نقوش

ادبِ عالیہ

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

ترتیب

طلوع — محمد طفیل

۱ ـ نقوش کے بارے میں میرے تاثرات — غلام رسول مہر، ۱۱
۲ ـ نقاشی و نقوش — ڈاکٹر اختر اورینوی، ۱۷
۳ ـ نقوش کے خاص نمبر — نثار احمد فاروقی، ۲۱

نوادرات

۱ ـ تذکرۂ شعرائے — مولانا حالی، ۳۳
۲ ـ اصول فارسی — مولانا حالی، ۴۰
۳ ـ تقریظ — مولانا محمد علی، ۴۵

شعر و شاعر

۴ ـ شعر اور زندگی — ڈاکٹر یوسف حسین خان، ۵۳
۵ ـ قتیل و جدی نقایا فرید آبادی — ڈاکٹر مختار الدین آرزو، ۶۴
۶ ـ مثنوی بہارِ عشق — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ۷۹
۷ ـ تنقید شعر اور حالی — پروفیسر عبد القادر سروری، ۱۰۶
۸ ـ بحر الکر — پروفیسر حامد حسن قادری، ۱۱۶
۹ ـ آوارہ گرد اشعار — قاضی عبد الودود، ۱۲۴
۱۰ ـ دارا شکوہ کا دیوان — پروفیسر محمد الدین سالک، ۱۴۱
۱۱ ـ غالب کی مقبولیت کے اسباب — شیخ محمد اکرام، ۱۵۰
۱۲ ـ آتش کی صوفیانہ شاعری — سید احتشام حسین، ۱۵۴
۱۳ ـ مزے دار شاعر — محمد حسن عسکری، ۱۶۱
۱۴ ـ اختر شیرانی — آل احمد سرور، ۱۸۳
۱۵ ـ فیضی کا تفکر شعر — ڈاکٹر وحید قریشی

ادب و تنقید

۱۶ ـ برج بھاشا کی پہلی گرامر — سید مسعود حسن رضوی، ۱۹۹
۱۷ ـ اردو اور پنجابی — ڈاکٹر محی الدین زور، ۲۱۴

نظمیں
غزلیں

دہلی کی زبان ٹکسالی تھی۔ دہلی والے ہی اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ نذیر احمد دہلی کے رہتے اس لیے احساس کمتری تھا۔ وہ دہلی والوں کی صف میں آکر اہل زبان میں شمار ہونے کا جذبہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس لیے بھی وہ زیادہ سے زیادہ محاورات مضرب الامثال اور روزمرہ اپنی عبارتوں میں پیش کرنے لگے۔ تاکہ یہ سب کو اندازہ ہو جائے کہ مجھے بھی دہلی کی زبان پر اتنا ہی عبور ہے جتنا کسی اور کو ہو سکتا ہے۔ اس احساس کو انہوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کا سیلاب ان کے ذہن کو بہائے لیے جاتا ہے۔ اور وہ بعض وقت مجبور ہو کر اس میں بہے چلے جاتے ہیں۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سنبھل نہیں سکتے ابتذال و رکاکت کلام میں آجاتی ہے۔ مگر ان پر محاورات اور روزمرہ کا ایسا نشہ سوار ہے کہ وہ بے خبر سے معلوم ہوتے ہیں۔ حامد حسن صاحب قادری نے جو اس سلسلے میں مثالیں پیش کی ہیں وہ اس دعویٰ کی بیّن دلیل ہیں ان ہی کو ہم یہاں بطور نمونہ پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں منتخب الاجتہاد میں تذکرۂ ہجرت میں لکھتے ہیں:۔

"اب تم ان حالات عقد صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کسی مفاد کی توقع کر سکتے تھے۔ اس دعوے نے تو ان کی یہ گت بنائی تھی کہ ؎

جھڑکی تو مدتوں سے مسادات ہو گئی
خالی کھجور نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی
باقی ہے مار کھانی تو سن لو گے ایک دن
اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اس دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا۔ (الاجتہاد ص۳۳)

امہات الامر میں اخلاق نبی کریمؐ اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسہ پر پیغمبر تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں پڑے چھاتی پر مونگ دلوایا کیے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جا سے اکھڑ گیا اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی؟

ان مثالوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ متانت و سنجیدگی کا خون نہیں ہوا۔ پیچھے سے شک گئے ان کی یہ گت، چھاتی پر مونگ دلوایا کیے، پائے ثبات اکھڑ گئے، بھاگ کر ..... یہ فقرے یا محاورے اس عظیم المرتبت ہستی کی شان میں ہیں جس کا نظیر صفحۂ ہستی پر پیدا نہیں ہوا۔ یہ صرف عام مسلمانوں کا عقیدہ نہیں خود نذیر احمد بھی رسالت مآب کا دل سے اتنا ہی احترام کرتے تھے۔ مگر زبان دانی کا غرہ اور محاورات کا چسکا ساری ذہنیت پر بھوت کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ نہ حفظ مراتب کا خیال اس کو دبا سکتا تھا اور نہ موقع شناسی اس کو اتار سکتی تھی یہ ضرور ہے کہ ان کا دل دھڑکا ہوگا۔ احترام کے جذبے نے قلم کو روکا ہوگا کہ کس کی شان میں یہ الفاظ استعمال ہو رہے ہیں کس موقع پر ان فقروں اور محاوروں کا صرف ہو رہا ہے مگر زبان دانی کے جوش اور الفاظ کے استعمال

لہ داستان تاریخ اردو ص۱۰۸-۱۰۹)

کرنے کا نشہ اس بے اعتدالی سے نہ روک سکا اور اس حد تک مدہوش کر دیا کہ نثری عبارت ناقابل معلوم ہوئی۔ تو چار مصرعے بھی چسپاں کر دیئے۔ حالانکہ اس موقع کے لیے یہ مصرعے نہایت نامناسب تھے۔ اسی بے تکے پن کی وجہ سے اکثر ان کی طرز تحریر غیر موزوں ہو جاتی ہے۔ کلام میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات جان بوجھ کر بڑھائی جا رہی ہے۔ یہ سب اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو الفاظ سے عموماً کھیلنے کا ہوتا ہے۔ سب کچھ کہہ جانے پر بھی خیال ہوتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا۔ اس لیے کہ مخصوص انداز بیان کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور موضوع ختم ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد ایسے دور میں تھے جب انگریزی تمدن کے اثر سے نئی قدریں متشکل ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو ان پر اعتماد ہو چلا تھا۔ انگریز اور یورپ کی ترقی کے راز کو سمجھنے کی کوشش ہندوستان میں ہو رہی تھی۔ ایک خاص طبقہ انگریزی تعلیم یا انگریزی اثر سے متاثر ہو کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سائنس کی نئی تحقیقات و معلومات کا مطالعہ کیا جائے ان سے پرانی ذہنیت کو بدلا جائے مذہب کو عقل کی عینک سے دیکھا جائے، توہمات سے کنارہ کیا جائے۔ اور ایسی رسمیں جو مذہب کے نام پر جاری ہیں مگر حقیقتاً خیال خام کی پیداوار ہیں وہ قوم و ملک کے لیے زہر ہیں ان سے اجتناب کیا جائے۔ انگریزوں کی ترقی کا ایک بڑا راز تجارت میں مضمر سمجھا گیا۔ اصلاح کے لیے تقریروں اور تحریروں دونوں سے کام لیا جانے لگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ نذیر احمد کا دور نئی تحقیقات و تحقیقات سے اثر لے کر اپنی قوم میں بھی ترقی کی روح پھونکنا چاہتا تھا۔ اسی کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے لیے معلومات کا ذخیرہ مغرب کے خزانے سے لے کر عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حالی، سرسید، محمد حسین آزاد اور ان کے تقلید وہم خیال یہی اصلاح کے علمبردار تھے۔ جس کو جو طبقہ مناسب معلوم ہوا اسی میں تبلیغ کرنے لگا۔ نذیر احمد نے پہلے پہل اس کام کے لیے طبقہ اناث کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انہوں نے اس کار خیر کے لیے نئے آلۂ کار کا انتخاب کیا۔ ناول اردو ادب کے لیے نئی چیز تھی اس کا یا پن بھی لذیذ معلوم ہوا ہوگا۔ اور پیامات کی تازگی بھی چاہتی تھی کہ پرانے قصے کہانی کو چھوڑ کر نئی صنف میں باتیں پیش کی جائیں اس لیے نذیر احمد کا یہ اقدام ناول میں اصلاحی مقصد کو پیش کرنے کا خیال بڑی نکتہ رسی پر مبنی تھا۔ بہرحال انہوں نے اصلاحی فریضہ ناول سے شروع کیا۔ اور لوگوں کی طرح نذیر احمد کے پاس بھی کوئی معاشرتی پروگرام ایسا نہ تھا کہ ان کی تخلیق سے تعبیر کیا جائے۔ درحقیقت ان کا ذہنی سرمایہ مغربی تمدن کا پرتو تھا۔ جس میں تقلید زیادہ تھی خلاقی کم۔ بہرحال جو کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں اس کو قوم کی بہبود میں صرف کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اقدام میں خلوص تھا وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ مسلمان ترقی کریں مادی ترقی کے لیے ان کے نزدیک ضروری تھا کہ شعور میں بھی بلندی آئے قدامت پرستی کے تنگ دائرے سے نکل کر نئے علوم سے متعارف و مانوس ہوں تاکہ نئے راستے اور ان کی قدر و قیمت سمجھ میں آئے۔ مختلف وجوہ سے نذیر احمد نے عورتوں کو زیادہ کمزور پایا اور مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے مضبوط بنایا جائے۔ اس لیے ان کی ناولیں مرأۃ العروس اور بنات النعش وجود میں آئیں۔ جن میں علاوہ اور باتوں کے ذہن کی بالیدگی کے لیے سائنس کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ مثلاً بنات النعش میں زمین کی گردش و دوران خصوصاً ہوا کا دباؤ، کشش، اتصال، اتقالیں، زمین گول ہے۔ اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس قسم کے اور بہت سے عنوانات ہیں۔ جن سے ظاہر ہے کہ ان مسائل کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ شعور میں عقلی عنصر غالب ہو جائے۔ زندگی کے رشتے منطقی طور پر سمجھ میں آ جائیں۔ مفروضات سے ہٹ کر عورتیں حقیقت کی روشنی میں چلنے پھرنے لگیں۔ اور نئی عقل کی توانائی کے ساتھ

آگے بڑھے۔ نذیر احمد نے اپنی ذہنیت پر ایک جگہ خود تبصرہ کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، بخود غلط، اسلاف کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا، آوہ، مولوی خاندان کے تھے مگر مولویت سے مبرا تھے۔ اسی لیے مولوی کو انہوں نے بہت بری نظر سے دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی انبیاء کی طرح سمجھ لیا کہ دین کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے۔ اس کو کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام"

ان کے نزدیک قوم کی رہبری کے لیے اب وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات و تغیرات سے بخوبی واقف ہو، مذہب کا اصل مغز بھی جانتا ہو، اپنے پر بھی تنقیدی نظر ڈال سکتا ہو۔ تعصب و تنگ نظری کا شکار نہ ہو۔ مختصر یہ کہ ایسے کردار کا مالک ہو جو زندگی اور مذہب کی اصل حقیقت سے واقف ہو، انسان کو انسان سمجھتا ہو۔

ان مختصر الفاظ میں نذیر احمد نے اپنے دور کے ممتاز لوگوں کی ذہنیت کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اتفاق سے اس وقت جو مرد آور وہ لوگ قوم کی رہنمائی اور راہ نمائی کر رہے تھے۔ ان سب کے مزاج و مذاق کی تعمیر اس اصول کے آئینہ میں نظر آتی ہے۔ مرتبہ حالی، آزاد اور نذیر احمد سب اسی تعمیر کے ساتھ راہ تجارت میں گامزن تھے۔ کبھی کسی سے تعرض ہو گئی ہو تو اسے اتفاق پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ مجموعی ان بزرگوں کے سامنے مسلک تھا۔ نذیر احمد کو اصلاح کے سلسلہ میں اتنا شغف تھا کہ وہ سچی ناصح مشفق معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ناولوں میں کردار کی حرکات و سکنات بیان کرتے کرتے خود بھی بول اٹھتے ہیں۔ اور اس شدت کے ساتھ بولتے چلتے ہیں کہ ہر اکھڑ سے بھی سنتے ہیں۔ ناول کے تکنیک کے مجروح ہونے کا خیال رہ جاتا ہے۔ مذاق کے تناسب و توازن کا لحاظ باقی رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات سے ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ بغیر بولے ہوئے ان کی حالت غیر ہو جائے گی۔ کچھ دیر بعد مرد اور بھی بے تکا ہو جاتا ہے۔ اس دور کے پس پشت تاثیل و خود نمائی کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور یہی جذبہ ان کی تمام ادبی کاوش میں پایا جاتا ہے۔ مذہب، اخلاق و معاملات کی بھرمار، اور انگریزی الفاظ کا بے مزہ رت دیے عمل استعمال ان کی اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جو خود نمائی کے ذوق پر محمول ہے۔

نذیر احمد کے ذہنی پس منظر میں سیاست کا زیادہ دخل نہیں مگر معاشرت اور سیاست میں جو فرق نظر آتا ہے وہ کسی نکتہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے سیاسی مسائل پر بھی ان کے خیالات ملتے ہیں گو دبے دبے ہیں مگر ہیں ضرور۔ ان خیالات کی تہہ میں اتنی معقولیت اور خودداری ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں لوگوں کا سیاسی شعور اتنا بلند تھا جتنا آج ہے۔ نہ آزادی فکر و گفتار آج کے ایسی حاصل تھی۔ مگر پھر بھی انہوں نے مختلف صورتوں سے حاکم و محکوم کے رشتہ پر جو منظر ڈالا ہے وہ اس وقت کے لحاظ سے قابل قدر ہے ایک جگہ اپنی اہلیہ کی زبان سے قدر کے بعد انگریزوں کے بھید میں کھلواتے ہیں:۔

"انگریزی سلطنت، ہمارے ہندوستان کے حق میں ایک ایسی ہے، جس کو اس وقت تک اکثر عوام اناس نہیں پر جو سکتے تبدیل سلطنت یوں بھی کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا تبدیل کہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ نہ دین ایک نہ زبان ایک نہ مذہب ایک جس ہندوستانیوں کے حق میں سلطنت کیا بدلی گویا ساری جہان بدل گئی۔ مجھے تو ہم ذریعے معقل، ساری لیاقتیں بے کار۔ کل تدبیریں بے اثر ..... اب ہر ایک منصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی حکومت سے ناخوش ہونے اور رہنے کی وجہ معقول

تھی یا نہیں؟

اس سلسلہ کی ایک لڑی اور ملاحظہ ہو، بنات النعش میں ایک جگہ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات پر کچھ عورتوں میں بحث ہو جاتی ہے۔ اسانی بی آخر میں سمجھاتے دیتی ہیں:۔

"جتنے بادشاہ ہیں سب لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ جب دنیا میں بہت آدمی ہو گئے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہونے لگا..... تجویز یہ ٹھہری کہ آپس میں کسی شخص کو سردار بنالیں۔ سب اس کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور اس سردار کا کام یہ ہو کہ وہ لوگوں کے جھگڑے طے کر دیا کرے۔ رعایا کی جان و مال و آبرو کا نگہبان رہے۔ اسی کا نام بادشاہ ہوا۔ لوگوں کا کام ہے اس کی اطاعت کرنا اور بادشاہ کا کام ہے رعایا کو آرام دینا۔"

اگر یہ مان لیا جائے کہ ان اقتباسات کے پس پردہ مصنف خود بول رہا ہے تو نذیر احمد کا سیاسی نظریہ واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ پہلے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں اور فرنگیوں میں مختلف اجزا سے بے بعد پائے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستانی اور انگریز کبھی شیر و شکر نہیں ہو سکتے۔ اتنے بنیادی اختلافات میں کہ ہندوستانیوں کا انگریزی عملداری میں خوش رہنا مشکل ہے کیونکہ علم و علوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ انگریزوں کے آجانے سے ہندوستانیوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا سب کچھ لٹ گیا اور وہ بیک جنبش قلم انگریزوں کی بدولت معزول ہو گئے۔ نذیر احمد سیاسی نہ تھے مگر ان خیالات میں انہوں نے نفسی تحلیل پیش کی ہے وہ ان کے نکتہ رسی کا پورا ثبوت ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کس طرح ملک و حالات اور واقعات کا مطالعہ کیا ہے اور حقیقت کو کتنی باریکی کے ساتھ محسوس کر لیا تھا۔ دوسرا اقتباس بھی ان کے خیالات کی بلندی اور آزادی فکر کی بیّن دلیل ہے۔ حالانکہ انگریزی شہنشاہیت اس وقت شباب پر تھی۔ غدر کے بعد ایک مدت تک انگریزوں کی سخت گیری زبان بندی کا کام کر رہی تھی۔ اور یہ کتاب بنات النعش، غدر کے صرف پندرہ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں عوام کی قوت و حقوق کو اس طرح بیان کرنا کہ بادشاہ لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں بڑی دیدہ وری کا کام تھا۔ گویا عوام کو یہ سمجھانا تھا کہ تمہاری اجتماعی قوت بادشاہ کی قوت سے زیادہ ہے اور تجزیہ کہ بادشاہ کا فرض اور یہ ہے کہ رعایا کی جان و مال و آبرو کی نگہبانی کرے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سنے کو بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ حکومت سے ڈرتے تھے نہ مذہب والوں سے۔ جو کچھ سوچتے تھے اس پر بیخوفی کی مہر لگا دیتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور بات ناقابل قبول ہے۔ ان کی اصابت رائے میں شک ہو سکتا ہے۔ ان کے نظریے سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی بے باکی پر دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

نذیر احمد کی شخصیت میں ایک بڑے مزے کا تضاد ملتا ہے جس قدر وہ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں کنجوس تھے اتنا ہی الفاظ کا ذخیرہ لٹانے میں فیاض تھے۔ یہی کی وجہ تو یہ تھی کہ وہ غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ مفلسی اور ناداری کے نشتروں سے دل پوری طرح واقف تھا۔ اس کو اب اپنے سے دور رکھنے کے لیے پائی پائی پر نظر تھی۔ مٹھی ہمیشہ بند رہی۔ لیکن الفاظ کے صرف میں ان کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی غریبی کی تلافی روپے سے نہیں بلکہ الفاظ سے کرنا چاہتے تھے۔ جس سے روپیہ جمع کرتے ہیں ان کو نفرت تھی۔ ویسے ہی الفاظ غریب امثال محاورات کے لٹانے میں مزا آتا تھا۔ اور یہ مزا اس حد تک غلبہ پا گیا تھا کہ کسی قیمت پر اس کے ترک کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ان کی ایک کتاب امہات الامۃ سے ان کی ساری شہرت دھک نامی میں آگ لگا دی

ازواج رسولؐ کے بارے میں لکھتے لکھتے الفاظ و محاورات کی بے اعتدالی اور اس جزئے نے جو ان کو فتا تھا غضب ڈھا دیا۔ کچھ ایسے نامناسب فقرے لکھ گئے جو ہر لوگوں سے قابل اعتراض تھے۔ ان کو پڑھ کر عام بے چینی پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے جذبات نذیر احمد کے خلاف اتنے مشتعل ہوئے کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ علماء کا اجتماع ہوا اور ان کی کتاب اہانت امہات کا جتنا بھی ذخیرہ ملا سب کو یک جا کر کے آگ لگا دی گئی۔ اس واقعہ پر نذیر احمد پر بڑا سخت اثر پڑا اس لیے کہ خود وہ رسولؐ اور ازواج مطہرات سے بڑی عقیدت مندی رکھتے تھے۔ معلوم کتنا پاس ان بزرگوں کے اخلاق و سیرت کی اشاعت پر کیا تھا۔ اور آج ان ہی کو ان بزرگوں کا مخالف کہا جا رہا تھا۔ ان کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے بعد زیادہ دن تک جی سکے۔ یہ حادثہ ۱۹۱۱ء میں اور ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔

نذیر احمد کی ذہنیت کی تشکیل میں مذہب کا عنصر جزو غالب ہے وہ بغیر اس کے فکر نہیں اٹھاتے۔ ہر اخلاقی تعلیم میں مذہب کی چاشنی ضرور ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب و اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناقابل اندیشہ بلکہ حماقت ہے۔ توبۃ النصوح کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں "نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بازو کو تن سے یا آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا باطن کو گوشت سے علیحدہ یا منفک کرنے کا قصد کرے۔" گویا ان کے نزدیک مذہب سے الگ ہو کر زندگی اخلاق کے دائرے میں نہیں رہ سکتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے خیال میں اخلاق کا شیرازہ بغیر مذہب کے قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا کا کوئی اور قانون اس کو راہ راست پر نہیں رکھ سکتا۔ ان کا ذہنی ارتقاء رسوم و قیود کا سہارا لیے ہوئے ہے جو کچھ دیکھتے یا سنتے چلے آتے ہیں اسی پر اپنی تخیل کا محل تعمیر کرتے ہیں۔ اس سے الگ یا آزاد ہو کر کوئی نیا نظریہ یا نقطۂ نظر ان کے ذہن میں نہیں۔ چنانچہ نصوح کو جب حشر کے میدان میں لے جاتے ہیں اور وہاں کی روداد بیان کرتے ہیں تو خدا کو مجسم بشریت اور اس کی جلوہ گاہ کو دنیا کی معمولی عدالتوں کا چربہ سمجھتے ہیں۔ خدا کے یہاں بھی حوالات و حاضر ہوتے ہیں۔ مجرم کے لیے فرد جرم تیار کرتے ہیں۔ گواہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوال و جواب کا سلسلہ پیدا کرتے ہیں۔ اور آخر میں عدالتی فیصلے کی طرح خدا بھی اپنا حکم مجرم کو سنا کر ہے۔ گویا خدا و خدام کی جلوہ گاہ دنیا کی ویسی ہی ہوں گی جیسے یہاں کچہریوں میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جدت و اختراع کا مادہ نہیں۔ البتہ مذہب کی روح کو کما حقہ سمجھ لیا تھا۔ اور جو کچھ سوچا یا سمجھا تھا۔ اس پر حق کے ساتھ کاربند تھے۔ اسی کو مشعل ہدایت بنا کر تمام دنیا کی تاریکیوں کو دور کرنے کی فکر تمام عمر کرتے رہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق

ممتاز حسین

ایک ایسے زمانے میں جب کہ طبقاتی جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو جذباتی و فوری انقلابی کمزوری کے باعث ادبی پرکھ میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قصور سیاسی تیز پسندی کا نہیں ہے کیونکہ سیاست تو تیز ہوتی ہی ہے۔ بورژوا نظام کے تضاد جوں جوں ابھرتے جائیں گے، طبقاتی جنگ کا تیز ہونا لازمی ہے۔ تاریخ کا تقاضا تو انہیں تضاد کو زیادہ ابھارنے اور تیز کرنے ہی کا ہے۔ لیکن جب سماجی ارتقا کے تو ابن کا اطلاق بہت چھوٹے اور میکانکی طور سے ادب پر کیا جاتا ہے تو نہ صرف ادب ہی کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ انقلابی قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ مارکسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ ادبی جانچ پڑتال کا بہترین آلہ ہے۔ لیکن جب اس آلے کو باقاعدہ تمام علوم کا جائزہ لیتے ہوئے میکانکی طور سے استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ علم دشمنی اور جہالت کا حربہ بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ اینگلز اور مارکس کے زمانے میں بھی خود جرمنی میں ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکسزم کو ایک ایسا علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے سوانح پر مارکس اور اینگلز دونوں ہی نے اپنا غم اٹھایا ہے۔ اسی طرح لینن نے مرزا گوستوں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ عملی تنقید کے ذریعے ہماری رہنمائی بھی کی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کی کسوٹی بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔ قبل اس کے کہ ایک دستے بڑے مسئلے کو ہاتھ لگایا جائے میں نہیں امرت سماجی ترقی کے معلوم اور کلیدی ادب کے چند بنیادی مسائل کو پیش کروں گا۔

جسے ہم سماجی ترقی کہتے ہیں اس کا تعلق ترقی کے مختلف سمتوں سے ہے۔ معاشی اور سیاسی ترقی کے ساتھ اگر مادی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ اور بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور نہ ابھر سکے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی ہماری ترقی نہ صرف نامکمل ہی ہے بلکہ اس میں کھوٹ بھی ہے کیونکہ سماجی شعور ایک خلاقانہ قوت ہے جو معاشی بنیادوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اگر سماجی شعور کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں خود معاشی نظام کی طرف لے جائیں یا نہ دیں۔ یہی خطرہ ہمیں تصنیفات کے فنی اثر ہی کو دیکھنے تک محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے دیرپا اثرات کا مطالعہ بھی لازم کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے کی ادبی تصنیف فنی اثر کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن سماجی ترقی میں دیرپا اثرات کی حامل ہو۔ اس حقیقت کا ایک مخالف پہلو بھی ہے۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ ادب اور تہذیب کی ترقی طبقاتی سماج میں ہوئی چنانچہ طبقاتی اثرات کی چھاپ تو ادب اور پھر دوسرا

ہی ہو رہے۔ لیکن جب ہم اس طرح سوچیں تو ہمیں سماجی ترقی کے مفہوم کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ ملوکی کا دور استحصالی نظام کو وجود میں لانے کے خیال سے ایک بڑا زمانہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قبائلی نظام کے مقابلے میں اس دور میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے۔ اس لیے اس دور کا کچھ حصہ ترقی پسندی کا بھی دور رہا ہے۔ یونان کا تمام علم و ادب اسی دور میں بار آور ہوا۔ اس دور کے علم و ادب نے ترقی اور رجعت دونوں ہی قوتوں کی نمائندگی کی ہے۔ کسی بھی دور کی سب چیزیں ترقی پسند نہیں ہوتی ہیں۔ اور نہ انہیں تاریخی تقاضوں کو نتیجہ ہی کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے۔ ترقی اور رجعت کی روایات باہم ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہی ہیں۔ سماجی ارتقا ترقی کی قدیم روایات کو آگے بڑھا کر ایک نئی صورت میں تبدیل کرتا رہا ہے۔ وہ ناقص اور غیر سائنسی روایات کو ضائع بھی کرتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم ہے۔ اگر بنیادی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترقی دو طرفوں میں سمت آئی ہے۔ طریق پیداوار کو بڑھانے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے اور انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حصہ لیا ہے انہیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ یہ قوتیں مختلف ممالک میں ایک ہی وقت میں اپنے ملکی حالات کے ماتحت مختلف صورتوں میں کام کرتی رہی ہیں۔ ہم ایک ملک کی مثال کو دوسرے ملک پر میکانکی طور پر لاگو نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ علم و ادب کا رشتہ سماجی بنیادوں کے ساتھ طبقاتی نظام میں اتنا براہ راست نہیں رہا ہے جتنا کہ قبائلی نظام میں تھا۔ طبقاتی نظام میں تو ان چیزوں نے اکثر و بیشتر ایک بار معاشی بنیاد سے متعین ہو کر اپنی ایک آزاد زندگی بھی اختیار کر لی ہے۔ اگر ان کی یہ آزادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ اپنی ترقی کے مخصوص قانون اور منطق بھی بنا لیتے ہیں۔ ہمیں فکری تحریکوں کو جانچتے وقت نہ صرف طبقاتی جنگ ہی کو دیکھنا ہے بلکہ ان کے تسلسل، منطق اور قانون کا بھی پتہ چلانا ہے۔ چونکہ فکری تحریکیں ادب پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ اس لیے ان کا مطالعہ معہ ان کی منطق کے بہت ضروری ہے۔ فکری تحریکیں اس لیے بھی اہم ہیں کہ وہ ایک مخصوص عہد کے ارضی نقطۂ نگاہ اور ادراک حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ان کی مدد سے ادب سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ادب کی تعریف لینن نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے بلکہ اس طرح بھی کہ ادب ادراک حقیقت میں بڑی مدد بھی کرتا ہے۔ انہیں معنوں میں ادب ہماری جسمانی، ذہنی، جذباتی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی مدد سے کسی بھی زمانے کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو حقیقت میں نئے اور پرانے کی جنگ کی تاریخ ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادیب کسی نہ کسی معنی میں نئے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس وقت یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ مکمل صورت سے نئے کے ساتھ ہو کیونکہ جس حد تک ایک دور کی متضاد قدروں کی جھلک تصویر عوام کے ذہنوں میں جھلکتی ہے۔ ادیب کا ذہن بھی جھلک رہتا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر متضاد باتیں بھی کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ بنیادی اعتبار سے پرانے کے خلاف جنگ کر کے کون سی نئی چیزیں لانا چاہتا ہے۔ اگر وہ صرف ماضی کی چیزیں واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہم اسے رجعت پرست سمجھیں گے۔ خواہ وہ ایک مخصوص عہد کے پرانے پن کے خلاف ہی جنگ کیوں نہ کر رہا ہو۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ جب اشرافی حکمراں طبقہ اپنے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت سے نئے تصورات کو بھی اپناتا ہے لیکن وہ ان تصورات کو صرف اپنے طبقاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے اس کی یہ کوشش اصل میں قدیم کو زندہ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال اسلامی تاریخ میں امام غزالی کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسلام کی شرعی حکومت انحطاط کی مکمل صورت میں تھی۔ شرع اور فقہ چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ دشمنان شرع یونانی علوم سے لیس تھے۔ باوجود امام غزالی کو بھی یونانی علم الکلام کو استعمال کرنا پڑا۔ لیکن امام غزالی

نے اسے جن مقاصد کے لیے استعمال کیا وہ قطعی رجعت پسند تھے۔ اسے مادی ترقی کے بجائے روحانی استدراک کا ذریعہ بنایا۔ اسلام میں مابعد الطبیعاتی منطق کی مابیں انہیں کی کوششوں سے کھلی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی مثال علامہ اقبالؒ کی فکری کوششیں ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسلام کی روحانی جمہوریت کو واپس لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے ان ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاہا ہے جن سے یورپ میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن ایسے تمام ذرائع کو وہ اپنے مخصوص مقصد کا پابند ہی کر دیتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کے کلام میں بھی تضاد پیدا کر دیتی ہے کیونکہ مادی ذرائع روحانی مقاصد کے ساتھ ہم نوا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر انسان خاص فطرت پر تصرف حاصل کر لے گا تو اس کا مقصد صرف مادی ہو گا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اقبالؒ کے کلام کے ترقی پسند اجزاء خود اپنی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ یوں تو علامہ اقبال کا فلسفہ خودی بڑا جاندار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ شریعت یعنی ثابت الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی بغاوت کی حدود بھی متعین ہو جاتی ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شریعت کو ایک سیال نظریہ بنا کر ہر نئے نظام پر منطبق کر دیتے ہیں۔ شریعت کی نظریاتی بنیادیں بالکل متعین ہیں اور اس کے عمل کی تاریخ ایک لمبے چوڑے دور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کے ایک بہت ہی مختصر سے وقت کو چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ شریعت کو استحصالی طبقے نے استعمال کیا ہے اور جب تفسیریں لکھنے کا وقت آیا تو تمام تر فقیہوں نے ایسے ہی نکات پیش کیے جن سے حکمراں طبقے کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ بالآخر خلافت (دینی ریاست) ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کی مخالفت کو ایک مقدس فریضہ بنایا گیا۔

شریعت کی مخالفت اسلامی تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس بغاوت کی ابتدا ان وحدت الوجودی صوفیوں نے کی جو یونان کے فلسفۂ وحدت الوجود سے متاثر تھے۔ یہ فلسفہ خلاصوں کا نہیں تھا بلکہ پلوٹینس کا تھا جس نے خلاصوں کی ثنویت اور ویسے قرطبی کی مادیت کو ہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کی اس آواز کو ذوالنون مصری، بایزید بسطامی اور حلاج نے انجام دیا۔ اس کے پیچھے یہ آواز اتحادی ہی مشکل تھی۔ اگر یونانی وحدت الوجود کے فلسفے کو توحید مطلق کے فلسفے پر برتری دی جاتی تو توحید مطلق کے فلسفے میں مادہ مخلوق ہے اور ایک خاص زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس کی ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ وہ اپنی حرکت و صورت پذیری میں قادر مطلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا محرک اور خالق ایک دوسری قوت ہے۔ جس طرح اس قوت نے قوانین فطرت وضع کیے ہیں اسی طرح سماجی (Institutions) کے لیے بھی پابند قوانین وضع کر دیتے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفے میں مادہ روح کے ساتھ ہم وجود ہے۔ مادہ بھی روح کے ساتھ ساتھ ابدی اور ازلی ہے۔ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔ اس طرح انسان کا عمل اور ارادہ مشیت ایزدی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کی تخلیق یا تخریب کرتا ہے تو اس میں مشیت کو بھی دخل ہے کیونکہ مشیت کا اظہار مادے کے توسط سے انسانی عمل ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیوں نے اسی منطق کی بنیاد پر اسلامی اخلاقیات کو مزید وجود سے آزاد کر کے عمل میں منتقل کر دیا ہے۔ اور ان تمام مذہبی دیواروں کو گرانے کی کوشش کی جو انسانوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان اسباب کے باوجود یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ صوفی عوام میں بہت مقبول تھے۔ وہ دنیاوی زندگی سے گریز کرتے تھے اور انہوں نے اسلامی تاریخ میں دینی سیاست کے قائم ہونے کی مخالفت کی ہے۔ یہ تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ صوفیوں نے بظاہر عمل کر کسی عوامی شورش میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن عوامی تحریکوں کے ساتھ ان کی ہمدردی بالواسطہ شامل رہی ہے۔

جس حد تک یونانی وحدت الوجود کا فلسفہ اور ایرانی گبرو تو سا کے مادی فلسفے کی روایات توحید مطلق کے فلسفے کے ساتھ ہم آمیز ہوتی گئیں، صوفیوں کے انقلابی ذہن میں بھی کمزوری آتی گئی۔ اس فلسفے نے پہلی بیعت امام غزالیؒ کے ہاتھوں کی اور دوسری بیعت مجدد الف ثانی سرہندیؒ کے ہاتھ۔ امام غزالیؒ نے وحدت الوجود کو اس کے مادی جزو سے باطل ہی قرار دیا۔ محسوسات کے فلسفے کو خاص وجدانی اور باطنی فلسفہ کی بنا پر تصوف کو روحانی مشق و مجاہدہ کی چیز بنا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شریعت اور طریقت کو بھی ہم آمیز کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جب مجدد الف ثانی سرہندیؒ نے ہمہ اوست کو ہمہ از اوست میں تبدیل کیا تو مادے کو باطل ہی قرار دے دیا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وحدت الوجود کا ذات خود بھی فلسفہ جو مادے اور روح کو ہم آمیز کرتا ہے۔ بہت سے معنوں میں صحیح ثابت نہیں ہوا۔ ہر چند وحدت الوجودوں نے مادے اور روح کی دوئی کو ہم آمیز کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ حقیقت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ انہیں روح کو فاعل اور مادے کو مفعول بنانا ہی پڑا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اس فلسفے میں فکر کو عمل پر ترجیح دی گئی ہے۔ صوفیوں کی زندگی میں تفکر پسندی، خاموشی اور اعتکاف انہیں قصورات کے ماتحت آیا ہے۔ لیکن اس فلسفے کا ایک عیب یہ بھی تھا۔ صوفیان کرام خدا کو عادل اکبر تسلیم کرتے تھے اور نہ ہی فطرت میں صرف انسان ہی کی جلوہ گری پر اپنا ایمان رکھتے تھے۔ میر کا ایسا خدا کا بندہ انسان بھی اس مرتبے سے واقف تھا ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو معبود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

یہاں تو خدا کو بندے سے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ جبر و اختیار کا جملہ تو صرف اس وقت اٹھتا ہے جب کہ ہم مادے کو خود مختار تصور کر لیں۔ یہ کشمکش تو صرف توحید مطلق ہی کی دی ہوئی ہے۔ چودھویں صدی کا انحطاطی تصوف اس کی زد سے کیوں کر بچ سکتا تھا۔ بالآخر میر کو بھی اپنی خود مختاری کا اعتبار جاتا رہا۔

اسی طرح صلاح کا فلسفہ بقا باللہ بھی انحطاطی دور میں بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ صرف فنا فی اللہ کا لفظ یاد رہ گیا تھا۔ صلاح کے بقا باللہ کے اصول کے مطابق انسان ذات باری کی خلاقانہ صفات ہی ختم ہو کر تفرید اور تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی تصور کے ماتحت انسان کو خالق بھی بتایا ہے۔ فنا فی اللہ کا وہ درجہ ہے جب کہ وہ اپنی تفرید کو کسی تحقیق کے لیے فنا کر دیتا ہے چونکہ بقا باللہ میں انسان کے بندہ رہنے کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے توحید مطلق کے ماننے والوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ اسے کفر کے برابر گردانا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ مسلمان صوفیوں نے زیادہ تر فنا فی اللہ ہی کو رواج دیا۔ پھر وہ کہ جاگیردارانہ نظام کا دکھلاوا اس خیال کو ہوا دیتے ہیں اور بھی مدد گار ثابت ہوئی۔ زندگی میں کوئی بھی نئی تحقیق غیر مادی علوم کے ناقص ہے۔ یہاں اہل شرع اور اہل صفا دونوں ہی نے مادی علوم کو ادراک حقیقت سے خارج کر دیا۔ اہل صفا تو محسوسات سے بچتے ہی رہے۔ لیکن اہل شرع نے تو اس کی بھی مخالفت کی۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ وحدت الوجودی بنیادی طور پر اگر ایک طرف مظاہر فطرت کی وحدت کے قائل تھے تو دوسری طرف کائناتی تحقیق کے مظاہر کی عالمی حیثیت کو مانتے تھے۔ سماج کے بارے میں ان کا یہ تصور نہ تھا کہ وہ کسی معاہدے کی بنا پر اپنے اختیارات سماج کو تفویض کیے ہیں بلکہ یہ کہ انسانوں کا سماج اسی طرح ایک عالمی ہے جیسے نباتات یا جمادات کی دنیا ہے۔ ان کا سماجی تصور (Collective) نہیں بلکہ کائناتی ہے۔ اسی وجہ سے بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور

اس کی شاعری میں بہت قوی ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

بروئے کہ مردم شود زندگی — شود تازہ چوں بر جہاں پیر تن

اس تصور کے ماتحت ان میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ لیکن چونکہ وہ مادے کے ارتقاء اور اس کے جدلیاتی عمل سے واقف نہ تھے۔ اس لیے سماجی ارتقاء کو طبقاتی کش مکش میں نہ دیکھ سکے۔ یہ راز تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہی آشکارا ہوا۔ پھر ہم صوفیوں سے اس کی توقع کیونکر کر سکتے ہیں۔

بڑی ضمنی سی بات ہے۔ لیکن کہہ دینے میں حرج ہی کیا ہے۔ یورپ کو پہلی دفعہ گوئٹے نے آفاقی ادب کا تصور دیا ہے اور اسے آفاقی ہی سمجھئے کہ گوئٹے وحدت الوجودی بھی تھا۔ اس گوئٹے کے بارے میں ایکرمن نے کہا ہے کہ "گوئٹے خدا کے تصور کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو یہ لفظ ہی کھسا دیتا تھا۔ وہ تو صرف انسانوں ہی کے ساتھ مانوس تھا۔ اس کی یہ انسان دوستی، ادب سے مذہب کو آزاد کرنے کی کوشش، گوئٹے کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس اعتبار سے زمانہ ماضی کے بڑے سے بڑے مصنفین اور شیکسپیئر بھی اس کا ہم پلہ ہے۔" لیکن میں اسے آفاقی نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ فارسی اور اردو ادب میں تو صرف وحدت الوجودی صوفیوں ہی نے خدا کے تصور کو چھینا ہے۔ میں فیضی اور غالب کے اشعار پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میں مولانا روم کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔ جس کی مدد سے آپ کو وحدت الوجود کا مفہوم بھی سمجھ میں آ جائے گا ؎

می گفت دریاں رہبر دل دریدہ

صوفی خدا نہ دارد او نیست آفریدہ

یہاں مولانا نے صاف لفظوں میں وضاحت کر دی ہے کہ چونکہ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اس لیے انسان کا بھی کوئی نہیں ہے۔ یہی فلسفہ صلاح کو اناالحق کی طرف لے گئی۔ اور اسی منطق کے ماتحت کتنے صوفی شعراء خاموش رہنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں جاگیردارانہ نظام کے زمانے تک انسانی عظمت کے گیت اسی فلسفے کے ماتحت گائے ہیں۔ وہ تمام صوفی شعراء جنہوں نے شریعت کے ساتھ بیعت کر لی ہے، وہ بھی انسان کی عظمت کے ایک حد تک قائل ہیں لیکن اس سے آگے قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی راستہ اصلاح کا اختیار کیا ہے۔ جس حد تک علامہ اقبال اصلاح کے فلسفے سے متاثر ہیں انسان کو جرم کبریا میں لا کر کھڑا بھی کیا ہے لیکن جس حد تک وہ امام غزالی اور سرہندی کے تصوف سے متاثر ہیں۔ مادی نقطہ نگاہ سے انسانی عظمت کی نفی بھی کی ہے۔ تو یہ منطق اور وحدت الوجود کے متضاد رویوں کے ملنے ہی کی کوشش میں علامہ اقبال نے خدا نے تعالیٰ کو لامحدود اور محدود دونوں ہی بتایا ہے۔ اور یہی کوشش اجتہاد اور تقلید کے تضاد کو بھی قائم رکھتی ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اجتہاد ترقی کے زمانہ میں کرنا چاہیے اور تقلید انحطاط کے زمانے میں۔ جب بھی کوئی انسانوں کو مقام کبریا بتا کر اسے مخلوق کا نصب بھی دے دیتا ہے تو وہ اسے بندۂ مظلوم بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے میں لینن کی تحریر کا اقتباس پیش کر رہا ہوں: "حقیقت میں یہ خدا کا تصور نہ تھا جس نے بہیمانہ انفرادیت پرستی کو دبایا ہے۔ یہ کام ابتدائی جماعتی زندگی نے کیا ہے۔ خدا کے تصور نے تو ہمیشہ سماجی جذبے کو کمزور کیا ہے ..... خدا کے تصور نے کبھی بھی فرد اور سماج کے رشتے کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ مظلوم طبقے کو غلامی کی زنجیروں میں اس عقیدت کے اثر سے جکڑ رکھا کہ حکمراں طبقے پر خدا کا سایہ رہتا ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ لینن نے جو کچھ لکھا ہے مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے لیکن یہ غلط بھی نہیں ہے۔ کہ خلق سبحانی کا تصور۔ تو ہمارے یہاں بھی کارفرما رہا ہے۔ اور یہ تصور توحید مطلق ہی کا جزو بن سکتا ہے۔ وحدت الوجود میں تو اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن توحید مطلق کے تلطف سے متاثر ہونے کے بعد تو صوفیوں کے یہاں بھی ولیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو ریاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے یا پھر ظل اللہ کی مراعات کے محتاج تھے۔ جہاں تک مادی تلطف کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے توحید مطلق اور وحدت الوجود دونوں ہی عینی فلسفہ ہیں۔ لیکن جاگیردارانہ نظام کی گزشتہ تاریخ میں توحید وجودی کے سیاسی مطلق العنانی، قانونی کثرت اور اطلاقی مطلق کے خلاف جنگ کی ہم اسے خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اس نے اس جنگ میں ادراک حقیقت کے لیے محسوسات کی شرط عطا کی چشم و گوش اور کام و دہن کی لذت کو ابتدائی زینہ کہا اور شعر و ادب میں محسوسات کی تمام رعنائیوں کو رچایا ہے۔ اس نے مصوری، بت تراشی، رقص، شعر و نغمہ کسی بھی چیز کو ممنوع قرار نہ دیا یہ دوسری بات ہے۔ کہ اس نے ہر چیز کو ایک پردہ بنایا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ یہ پردے کو کبھی اٹھا نہ سکا۔ کیونکہ انسانی دماغ مادے سے ماورا تصورات کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتا ہے۔ اگر مشرق میں کچھ لوگ حافظ کے دیوان کا مطالعہ حقیقت کے رنگ میں کرتے ہیں تو اس میں کس کا قصور ہے۔ اگر گوئٹے اور ہائنے نے حافظ کو صرف مجازی کے رنگ میں دیکھا تو علامہ اقبال کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ کم از کم دنیا کے ایک حصہ پر فلاطونی گوسفند کی روحانیت کا رنگ نہیں ہے لیکن وہ اس بات سے بھی خوش تھے۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ حافظ کا مطالعہ صرف مذہبی رنگ میں کیا جائے تاکہ یورپین مغرب اور ایشیائی مسلمان اس کی ایرانی بیکرم کی مخالفت کرے۔ وہ تھی بے ثباتی دنیا کی بات تو اس کی مخالفت تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں کر سکتا ہے جو مادے کو تحقیق سمجھتا ہے۔ کیونکہ اگر مادہ مخلوق ہے تو اس کی ایک ابتدا ہے اور انتہا بھی۔ کم از کم اہل شرع کو تو بے ثباتی دنیا کا ذکر کرنا ہی نہیں چاہیے۔ مسلمان صوفیوں میں تو یہ چیز توحید مطلق ہی کے تلطف کے باعث آئی۔ ورنہ وحدت الوجودی آواز تو ہمیشہ یہی رہی ہے "ہم سے پہلے نہ تو ابد ہے اور نہ ہمارے بعد ازل" حلاج

پھر یہ چیز صرف صوفیوں ہی کے ساتھ کیوں منسوب کر دی گئی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ ہراکلیٹس کے قول کے مطابق وحدت الوجودی بھی اس بات کو مانتے تھے کہ ہر چیز ہے اور نہیں ہے یعنی ہر چیز ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے ؎

ہر قطرہ پانی کے ٹھیک نظر کر — گر میں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے (میر)

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میر)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)

شاید اسی سبب سے بہت سے صوفیوں پر حلولی ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ لیکن ہراکلیٹس کے اس نکتے کو سائنسی طور پر سمجھنے کے لیے نیچرل سائنس کی ضرورت تھی۔ جس سے ایشیا مدتوں تک محروم رہا۔ ناپائدار تغیر و حرکت کو فنا کے ساتھ ہم معنی کر دیا گیا۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہر چیز فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ ایک نئی صورت میں بدلتی رہتی ہے تسلسل زندگی کو ہے نہ فنا کو۔ یہ نکتہ قیامت اور زمان و مکان کے ارضی و سماوی تقسیم نے بھلا دیا۔ صوفی شعرا بھی اس اختلاف کے شکار ہو گئے۔ چنانچہ میر اور غالب دونوں ہی کے یہاں یہ طرفی کا رنگ ہوا نظر آتا ہے۔ دونوں ہی بقا کے راز کو فراموش کر کے فنا کو مقدم کر دیتے ہیں ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا — رفعت
پھرتی ہے اپنے ساتھ لئے منفعل فنا — آب رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ — دبیر
مری ٹھوکر نے تجھ کو کیا برابر خاک — میں نقش پا کی طرح پامال اپنا ہوں — "
مزا ہے خاک ہونا ہو خاک آشنا پھرنا — اس راہ میں ابھی تو دو پیش مرحلے ہیں — "

بہرحال اس تعریف و تحریف کا جو کچھ سبب ہو اس قسم کے انتخابی نمونے سے حافظ کے زمانے سے ان اعلیٰ ہر ایک صوفی شاعر متاثر ہوتا ہے۔ اس قسم کے خیالات کی جتنی مخالفت کی جائے کم ہے۔ لیکن جب ایک مخصوص خیال کو پرچار بنا کر صوفی شعراء کی اچھی باتوں کی بھی مخالفت کی جاتی ہے تو پھر تو جہل کی موافقت مدنظر ہوتی ہے یا اپنے ذہنی رجحان کا تحفظ۔ مثال کے طور پر حافظ کا ایک شعر لیجئے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اس شعر کے بارے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی رائے دے کہ جب حافظ نے یہ شعر کہا تھا تو ترقی پسند تھا لیکن اب رجعت پسند ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اسے یا تو کلاسکی ادب کے جانچنے کی سائنس نہیں معلوم ہے یا پھر وہ لوگوں کو کلاسکی ادب سے متنفر کرنا چاہتا ہے۔ غلامی کے عہد سے لے کر سرمایہ دارانہ نظام تک ایک طبقاتی شعور کے مختلف منازل رہے ہیں۔ اگر آج کے دور کی طبقاتی جنگ میں جس کا شعور بہت ہی حساس تیز اور تند ہے، ہم غلامی کے عہد یا جاگیردارانہ نظام کے ادب کو جانچنے کی کوشش کریں گے۔ تو وہ ہمیں یقیناً غیر معلوم ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کی معنوی افادیت کو اجاگر کرنا خود اپنے ساتھ ظلم کرنے کے برابر ہے۔ کارل مارکس نے یونان کے اساطیری ادب اور شیکسپیئر کو اس نظریے سے نہیں جانچا ہے اور نہ یہ نظریہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں درست ہی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ڈکنس کے ناولوں میں انسان دوستی کا جذبہ طبقاتی جنگ کے تضاد پر غالب آجاتا ہے۔ آپ ڈکنس کو طبقاتی محرک باز کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ڈکنس کی عظمت کم نہیں ہے۔ حالانکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا ہمنوا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ بورژوا انسان دوست کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی دوستی مظلوم طبقے کے ساتھ بہت ہی واضح ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ڈکنس کے ناولوں میں جانبداری محض نہیں ہے تو انسان دوستی ہی کے جذبے کے باعث بھی ڈکنس روس میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ اب آپ ایک پیرس اور آئیے۔ شیکسپیئر کا کوئی بھی ایسا کردار نہیں ہے جس میں اس نے اپنے ہیرو کو مقدر کے ساتھ ہم نوا کیا ہو۔ بلکہ دیگر اس کا کوئی بھی ہیرو تقدیر کی تلخی میں غالب نظر نہیں آتا ہے۔ شیکسپیئر کے ہیرو سوفوکلیز روس کے ہیرو کے شعور کو بیدار نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی شیکسپیئر روس میں پڑھا جاتا ہے اور ڈکنس کے مطالعے میں زیادہ جانبداری حظ کے ساتھ۔ اب آپ ایک پیرس اس سے بھی نیچے آئیے۔ یونان کا کلاسکی ادب اس کا کوئی نقطہ نگاہ یا حس ہی صفحہ نہ ہے۔ آج کی دنیا میں کیا افادیت رکھتا ہے لیکن کارل مارکس ہر سال پڑھتا تھا۔ اور اسے انسانیت کے نازک حسی کے ساتھ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اسی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے یہ کلاسکی جملہ بھی لکھا ہے۔

یہ سمجھ مشکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون و ادب اور اس کے ادوار مخصوص قسم کے سماجی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہاں یہ سمجھنے میں یقیناً دقت ہوتی ہے کہ وہ آج بھی کیوں جانبداری حظ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض معنوں میں ایک ایسا معیار قائم کئے ہوئے ہیں جس کو

حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ یونان کے کلاسیکی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے اپنے خیالات کا اظہار کئی جگہ پر کیا ہے۔ اس سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں کارل مارکس کا نقطۂ نظر کیا تھا چونکہ اس کی حیثیت ہی نگاہیں ایک دور کو دوسرے دور کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے مختلف مثالوں سے بھی واقف تھا۔ اس لیے وہ جمالیاتی حظ دس کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا تھا۔ آخر ادب کا ہمارا تو ایک حسن ہے، جسے مارکس نے ادبی حسن کہہ کر یاد کیا ہے یہ ادبی حسن بقول حافظ ہر کس حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

ہر کہ چہرہ بر طریقت دیدہ وا نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

اگر مارکس کا نظریہ صحیح ہے تو یہ مان پڑے گا کہ حافظ کا شعر نہ صرف ماضی ہی میں ترقی پسند تھا بلکہ آج کی تاریخ میں بھی ہے کیونکہ وہ جمالیاتی حظ کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور جب ہم حافظ کے اس شعر کو مثال کے طور پر پیش کریں تو ہمیں یہ نہ کہنا چاہیے کہ وہ ایسا ہونے تو بہت پسند ہوگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر یوں ہوتے تو نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات انہیں کے لئے صحیح ہے جو ماضی میں ترقی پسند روایات کے حامل رہے ہیں۔ اور جنہوں نے پرانے کے خلاف جنگ کی ہے کیونکہ حسن ترقی کے ساتھ آمیز ہے۔

اب میں حافظ کا ایک دوسرا شعر پیش کر رہا ہوں۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما

یہ واقعی بڑا جرأت پسندانہ خیال ہے کہ جو معما حکمت سے نہ کھل سکے بھلا اسے مطرب کیونکر کھول سکتا ہے۔ غالباً یہی فلسفہ خیام کا بھی تھا۔ پھر بھی خیام نے ایرانی ادب میں مادی اور حسی فلسفے کو جنم دیا۔ لیکن میں خیام کا سہارا ہی کیوں لوں۔

حافظ کے اس جرأت پسندانہ فلسفے کے بارے میں میرا جو آج مدعا ہے وہ سائنس اور مادی علوم کی پرستی ہوئی روشنی کے باعث ہے جب کہ روز بروز مسئلے پر مسئلے کھلتے جا رہے ہیں۔ کیا یہی بات حافظ کے وقت کے لیے بھی تھی؟ اگر آپ حافظ کے وقت کا جائزہ لیں اور یہ بات تیرھویں صدی عیسوی کی ہے۔ جب کہ یورپ میں بھی اندھیرا تھا۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حافظ کے زمانے میں مادی علوم کی تعلیم ہی نہیں ہوتی تھی۔ مدرسوں میں صرف منقولات اور معقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ منقولات کا دائرہ فلسفۃ الٰہیات اور احادیث فلسفۃ الٰہیات سے مادی علوم کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا تھا۔ مادی علوم کے خلاف یہ جنگ تین سو سال پہلے سے ہی جاری تھی۔ اس کی ابتدا معتصم باللہ کے زمانے سے ہوتی ہے جب کہ مادیین رطلف یہ ہے کہ اس وقت وحدت الوجودیوں کو بھی مادیین میں شمار کیا جاتا تھا۔ تو تیغ کر دیا اور تمام مادی علوم کی تعلیم پر پابندی عائد کی گئی۔ اس وقت سے ایران مادی علوم سے دور ہو گیا۔ حافظ کے وقت میں تو خاصتاً فلسفی تعلیم ہو رہی تھی ایسے ماحول میں اگر حافظ نے فلسفی حکمت کی مخالفت کی تو کیا قصور کیا۔

یہاں جب حافظ حکمت کے خلاف دخل کر کے مطرب و مے کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا اشارہ صرف محسوسات کی طرف ہے اور محسوسات علم کے ادنیٰ زینے ہیں۔ انہیں معنوں میں خیام اور حافظ نے حسی فلسفے کو ایرانی ادب میں داخل کیا ہے۔ یہ ایرانی ثقافت کی بازگشت تھی جو ہمیشہ ایک مادی فلسفہ تھا۔

گر می خورید کہ ہست عالم نیست بہ ز دمی

مادیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے پہلے اپنے حواس کی قوتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ مادی علوم اخلاقی منطق کی کوکھ

سے نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یونان کا مادی فلسفہ یونان کی پیگزم سے پیدا ہوا۔ یورپ میں بھی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زمانے میں مفکر جتنے اور ادیبوں کے پیگزم سے بے کان حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ مادی زندگی کی مسرتوں کو ابھارنے، بغیر مادیت کا نظریہ مستحکم بھی نہیں ہوتا ہے۔

حافظ کے سامنے مادی علوم نہ تھے۔ وہ خود امام غزالیؒ کے باطنی بیت کر چکے تھے۔ پھر بھی ان کی شاعری میں ایرانی پیگزم حقیقت نگاری کے روپ میں ابھرا ہے۔ مادی حقیقت نگاری جیسی حقیقت نگاری کے بغیر وجود میں نہیں آتی ہے۔ حافظ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اخلاقی منطق کے خشک طریق استدلال کے خلاف بغاوت کر کے جیسے اظہار حقیقت سے ایرانی ادب کو مالا مال کر دیا۔ کیا یہ شعر و حسن پیدا نہ ہے؟

اس موقعہ پر میرے سامنے علامہ اقبالؒ کے وہ اشعار بھی ہیں جو انہوں نے کبھی حافظ کے بارے میں کہے تھے۔ مجھے مرحوم کی اس تنقید سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک حافظ کے فلاطونی گوسفند ہونے کا تعلق ہے، ہر وہ شخص فلاطونی گوسفند ہے جو مادے کو مخلوق سمجھتا ہے۔ پھر یہ کون سمجھائے کہ حافظ، صبا، گیسو اور مے و ساغر میں کیا فرق ہے۔ کیوں ایک سے خطرے کا خطرہ کیا جاتا ہے اور دوسرے کو رام بتایا جاتا ہے کیا اس خیال سے کہ حافظ زیادہ ایرانی اور رنگین ہے۔ تیسری بات اور بھی پیچیدہ نظر آتی ہے علامہ اقبالؒ عرفی کی تقلید کے لیے جایت کرتے ہیں اور عرفی حافظ کی شاعری پر اپنا ایمان رکھتا ہے۔

گر خدا دعوی ہوس داری و در چشم سخن　　بندگی حافظ شیرازی بایست کرد　　(عرفی)

ان تمام باتوں میں علامہ اقبالؒ نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ ہے حافظ کی جادو بیانی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں اس کا حاصل کرنا مشکل ہے اس کی لذت خطرناک بھی ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کو سہل انگاری سے روکتی ہے۔ انہیں بار بار دعوت دیتی رہی ہے۔ کہ خیالات کو صرف نظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ شعر ایک تخلیقی پیکر ہے جو صورت و معنی کے جدلیاتی طریق کار سے ابھرتا ہے۔

پھر کیا عجب کہ کچھ لوگ حافظ سے اس بری طرح متعصب ہو جائیں کہ اگر غزل کے انتخاب پر بات کرنی ہو تو وہ حافظ کا تذکرہ کریں شاید اس لیے کہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

اب دیکھنا ہے کہ ان تعصبوں کا بنیادی سبب کیا ہے جو ذاتی اغراض و مقاصد سے آزاد ہے۔ ہر ملک کے ادب کے ساتھ اقتصادی ارتقاء کے سمجھنے میں ہوتی ہے۔ مغرب کا تاریخی ارتقاء اور وہاں کا اجتماعی شعور ہمیشہ کے لیے بھی اقتصادی طبقاتی شعور سے آگے بڑھا ہم مغربی تاریخ کے شعر و ادب کا کچھ پر مغربی تاریخ کا عکس نہیں کر سکتے اور نہ ہم تاریخ کے مختلف ادوار کو اس طرح خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ گویا ایک کا تعلق دوسرے دور سے تھا ہی نہیں۔ اکثر اوقات ہم میکانکی طور پر غلام تہذیب کی پیٹھ پر جاگیردارانہ نظام اور اس کی پیٹھ پر سرمایہ دارانہ نظام کی اینٹ چنے ہوئے پیچھے جاتے ہیں۔ اور ان تینوں دور کو ایک معنی میں ایک عہد (epoch) سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ذرائع پیداوار اور تہذیب کے مادی وسائل کے بڑھنے کا اور ترقی کرنے کا تعلق ہے ایک دور کو دوسرے پر برتری حاصل ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ غلام کے مقابلے میں کھیت مزدور اور کھیت مزدور کے مقابلے میں مل مزدور کی آزادی نسبتاً آگے بڑھتی رہی ہے لیکن ذرائع پیداوار پر ایک مخصوص طبقے کے تصرف حاصل کر لینے سے غلامی کا دور ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ طبقہ استحصال کی بنیادوں کو ختم نہ کر دے۔ یہی سبب ہے کہ مارکس نے ان تینوں ادوار کو ایک عہد (EPOCH) کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ پورا عہد غلامی کا عہد ہے۔ اس میں استحصال کی شکلیں

تو ضرور بدلتی رہی ہیں لیکن استحصال ختم نہیں ہوا ہے۔ انہیں معنوں میں اشتراکی انقلاب اپنے ماسبق کے انقلاب سے بہت ہی مختلف ہے یہ فرق ایک بنیادی تبدیلی کا ہے۔ اشتراکی انقلاب کی یہ بنیادی خصوصیت اس طبقاتی شعور کا نتیجہ ہے جسے بورژوا نظام نے بہت ہی تیز کر دیا ہے۔ آج بورژوا نظام کے طبقاتی شعور میں جو تیزی اور تندی ہے اگر اس کی بنیاد پر آپ جاگیردارانہ نظام کے طبقاتی شعور کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی ناکامی ہوگی۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ جاگیردارانہ نظام میں طبقاتی جنگ یا طبقاتی شعور نہ تھا۔ اس سے صرف اتنا مراد ہے کہ اس وقت طبقاتی شعور اتنا آگے بڑھا ہوا نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ کیونکہ اس وقت تک ہونے والے اور ہونے جانے والے طبقوں کا تضاد اتنا گہرا نہیں پایا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے بہت سے دبے ہوئے تضاد کو سرمایہ دارانہ نظام نے ابھارا ہے اور بہت سے اس نظام کے دبے ہوئے تضاد کو اشتراکی نظام نے ابھارا ہے۔ میں وضاحت کے لیے ہندوستان کی تاریخ سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہات کی زمینوں پر کسانوں کا قبضہ تھا۔ بظاہر زرعی پیداوار پر تصرف انفرادی تھا۔ لیکن وہ اپنی محنت سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا پاتے تھے۔ کیونکہ پیداوار کا ایک تہائی یا چوتھائی حصہ وہ جاگیردار کو بھی دیتے تھے۔ یہاں چونکہ زرعی پیداوار پر براہ راست تصرف جاگیردار کا نہ تھا اس لیے جاگیرداروں اور کسانوں کا طبقاتی تصادم بھی اتنا شدید نہ تھا جتنا کہ انگریزی راج میں ہوا۔ انگریزوں کے آنے سے یہاں کے طبقاتی تعلقات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے دیہات کی اجتماعی زندگی کو تباہ کر کے زمینیں محصول جمع کرنے والے یعنی زمینداروں کو دے دیں۔ اب زرعی زرائع پیداوار پر براہ راست تصرف زمینداروں کا ہے۔ کیونکہ وہ انہیں بے دخل بھی کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کی زرعی تحریکیں بھی ہوتی ہیں اور ان کا طبقاتی شعور بہت بیدار ہے۔ آج کی ایسی شعوری آگہی جاگیردارانہ نظام میں نہ تھی۔ لیکن طبقاتی کشمکش تو تھی ہی یہ بات صحیح ہے لیکن اس کشمکش کا اظہار شاہی سیاست میں ہوتا ہے۔ ایلگز کہتا ہے کہ تمام انقلابی عناصر جو جاگیردارانہ نظام کی تہوں میں گھستے تھے وہ سب کے سب شاہی طاقت کی طرف راغب ہوتے تھے۔ اور آخر الذکر ان کی طرف راغب ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں جب ہم جاگیردارانہ نظام کی سیاست اور طبقاتی شعور کا پتہ چلانے کی کوشش کریں تو ہمیں بادشاہوں کی سیاست کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ یہ راستہ کافی مشکل ہے یہاں سر جھکانے کی ضرورت پڑتی ہے ہمیں جعلسازی میں کسی بھی استحصالی طبقے کے منظر کی تنقید قبول نہ کرنی چاہیے کیونکہ وہ اپنے مخالف طبقے کی بدی کھوجنے میں تو بہت ہی کامیاب رہتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت کی تہوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ اس کا استحصالی رجحان حقیقت تک پہنچنے میں ایک پردہ بن جاتا ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات ہوئی ورنہ ختم طرفی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ میر اور غالب کی شاعری میں کسانوں کی بغاوت اور پلاسی کی جنگ کا تذکرہ نہیں ملتا ہے تو انہیں رجعت پرست کہہ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ میکانکی تصور ہمیں دوسری قسم کی خطاؤں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہم اشتراکی اور فیوڈل نظام کو دو چیزوں میں رکھ کر موازنہ کرنے لگتے ہیں اور جب چیزوں کا پتہ چلتا نظر آتا ہے تو پھر ماضی کی حسین روایات پر بھی ملامت کی نظر ڈالنے لگتے ہیں۔

ماضی کی حسین روایات کو حقارت سے دیکھنے کا یہ جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے۔ اور تاریخ کو وہی مٹاتا ہے۔ جس میں کچھ احساس کم تری ہوتا ہے۔ وہ تمام ادیب اور شعراء جو اپنے فن کو اس حد تک چمکا نہیں سکے ہیں کہ اپنے کلام میں بھی ایک ابدی حسن پیدا کر سکیں۔ ماضی کی حسین روایات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ ابدی حسن کا وہ ہمہ ہی ختم ہو جائے۔ پھر تو نام کے لیے میدان خالی رہ جاتا ہے۔

یہ ابدی حسن صرف یونان کے کلاسکی ادب ہی کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور کی بہترین ادبی تخلیقات کے بارے میں صحیح ہے۔ ہر دور کے ادب کا نہ صرف مواد ہی بدلا ہوا ہے۔ بلکہ ہیئت بھی بدلی ہوئی ہے۔ پھر بھی ان کے باہمی امتزاج سے جو حسن پیدا ہوا ہے وہ سب کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا۔ اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہمیں ادب کے مقتضیات کا پتہ چلانا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ ادب مخصوص قدروں اور خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تبلیغ کا اثر وقتی ہے یا دیرپا۔ وہ ہمارے جذبات اور خیالات کو متحرک کر کے ایک دیرپا عمل کی تخم کرتا ہے۔ یا صرف وقتی جوش میں ڈال کر چھوڑ دیتا ہے وہ ہمارے احساسات اور نفسیات کی جوابی صلاحیتوں کو چھوتا ہے کہ نہیں۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ نہیں کہ وہ ہماری نفسیات پر اثر انداز ہو کر ہمیں حالات کے بدلنے اور خود اپنے کو بدلنے میں مدد کرے۔ اور ہماری نفسیات کو نئی قدروں سے ہم نوا کر کے ایک نئی جذباتی تنظیم بھی کر سکے۔ اگر یہ قوت اور صلاحیت کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قصہ ماضی کی حسین روایات کا نہیں ہے یہ اس کا اپنا المیہ ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے نیا ذات اور جذبات کو ایسے زندہ اور متحرک سانچوں میں ڈھال سکے جن کی بازآفرینی سے ہمارے اندر حیات نو پیدا ہو جائے۔ مشاہدے اور تجربے کی بنا کہانیاں لکھنے لگیں اور قدم قدم پر صداقت کی داد دیتی جائیں۔ یہی وہ مناسبت ہے جس پر پل کر ہم عوام کو نئے خیال اور نئے معرکے کی طرف اکسا سکتے ہیں۔ یہ آسانیاں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ شاعر کے مشاہدے اور سچائی کو اپنے ذاتی تجربے کی سطح پر محسوس نہ کریں اور انہیں لفظوں، تشبیہوں اور تصویروں کے ذریعے محسوس نہ کریں جن سے ان کے حواس آشنا ہیں۔ یہاں ہمیں عوامی ادب اور ماضی کی روایات سے بہت سے چیزیں مستعار لینی پڑیں گی۔ یہ کام چھیننے اور جھپٹنے سے زیادہ چھننے اور نپانے کا ہے۔ تقریر کا کام وقتی ہوتا ہے۔ لیکن ادبی شہ پارے کا اثر دیرپا ہوتا ہے وہ انسانی ذہن میں رینگتے رہتے ہیں۔ ہمیں بار بار اکساتے اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ترغیب عمل میں ایک ایسی پائداری ہوتی ہے جو کہ وہ اس کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ ایسا ہی ادب پھانسی پر جھولنے کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ یہ مرتبہ تقریر کو حاصل نہیں ہوا کرتا ہے۔ شعر و ادب کی تخلیق تصورات کی بازآفرینی نہیں بلکہ از سر نو تخلیق کرنے کا کام ہے۔ اس پرانے طریق کے مادی مبادیات میں جنہیں تفصیلات میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ انہیں معنوں میں یہ معجزہ بھی نہیں ہے۔ اس طریق کار کے سمجھنے میں مشاہیر علم و ادب کے کلام کا مطالعہ بہت سی مدد کرتا ہے۔ گورکی کا ادب نظیر کے ادب سے بنیادی طور پر مختلف ہے تاہم اس نے نظیر سے لکھنا سیکھا۔ چیخوف کا فن کسی حد تک حزن و یاس اور افسردگی کے جذبات کا حامل ہے۔ پھر بھی گورکی کو یہ کہنا پڑا کہ میں جب تمہارے فن سے اپنے فن کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نظم سے نہیں بلکہ بانس سے لکھ رہا ہوں۔

یہ ایسی مثالیں ہیں جو شعر و ادب کی تخلیق میں سنگ میل بن سکتی ہیں۔ اور اگر انسان محنت کرتا رہے تو وہ اپنے فن کو مانجھ بھی سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صرف اسی راستے سے صحیح ادبی تخلیق تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اسے عوام کی زندگی سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور جب وہ یہ کام زندگی کے کسی انقلابی موڑ پر انجام دیتا ہے تو اسے ماضی کی روایات کو بھی جگانا پڑتا ہے۔ وہ ماضی سے لفظ، نام اور مانوس سب قرض لیتا ہے تاکہ وہ نئی حقیقت کو عوام کے محبوب قالب میں ڈھال کر کے۔ آج کا انقلابی شاعر جس حد تک اس حقیقت سے دور ہوتا جائے گا عوام سے بھی دور ہوتا جائے گا۔

اچھا شعر لیکن خبر رکھنے کے برابر ہے اپنی ذاتی پہلو اور زیادہ محنت کرنی چاہیئے۔ لوگوں کو حسن کے معیار ہی سے برگشتہ کر دینے کی کوشش کرنی چاہیئے

فراق کے خطوط

بنام محمد طفیل ایڈیٹر نقوش

(۱)

۴ بلاک روڈ، الہ آباد
۱۴ فروری ۱۹۵۳ء

برادرم طفیل صاحب، تسلیم۔

ایک مدت ہو گئی جب آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ میری بدتوفیقی دیکھئے کہ خدا خدا چار ماہ بعد جواب لکھنے بیٹھا ہوں، اور کئی برسوں سے میرے لیے بڑی مصیبت یہ ہو گئی ہے کہ میرے پاس جتنی جاری ڈاک آتی ہے اس کا جواب دینا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے خطوط تو میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن بہت سے خطوط ایسے بھی آتے ہیں جن میں جناب خوص و محبت کی باتیں تو لکھتے ہیں لیکن جنہیں پڑھ کر محض تھکاوٹ سی محسوس کرتا ہوں۔ شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ پھر میری حیثیتیں بھی کئی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی تمام حلقوں سے خطوں، فرموں، ناشروں کے مضامین، پیغامات، اصلاح سخن کی مانگیں آتی رہتی ہیں جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر طلبہ اور مقررین کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے کالجیٹ کی ذمہ داریاں، انگریزی نکرے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ڈاک صرف امیدوں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ ایک بیم کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی خرابی، نیم خوابی، سودائی مزاج کی وجہ سے مصیبت کا احساس، الجھن اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آ جانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام باتوں میں مبتلا ہوں، بہرحال کام میں لگے جا رہا ہوں اور اپنے آپ کو ایک ادیب کے فرض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں۔ عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی تربیت دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو جو طوفان اٹھتے رہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر ہلچل مچا دیں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا سکون و توازن قائم رکھیں۔

آپ نے ایک سانس میں کئی باتیں کہہ دی ہیں۔ لیکن میں سانس لے لے کر بھی سب باتیں کہنا چاہوں تو بھی آپ کی ساری باتوں کا جواب مشکل ہے۔ بہرحال آپ سے کچھ کہے بغیر جان چھڑانا بھی مشکل ہے۔ اس لیے آج یہ عرض کیے دیتا ہوں۔ کہ مجھے شعر کہنے کے لیے

کسی خاص ماحول یا موڈ کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں ؟"

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق وسطی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس طبقے کی اچھی بُری باتیں خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خدوخال ہیں اور جو مجھ کو اپنے ہم چشموں سے ممتاز کرتی ہے۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ مذہبی تھا۔ اور فطرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے مدہوش کر دیتی تھیں اور عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظر قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ میں ان میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست مغائرت محسوس کرتا تھا۔ کہ گھر والے تعجب کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا۔ بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے لیے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا۔ نو دس برس کی عمر سے جس لڑکی یا لڑکے، مرد یا عورت کو اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ میرا جسم بلکہ میری ہڈیاں تک پگھل کر رہ جائیں گی۔ شعوری طور پر احساس حسن سے برانگیختہ ہونے والی حسیت میرے اندر سن بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ میں گیتوں کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دے جاتی اُن سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا پُرا گھر تھا اور ٹوٹ کر سب سے ملتا تھا۔ پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساس تنہائی پاتا تھا۔ مجھے ہاتھوں پر بھی بتا دوں کہ بچپن میں ہر ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں ان کے حسن اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور بداسلوبی سے بدمزہ ہوتا تھا۔ اس طرح زندگی کے سترہ، اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی بھری تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہار جذبات کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ اور شعر گوئی کی خواہش گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہ گھٹن میرے لیے بسا اوقات مصیبت بن جاتی تھی۔ لہٰذا اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی صورت بالکل وہی تھی بلکہ اس سے بھی گئی گذری جو ان لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا۔ اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی ان پڑھ انسانوں سے میری بیوی میں کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا۔ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شدید حس بری کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔ یہ ضرور ہوا کہ سال بھر تک مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چوتھے دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا۔ اس لیے کالج اور یونی ورسٹی کے امتحانوں میں بہت اونچی پوزیشن میں پاتا رہا۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد منشی لڑکھ پرشاد حیرت گورکھپوری جو شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے انتقال فرما گئے اور ایک بھی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر پر آ گئے۔ پی سی ایس اور آئی سی ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بیوی اور بے دماغی نے مجھے انکار اس بنا پر کیا تھا۔ کہ میں

دونوں سے مستفنی ہو گیا۔ ان کیفیت وہ اور کرب آگیں حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا میرا داخلی موڈ اور خارجی ماحول تو بچپن ہی میں بن گئے تھے۔ اب جب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے ذہنی خلوص کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی پُرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا۔ اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ ادھر پو پھٹی اور ادھر غزل کا مقطع ہوا۔

اجلے اجلے سے کفن میں سحر شام فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی معنویت جس طرح میرے اشعار میں فضا باندھتی ہیں وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے شاعرِ نیم شبی کہا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر لکھنے کے پچیس برس بعد میں نے یہ رباعی کہی۔

دن ڈوب گیا تو بات کچھ اور بھی ہے
آنکھ اوجھل وارداتِ کچھ اور بھی ہے
خاموشی و تیرگی و خنکی کے سوا
اے انجم و ماہ رات کچھ اور بھی ہے

آدھی رات اور جھلکیاں کے عنوان سے میری دو نظمیں رات کی ترجمانی اور مصوری کی مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ میرے پورے کلام میں رات کے متعلق صدہا اشعار اور رباعیاں بکھری ہوئی ملیں گی۔ یہ خط اپنے اس متعلق کے ساتھ ختم کرتا ہوں ۔

فراق دیکھ شبِ غم گداز قلبِ نجوم
چھڑا ہوا ہے سکوتِ ابد کا افسانہ

کچھ اور اشعار یاد آگئے ۔

تاریکیاں چمک گئیں آوازِ درد سے — میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے — آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

جب سانسوں کو چھوتا ہوں راتیں رُکنے لگتی ہیں — ظلمات کے سینے میں ہم میں روز چراغاں کرتا ہوں

اب دور آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے — اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

اچھا اب رخصت چاہتا ہوں۔ لیکن رخصتی سے پہلے اتنا پوچھنا چاہتا ہوں، کہ ایکا ایکی آپ کو میرے بچپن اور میری ذات سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ان باتوں کا صاف صاف جواب دیجئے گا، تو میں بھی صاف گوئی پر آسانی اتر آؤں گا۔

ایک بگڑتی ہوئی غزل حاضر ہے۔ اپنی رائے سے ضرور اور جلد مطلع فرمائیے گا۔ اس لیے کہ شاعر ہر وقت داد کا محتاج ہے، اور مجھے تو میرے فن نے باقی شعراء سے کچھ زیادہ ہی بھوکا بنا دیا ہے۔

آپ کا

فراق

کمزور میری صحت اب کسی طرح سنبھل نہیں سکتی۔ اگر کچھ دن جیتا بھی رہا تو اسی نظر میں جیتا ہوں گا کہ اپنا مجموعۂ کلام اور دیگر تصانیف کسی ایسے ناشر کو سونپ دوں جو میرے اس حاصل زندگی کو ضائع اور تباہ نہ ہونے دے

---

(۲)

۴ بیچک روڈ، الہ آباد

۲۳ فروری ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

کبھی تو آپ بھی میری طرح ڈوب جاتے ہیں اور میں جواب کی راہ تکتا رہتا ہوں۔ لیکن اب کے آپ نے بڑی جلدی جواب دیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے ہی سے جواب لکھ رکھا تھا۔ غزل کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ! البتہ مجھے آپ کی یہ بات کھٹکی، کہ ایک شعر وزن میں نہیں۔ علامہ آزاد لکھنوی صاحب (اسے ایک بار پھر پڑھیئے، نہ تو اس شعر کو کاٹیے گا اور نہ ہی خود ترمیم کیجئے گا۔ مجھے وہ شعر لکھ بھیجئے۔ میں خود اس کی نبض دیکھوں گا۔ آپ نے پہلے تو غزل کی بڑی تعریف کی۔ اور میں بڑا خوش ہوا کہ میرے کلام کو میری ہی طرح اور بھی عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات سے رہ گئے۔

آپ میرے حالات زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہیں، تو میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ آپ کی باتوں کا جواب لکھتا رہوں۔ اور اس طرح چار مہینوں کا سکوت اٹھا تو دوں۔

میری زندگی کے داخلی اور خارجی ماحول پر زیادہ تر بھی کچھ روشنی تو میرے پہلے خط سے پڑی ہو گی۔ اس خط میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کن محرکات و مقاصد کے زیر اثر میں شعر کہتا رہا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ اردو ہی زندگی کے عذاب ہو جانے کے بعد کیا میری کوئی حقیقی زندگی بھی رہی ہے۔ اور اس کا میری شاعری پر کیا اثر رہا ہے ——— میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا ہوں۔ کہ زندگی کے خوش گوار اور ناخوش گوار حالات و تجربات کا ایک سچا جمالیاتی احساس حاصل کیا جائے۔ زندگی کا ایک وجدانی شعور حاصل کرنا،

وہ آسودگی اور طمانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے دکھ سکھ دونوں نامکمل رہتے ہیں۔ یہی احساس میرے محرکاتِ شعری رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اجتماعی زندگی کی کچھ بلند قدریں ہوتی ہیں۔ پھر تمام انسانیت کی زندگی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس زندگی کی کچھ ارتقائی قدریں ہوتی ہیں۔ قومی زندگی اور عالم گیر زندگی کی ان قدروں اور ہندوستان کے پھر کے مزاج کو اپنی شاعری میں سمونا ملکی اور عالمی زندگی کے پاکیزہ محرکات کو گویائی عطا کرنا ہی میرا مقصد شاعری رہا ہے۔ اردو شاعری میں بہت سے محاسن کے باوصف بہت سی بلند چیزوں اور قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں لوں گا۔ حالی اور اقبال کی حالی کا دل بہت نرم ہے۔ نیکی اور شرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن گہرا یا بلند تفکر یا فلسفیانہ دماغ ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اقبال کے یہاں بدرجۂ اتم ملتی ہیں۔ لیکن بدنصیبی سے ایک جنگجوئی کا جذبہ بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ اور طاقت یا قوت خواہ کسی طرح کی بھی ہو اس کے لیے ایک ادھی پرستش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ جنگیں جتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک سنگین کو خلقی مزاج کا اثر ان کا کلام پڑھ کر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسلامی قوت کے تصور کی زنجیروں میں ان کی شاعری جکڑی ہوئی ہے۔ شاعری میں میری کوشش بہت دنوں تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہی اور کافی دنوں تک تو اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو کمزور کیے بغیر اور افلاطونی محبت یا عشقِ حقیقی سے قطع نظر کر کے جنسیت کو زیادہ سے زیادہ دے سکوں۔ اور اسے اس حسن سے مالا مال کر سکوں۔ عشق کے غم و نشاط اور حسن کے تصور کی تہذیب و تالیف مزدوج ہی سے میری کوشش تھی۔ عشقیہ شاعری کو سطحیت، تعمق، خشونت، مغائرت اور چھوکے پن سے بچانا۔ اور اس میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدریں سمونا یہی میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً روسو تھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے۔ سنسکرت ادب کے کارنامے، فارسی ادب کے کارنامے۔ مجھے برابر متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اردو شاعری، جذبات و خیالات کے معاملے میں اور معیارِ شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اردو ادب سے متاثر رہی ہے۔ اتنا اردو شاعری سے متاثر نہیں رہی۔ البتہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ میں اردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں۔ اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثراتِ زندگی کی زبان جیتی جاگتی شکل میں اجاگر ہو پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ قادر الکلامی ایک طرح کا عجز بیان ہے۔ کیونکہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے حدود منطقی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے۔ جس کے لیے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصد شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اردو کے شعرا کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا انصاف بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد سے میری متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اشتراکیت کے فلسفہ میں عمل کے جو معنی ہیں وہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے عمل کے فلسفوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب میری کوشش ایسی نظموں میں ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقاء کی روشنی میں پیش کروں۔ محض شگفتہ ہونا یا زندگی جیسی ہے اس سے متاثر ہونا، قومی پھر اور قومی مزاج کے

تصور پر وجد کرنا سے اب میں نالائی سمجھنے لگا۔ اب دنیا اور زندگی پر وجد کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تصور میرے اندر کارگر ہونے لگا۔ دنیا کو بدل دینے کے عالم گیر عمل اور عوام عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت، دور رسی اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں اجاگر کرنے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے ——— جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا کہ میرے کن کن سے تعلقات رہے ہیں۔ ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے۔ جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں، جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں، اگر ان باتوں کا پتہ چلنا ہو تو میری غزلوں، رباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا چاہیئے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ محبت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔ اب بھی تہذیبی حالات کے باوجود صورت حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے عشق سے متاثر ہونے کے موقعے تو ملے ہیں لیکن ان سے عشق بہتنے کے موقعے نہیں ملے ہیں یا بہت کم ملے ہیں۔

پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس تعلق کو وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے جو چیز اس محبت کو بلند کرتی ہے وہ وہی ہے جو معمولی جانوروں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے یا معمولی آدمیوں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے ایک حساس اور دہے ہوئے دل و دماغ والے انسان کی جنسی زندگی کو داخلی طور پر مختلف بناتی ہے۔ جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں حلول کر جائیں۔ اور اس کے مستقل کردار کا جزو بن جائیں۔ اور جب جنسی خواہش کے مقابلے میں احساس جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ گہرا ہو جائے، تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے ——— کیا میرا عشقیہ کلام آپ کو یہ احساس کراتا ہے کہ جنسیت اپنی تمام کثافتوں سے پاک ہو کر میرے شعور اور کردار کا جزو لطیف بن گئی ہے؟

معاف کرنا میں نے اس خط میں خواہ مخواہ "خطیبانہ رنگ" اختیار کر لیا۔ آپ تو بعض اوقات ایسی اٹل سیدھی باتیں کر دیتے ہیں جو ہم نازک مزاجوں پر گراں گزرتی ہیں۔ اگر آپ پر میرا یہ لکھنا گراں گزرا تو آپ سے معذرت چاہنے میں بھی لطف آئے گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے لاہور بلائیں اور میں نہ آؤں۔ البتہ موسم کا وعدہ میں نہیں کرتا۔ آپ ان سے براہ راست خود کتابت کریں۔ میں بھی لکھ دوں گا۔ اور آپ کس کس کو جا رہے ہیں۔

آپ کا

فراق

(۳)

۲ جینک روڈ، الہ آباد
یکم مارچ ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم۔

آپ کا طویل خط ملا، شکر ہے کہ آپ دو سطری اشاروں سے آگے بڑھے یا تو قائل ہو جیئے یا کچھ، بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ صاحب میں آپ کی اتنی سیدھی باتوں پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، میری باتوں پر بے شک ایمان نہ لائیے۔ لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کیجیے، اور نہ میں آپ کے جوابوں میں الجھ جاؤں گا۔ اور بات آگے نہ بڑھ پائے گی۔ اور پھر آپ مجھے یہ طعنہ دینے بیٹھ جائیں گے کہ میں الفاظ کے جادو سے قائل کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایٹم بموں کو تو خدا بھی قائل نہیں کر سکتا (خدا کا لفظ محاورے کے لیے لیا ہوں) اور میں تو ایک شاعر ہوں۔

اچھا ان باتوں کو چھوڑ دیجیے اور یہ دیکھیے کہ مجھے اچھے خطوں میں اپنے نفسیاتی تجزیہ کی دیانت دارانہ کوشش میں ہفت خواں طے کرنا پڑا کہ میں، جنسیت شہوانی تلذذ، عشق انسانی بہبودی اور ترقی، انسانیت کا صحیح نظریہ یا یوں کہیے کہ عشقیہ دلچسپیوں کے ساتھ غیر جنسی اور غیر عشقیہ اہم امور و مسائل میں دلچسپی ان تمام چیزوں اور رجحانات یا محرکات کو اپنے کردار میں سونا اور اتنے مختلف اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی شخصیت کی ایک پوری، گاڑھی بنانا، ان مختلف اجزاء میں ہم آہنگی پیدا کرنا یہی کوشش رہی ہے۔ اس خط میں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری عشقیہ شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ ۱۹۳۶ء کے قریب میرا رجحان اشتراکیت کی طرف ہونا شروع ہوا۔ لیکن جیسا پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ لڑکپن ہی سے حسن پرستی کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملی ہوئی میرے اندر کچھ اور صفتیں بھی تھیں۔ یعنی زندگی کی اعلیٰ قدروں، نیکی، خلوص، ہمدردی، شرافت، انسانیت دوستی، علم پرستی، حقیقی عظمت پرستی اور بعد کو اشتراکیت کا علم ہونے کے پہلے سے سچی وطن پرستی اور ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی عظمت کا احساس یہ تمام چیزیں میرے اندر کارفرما تھیں۔ اس لیے شروع ہی سے میری عشقیہ شاعری میں یہ تمام محرکات و اقدار اس طرح کارگر ہوتے رہے کہ عشقیہ جذبات میں شرافت اور تربیت یافتہ انسانیت کے عناصر گھل مل گئے۔ جنسیت یا عشق اگر محض جنسیت و عشق ہیں۔ تو تھوڑی سی اچھی عشقیہ شاعری کو یہ جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن بلند عشقیہ شاعری اس آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جو زیادہ جنسیت یا زیادہ عشق تک اپنی دلچسپیاں محدود رکھتا ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ اور نئی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر بیدار مغز روشن خیال ہندوستانی کی زندگی محض انفرادی دلچسپیوں کی حدیں توڑ رہی تھی۔ اور یہ عمل عشقیہ شاعری پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ قومی زندگی میں ایک بڑا پن آ رہا تھا۔ اس لیے ہماری عشقیہ شاعری میں بھی ایک بڑا پن آنے لگا تھا۔ رائج اور اکیلا انحطاطی دور ختم ہو رہا تھا۔ خود میری زندگی میں عشقیہ محرکات کے ساتھ ساتھ جو دوسرے اچھے محرکات تھے۔ اور قومی زندگی میں جو نئے اقدار بن رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر میری عشقیہ شاعری کو پروان چڑھایا ——— پھر ۱۹۳۶ء سے اشتراکی فلسفہ نے میرے عشقیہ شعور اور میری عشقیہ شاعری کو نئی وسعتیں اور نئی معنویت دی۔ یہ حقیقت دہرانے کی ضرورت ہے کہ صرف جنسیت

زندگی اور عشق زندگی نہ جنسیت کو چھا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں قومی زندگی کی بیداری نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ لوگ ترقی پسندی کو بلند پایہ اور موثر عشقیہ شاعری کا دشمن غلطی سے سمجھ بیٹھے تھے۔ اجازت دیجئے کہ میں یہاں اپنے کچھ عشقیہ اشعار پیش کروں ؎

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ — ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے — اسی کے نقش کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

فرش سے خانہ پہ چلتے چلتے جاتے ہیں چراغ — دیر ہی ہے تری آہستہ روی اے ساقی
خاک میں چوٹ دبی تھی یہ نہ جانے کب کی — رنگ پیمانہ لہو دینے لگی اے ساقی

زندگی کو بھی مزہ دیتا ہے — دو چلے تیرے بیقرار ہوئے

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے — کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

ہر گردشِ چشم آئینہ گردشِ دوراں — ہر ایک ادا موجِ شرابِ طرب آگیں
آفاقِ تعارف ہی میں صد قربتِ پنہاں — پہلی ہی نگاہوں سے عیاں الفتِ دیریں
موسیٰ نگہِ ناز سے ان لفظوں کا اٹھنا — میں صاعقۂ طور ترے ساعدِ سیمیں
وہ ہر نفسِ حسن میں خوشبوئے محبت — وہ رنگِ گلِ افشانی لبِ لالہ رخاں میں

خوفِ طوالت سے میں اپنی عشقیہ جمالیاتی نہ بیان یا نظمیں پیش نہ کروں گا۔ اور نہ غزلوں سے زیادہ اشعار کی مثالیں دوں گا لیکن مندرجہ بالا اشعار پر اگر آپ غور کریں گے تو دو حقیقتیں کھل جائیں گی۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی سماجی سیاسی یا کوئی غیر عشقیہ یا افادی خیالات یا عناصر نہیں ہیں۔ یہ خالص یا سو فی صدی عشقیہ شاعری ہے۔ لیکن بغیر علمی اخلاقی سماجی اور سیاسی محرکات کے یہ عشقیہ شاعری ممکن بھی نہیں۔ جنسِ عشق، زندگی کی دوسری دل چسپیوں سے دست بردار ہو کر یا گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جانے کے بعد یا تو جنون میں مبتلا ہو جائے گا یا نامرد ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے اردو شعراء جسمی لحاظ سے نامرد نہیں تھے۔ لیکن چونکہ زیادہ تر یہ شعراء وسیع دلچسپیاں نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی عشقیہ شاعری میں وہ قوت یا زندگی نہیں ہے، جو ان شعراء کی عشقیہ شاعری میں ہے، جو حیات و کائنات میں بھی دل چسپی رکھتے تھے، مثلاً میر، آتش، غالب۔

تو عشقیہ شاعری میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ اعتراف و صداقتِ جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت کیفیت ہمہ گیری و انفعالیت

صنوتیت، تخلیق فضا اور زبان و بیان میں ایک عالمگیر لہجہ، انسان کے دل کی دھڑکنیں اور ایک آفاقیت پیدا کر سکوں۔ فنی محاسن اگر آئیں تو انہیں صفات اور مقاصد کو اجالنے اور چمکانے کے لیے آئیں۔ دنیا بھر کا عشقیہ ادب ہر مرتبے کا ہے۔ معمولی اوسط درجے کا اور بلند مرتبہ، آخر الذکر آفاقی ادب سے استفادہ کرنا بھی میرا مقصد رہا ہے، اور اس طرح عشقیہ شاعری کے لہجے میں زندگی بلندی اور پاکیزگی پیدا کرنے میں مجھے کافی مدد ملی ہے۔ شخصیت اور شاعری صرف اپنے بوتے یا اپنے سہارے ہرگز بلند نہیں ہو سکتیں دونوں بلندیاں اخذ کرتی ہیں، تہذیب انسانی سے، ہر شخص کی بلند شخصیت اور ہر شاعر کی بلند پایہ شاعری دوسروں کی دین ہے بات صرف اتنی ہے کہ ہر خاص و عام اس دین کو حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک اور تخلیقی عنصر سمونا چاہا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لا کر فطرت یا حقیقت پر ایمان لاؤں۔ یوں تو میری عشقیہ شاعری میں دکھ، درد، غم آنسو، اضطراب، ناکامی، سبھی کچھ ہے۔ لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزاری نہیں ہے۔ بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہنچاتا ہے۔ تصوف کا سہارا لیے بغیر مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقاء پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے بیس برس پہلے تک جینیت اور تصوف کا کچھ اثر ضرور رہا ہے۔ لیکن عنصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا ہمہ وقت احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے

بہت اچھا جب لاہور آؤں گا، تو آپ مجھ سے باقی باتیں پوچھیے گا۔ یہ خطوں کا سلسلہ بڑا دوسرا ہے۔ جوش صاحب کھنڈ کے مشاعرے میں آئیں گے۔ تو میں بھی ان سے بات کروں گا بات کیا کروں گا بلکہ بات پکی کر دوں گا۔

آپ نے اندازے کے سلسلے میں جو رقم بھیجنا تھی، وہ اب تک نہیں پہنچی۔ براہ کرم اس کا بھی خاص خیال رکھیں۔

آپ کا

فراق

(۴)

۳ ہیلک روڈ، الہ آباد

۳ جولائی ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم۔

آپ نے اپنے خط میں یہ کیا لکھ دیا کہ میں نے عشقیہ شاعری کے پردے میں بعض بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں میں نے بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ تو آج ضرور ذرا کھل کر باتیں سن لیں۔ تاکہ میرا یہ بہکنا جذبہ یا نہ صدق بے مثال بن جائے ——— یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ میں جنسی موضوعات پر آ کر پھسل جاتا ہوں۔ بلکہ میں بعض اہم شخصیتوں پر آزادانہ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

اچھا تو سنیئے۔ آغاز شباب سے لمبی زندگی پانے والوں کی بھی عشقیہ یا جنسی زندگی زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس تک قائم رہ سکتی ہے۔ یعنی مدیا نوے برس کی عمر تک۔ اس دوران میں کسی شخص کے جتنے بھی محبوب و معشوق ہوں۔ ان سے وہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار بار مل سکے گا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تین چار سو معشوقوں سے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جنسی زندگی کا اصل حصہ یعنی برس دکنار، وصل و ہجر، شکوہ و شکایت، وفا جفا، انتظار، نامہ و پیام اور اسی قسم کی مٹھی بھر باتیں عشقیہ زندگی کے اخیر تک قائم رہتی ہیں، لیکن انہیں مٹھی بھر باتوں سے عشقیہ شاعری ایک ہی شخص کے ہاتھوں ہزارہا عشقیہ اشعار کہلوا لیتی ہے مجھے انگریزی شاعر کیٹس (KEATS) کے ایک خط کی یاد آگئی کہ جس طرح ایک لڑکی دیوار کے دو تین نقشوں سے جالا بننا شروع کرتی ہے اور ہزارہا تار اور حلقے بنا لیتی ہے، اسی طرح شاعر اپنے گنے چنے تجربوں کے سہارے ایک پورا ایوان عشق کھڑا کر دیتا ہے یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ کہ زیادہ تر حالتوں میں کسی عشق کے معشوقوں کی تعداد دو تین ہی زندگی بھر میں ہوتی ہے۔ اور ان معشوقوں سے دو چار ہی وہ زندگی بھر میں مل پاتا ہے اور ان دو چار سو ملاقاتوں میں وہی مٹھی بھر باتیں اپنے کو دہراتی رہتی ہیں۔ آئے دن نئی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ اور دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اشعار کا۔ اگر یہ تجربے نثر میں لکھے جائیں، اور افسانے کا سہارا لیا جائے، تو شاید چالیس پچاس صفحات میں سب باتیں بیان ہو جائیں گی۔ لیکن یہ شاعری کا جادو ہے کہ ایک ایک بات اور واردات ہزار ہزار بار دنیا جنم لیتی ہے۔ یہ تکرار و تجدید جذبۂ عشق کے استقلال سے پیدا ہوتی ہے۔ مجہول لذت پرستی تخیل کی مدد سے قریب قریب لامحدود خلاقانہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔ اب اگر سارا دیوان محض جوا جائی سے بھرا ہوا ہو تو ماننا پڑے گا کہ شاعر کی زندگی و ذہنیت ناقابل اصلاح ہوس کاری کی شکار ہیں۔ لیکن اگر واقعی کسی کا دیوان لطیف پاکیزہ رنگین پر معنی عشقیہ جذبات اور جمالیاتی احساسات سے مالا مال ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کی جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ وہ عشق بھی محض شاعر کے کردار کا مستقل جزو نہیں بن گیا ہے۔ جذبہ شاعری کے روپ میں رنگا رنگ انداز سے جلوہ گر ہوا ہے اور خلاقانہ خلوص ہی ایسا کر سکتا ہے ؎

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

اس خلاقی کا راز کیا ہے؟ چند محدود تجربے اور بار بار ہزاروں نئے روپ کیسے دھار لیتی ہیں، یہ ذرا پیچیدہ سوال ہے۔ شاید بات یہ ہے کہ داخلی کیفیات یا کوئی داخلی کیفیت گننے کی چیز نہیں ہے۔ جسے ہم ایک جذبہ کہتے ہیں۔ جب وقوف یا ادراک اسے چھوتا ہے یعنی جب جذبۂ علم جذبہ بنتا ہے تو اس کے بے شمار پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح وحدت سے کثرت پیدا ہوتی ہے، ہر حقیقت ایک ہوتی ہوئی بھی کئی حقیقتیں بن جاتی ہے۔

ایک عاشق کی جنسی زندگی کو یا اس کے جنسی اعمال کو بے تہہ اشخاص بدکاریوں اور خلاکاریوں سے تعبیر کرتے ہیں ؎

زلف میں آیا عشق اعظم
ٹوٹ پڑے دنیا کے کھیلے

ازل کی صبح سے اس عشق کا نہ راز کھلا
جو شہر شہر ہے بدنام کوہ بہ کوہ رسوا

یہ راز اگر کہیں کچھ کھلتا ہے تو عشقیہ شاعری میں کھلتا ہے یا عاشق کی زندگی کے ان پہلوؤں اور کارناموں میں کھلتا ہے جن کا سرو شتہ کوئی جنسی یا عشقی زندگی سے ملا نہیں پاتے۔

جنسیت کا خواہش یا حاجت، رائی کی سطح سے ابھر کر ایک مستقل جذبے کی شکل اختیار کر لیتا، اس میں ارتقائے حیات انسانی کا کونسا مقصد پنہاں ہے؟ ——— بقائے نسل کے لیے تو جنسی خواہش یا ایک خواہش مردار کافی ہے۔ عشق کس مد میں آتا ہے؟ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ ایک عظیم تہذیب میں عمل کی وسعتیں اور اس کے بے شمار پیچیدہ منتشر عشقیہ جذبات کی دین ہیں۔

انسان کو محض کھاتے پیتے گزارے — اس منزل سے وہ پاؤں آگے نہ دھرے
وحشی کے عمل کی انتہا صید و شکار — گر عشق نہ ہو عمل ترقی نہ کرے

عشق کی خلاقی محض شعر و شاعری، رقص و سرود، تاج محل اور اجنتا یا دیگر فنون لطیفہ تک محدود نہیں۔ بلکہ تہذیب کا پورا کارنامہ اس جنسیت کی تخلیق ہے، جو عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کار آمد عمل یا افادیت سے شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیا یہ فنون تاریخ کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ہوتے ہیں۔ یا ان مقاصد سے دامن تحقیق چیز ہے؟ کیا وجدان رہا کے وجدان ہوتا ہے یا برائے عمل؟

خطرہ تو اس کا ہمیشہ رہتا ہے کہ فنون لطیفہ آپ اپنے شکار ہو کر رہ جائیں اور نظر حال و مآل ہو کر رہ جائیں۔ لیکن شاعر اور اس کے سماج کی بیدار مغزی اس خطرے سے شاعری کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اے شاعر خوش نوا تری ہے وہ ذات — جو سوئی ہوئی جرأت جگا دے دن رات
اپنی ہی لذت بیاں میں نہ ہو گم — دم بھر نہ چھپے منصب نقاد حیات

حقیقی شاعرانہ وجدان محض کائنات کے وجود کے احساس سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس وجود کے پیچھے علم اور اسے صحیح طرح سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وجود کا سچا ادراک اس راز کا انکشاف کرتا ہے کہ وجود کائنات ہر لمحہ ایک متحرک اور تغیر پذیر وجود ہے۔ کائنات کی تخلیق ہو نہیں چکی بلکہ ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس مسلسل تخلیق کا ضامن آدمی کی ذات ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب سے سینکڑوں برس پہلے کی شاعری کے مشاہیر نے اپنے زمانے کی کائنات کو جس طرح سمجھا تھا وہ کائنات تو اب بدل چکی۔ اور وہ کائنات ہمیں واپس دی جائے تو ہم اسے کروڑوں کے مول بھی نہ خریدیں۔ لیکن۔ والمیک ہومر، ورجل۔ کالی داس۔ فردوسی، حافظ، تلسی داس اور شیکسپیئر کے کارنامے اب بھی سدا بہار بنے ہوئے ہیں۔ ان شاعروں کی دنیا بدلنے سے ہمیں انکار ہے اور ان کے کارنامے کھو دینے سے بھی ہمیں انکار ہے۔ یہ اس لیے کہ ماضی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ پہلو جو حال و مستقبل میں اپنی ہیئت کو تبدیل کر کے قائم رہے گا۔ دوسرا وہ پہلو جو اب قائم نہیں ہے۔ شاعر ماضی کے دوسرے پہلو کو جاوید شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اور جس ماضی سے ہم ابھرتے ہیں اس کا زندہ شعور ہمارے اندر پیدا کر کے جاری بدلتی ہوئی زندگیوں کا تسلسل محفوظ کر دیتا ہے۔ یعنی ماضی کی زندہ روایتوں کی روح کو محفوظ کر دیتا ہے ہم ماضی سے کیا کریں گے لیکن ہم ماضی کی معنویت سے اگر چشم پوشی

کریں تو حال کو بھی کھو بیٹھیں گے۔ ہمیں حال کو ماضی نہیں بنانا ہے۔ لیکن حال اور ماضی میں جو رشتہ ہے اُسے سمجھنا از حد ضروری ہے۔ اگر ماضی کا ادب عالیہ سب کا سب فنا ہو جائے گا تو ہمیں حال و مستقبل کی تعمیر میں بہت سی رکاوٹیں پڑیں گی۔

آپ کے مضمون پڑھتا رہتا ہوں۔ تعریف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں آپ اکتا نہ جائیں۔ اور یوں ہم اچھے مضامین سے محروم ہو جائیں۔

اور آخری بات یہ کہ خفا ہونا چھوڑ دیجئے۔ اتنے ثقہ آدمی ہوتے ہوئے۔ جب آپ بچوں کی طرح روٹھ جانا چاہتے ہیں تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ فراق اور مشین میں تھوڑا سا فرق تو ہے۔ بہرحال غزل حاضر ہے اور اسلامی ادب کے بارے میں بھی چند سطور قدریں۔ یہ آپ کے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو اچھے بھلے تھے۔ اب تو ان کی بیماری لاعلاج معلوم ہوتی ہے۔

پچھلے دنوں سخت بیمار رہا ہوں۔ اس لیے جلد جواب نہ دے سکا۔ مجبوری تھی۔

آپ کا
فراق

(۵)

۳ بیلک روڈ۔ الہ آباد
۱۱ر جولائی ۱۹۵۲ء

برادرم۔ تسلیم

آج میں آپ کو بڑا معقول قسم کا خط لکھنا چاہتا ہوں۔ موضوع تو آپ کا ہے۔ لیکن لکھوں گا تو میں۔ کئی دنوں کے بعد آج طبیعت سنبھلی ہے۔ اگر قلم بھی سنبھل کے چلا تو مجھے وہ لطف نہ آئے گا جو قلم کے پھسلنے میں ہے۔ بہرحال مسکرا رہا ہوں اور یہ کہ میں اپنی شاعری سے خوش ہی خوش ہوں یا کسی قدر آسودہ بھی ہوں۔ میں معقول و مناسب مدلل اپنے کلام کے اس حصہ سے آسودہ و مطمئن ہوں جسے میں اچھا سمجھتا ہوں۔ لیکن اپنے کسی شعر، غزل، رباعی یا نظم کو صرف آخر نہیں سمجھتا۔ میر، غالب، آتش، اقبال بھی مختلف سطحوں میں مختلف قدریں اور مختلف مرتبے۔ میرا اچھا شعر عظیم تر شاعری نہیں ہے لیکن کسی شاعر کا اچھا شعر عظیم تر شاعری ہے۔ میں جیسی اچھی اور جتنی اچھی شاعری کر سکا ہوں اس سے کہیں اچھی شاعری کا تصور کر سکتا ہوں۔

اگر مجھے اپنے پورے کلام پر نظر ثانی کرنے کی فرصت ملی تو میں اس فرصت کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے بہت سے اشعار کو اور بھی چمکا دینے کی امید رکھتا ہوں۔ خاص کر غزل کے اشعار اور اپنی بہت سی رباعیوں کو۔ انہیں پھر سے چھونے کی ضرورت ہے (THEY NEED RETOUCHING) ابھی میرے تحت الشعور میں سیکڑوں غزلیں اس طرح لگنا ہیں کہ میں لگناہٹ سن نہیں سکتا۔ صرف ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر ایک لگناہٹ سی ہو رہی ہے اور بس۔

اپنی نظموں کے بارے میں میں یہ محسوس کرتا ہوں مجموعی طور پر ان میں کئی خوبیاں ہیں۔ لیکن جتنی اچھی نظمیں میں کہہ سکا ہوں ان کی

دس گنی تعداد یا مقدار میں نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری دو نظمیں ادبی اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت سراہی گئیں۔ اگرچہ یہ دونوں نظمیں غیر مقفیٰ ہیں۔ لیکن آپ کے حضرت جگر مرادآبادی ایسے سراپا غزل شاعر اور حضرت جوش ملیح آبادی جیسے سراپا نظم شاعر نے بار بار ان پر وجد کیا اور جی کھول کر داد دی۔ اور اگرچہ ان نظموں میں کوئی کھلا ہوا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ صرف منظر نگاری اور تخلیق فضا ہے۔ پھر بھی علی سردار جعفری اور ان کے ہم نوا ہم عصر شعراء نے جی کھول کر ان کی داد دی۔ یہ دو نظمیں ہیں: "آدھی رات" اور "پرچھائیاں"۔ اکثر خیال آتا ہے کہ اس انداز میں کم از کم دس نظمیں اور ہوں۔ میری ایک اور نظم ہے: "رقص شباب" جسے میں بہت اچھی جمالیاتی نظم سمجھتا ہوں اور جو اردو کے تمام مشاہیر سے داد حاصل کر چکی ہے۔ دو چار ایسی اور نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ترقی پسند نظموں میں داستان آدم، روٹیاں اور کچھ دوسری نظمیں مجھے پسند ہیں۔ میں ان سے بھی بلند تر انداز میں پچاس اور نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔

میں نہ تو اقبال، جوش، چکبست کی تقلید کرنا چاہتا ہوں (اگرچہ ان کے محاسن کلام کا مجھے اعتراف ہے) نہ یورپ کے شعرا کی سو فی صدی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس بیان سے متفق ہوں کہ اردو کی نظمیں بھی غزلیت زدہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ورڈسورتھ، کیٹس، شیلے، کولرج، ٹینی سن، میتھو آرنلڈ، سوین برن وغیرہ شعراء کے اسلوب اور تکنیک میں جو خلاقانہ صلاحیتیں ملتی ہیں۔ اور کلفت اور تھکن کے ساتھ جو سنجیدگی ملتی ہے اس نمونے کی کچھ نظمیں کہہ سکوں۔ کچھ ایسی نظمیں کہہ بھی چکا ہوں۔

ہمارے نئے شعراء غیر مقفیٰ نظم میں جو کوششیں کر رہے ہیں میں اُسے سراہتا ہوں لیکن مقفیٰ شاعری کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ انگلستان کی شاعری اردو شاعری سے بہت پرانی ہے۔ لیکن آج تک اس میں رنگا رنگ مقفیٰ شاعری ہو رہی ہے۔ اگرچہ انگریزی شاعری کے ہجوم دن سے اس میں غیر مقفیٰ نظم (BLANK VERSE) داخل ہو چکی تھی۔ انگریزی کے مشہور ODE ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم اپنی مقفیٰ شاعری کے لیے نمونے بنا سکتے ہیں۔

اپنی شاعری کی خوبیوں اور اس میں جو کمی محسوس کرتا ہوں اُس کے بارے میں اظہار خیال کر چکا۔ اس دور کے شاعروں سے گذارش کروں گا کہ وہ انیسویں صدی کی مغربی شاعری کا بغور مطالعہ کریں۔ اور قدیم مشاہیر اردو کے کلام کو بار بار پڑھتے رہیں۔ قدیم ادب سے استفادہ کیے بغیر کام نہ بنے گا۔ لیکن قدیم ادب کا شکار ہو جانے سے بھی کوئی کام نہ بنے گا۔ محاورے، روزمرہ، فصاحت، تمثال اور وہ دیگر محاسن شعری جن کے نمونے قدما پیش کر چکے ہیں۔ انہیں نظر انداز کر کے ہمارے نئے شاعر کہیں کے نہ رہیں گے۔ ان نئے اسلوب ضرور پیدا کیے جائیں۔ روایتوں کی زنجیریں ضرور توڑی جائیں۔ لیکن جو گھسے شاعری کو زندگی بخشتے ہیں اُن کا ضرور لحاظ رکھا جائے۔ محض نئی بات کہہ دینے سے یا نئے انداز بیان سے یا چونکا دینے والی بات کہہ دینے سے شاعری زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری شاعری محض مختلف افراد کے دماغوں کی اپج رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئی شاعری جبھی زندہ رہے گی جب وہ ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب کی دین ہو۔ ہمیں اپنی شاعری کو اپنے اور دنیا کے قدیم مستند ادب کا سہارا دے کر نیا بنانا ہے۔ ایک بات اور عرض کر دوں۔ انگریزی کے ایک بڑے ادیب کا مقولہ ہے کہ عظیم ادب شاذ ہی ادبی ہوتا ہے (GREAT LITRATURE IS SELDOM LITRARY) میں شروع ہی سے ادب کو ادبی زبان دینے کے بجائے زندگی کی زبان دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ زبان دانی کا حقیقی مفہوم ہے حیات دانی و حیات شناسی۔

آپ کا

فراق

(۶)

۳ بیگ روڈ - الہ آباد
۵ر اگست ۱۹۵۳ء

برادرم تسلیم

اس خط میں ان مباحث پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا، جو میرے پہلے خطوط میں زیر غور رہے ہیں اور میں آپ کی ان باتوں میں نہ الجھوں گا، جن میں آپ نے اڑنگے لگائے۔ بس میری باتوں کو چپکے سے سنتے جائیے۔ جب آج سے پہلے کا ادب موجودہ تہذیب کا ایک زندہ جزو بن چکا ہے تو یہ امر لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر نامک حلال شاعر قدما سے اپنے مزاج و صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے۔ میں نے اردو اور دوسری زبانوں کی اچھی شاعری سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ میں میر، غالب، نظیر اکبر آبادی، آتش، اقبال، جوش یا کسی بھی مشہور اردو شاعر کا طبع دوم بن کر رہ جاؤں۔ میرا یقین ہے کہ اگر میرے کلام سے تمام مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور دوسرے مشاہیر اردو کے فائدہ کلام سے ان کے مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور سب کو گڈمڈ کر کے ایک پلندہ بنا دیا جائے تو اہل نظر حضرات اس بے نام و نمود پلندے میں سے میرا اور دوسرے شعراء میں ہر ایک کا کلام الگ الگ کر لینے میں قریب قریب سو فی صدی کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اردو حاضر یا گذشتہ ادوار کے دوم اور سوم مرتبہ کے شعراء کا کلام اسی طرح گڈمڈ کر دیا جائے اور نواب جعفر علی خاں آثر کے مجموعہ "بہاراں" کی غزلوں سے مقطعے کاٹ کر اس دوم اور سوم درجے کی شاعری کے پلندے میں ملا دی جائیں تو ان شعراء کے کلاموں کو الگ الگ کرنے میں کسی کو کامیابی نہ ہوگی۔ کمزور شاعری خواہ اسے کتنا ہی رچایا اور سنوارا جائے۔ خط و خال اور شخصیت سے محروم رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ میر و غالب سے کم تر حیثیت کا شاعر صاحب طرز نہیں ہو سکتا۔ جرأت اور ناسخ، میر و غالب سے بہت کم تر ہیں۔ لیکن جرأت و ناسخ دونوں صاحب طرز ضرور ہیں۔ اب اگر کوئی شاعر دوم سوم درجہ کی شاعری کرتا ہوا بھی ایسی کمزور شاعری کرتا ہے کہ اس کا کوئی اپنا رنگ نہ بن پائے اس کی شاعری میں نمایاں خد و خال نہ پیدا ہوں، ایسے صفات نہ پیدا ہوں، جن میں اس شاعر کا کوئی شریک نہیں تو اس شاعری کو تو ہم جان تو سکتے ہیں لیکن اسے نہ ہم مان سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں۔

میں نے ارادتاً اس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے طرز کلام کی ذریعہ اپنی انفرادیت کی مسجد الگ بنا دوں۔ اگر میرے کلام کا ایک نمایاں اور مخصوص رنگ ہے اور ایک مخصوص طرز ہے تو یہ امتیازات میری شاعرانہ شخصیت سے میرے کلام میں داخلی طور پر پیدا ہوتے گئے۔ البتہ میری شاعری کے آغاز سے پانچ سات برس تک جسے دور تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ میرے کلام میں تقلید کا عنصر قدرے زیادہ ہے۔ اور میری اپنی آواز ذرا دبی دبی سی ہے۔

لیکن جیسا عرض کر چکا ہوں ایک مخصوص رنگ اور نمایاں خد و خال دوم و سوم درجہ کی شاعری میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ بلند مرتبہ شاعری یا وہ شاعری جسے ہم ادبیات عالیہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک منفرد شخصیت کے علاوہ حسن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا سرکاری جوہر ہے حیات و کائنات کی عظمت، آفاقی وسعت، حیات و کائنات پر اٹل ایمان اور حیات و کائنات سے بیکراں محبت۔ یہ سرکاری جوہر عشقیہ شاعری اور دیگر موضوعات کی شاعری دونوں کو عظمت عطا کرتا ہے۔ آتش اور آتش کے شاگردوں کو لے لیجئے، آتش کی استادی کا راز ان کی زبان دانی، طباعی، ذہانت، مضمون آفرینی میں اس حد تک نہیں ہے جس حد تک آتش کے فکر کی آفاقیت میں

وہ راز پنہاں ہے۔ اور کلام آتش کی آفاقیت کے مزاج میں بنفسہٖ طور پر ممکن ہے کہ کئی موضوعات پر ہو اور جس طرح آتش نے سوچا۔ اسی طرح، تمدد صبا نے بھی سوچا ہو لیکن وہ موضوعات آتش کے دیوان میں اس سے زیادہ دُور، رس اور پُر عظمت اور پُر کیف بن گئے۔ جتنا وہ تمدد صبا کے دیوان میں بن سکے تھے۔ بلند شاعری فی الحقیقت جمالیاتی عظمت کی تلاش ہے۔

جنسیت اور عشق کے بارے میں بھی پہلے کے خطوط میں کئی باتیں کہہ چکا ہوں۔ آج یہ کہنا ہے کہ بڑے عاشق کا عشق اتنا بڑا عشق نہیں ہوتا جتنا بڑے "انسان" کا عشق بڑا ہوتا ہے۔ بظاہر جنسیت محض جنسیت ہے۔ لیکن شیکسپیر، کالی داس، حافظ، گیٹے، داتے کی جنسیت عوام کی جنسیت سے بہت بلند تر چیز ہے۔ عشق صرف دل کا معاملہ نہیں ہے جتنا دل سے زیادہ دماغ کا معاملہ ہے۔ چھوٹے دماغ کا آدمی بڑے سے بڑا عاشق ہو کر بھی کوتاہ یا بڑا عاشق ہوتا ہے۔ بڑا عاشق نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اگر معشوق پر موت مٹ جائے، اپنے شدت خلوص سے وہ اپنے جسم کو چھلنی بھی کر ڈالے یا جنگلوں میں نکل جائے یا معشوق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے، پاگل بھی ہو جائے، خودکشی بھی کرے یا جو کچھ کرے۔ بلند دل و دماغ والے عاشقوں کی برابری نہیں کر سکتا۔ خواہ آخر الذکر کوئی ڈرامائی یا غیر معمولی حالت اپنی نہ بنائیں اور کچھ ہنس کھیل کر واردات عشق کو برداشت کریں۔ وفا کے مجرے دکھا کر بڑے عاشق کا کام نہیں ہے۔ یوں تو میر نے کہا ہے ؎

پرستش کی اے بت یہاں تک تری
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

لیکن یہ پرستش در جاناں پر جبیں سائی یا رونے یا گڑگڑانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک داخلی عمل ہے۔ اس داخلی عمل سے حسن کے اقدار کی تخلیق ہوتی ہے۔ جنسیت بجائے بقائے نسل کی ضامن ہونے کے ارتقائے تہذیب کی ضامن بن جاتی ہے۔ کسی مفکر کا بیان ہے کہ ایک زہیت یافتہ ناکام عاشق دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ جنسیت کو عشق سے خارج کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ ایسا عشق ناکام ہو ہی نہیں سکتا۔ جب حسرت موہانی کہتے ہیں ؎

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

یہ اخلاقی عشق محض ایک بڑے بہت چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس دور سے دیکھنے میں بھی جو جادو کا اثر ہے۔ وہ جنسیت ہی کا جادو ہے۔

یہی بات ہم افراد سے گزر کر قوموں اور تہذیبوں کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ وحشی یا نیم مہذب قومیں اس کی مثالیں تو پیش کر سکتی ہیں۔ لیکن ان کے کئی افراد مہذب عشق کے تحت آگ میں کود پڑے۔ لیکن ایسی قوموں کا عشق ان مثالوں سے بڑا عشق نہیں بن جائے گا۔ البتہ قابل قدر عشق ضرور رہے گا۔ کیونکہ عشق کا مقصد معشوق سے وصال و قرب کے علاوہ مہذب عشق اور احساس جمال کو بلند بنانا ہے اور آگے چل کر تہذیب و تمدن کی تخلیق کرنا ہے۔ شیکسپیر کی عشقیہ شاعری ملک آزاد بھوکے دانے کے غیر عشقیہ علم کا ہاتھوں سے غیر متعلق ہے۔ شیکسپیر کی شاعری۔ بیکن کی تصنیفات، اٹلی دنیا کی دریافت، انگلستان کی نشاۃ ثانیہ، یہ سب ایک ہی تاریخی عمل یا دور کی پیداوار ہیں۔ ہماری اردو شاعری نے کسی بڑی قومی زندگی کے آغوش میں نہ جنم لیا تھا نہ پروان چڑھی۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں خود میری شاعری میں اگر واقعی کچھ بڑی چیزیں ہیں تو وہ سب کی سب ایجاد بندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس ہندوستان کی دین ہیں۔ جس کی نشاۃ ثانیہ راجہ رام موہن رائے کے وقت سے شروع ہو چکی تھی۔ جو عشقیہ شاعری ایک بڑی قومی زندگی اور ایک بڑی اور زندہ تہذیب کی پیداوار ہو گی۔ وہ قوم کے لیے چھوٹے حال تال

یا محض تفنن طبع کا باعث نہ رہے گی۔ بلکہ وجدان و تفکر کی ایک بڑی پرتی درستی ہوگی۔ بڑی عشقیہ شاعری کی نگاہ میں جہاں ایک طرف معشوق ہوتا ہے۔ وہاں دوسری طرف قومی زندگی اور اس کے امکانات ہوتے ہیں۔

ایک مسئلہ پر بھی اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں، معشوق ذہنی اور اخلاقی طور پر کوئی فوق الانسان نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معمولی انسان ہوتا ہے ——— تو کیا اس کا اس قدر گرویدہ ہو جانا کہ اس سے حقیقی انسان کا تصور بھی ناممکن ہو جائے، ایک جھوٹ یا مبالغہ نہیں ہے؟

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

محبت کی مشہور داستانوں یا واقعوں کے معشوق اپنے زمانے کے حسین ترین انسان تھے۔ لیکن ناقابل برداشت جنسی کشش عاشق میں پیدا کر دیتے تھے۔ اور غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے عاشقوں کے دلوں میں دنیا کے حسین ترین انسان نظر آتے تھے۔ عقلی طور پر تو یہ ایک جرم ہے۔ لیکن اس جرم میں ایک راز پوشیدہ ہے۔ اور وہ راز بقائے نسل نہیں ہے۔ بلکہ ارتقائے نسل ہے۔ بقائے تہذیب نہیں ہے بلکہ ارتقائے تہذیب ہے، معشوق کے جمال کی یہ داخلی کشش مجموعی حیثیت سے ایک بہتر نسل اور بہتر تہذیب کی ضامن ہے، جنسیت شدید جذبات کے سہارے بہتر نسل پیدا کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر کسی مرد اور کسی عورت میں انتہائی عشق ہو تو اولاد بہت جلد تو پیدا ہوگی۔ لیکن امکان بہتر اولاد کے پیدا ہونے کا ضرور ہے۔ اولاد کی ترقی میں سب سے زیادہ حصہ ماں باپ کی باہمی محبت ہے۔ اگرچہ اور چیزوں کا بھی اس معاملے میں حصہ ہے۔ پھر بھی والدین کی باہمی محبت بچے کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے۔ یعنی اسے ترقی کے بہترین امکان فراہم کر دیتی ہے۔

لیکن ہم جنسوں کی پُرخلوص جنسی محبت سے اولاد تو نہیں پیدا ہوتی، پھر اس سے تہذیب کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک فائدہ عاشق و معشوق کی زندگیوں میں لطافت پیدا ہو جانا اور دونوں کی شخصیتوں کی تالیف و تہذیب۔ دوسرے اگر عاشق کی شخصیت معشوق سے بڑی ہے تو معشوق، جمال ہم نشیں در من اثر کرد کے مصداق بہت کچھ بن سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہم جنسوں سے محبت اتنے گنے افراد تک محدود رہے تو اچھا ہے۔ پھر اگر ایسی محبت میں عرفیں میں سے کوئی شاعر فن کار یا کسی دوسری کارآمد دل چسپیوں کا حامل ہے۔ تو یہ محبت اس کی ان دل چسپیوں کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ یہاں بھی وہی بات کہی جائے گی۔ یعنی بھیڑ سے آدمیوں کی امرد پرستی کو سنقرار یا بہت سے گمنام لیکن شائستہ تہذیب یا شائستہ عشق عشاق کی امرد پرستی سے کوئی نسبت نہیں۔ ہر امرد پرست فنڈا یا شہدا نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ مخرب اخلاق ہوتا ہے۔ بڈ ورڈ کا رچیٹر کی تصنیفات اس نازک مسئلے پر بہت بصیرت افروز ہیں۔

دیکھئے میں ان خطوں میں کتنی محنت کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ کو میری ذات اور میرے خیالات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ میں نے آج تک کسی سے بھی اتنی کھل کر باتیں نہیں کی ہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ کہ مجھے آپ کی ہر بات کی تعمیل میں ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اب مجھے اپنی زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ نہ جانے کب مر جاؤں۔ کافی عمر ہو گئی ہے۔ کب تک شعر لکھ کر جی سکوں گا۔ اور اب مجھے یہ امید بھی ہے کہ آپ میری زندگی میں یا میرے مرنے کے بعد ایک ایسا مضمون لکھ سکیں گے، جس سے میری بھرپور شخصیت سب کے سامنے آئے گی۔ کیا یہ کم میری زندگی کے بعد ہوگا یا زندگی ہی میں۔

آپ کا

نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبد الحق

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دو غلے مرد و زن باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزوں اور فرانسیسیوں کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ اکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

ان سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ یہ بھی آپس میں لڑتے، کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر چڑھ کر بیٹھتے۔ کبھی مل کر غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی غداری کر کے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس ملک کے معاوضے میں مصارف کے نام سے گرانی قدر رقمیں لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتھیا لیا۔ کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھیڑ خانی شروع کر دی اور اس کے حریفوں سے مل کر اس کے علاقے پر چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لئے رکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پر ایک ایک ٹکڑا ساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے مخصوص علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و اطوار، ان کی زبان، غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں نامانوس اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود"

اس میں "گاہ گاہ بر ساحل نمودار می شود" کا کلمہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کرتے تھے کہ کاریگر اچھے ہیں، بندوق، توپ، گھڑی وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحبِ علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا رفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انھوں نے ابتدا میں جس مکر و فریب، جعلسازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے چہیتے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اعتقادات، تہذیب و روایات اور علم و فضل پر فخر تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انھوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا بدل دی اور باوجود زوالِ سلطنت کے انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور نجس سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور دیکھ چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسلمانوں میں دو چار ہی خاندان ایسے تھے جنھوں نے اس کشمکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے پڑھے اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اٹھے جن کے نام اپنے تبحر اور علم و فضل کی وجہ سے ہمیشہ دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۲۴۳ - ۱۲۵۲ھ) سرکارِ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے کے گورنر جنرل لارڈ بنٹنک کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین العابدین حسین (والد سید حسین) اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کردہ مدرسہ عالیہ میں علومِ مشرقیہ کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ بنٹنک کے اسسٹنٹ کی اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بطور سفیر یا پولیٹیکل ایجنٹ امیرانِ سندھ و افسرِ اعلیٰ جہاز رانی دریائے سندھ متعین ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا۔ مگر امیرانِ سندھ اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم لیتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے

جب کبھی کوئی عربی شعر یا آیاتِ قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے جب لوگ تعزیہ مانگتے تھے وہ اس ٹوکری میں سے نکال نکال کر دے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بدنفس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ یہ شخص دراصل انگریز ہے مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی تھے گورے چٹے لوگوں کو یقین آگیا اور شورش برپا ہوگئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہوگیا اور وہ راتوں رات ہمارے یہاں بھیس بدل کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست بہار چوبیس پرگنہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دو بار لیجسلیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی ۱۸۸۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران میں انھیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگال میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت بھی مہاتما بدھ کی جنم بھومی ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی۔ سید صاحب ۱۸۸۳ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرائی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی تھی کہ حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ نادر عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور پہنچے اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۶۸ء میں میٹرکولیشن کی سند حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں درجۂ اول میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اثر سے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک کر دیں۔ لیکن نوجوان سید نے جو کالج کے دنوں سے تازہ تازہ علمی ذوق کی بنا پر اس سررشتے کو پسند نہ کیا جو تمام سرکاری سررشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزرنے پر بھی اب تک ناقدر دانی کا شکار ہے۔ اس نے ڈپٹی کلکٹری پر کلکٹری کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی اور اس طرح انھیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں ان کو لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و اشغال اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علماء و اکابر کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا۔ ان تمام باتوں کا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پر اثر ہونا ضروری تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں انھیں لکھنؤ ٹائمز کی اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقداران اودھ کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے نہر سرد نکالنی چاہی۔ اس سے تعلقداران اودھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے تعلقداران اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اخبار ہائے نیر نے (جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا) اس تجویز کی تائید میں پرزور آرٹیکل لکھے۔ لکھنؤ ٹائمز کے نوجوان اڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ اسی نکتہ چینی اور دوسری تعلقداران اودھ کے اخبار میں حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین عرش عتاب میں آگئے اور انھیں اڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر گارڈ تارنھ بروک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ واپس ہوئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہمانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار رؤسائے عظام کی کی جاتی تھی۔ کل گورنران صوبجات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا مہمان سمجھیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریذیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس ہمرکاب تھے لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل ایل بیرو چیف کمشنر کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل بیرو نے تعلقہ داران اودھ و دیگر امرائے شہر سے ملاقات کرائی منجملہ ان کے پروفیسر سید حسین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور ان کی علمی و ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔ نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مردم شناس اور قدردان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدرآباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں۔ چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب حیدرآباد واپس پہنچوں تو تم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدرآباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابلہ میں کم تر اور ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انھیں رنج ہوتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انھیں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے امرا کو کہلوا بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس و پیش کرتے رہے اور آخر ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد آئے اور آئے بھی تو تین مہینے کی رخصت لے کر۔ حیدرآباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔

ابتدا میں نواب صاحب نے انھیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ (مددگار خاص) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدرآباد میں انگریزی محمد (سیکرٹری) ایک انگریز مسٹر اولی فینٹ تھا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی جو ایسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدرآباد گورنمنٹ کے مصارف کی رقم کئی سال سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے زیر خیر علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام، ان کے امرا اور اہل حیدرآباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہرا رہا اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی مگر زبردست مارے اور رونے نہ دے کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔ سر سالار جنگ نے اس مہم کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ آرزو تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ بہت چوکنی تھی۔ نواب سالار جنگ نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بچانے میں جو بے نظیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریزان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے ورنہ کبھی کے ختم کر دیئے جاتے۔ برار اور اسی قسم کے دیگر اہم معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری مسٹر اولی فینٹ انگریزی حکومت کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ نواب اعضائے ضعیف ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک محمد

(جائنٹ سیکرٹری) تھے گویا شریک جرم تھے۔ حیدرآباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرض عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیئے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے سن کر فرمایا کہ سید حسین کے نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دے دوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدر دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

۱۸۸۶ء میں نواب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور معتمد صیغۂ مقررات مقرر فرمایا جس میں سررشتۂ تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب حضور نظام (میر محبوب علی خان) مسند نشین ہوئے اور میر لائق علی اعماد السلطنت، مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملات حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے معتمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میر مجلس خود بنفس نفیس اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خان) تھے۔ اس سال جشن نوروز میں ان کو علی یار خاں مرتبہ جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں بہ تقریب جشن نوروز عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں بیاگرہ مبارک کے موقع پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء/۱۳۰۶ھ میں مولوی صاحب اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے دست مبارک سے (اپنی زبان میں) ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "نواب عماد الملک بہادر۔ آپ کے واسطے خدمت خانگی پرائیویٹ سیکرٹری کی مقرر کیا ہوں جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اردو اور بات کو مخفی رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہوگی وہ آپ کے پاس لکھ کر بھیجوا دوں گا یا خود آؤں گا۔ مگر آپ کل دس بجے صبح میں آکر نذر دینا۔"
>
> (دستخط) محبوب
>
> ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ روز دوشنبہ شب سہ شنبہ

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن) ممالک محروسہ سرکار عالی کے عہدے پر متمکن ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ یہ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کئے گئے لیکن انھوں نے نظامت تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں بالطبع تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سفارشوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و نااہلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامت تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت و اقتدار بھی واجبی ہی واجبی

ہے جبکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ عہدہ دوسرے فوائد سے بھی محروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم و فضل اور اعلیٰ سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امرا و وزرا ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۳۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور سررشتۂ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس فرض منصبی کے ان کے اثر اور محبت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کے بڑے قدردان تھے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف۔ اس کتب خانہ کے لئے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس برِ عظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ نواب عماد الملک کتاب کے بڑے قدردان تھے اور اس قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو لے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے وہ اس پر بہت جھنجھلاتے اور اسے اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے چار پانچ عربی کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مطلوبہ مدار المہام سرکار عالی (نواب وقار الامرا) کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی مصاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار! مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اس کی سن گن پہنچ گئی۔ انھوں نے مدار المہام سے کہا کہ کتابیں واپس فرما دی جائیں، میں انھیں خود خرید لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چار گنی قیمت وصول کر لوں گا۔ مدار المہام نواب وقار الامرا نے جو بہت بامروت، فیاض اور سیر چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتہ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری افضل العلما نواب حمید اللہ خان (فرزند مولوی محمد اللہ خان) تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مبلغ نو لاکھ کشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپے لکھی ہے تو انھیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیجی جائیں۔ نواب عماد الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے دیکھنا ہو یہاں آ کر دیکھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلما صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح

نقد لی جائے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سے نادر کتابیں طبع و شائع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلاد یورپ میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے ماہانہ اس کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال بعد پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدر آباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالعلیم شرر لکھتے ہیں:-

> "مجھے ایک مدت تک بالذات ان کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے طلب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے اسی سلسلے میں مجھے ان کی واقفیت عامہ اور ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے حالانکہ یہ ہے کہ میں نے انھیں ادب عربی میں کھپا کے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے سادے اور خالص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے۔"

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جامعہ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:-

> "دوسرا امر جس کی طرف کارپردازان جامعہ طیبہ کی توجہ مبذول ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائیگی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔

عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حق تحکم حاصل ہے۔"

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی۔

"میں نے اورنگ آباد میں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہو گئی۔ قیام کالج کے بعد آپ نے ان طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے جنھوں نے عربی زبان لی تھی اور ہر سال بغیر یاد دہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چیک آجاتا تھا۔"

مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا:

"جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی، وہاں پرانی علمی کتابوں کی تباہی دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد دے کر ان کتابوں کے خریدنے اور محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خط لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی تباہی پر میں رو رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ تھی مرحوم کی کریم النفسی اور علم کی شیفتگی۔"

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تقاضے کے آمادہ ہو جاتے تھے۔

وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحاق خان آنریری سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

"نہایت وثوق کے ساتھ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا ہے جس کی تصانیف اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو ..... اگر آپ کی کوشش سے اس مشہور زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم و نثر جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہو گی جس کا نفع غیر محدود ہو گا اور جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا ——— بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی

مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے
خود ایک ہزار روپے اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دونگا۔"

اس کے بعد نواب اسحاق خان بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار دئے۔ سرکار عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خان صاحب افضیلت جنگ سے پانسو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اسی طرح وہ اہل علم کی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود الحسن لونکی مرحوم ایک عالم متبحر تھے۔ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی۔ بہت روشن خیال اور نہایت زندہ دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفین اسلام پر ایک کتاب کیا انسائیکلوپیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک جلد مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علماء نے اسے بہت پسند فرمایا۔ دوسری جلد کی نوبت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے نواب عماد الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فوراً اعلیٰ حضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدرآباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا اور ایک معقول تنخواہ ان کے لئے مقرر ہو گئی اور ایک مختصر سا عملہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے چند جلدیں دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی جلدیں عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبار میں پڑی سڑ رہی ہیں جن کا اب کوئی قدردان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرنکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انھیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فرد واحد کا کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبدالجبار خان ملکاپوری نے دکن کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے دولت آصفیہ سے چھ ہزار روپے منظور کرائے۔

مولوی عبداللہ خان نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ آصفیہ ہی میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سرو آزاد اور مآثر الکرام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت فرمائے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کرا دیا۔

ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے اور انھوں نے اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے منصب (یعنی دوامی وظیفہ) مقرر کر دیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے تھے اگر کسی تعلیم کے شوقین نادار طالب علم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلی سے ایک نوجوان عبدالرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لیکر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ انھوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسن تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ کر بھیجا کہ تعلیمی کس

قدر رقم کی ضرورت ہے۔ اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ وہ بھی ایسے خوددار اور شریف النفس تھے کہ جواب میں لکھا۔ یہاں حسب دلخواہ انتظام ہو گیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی ٹیم کھیلوں کے دورے پر جا رہی ہے۔ میں نے کہا ہاں فلاں فلاں مقام پر جائیں گے۔ یہ سننے کے بعد کئی سو روپے ان کے سفر خرچ کے لئے بھیج دیئے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ درجے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے فرنچ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلا تکلف گفتگو کرتے تھے۔ جب امیر امان اللہ خان ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر ہی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے متعلق شرر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعراء کے سادہ اور پرجوش کلام کے بہت مداح تھے اور مولدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قائل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں لکھنؤ کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انھیں لفظی صنائع سے جس پر لکھنوی شاعری کا دارومدار تھا اور رعایات خیالات سے بہت چڑ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو، فارسی، عربی) میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالی نے اردو کو تین نثر عطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار جنھیں وہ ان کا شہ کار سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سناتے تھے لیکن کہتے تھے میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائع بدائع سے دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا "نہیں! لیکن آخر لکھنؤ میں رہتا ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد رسالے اور مضامین اور نظمیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انھوں نے "اصطلاحات علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چوراسی پچاسی برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے قدیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آراء پر جو تنقید فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشاپردازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہل زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب الرائے اور نام و نمود کے مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ تقسیم بنگال کے بعد سے مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکر رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دور بیں اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ انھی نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سرسید احمد خاں کے پیرو تھے۔ جب سرسید نے انڈین نیشنل کانگرس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت پُر زور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ اکثر اسی خیال کے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکومتوں کی بدنظمی، ابتری، ناانصافی، رشوت خواری، ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں نے ریلیں جاری کیں، تار گھر، ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا انسداد کیا، تعلیم پھیلائی اور مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں، سفر کی آسانیاں پیدا ہوگئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہوگیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو کیا جسٹس رانا ڈے تک نے اپنے ایک جملے میں انگریزوں کو مشیت ایزدی اور ملک کے حق میں باعث خیر فرمایا تھا۔ ابتدا میں گوکھلے اور گاندھی بھی یہی کہتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگرس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگرس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انہیں حکومت میں ذمہ داری کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعہ اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور عملی تحریکوں میں پڑنے سے ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے نہ ہٹے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنھوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے تھے ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریز حکومت سے اصل نقصانات کیا پہنچے اور بعض اسے آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں "جنٹلمین" کی ضرورت ہے۔ یہ وہی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ایرے غیرے کامیاب ہو کر آجاتے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دیے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انھیں بگڑام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصباتی شرفا کی خو بو ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے یہ شخص شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شرافت کی کچھ عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی تھے جو کہہ گئے ہیں ؎

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آؤ بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور" دونوں اشراف ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک نہ

صرف وقت کے تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی سمجھتا تھا اور وہ اپنا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا۔ جہاں تھا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تصنع نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا فرنیچر اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا۔ لیکن زمانۂ ملازمت میں اور خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امرا وزرا ان کا بہت ادب احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی خورد کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و معاشرت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور رعب داب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وہ بہت صاف باطن بامروت اور منکسر المزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف علمی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص آجاتا تو ملنے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل جنگ ان سے ملنے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل جنگ نشست کے کمرے میں آئے تو مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کیا بچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے (جھٹکا وہ کی قسم کی سواری ہے) یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "تم اہل علم کی توہین کرتے ہو؟ تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا" غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ پانی پانی ہو گئے۔ عقیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورٹی کو ریلیش میں سیڑھیوں کے عین سامنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سواریوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملہ میں نواب عماد الملک بہت سخت تھے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے خواہ صاحب علم کیسا ہی خستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ہو۔ وہ خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے ان کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور ادبی علمی گفتگو میں ان کا انداز تخاطب بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرق مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

اردو زبان و ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی سال ۱۸۸۸ء میں ایک ماہانہ اردو رسالہ "مخزن الفوائد" جاری کیا۔ یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا۔ اس میں متعدد مضامین شائع ہوئے ان میں بے شمار بیشتر سائنسی موضوع پر تھے۔ ہمارے فہیم یافتہ حضرات کے شعار میں اب تک یہ بات داخل ہے کہ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ نواب عماد الملک ہمیشہ اردو میں گفتگو کرتے تھے ایسے لوگوں سے جن کی زبان اردو ہے یا جو اردو زبان جانتے تھے، انگریزی میں بات چیت کرنے کو بدتمیزی اور چھوٹا تفاخر خیال کرتے تھے۔ البتہ جب کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جو اردو نہیں جانتا تھا مثلاً ایرانی، عرب یا انگریز تو اس سے اس کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب جو پہلے برٹش انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے اور بعد میں بھوپال میں وزیر ہو گئے تھے نواب صاحب سے ملنے آئے اور آتے ہی انگریزی میں گفتگو کرنی شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ میری زبان انگریزی نہیں اور نہ غالباً آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آجاتا ہے تو میں اس سے سٹریٹ انگریزی میں بات چیت کر لیتا ہوں ورنہ میں انگریزی

زبان میں بات چیت کرنا ناپسند کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت کرنی پڑی۔

وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ نہ صرف حصول علم میں مانع ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۷ء میں کیا ہے جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت ادق زبان ہے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی فنون مثل حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ کے اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ بیشتر قعدا و طلبہ کو دس دس بارہ بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس عرصۂ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے..... انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں..... جغرافیہ جانتے ہیں، اقطار دنیا کے نام جانتے ہیں، خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، ندیوں، پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کا نشان دے سکتے ہیں، یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شرابی سلطنت سے بے خبر اور اورنگ زیب ایک سخت متعصب اور ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے بالکل لاعلم نہیں کہ مثلاً بول چال میں مگر اپنی مذہبی زبان اور بزرگوں کے علوم اور حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ کالج میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا۔ پھر اس کے ہمہ تن مغربی دنیا کے مقلد بن جاتے ہیں۔ ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ آپس میں گفت و شنید بات چیت سلام علیک سب انگریزی زبان میں کرنا ان کو بھاتا ہے۔ کھانا پینا انگریزی قسم کا پسند کرتے ہیں۔ اپنے آٹھ کروڑ ہم مذہب ہندو کو مسلم ڈبا کر بھی کے نام سے شرف بخشتے ہیں۔ اپنی زبان میں تحریر و تقریر کرتے ہیں تو اس میں حتی الوسع انگریزی لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز نہیں آتی سورے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے کلمہ تو جید تک معلوم نہ تھا کہ

کیا شے ہے اور کس کا نام ہے؟

کالجوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائیگی اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغربیہ سے ناآشنا رہیں گے ..... اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامعہ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطۂ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے جس امید کامیابی ہوئی تو یہ جلد مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر ہمیں انجمن کی صدارت کیلئے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ ادبی علمی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً کاغذ قلم لے کر فارسی زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی سید راس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا ان کو کھٹکھٹائیے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ سید صاحب سفر سے واپس آئے تو کہا۔ آغا خان سے ملا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملئے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ پونا آکر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہز ہائی نس آغا خان تپاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی دستکی میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ ایک روز داور محشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدرآباد سے وطن دشمالی ہند جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رام پور (نواب حامد علی خان) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فرمان روائے ریاست رام پور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالہ کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ طبیعانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انھیں یہاں

لائیے مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آکر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب سے صدمہ پہنچا ہے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیے دار کرسی میں باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انہیں بمبئی تک لے آئیے پھر میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے۔ جبکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے "آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے" کہتے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں روزانہ ہزاروں روپے صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمۂ تعلیم یا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدرآباد آنا پڑتا تھا۔ قیام حیدرآباد کے ان ایام میں نواب صاحب سے ملتا رہتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے کہا امپیریل بنک آپ کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابل اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا ڈاک خانہ آپ سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط دے دیتے تھے کہ یہ ڈاک میں ڈلوا دیجئے گا۔ میں نے مکان پر آکر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک نے مجھے اطلاع دی کہ نواب عماد الملک نے دو ہزار کا چیک انجمن کے نام پر بھیجا تھا جو انجمن کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انجمن کے حساب میں درج ہوگی تو سالانہ رپورٹ میں بھی درج آئیگا اور جلسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ جو منع فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ رنگ کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خان کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق مجھ سے مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و نسق ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلا وجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفاء مروت میں آکر یا تالیف قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک

بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد آنے کے بعد جو مخزن الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے بر سبیل تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلیٰ ارکان ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان مصاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، رحمدلی، قدردانی، سیاست و تدبر کا دوانی اور عالی دماغی کی بے حد مداح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دیئے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ سرکاری کارروائیاں کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے" یہ سننا تھا کہ دربار میں سناٹا چھا گیا! اعلیٰ حضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیف سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولت آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے پیشرو بادشاہوں کے درباروں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہل دربار مولوی صاحب کی یہ صاف بیانی سن کر دنگ رہ گئے اور ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب عماد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا" نواب صاحب نے عرض کیا کہ "حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی" اعلیٰ حضرت جب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور ہر دلعزیز فرماں روا کے فرزند اور جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان کا حال سنئے کہ اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی راجہ یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ ہمارا جو پیشکار یا مہاجن تابعہ یا کوئی اور ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاز میں اپنے محل میں ایک بڑا دعوت دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے، اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ شاہ و گدا کو اختلاف کی تاب کہاں۔ سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز علی الصبح اعلیٰ حضرت کے معتمد حبشی غیاث الدین (اظہر جنگ) نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدرآباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف اسٹیٹ کی معتمدی کی جو تنخواہ اب

تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجیے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں اس کا ایک حبہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔ اور اسی روز حیدرآباد کو الوداع کہہ کر پونا تشریف لے گئے۔ یہ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا اولے نمونہ ہے۔ متلون، مغلوب الغضب، متکبر، بے اصولے، گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان۔ جو شخص انھیں یہ خط لکھتا ہے "عماد الملک بہادر فخر الامائل والاقران۔ آپ کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعامی نہ ہو کر ایک زمانہ گذر گیا ہے لہٰذا کل صبح دس بجے شریک بریک فاسٹ ہوں تو باعث مسرت ہے۔" ایک خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں ایسی باوقعت خدمت سے دفعتہً استعفا دے دینا تمام مسلمانانِ ہند کے لئے ایک بدقسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر، صاحب رائے، تجربہ کار، واقف اسرار پھر دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ ....." یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے وہی شخص ان کو اچھوان کے استاد بھی ہیں دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدرآباد سے خارج البلد کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریذیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک معمولی شخص نہیں۔ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو ناروا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے اور آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے۔ جس روز حیدرآباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے) مائی ٹیوٹر، مائی ٹیوٹر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی معتمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک عرضداشت بغرض امداد انجمن پیش گاہ اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ امداد منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا "اسے قبول نہ کیجیے۔ انکار کر دیجیے۔ ریاست کے خزانہ پر صاحب بہادر کا قبضہ ہے۔" (اس وقت صدر المہام فنانس سر ریجنالڈ گلانسی تھے) میں نے اسے خلاف مصلحت خیال کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدرآباد اس برعظیم کی سب سے بڑی اور باعظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ سر سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے عروج کو پہنچ گئی۔ شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھولتی پھلتی ہے۔ سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی

تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم گراں آٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کش مکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں پر ابھارا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لئے کذب و افترا، بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ سازشوں کا یہ حال ایسا پیچ در پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی پھنس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا ؎

پاک ہیں آلائشوں سے بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

انھوں نے اپنے ذاتی رسوخ اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور بار فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار علی حضرت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی سیکرٹری نواب سر امین جنگ سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں امین جنگ کی جگہ آپ کے فرزند گرامی ہاشم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں مناسب یہ ہوگا کہ حضور امین جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرما دیں۔ محمد پیشی کی خدمت (جو بعد میں صدر المہامی پیشی ہو گئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ دار اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند عقیل جنگ کو کوتوال شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوتوال شہر کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار تو کیا کوئی امیر یا وزیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ عقیل جنگ اس کام کے اہل نہیں، کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے ساتھ اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے۔ لیکن نواب عماد الملک نہایت عزت و آبرو کے ساتھ آخر تک حیدرآباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔

برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے جو یونیورسٹی کمیشن ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تفتیش اور اصلاح کے لئے بہ صدارت سر تھامس ریلے مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب بھی منتخب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۰۲ء میں جب لارڈ کرزن امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں لارڈ منٹو نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۹۰۸ء میں میرٹھ کے اجلاس میں بہ زمانہ صدارت اور دوسری بار جب ۱۹۱۰ء میں کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں مدراس یونیورسٹی کے کانووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) میں خطبۂ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزاحیہ آتا تھا کہ کرسیں کہ ابتدا میں جن بزرگوں نے انگریزی معاشرت کی گرویدگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے رہنے سہنے میں بہت کچھ تبدیلی کر لی تھی وہ کھانا اپنا ہی کھاتے تھے۔ سر سید احمد خان، نواب محسن الملک،

نواب عماد الملک کے دسترخوانوں کا میں نے یہی رنگ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی اُبلے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے؟ اب تو لوگ وہ کھانے بھول گئے نام تک یاد نہیں، نہ ان کے پکانے والے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدر دان۔ اب جو کھانے ہم کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغلئی۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں۔ لیکن ان میں کہتے ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور آب و نمک کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ نواب عماد الملک بہت نفیس اور لذیذ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ دتارا آباد لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑا۔ شب کے کھانے پر وہ بار بار ٹوکتے تھے کہ کیسے جوان ہو تم سے تو میں بڈھا ہی اچھا ہوں تم سے دُگنا کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن یہ مرغن کھانا میں نے مزیات بھی تھیں مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بے چین رہی۔ صبح ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کی ٹھانی۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا اور ٹھہرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا میرے سامنے آتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ نواب صاحب میرے کم کھانے پر ہنستے اور طعن کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بیتی ہوئی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک دمنی اور حیدرآباد جا کر ہی دم لیا۔ نواب صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ بعض چیزیں خود بھی پکاتے تھے۔ خاص ادرک والی جس میں کرخ کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ قدر دان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ جب وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میٹھے چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر نئی تھی۔ نئی شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صحیح فرمایا۔ اس وقت پرانی شکر نہ مل سکی نئی استعمال کرنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت بکاول تھے۔ نواب صاحب کے ملاقاتیوں میں دو چار ہی ایسے تھے جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے رابطہ تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ وہ اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

پرانے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اس کے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سر سید احمد خان کی تھی۔ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک عزیز عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حسابات کی جانچ ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس تذکرے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے متعلق ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا درحقیقت اپنی سیرت، کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت

قابل قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہل تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرے اور تقیے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب رام پور مرحوم (حامد علی خاں) جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عماد الملک بہادر کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات ہمیں ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ تقیے کا تھا۔ حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے "التقیۃ دینی و دین آبائی"۔ وہ نہایت بے تعصب شخص تھے کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے مطلق کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "مولوی شبلی نعمانی مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے افارق کو شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عماد الملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ لہٰذا ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت تھی جو آپ نے ادا کی"۔ سررشتہ تعلیم بہت وسیع محکمہ ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا تقرر ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انھوں نے کبھی مذہبی پاسداری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت فراخ دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں کی جو اشاعت تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انہیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گفتگو میں اکثر محاسن اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام اہل حدیث (وہابیوں) کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانۂ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش داعی اور واعظ اشاعت اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آکر مہمان رہتے اور ان کے والدین کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں مسلمان کر لئے تھے۔ یہ نو مسلم بڑے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے مثلاً کھیت میں کوئی ہل چلا رہا ہے تو اذان سنتے ہی ہل جہاں تھا وہیں رہ جائے گا یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پر ہے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کوئی شخص قبر پر پھول چڑھائے یا اسی قسم کی کوئی اور بدعت کرے اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیادار پیروں نے آنا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے توہمات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسمٰعیلؒ کے دعوات کے تقرے اور سچے اسلامی جوش کے بہت قائل تھے۔ لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر آخر عمر تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کا مکمل خیال ہو گئی ان چیزوں کو وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خاں صاحب (فضیلت جنگ) صدر الصدور سے

قرآن مجید کی فصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظِ قرآن پاک کی مرسیقیت اور ترنم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیۃ الکرسی کے الفاظ میں ایسی حسنِ ترتیب ہے کہ وہ پیانو پر ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقائے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت ثنا خواں تھے۔ غالباً انہی کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ (لیڈر) مذہب کے بھیس میں آئے گا۔ کچھ مدت بعد جب گاندھی جی میدانِ سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے نواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے انھوں نے یک لخت اپنی طرزِ زندگی اس طرح بدل دی جیسے سانپ اپنی کینچلی بدل دیتا ہے۔ وہ ننگے سر، ننگے پاؤں رہتے گھٹنوں سے اوپر ایک غرقی سی باندھ لیتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا بڑا سا رومال یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہو گئی اور وہ دفعتہً موہن داس کرم چند گاندھی سے مہاتما گاندھی ہو گئے۔ ہندو خلقت ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہام و وحی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی، ہندوستانی اردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو تو ہندو مسلمانوں کو خلافت کے لاسے پر ایسا لگایا کہ ان کے سرگروہ اور علما گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست میں ایسا سمویا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خطوں کا جواب بالالتزام دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی فونٹین پن استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعفِ بصارت کا بھی عارضہ تھا انھوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریریں کسی سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔

میانہ قد، کھلا گندمی رنگ خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے، آخر زمانے میں ترک کر دیا۔ سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حقہ پیتے تھے۔ پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ سگریٹ سگار بہت ناپسند کرتے تھے۔ کہتے تھے جہاز کے سفر میں ایک بار سگریٹ سگار پینے کی کوشش کی۔ اس کی بو سے بہت تکلیف ہوئی اور حلق میں بھی خراش معلوم ہوئی۔ زبان میں بھی سی کلفت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی یعنی حیدرآبادی لباس پہنتے تھے جب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آ گئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۳ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں:-

۱۔ سوانح سر سالار جنگ۔ یہ نواب سر سالار جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔

سر سالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست دانی معاملہ فہمی، مردم شناسی اور قدر دانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سر سالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا تھا۔

۲۔ DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION۔ اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ڈبلیو ولٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسائل عماد الملک۔ اس میں نواب صاحب کے وہ تمام مضامین، خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں تحریر کئے۔

۴۔ انگریزی مضامین۔ مقالات و خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ۔ یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابلِ قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر و احادیث اور لغات اور علمائے ادب کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑی احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور تولتے تھے۔ اس کے ساتھ لفظی پابندی کا بھی خیال رکھتے۔ ان کے پیش نظر بائیبل کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سولہ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور بطور پروف کے چھپوا بھی لیا تھا۔ نظر ثانی کے وقت مولوی حمید الدین صاحب سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ افسوس کہ باوجود کبر سنی، ضعفِ بصارت اور ٹانگ کے صدمے کے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے۔ لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے جو رواداری، اعتدال اور اطمینانِ قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اونچ نیچ کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسنِ ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی طرزِ معاشرت اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوقِ علم اور ذوقِ تہذیب سے عاری ہوتے گو دنیاوی حیثیت سے ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہوتا، ملنے سے اِبا کرتے اور ایسے اصحاب ان کا برتاؤ خشک اور اُکھڑا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اہلِ علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ ان سے گھل مل کے باتیں کرتے۔

ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی، خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم یا طالب علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت اہل علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخدلی سے کام لیا اور اس سے ان کو سچی خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول، باوضع اور پابند اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روش زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات اپنے بزرگوں کی خودداری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں ان کا منتخب کلام سناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے دیکھ کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالی نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مظہر جان جاناںؒ نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطۂ جواہر" تھا۔ اس کا ذوق کی شاعری پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پرانے صاحب ذوق اور پڑھے لکھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگا وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گھر کے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے، اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوئی لیکن جیسی ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے سررشتہ کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری کیلئے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام نکالنا پڑتا ہے اور کبھی لڑ جھگڑ کر اور اپنے رسوخ سے کام لیکر منظوریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور غیور اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی رگڑ اور دوڑ دھوپ یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توقع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے انوکھے حالات اور ماحول کی آئے دن کی تغیرات نے بیزاری اور نئی طرز معاشرت نے تن آسانی پیدا کر دی تھی اور کام کا وہ ولولہ جو ابتدا میں تھا بعد میں نہ رہا لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض، فاضلانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دولت آصفیہ حیدرآباد کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

سر سید احمد خاں

عنایت اللہ دہلوی

• غالباً جون کی ششماہی کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم (مولانا ذکاء اللہ) جو اُس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے۔ گرمیوں کی تعطیلیں دہلی میں ختم کر کے الہ آباد واپس جانے لگے۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا، تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سید صاحب (سر سید مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر اُس وقت آٹھ برس کچھ مہینے تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر میں نے ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہوا تھا۔ سٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا، کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ لگا کر جھانکتا تھا۔ کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخرکار یہ وقت بھی آ گیا۔ ریل کھسکی۔ سٹیشن کی جتنی صورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی۔ کبھی سانپ کی طرح لہراتی جنا کا پل اُترتے ہی فرّاٹے بھرنے لگی۔ پہیوں کی لے دار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ میدان۔ کھیت۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہ تھا جو دوڑ کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی اشیاء بے تحاشا دوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوئے۔ اوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دور نظر آتی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ میں سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آ جاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل کی گرج جیسے گھر میں سن کر ڈر لگا کرتا تھا اب یہاں سنائی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اندھیرے کو چھوڑ کر روشن مطلع میں آ جاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کوئلہ کا ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہوا اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے سٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ۔ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اُتر کر انجن تک بخطِ مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلنا کہنا اس کے بعد اپنی

گاڑی کی طرف آتا۔ چلتی ریل میں دوڑ کر پائے دان پر کھڑا ہو جاتا۔ بڑے سٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آ رہا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ میں چھپا ہوا ہے مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتہً بڑی گرج اور لرز سے سٹیشن کی اونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ قلیوں اور مسافروں کا شور۔ سوٹے والوں کی بے تکی بولیاں۔ ہوٹلوں اور چائے خانوں کا چمکتا ہوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز دیکھتا۔ چاہتا کہ والد بھی اسے دیکھیں۔ کئی دفعہ آنکھوں میں کرنے کی راکھ بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہارا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آ گیا۔ والد یہاں اترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آ کر کہا کہ "سید صاحب کی گاڑی بھی ہے۔" سٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے رسائی میں آ کر گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دور سے دیکھے تھے۔ کبھی ان کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پنکھا چل رہا تھا مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر چیں کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی۔ سفید سر۔ سفید داڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہی سید احمد خاں تھے جنہیں دلی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آ گئے" والد صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سید صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں بھی سید صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور بھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرش پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ کے کرتے اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لگی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کورنس میرے لئے اس قدر پُر لطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی لطف نہیں دے سکتی۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو بچے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کورنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں ان میں سب سے زیادہ دلکش سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے مقبرہ کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دلی میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو خاصی رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا

تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر رحیم و کریم تھے کہ مجھ کو اپنے والد ان کے سامنے بہت دبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ ورنہ اس جا کیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا اُن کے گلے کی دوات کو بڑی حیرت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ہر کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اُسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اُس وقت چونکا جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ "تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ ناری کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا "پکھارو کو" جس پر فرشی پکھا فوراً رک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چھرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چھرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چھرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد اس کمرہ میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ اس کمرے میں جو شاہانہ تھا اُس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز تھی اُس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر اُن سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی۔ کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا اُس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا اُس پر بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد کچھ باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ سے تو خون نکل رہا ہے توبہ۔ توبہ" میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پان کھانا بری بات ہے۔

جب کھانا ہو گئی تو آدمی نے آ کر کہا "کھانا میز پر ہے" اس پر سب لوگ اٹھے اور کھانے کے کمرے میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر، چینی کے برتن، شیشے کے گلاس، چاندی کے چمچے، ہاتھی دانت کے دستے کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان، برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اُسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطاری کے وقت نکالے جاتے تھے۔ ماما میں اُن کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور چاندی کے کانٹے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روز مرہ مجھوایا جاتا تھا مگر اس کی صورت شکل اور مٹمٹاتی ہوئی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی وارمی کا دبلا پتلا سوکھا مگر بے حد چست و چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڑے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقین ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو اُن کے پلنگوں پر لے جا کر سلا دو"

سچ کہتے ہیں چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلتی ہے۔ بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں اُن کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی یا نہیں؟ والد بھی تو جواب دے دیتے تھے کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساٹھ آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرز معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا مگر اس کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ باغوں میں پھولوں کے پودے ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری۔ چمکتی ہوئی۔ ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔"

(عطیہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

مالک رام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ حبیب گنج میں رہا کرتے تھے، میں دہلی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا حلقۂ احباب مجھ ایسے میرزد ہیچمداں سے بہت بلند تھا، اور یہ کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے۔ غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۸۶۸ء میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا۔ اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور یہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر ادھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھو۔ ممکن ہے ان کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ بارے اب کے تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے۔ یہ تھی تقریبِ تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے

یہ نقل مجھے بھیجدی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی نکلی، تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحب ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط لکھی ہے یا نواب صاحب کے کاتب نے روانتی اصلاحیں دی ہیں۔ ان میں سے کتنی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی اٹکل سے انہیں درست کر لیا۔ پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار ان سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں طے کیا کہ جب دہلی جانا ہوا، تو ایک دن کے لئے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ اور اصلی نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے درستی کر لوں گا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ جائیے۔ یہ تو میری خواہش تھی، میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دہلی آیا۔ یہاں ایک دن اب یاد نہیں رہا، میں کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خاں کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے پھر ان کی خدمت میں لکھا کہ آپ کے ہاں حبیب گنج میں مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے، لیکن اب میں اسے آپ کو بھیجوں گا نہیں۔ اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہیے لے جائیے۔ میں خود کتنے دن سے وہاں جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن مکرر وہاں اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی حیص بیص میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے ہڑبڑا کے بستر باندھا اور بغیر اطلاع دیئے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے سٹیشن پر اترا ہوں تو بوندیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو پھر۔ لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے کہا اگر نہ ہوئے تو کوئی قیامت آ جائے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہرحال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں مرسس روڈ پر ان کی کوٹھی جیب منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرا کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آ گیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالوحید خاں صاحب کا تعارف کرا دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں، نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے خان بہادر حاجی مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خاں شیروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیرہ تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالحق خاں صاحب مرحوم کی (ضلع فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب زینب بیگم صاحبہ سے ہوا۔ مولانا عبدالحق خاں مرحوم مشہور کتاب ارمغانِ آصفی کے مصنف ہیں۔ جس میں فارسی مصادر کے حصوں کی اسناد کلام اساتذہ

سے جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب آٹھ حصوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سوانح عرب اور ایک تذکرہ شعرائے فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبدالغنی خان نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں یہی مولانا عبدالغنی خان صاحب جناب عبدالوحید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی ہمشیرہ تھیں۔ نفیس دلہن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو تین سال ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے ؎

ہستند را خوش نفسانند سخن در کہ بود ۱ باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی و نگاہ ۲ حسرتی، اشرف و آزردہ بود و اعظم شان
غالب سوختہ جاں، گرچہ نیرزد بہ شمار ۳ ہست در بزم سخن، ہم نفس و ہمدم شان

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبدالغنی صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۴۲ء میں اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے "بنیاد سخن فتاد"۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خاں آگرہ کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عزت النسا بیگم صاحبہ کا نام صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انھوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خاں اور ان کے بڑے صاحبزادے ولی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی ننھیال سے بھی دین کے تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تر خیر ان خداداد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے۔ ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالغنی خاں سے منسوب تھیں اور جناب عبدالوحید خاں صاحب انہی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں کی پرتی کے بیٹے پوتے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا، وہ انہی نے نواب صاحب مغفور کو دیا تھا، جو ان کے خاندانی کاغذات میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ، بحر طویل میں چلا گیا۔ بہرحال جناب نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے انھیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دوزانو بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے قیافے سے فوراً پہچان لیا۔ پہلے حلیہ سنیئے۔

بہت لانبا قد، کوئی چھ فٹ کے قریب، اکہرا جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک، خضاب لگی ہوئی بھرواں داڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر

بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غالباً اُسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اور اس کے اوپر منڈلے کی شکل میں سپید شال اوڑھے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور اُٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا، آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو، مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپنے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑ توڑ انھوں نے چار سوال کر دیئے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت نیچی تھی، اور ایک ایک لفظ انھوں نے الگ الگ کہا۔ کمرے میں پہنچے تو بیٹھتے ہی فرمایا، میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، قبلہ جوانی کی بھی ایک ہی کہی، ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے، وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے "غمِ عشق نہ تو خیر نہیں" غمِ روزگار نے ہمیں پریشان رکھا، اس لئے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ کہنے لگے، میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی "سبد چین" کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا ہی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ آپنے موتمن کے فارسی دیوان سے متعلق پوچھ لیا، پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا، میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت اُن کے ساتھ گزارتا ہوں، اور واپسی بالعموم عشا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوعِ سخن بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اُن کے آرام میں خلل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دل سوزی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام بھی ہوئے تو انھوں نے قطعی کسی طرح اُسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطف سے فرمایا۔ ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجئے۔ کل صبح انشاء اللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا، یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کونسا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ سنجیدگی سے ہونے لگی تھی، اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشندان میں کچھ خرابی تھی۔ یہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکتا تھا۔ رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ خیر صبح کو اُٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور اُن کے مصاحب مُلا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور مُلا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب

تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا، اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہی تھی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا۔ محتشم صاحب آگئے۔ ملازموں نے کرسیوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ اللہ اب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے، تو اس سے یہ خیال نہ کرو، کہ مجھے اس سے توارد ہو گیا ہے، بلکہ یقین جانو کہ اس نے نہاں خانۂ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے، جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غلطی سے میرے حصے کی چیز یہاں آگئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے اردگرد پڑی تھیں ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا، وہ ایک کتاب منگواتے، مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعرا طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدا ہے تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن انھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی تحریریں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ دیکھئے یہ سرخ روشنائی کی تحریر طالب کی ہے۔

یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے شہر میونخ (میونخ) میں ہے، اسے کتاب خانے میں ہے۔ جو اس سے صرف چھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میر نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتاب خانہ میں رہا ہے۔ یہ رہیں ان کی مہریں۔ صاف پڑھا جاتا ہے "محمد اورنگ زیب بادشاہ"۔

یہ شیخ سعدی کی بوستان ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر۔ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن پہلے ایک تازہ فتوح آئی تھی۔ ملا سعد الدین تفتازانی کی مطول ہاتھ سے کہہ کے اسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ آہی عبارت بہت قدیم اور منقش تھی اور باقی آدھی تازہ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا، پاس ہی میز پر مکبر شیشہ پڑا تھا۔ اٹھایا اور اسے میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھئے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ میں رک رک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نور الدین بن اکبر شاہ غازی" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔

بابر بادشاہ کے بیٹے کامران کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے عکس دیئے گئے ہیں، جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں یادداشتیں ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ مطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کا سوادِ خط بالکل وہی ہے جو کامران کے دیوان میں ہے۔ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا تو آپ نے کامران کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنت نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے اسے دکھاتے اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا مبصر یا صاحب علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر یوں کتاب پر کتاب نکلوا رہے تھے، گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کوئی کتابوں کا قدردان ملا ہو، اور میں اپنی بے مائگی اور ان کی ذرہ نوازی پر عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شعر ہے ؎

یاراں زمہربانی دانند ہر چہ دانند
ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ مائیم

اصل بات یہ ہے، کہ وہ بفضلہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اساسی اور بنیادی طور پر علمی آدمی تھے۔ ان کی روح اور ذوق کی تسکین اگر ہوتی تھی تو کتابوں سے یا صاحب علم اصحاب کی صحبت میں۔ جہاں کہیں انھیں یہ دونوں چیزیں میسر آجاتیں ان کا بیرونی پردہ، جو بہرحال عارضی چیز تھی، اٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا، تو وہ بے نقاب ہو گئے۔ صحیح یا غلط، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا، کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدردان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں علم کا شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں گویا قدر مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا، کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا اندوختہ نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبۂ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا، کہ آپ کا بچہ، جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہم جولیوں کو نہ دکھلائے، اسے چین نہیں آتا۔ اس کی تہہ میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھلونے سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی نمائش کی خواہش۔

نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتب خانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا، کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس لئے بسا اوقات واقعی صاحب ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ دعوتیں دے دے کر انھیں بلاتے۔ اپنا مہمان رکھتے اور جب واقعی کوئی قدردان مل جاتا، تو پھولے نہ سماتے۔

عربی کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیر مقام فی الدنی سرج سابح
وخیر جلیس فی الزمان کتاب

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔
یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا طغرا ہے۔ ریاست کی ایک تکونی مہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آکے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک پرانا اور دل کش قلمی نسخہ تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات کی تصاویر بھی دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کو آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں ان کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے تو واجبی ہی سی تھیں۔ البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کر آیا ہوں وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۸۵۸ء لکھی ہے جو بداہتہً غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث ہوئی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔ بہرحال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ ذکر غالب کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعے کے لئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گزارش کی کہ "سبد چین" کا مطبوعہ نسخہ دلوائیے تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

"سبد چین" کی پہلی ۱۸۶۵ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگوایا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے حبیب گنج والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام بارڈنگ لائبریری دہلی کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا۔ اس کے باوجود میرے شائع کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں جن کا مجھے افسوس ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملا احمد مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دسترخوان لکڑی کا ایک نیچا سا تخت تھا۔ اس پر سفید چادر تھی۔ تخت کے چاروں طرف گدے تھے۔ ہم لوگ ان پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب مغفور دسترخوان کے ایک سرے پر تھے۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر ان کے خلف اکبر خان بہادر محمد عبدالرحمٰن خان صاحب تھے۔ اور ان کے بعد ملا احمد۔ نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بس یہیں پانچ کھانے پر تھے۔

کھانے میں قورمہ پلاؤ تھا۔ مرغ کا سالن تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لا کے رکھی۔ یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں تھوڑا سا نکال کے مجھے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی۔ جناب خان بہادر نے یہ کہہ کے مجھے پیش کی کہ شوق فرمائیے۔ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان

دیکھتا رہا۔

چار بجے کے لگ بھگ میں پھر بڑے کمرے کی طرف گیا۔ نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے جا رہے تھے۔ مسجد بڑے پھاٹک کے باہر ہے جہاں جماعت ہوتی تھی۔ اُن کی واپسی پر ہم رات کے کھانے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لئے اُٹھے۔ لیکن نماز کے بعد سیدھے وہیں واپس آئے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام اور انگریز ریذیڈنٹ سے اپنی چپقلش کے حالات سناتے رہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ مرحوم کی وضعداری کا ایک قصہ قابلِ ذکر ہے۔ فرمایا، مجھے پان کی عادت ہے، لیکن تمباکو نہیں کھاتا۔ میں جب پہلی مرتبہ مہاراجہ بہادر کے ہاں گیا تو وہ خاصدان میں پان رکھ کے لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جا کے اب دوسری مرتبہ وہ زردہ لے کے آگئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ میں حیدرآباد میں بارہ برس رہا اور مہاراجہ بہادر سے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ جب بھی میں اُن کے ہاں جاتا، وہ پہلے پان کی گلوری لاتے جو میں لے لیتا۔ پھر تمباکو لاتے میں شکریہ کے ساتھ عذر کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے تمباکو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

برادر دوست ماہر کہ بے منت قدم سایہ
بہر گاہیکہ بر دارد، از و پائے ز من چشمے

کتبہ حبیب الرحمٰن

بفرمائش مالک کرم صاحب بوقت ورود ایشان در حبیب گنج ۱۷ شوال المکرم ۱۳۵۶ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء۔

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے پہلے "سبد چین" اور پھر "ذکرِ غالب" شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے آن کی خدمت میں بھیجے۔ حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے بہت تعریف کی۔

(۲)

اتفاق سے میں ۱۹۳۹ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا، اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں واپس وطن آیا۔ اس تمام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ میں جب لوٹ کے آنے والا تھا، تو انھوں نے لکھا کہ جب واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعمیلِ حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں حبیب گنج گیا۔ میں نے جانے سے ایک دن پہلے تار سے انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی۔ میں صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا تو نواب کے پھر جناب عبدالحمید خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں جو اتنے دن کے وقفے کے بعد کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہرحال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب قبلہ حبیب گنج میں ہیں۔ میں فوراً اودی جانے والی لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ اب رستے کا حال کیا بیان کروں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے

پچھلے دس برس میں سڑک کی مرمت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سڑک کہنا ہی غلط تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور ان کے بیچ میں ایک خاصی چوڑی روش تھی۔ جس پر بہت باریک مٹی کی چھڑکاؤ تہہ جما دی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد و غبار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا۔ اور اگر بدقسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر آ نکلتی تو پھر خود ہی تصور کر لیجئے کہ مسافروں پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا اکے یا تانگے پر طے کرنا تھا۔ یہاں میں اڈے پر اترا اور ایک تانگے پر بستر رکھ کر آگے روانہ ہوا۔ لیکن بدقسمتی اتنا خراب تھا کہ ہچکولوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ ناچار دو تین فرلانگ کے بعد میں اتر کھڑا ہوا باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی۔ اور سامان تانگے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے غربی برآمدے میں فرش پر بیٹھے حسب معمول تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ میں ملا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہوئے تو میں نے جھک کر سلام عرض کیا۔ چونکہ اب اونچا سننے لگے تھے اس لئے سنا نہیں۔ ملا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہئے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب لے جا کر خاصی اونچی آواز سے دوبارہ کہا آداب عرض کرتا ہوں۔ چند لمحے تک غور سے دیکھا۔ میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک لخت پہچان کے مروقہ کھڑے ہو گئے اور لپٹا لیا۔ اللہ اکبر اس معانقے کی گرم جوشی سے اب تک لذت اندوز ہو رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ میرا تار انہیں موصول نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تار میں نے ہی گڑھ کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہاں سے جناب عبدالوحید خاں صاحب نے آگے دستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے آدھ پون گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک لے کے آیا۔ اسی میں تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا، وہ پانی کا لوٹا، صابون، تولیا وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی۔ سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے فرمایا۔ مغرب کے بعد آپ کی پچھلے سات برس کی رام کہانی سنوں گا، کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسر و چشم شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آ گئے۔ نواب صاحب اور ملا احمد اور میں۔ اگرچہ میں نے اس پچھلے سات برس میں شرق اوسط و افریقہ کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی، لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا کہنے لگے، دیکھئے صاحب! اردو میں گفتگو نہیں ہوگی آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے، تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں، کہ وہ ان کی سمجھنے اور انہیں سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی، کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان کو ادرجہ کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرائمر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو چھوڑیئے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سنا ہوگا۔ خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میرے ایک مصری دوست

ہیں، وہ کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قنصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی باشندے کسی کام سے اُن کے دفتر میں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے، فرمانے لگے، قسم لے لو، جو میں اُن کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں، آخر ایک ترجمان بلانا پڑا، جو طرفین کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا، اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ عربی میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ لوگ انھیں بے تکلف بولتے ہیں، اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نہ انھیں معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے لفظ راہ پا گئے ہیں مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس بیرونی آلائش سے کچھ محفوظ رہی ہے، تو حجاز کی زبان، اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ عربی عوام ہی تک محدود نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کریں گے تو اسی وارجہ زبان میں۔ یوں لکھنے کو ٹھیک لکھیں گے، کیونکہ کتابی زبان نہیں جانی، لیکن بولیں گے یہی عام بولی۔

اسی صورت حال کو مدنظر رکھ کے میں نے عرض کیا کہ مجھے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن بے اختیارانہ میری زبان پر وارجہ کلمات آجائیں گے جو اول تو آپ سمجھیں گے نہیں اور اگر سمجھ بھی گئے تو عربی کا ہے کو، یہ اچھا خاصا مذاق بن جائے گا۔ فرمانے لگے، پروا نہ کیجئے۔ چنانچہ ہم پہلے پندرہ بیس منٹ تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوشش کی کہ حتی الوسع میری زبان نحوی اور صحیح ہو لیکن پھر بھی مشق نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں وارجہ لفظ آ گئے۔ موضوع سخن اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشری مسائل سے متعلق پوچھتے رہے۔ جب میں نے بتایا کہ عوام بہت غریب ہیں اور دولت کی تقسیم بہت غلط طریقے پر ہوئی ہے۔ ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو کے رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں۔ مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بلکہ خلاف اسلام تمدن و معاشرت ہر جگہ عام ہے تو بہت افسوس کرتے رہے۔

اس کے بعد اردو زبان و ادب کا سلسلہ چلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خطوط قید خانے میں اُن کے نام لکھے تھے، اُن کا مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے تھوڑے دن پہلے ایک اور مختصر کتاب اُن کے ایک عزیز نے مرتب کر کے "کاروانِ خیال" کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ اُن کے اپنے خطوط بھی ہیں۔ "غبارِ خاطر" کا ایک بہت خوب صورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط بھی زیادہ ہے جس میں اسلامی موسیقی سے متعلق بحث ہے۔ "کاروانِ خیال" کے ساتھ اس خاص ایڈیشن کا ایک نسخہ میز پر پڑا تھا۔ دونوں کتابوں کو اٹھایا اور اُن پر دستخط کر کے مجھے عنایت فرمائیں۔ پھر مولانا آزاد کی تحریر و تقریر اور حافظے اور ہمہ گیر شخصیت کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں۔ چنانچہ میں نے اُن کے خاندان، تعلیم اور حیدرآباد کی ملازمت سے متعلق کئے سوال کئے۔ جواب دیتے رہے۔ پھر فرمایا، میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں علی گڑھ کے رسالے مصنف میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں در آئی ہیں۔ بہرحال اس پر ایک نظر ڈال کے آپ کو بھیجوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ یہ پرچہ انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں خود ان کے قلم سے ہیں، بعض کسی اور کے۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوانِ غالب کا ایک نسخہ ہے جس کا پہلا اور آخری ورق غائب ہیں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ قرائن سے البتہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں نیر رخشاں کی لکھی ہوئی تقریظ ہے میں نے غلط فہمی نکالا کہ یہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں شائع ہوا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح "ذکرِ غالب" کے پہلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اب یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ۱۸۵۵ء میں اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک نئی الجھن پیدا ہوئی کہ آخر میرے پاس جو نسخہ ہے یہ کہاں اور کس سال میں چھپا۔ میں احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا کہ اگر کتب خانہ حبیب گنج میں بھی اسی ایڈیشن کا کوئی اور نسخہ ہو تو مقابلے سے یہ معمہ حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مطبع احمدی شاہدرہ دہلی والا ۱۲۷۶ھ کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں بعض شعر چھپنے سے رہ گئے۔ بعض دوبارہ چھپ گئے کتابت کی غلطیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اسی لئے میرزا نے فوراً مطبع نظامی کانپور میں نیا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت دے دی تھی۔

ہمیں کتب خانہ میں آ کے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ فرمایا۔ لیجئے آپ سے متعلق ایک شعر ہو گیا ہے ؎

اے مالکِ ملکِ وفائے یاراں
دل رام تو شد فدائت صد جاں

میں اٹھ کے آداب بجا لایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمائیے۔ وزنگ تصویروں کے ذخیرے میں سے تلاش کرتے رہے سب پرانی چیزیں تھیں۔ اور ان میں سے بھی کوئی اکیلی تصویر نہ نکلی۔ چونکہ میرا شام کو واپسی کا ارادہ تھا۔ فرمانے لگے چلئے میں آپ کے ساتھ علی گڑھ تک چلتا ہوں، وہیں اکٹھے تصویر اتروائیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے زحمت کچھ بھی نہیں۔ میں کل تو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤں گا۔ یوں علی گڑھ تک اور ساتھ بھی رہے گا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے کل کسی کام سے الہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے روانہ ہوتے ہوتے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن، پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم علی گڑھ پہنچے، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نہیں رہا تھا کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت اتروا کر بھیج دوں گا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہے گا کہ آپ اس میں نہیں ہوں گے۔

راستے میں گرد و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دل بادل کو دیکھ کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہو گئی ؎

زمیں گرد میداں کہ بر شد بہ دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر خود حافظے پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسبِ موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لیکن یوں اچانک ایک شعر

سن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیاتِ شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جا بجا اضافے کئے جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں یاروں کو مشغلہ ہاتھ آیا اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمونوں کا ایک تار باندھ دیا۔ بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً حیدر آباد ریڈیو سے ایک تقریر بھی اس موضوع پر نشر ہوئی تھی جس وقت وہ شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے میرا ذہن "شعر العجم" کی طرف منتقل ہو گیا جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے میں شاہنامے پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آ گیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی جن اصحاب نے "حیاتِ شبلی" پڑھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا برملا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی، اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں، جو اس موضوع پر ذمہ دارانہ اور واقف کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہر حال انھیں کے خوشہ چین ہوں گے۔

ان ہی رعایتوں کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ نے "حیاتِ شبلی" میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا، کیوں آپ کا اشارہ کس طرف ہے میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کر کے وہ گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں محض خطائے بزرگاں گرفتن خلاست" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے، جو اب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے۔ فرمایا۔ ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے خطوطِ شبلی بھی ضرور دیکھی ہوں گی جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے، فرمایا۔ ہاں یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے اتنی تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی "پردہ داری" تھی۔ کہنے لگے، مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یہی سہی۔ لیکن آپ اصحاب کی یہ کاہل خموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے "فائدہ"۔ فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے مورخ کے لئے روشنی مہیا ہو جائے گی، اور اس کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے

گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور جرم استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے "لاتکتموا الشہادۃ" کسی سلسلے میں اگر تمھیں کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اسے مت چھپاؤ، اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

لے آمدنت باعث آبادی ما
ذکر تو بود زمزمۂ شادی ما
بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورود مکرر بمقام حبیب گنج

فی البدیہہ

اے مالک ملک وفائے یاراں
دل رام تو شد فدائت صد جاں

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ
حبیب گنج، ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی لیکن پھر بہت بے قاعدگی پیدا ہو گئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بار خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالوحید خاں صاحب سے ان کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن آن کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن ہی کے سات بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۳)

عمر بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ بھی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۶۴ برس تھی۔ یعنی کتاب مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ ٹالے نہیں ٹل سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس ہی رئیس تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ پھر ملک کے علم و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہوگا جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شاد کام اور فیض یاب نہ ہوا ہو۔ یہ بھی قابل فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دور کی وہ پیداوار تھے وہ دور ہی ختم ہو گیا۔ اب ان کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس دور کی یادگار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کل اس کے

بعد گھپ اندھیرا۔

زمانے نے اپنا ورق الٹ دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص، دوستی اور وفا، اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دُنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر کوئی لفظ نہ ملے۔ وضعداری، ایک قانون، ایک ضابطے کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں، اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے اب کوئی طاقت آپ کو اس سے اِدھر اُدھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا ہوئی اُسی طرف پھر گئے۔ اسے ہم وفاداری بشرطِ استواری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میرؔ کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
جب کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

ابوالکلام آزاد

غلام رسول مہر

نو افزونست زاندازۂ بر شمع عود
غزلی بہ ترمزمہ خوانم کہ پر و بالیست اند

۱۹۱۳ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دستخط کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ "حزب اللہ" کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا، لیکن دوستوں پر اعتماد تھا اس لئے تردید کے بغیر دستخط کر دیئے۔ دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے۔ اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں۔ اوپر جلی حروف میں "من انصاری الی اللہ" مرقوم ہے۔ اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ۔ پایان تحریر نام، پیشے، عمر اور رہنے کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ بھئی! کوئی دلچسپ مشغلہ بتاؤ، جس سے نتیجۂ امتحان کے انتظار کا وقت بخوبی گزر سکے۔ انھوں نے کہا کہ اخبار جاری کرلو۔ اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کر دئے۔ ایک روزانہ "زمیندار" دوسرا ہفتہ وار "الہلال"۔ "الہلال" کا چندہ اس زمانے میں آٹھ روپے سالانہ تھا اور اعلان ہو چکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے "ہلال احمر فنڈ" میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے ہم خرما و ہم ثواب کے پیش نظر فوراً درخواست بھیج دی، لیکن نہ اس وقت تک "الہلال" کی شکل دیکھی تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس قسم کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ "حزب اللہ" کا فارم "الہلال" ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد "الہلال" کا وی۔ پی آ گیا۔ پرچہ کھولا تو پورا ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پڑھنے کا میں عادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے "ہلال احمر فنڈ" میں چندہ دینے کا ثواب "میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ لیکن "خرما" کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ ویسے ہی رکھ دیا اور اس کے کسی حصے سے استفادہ کا سوال باقی نہ رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھے بغیر ایک جگہ رکھتا جاتا۔ چھٹا ساتواں پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا اس لئے طبیعت پر جبر کر کے مضمون پڑھا کہ جس جماعت

سے وابستہ ہو رہا ہوں، اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر تمام پرچوں کو اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر بڑا افسوس کرتا رہا کہ پہلے دن اس کا باقاعدہ مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا۔ ؎

بے غم عشق تو صد حیف از عمرے کہ گزشت
پیش ازیں کاش گرفتار غمت می بودم

میں گاؤں میں رہتا تھا جہاں ہفتے میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی۔ "الہلال" کی آمد کے دن ڈاکیے کی پیشوائی کے جوشِ اشتیاق میں میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل باہر نکل جاتا۔ جہاں وہ ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو دوست یا عزیز ملنے کے لئے آتے، ان سب کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ "الہلال" سے عشق و شیفتگی کی ابتدا تھی۔ اسی وقت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ چالیس سال کی مدت میں کاروانِ حیات نے وابستگی و انقطاع کی سینکڑوں منزلیں طے کیں۔ لیکن یہ رشتہ استوار سے استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل بہت قریب نظر آتی ہے، اس تعلق کو زندگی کی ایک عزیز ترین متاع سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور میری درخواست پر انھوں نے اپنی ایک دستخطی تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اگرچہ اس واقعے کو ایک عمر گذر چکی ہے، لیکن آج بھی تصویر پانے کی لذت اسی طرح محسوس کرتا ہوں، گویا یہ نعمت ابھی حاصل ہوئی ہے۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی جب میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کانفرنس سے مراجعت پر برنگیز ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا تو اپنے ذہن میں جو تصور قائم کر رکھا تھا اس سے وہ بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قامت، جسم نہایت دبلا پتلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی موچھ صاف، کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا کہ آج شام کے چار بجے طے مقررہ وقت پر حاضر ہوا تو ان کے علم و فضل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ جذباتِ عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کے لئے ہر کوشش ناکام رہی، گویا یہ نقشہ پیش تھا ؎

آزردہ ز من حال شب وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

مولانا نے پوچھا کہ بی اے پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کروں گا، تاکہ ملک و ملت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا "مشغلہ اچھا ہے، لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس طرح منزلِ مقصود کے قریب پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟" فرض کرو کہ ابتدائے کار ہی میں آرزو کے مطابق سامان میسر آجاتے ہیں تو اخبار کے استقلال اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لئے کم و بیش دو سال کا انتظار ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا۔ گویا جس ذریعۂ خدمت سے کام لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہو، اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک حصے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہو جائے گا۔" میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

"الہلال" بند ہو چکا تھا مولانا نے "البلاغ" نکالا تو اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں "دارالارشاد" قائم کر دیا جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآن حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا "الہلال" کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے۔ لیکن "دارالارشاد" کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے انہیں بنگال کے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ رانچی چلے گئے تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی "البلاغ" بھی بند ہو گیا اور "دارالارشاد" بھی۔ اس اثنا میں درس صرف اڑھائی تین پارے تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذات بابرکات سے استفادہ کی جو آرزوئیں موجزن تھیں وہ بھی خون ہو کر رہ گئیں ——

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو ملک میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو گئے۔ میں اس زمانے میں زمیندار سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیازمندی کے روابط کی تجدید ہوئی۔ اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتۂ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضلِ اللہ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے عہد کی عام حالت یہ ہے کہ حسنِ نیت کی بنا پر بھی کسی سے اختلاف ہو تو اسے ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اس وصف میں بھی یگانۂ حیثیت کے مالک ہیں کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انھوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم و فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا جو نصف صدی سے اس کرۂ سرزمین کے آسمان پر آفتابِ جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں کی اقلیموں کے تاجدار ہیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں کسی زمانے میں بھی مشہور فرمانروایانِ علم و فضل کے لئے یکسر حیرت انگیز تھیں۔ جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انھوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے۔ سلیم نے کہا یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ "الہلال" کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالی کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کہلا بھیجا۔ نیز فرمایا کہ "الہلال" آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ "ارمغانِ فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ نکلتا تھا جس کی ماہانہ طرحوں پر کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلدستے میں شائع

ہوتی تھیں۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخی رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ انھی کی ہوتی ہیں۔ ایک روز مولانا مسجد سے نکل رہے تھے۔ نادر شاہ خان نے روک لیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لئے تقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ انھوں نے زمین بتائی "یاد نہ ہو" "شاد نہ ہو" مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیئے۔ نادر شاہ خان بولے کہ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے۔ مولانا نے یہ توقف کیا۔

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

نادر شاہ خان نے کہا کہ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔

شمس العلماء شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی۔ شبلی ۱۹۰۵ء میں لیبیا گئے تو اس زمانے میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے۔ دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابوالکلام آزاد یہی ہیں۔ جب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ "الندوہ" کی ایڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ خدمت انجام دی۔

بہرحال جو وجود عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابر علم و فضل کے لئے باعث حیرت و استعجاب بن گیا تھا اس کی شان و عظمت کے متعلق میں کچھ زبان کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا ہے۔ اس کی محسوس و مشہود مثالیں "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ "تذکرہ" رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں لکھا گیا، جب مولانا کے پاس کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ "غبار خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جا سکتیں۔ "غبار خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ "مآثر الامراء" کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے "غبار خاطر" میں درج کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ استصواب کی غرض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا "منقولہ عبارت درست ہے اور یہ "مآثر الامراء" کی فلاں جلد کے فلاں صفحے پر فلاں طرف اوپر کی سطروں میں موجود ہے۔ میں نے تیس سال پیشتر "مآثر الامراء" دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لوح حافظہ پر منقوش ہیں۔"

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینۂ طبع کے درخشاں ترین جوہر ہیں۔ انھوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی، ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے۔ انھوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انھیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے۔ لیکن ان کی شان عزیمت

ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دل گداز مرحلہ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ اگر حکومت سے کچھ کہنا ہو تو میں اسے فوراً بھیج پہنچا دوں گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقۂ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پنڈت جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے، اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

> "جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی ..... میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

> "میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن ..... اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا، اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحب عزیمت رفیقۂ حیات اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوئیں جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو بھی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں بخشندۂ حیات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزانی ہوئی ہوں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ مولانا اس افتاد پر انتہائی اضطراب و پریشانی سے تو محفوظ رہ سکے، جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ یہ سچ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ صبر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان موجبات غم کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساسات حزن پر قابو پالے اور انھیں مناسب حدود سے تجاوز کا موقع نہ دے۔ یہ نہیں کہ احساسات مرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح مولانا بھی احساسات سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ رفیقۂ حیات کی خطرناک علالت کا خط ملتے ہی ان کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی۔

خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اسیر تھے اور پاس رہ کر تیمارداری بھی نہ کر سکتے تھے، جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعث تسکین قلب ہوتی ہے۔ یقیناً انھیں بھی آرزو ہوگی کہ رہائی ملے تو خود اپنی اہلیہ کا علاج کرائیں اور تا بہ حدِ امکان اس کا دکھ مٹانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی۔ انھوں نے جب اس راستے میں قدم رکھا تھا تو ان تمام قربانیوں کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں۔ جب پے بہ پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے ایک صاحبِ عزیمت انسان کی طرح انھیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا:۔

"ہر وقت دسے پیش نظر رکھئے کہ استقامت اصل کا ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ؎

ہاں، رہ عشق ہست کہ رفتن نداردو باز گشت
جرم را اینجا عقوبت ہست و استغفار نیست

دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیئے، لیکن جب اتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں کا سامنا ہو جائے لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے، اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے۔"

مولانا کی ذاتِ گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلاشبہ ان کے قلب پر بھی رنج و الم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عزیز ترین رشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہیں لیکن انھوں نے مقامِ صبر کے واجبات جس شانِ عزیمت سے ادا کئے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ موجباتِ غم سے متاثر ہونا ہر قلبِ سلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پا لینا صرف صابرین، مبشرین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے۔ جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا۔ میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہ طے کر چکے تھے، اس پر مدت العمر بے خوف و خطر لائحہ قائم رہے۔ یہ ہیں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویدارانِ عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انھوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل بھی فراہم کر لئے۔ لیکن مولانا کے نزدیک صحیح، مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش دس سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ وسائلِ معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر لئے تھے اور جن میں وہ سب سے بڑھ کر کامیاب

تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا تر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم مل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر عنفوانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے لوگ اپنی آنکھیں ان کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا غلط مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرم جوشیوں کا اظہار ہوتا رہا، وہ شاید مولانا محمد علی مرحوم کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دل عزیزی انہیں اس وقت حاصل تھی جب ان کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کا ملا جلا بے غرضانہ تھی یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے جنہیں مختلف گروہوں نے صاحبِ اختیار و اقتدار دیکھ کر تیغ بابِ مقاصد کا مرجع سمجھ لیا ہو۔ لیکن انہیں پیشِ نظر مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں شاید بہت دل پسند معلوم ہوں۔ لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آسان بر صفِ آتش زدن
می نماید گرچہ از پروانہ خویش

یہاں سوال مولانا کے افکار و آرا کی درستی یا نادرستی کا نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ ان کی شانِ عزیمت و استقامت واضح ہو جائے۔

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے عملی دائرے میں جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ حیثیت کے مالک ہیں مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرتِ ثانیہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ اوّل وقت اٹھتے ہیں گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں ؎

مباد ست سحری را کہن نظیری کم
کہ ہر چہ کرد دعا بائے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ملاقات کے لئے کوئی وقت بتائیے۔ فرمایا "صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتے ہو" وہ آٹھ دس دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ بجے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ تین گھنٹے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دلی گیا تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس دن ان کے پاس ٹھہرا رہا۔ یہی صبح کا وقت گفتگو کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں عمر گزارنے کے باوجود انہیں خلوت و تنہائی بہت پسند ہے۔

تنہائی و خلوت طلبِ عشق نظیری
ایں خیل و خدم را بہ امیرے بخش

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً ۱۹۳۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور بہت کم کھاتے ہیں۔ آج کل تو غذا کی تعطیل غیر معمولی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لطیف چینی

چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے ہیں اور اس کے دلکش تذکرے غبارِ خاطر میں جا بجا موجود ہیں۔

انھوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ نیاز بہ آسانی قبول نہیں کرتے جنھیں انتہائی شفقت و نوازش سے انھوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا ہے۔ ایک مرتبہ انھیں عرق النسا کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ۔ میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہوگا۔ میں نے حالات سنائے۔ حکیم صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے دوائیں کلکتہ بھیجی گئیں۔ ان سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ دوائیں کچھ دیر جاری رہنی چاہئیں۔ مولانا نے لکھا:

"مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تامل نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جوہر منقی وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے تو ضرور کرونگا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دواخانے کو حکم دے دیا کریں تاکہ مرکبات وی۔ پی پارسل کے ذریعے پہنچتے رہیں۔ اس صورت میں شکر گزار ہوں گا اور انشراحِ خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہیئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں گے تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کرونگا نہ اعتماد دوا اجرا کی حالت گوارا ہو سکے گی۔"

ایک مشہور عالمِ دین نے مولانا کی تفسیر فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمناً یہ بھی لکھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو میں بھیج دوں۔ فرمایا۔

"کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔"

"۱۹۱۸ء سے میں نے جن جن باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھنے کا ہوگا، جواب دونگا، تاہم اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کرونگا۔"

پنجاب کے ایک سیاستداں نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک بالکل بے اصل تھیں۔ انھوں نے مجھے لکھا:

"اگر میری طبیعت کا وہ اندازہ ہوتا جو اس وقت صاحبِ الہلال نکالتا تھا، تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں؟"

آخر میں فرماتے ہیں:

"اگر ایک مدعیٔ اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل۔"

ایک مرتبہ ورنگ ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک مراسلے میں شعلہ اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا:

آں بخت نداریم کہ ہم بزم تو باشیم ما و سر راہ تو و آہے و نگاہے

انھوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا بیان کیا مرتع تھا:

"ایک حدیث قدسی ہے: من تقرب إلی شبراً تقربت إلیہ ذراعاً

وجو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں

عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تحقق سے محروم نہ رہوں۔ اب

بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا: ع ہزار بار بر و صد ہزار بار بیا"

مضمون بہت طویل ہو گیا۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ کہہ سکا۔ وہی عرفی والی بات ہوئی کہ ؎

زباں ز نکتہ فرو ماند و راز من باقیست بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے ایک طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے تھے کہ خلافِ عادت ان کے قلم سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے۔ فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی ؎

تا رو ابرو بہ بازار جہاں جنس دنا دانتے گشتم و از طالع دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم، فنون، ادب، انشا، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں میرے فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ تحدیث نعمت ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا۔ اس نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس مہم اور عمل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گستری ہے، نہ تعلی بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش مجھے اندازہ شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا ؎

وعدہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

مہدی حسن

عبدالماجد دریابادی

سنہ ولادت تخمیناً ۱۸۶۳ء، ۱۸۶۵ء ہوگا۔ وفات ذی قعدہ ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ عمر ۵۰ سال کے اندر ہی رہی۔

ہوش کی آنکھیں جب کھولیں تو اپنے وطن گورکھپور میں رنگ پیدا ہوا ریاض خیرآبادی کا ——— ریاض کا وطن اختیاری گورکھپور تھا۔ وہیں شباب گزارا۔ وہیں سے ریاض الاخبار ہفتہ میں دو بار (سہ روزہ کی اصطلاح اس وقت تک نہیں چلی تھی) نکالا۔ وہیں سے نقشہ اور عطر نقشہ کے شگوفے چھوڑتے رہے۔ اور وہیں سے انگریزی ناولوں کو اپناتے رہے۔ آج یہ سارے نام اور حوالے قصہ طلب معلوم ہیں۔ ان کی دلفریب نثر بھی سنتے چلئے ——— ریاض الاخبار نام کا سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی ادبیت اس کی سیاست پر کہیں غالب۔ ریاض اس میں نثر کی شاعری کرتے۔ اور لوگ بھی بجائے سیاسی معلومات کے زبان و انشا ہی کی خاطر خریدتے۔ نقشہ اس کا ایک ننھا منا سا صفحہ جیبی تقطیع کا رنگین کاغذ پر نکلتا۔ اور لطیفوں چٹکلوں سے دل بہلاتا رہتا۔ عطر نقشہ کی بابت اب خوب ذہن میں نہیں۔ اسی شان جمالی کا یہ پرچہ غالباً شعر و نظم کی بہار دکھاتا۔ بہرحال اتنا یاد ہے کہ یہ دونوں پرچے نام کے نقشہ قیامت کی شوخیاں دکھاتے رہتے۔ اور ریالڈز وغیرہ کے عام پسند انگریزی ناولوں کو ریاض اردو میں اپناتے رہتے چنانچہ ریالڈز کا (LOVES OF THE HAREM) حرم سرا کا نام پاکر اردو میں اپنا نام کر گیا۔ اردو کے معلی کے لطیف و شستہ جملے گویا سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ اور پھر ریاض اور ان کے دوست رتن ناتھ پوری کے مزے دار اشعار ——— عطر میں بسے ہوئے۔

یہ فضا تھی جس میں مہدی مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ اسی میں پلے، بڑھے۔ رسالہ سال بعد ریاض کو ایک خط میں لکھا:

> "مجھ کو آپ کے ساتھ جو خاص تعلق ہے، آپ کو معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس وقت سے آپ کے لٹریچر کا دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔" (مکاتیب مہدی ص ۱۸۰)

دلگیر مرحوم ایڈیٹر ماہنامہ نقاد (آگرہ) کے نام اس سے کہیں زیادہ کھل کر لکھا ہے:

> "مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں جیتا رکھے) عروس سخن کا آشنائے ازل ہے۔ آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں، وہ ریاض کے قلم کی آواز بازگشت ہے۔ آج لٹریچر پر جب آزمائی کے لئے بیٹھنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن میں نے پہلے پہل یہ

لفظ ریاض الاخبار میں دیکھا۔ جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا
..... موجودہ لٹریچر ارتقائی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے وہ
جس طرح نظم کا مالک ہے۔ آغاز نثر بھی ہے۔ اور یہی امتیاز فائقہ ہے جس کی بنا پر
وہ انشا پردازی کا مستم الثبوت ہیرو ہے۔" (مکاتیب مہدی ص ۱۰۹)

پیدائش محلہ بسنت پور، گورکھپور کے ایک کھاتے پیتے شریف اور مذہبی رنگ کے خاندان میں ہوئی۔ والد کورٹ انسپکٹر تھے۔ گھر ہی کا ایک چھوٹا مکتب کہلاتا تھا، وہیں بیٹھ کر حسب دستور وقت اردو فارسی پڑھی۔ ممکن ہے کہ عربی کی بھی شد بد حاصل کی ہو۔ اور پھر کچھ روز ہی گزرے جا کر اسکول کے درجوں میں پڑھا۔ طبیعت بڑی اخاذ پائی تھی۔ مزاج میں نفاست و لطافت اور اردو ادب سے مناسبت، یہ چیزیں معلوم ہوتا ہے فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ بس انھیں کے سہارے بغیر کوئی ڈگری یا سند حاصل کئے کچھ ہی روز میں اتنا کر لیا اور ایسے چل نکلے کہ اچھے اچھے ڈگری والوں کو راستہ بتاتے، اور بڑے بڑے سند والے ان کا سامنا کرتے ہچکچاتے۔ بیگم مہدی کی روایت ہے کہ شروع میں گھر پر کسی انگریز سے بھی پڑھا تھا (افادات مہدی ص ۵) یہ روایت انھوں نے یقیناً مرحوم ہی سے سنی ہوگی۔

یہ بیگم دوسری بیوی تھیں بڑی چہیتی اور صحیح معنی میں شریک زندگی۔ پہلی بیوی کا انتقال مرحوم کی جوانی ہی میں ہو گیا تھا یہ عقدہ اس کے بعد ہوا ——— معاشرت میں "صاحبیت" کا اثر ممکن ہے کہ انھیں "صاحب" کی تعلی کا نتیجہ ہو۔

شعوری طور پر بچپن میں بھی اثر سب سے زیادہ سرسید کا پڑا۔ ان کے تہذیب اخلاق کی ایک جلد دیکھنے کو مل گئی تھی۔ انھیں بیگم مہدی کی روایت ہے کہ

"وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ صرف اسی تہذیب اخلاق نے مجھے آدمی بنا دیا۔" (افادات ص ۶)

مرحوم کا شمار مصنفین کے زمرہ میں تو مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے تصنیف یا تالیف ان کی ایک بھی نہیں۔ خوب کہا ہے ہمارے اردو کے رئیس المصنفین مولانا سید سلیمان ندوی نے کہ:

"مرحوم کوئی پیشہ ور مصنف نہ تھے جو پھلوں کی زحمت کے لئے اپنی تصنیفات کا ذخیرہ چھوڑ جاتے۔" (مکاتیب ص ۱۶)

مضمون نگار بھی وہ کوئی پیشہ ور اور بڑے مشاق نہ تھے ذخیرہ تحریر کل ۳۱ مضمون ہیں چھوٹے اور بڑے سب ملا کر اور انھیں میں ترجمہ، تنقید بھی شامل ہیں۔ یہ ہفتہ واروں اور ماہناموں میں پھیلے ہوئے مضمون ۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۶ء یعنی ۱۷ سال کی مدت میں شائع ہوئے۔ اس حساب سے اوسط ہر سال ڈیڑھ مضمون کا پڑتا ہے۔ یہ اوسط ہوا اور نہ واقعہ یہ ہے کہ عموماً سال میں دو ایک مضمون لکھتے وہ بھی جب طبیعت خوب حاضر ہوتی اور لکھنے کا کوئی داعیہ قوی موجود ہوتا۔ کسی کسی سال جب طبیعت میں موج آتی تو چار چار پانچ پانچ مضمون بھی لکھ ڈالتے اور درمیان میں مہینوں کیا برسوں کا سناٹا ——— تصنیف کے نام سے کل کائنات یہی مجموعہ مقالات ہے جو افادات مہدی کے نام سے وفات کے بعد شائع ہوا ہے۔ بیچارہ کو نظر ثانی و ترمیم وغیرہ کا کوئی موقع نہ مل سکا اور ہر صاحب تجربہ

جانتا ہے کہ اس کے بعد تحریر کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ ناممکن تھا کہ ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء والے مہدی حسن جب ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۰ء والے مہدی حسن (جن کے نام کے ساتھ "افادی الاقتصادی" کا بے معنی سا دُم چھلا لگا رہتا تھا) کی کسی تحریر کو دیکھتے تو اسے بے ہاتھ لگائے بلا اصلاح کئے بغیر چھوڑ دیتے ——— افادات کی ضخامت ۲۶۰ صفحات پر دوسروں کے لکھے ہوئے دیباچہ وغیرہ کو نکال کر ۴۰ صفحہ کی ہے۔

اور ہاں اس سے کچھ کم ضخامت کی ایک اور کتاب بھی ان کے قلم کی رہین منت نکل آئی۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے مکاتیب مہدی کے نام سے ——— مرحوم بڑے اچھے، بڑے پاکیزہ خط نویس تھے۔ ظلم تھا اگر ان کے ان انشائی کمالات کو ضائع ہونے دیا جاتا۔ کچھ قدردان احباب و اعزہ نے انھیں بچا بچا کر رکھ لیا تھا۔ یہ اوپنی جواہر پارے اگر ضائع ہو جاتے تو اردو کا ایک قیمتی سرمایہ گم ہو جاتا۔ بیچارے کی ساری عمر سرکاری ملازمت میں گزری۔ وہ بھی کچھ اونچی نہیں۔ پہلے نائب تحصیلدار رہے پھر تحصیلدار ہو گئے۔ تنخواہیں اس زمانہ میں کچھ واجبی ہی سی ہوتی تھیں۔ یہ ٹھہرے شاہ خرچ، مزاج کے شوقین، نفاست مجسم۔ کھانا ہو تو نفیس، کپڑے ہوں تو نفیس، مکان اور اس کا فرنیچر ہو تو نفیس، ہر خرچ اُجلا۔ ہاتھ ہر خرچ پر کھلا ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گزر بسر کس طرح کی۔ چہیتی بیوی کے گہنے کپڑے کے حوصلے و ارمان کیسے پورے کئے۔ لڑکوں کی تعلیم کے آخراجات کیونکر نکالے۔

کئی سال کا زمانہ تو خیر بنارس اور الہ آباد کی صدر تحصیلوں میں گذارا۔ باقی بیشتر حصہ دیہات کی دور دراز تحصیلوں ہی میں بسر کیا، جہاں کتابوں کے کسی بڑے ذخیرہ کے وجود کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تحصیلداری کے جھمیلوں کو یوں بھی کوئی مناسبت علمی اور تصنیفی مشغلوں سے نہیں ہے اور پھر جبکہ قیام بھی ایسی جگہ ہو۔ جہاں کوسوں نہ کسی علمی صحبت کا پتہ۔ نہ کسی کتب خانہ کا نشان، تو ایسے کورد بیہ میں اور اتنے غیر علمی ماحول میں رہ کر جید مقالہ نگاری کرڈالنا ایک اولی کرامت ہی کا مرتبہ رکھتا ہے۔

نئی نئی ترکیبیں گڑھنے اور انگریزی سے لے کر اردو میں نئے نئے لفظ ایجاد و اختراع کرنے میں مرحوم کو ایک حد تک ملکہ تھا اور اگر کہیں علمی استعداد مولانا نذیر احمد دہلوی کی سی ہوتی یا لسانیات اور زبان دانی سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی تو مہدی حسن اس میدان میں سب سے بازی لے جاتے اور اپنے معاصرین کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ پھر بھی جتنا کچھ وہ کر گئے وہ بہت سے پیشہ ور مستند مصنفین کے لئے بھی باعث رشک ہی ہو سکتا ہے۔

ماسٹر پیس کے لئے "اختراع فائقہ"، "ہنی مون" کے لئے "عہد زفاف"، "جوائنٹنگ ٹائم" کے لئے "وقفۂ سبکدوشی"، "ایلیگیٹ" کے لئے "عوامد رسمیہ" اس قسم کے الفاظ خدا معلوم کتنے انھوں نے چلانے چاہے، اور ان میں سے کوئی کوئی چل بھی گئے ——— غیر شائستہ جنسی لب "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" "دماغی جنتیں غیر فانیوں کے ساتھ" "پیارے جناب" اس قبیل کے بھی بہتیرے لفظ انھوں نے انگریزی سے اپنائے۔ کچھ ان میں سے جم گئے اور کچھ اُکھڑ گئے! ——— انگریزیت سے متاثر بہت زائد تھے (اور وہ زمانہ ہی خاص تاثر کا تھا اس لئے وہ اکیلے کیا، سب ہی متاثر تھے) اس لئے انکی اختراعات میں بھی انگریزیت کی جھلک آ گئی اور وہ لفظ اور فقرے اردو میں کھپ نہ سکے۔

اپنے مذہبِ ادب میں پورے "اہل السنت والجماعت" تھے۔ یعنی سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی سب کے قائل۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی آزاد کی فضیلت کا کلمہ پڑھتے، کبھی نذیر احمد کی عظمت کا علم ہوا میں لہراتے، کبھی شبلی پر جان چھڑکتے۔ کبھی حالی کی اداؤں پر واری جاتے۔ اور کبھی سرسید کو استاد الکل کے رتبہ پر رکھتے ——— یہ سارے دعوے ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ اپنے اپنے سیاق میں اور مناسب موقع پر یہ سب باتیں ٹھیک ہیں اور اتنی "فضیلت" کی گنجائش مذہبِ اہل سنت میں پوری طرح موجود ہے۔ سنجیدہ اور علمی ادب اردو کے ان "عناصرِ خمسہ" کے علاوہ ادبِ خالص کے بھی استادوں کے پرستار رہے ہیں تھے۔ ریاض کا نام اوپر گزر چکا۔ ایک اور اسی دور کے بہت اچھے لکھنے والے، تیرھویں صدی اور صلائے عام کے ایڈیٹر منشی ناصر علی دہلوی تھے۔ دنیا تو اب ان کے نام ہی کو بھول چکی ہے۔ "ادبِ لطیف" کی اصطلاح پر بعد کو چند خاصیوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ ورنہ انشاء کی یہ شاخ دراصل ناصر علی کا خاص حصہ تھی۔ اور جدی ان کے نام پر مٹے ہوئے تھے۔

خشک نگاری ان کے مذہب میں بمنزلہ کفر تھی۔ "مولویت" اور "مدرسیت" سے اسی لئے بیزار رہتے۔ اور تو اور خود مولانا سید سلیمان سے مدتوں ان کی "مولویت" کی بنا پر بدظن اور ان کے کمالات کے منکر رہے ——— مولانا شبلی کے انتقال کے دھچکے کے لئے واقعتہً پُر ملال تھا۔ معاً بعد ۷ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی عبدالمجید دریابادی کے خط میں لکھتے ہیں:۔

> "سیرت نبوی کی تکمیل اب قیامت تک ہو چکی ..... سنتا ہوں میاں سلیمان اور پروفیسر حمید الدین ترتیب دیں گے۔ اس سے تو نہ ہونا اچھا تھا۔ یقیناً تنقیدی حصہ مرحوم نے نہیں لکھا ہوگا، جسے وہ تاریخی حصہ کے بعد شروع کرتے۔" (مکاتیب ص۱۳۵)

بدگمانی بے محل ہی تھی اب تک قائم رہتی۔ حقیقت کی پہلی ٹھیس سے چکنا چور ہو گئی۔ فروری ۱۹۱۷ء میں خود سید الطائفہ کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:۔

> "میں نہایت دلچسپی سے آپ کی ادبی فتوحات کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا تصنیفی عہد علامہ شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس خیال کو میں نے ایک مستقل عنوان کے تحت میں پھیلایا ہے۔ "اردو لٹریچر کا دورِ واپسیں" عنقریب آپ کی نظر سے گزرے گا۔ جس میں میں نے دکھایا ہے کہ دارالمصنفین سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔" (مکاتیب ص۹)

پھر ستمبر ۱۹۱۷ء میں ارض القرآن کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "میں عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں۔ یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں۔ اور جب تناسب میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔" (ص۱۰)

اور پھر:۔ "یہ کہنا بھول گیا کہ طرز لٹریچر کی لطافت آپ کا حصہ ہے (ص۱۹)

اور ایک بار اور معارف کے بعض چٹپٹے شذرات کی داد میں جو مسز سروجنی نائیڈو کے سلسلہ میں تھے:۔

"آپ نے شاعرۂ دکن پر جو بجلیاں گرائی ہیں اور اس سلسلہ میں مخزون سوسائٹی پر جس خوبصورتی سے بے دردی کی ہے، سچ یہ ہے وہ نازک خیالی کی آخری حد ہے۔ میں نے بار بار پڑھا اور لطف اٹھاتا رہا ——— جس زمانہ میں یہ پہلی دفعہ اسٹیج پر آئی ہے اور اس کی زبان سے یہ شعر نکلا ہے ؎

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بسے
شرط اول قدم آں ست کہ مجنوں باشی

خوب یاد ہے کہ بہتیرے دل تھام کر بیٹھ گئے تھے۔ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے ..... مدت سے سوچ رہا تھا کہ اس کی لکھ دار نسائیت کو اپنی چند سطروں کا تختۂ مشق بناؤں لیکن آپ نے میرے لئے بالکل گنجائش نہیں چھوڑی اور ساتھ ہی میرے دل کا ارمان پورا کر دیا۔ جو خاکہ آپ نے کھینچا ہے اور جس پہلو سے چوٹ کی ہے، وہ تقلید کی چیز نہیں۔ خلاف شکر میں اس طرح کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہے کہ خود آپ سے داد لینے کو جی چاہتا ہے۔" (ص ۲۱)

عام طور پر مزاح منوازن اور رائیں بھی تلی رکھتے تھے نہ مدح میں غلو نہ ہجو میں مبالغہ۔ نہ افراط نہ تفریط لیکن آخر بشر تھے چوک ہی جاتے تھے۔ ان سطور کا راقم، آج کا بتا ہوا "مولانا" اس وقت نرا کورا "مسٹر" تھا اور مرحوم سے سن میں کوئی ۱۶-۱۷ سال چھوٹا۔ بس اس پر اس طرح مہربان ہوئے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ مکاتیب کے ورق کے ورق اور مراسلت کی سطروں پر سطریں اسی خورد نوازی کی نذر ——— حوصلہ افزائی کی بھی کوئی انتہا ہوتا تھی۔

مزاج کی نفاست اور طبیعت کی شرافت میں اپنی نظیر آپ تھے یوں سمجھئے کہ ان کی تخلیق میں جزو اعظم یہی دو عنصر تھے۔ لکھتے وقت کاغذ نفیس ہو۔ قلم نفیس ہو۔ روشنائی نفیس ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسم خوشگوار ہو۔ جب کہیں ان کا قلم حرکت میں آ سکے۔ مسودہ لکھتے وقت کیا مجال کہ کوئی داغ دھبہ پڑ جائے یا کہیں کاٹ پیٹ کو راہ ملے۔ سرکاری ملازمت سے آزاد ہوتے اور وقت تمام اپنا رکھتے، جب بھی اتنی رعایتوں اور اتنے التزامات کے بعد کیونکر ممکن تھا کہ کوئی بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑ جاتے؟ جتنا لکھ ڈالا یہی بہت غنیمت ہے۔

کتابیں نہایت صاف ستھری رکھتے اور جلد اعلیٰ سے اعلیٰ بندھوا کر سیکنڈ ہینڈ یا استعمالی کتاب وہ ہاتھ میں لینا کیا جانیں۔ "دوشیزۂ کاغذی" انھیں کی زبان میں "دست غیر سے مس ہو جانے کے بعد" ان کے کس کام کی رہتی۔ کھانا نفیس کھاتے، کپڑا نفیس پہنتے۔ مکان، فرنیچر ہر چیز میں صفائی، نفاست اور لطافت کا خیال سب پر مقدم۔ کہا کرتے کہ سیکنڈ کلاس کوئی سی بھی شے ہو، مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی ہو درجہ اول کی ہو۔

اور شرافت نفس تو کچھ اس سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کسی کی دل آزاری کیا دلشکنی بھی جانتے ہی نہ تھے اور تحریر میں

درشت و ناملائم الفاظ لانے کو گالی کے برابر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایسے بھدے ثقیل لفظ لانا تحریر کا خون کرنا ہے۔ صرف لطیف اشاروں کنایوں کے جواز کے قائل تھے اور ہلکی پھلکی چوٹیں کر جانے کے بادشاہ تھے، اور خیر خود تو اس پر عامل تھے ہی، دوسروں کو اس روش سے ہٹتے دیکھتے تو ٹوک دیتے۔ شذرات معارف کی ایک عبارت پر مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں۔

"میری غرض یہ ہے کہ ثقیل الفاظ کی جگہ صرف مفہوم کی تہ سے کام لیا جائے۔ یہ باتیں کوئی اور آپ کو نہیں لکھے گا لیکن مجھ کو جس حد تک خلوص ہے، اس کا اقتضاء طبعی یہ ہے کہ جن نکتوں پر رعایت ظہور کی وجہ سے دوسروں کی نگاہ نہیں پہنچتی، ان کو آپ کی توجہ میں لاؤں۔" (ص ۲۲)

میری دورِ جاہلیت کی ایک کتاب "فلسفۂ اجتماع" نام ہے، نقشۂ الحاد کی حالت میں لکھی ہوئی۔ اس میں پیمبروں کا ذکر جا بجا ہے بالکل دنیوی لیڈروں کی حیثیت سے ہے۔ اور ان کے کارناموں پر تنقید و تبصرہ اسی انداز میں، جس میں قومی و ملکی لیڈروں پر ہوتا رہتا ہے۔ اپنے نزدیک اُس وقت اس میں ہرج ہی کیا تھا؟ اور اگر کوئی روکتا ٹوکتا تو جواب میں اس کی مولویانہ تنگ نظری اور تعصب پر لے دے ہوتی تھی۔ مہدی مرحوم میری تحریر کے قدردانوں میں نہیں، پرستاروں میں، عاشقوں میں تھے۔ اس کے باوجود کچھ ہی دن بعد جب لکھنؤ آئے تو مجھے ایک موقع پر تنہا پا کر بولے، کہ:

"فلسفۂ اجتماع کا عاشق زار مجھ سے بڑھ کر کون ہوگا، لیکن سن لیں مجھ سے چھوٹے ہو اس لئے ایک بات کان میں ڈالے دیتا ہوں، پیمبروں خصوصاً پیمبر اسلام کا تذکرہ جس طرح آیا ہے، اس سے صاف استخفاف نکلتا ہے۔ عقائد کی بحث سے قطع نظر یہ رنگ کسی سنجیدہ مصنف کی متانت تحریر کے بھی تو منافی ہے۔ جن شخصیتوں کا ادب و احترام کروڑوں انسان کر رہے ہوں، ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا تو لازمۂ تہذیب و شائستگی ہے۔"

بات اتنے خلوص سے کہی گئی تھی کہ سیدھی دل میں اتر گئی۔ اور جو دل سے منکر و مکذب تھا، وہ کم از کم زبان و قلم کی حد تک تو آدمی بن گیا۔ اور پھر دو برس بعد جب اس کتاب پر حیدرآباد میں سخت لے دے شروع ہوئی تو اپنے اسی اخلاص و شرافت کے تقاضے سے مجھے لکھا:

"میں نے آپ سے لکھنؤ میں ذکر کیا تھا کہ آپ نے گو آنحضرت کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہار خیال کی باریک تہہ میں ایک طرح کی تضحیک پائی جاتی ہے۔ اور یہ مستقلاً رنگ ہے، مستشرقانہ سنجیدگی نہیں، ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے یہ شکایت دور ہو سکتی ہے اور مقصود پھر بھی ہاتھ سے نہیں جائیگا۔ یہیں آپ کیلئے کر سکتا ہوں آپ اجازت دیتے ہیں؟" (مکاتیب ص ۵۷)

یہ تو آپ بیتی تھی باقی اسی طرح کی مثالیں کوئی گنانے پر آئے تو ان کی تحریروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھی خاصی نکال سکتا ہے ——— خود بڑے "آزاد خیال" تھے اور بڑے "روشن خیال" "ملائیت" کے نام سے بیزار، مولویت کے سایہ سے پناہ مانگنے والے، لیکن ہر آزاد مشربی اور ہر روشن خیالی پر چھاپ تہذیب، شائستگی اور شرافت کی لگی ہوئی۔

تحریر کا اصل جوہر شوخی تھی ظرافت نہیں شوخی [illegible] نہیں [illegible] تفنن آفرینی نہیں بلکہ صرف ایک

انبساطی کیفیت جو بہت پھیلی تو ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی اور بس۔ محرک قوی نہیں جو حرارت جسم کو انتعاش میں لے آئے، صرف مسکن جو مسرت کی ہلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے ——— وصال نہیں صرف خیالِ وصل۔ بقول شخصے ؎

خیال ہی میں مزے وصلِ دلربا کے لئے!

مثالوں کا انتظار ہوگا۔ دو چار حاضر ہیں۔ موضوع علمی ہو، ادبی ہو، مذہبی ہو، قلم کی شوخیاں ساتھ کہیں بھی نہیں چھوڑتیں۔

مولانا شبلی کی نیم فلسفیانہ نیم متکلمانہ کتاب الکلام نئی نئی نکلی ہے اس پر تبصرہ کر رہے ہیں:۔

"ہم کو الکلام کے ہوتے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات جدید علم کلام کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ فاضل پروفیسر نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز پرزوں یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس علمی نزاع میں اختیار کی گئی وہ شبلی ہی کا حصہ تھا۔" (افادات ص ۱۳۵)

ایک اور جگہ الندوہ (مولانا شبلی کے ماہنامہ) کا تعارف کرا رہے ہیں اس کی تمہید میں:۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اردو کے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور لفظ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جو ہنوں پر آئی ہوئی کچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی مدتوں شعرا سے گاڑھا اتارا رہا۔ یہ اتفاقیہ سن بری طرح کھل کھیلی ہاتھ پاؤں نکالے اور بہنیرے بنائے بگاڑ دیئے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹاتی رہی بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔

آخر آخر میں ملک کے منجھے یعنی ناول نویس تو یہاں تک پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ داری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے ہوئے سنا ——— اری اٹھ جاؤ گی میں صدقے سے" لیکن دفعتہً اس کی حالت نے پلٹا کھایا کثرت فراخش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو گردش ہی جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علما کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سنا گیا کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انہیں کے تصرف میں رہتی ہے الندوہ اس کا ایک شعر پیش ہے۔" (افادات ص ۱۰۸، ص ۱۰۹)

ایک دیندار اہل قلم سے ان کی کوتہ قلمی کی شکایت گرمیوں کے رمضان کے زمانے میں کرتے ہیں اور اپنے قلم کے بانکپن سے صحرائے خشک کو لالہ زار بنائے دیتے ہیں:۔

"خیر تو ہے؟ آپ کا بالکل پتہ نہیں۔ کیا آپ کے رمضان سے میرے مئی کے شدائد کچھ کم ہیں جو ایک دوسرے آپ مہر بلب ہو رہے ہیں؟ تحریری فاقے رند مشرب دوستوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں، روزہ رکھئے

نہ رکھیے مگر مجھے یاد ضرور رکھیے۔ (مکاتیب ص ۱۱۵)

میں ایک سال حیدرآباد رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی اور اس کا مقدمۃ الجیش سر رشتہ تالیف و ترجمہ ایک سال قبل ۱۹۱۸ء میں کھل گیا تھا۔ میں اسی میں تھا۔ عقائد کی آڑ لے کر دکن کے اخبارات نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور مدت قیام کے چند مہینے بڑے سخت معرکوں میں گزرے۔ سال بھر بعد لکھنؤ واپس آیا ہوں، ضابطہ سے صرف رخصت لے کر، لیکن دل میں استعفا کی نیت مستحکم کر کے۔ حضرت مہدی جیسے مخلص کو سارا ماجرا لکھ بھیجا ہے۔ اب جواب ملاحظہ ہو:۔

"جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک لقمہ تر جلد سے جلد حلق سے نیچے نہیں اُتار لیتا اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپ کے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس میں میرے نکمے پن کو اس قدر دخل نہیں جس قدر آپ کے بخل کو۔ کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حصہ میں نہیں آتی۔ خوش ہو اقفس کی تیلیاں توڑیں اور پر شکستہ طائر کو جائے وطن نصیب ہوئی۔ وطن بھی لائق رشک لکھنؤ جس کی فضائے بسیط آپ کی تنشیط دماغی کیلئے زائد از کافی ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ "اب وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے" ایک صاحب فرماتی ہیں صاف کیوں نہیں کہتے کہ بیگم اپنی ہیں۔ یہ نکتہ رہ گیا تھا کمی پوری کئے دیتا ہوں۔" (ص ۶۵)

میری شادی کو تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہے۔ بیوی اور سالیوں کے ساتھ لکھنؤ سے باندا اپنی سسرال گیا ہوں ریل کا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ حضرت مہدی کو لکھ بھیجا۔ جواب میں آپ بھی شریک ہوں:۔

"آپ کا پرستان سفری وہ بھی تخت رواں (ریل) پر بہت ہی قابل رشک ہے۔ سچ یہ ہے کہ جنس لطیف کی پاکیزہ وشی اور کافرادائی کے ساتھ کائنات کے خوبصورت چہرہ کا غازہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے لئے شرط زندگی بھی ہے کہ بغیر اس کے دنیا سرے سے رہنے کے لائق نہیں تھی۔" (ص ۶۵)

صاحب معارف کو معارف اور مطبوعات دار المصنفین کی لوح کی سادگی ("سادہ لوحی" نہیں!) پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو قلم کا بلبل یوں نغمہ سرا ہوتا ہے:۔

"یہ غلط ہے کہ فلسفہ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے۔ عورت کتنی ہی حسین ہو، لیکن جوگی کے بعد وہ جوگن نہیں رہتا۔ ہیرا تراش کیل کے آتے ہی اس کی سج دھج، تراش خراش سب میں فرق آجاتا ہے۔" (ص ۳۴)

سارا مہدوی لٹریچر انہیں شرخیوں کی تجلیات سے جھل جھل کر رہا ہے۔ شوخی کہیں کہیں بڑھ کر چلبلے پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے متانت کی آنکھیں اس منزل پر پہنچ کر بند ہونے لگتی ہیں اور پردے کی باتیں زبان قلم پر بے پردہ ہو کر آنے لگتی ہیں۔

مثالیں ——— ایک آدھ ——— لیجئے۔ مخاطب مولانا سید سلیمان صاحب ہیں متانت و تقدس ہیں:۔

"میں خدا خدا کر کے ڈیڑھ سال کے بعد گھس سے چھوٹا یعنی تحصیلداری پر جس کا چنداں شائق نہیں منتقل ہو گیا یہ اضافی تصریح اس لئے ہے کہ وطن آیا تو دار المصنفین میرے لئے گھر آنگن ہو گا اور آپ سے بوسہ بہ پیام کی جگہ، آپ عورت ہوتے تو کہتا، لب بلب کی ٹھہرے گی۔ آخری فقروں سے آپ کے تقدس میں کچھ فرق تو نہیں آتا؟" (ص ۳۴)

انھیں سید صاحب نے پہلی بیوی کی وفات پر دوسرا عقد کیا ہے اور اتفاق سے اس وقت کچھ علیل تھے حضرت مہدی کو ایک اشتعلہ ہاتھ آگیا اور تا گفتنی کس کس طرح ان کی زبان پر آگئی ہو گئی :-

"میں سنتا تھا مولوی خلوت کے رنگیلے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی روداد مجھے جہاں تک معلوم ہوئی غیر معمولی ہے۔ یہ کیا کہ مرعوب ہو کر صنفِ نازک کی آبرو کھوئی۔ خیر گزری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا لیکن دوستوں کو قلق رہے گا کہ جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا۔ عورت کتنی ہی نازک اور لچکدار ہو لیکن یہ اس کی فطرت کا راز ہے کہ حریف مقابل کے ثقل پر غالب رہتی ہے یعنی ہار ماننے والی نہیں۔ یہ دلچسپ شکست خدا کے صرف مقبول بندوں کے حصے میں آتی ہے یہ تصریحات آپ کے مذاق سے کتنی ہی بیگانہ ہوں مجھے سنجیدہ نہیں اور گو آپ کا ہنی مون (عہد زفاف) بستر علالت پر گزرا تاہم میں سننا چاہتا ہوں آپ کہاں تک اپنے قصر کی تلافی کر سکے اور آیا آپ خوش ہیں؟ وہ آتشہ اچھی کھنچی ہو تو نشاطِ مستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے، میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔" (ص ۴۲، ص ۴۳)

سید صاحب تو خیر اس زمانہ میں جوان تھے۔ ایک اور بزرگ مولوی مقبول احمد صاحب صمدانی تھے۔ میں نے انھیں جب دیکھا، سفید ریش ہی پایا ——— حضرت مہدی سے ان سے بھی ایسی ہی چوٹ کی ہوتی تھی۔

اس سے آگے بڑھیے تو سرحدیں عریانی کی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور مہدی مرحوم اس صنف میں بھی بند نہ تھے اور نہ اس میدان میں کسی سے پیچھے رہنے والے۔ بلکہ ان کے ادب کی بھی یہی صنعت ایسی ہے جو انھیں آج کے "ترقی پسندوں" کی بزم میں "پیر مغاں" بنائے ہوئے ہے ——— زیادہ نہ نے اس صنعت کے تو پیش کرنے کی ہمت کہاں سے لائی جائے۔ دل پر جبر کر کے دو چار فقرے دہرائے بغیر چارہ نہیں :-

"عورت چھنتی ذرا مشکل سے ہے۔ لیکن جہاں پھنسی، اس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی۔ اس کی اصلی غایت زندگی دوسرے کی پھانس ہے ..... اس کی فتوحات اس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دستبردار نہیں ہو سکتی۔ وہ وار کر کے رہے گی کیونکہ یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شانہ سے آنچل خود نہ گرائے۔ لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ دہرائے ہوئے آنچل میں دراصل اسے سینہ کا ابھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جا کر دیکھیے۔

عریاں کا جائزہ نظر بھی ایک طرح کی دادِ حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لیکر رہیگی۔

اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستانہ کی طرح چھنتی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ ان سرکشوں کو قید رکھتی ہے جنھیں عورت کے ارمانِ مجسم کہیے۔ مے و آتشہ وہ بھی شباب کی جب کھنچ کھنچا کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو، تو کون ہے جو ان کی کیف مستی اور بے خودی کے جھونکوں کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا۔ ترکیب عناصر ہی تو ہے۔ ذرا فطرت کی شوخی دیکھیے گا، فتنۂ قیامت زاکیے گنجائش نکالی بھی تو کہاں؟ دنیا میں معیارِ حسن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلافِ مذاق کے لحاظ سے

حسن کے لئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا۔ تاہم ہر زمانہ میں عورت کا مقیاس الشباب دائرۂ حسن کا مرکز رہا ہے۔ آج تک سنتے میں نہیں آیا کہ اہل چین کی چپٹی ناک کی طرح سپاٹ سینہ بھی کہیں پسندیدہ بنا ہو۔
(افادات ص۲۱۰، ص۲۱۱)

بعض تصریحات اس سے بھی زیادہ فحش و بے پردہ ہیں ——— اور شرفا کی محفل میں یہ بولی تھوڑی آج بھی کچھ عجیب سی ہے آج سے ۴۰-۴۱ سال قبل ۱۹۱۳ء میں جب یہ مضمون اول بار شائع ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت یہ کن نظروں سے دیکھا گیا ہوگا!

مہدی ادیب و انشا پرداز ہی نہ تھے کچھ حکیم بھی تھے۔ اور خود لاکھ نہیں نہیں کہتے رہیں، کہیں کہیں باتیں سعدی اور رحمانی کے رنگ کی کر گئے ہیں۔ اپنے تجربہ کی باتیں دوسروں کو بتاتے ہیں ان کی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں، اور دنیا کا نشیب و فراز جس طرح خود ان کی نظر میں ہے ویسے اختیار چاہتے ہیں کہ ان کے آس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوں۔

مہدی مزاحات نگاری کے شہسواروں میں تھے اور خود بھی کچھ درجۂ اول کے مذہبی نہ تھے اس پر بھی دیکھئے کس حکیمانہ انداز سے میری تبلیغ ادبیوں" پر ٹوکتے ہیں (زمانہ پھر یاد کر لیجئے کہ میرے شباب الحاد کا ہے)۔

"گزشتہ تصنیفات کی نظر ثانی کے سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فلسفیت کے زور میں مذہب کی نسبت کوئی رہا مارک یا طرز ادا ایسا نہ ہو جس سے اس کی تحقیر تو خیر تخفیف سی بے رخی بھی پائی جائے۔ جو کچھ لکھئے مسلم بن کر لکھئے کہ سنجیدگی تصنیف کا اقتضا یہی ہے۔ یہ نکتہ ہم برس کے بعد سمجھ میں آئیگا۔ لیکن اس درمیان میں آپ کو کم از کم ڈاکٹر لیبان کی طرح فیاض دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ کسی بانی مذہب کی فلسفیت کا اعتراف دراصل "میٹھی چھری زہر کی بجھی" کا مصداق ہوگا۔ اردو میں شبلی کے مصلح اعظم کو محمد نہ لکھئے، آنحضرت لکھئے تو شکر آپ کا شکر گزار ہوگا۔" (مکاتیب ص۱۰، ص۱۱)

باندے میں میرا چھٹا اور پہلا بچہ ۱۹۱۸ء میں عالمگیر وبائی انفلوئنزا کی نذر ہو گیا وہ ایک روز بعد بیوی کو وہیں میکہ میں چھوڑ میں لکھنؤ آگیا ہوں۔ حضرت مہدی تعزیت نامہ لکھتے ہیں:۔

"نہایت افسوس ہوا کہ محبت کا ثمرۂ اولیں ضائع ہوا۔ غالباً یہ عالمگیر بخار کی عنایت ہوگی۔ ہماری متفقہ ہمدردی بچے زیادہ ان کے ساتھ ہے، جن کی بھری گود دفعتہً خالی ہو گئی اور جن کا آنچل یہ نقشہ ہوگا ——

یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا
ترا داغ دل میں نشانی رہے گا

آپ تنہا نہ چھوٹتے تو اچھا تھا ساتھ رکھئے یا ساتھ رہیئے۔ کہ نئی نئی چوٹ کے لئے مرہم زخم کی ضرورت ہے۔ قانون فطرت کا یہی بے تکا پن بعض وقت بلا کے جان ہو تا ہے۔ مگر یہ انسان کی عام تقدیر ہے۔" (ص۱۰، ص۱۱)

---

[1] شبلی کی سیرۃ النبی (جلد اول) کے مطالعہ کا یہ اثر ہوا تھا کہ صاحب سیرۃ کی عظمت کا اس درجہ میں قائل ہو گیا تھا کہ انہیں مصلح اعظم کے درجہ پر رکھنے لگا تھا ——— انکار محض کے مقابلہ میں یہ درجہ بھی غنیمت تھا۔ اور مہدی مرحوم میری اس نفسیت کے راز دار تھے۔

میں حیدرآباد میں ہوں وہاں کے جوڑ توڑ اور آپس کی سازشیں ایک کھلا ہوا راز تھیں۔ میں کمسن و ناتجربہ کار حضرت مہدی کی دلی آرزو کہ میں محسود ہونے سے بچا رہوں، دیکھئے، یہ مشورہ بھی بانکپن کی کن اداؤں کے ساتھ پیش کرتے ہیں:۔

"جس جلیل القدر شخصیت کا آپ نے ذکر کیا ہے[1] اپنے روابط ان سے قائم رکھیے۔"

اور ہم چشموں میں یعنی جس دائرہ میں آپ ضابطہ سے رکھے گئے ہیں ان میں سے کسی سے کامیابی تو خیر کبھی بعید سے بعید توقع کا ذکر بھی نہ آئے۔ اسی طرح شب کے کھانے کا راز تمام صبح بھی نہ افشا کرنے پائے، آپ خود نفسیات کے عالم ہیں۔ لیکن جی نہیں مانتا چھوٹا بھائی سمجھ کر حدود سے نکل جاتا ہوں۔

میں نے بہتر سے بہتر اشخاص کو بھی دنیا میں کم بین پایا۔ دوسروں کے لطف قائم رکھنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم نسبتہً ان سے بہتر حالت میں ہوں۔ اس خاصۂ طبیعت کو نفسیات کی کس شاخ کے تحت میں رکھیے گا؟ (ص ۴۹، سنہ)

اور پھر یہ خبر سنکر کہ میں حیدرآباد سے ایک معقول ملازمت چھوڑ کر چلا آیا ہوں اور واپسی کا قصد نہیں رکھتا، کس طرح مجھے چمکارتے ہیں:۔

"کیا واقعی اب واپسی کا قصد نہیں؟ آپ تو فلسفی ہیں دنیا دیکھنے کے لئے ہے، برتنے کے لئے نہیں اور لوگ کی حماقت سے لطف اٹھانا بھی ایک عیش ہے۔" (ص ۶۶)

اپنے ایک عزیز قریب کے سامنے جو ساتھ ہی مخلص دوست بھی ہیں، اپنا دل کھول کر یوں رکھ دیتے ہیں:۔

"بھولو یا نہ سمجھو، میری طبیعت یعنی دنیائے احباب تم ہی دونوں تک محدود ہے۔ اونچی سوسائٹی میں اٹھا بیٹھا، بڑے بڑے جگ گانے نظارے دیکھے، عمر اس میں گزری لیکن قسم ہے واگر آنکھیں خیرہ ہوئی ہوں بجلی کی ہوش ربا روشنی میں جھپک کر بھی کبھی اپنے سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا۔ اس سے زیادہ نمائشی دنیا میں ہم سے کیا چاہتے ہو، اچھے اچھوں کو دیکھا آپے سے باہر، سبک سری کی چلتی پھرتی تصویریں جاتے ہیں۔"

مہدی مرحوم کوئی بڑے مذہبی نہ تھے۔ لیکن مذہب بیزار و مذہب دشمن بھی ہرگز نہ تھے۔ آزاد خیال سے تھے اور اپنی رند مشربی کو ہر جگہ اچھالتے رہتے تھے۔ "مولویت" کے نام سے چڑتے اور "مولوی" پر خار کھائے بیٹھے رہتے تاہم مسلمان تھے، توحید کے قائل اور رسالت کی تصدیق کرنے والے۔ لباس مغربی زیب تن رہتا لیکن لباس کے اندر دل خالص مشرقی تھا۔ دماغ مغربیت کے اثر سے آپکا کی پینے لگتا لیکن یہ اسے گھوم پھیر کے پھر ایمان و اسلام کی طرف واپس لے ہی آتے۔

---

[1] مرزا سر امین جنگ بہادر صدر المہام بیگاہ اعلیٰ حضرت تھے۔

شفقت، ہمدردی، اور اخلاص کے پتلے تھے۔ قلب رقیق تھا کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے۔ اپنے بیگانے سب کے ساتھ حسن سلوک کی فکر میں لگے رہتے۔ اور اپنی فیاضی کا دروازہ کسی پر بند نہ رکھتے۔ نماز پابندی سے نہ پڑھتے لیکن جب کبھی پڑھتے اور اکثر غسل تازہ کے بعد ہی پڑھتے تو "رفیق حیات" مہدی بیگم کا بیان ہے کہ خشوع خضوع کے ساتھ پڑھتے، اور دعا مانگتے وقت تو تصویر معبودیت بن جاتے ——— زندگی کی مہلت کچھ روز اور مل جاتی تو مجھے اپنی جگہ یقین ہے کہ ان کی اسلامیت خوب پختہ اور نمایاں ہو کر رہتی اور اپنی تخلیقات معنی و لفظی کو نظر ثانی و اضافہ کے بعد ہر طرح پاک و پاکیزہ بنا کر ایک بڑا ذخیرہ صحیح معنی میں "ادب لطیف" کا اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔

علامہ عمادی

ابوالخیر مودودی

مستقیل سر اور کشادہ ابھری پیشانی کے عمادی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی و عقلی کے حافظ، وسیع النظر مؤرخ، عربی، فارسی اردو کے انشاپرداز ادیب، رنگین بیان و گرم لہجہ شاعر، کتاب میں دیدہ ور باقی امور میں جنتی۔ ان کا حافظہ طرفہ تماشا تھا۔ جیسیوں مرتبہ کے چلے ہوئے رستے پر ان کو چھوڑ دیجئے، رستہ بھول جائیں گے اور بغیر رہنمائی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ شدہ کے دبائی الفلوانزا میں رفیقۂ حیات نے ان کو زندگی کے رستے میں چھوڑا اور وہ یہ رستہ بھی بھول گئے۔ لیکن کتاب، کوئی بھی ہو ——— فسانۂ آزاد، کوچک باختر، نائیکا بھیدیا کوک شاستر ——— ایک دفعہ نظر سے گزر جانی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں۔ بلکہ بعض خاص خاص جملے اور فقرے لفظ بلفظ یاد رہتے۔ مہینہ بھر ایک ہی چیز کھلائیے، وہ شوق سے کھالیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیل ذائقے کے لئے ——— اور ذہنی مہمیز کے لئے ——— تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمے بھی پڑھتے تھے۔

عمادی صاحب کے نام سے میں سب سے پہلے، امرتسر کے اخبار "وکیل" کے ذریعے واقف ہوا ——— اور ابوالکلام صاحب کے نام سے بھی اولاً "وکیل" ہی کے ذریعے آنکھیں روشن ہوئی تھیں ——— یہ میرے بدو شعور کی بات ہے جیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں "وکیل" بڑا نامی گرامی اخبار تھا اور اس وقت کی صحافت میں اصابت رائے، متانت تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عمادی صاحب اس کے اڈیٹر اور ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ شعور بڑھتا گیا اور عمادی صاحب سے واقفیت بڑھتی گئی: "الندوہ" کے پرانے پرچوں[1] میں اعجاز القرآن اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب اڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا یہاں بھی وہ سب اڈیٹری میں ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ پھر "وکیل" کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوش فکر سے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ماہنامہ[2] نکلنے لگا جس میں نقلی علوم کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں

---

[1] ۱۹۰۶ء ۔ ۱۹۰۸ء

[2] ۔ یہ رسالہ بھی وکیل لمیٹڈ کے زیر اہتمام نکلا تھا۔

کے عقلی و انکشافی علوم پر بلند پایہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے اتنا لکھا کہ اب معلوم ہوتا تھا بند ٹوٹ گیا ہے۔[1] شعور نے چند نظمیں اور ایک کیس قرآن کے ایک عربی ماہنامے "البیان" پر آگاہی ہوئی۔ یہ ماہنامہ عمادی صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۹۰۳ء میں نکلا، جسے وہ ۱۹۰۵ء تک کامیابی سے چلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ وہ کتنی علامیں پہلے شخص تھے جنھوں نے برصغیر ہند کی صحافت سے رابطہ جوڑا، اور مصر و بیروت کے رسالوں اخباروں میں مضامین لکھے۔ "البیان" اسی رابطے کے سہارے نکلا تھا۔ پھر جب "الہلال" نکلا تو کچھ دنوں بعد "وکیل" کی توجہ سے ان کا نام رخصت ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ ابوالکلام صاحب نے عمادی صاحب کو "الہلال" کی سلک ادارت میں جذب کر لیا ہے۔[2] "الہلال" سے ظفر علی خاں صاحب نے ان کو "زمیندار" میں کھینچا، اور دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے نیم رسالے "ستارۂ صبح" میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت بھاری بھرکم تھی، لیکن عمادی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے نمود واقعہ وقتاً اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دارالترجمے سے متعلق ہو کر حیدرآباد جا رہا تھا۔ علمی مشورے کی غرض سے حکیم اجمل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب نے فرمایا: وہاں ایک بڑے فاضل شخص عمادی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل ۱۹۰۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے، ایک دن سفیر صاحب نے مجھ سے کہا: حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کر دے۔ مجھے تین سال جستجو کرتے ہو گئے۔" مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سوچتا رہا، مولوی عمادی صاحب نے بڑے بھائی سے "قانون" پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دست گاہ رکھتے ہیں، خط لکھ کے ان کو بلایا اور انھوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔"

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عمادی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک وہ بھی منسلک ہوا جو ان کی پاداش میں بیٹھنے کے قابل تھا۔

لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوق ملاقات نہ تھا۔ خیال تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے متقدم ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی تصنیفی پرلاوے رہتے ہوں گے، آنکھوں میں نخوت نظر آتی ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوں گے

---

[1] وکیل بک ڈپو سے عمادی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات میں "حکمات"، "علم الحدیث"، "فلسفۃ القرآن"، "فلسفۂ ابن عربی"، "صناعۃ العرب"، "تاریخ عرب قدیم" اور تراجم میں مفتی محمد عبدہٗ کی مشہور کتاب "الاسلام والنصرانیۃ" (جو "دین اسلام" کے جواب میں لکھی) شیخ عبدالعزیز شاویش کی "الاسلام دین الفطرۃ" اور امام راغب کی "تفصیل النشاتین وتحصیل السعادتین" شائع ہوئیں۔

[2] "البیان" تین حصوں پر مشتمل تھا، ایک حصے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالات حاضرہ عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصے میں عرب اہل قلم کے مضامین یا ترجمہ درج کئے جاتے تھے اور تیسرے حصے میں بلاد اسلام کے حالات اور خبریں اردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر و شام و بیروت اور شمال افریقہ، تونس و الجزائر و مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

گویا لوگوں کے سروں پر چل رہے ہیں، اور باقی آنکھیں بند کر کے اس طرح کرتے ہوں گے جیسے بہت دور کسی سیارے میں بیٹھے اپنے بندے پر وحی نازل فرما رہے ہیں ——— مگر جب ان کو دیکھا، تو پہلی نظر میں ذہن پر ان کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ یہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی ودیعت الٰہی نہیں سمجھتا، محض انسان، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان! اور اس سے زیادہ کچھ ہونے یا منوانے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ اور میں بھول گیا کہ وہ کوئی بڑے جغادری فضیلت پناہ ہیں، اور میں سطوتِ دریا سے بہت دور کھڑا ایک نادان لڑکا ہوں۔ چہرے پر شرافت کی ملاحت، خدوخال میں علم کا رچاؤ۔ آنکھوں میں گہرے پانی کا وقار۔

اسلاف عالی گوہر تھے۔ علم صدیوں سے متوارث تھا، جاہ و منصب بھی چلا آیا۔ نیک نہاد اولاد نے جوہر وار بزرگوں کی تحقیقی میراث پورے جتن سے محفوظ رکھی اور ایک نسل نے دوسری نسل کو جنا دی۔ نسباً یہ لوگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے ساتھ ان کے اوضاع و اطوار میں نمایاں رہی۔

شیخ عماد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں علم کے قافلوں کی آخری منزل پورب دیس تھا۔ شیخ عماد بھی یہیں پہنچے اور جونپور میں خود وہ اور ان کے گھرانے کے لوگ ہمہ تن علوم میں مشغول ہو گئے۔ ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس گھرانے کے درس علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا۔ اس نے بارہ گاؤں سیر حاصل جاگیر دے کے، ان لوگوں نے انہی دیہات کو اپنی درسگاہ بنا لیا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخشیاں ایک مستقل فکر کی حامل تھیں۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداروں کے لئے آزاد و با اختیار سرمایہ مہیا کر دینا تھا۔ ہر درسگاہ قرب و جوار کے طلبہ کی اقامتی درسگاہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طلبہ تن کے کپڑوں سے گھر سے چلتے اور جس درسگاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی وہی درسگاہ کفیل ہوتی۔ یہ دیہاتی درسگاہیں صحت مند تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں۔

عمادی خاندان نے پورب کی بستیوں میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تلقین کی شمعیں روشن رکھیں۔ آخر زمانے میں سو گھر پورا میں شیخ عبدالقادر عمادی کی درسگاہ مرجع علم تھی، اس میں بیک وقت دو دو سو طلبہ مقیم رہتے تھے۔ بادشاہی وقتوں کی جاگیر اودھ کی نوابی کے ابتدائی دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چشمۂ نور جاگیر میں نہ تھیں خود ان کی ذات تھی۔ بزرگوں کا زر خرید امر تور ایک گاؤں تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدارات کرتے اور دونوں وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھاتے۔ یہ عمادی صاحب کے پرداد تھے۔

اس تعلیمی اور تہذیبی خدمتگزاری میں عورتیں بھی اپنے دائرہ عمل میں مردوں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشرے کا سینکڑوں برس پرانا دستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف چلا پاتے تھے، تہذیب و شائستگی برومند ہوتی تھی اور معاشرے کا شیرازہ بندھا رہتا تھا۔

عمادی صاحب نے علمی شیفتگی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ خاندان میں اب تک بول چال کی زبان عربی تھی، صرف و نحو دادی سے پڑھی۔ اور گیارہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود "الف لیلہ" پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد سے

حل کر لیتے۔ اسی کتاب نے عربی انشا کا شوق پیدا کیا۔ علوم و آداب اپنے والد اور دادا سے پڑھے، دونوں بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی ڈھیروں اُلم غلم کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہتر ہی ادب عالیہ بھی پڑھا دیا۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جامعہ و ابن قتیبہ کی ادبی صناعتوں اور کلام عرب کے مجموعوں سے خود استفادہ کر لے۔ یہ زندگی سے ہنستے بولتے، کھرے اور سادہ، لطیف اور شگفتہ، کانٹے کی تول تھے۔ ادب کی تعلیم متنبی اور حریری اس کے آگے پانی تھے۔ نقلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام نصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر اکتفا کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ درس نظامی پر اضافہ تھا۔ اس کے بعد خیر آبادی درسیات سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خاں[1] رام پوری کے درس میں داخل کر دیا۔

ہزاروں رحمتیں ہوں ان بزرگوں پر جنھوں نے فقہ میں سلاست روی کا قانون ذہن نشین کیا، اور غیبادی تعلیم میں آزاد تفکر کا سبق پڑھایا۔ اگر خدانخواستہ عمادی صاحب قدوری شریف اور مولانا کنز الدقائق کی آل اولاد کے چکر میں پڑ جاتے تو اور جو کچھ بھی ہوتے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلب عمادی صاحب نہ ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے "صورت معنی" اور "معنی صورت" کے کانٹوں میں الجھنے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ قریبے کی مٹھی میں سمٹی سمٹائی ڈاڑھی کو یک انگشت و دو انگشت بنانا پڑتا۔ کٹے ڈھکا پائجامہ نہ پہن سکتے، اور نہیں اتنی گہری ترشواتے کہ مونچھوں کے وجود کا اطلاق ہی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد تفکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بت شکن تھے انھوں نے فلسفہ نشیں کے طاقچوں سے بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہے اور بڑے مزے سے ان کا مثلہ کیا ہے۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی طاقچے میں نہیں بٹھایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبد المجید خاں صاحب سے دلی، اجمل کے طب کی مشہور کتاب "القانون" پڑھی۔

---

[1] مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولوی فضل حق خیر آبادی کے یگانۂ روزگار شاگردوں میں تھے۔ چند سال رام پور میں درس دیا، پھر ۱۸۷۱ء میں جون پور آئے اور مدرسہ امام بخش کو دولت بخشی۔ مولوی حبیب اللہ خاں شروانی ان کی کریم النفسی کا ایک واقعہ بڑے مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ مدرسہ عالیہ کے امتحان کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے۔ سخت گرمیوں کا موسم تھا، امتحان سے فراغت پائی تو بارہ بج چکے تھے۔ استاذ العلماء کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلتے تو سر پر چادر ڈال لیتے، چادر ڈال کے مدرسہ سے پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کرنے زنان خانے میں جا چکے تھے، اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لائے اور اس شان سے مہمان عزیز کی پذیرائی کی جو انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے بھیجے کو بھیجکر کنویں سے تازہ پانی منگوایا، اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئے۔ سپاس گزاری یہ تھی کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے وضو میں کرم فرمایا۔ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

پھر رام پور میں عرب محمد طیب سے فنون ادب کا فیض حاصل کیا، اور طیب صاحب نے مکتب سے مکتب نوازی کی مسند پر بٹھا دیا۔

اس زمانے کی علمی دنیا میں مولوی عبدالحق آسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدالحق فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ اور رام پور کے مدرسۂ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسی چھوڑ کر لکھنؤ میں "اصح المطابع" کے نام سے مطبع قائم کیا۔ جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصحیح و تہذیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ آسی صاحب کو اپنے اس کام کے لئے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی، جو ادب اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے ہوں اور غلط سخنوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے کسی کام سے رام پور آئے، طیب صاحب نے ان کے مطلب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، اور عمادی صاحب مکتب سے مطبع کی زینت بن گئے۔ یہاں غلطی اور مطبوعہ نسخے تھے اور عمادی صاحب اول سے آخر تک لفظ بلفظ ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ آسی صاحب کو کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ جیسے بچوں کو ہجوں کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انھوں نے اپنے ذمے رکھا۔ کام کا دائرہ وسیع کر دیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور ریاضیات کی تقریباً تمام کتابیں شائع کیں۔ "اصح المطابع" کا نام درسی حلقوں میں صحت طباعت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، غلطیوں کی تصحیح نے کھٹک اور پرکھ کی استعداد پیدا کر دی، اور بغور پڑھنے کی وجہ سے مباحث ذہن نشین ہو گئے اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیلاً اس کے مباحث سامنے آ گئے۔

تصحیح کا بار جب ہلکا ہوا تو آسی صاحب نے پہلے "الریاض" نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبدالوالی صاحب کے اہتمام سے "البیان" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی مدارات میں نکلے تھے جب ناخن نرم تھے اس وقت سے عربی انشا کا ذوق پرورش پا رہا تھا۔ تصحیح کے کام سے جب فرصت پاتے عربی جرائد کو مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ آسی صاحب نے مناسب سمجھا کہ یہ ابر کرم جو باہر برستا ہے گھر ہی میں کیوں نہ برسے۔

لہ۔ عرب محمد طیب نو اور عالم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا بہتا دریا، وطن مکہ تھا، نہ جانے ہندوستان کس طرح آ نکلے، مولوی فضل حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ) سے معقولات میں کمال حاصل کیا، نقلی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتابیں بے نیاز ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب رکھتے تھے، کلام جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گھنٹوں قصیدے پر قصیدہ مسلسل سنتے جائیے، پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی عکاسی کر دیتے اور لہجے سے شعر کی جنسیں نمایاں کر دیتے۔ نکات سخن بیان کرتے اور داد سخن دیتے۔ مماثل یا متماثل شعر سنانے کی لہر آ جاتے تو گھنٹوں ہمرنگ و ہم معنی شعر سنتے جائیے۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے۔ نواب کلب علی خاں کی مجلس کے بلبل ہزار داستان تھے، جد و ہزل میں طاق، نواب ان کی بہت تازیانہ ادا کرتے۔ مذہب میں پانی تھے، جس رنگ کے گلاس میں چاہو ڈال دو، مگر رہتے تھے اسلام کے دائرے کے اندر۔ مدتوں مدرسۂ عالیہ کے صدر و مہتمم رہے اور طلبہ کے ذلیلے بڑی فراخ حوصلگی سے ہضم کئے۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مرد آزاد و بے باک پر۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب سے آخر میں دارالترجمے اور حیدرآباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دارالترجمے کو یہ بڑا شرف "تقریباً بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ بھی کچھ مدت میں وہ بھی کچھ مدت میں مترجم[1]، ناظر مذہبی۔ علمی مبصر، واضع اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے، اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ باایں ہمہ وہ علمی رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی مدد اور رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دائرۃ المعارف اور کتاب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رکین تھے۔ دائرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں یورپی شرق شناسوں کے اشتراک سے ایڈٹ کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگران اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے۔[2] کتاب خانہ آصفیہ کی مجلس مخطوطات میں وہ علمی نسخوں کے مستند مبصر تھے۔ کتاب کسی موضوع و مضمون کی ہو اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادی قیمت کیا ہو؟ اس میں وہ کورے تھے اور اس سے سروکار ہی نہ رکھتے۔ جس نے زندگی بھر بازار جا کے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں تیر تکے ہی لگاتا۔ یک درگیری اور محکم گیری ان کی شخصیت کی ایک بنیادی اینٹ تھی۔

---

[1] مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے حسب ذیل کتابیں نکلیں:-

(۱) مروج مسعودی کا "تنبیہ و اشراف" اور "مروج الذہب" (۲) مورخ طبری کی تاریخ الرسل والملوک کی آخری دو جلدیں۔ (۳) طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن حزم کی الملل والنحل ——— یہ آخر الذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

[2] بارہویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی و طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل:-

(۱) رسالۃ الضوء
(۲) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالقطوع
(۳) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالدائرۃ
(۴) رسالۃ الکرۃ
(۵) رسالۃ مشکل بنی موسیٰ
(۶) رسالۃ المساحت
(۷) رسالۃ ضوء القمر۔

محدث ابن جوزی کی مشہور تاریخ اور سیرت خلفاء کا وشنہ مصطلحی ۔ مدینہ منورہ

حیدر آباد سے عمادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب[1] تھے ——— یہاں حیدر آباد سے میری مراد حیدر آباد کی روح ہے، روح کا مظہر، جس سے حیدر آباد، حیدر آباد تھا ——— اور اپنے رفیق و برادر کی کچھ اس شان سے تقریب کی کہ پیش گاہ سے تار کے ذریعے طلبی ہوئی، دربار کی لباس پر طرف کر دیا، پہنچتے ہی باریاب کیا اور مشرقی شعبے کو ان کی رکنیت کا شرف بخشا۔ پہلی ملاقات میں ہفتوات کا لفظ، اتنا گہرا پڑا کہ عمادی صاحب خاص امتیازوں کے مورد بن گئے، ایسے امتیازات جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بارگاہ میں جو نادر قلمی کتابیں صلہ و انعام کی غرض سے پیش کی جاتیں، اور بڑے بڑے مصنف اپنی جو کتابیں نوازش و سرپرستی کی غرض سے پیش کرتے ان کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے ایک ہی معتمد جوہری تھا، عمادی صاحب! یہ بھی معاملت تھی، براہ راست "ہمارے ناموس" اور "ہمارے حافظ" صاحب کے جانے۔ اپنے خاندانی کتاب خانے اور آصف جاہی ریکارڈ آفس کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس نادر تاریخی مواد سے دیکھنے کا اتفاق عمادی صاحب کے سوا کسی کو نہیں ہوا، خود اپنے لئے ہندوؤں کی سیاسی تاریخ لکھوائی اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اطمینان اور اپنی تلاوت میں استفادے کے لئے قرآن کے نامی گرامی ترجموں کی نسبت فوقیت چاہی کہ دیکھ کر بتاؤ ان میں کونسا ترجمہ مستند ہے اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو حاشیے پر اصلاح کر دو، کس قدر جذامی بنا ڈالنے والی تھا انسانیت کو یہ امتیاز اور منفرد امتیاز! لیکن عمادی صاحب کا جوہر ذات اس قدر اعلیٰ اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے امتیازات اس سبک میں بارش کی ایک بوند تھے!

عمادی صاحب کے بطور تحدیث نعمت بھی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو اردو کی ایک کہاوت ہے: "نیکی کر کنویں میں ڈال"، بالکل اسی طرح انھوں نے یہ سارے کام کئے، اور ان کے ذکر اذکار خاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔ اس سے زیادہ خلوص کاری اور کیا ہوگی۔ کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر رہے جو ان سے قریب تر تھے۔

---

[1] ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابع اپنے زمانۂ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جاننے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس (میر محبوب علی خاں) کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادۂ ولی عہد کو مملکت کا کام سکھانے جاتے تھے، ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے، کاغذات پیش کرنے ہمیشہ یہی ان کے ساتھ جاتے۔ عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق، اسباب اور کام میں دھدھ برق تھے، ولی عہد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو اس کی نوقیت گراں گزری، ان لوگوں نے یہ سازش گھڑی کہ عزیز مرزا ولی عہد کو برسر اقتدار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس پاداش میں عزیز مرزا صاحب اور ان کے رفیق ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ بات یاد رکھی، اور جب ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کے لئے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدر آباد بلا لیا اور اپنے خاص فرمان سے مغربی شعبے کا رکن مقرر فرما دیا۔

یہ اُن کے گہرے علم کا گمبھیر انا تھا۔ انا احساس ذات ہے، یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و نظر سے متوازن ہوتا ہے اسی قدر گمبھیر ہوتا ہے، اور جس قدر گمبھیر ہوتا ہے اسی قدر ہوش مند شخصیت تشکیل پاتی ہے ——— لیکن ایغو جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے، وہ مستقیم اور متوازن احساس ذات نہیں! انا کی جو مستی ہے ——— عمادی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و نظر سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص کمال اور خاص بصیرت ہے، اس احساس اور قلندر مشرب بزرگوں کے فیضِ تربیت نے ان کی ہوش مند اور جیتی شخصیت کو جنم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو آج ڈھونڈے بھی کہیں نظر نہیں آسکتیں، نہ خانقاہوں میں نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے ادبی مرکز میں! شاید کالونی کریکی، نخوت اور تمکنت کی پرچھائیں بھی ان میں نہ تھی۔ اپنے ہر ملنے والے کی بے حد بزرگ داشت کرتے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات اور کسی طریقے سے ایک جاہل ہم نشین کو اس بات کا خفیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن اور دست گیری کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کر دیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی تنخواہ میں دست گیری کی ایک مستقل مد تھی۔ معمولی نہیں چھ سو میں سوا سو روپے کی مستقل مد! خود ان کا اپنا حصہ کھانے کپڑے اور اوپری مصارف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کا بیس فی صد! دست گیری اس شان سے کرتے کہ اونچا ہاتھ نیچا رہتا اور نیچا ہاتھ اونچا۔ جیسے مرید با اخلاص اپنے پیر و مرشد کو اور سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر دفتر کے چپراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آتا تو اگرچہ وہاں کا عام دستور یہ تھا کہ چپراسیوں کا سلام دیکھ لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عمادی صاحب ان سب سے مصافحہ کرتے، بزرگ داشت سے ان کو بٹھاتے، خود ہر ایک کو عطیہ پیش کرتے اور عید کا انعام ٹھیک اسی طرح پیش کرتے جس طرح وہاں اعلیٰ حضرت کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ عبد اور عید گردی میرے لغت و رسم سے خارج رہی ہے، لیکن عمادی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔ ان کی بلندیاں دیکھ کر میری پستیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ سادگی پر پیچے تو اپنی پستی کا یہ احساس انہی کی بلند انسانیت کا ادنیٰ فیض تھا۔ شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریقے پر جسارت سے کچھ کہا، فرمانے لگے: جب عمادی اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عید کی نذر

---

[1] قلندری طریق کا تخم ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان لائے، پرویز سال تھے، صاحب فضل اور اپنے کام میں صاحب کمال تھے، "بروش بیک نگاہے" ان کا طریق کار تھا، خواجہ قطب الدین بختیار اوشی سے متمتع کیا اور متمتع ہوئے۔ وہ خود تو وجدان کی اس تازہ نظر سے ان علاقوں کو بہرہ مند کرنے واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے، لیکن یہاں بھی ان سے ایک مستقل طریق تفکر شائع ہوا، قطب جمال اس کے مرحلہ تھے اور طریقہ چشتیہ میں بھی اس طرز تفکر کا پیوند لگا، چنیز کار تھی تمام اصحاب طریق متمتع ہوئے۔ عمادی صاحب کے بزرگ شیخ قطب جمال کے حلقے سے متعلق تھے مشرب قلندری کا خلاصہ دو لفظوں میں جیت نفس ہے۔ قطب فکر کی بالکی و بے باکی خوش دلی و خوش اندیشی شیخ محمد حدث نے "اخبار الاخیار" میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

پیش کرتا ہے، تو یہ لوگ بار رجحانوں اس کے سزاوار ہیں۔ عمادی کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے مخدوم ہیں اور وہ سب کا ادنیٰ ترین خادم ہے۔ ان کے لہجے میں بھرپور انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں پیوست ہوتی جا رہی ہے۔

نوکروں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ تھا۔ نوکر صرف رہتے تھے، لیکن ان کا سارا گھر ان کے دسترخوان میں برابر کا حصہ دار تھا، بلکہ ان کے مہمان بھی۔ جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ قدرتِ کلام مودبین سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت محبوب تھی۔ دکھ بیماری میں ان کی دیکھ بھال علاج معالجہ کرتے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت الفت تھی۔ وطن جاتے عزیزوں دوستوں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ خاندان کے متعدد بچوں کو ان کے رحمان کے علاج پر جھوایا۔ ایک بھتیجے کو اب کا اور ان کے صاحبزادے کو سائنس کا شوق تھا دونوں کو بلا امتیاز ایک ساتھ علی گڑھ میں پڑھوایا۔

حیدرآباد کی جاہ و مال معاشرت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنی کلٹے پر اوس ہوتی ہے۔ نمونے کی طالب علمانہ سادگی جو ہمیشہ سے ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سرِ مو فرق نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست کہتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو روش دیکھی تھی وہی آج اس مرکزِ جاہ و فراغت میں دیکھ رہا ہوں نہ مزاج میں کوئی فرق ہے۔ نہ لباس اور بود و باش میں" ـــــــ اور اسی سلسلے میں عمادی صاحب کی تحصیل علم کے واقعات سنائے۔

انفرادیت کیجئے یا وضعداری، جو کچھ بھی تھی ان کی ٹوپی میں تھی، پھندنے سے آزاد اونچی باڑ کی نرم ترکی ٹوپی۔ ڈھیلی ڈھالی گھٹنوں سے بالشت بھر سے کچھ زیادہ لمبی شیروانی۔ ڈیڑھ فٹے پائنچے، ٹخنوں سے اونچے نہیں، اتنے لمبے کہ ایڑیوں سے لٹے رہتے۔ یہ چیز خاص اقسام کے لوگوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔ جبا اور عمامے سے کبھی گراں جسم نہ ہوئے جو لباس معمولاً پہنتے تھے، کوئی مجلس ہو اسی لباس میں جاتے۔ جلوہ و زیبائی کا جدا لباس کیش و آئین نہ تھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے وضعدار تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا۔ جو وضع پڑ گئی زندگی بھر کا دستور بن گئی۔ تو ہو جائے کسی کی جو کسی قسم کی ہو، اس سے انھیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و استہزا، اپنی ذات کے متعلق ذکر اذکار ان کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی تھی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی جس میں ذرا بھی کوئی استعداد پاتے، اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے مقام سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے اور حوصلہ بڑھاتے۔ رد و کد، بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور فیصلہ کوئی، اگر کسی علمی بات پر چھیڑ کے ذہنی ورزش کا لطف پیدا اور لطف اندوز کرتے۔ شواذ اور نوادر مسائل اور لطائف و ظرائف ان کے کشکول میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا جس مسئلے پر گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کے ہزاروں شعر، جدید و ہزل ہر قسم کے ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے، سنتے اور نکتہ سنجی کرتے۔ مطالعے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ ادبی تاریخی اور فنی لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کر کے اس طرح ہنستے کہ سارا جسم ہل جاتا۔ شاید مقامی محاوروں کی طرح ہنسنے کا محاورہ بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی بالکل یہی وضع مرحوم مولوی

ابوبکر شیث کی بھی تھی، دونوں "جون پوری" تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سانچا جون پور کی قدیم شائستگی نے ڈھالا ہو۔

تردید کے انداز میں تردید نہ کرنا اور غلطی کی اصلاح "غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہ بھی مستقل عادت تھی کہ جو لوگ بننے کے شوقین ہوتے بڑی تکنہ آفرینی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ بننے کا سودا ہوا، خوب عبارات کی، وہ "حضرت العلامہ" بن گئے اور اس سند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ لکھ دیا ہے، علامہ بن کر اپنا قانونی حق سمجھ لیا اور عمادی صاحب نے طرح داری سے لکھ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو منتخبہ کہتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ جیسے دوست بلاشبہ علامہ ہیں اور ایسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ تفریح کے لئے تھے لطیف ضروری ہے اور یہ شے لطیف کا کر شرمتا تھا تھوڑے عالم لوگ بھاتے، عمادی صاحب نے کہا: میرا بابا آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا، وہ غریب علامہ بننے کی کوشش میں کچھ بن ہی جائے گا، بگڑے گا تو نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے۔

ہمیں تو شیخ و برہمن سبھی کی سنتے ہیں
یہ کیوں ہو کہ اس نہ توڑیں پکانے والے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی عبارات میں بھی دریغ نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یہ اپنی جگہ محکم تو وہ اپنی جگہ خوش۔

اور یہی عبارات تھی کہ تاثر کے مترجم مسعود علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب شاگرد کو اس کے کمرے میں جا کے پڑھانے لگے۔ محوی صاحب علی گڑھ کے پرانے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی میں نمایاں استعداد کا علامہ شبلی نے ان کو شیفتہ دیا تھا۔ سنسکرت بھی وہ پڑھے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ سنسکرت کے مرتبے کی وجہ سے خود پڑھنے نہیں آتے، اور عمادی صاحب کو بھیج ڈالا۔ خوب برسے، خوب برسے بھیجنے پر برسے اتنے ہی وہ نہال ہوئے، اجڑی تھی تو بڑے ٹھہرے ہوتے ہیں بولے۔ ان کے آنے سے مجھے کچھ ترک نہیں لگ جائے گا۔ یہ بات تو قابل قدر ہے کہ انھیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے آپ پڑھئے عمادی آپ کی جناب میں بھی حاضر ہوگا۔ انہی محوی صاحب کے بال ضیافت میں ظفر علی صاحب نے بیان کیا تھا "یہ ۳۳ء یا ۳۴ء کی بات ہے کہ مجھ سے ڈاکٹر اقبال نے ذکر کیا کہ میں ابن عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو مجھے ابن عربی کی فصوص اور فتوحات کے مباحث اور فلسفہ سمجھا دے۔ میں نے اپنے علامہ کو تجویز کیا اور یہ حضرت خود جا کے پڑھانے لگے۔" محوی صاحب نے زیدشاہی: کہ رسم پابندی اوقات بھی جاتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا قصہ پوچھا، بہت سادگی سے اتنا کہا: جو بزرگ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے تھے وہ بوڑھے ہو چکے تھے، مولوی شبلی سید صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و مطالعے میں مشغول تھے۔" اور قصہ گویا تمام کر دیا۔

مولوی سید سلیمان صاحب کو بہت ملال تھا کہ "ان کے مضامین ابوالکلام کے نام سے شائع ہو گئے۔" ایک دن دارالمصنفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں عمادی صاحب کے پاس دفتر تشریف لائے، یہ قصہ لازم گنگوہ سے تھا، فرمایا: یاد ہوگا مولانا

آپ کو، وہ میرا مکان پڑھ کی مسجد والا مضمون اور ابوالکلام صاحب کا برہمی کا خط! اسی مضمون سے شہرت لی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا ——— اور مولانا! آپ نے دیکھا، آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مملوکات ارثی میں شامل کرتے جو آپ وہاں چھوڑ آئے تھے ..... اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی۔ عمادی صاحب نے کہا: چھوڑیے جناب مولانا (یہ عمادی صاحب کا خاص انداز تخاطب تھا) ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطف صحبت حاصل نہ ہوا!"

سید سلیمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دل گرفتگی سے عمادی صاحب کی صورت تکنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دل چسپ مطالعہ تھا۔

ان کا ذہنی وجدان کلیۃً عقلی تھا، اور وجدان الفاظ کا زندانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد راسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات رسوخ کی پوری آزادی دیتے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، راسخ اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو "انگریسول" کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی صحبت سے یکساں فرحت و انبساط حاصل کرتے۔ ایک غالی شیعہ دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام نے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: آپ جس کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبلچی اور سارنگیے پیدا کرنے نہیں چاہتا خیر شکن جیدر کر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ "کفر ان کے نزدیک لعنت اور اصطلاح دونوں لحاظ سے، عقل سے بغاوت ہے اور استدلال ایمان کی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مولوی معنوی نے استدلال کو پائے چوبیں کہا ہے، وہ پائے آہنیں کہتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انھوں نے یوں بدلا ہے:

پائے استدلالیاں روئیں بود — پائے روئیں ہم ز تسکیں بود
بسکہ استدلال کار دیں ماست — فخر رازی راز دار دیں ماست

اور یہ استدلالی طریق، دینی امور اور علمی امور میں، ان کا اصول کار تھا۔

وہ اپنی تسکین خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے، تو دن رات اسی دھن میں لگے رہتے اور تحقیق کے پھل سے، خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، شاد و شاد ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہوتا تھا، وہ اپنی خواہش اور نقطۂ نظر کو محور نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف زمینی کام لیتے تھے اور عمارت گری کے لئے تذکرہ و تراجم رقعات و محاضرات (گفتگو کی کتابوں) اور دوسرے مآخذ سے واقعات کو رونما کرنے والے ریشوں کا مکھن نکالتے۔ اس کے لئے وہ قصوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے شاہی فرمانوں، جاگیری دستاویزوں اور پرانے وقف ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ امتحانات اور دوسری علمی سرکاری مدوں سے دو ڈھائی ہزار سالانہ کی جو آمدنی ہوتی وہ علمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کر دی تھی۔

بدنام واقدی سے ان کو بہت ہمدردی تھی، کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے تاریخ اور افسانے کو سمو کر

ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے فن سے معاشرے کی اکثریت ہر زمانے میں بڑے ذوق شوق سے مستفید ہوئی۔ وہ مورخ کی بجائے ایک بامقصد نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا واقف آب و رنگ مہیا کرتی ہے، جو ان کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دو نظریوں: عربوں کی بدویت کے نظریے اور علوم و آداب میں عربوں کی تہی دستی کے نظریے سے سخت اختلاف تھا۔ کہتے تھے کہ مستشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی محققانہ رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریے بے اصل ہیں "تاریخ عرب قدیم" اور "صناعۃ العرب" ابن خلدون کے نظریۂ بدویت کی تردید ہی نظر آتی ہیں، لیکن ان کو اپنی معتاد روش کے مطابق تردید کے عنوان سے پیش نہیں کیا۔

مقالہ ہو یا ترجمہ، یادداشت قلم کھنے اور کسی پیراگراف یا صفحے میں شاذ و نادر کوئی لفظ غلط زد ہوتا۔ مدت سے خود لکھنا چھوڑ دیا تھا، ترجمہ لکھوا لیتے تھے۔ ترجمہ لکھنے کا ڈھنگ اکثر و بیشتر یہ ہوتا: ٹہلتے رہتے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور نظر سے روانی سے بول دیتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ لفظی ہوتا، مسجع عبارتوں کے لفظی ترجمے کی یہ شان تھی:

والقمر الباهر والكوكب الزاهر
والغمام الماطر وما بالجق من طائر وما
اهتدى بعلم مسافر من مهد وغائر
لقد سبق هاشم امية الى المآثر اول
منه وآخر ابوه همهمة بذلك خابر
نقض لها ثم بغلبة.

قسم ہے ماہ تاباں کی، نجم درخشاں کی، ابر باراں کی، مرغان فضائے آسمان کی۔ قسم ہے اس پہاڑی ٹیلے کی جس سے رہرو کو راہ ملے، فراز پسند ہوں یا نشیب گیر سب کو پناہ ملے کہ خوبیوں میں ہاشم امیہ سے بڑھ کے ہے، آگے اچھے ہر حال میں بڑھ چڑھ کے ہے۔ ابو ہمہمہ اس کا خبر رساں ہے اور یہی اس کا بیان ہے۔ اس بیان کے ساتھ ہاشم کے غالب آنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے۔ ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا چاہتے تھے کہ اس کتاب خانے میں اچھے داموں نکل جائے۔ ان سے کہا: فہرست بنائیے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھیے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا، یہ کام اپنے ذمے لے لیا، اور بار احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبکدوش کر دیا کہ مجھے پڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی۔ وہ ہر ہفتے دس پانچ کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی محنت کون کسی کے لئے اٹھاتا ہے۔ چند نمونوں سے تعارف کی فنی خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہوگا:

کیمیائے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین کیوں کی، نبات و معدن و جماد میں قدر مشترک کیا ہے، نقص خلقت کی کتنی گنجائش ہے۔ سالمات کتنے ہیں اور ناقصات کس قدر ہیں، جوہر و عرض کی کیا نسبت ہے، جن اجسام کو بظاہر مقیت اور ٹھوس محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر تحلل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تقطیر و تحلیل و ترکیب سے وہی جنس سائل مرتبہ حالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل سب کو لے کر ہیرے میں تبدیل کر لیا جائے؟

کیمیائے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیا کے علم حق اور عمل صدق پر مبنی ہے۔

اسلام سے پیشتر کلدانی و مصری و یونانی قومیں موسیٰ میں مبتلا تھیں۔ مسلمان بھی ابتداً اسی علم میں گرفتار تھے۔ خلافت سے محرومی کے بعد خالد بن یزید اور ان کے رفیق کار جابر بن حیان انہی تحریکوں میں پڑے رہے جو طغرائی کی تحقیق میں فن سے تعلق نہیں رکھتے، ایک شخص زمین کی تصعید میں سرگرم ہے، تکوین میں انہماک رکھتا ہے، یا اس ہمہ کوشش بے نتیجہ رہتی ہے، اس لئے کہ نباتات و معادن و جمادات کے حقیقی علم سے عملاً آشنا نہیں۔

مسلمانوں نے یہ کمزوری محسوس کی، موسیٰ کے زینے پر چڑھ کے کیمیا کے بام حکمت پر چڑھ گئے۔

یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے۔

طغرائی نے اپنے تمام پیش رووں سے الگ ہو کے ابوبکر رازی کو اپنا مدار علیہ مانا ہے کہ اس علمی خلافت کے ——— فی زعمہ ——— وہی باقی بلا فصل تھے:

رسالہ حُرّ: فلاسفۂ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا شیخ بو علی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ عہد سلاجقہ کی یادگار ہے۔ اسی عہد کی زبان ہے اور وہی انداز بیان ہے، کائنات کس طرح وجود میں آئی، ہستی کیسے ہوئی، معدوم سے موجود کی کیا سبیل نکلی، کوئی شے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی علت و سبب موجود ہو، علت اس شے پر مقدم ہوتی ہے، وجود عدم سے نکلا تو کیونکر نکلا، علت وجود کو وجود سے پہلے موجود ہونا چاہیئے حالانکہ وجود سے پہلے آپ عدم کے قائل ہیں۔ یہ مباحث نمونہ کتاب ہیں۔ ان میں غور کرنے والے پر طبیعیین و دہریین کے مذہب کا فساد خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے پہلے ایک واجب الوجود بھی ہے، تعالیٰ شانہٗ کہ وہی اس کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبب بھی۔

رسالہ طیر: یہ بھی شیخ کی عربی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سلجوقیوں کے عہد میں ہوا تھا۔ اس میں انسان کی تخلیق سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہوتے ہوئے ان میں گوناگوں اختلاف کیوں ہے؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی تحلیل کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے، یہ استعداد بالقوہ ہے، ممارست سے اگر اس کو فعل میں لایا جائے تو کوئی سے مدارج ارتقا میں ہر انسان فائز نہیں ہو سکتا۔

تحفۃ الحبیب: اصفہان کے خوش بیان سخنور و سخن سنج میرزا طغرائی کی یہ کتاب زبان آوری کی دنیا میں پرواز خیال کا ایک عجیب مرقع ہے۔ مثلاً سعدی نے، کہ ملاحت کلام میں شور انگیزی پہلے پہل انہی کے حصے میں آئی، ایک غزل لکھی، خسرو بھی اسی زمین کو شاداب کرتے ہیں اور معاملہ بندی میں جسے آن دنوں وقوعہ گوئی کہتے تھے، ایک نئی شان دکھلاتے ہیں۔ حسن اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ سلمان ساوجی، خواجو کرمانی، حافظ فقیہ کی شکر خائی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے یہی زمین سخن شکرستان بن جاتی ہے۔ پھر حافظ آتے ہیں اور خداداد قبول خاطر سے اسی زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں۔ پھر وحشی، بافی و کاتبی و نزاری و جامی اپنے اپنے طرز میں داد سخن دیتے ہیں۔

ایک ایک زمین میں مشاہیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حیرت خیز نگار خانہ معنی اہل نظر کے ذہنی شگفتگی کا انبار در انبار سامان رکھتا ہے جس سے ادب فارسی میں عہد بعہد حسن تخیل و لطف ذوق و عروج فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے ناآشنا ہے۔

اسی سلسلے میں دو مضمونوں کے اقتباس، ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام میں، بغداد، کا تمدن سیلاب تاتار کی نذر ہو چکا ہے، ہولاکو کا جانشین "اباقا" سریر آرائے سطوت ہے۔ "تبریز" جو "زبیدہ خاتون" کی یادگار تھا، آج اس میں تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے، روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کے سب کفر کے نرغے میں آ چکے ہیں، مصر و شام کی ایک بچی کھچی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نے پناہ لی ہے، مگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں اسی ضرورت سے خود "اباقا" "تبریز" میں لشکر زن ہے۔ اور صاحب دیوان وزیر اعظم خواجہ شمس الدین محمد پر تاکید ہو رہی ہے کہ مغولستان سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر لی جائیں پوری قوت کے ساتھ جامع قسطنطنیہ کے مناروں پر حملہ ہو سکے۔"

(۲) ہجرت نبوی کا چھیاسٹھواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشت کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، جوش انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے، یزید و آل یزید پر عام بیزاری مزید ہے، تو آہیں کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر توبہ تلا اب بھی برپا ہے۔ اسی حالت میں قبیلۂ ثقیف کا ایک جوان مرد اٹھتا ہے اور سب کو بٹھا دیتا ہے۔ اس کی کنیت ابو اسحاق ہے، پہلے خارجی رہ چکا ہے، اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ طرف داران اہل بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے، بادل بہ شیر اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسن مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے یہ کانٹا کیا گل کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے؟"

اردو میں شعر کہتے تھے، عہد شباب کی ایک غزل ہے:-

چشم پرفن کا ہے گردش میں نظام اے ساقی
گردش ساغر دینا کو سلام اے ساقی

سطوت جام کی جاتی رہی عالم گیری
اب کہاں ولولۂ شرب مدام اے ساقی

شیشہ ہے منتظر جلوۂ خورشید ازل
مجھ کو درکار نہیں ماہ تمام اے ساقی

کعبۂ دل میں بتوں کو ہے خدائی کا غرور
لب تک آتا ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی

پرتو صبح بنا گوش سے ہوگی کافور
گیسو ہند جگر خوار کی شام اے ساقی

تیغ ابرو سے مے آشام کہیں ڈرتے ہیں
دم شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

مے گل رنگ شہادت کا چلے بزم میں دور
آ چلی ساعت افطار صیام اے ساقی

فارسی میں یوں داد سخن دیتے ہیں:-

جبین زاہد ز افتادگی نشد روشن — ہزار سجدہ کند نور بر جبیں نرسد

حرمان تو ز ہمت کوتاہ بین تست — ہرگز در کریم بکافر نہ بستہ اند

اہل عیش ہمہ از آتش دوزخ بیماں — ہر کہ در خلد در آید نہ برندش بجیم

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب این ست کہ بیمار تو بیمار تر ست

فریب رنگ و نمود اے گہر شناس مخور — حباب وار نمودار ی گہر بخشند
عجب مدار اگر مرغ خانہ پرور را — نداد ہمت پرواز بال و پر بخشند
جہاں کشا کہ جہانے دگر پدید آید — گلیم فقر بیا بند و تاج زر بخشند

عالم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات انسان ہونا ہے علامہ صاحب جتنے بڑے عالم اور علامہ تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان تھے۔ بلند نگاہ اور کریم النفس، قلندر صفت اور قلندر سیرت۔ ان کی زندگی شرافت نفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

ظفر علی خان

شورش کاشمیری

جدید پود کے لئے ظفر علی خاں ایک بھولی بسری کہانی ہیں۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے ان کا طوطی بولتا تھا ——
وہ ہندوستان کے پنجابی رہنماؤں میں سرفہرست، مجموعۂ اضداد اور جامع صفات تھے —— اب تو پیر گو رکنا ہے ہیں لیکن
جب جوان تھے، آگ تھے۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں، ادیب، خطیب، صحافی، شاعر اور سیاس ——
آج بظاہر وہ ایک گم شدہ ورق ہیں اور لیل و نہار کی بہت سی گردشوں نے ان کے آفتاب کو گہنا دیا ہے، لیکن ایک زمانے میں
ان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ حتیٰ کہ ان کا وجود ملی جدوجہد کی ایک تاریخ بنا گیا۔ ہر چند اس تاریخ میں ایک عجیب سا تضاد
ملتا ہے اور ظفر علی خاں اس تضاد کا ایک شدید مظہر ہیں۔ —— لیکن اس تضاد میں بھی اتنی دلکشی ہے کہ زمانے کے احوال و
ظروف سے ملا کر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو اس میں نہ صرف ادب کی فرزانگی اور سیاست کی دیوانگی نظر آتی ہے، بلکہ وہ ایک
عجیب و غریب پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ —— ان کا ادب ان کی زندگی سے متاثر ہے اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا عکس
اور ان دونوں کے امتزاج سے جو صورت بنتی ہے، اس سے ایک ایسا وجود ابھرتا ہے جس میں صوری تھوڑی سنگتراشی زیادہ
ہے —— ظفر علی خاں سراپا ہنگامہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکایتیں شاذ اور شکایتیں وافر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خاں
کی شخصیت سے ہم عصروں اور ان کے جانشینوں نے جو تغافل برتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خاں نے گرد و پیش کی
عمارتیں ڈھاتے ہیں زبان اور قلم کو ہمیشہ گرز آبدار شکن بنائے رکھا۔ نتیجہ معلوم کہ —— آج وہ ماضی کی تمام بہاری کے باوصف
دو دو چراغ محفل نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی ادبی یا سیاسی نقشہ ایسا نہیں جس میں ان کا خط نہ ہو —— اور پھر
محض خط ہی نہیں رنگ بھی ہیں۔ کہیں مدھم، کہیں شوخ۔ انہیں ان خطوں اور رنگوں سے علیحدہ کر کے پرکھنا زیادتی ہے وہ
جو کچھ بھی ہیں اپنے ماحول کی صدا ہیں —— اور اسی سے ان کی سیرت عبارت ہے —— وہ ایک ایسی تصویر ہیں جس میں
بوقلمونی ہی بوقلمونی ہے۔

اب سے چالیس پچاس برس پہلے پنجاب سپاہیوں کی کھلی منڈی تھا۔ صدیوں تک لشکروں کی گذرگاہ رہا۔ برطانیہ نے
پنجاب کو حیطۂ اختیار میں لیا تو یہ ذہنیت اور پختہ ہو گئی —— حتیٰ کہ تمام صوبہ برطانوی مقاصد کی جولانگاہ بن گیا —— اس
سارے عرصہ میں صوبے کی اصل پیداوار سپاہی ہی رہے یا پھر ظفر علی خاں کی مخصوص سیاسی اصطلاح میں کاسۂ لیسان سرد ——

جن کا طغرائے امتیاز "وفاداری بشرطِ استواری" تھا۔ ادھر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سیاسی شعور کی کرنیں پھوٹ چکی تھیں، لیکن پنجاب کا مطلع بدستور تاریک تھا۔ بعض سمتوں میں چند گونجدار آوازیں سنی جاتی تھیں لیکن ان کا دائرہ نہایت مختصر تھا ——— ایک انجمن تھی اور اس میں چند چراغ ——— بالفاظِ دیگر ایک اخلاقی مذاق پیدا ہو رہا تھا جس سے عامۃ الناس بوجہ وجوہ محروم تھے۔ ظفر علی خاں نے ایکا ایکی اسی جمود میں نعرۂ رست خیز بلند کیا۔ ادھر لاہور میں کئی ادبی محفلیں جم چکی تھیں۔ ان کے بانی محمد حسین آزاد تھے۔ عبدالقادر نے مخزن نکالا تو ایک نرم آرائستہ ہو گئی۔ ادھر صحافت میں دو چار اخبار پیش رو تھے لیکن ظفر علی خاں جو شبلی، حالی، وقار، محسن الملک اور اس عہد کے دوسرے اکابر کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکے اور حیدرآباد کی خوشگوار ادبی فضا میں رہ چکے تھے، ایک نیا رنگ لے کر اٹھے ——— وہ کسی روایت کے تابع نہیں تھے لیکن انھوں نے بزم کو رزم میں ڈھالا۔ "زمیندار" جو ان کے والد کی امانت تھا، اس کی ہیئت بدل ڈالی۔ وزیرآباد سے لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے "زمیندار" نکالنا شروع کیا۔ ان کا ادبی مذاق بہت نکھر چکا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم، حیدرآباد کی صحبتیں، سرسید، شبلی اور حالی کا تلطف ——— ان سے ایک منفرد ظفر علی خاں نکلا ——— اردو جو مشکل پنجاب کے چند گھرانوں میں راہ پیدا کر سکی تھی، اب عوام کے مزاج میں دخیل ہونے لگی۔ پڑھے لکھوں کا تناسب چنداں حقیر نہیں تھا ——— لیکن قارئین کی قلت نے سامعین کی کثرت پیدا کر دی اور دیکھتی آنکھوں اس سرے سے اس سرے تک ظفر علی کا نام ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ ظفر علی خاں کے بشارتِ قلم نوکِ زبان ہونے لگے ——— اتفاقات بڑی چیز ہیں۔ ادھر ظفر علی خاں نے زمیندار کی ادارت سنبھالی، ادھر بلقان میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ پہلا سیاسی موڑ تھا جو مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے بعد مڑنا پڑا اور ان میں اپنے پاؤں پر اٹھنے کی قدرے ہمت پیدا ہوئی ——— ظفر علی خاں ادبی اعتبار سے سونا پہلے ہی تھے، اس سیاسی اتفاق نے سہاگہ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہو چکا یا بعض روایتوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ اپنے نہ سہی کہ ان کی مصلحتیں بسا اوقات غبار آلود ہوتی ہیں، لیکن پیروں کا خیال ہے کہ اس دور کے اسلامی جذبات کی مظہر چار شخصیتیں ہیں۔ ابوالکلام، اقبال، محمد علی اور ظفر علی خاں۔ ان چاروں میں بہت سی خصوصیتیں مشترک اور بیشتر میں تضاد تھا۔ لیکن ان کے اشتراک اور تضاد دونوں میں حیاتِ ملی کی روحِ کارفرما تھی۔ ابوالکلام علم و عمل کا مرقع تھے لیکن وہ جس مقام سے پکارتے رہے، وہاں انھیں یہی احساس رہا کہ وہ اپنی ہی قوم میں ایک اجنبی آواز اور اپنے ہی ملک میں ایک غریب الدیار ہیں ——— اقبال کی فکر میں ان کا عمل تھا ——— محمد علی ایک نصب العین تھے جس کا امتیاز تھا ——— "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" ——— اور ظفر علی خاں ——— "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را" کی صدائے بازگشت .....

اس وقت مولانا کی عمر چوالیس برس سے کچھ اوپر ہے اور سن پیدائش ۱۸۷۰ء ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہر میں پیدا ہوئے۔ وزیرآباد ہائی اسکول میں داخلہ لیا، پٹیالہ سے میٹرک کیا اور علی گڑھ سے ۱۸۹۳ء میں ایف اے کی سند لی۔ والد کشمیر میں ڈاک اور تار کے نسلی تھے۔ ان کے بلاوے پر سری نگر چلے گئے اور اسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ وہاں اپنے ایک افسر سے الجھ پڑے ان کی چوکھی اور ملازمت سے دست کش ہو کر مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ لوٹ گئے۔ فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا۔ نواب محسن الملک کو خواجہ غلام الثقلین کے استعفا دینے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ آپ نے اخبار میں اشتہار دیکھا اور درخواست گذاری ——— اور خواجہ صاحب

کی جگہ ملازم ہو گئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کیا۔ پھر محسن الملک سے سفارشی خط لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ نواب افسر جنگ سے ملے انھوں نے فوج میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں کسی نہ کسی طرح فوج سے دار الترجمہ میں چلے گئے۔ چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہو گئے۔ میر عثمان علی خان کے آتالیق بنے۔ سید مرزا ہوم سیکرٹری تھے، ان کی توجہ سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ان کا تبادلہ ہو گیا تو نواب سربلند جنگ ان کی جگہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ وہ فدوی ترش رو اور چڑچڑے تھے۔ مولانا کی جودت طبع کو مضمون باندھ آگیا۔ محمد رفیع سودا نہیں تھے کہ غصہ سے کہتے: قلمدان لاؤ ——— قلم اٹھایا اور جو کھو ماری۔ سربلند جنگ کو بھی خبر ہو گئی۔ مولانا بھیجنے کے کر میر محفوظ علی بدایونی کے ہاں بریلی چلے گئے۔ آدھر وہ بھی ملازمت سے بیزار تھے، دونوں نے بمبئی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی اور استعفا دے کر رخصت ہو گئے۔ وہاں مکان کرایہ پر لے کر اور فیشل کرنسل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا ——— جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا، مگر بیل منڈھے نہ چڑھی۔ دونوں ادیب تھے اور بیکار دیا تھا۔ عزیز مرزا تو دل شکستہ ہو کر بدایوں چلے گئے لیکن آپ نے دکن ریویو نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ عزیز مرزا دوبارہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ انھوں نے تار سے بلوا بھیجا، بمبئی سے حیدر آباد پہنچے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار مقرر ہو گئے۔ یہاں آپ نے لارڈ کرزن کی تالیف خیابان تاریخ کا اردو میں ترجمہ کیا اور شہرت پائی۔ پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو روپے انعام میں دئے جو ایک پنجابی نژاد کو کسی اردو ترجمے پر پہلا انعام تھا۔ جو نظام نے از راہ خوشنودی تین ہزار روپے مرحمت فرمائے ——— داغ، میر محبوب علی خان کے استاد اور مرزا امیر آتے۔ انھوں نے تقریظ لکھی جس میں صحت زبان کی بے حد تعریف کی ——— احسن مارہروی راوی ہیں کہ داغ کے قلم سے نثر کا جو سب سے بڑا ٹکڑا نکلا، وہ یہی تقریظ ہے ——— اس سے پہلے مولانا سیر ظلمات، فسانۂ لندن اور منہری گھونگا کا ترجمہ کر چکے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا کہنا ہے کہ ظفر علی خان فسانۂ لندن کے بجائے کسی علمی کتاب کا ترجمہ کرتے تو ان کی خدمات علمی میں شمار ہوتا۔ موکہ مذہب و سائنس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ایک مفید دینی خدمت ہے۔ غرضیکہ ان تراجم سے مولانا کی ادبی قابلیت کا شہرہ ہو گیا۔ انھی دنوں موسیٰ ندی میں طغیانی آگئی جس نے تمام ریاست کو ہلا ڈالا اور متاثرہ لوگوں کی امداد کے لئے تحریک چل نکلی۔ مولانا نے اس پر جو طویل نظم لکھی، اس سے ادبی و شعری حلقوں میں ان کا نام اور رتبہ ہو گیا۔ اس نظم کو موضوع کے اعتبار سے اولیت کا درجہ ملا۔ اسی اثنا میں دکن ریویو جاری کیا۔ جنگ روس و جاپان کے نام سے ایک مبسوط ڈرامہ لکھا۔ گو اس کی فنی حیثیت بلند نہیں، لیکن ادبی اعتبار سے قادر الکلامی کا نمونہ ہے ———

ایک روز نواب افسر جنگ فوج کے جوانوں کی نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ آپ قریب ہی کھڑے تھے ——— جی چاہا تو نواب افسر جنگ سے عرض کی ؎

تو دستگیر شوی اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہان سوار اند

افسر جنگ مسکرائے۔ نیزہ موجود تھا، گھوڑا طلب کیا ——— فرمایا:

ہمیں میدان و ہمیں گرگے است

مولانا تامل کئے بغیر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئے اور آن واحد میں میخ اکھاڑ لائے ——— ایک دن داغ کے ہاں شریک مجلس تھے

کر تھے میں شور ہوا۔ کوئی کچھ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، لنگوٹ باندھ کنوئیں میں اُتر گئے اور بچے کو نکال باہر کیا۔

حیدرآباد میں کسی یورپین تھیٹریکل کمپنی نے ڈرامہ کیا جس میں نیم برہنہ عورتوں کا رقص بھی تھا۔ ریاست کی طرف سے کمپنی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اُٹھے تو اخبار نویس کے بجائے اظہار ملامت کر ڈالا۔ ریذیڈنٹ کو ناگوار گذرا، دل میں گرہ باندھ لی اور آخر حیدرآباد سے نکلنا پڑا ——— والد حیات تھے۔ یہاں آکر زمیندار میں شریک ہو گئے لیکن ایک آدھ برس ہی میں دوبارہ طلبی ہو گئی۔ سر مائیکل اڈوائر حیدرآباد میں ریذیڈنٹ رہ چکے اور اب پنجاب میں گورنر تھے، ان کے اشارہ پر خواجہ حسن نظامی نے چغلی کھائی اور حیدرآباد سے دوبارہ نکالے گئے۔ حتیٰ کہ پنشن بھی ضبط ہو گئی۔ الزام یہ تھا کہ نظام حیدرآباد کو پان اسلامزم کی راہ پر ڈالنے اور انگریزوں کے خلاف اکسانے ہیں۔ لاہور پہنچے تو والد بستر مرگ پر تھے یا خالہا اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ زمیندار کو وزیر آباد سے اُٹھایا اور لاہور چلے آئے۔ بلقان کی جنگ نے جہیز کا کام کیا۔ اخبار کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ سر مائیکل گھات میں تھا۔ ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا کرم آباد میں نظر بند کئے گئے۔ وہاں سے نکلا وہ صبح نکالا لیکن تابہ کے؟ بالآخر اس کی شہ رگ بھی کٹ گئی۔ جن لوگوں کے سپرد احتساب کا کام تھا، وہ ادبی استعدادوں اور شعری کنایوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک زمانہ میں زمیندار کو محض اس لئے ایک بڑی رقم کی ضبطی سے دوچار ہونا پڑا کہ اس میں کسی مقالہ کا سرعنوان یہ شعر تھا ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

لاہور کے ایک سرکاری قبیلے نے مخبری کی اور زمیندار موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ اب جو ضبطیوں، قرقیوں اور بندشوں کا سلسلہ چلا تو سیلاب تھا نہیں ——— تحریک خلافت میں یہ طغیانی اور تیز ہو گئی حتیٰ کہ حضور کی ایک تقریر میں ماخوذ ہو کر پانچ سال کے لئے قید ہو گئے۔ اور پھر ۱۹۳۶ء تک کبھی رہائی کبھی اسیری۔ آپ کی مجموعی قید جو آپ نے مختلف وقتوں میں کاٹی، تقریباً بارہ برس ہوتی ہے۔ ہر تحریک میں حصہ لیا اور ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن ہر تنظیم میں شامل ہو کر اس سے الگ ہی رہے ——— کانگریس میں گئے تو برہنہ تلوار اس سے نکلے تو دو دو الفقار ——— مجلس خلافت کی طرح دو رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہاتھوں سے دو دو ماتھ کئے۔ احرار کی عمارت اُٹھائی لیکن شہید گنج کی کدال سے گرا بھی دی۔ اتحاد ملت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی ڈھا دی لیگ میں تھک ہار کر شریک ہو گئے اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھا۔ تنگ طبیعت کا انداز جوں کا توں رہا۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ آپ کی انہی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"ملک میں کسی تحریک کو جیلوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا چاہو تو ظفر علی خان اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام یہ قلعہ بنا دیں گے، لیکن جب قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو، کیونکہ وہ پھر اسی قلعے کو ڈھا دیں گے۔"

الغرض ظفر علی خان انہی حادثوں کی مخلوق اور یہ حادثے ان کے سراپا کو جھیلتے ہیں۔ بظاہر یہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو

ہے لیکن حقیقتاً ادبی ہے کیونکہ ان کا ادب ان کی سیاست کی خلیق نہیں۔ ان کی سیاست ان کے ادب کی پیداوار ہے۔ ان کی سیاسی زندگی میں جو چمک ہے، وہ ان کے ادب کی وجہ سے ہے۔ ظفر علی خان میں سے ادب کو حذف کر دیں تو ایک فرد رہ جاتا اور شخصیت اوجھل ہو جاتی ہے۔ بعض ثقہ لوگوں کی رائے ہے کہ ظفر علی خان کا ادب ان کی سیاست کے ہاتھوں پٹ گیا۔ وہ سیاست کے ہتھے نہ چڑھتے تو ادبی اعتبار سے اقبال اور ابوالکلام کی صف میں ہوتے اور ہنگامی ادب کی جگہ تخلیقی ادب پیدا کرتے اس کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ یوں ہوتا اور دوں ہوتا کی بحث سرے سے غلط ہے۔ ظفر علی خان پیکر ہی اس امتزاج سے بنا ہے ——— اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو ظفر علی خان کے ادب نے بوجوہ بس اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے زیادہ مقصد کی خدمت کی ہے جن کے ہاں ادب محض ایک سماجی نظام کی اکھاڑ پھینک کے لئے آلۂ تخریب ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں ادب، تنقید حیات، تفسیر حیات اور تعمیر حیات ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود حیات کیا ہے؟ اس کا موقف کیا ہے؟ اور اس موقف تک پہنچنے کے لئے وہ کون سے اصول ہیں جن پر زندگی کا نظم قائم ہے ——— ظاہر ہے کہ زندگی ایک فرض ہے اور اس فرض کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے بارے میں جہاں تک احوال و ظروف کا تعلق ہے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ہر دائرہ انسانی میں حرکت و عمل کے خطوط ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ظفر علی خان نے جس ماحول میں قدم رکھا، وہ مسلمانوں کے لئے حد درجہ اجنبی تھا۔ تمام عالم اسلامی کے مسلمان مغربی یورپ کے ہاتھوں پٹ رہے تھے ——— ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جنھوں نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے محو ہو جانے کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جن کے لئے یہ غم تازہ تھا۔ ادھر ملک میں قومی تحریک نے بال و پر پیدا کرنے اور حریت کا احساس کروٹیں لینے لگا تھا۔ ظفر علی خان نے ایک مرد کار زار کی راہ اختیار کی ——— اب تک رمز و کنایہ اور استعارہ و تشبیہ میں باتیں کی جاتی تھیں چنانچہ غالب اس مقام پر ایک آہ سرد نظر آتے ہیں۔ ان کے خوشہ چینوں میں حالی نے نالۂ درد بلند کیا۔ شبلی صف ماتم میں شریک تو رہے لیکن آخر تاریخ کی راہ پر نکل گئے۔ اکبر نے تنقید اور تطہیر کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں افسوسوں اور قہقہوں کا امتزاج ہے۔ اقبال ایشیائی کارل مارکس کی حیثیت سے آگے بڑھے اور وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

ظفر علی خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ادب کو عوام کے لئے ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے جذبات کا سفیر بنا لیا۔ جو باتیں اب تک رازداری سے کی جاتی تھیں وہ کھل کر سامنے آ گئیں ——— ظاہری رکھ رکھاؤ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ مرحلہ یہ تھا کہ جن غیر ملکوں کے قبضہ میں ہندوستان ہے، ان کے خوف اور حیرت کو ذہنوں سے خارج کیا جائے ——— اور یہی قومی تحریک کا ابتدائی شیوہ ہوتا ہے۔ ظفر علی خان نے غیر ملکی حکومت پر تابڑ توڑ حملے کئے جوں جوں قومی تحریک پھیلتی گئی، توں توں ان کا قلم تیز ہوتا گیا۔ انھوں نے برطانوی نظم و نسق اور اس کے کل پرزوں ہی کو ہدف تنقید نہیں بنایا بلکہ ان کے ہندوستانی معاونوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس حملے کی لپیٹ میں سبھی آ گئے ——— افراد، مجالس، عقیدے، نظریات، تحریکیں اور اپنے، پرائے ——— ان کی مدارات کے لئے ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں وضع کیں کہ سبھی واہ واہ اٹھے ان میں تلخیاں بھی تھیں اور کچھ کے بھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا ——— عوام ہمیشہ جذبات پر اٹھتے ہوتے ہیں۔ شاعری بجائے خود جذبات کی پیداوار ہے اور صحافت کی بنیاد ہی جمہور پر ہے۔ ادھر قومی تحریک میں جذبات کا طبع نفرت اور محبت سے ہوتا ہے۔ لوگ

جذبات ہی کے بل پر نفرت کرتے اور جذبات ہی کے ذریعہ محبت کرتے ہیں۔ ان تمام حرکات نے ظفر علی خان کے قلم کا اسلوب متعین کیا اور نظم و نثر کے میدان میں یکہ تاز ہو گئے۔ پھر ان حوال سے صحافتی شاعری پیدا ہوئی جس میں قصیدہ تھا یا ہجو ——— اور ظفر علی خان کا سارا کرو اسی میں جھلکتا ہے۔ ان کے ممدوحین کی فہرست مختصر لیکن معتوبین کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور عقیدوں کو انھوں نے خراج ادا کیا ان میں تو باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مستثنیٰ ہیں۔ اس باب میں انھوں نے سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں اور شگفتہ سے شگفتہ شعر نکالے۔ ان کے نعتیہ کلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے وہ دوسرے شعرا کی طرح غلو سے کام نہیں لیتے بلکہ حضورؐ کی سیرت کا نقشہ اور ان کے محاسن کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا تھا کہ قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں اسلام اور تاریخ اسلام سے والہانہ عقیدت ہے ——— بعض مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی مسلمانوں کو تلقین کی ہے ——— مثلاً صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور اس زمانہ میں ابن سعود، امان اللہ خان، مصطفےٰ کمال ان کے ممدوحین تھے۔ بعض تحریکوں کی تائید و اعانت کے لئے جذبات کی شیفتگی کے ساتھ قلم اٹھایا۔ مثلاً کانگریس، خلافت، احرار، اکالی دل، دوارہ تحریک، مسلم لیگ، اتحاد ملت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر ہم سفر رہنماؤں اور ہم نوا عزیزوں کو بھی ہدیۂ سپاس پیش کیا۔ لیکن ان رہنماؤں، عزیزوں اور تحریکوں کے معاملہ میں ان کے ہاں دونوں طرح کے جذبات عام ہیں جس کی تعریف کی اس کی ہجو بھی لکھی، اور جس کی ہجو لکھی اس کی ستائش بھی کی۔ مولانا کے تینوں مجموعے "بہارستان"، "نگارستان" اور "چمنستان" اس سے لبریز ہیں۔ بلکہ ان واقعات کی دستاویز ——— حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا کلام پوری نصف صدی کے سیاسی واقعات کی منظوم تاریخ ہے۔ ایک مورخ اس میں واقعات اور حالات کی بہت سی گم شدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے تین مجموعے اور تھے۔ پہلا "روح معانی" ——— یہ اصلاً گورکھپور خلافت کانفرنس کا خطبہ تھا۔ اسی کے اخیر میں چند نظمیں درج تھیں جنھیں بہارستان میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرا "حبسیات" ——— یہ مولانا کے زندانی کلام کا مجموعہ ہے جو آپ نے پانچ سالہ قید کے دوران میں منٹگمری سنٹرل جیل میں سپرد قلم کیا۔ تیسرا "ارمغان قادیان" جس میں مقالات کے علاوہ وہ نظمیں تھیں جو آپ نے قادیانی فرقہ پر لکھیں اور اب ان کے دوسرے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

جہاں تک معتوبین کا سوال ہے، ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائد اعظم، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال بھی ان کے قلم کی زد میں آ چکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستار فضیلت کے پیچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا۔ جس کی بہترین مثالیں سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں۔ یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خان نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی

گو ان میں ذاتیات کا زہر انتہائیت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے۔ لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے، وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجوؤں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈپلومیسی، ہندو چالبازی، نادر بانی بنوت اور اپنوں کی کاسہ لیسی ہے کہیں کہیں دشنام بھی ہے۔ لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے، عمدہ ترکیبیں، اور دلآویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ گو ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں۔ لیکن بیشتر ان اشعار پر سر دھنتے اور صاد کرتے ہیں۔

اس قدرتِ کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ زمیندار ان کے ایام صحت تک ایک ادارہ رہا ——— کئی آئے اور کئی گئے ——— عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد میکش اور نصر اللہ خان عزیز، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے ——— بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تصحیک و طعن کا ڈول ڈالا، لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا، جو سامنے آیا مات کھا گیا ——— !

عجیب زمانہ تھا مسلمان رہنما تحریک خلافت کے نتیجوں سے متنفر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے ——— مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور خواجہ حسن نظامی میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ روزنامہ انقلاب مرحوم ان معرکوں کی دلآویز فصل تھا ——— مولانا نے انقلاب پر چوٹ کی ———

مجموعہ انقلاب کا اقبال و فنون ہیں

انھیں شبہ تھا کہ انقلاب کے اجزا میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خان نون کا ہاتھ ہے ——— بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا ——— انقلاب کے ہم نوا دلی میں نیاز مندانِ لاہور یعنی ——— مہر و سالک کے علاوہ تاثیر، تبسم، حفیظ، اختر اور ان کے ساتھی ——— اُدھر تھا ظفر علی خان ——— اِدھر افکار و حوادث اُدھر افکار و حادثات ——— وہاں کوئی لکھنے والا، کوئی نظم لکھ رہا ہے، کوئی انتساب اور کوئی افکار و حوادث کے محل سے پتھر برسا رہا ہے اور مولانا ہیں کہ چومکھی لڑ رہے ہیں ——— ایسے معرکوں میں مولانا کا ادبی نام نقاش ہوتا ——— پھر ایک نام نہیں کئی نام ——— اِدھر انتساب کھا، اُدھر نکات اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین، نئے نئے قوافی، نئی نئی ردیفیں اور بولتی ہوئی نظم ——— کہا ہے ماہے حسرت بھی ہاتھ بٹاتا اور ایک آدھ، نصر اختر شیرانی نے بھی عکاس کے نام سے چند نظمیں کہیں ——— مگر ظفر علی خان بلا کے شہسوار تھے ——— لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا ———

زمیندار ایک، آپ اتنے مگر اوج صحافت پر
یہ اک تنہا لڑے گا آپ کی ساری چمنوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر چل رہے ہیں، مصرعے ہو رہے ہیں، اُدھر سے طعن توڑا جا رہا ہے اِدھر سے جواب آں غزل آ رہا ہے کہیں طنز سرگرم نوا ہے کہیں بھیتی آتش فشاں ——— اور پھر ایک آدھ دن کی بات نہیں ——— ہفتوں یہ دور رہا ——— حریفانِ بذلہ سنجی، حریفانِ دشنام ہو گئے تو بات مطلع سے مقطع پر آ گئی ——— تعلیم چورنگ ہے اور مولانا فاتح ———

اثر بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ بلکہ خود شخصیت اپنے طبیعی، سماجی اور سب سے زیادہ معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھل جایا کرتی ہے۔

فلسفیوں کی افراط تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی سے بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کی گاڑی کھینچی جا سکتی ہے۔ لیکن خود یہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے زمانے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔

میں نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں جن مسلمانوں کو لوح تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور طمع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر طمع کا مال، کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں، زیادہ تھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے، لیکن طمع کی عارضی چمک ماند پڑنی شروع ہو گئی ہے اور کھرے سونے کی بازار میں مانگ بدستور موجود ہے۔ ممکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں۔

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور ان کی مدد کے لئے ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما اور موجودہ آب و رنگ پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خان صاحب ضلع فرخ آباد (یو۔پی) کے مشہور قصبہ قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ قائم گنج کے پٹھان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے چنانچہ ذاکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فوج میں ملازم تھے۔ ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بدعت سے کم نہ تھا۔

ذاکر حسین کا بچپن حیدرآباد میں گذرا لیکن وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پلے اور بڑھے اور ریاست کی جاگیردارانہ آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی بہت پر اپنے پرحسن شاہ صاحب کا پڑا جن کے وہ بہت کم عمری میں مرید ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذاکر حسین کے عزیزوں میں سے تھے اور حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی سے ارادت رکھتے تھے۔ حسن شاہ صاحب پر ایک واردات ایسی گذری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے اور شاید انھیں برا بھلا بھی کہتے تھے جب ان کے مرشد حضرت شاہ طالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لئے یہ حکم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پشاور تک پیدل جاؤ اور واپس آؤ۔ اس تادیب نے حسن شاہ صاحب کو آزادہ روی اور صلح کل سکھانے کے علاوہ جہانبانی جہاں گشت بنا دیا اور ان کا یہ شعار ہو گیا کہ ایک گٹھڑی کپڑوں اور کتابوں کی ساتھ لئے، پیدل دنیا بھر میں پھرا کرتے۔ جب کبھی حیدرآباد آ کر کچھ دن رہتے تو ذاکر حسین کی ہدایت و ارشاد کا کام زیادہ تر ان دو طریقوں سے انجام دیتے۔ ایک تو وہ کسی مرید سے علم دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کراتے، دوسرے اسے روپیہ دیتے اور پھر حاجتمندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و صدقات کی مشق سے اس کا دل بھی کھل

جانے اور ہاتھ بھی۔

۱۹۰۷ء میں ذاکر حسین تعلیم کے لئے آٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیجدیئے گئے جسے سید احمد خاں کے ایک دور کے رفیق مولوی بشیر الدین نے قائم کیا تھا۔ ان بزرگ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ایک ہی دھن تھی اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین ان بچے معلموں میں سے تھے جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں:

درس ادب اگر بود زمزمہ محبتش
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

ذاکر حسین کے حساس دل پر مولوی صاحب کی ایک صفت اور سید صاحب کی بہت سی صفات کا بڑا گہرا نقش بیٹھا جو کبھی مٹ نہ سکا۔

۱۹۱۳ء میں ذاکر حسین ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ انھوں نے سائنس میں پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ ایس سی کا امتحان دینے کے لئے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں۔ لیکن شدید علالت کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کرکے پھر علی گڑھ واپس آنا پڑا۔ اس طرح ان کا ایک سال بیکار گیا۔ اس بار انھوں نے آرٹس کا کورس لیا۔ ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم اے پری ویس پاس کیا۔ ایم۔ اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ذاکر حسین اقتصادیات کے شعبے میں جونیئر لکچرار کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ علی گڑھ میں ترک موالات کا زلزلہ آیا جس سے سید احمد خاں کا ایم۔ اے۔ او کالج زیر و زبر ہو کر ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے گرتی ہوئی عمارت سے نکل کر ایک خیموں کی بستی میں پناہ لی اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا ان پناہ گزینوں میں ذاکر حسین بھی تھے جو اب ذاکر صاحب کہلانے لگے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے دوران میں ذاکر حسین یونین کے اور عام طور پر طالب علموں کی اجتماعی زندگی کے روح رواں تھے۔ انھوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن خود سب سے گہرا اثر ڈاکٹر ضیاء الدین کا قبول کیا۔ گو وہ ثبت نہیں منفی اثر تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذات ان سب صفات کا مجموعہ تھی جن سے سرکار برطانیہ کا تقرب اور ہمنوا و ہمدرد قوم میں مقبولیت حاصل ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیروی معکوس کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلبہ کو ترک موالات کی دعوت دی تھی اور مولانا محمد علی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے دست مبارک سے جامعہ ملیہ کا افتتاح کرایا تھا تو ذاکر صاحب کے لئے ایم۔ اے۔ او کالج کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا نہایت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ کئی روز شدید کشمکش میں مبتلا رہے مگر ایک دن جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے انھیں بلا کر بڑی محبت سے زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے اور یقین دلایا کہ ایم۔ اے۔ او کالج میں رہ کر تم کو ایک ہی سال کے اندر ڈپٹی کلکٹری مل جائے گی تو ذاکر صاحب کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ فوراً ایم۔ اے۔ او کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ پہنچ گئے۔

دو سال تک جامعہ ملیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچے میری ملاقات ان سے ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ لیکن اب سوا تین برس تک میرا ان کا

ہر وقت کا ساتھ رہا۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں چوکھا پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ ذاکر صاحب "در ایام جوانی جنان کہ اندر دوانی" کی وادی پُر خار سے بڑی پامردی سے گذرے۔ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں الجھے نہیں بلکہ اوسان قائم رکھے دامن بچا کے قدم بڑھاتے چلے گئے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے استادوں میں پروفیسر زومبارٹ اور دوسرے بڑے پائے کے عالم تھے جن سے انھوں نے بہت فیض اٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا تو شاید میرے استاد انیر انگر سے جو خیر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بن کر لوٹے تو ملک کی یہ کیفیت دیکھی کہ ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں اور لوگوں پر خصوصاً مسلمانوں پر ایک عام افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

گلشن میں کہیں پتے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ خود ان کے دل کی آواز تھی:

بے گانہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

یہ جان طبیعت باز نہیں آئی اس نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کو خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ ۱۹۲۸ء کے آخر میں حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وسائل کے فقدان، اپنوں کی مخالفت، بیگانوں کی شماتت، حکومت کے عتاب کے باوجود جامعہ ملیہ کو چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا۔ یہ وہی کر سکتا تھا جسے خدا پر، انسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر بھروسہ ہو۔ جو ایثار ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کے لئے کیا اس میں تن، من، دھن کی قربانی تو سب کو نظر آئی مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لئے ان سب سے مشکل ہے بہت کم لوگوں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ پبلک لیڈری کے مرتبے جن کے لئے ذاکر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جتن کرتے تھے ان کو بے مانگے مل رہے تھے مگر انھوں نے بے تامل چھوڑ دیئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی کیجئے تو چاہتا ہے اور ان دنوں جامعہ ملیہ کی جو لئے شیر لانے کے لئے خاص طور پر اپنے آپ کو پوری طرح کھپانے اور تپ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ذاکر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی اور ملی لیڈروں سے سابقہ رہا لیکن ان کی شخصیت پر نقاب ذکر اثر صرف مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں کا پڑا۔ گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خاں کے حسن و مروت، صبر اور حلم نے اس پر جلا کر دی۔

بزرگان قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سب اس بے دلی کی فضا میں جو خلافت اور سوراج کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد چھا گئی تھی، اس ادارے کی کشتی کو حکومت کی مدد کے بغیر پار لگانے سے بہت ہار چکے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے مشورے سے جامعہ کے استادوں میں سے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جنھوں نے بیس سال برائے نام معاوضے پر جامعہ ملیہ کی خدمت کا عہد کیا، انجمن تعلیم ملی

کی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے جامعہ ملیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلایا۔ ارباب حکومت روڑے اٹکاتے رہے۔ بزرگان قوم والا مقام دور سے تماشا دیکھتے رہے اور خود وارثان قوم ذاکر صاحب کی سرکردگی میں روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر ایک آزاد تعلیم گاہ کی تعمیر کرتے رہے۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ یوں تو ہندوستان کے خون میں تحریک آزادی نے ۱۹۱۸ء سے ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندو مسلمان اہل غرض کی اغراض کے تصادم سے فرقہ واری زہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ ہیجان خون نے زہر باد کی صورت اختیار کر لی۔ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ ملیہ اس زمانہ میں دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں لپیٹ لیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم پرور ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں۔ ذاکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا سیاست سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن معلم کی روح جامعہ کی روح نہ بن سکی۔ دشمنوں کی عداوت اور دوستوں کی محبت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے البتہ ذاکر صاحب نے اپنی سی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت کرانے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹائیں اور انھیں آخر تک یہ آس رہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب معتبر ذرائعوں سے معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کو پہلی قومی کابینہ میں رکھنے کی تجویز ہے تو انھوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کابینہ متحدہ ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی، اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مرد فقیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوتی۔ فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا جس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے ——— بھارت، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان۔ ذاکر صاحب کے جگر پارے چل گئے، ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ مگر اس اندھیرے میں انھیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انھوں نے پاکستان کو دعائے خیر دی اور اپنے آپ کو تن من سے ہندوستان (بھارت) کے حوالے کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے تین سال ذاکر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصے میں انھیں دہلی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطرار، مایوسی، ہراس، دہلی میں آکے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے سروسامانی، مصیبت آوارگی، طیش کے جگر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی یکساں خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ان تھک کام کرنا پڑا گاندھی جی کی شہادت کا جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑا، جامعہ ملیہ کو اپنے معتمد ساتھیوں کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر اور باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جد و جہد کرنی پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک چھاننی پڑی۔ روح، دماغ اور جسم تینوں پر مسلسل بوجھ پڑتا رہے تو انسان کہاں تک سہہ سکتا ہے۔ آخر جسم کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید قلبی مرض (THROMBOSIS) کا حملہ ہوا جس سے جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر خدا کو ذاکر صاحب سے کچھ اور کام لینا تھا۔ اس لئے چار پانچ مہینے صاحب فراش رہ کر اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ذاکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور توجہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں

تک ان سے ہو سکتا تھا نا اُمیدی میں اُمید، بے دلی میں ولولہ، بدنظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پر پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقی اُردو (ہند) اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تعلیم کمیٹی کی صدارت ان کے وقت کا بہت سا حصہ لے لیتی ہے۔ اس لئے ان کو مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بمبئی کے ایجوکیشنل سروس کے قابل ترین افسر سید نور اللہ صاحب کو بلا کر پرو وائس چانسلر بنانا پڑا ہے۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کا مرکز علی گڑھ ہے اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ تھوڑا سا رنگ بھرتے ہیں تاکہ اس قلمی تصویر کے نقش کسی حد تک اُبھر آئیں۔

میرے محترم استاد پروفیسر اشپرانگر نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالی، سیاسی، معاشی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی گو اس میں مذہب و تصوف، فکر و نظر اور ذوقِ جمال کا خاصا گہرا رنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ ہلکا سا رنگ موجود ہے۔ لیکن ساری زمین انسان دوستی سے رچی ہوئی ہے، ان کے لئے انسان سے، خواہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا نہ کوئی مذہبی یا اخلاقی فرض ہے، جس کے لئے شعوری عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے جس کے لئے فکر کی، اور نہ کوئی سیاسی تدبیر ہے جس کے لئے تدبر کی ضرورت ہو بلکہ وہ تو ان کی فطرت کا تانون ہے جو بلا شعور، بلا ارادہ کام کرتا ہے۔ ہم سنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے دو سفلوں عزیزوں یا عام طور پر بندگانِ خدا کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ فلاں نے قوم و ملت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دُنیا کو تج دیا ہے، ایثار کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۳۲ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انھیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ تیاگ کا، نہ ایثار و قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تکلف، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا اچھا ہے جیسے وہ سماجی یا انسان دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں انھیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کشمکش سے گزرنا، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو، وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ کسی جزو کو رد، اور کسی کو قبول کریں، بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اخلاق رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ بُرے آدمی اور اس کی بُرائی میں فرق کرو، اس طرح جیسے بیمار اور بیماری

ہیں کرتے ہو۔ برائی کو ضرور برا کہو اور دفع کرنے کی کوشش کرو۔ مگر اس انسان کو جس کے اندر برائی نظر آئے بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل، علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو۔ اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عمل کرتے ہوئے میں نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو۔ برے اعمال کی وجہ سے کسی کو برا سمجھنا تو درکنار، ذاکر صاحب کی انتہا مروت اکثر انسان کے جوہرِ انسانیت کی خاطر اس کے برے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا ضرور کر لیتی ہے۔ کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں حج اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہِ کبیرہ و کفر ہے۔ ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو، کسی انسان کو روند کر آگے بڑھنا ہو تو وہ عموماً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب ذاکر صاحب تعلیم کے لئے برلن پہنچے تو وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب درپیش تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں اتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب اپنے حریف کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ دوسرے سال جب لوگ انھیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ ان کا حریف بنے، بلا مقابلہ وہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے۔ ان کی دینداری دنیاداری کے پردے میں سے یوں بھی تھوڑی بہت جھلکتی رہتی ہے۔ لیکن اچھی طرح چمکتی اس وقت ہے جب آس پاس کی فضا میں مایوسی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے اچھوں کے ایمان ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا، جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی جان ہر وقت خطرے میں تھی اس کے بہت سے سچے ہمدرد و جاہل الرائے سمجھے جاتے تھے اصرار کر رہے تھے کہ کچھ دن کے لئے دہلی چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن ذاکر صاحب کے قدم جمے رہے اور ان کی وجہ سے ہزاروں اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے جسمانی اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ذاکر صاحب نے نہ صرف اپنا لنگر سنبھالے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو خود ان کو ڈبونا چاہتے تھے، سہارا دے کر کنارے پر پہنچا دیا۔ ان دنوں ذاکر صاحب نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ مجھے انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے۔ جنون کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گذر جائے گی۔ ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدائی پر اٹل ایمان رکھتا ہو۔

نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس وہ صفات ہیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی گہرائی سے ناسازگار ماحول کے باوجود ابھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اثر سے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے علی گڑھ میں رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھنا روزمرہ کی زندگی میں، رہن سہن اور اخلاق و آداب میں۔ بیرونی صفائی اور ستھرائی اندرونی پاکیزگی اور حسن و تناسب کا لحاظ رکھنا بہت دشوار تھا۔ مگر ذاکر صاحب نے کر دکھایا۔

جامعہ ملیہ کے دور تنگ و تنگی ہی میں ذاکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ارادے کو سادگی اور سلیقے کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اب علی گڑھ میں جہاں انھیں مقابلتاً فراغت حاصل ہے، ان کی ذاتی توجہ اور اہتمام کی بدولت وائس چانسلر کے بنگلے سے لے کر یونیورسٹی کی آخری حدود تک ساری بستی گلزار نظر آتی ہے۔ سڑکوں، نالیوں، چبوتروں کی صفائی سے صحتِ جسم و صحتِ

سے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ گھر والوں میں سے بھی کسی کی نہ سنتے تھے۔ بلکہ جو کچھ کوئی کہتا اوبدا کر اس کے خلاف کرتے اور تکلیف اٹھاتے۔ بھابی بھی ان کی ضد سے پریشان ہوتی تھیں گھر ان کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بچاری خاموشی سے سارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگرانی اور پرورش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا مجال جو کبھی پیشانی پر شکن تک آجائے۔

دو بجے افسانے تو چغتائی صاحب نے میرے لئے پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے۔ کئی افسانوں کے انھوں نے پلاٹ سنائے سب اچھے ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان سنایا ——— سوانگ کی دو بیبیاں ——— یہ سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے "تو لاؤ پہلے اسی کو لکھ ڈالیں" اور کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا واقعی مکھیاں مارتا رہا کیونکہ اس سال وہاں ساری دنیا کی مکھیاں آگئی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انھوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے، پھر بولے "میاں پڑھ لیں چکے۔ لو ذرا اب تم قلم لو۔ میرا ہاتھ تھک گیا" میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تکلف بولتے رہے میں لکھتا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا "بس جی میں تو لکھ چکا۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔ مرغی کھانے کھلاتے ہو تو سونے بھی دو" کہنے لگے "اچھا تو مجھے پانی لگا کر سو رہو۔ عصر کے وقت انھوں نے جگایا "کیا آج چائے نہیں پیو گے؟" اٹھنا پڑا، بولے "افسانہ ختم ہو آرہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائے گا" میں تو جا دبی کر کسی کے ساتھ ہی گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے لکھتے رہے۔ چراغ جلے گھر واپس پہنچا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "لو بھئی یہ افسانہ" اور کوئی چالیس فل اسکیپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا "شاباش ہے مرزا صاحب آپ کی ہمت کو۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا" جانے کے نام سے ان کا منہ اتر گیا۔ کہنے لگے "نہ جانے کیا بات ہے تم آجاتے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ، ہم تمہیں دو افسانے اور لکھ دیں گے" انھوں نے یہ بات کچھ ایسے اندوہناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا "اچھا میں پرسوں چلا جاؤں گا" بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس چغتائی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو ہو ہی جائیں گے۔ اگر سو صفحے کے اور ہو جائیں تو "چغتائی نمبر" ہی کیوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک اچھی یادگار ہی قائم ہو جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ "مرزا صاحب! تو پھر آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں دے دیں، اس کے بعد پندرہ بیس دن میں پھر چند مضامین اور لکھ دیجئے۔ میں "چغتائی نمبر" چھاپے دیتا ہوں" یہ تجویز انہیں پسند آگئی۔ پوچھا "پک بھی جائے گا؟" میں نے کہا "نہ بکنے کی کوئی وجہ نہیں" کہنے لگے "ایک حصے میں تمہیں سب مضامین مل جائیں گے" میں نے چند تجویزیں انھیں بتائیں کہ اس اس طرح کے مضامین ضرور لکھیے مثلاً ایک آدھ غمناک افسانہ، دو ایک مکالمے یا ڈرامے اور ایک مضمون یہ کہ "میں مضمون کیسے لکھتا ہوں" کہا "یہ سب ہو جائے گا؟"

اگلے دن دو مضمون تو انھوں نے لکھ کر دے دیئے اور بیبیوں پلاٹ سنائے۔ پھر کہنے لگے "لکھتے لکھتے میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ ہینڈ میں لکھنے والا مل جائے تو میں کئی ناول بول دوں"

اگلے دن صبح سویرے میں اٹھ بیٹھا۔ بستر لپیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ افسردگی چہرے سے ظاہر تھی۔ کہنے لگے "ارے بھئی سنتے ہو، آج اور نہ ٹھہر جاؤ، سارے مضامین ساتھ ہی نہ لے جاؤ" دل کٹ گیا ان کے اس خلوص کو دیکھ کر۔ میں نے کہا "اگر آپ کو میرے ٹھہر جانے سے خوشی ہوگی تو میں ضرور ٹھہر جاؤں گا، مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرتے رہیں۔

پندرہ دن میں تو یہ مضامین لکھے جائیں گے جو میرے پاس ہیں۔ باقی آپ پھر بھیجتے رہیئے گا۔" بولے "ارے بھئی تم نہیں جانتے کہ تمہارے یہاں ہونے سے میری کیا کیفیت ہے۔ سچ کہتا ہوں میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ بھوک لگنے لگی، خوراک دگنی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں اور لکھتا ہی رہوں۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائے گا اور پھر بیماری مجھے دبوچ لے گی۔" میں نے ان کو بہلانے کے لئے کہا "اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو بھیجوں گا ان سے رہی سہی کمزوری بھی جاتی رہے گی۔" مگر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے اور بولے "بس تو آج تم نہیں جا رہے؟" میں نے کہا "نہیں! جلدی جلدی بھابی سے جا کر کہا "شاید صاحب آج نہیں جا رہے۔ آج انہیں جو چیز کی سیر کرائی جائے گی۔ ذرا اچھا ناشتہ کرا دو آج۔" ناشتے کے بعد کسی دوست کی کار منگوائی۔ شہر کا ایک چکر اس میں لگایا۔ پھر ایک پرانا قلعہ دکھایا۔ ایک نیا محل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عزیز تھے، ان سے ملوایا۔ دوپہر کو گھر آئے۔ کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سو گیا اور انہوں نے اتنی دیر میں دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ لئے۔ کہنے لگے "آج رات کو تمہیں گانا بھی سنوایا جائے گا۔" میں نے کہا "آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔" بولے "نہیں تو نہیں ہے۔ ایک ہندو چکا گانا گاتا ہے، اسے بلوایا ہے۔" وقت اچھا گذرا۔ صبح ناشتہ پر پھر کچھ روکنے کی تمہید اٹھائی تھی کہ بھابی نے کہا "کیوں آپ انہیں پریشان کرتے ہیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ تین دن کو کہہ کر گئے تھے، آج چھ دن ہو گئے۔" کہنے لگے "ارے صاحب یہ کسی کے ذکر تو نہیں کہ ان کی حاضری ضروری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تار دیتے ہیں۔ انہیں آخر کس بات کا فکر ہے؟" بھابی شاید کچھ اور کہتیں مگر بیچ میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ بول پڑا "اماں یہ دلی میں کیا کرتے ہیں؟" بھابی نے کہا "کچھ بھی نہیں۔" بچے نے کہا "تو پھر یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟" ہم سب ہنس پڑے اور وہ بات بھی آ گئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا "وعدہ کرو کہ پھر جلدی آؤ گے۔" میں نے کہا "جب آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔"

نواب صاحب جاورہ خبر نہیں کب سے چغتائی صاحب کی قدردانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصے بعد سنا کہ نواب صاحب نے انہیں جاورہ بلا کر چیف کا بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جاورہ لکھ دیا۔ میں وہاں بھی گیا۔ نہایت عالیشان کوٹھی انہیں ملی ہوئی تھی۔ چغتائی صاحب بہت بڑے عہدہ دار تھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ "نواب صاحب سے کب ملو گے؟" میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے دقت محسوس ہو۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے بھئی تمہارے دادا کے تو بڑے قدردان ہیں یہ نواب۔ میں نے یہاں لوگوں سے سنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جینے کی آس نہ رہی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں "مولوی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن شائع کرو تم اچھے ہو جاؤ گے۔" انہوں نے تمہارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپہ خانہ سے شائع کیا اور واقعی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" میں نے کہا "اور کچھ خیرات بھی مجھے دیں گے؟" مرزا صاحب نے کہا "تو پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا "مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میرے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ ہیں آپ ہیں۔" مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دل میں شاید کچھ ناراض بھی ہوئے۔

جاورہ میں مرزا صاحب کی صحت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مرطوب آب و ہوا سے ان کی سانس

کی شکایت اور بڑھ گئی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شاید مشکل سے دو سال جاورہ میں رہے ہوں گے، ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ جودھپور واپس چلے جائیے ورنہ آپ یہاں بہت جلد مر جائیں گے۔ مرزا صاحب ہماری کاغذ کر کے جودھپور چلے آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت بھس ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتابیں چھاپنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب "اُمہات الامۃ" لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک درجہ وہن پادری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلعم پر بعض بڑے بے ہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر ازواج مطہرات کے سلسلے میں ناگفتہ بہ باتیں کہی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سر سید احمد خان نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابل قدر بھی۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں۔ اور بعض جگہ فقرے بھی ایسے لکھ گئے ہیں جو زبان کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی لکسانی کیوں نہ ہوں، رسول مقبول و اہل بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابل اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب اس پیرایۂ بیان کا جواز یوں پیش کرتے تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس ساری کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ تو صحیح ہو یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علماء نے اس کتاب کو سوختنی اور مولوی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار لیڈر نے رائے شرکے لئے اس کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت انھیں علماء کے جلسے میں لے جا کر جلوا دیا۔ قصہ مختصر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شامت اعمال اس کتاب کا نسخہ کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں، اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر ہمارے علمائے اس کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑے، جب اُدھر سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ پر بزرگوں سے دباؤ ڈلوایا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور ہر شہر میں اور دلی میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ چغتائی صاحب نے مجھے جودھپور سے لکھا کہ ساری کتاب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے انھیں دو سو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ اور کتاب کی اشاعت روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ چلو غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اس نے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ اُدھر مرزا صاحب کی ضدی طبیعت نے زور مارا اور انھوں نے ایک مراسلہ "انقلاب" لاہور میں چھپوا دیا کہ "اُمہات الامۃ" شاہد احمد کے پاس اب نہیں ہے، میرے پاس ہے جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ مجھے کاٹ کر میرا پلاؤ پکائیں اور فلانوں کو کھلا دیں۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی تو لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جودھپور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد وہ کچہری

جا رہے تھے تو دو چار بدمعاشوں نے ان پر لاٹھیوں سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے لکھا: بھائی بڑی رسوائی ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو مسلمانوں کے جلسۂ عام میں توبہ کرو اور اقرارِ اسلام کرو ورنہ تم کافر ہو اور قتل کر دیئے جاؤ گے۔ سارے شہر میں آگ پھیلی ہوئی تھی۔ لاکھ میں سب سے کہتا ہوں کہ کتاب میں نے نہیں لکھی، دلی والے نذیر احمد نے لکھی تھی مگر سب یہی کہتے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو یہاں کے علما کے حوالے کر دوں۔ علما مجھے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ مجھ سے سب کے سامنے توبہ کرائی، مجھے کلمہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے مشرف بہ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی۔ خیر مجھے اس تکلیف اور رسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بے حد رنج ہوا اور شرم آئی یہ دیکھ کر کہ وہ دو سو جلدیں جو تم نے مجھے بھیجی تھیں اور مجھ سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس جلسے میں جلائی گئیں۔ افسوس کہ پچیس تیس سال میں مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔"

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھابی کو بھی لے کر آؤ۔ قبیل ارشاد کی گئی۔ اب کے جو انھیں دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سوکھ کر قاق ہو گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشاش تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے: "دیکھو! ابھی تم آ گئے ہو اور ابھی ہماری بیماری جاتی رہی۔" مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ ہنستے، ہنساتے رہے۔ ایک ناول "شراب" لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سنائے اور چھاپنے کے لئے مجھے دیئے۔ رات کو جب دسترخوان بچھا تو کھسک کر ساتھ بیٹھ گئے۔ بھابی دیر سے چیخیں کہ آپ کچھ نہ کھائیں گے کہنے لگے: "کھائیں گے تو ہم ضرور۔ اب ہم بالکل اچھے ہیں، کوئی بیمار تھوڑی ہیں۔" مجھ سے کہتے جاتے تھے: "ارے بھئی یہ بھی لو۔" بھابی جھلاتی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھایا تو خیر ان سے کیا جاتا تھوڑا تھوڑا سا سب چکھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھا تو ان کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بدہضمی ہوئی۔ رات بھر اوکتے اور ڈکارتے رہے۔ پیچش نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کو سنبھلنے دیا گیا تھا۔ ہم بازار سے گھوم پھر کر آئے تو تکیے کے سہارے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے: "لو یہ افسانہ تمھارے لئے لکھا ہے۔" پڑھ کر سنایا۔ عنوان تھا "برقند کسٹرول"۔ میں ہنس رہا تھا، مرزا صاحب بھی ہنستے جاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری افسانہ ہے، اور میرے لئے ان کی یہ ہنسی بھی آخری۔ اگلے دن میں دلی واپس جانا تھا۔ رات کو باتیں کرتے کرتے میری بیوی سے بولے: "آپ کا آنا ایسے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" پھر ایک اپنا چھپا ہوا ایڈریس فارم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر انھیں دیا کہ "اسے قبول کر لیجئے۔" انھوں نے پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب "کو کتار" کا حق تصنیف ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ میں نے کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے۔" کہنے لگے: "تم خاموش رہو جی۔ تمھیں تھوڑی دے رہے ہیں۔" نہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ ان کے خطوں سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آنے شروع ہوئے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا خط ملا کہ آخری بار آ کر مل جاؤ۔ کچھ دن

لینے آنا۔" میں نے روانگی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر ان کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "چغتائی صاحب کا کیا حال ہے؟" بولے "وہی ہے!" سمجھ میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے حصے کے کمروں میں سناٹا ہے۔ نہ بھابی نہ بچے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر لحاف اوڑھے چغتائی صاحب پڑے تھے۔ پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سکڑا دکھائی دیا کٹ بڑی داڑھی مونچھیں اور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔ لحاف ہٹا تو اس میں سے بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ بالوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر پلنگ پر ٹانگے کے چیونٹے پھر رہے تھے۔ میں رونے لگا وہ بھی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا "یہ کیا حالت ہو گئی؟" بولے "بس اب ختم سمجھو۔" پھر ایک دم سے مسکرائے اور کراہتے ہوئے بولے "ارے ارے آپ کو دیکھئے" اور لحاف میں سے ایک چیونٹا چٹکی میں پکڑ کر نیچے پھینکا۔ "مرنے سے پہلے ہی اپنا حشر لینے چلے آئے۔" اتنے میں اندر کے رخ کا ایک دروازہ کھلا اور ان کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" مرزا صاحب نے کہا "یہ شاہد صاحب آئے ہیں، انہیں پہلے چائے پلوائیے۔" اماں چلی گئیں تو ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اب صرف اماں ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماشاء اللہ بھرا پرا گھر تھا مگر کوئی ان کے پاس نہ آتا تھا۔ میں نے کہا "بھائی اور بچے کہاں ہیں؟" بولے "رام پور!" میں نے کہا "وہ کیوں؟" کہنے لگے "بیوی کو میری خدمت کرنے کو کہنے خود دق ہو گئی۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ مگر وہ نہ مانیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میں تو مر ہی رہا ہوں اور اگر یہ نہ چلی گئیں تو یہ بھی مر جائیں گی، تو میں نے ان سے کہا، اگر تم یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تمہیں طلاق دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہ گئیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔ تو انھوں نے کہا آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو طلاق نہیں لی۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آخر میں نے تنگ آ کر ان کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو آ کر لے جاؤ، میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچتے ہی ان کا بھائی آ دھمکا اور زبردستی اپنی بہن کو یہاں سے لے گیا۔" میں نے کہا "یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ نے یہ صلہ دیا انھیں۔" کہنے لگے "بھائی اگر وہ یہاں رہتیں تو وقت مر جاتیں۔ ان کے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور ہاں سنو، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان کے گھر والوں کو میں جانتا تھا کہ ایک خط میں ہی آ کر لے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا بھی یہ طلاق نہیں ہے مگر ان کے بھائی نے کہا "جب انھوں نے ہمیں لکھ کر ہی بھیج دیا تو اگر نہیں ہوئی تب بھی ہو گئی۔"

اس کے بعد ان کی اماں اور بھائیوں اور صحت چغتائی سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ بیماری نے مرزا صاحب کے دماغ پر عجیب طرح کا اثر ڈالا ہے کہ انھیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھاجیوں کو لڑوا دیں گے کسی پر چوری کا الزام لگا دیں گے۔ طبیعت سے گھڑ گھڑ کر کوئی ایسی بات کریں گے کہ دو آدمی الجھ جائیں۔ ہم سب نے تنگ آ کر ان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی مامتا ہے جو برداشت کر رہی ہے۔" میں نے کہا "مگر اب تو ان کا آخری وقت ہے کے دن جیتے ہیں بچارے۔" مگر سارے بھائی بہن یہی کہتے تھے کہ "یہ نہیں مریں گے۔ کتنی ہی دفعہ ہو چکا ہے کہ منجھلے بھائی مر رہے ہیں، منجھلے بھائی مر رہے ہیں۔ سب بھاگے بھاگے گئے اور وہ نہ مرے نہ ورے۔ پھر اچھے خاصے ہو گئے۔" اس گھر میں تین دن

رہنا مجھے اجیرن ہو گیا۔ عجیب بے کسی کی زندگی تھی۔ گرم گرم بخار چڑھتے، پنڈا جھلستا رہتا۔ ہڈیاں تک سوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے مارے سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ مگر دماغ روشن تھا۔ کوئی تیمار دار نہیں، پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم نکل جائے۔ گھر والے تو مطمئن ہیں کہ یہ مرنے ہی کے نہیں۔ میں نے جی میں کہا: اللہ تیری شان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کو ہنسایا اور مرنے کے بعد بھی ہنساتا رہے۔ اور اس عذاب میں مبتلا! تو ہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہے تھے۔ میں نے کہا: "یہ روپے رکھ لیجئے۔" پوچھنے لگے: "کتنے ہیں؟" میں نے کہا: "دو سو ہیں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو میں ابھی بیچ کر اور بھیجدوں گا۔" بولے: "بہت ہیں۔ تکیے کے نیچے رکھ دو۔" خدا حافظ کہہ کر میں آنسو پونچھتا باہر نکل آیا۔ پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید دو ہفتے گذرے ہوں گے کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ میں نے کہا: "لو بھئی وہ مر گیا جو مرتا نہ تھا۔" انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

منٹو ماموں کی موت

حامد جلال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اٹھ کر گھر چلے آئے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ فانی کے معجزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف اتنا کہوں گا ــــ منٹو ماموں! آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت ہے۔"

بہاولپور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ٹرننگ سٹیڈیم میں بیٹھا طلاع یا رخاں کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید برافروختگی پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پر انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا "کہاں انتقال ہوا؟" جواب ملا "گھر پر!" اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تانگے پر، کسی ریستوران میں، کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آ گئی ہو.....

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو میچ کا انھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا "امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔"

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لیے امپائر سے کئی بار اپیلیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ اب ان کی بے معیار و ڈانواڈول اننگز ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی حنیف محمد کی طرح ہوشیار اور محتاط کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے جسے وہ لاہور کے تیسرے ٹیسٹ میچ میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ درحقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک ریستوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا "حامد جلال کو واپس آ جانے دو، میں اسی کے ساتھ ٹیسٹ میچ میں حنیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔"

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مددگار عورت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ لاش گجرات میں سڑک کے کنارے

پالی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی نعش کو جس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کڑکڑاتی سردی میں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹی نے منجمد کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیے سے منٹو ماموں بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گجرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی ہوگی جو ان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی پیک ہے۔ انھوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسبِ معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے کیونکہ میرے لڑکے نے منٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو ماموں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا جگر پھٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورتِ حال کا تن تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا اور انھیں موت کے منہ سے نکالنے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید حملوں کے بعد وہ شفایاب ہو چکے تھے اس لیے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آفٹ دینے کے لیے اپنا کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہونی شروع ہو گئی تھی جب منٹو ماموں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔

منٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلافِ معمول نہیں سنبھلی۔ ان کی نبض برابر ڈوبی گئی اور دل میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی قے بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ماموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ماموں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سنتے ہی وہ بول اٹھے "اب بہت دیر ہو چکی ہے مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر منٹو ماموں فوراً مشتعل ہو گئے اور انھوں نے غضب ناک آواز میں کہا "خبردار جو کوئی رویا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اسے مرتا ہوا دیکھیں۔ منٹو ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے

جو ان کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔

ایمبولنس آنے سے پہلے صرف ایک یا دو بار انھوں نے اپنے منہ سے رضائی ہٹائی۔ انھوں نے کہا: "مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور رضائیاں ڈال دو۔" کچھ دیر توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا: "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو....."

شراب کے لیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پوا منگا لیا گیا۔ انھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے: "میرے لیے دو پیگ بنا دو۔" اور یہ کہتے ہوئے درد اور شدید تشنجی دورے کے باعث وہ کانپ سے اٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے، لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے اپنے اوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہ واپسیں یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے ——— وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنستے بولتے رہتے ہیں، محبت کرتے رہتے ہیں۔

بستر مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی یا نفسی صورت میں قابو ممکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے ——— اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہو گئے تھے لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لیے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے جہاں کوئی انھیں ہارتا نہ دیکھ سکے جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں، اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزا و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے لیکن مرنے سے پہلے وہ منفعل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا لیکن منٹو ماموں ریاکار نہیں تھے۔ انھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر لیکن اس کا مشاہدہ بھی مرکزی کردار کر پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم صرف وہی کچھ سکتا تھا۔

میں اس وقت موجود ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے اور یہ کچھ مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ انھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ بھولنا۔ میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا آخری جام انھیں پینے کو دے دیتا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کہانی

صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اتار دیا۔ تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔

ایمبولنس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اتر سکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایمبولنس میں لٹا دیا گیا۔

ایمبولنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو انھوں نے دم توڑ چکے تھے۔ دوبارہ ہوش میں آئے بغیر اسی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

میرا دوست، میرا دشمن

عصمت چغتائی

اڈلفی جیمز کی چوٹی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی جیسے کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی لیکن یہاں تو وہ "نیا آدمی" منٹو تھا جس سے میں پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا: "چلو واپس چلیں شاید منٹو گھر پر نہ ہو۔" مگر شاہد نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔"

یہ لہجے سے پر سوز سے ایک تو منٹو اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی کیا، مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔ ہنسنے دو جو اس کی زبان کی نوک پر جھنک ہے۔ میں جھلا تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بجھ جاؤں گی۔ چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا صفیدا اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لمبی چھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آئیے آئیے!" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھدر کا کرتا پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی کلوٹی موٹی مرچ سی ہوں گی۔" اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے گھونسے جھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک دم نہ ہاتھ پر لے لے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں پوری تن دہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اٹھایا ہو اور اسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات الجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا لہٰذا دوسری ملاقات کے لیے اٹھا رکھی گئی۔ گھنٹے ہمارے چڑے شینوں کی طرح مختلف موضوعات پر چہکتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں سے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے فقروں

میں احمق بھگلی اور کے بحث کر ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں جنہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا۔ مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے، سنجیدگی سے مسکراتے، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پھڑکتے! وہی نازک نازک ہاتھ، سر پر بکھرا بھرا بال، پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ ہنستے ہنستے اچانک منہ کر کے کھانسنے لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا:

"یہ بالکل غلط" اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

"آپ کچھ بھی کر رہے ہیں۔"

"حماقت ہے یہ۔"

"وحاندلی ہے عصمت بہن!"

"آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"میں یونہی۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔"

"تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟"

"اس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پکڑ کر پٹواتے رہے۔" منٹو زور سے ہنسا۔

"تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔"

"تو اتنا یاد رکھئے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟"

"علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے تمہیں ٹی۔ بی ہے۔ معاف فرمائیے کہ میں نے مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو سمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔"

"یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔"

"کون بزرگ؟"

"میرے بھائی عظیم بیگ! قومی مجلس کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آج تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے،

شاہد جو جاری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملاد پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

سردار اس بیرنی سے اچار نکال لیجئے۔" منٹو نے تیزی سے بیرے کھانا لگایا اور کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگذاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے پہلے آپ کے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر منٹو "لحاف" کے بخیے ادھیڑنے لگتا جو ان دنوں میری دکھتی رگ بنا ہوا تھا میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے "لحاف" لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں "لحاف" کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مصر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں "لحاف" سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات دھڑلے اس معقولیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

"صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔"

"آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"بہت یاد آرہی ہے تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔" میں نے کہا۔

"ارے..... کیا کہتی ہو اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔" وہ اپنی اصلیت پر اترنے لگا۔

"نیند تو مخملی پر بھی آجاتی ہے۔" میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

"آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟" میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

"محبت!" وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ "مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔" اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ "میں محبت کا قائل نہیں۔"

"ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"نہیں۔"

"اور آپ کے کبھی گھونسے بھی نکلے۔ شعر بھی نہیں ہوتی مگر گالی کھانسی تو ضرور رہتی ہوگی۔" وہ ہنس پڑا۔

"محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے بہن اور بیٹی سے بھی ..... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ بچوں اور جوٹ بجوٹے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے، ماں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔" وہ بیٹے کے خیال پر اچک کر کرسی پر اونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا پیدا ہوا تھا۔ بڑا شریر تھا گھٹنوں

چلتا تھا تو فرش کی درازوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا۔ عام بابوؤں کی طرح منشی نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

"آپ یقین کیجئے پورے سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینہ کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو بس پڑی سوتی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلا لیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلانے سے پہلے بوتل کلوں یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہئے نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ کیسا مردوا ہے جو بچے پالنے میں مشاق ہے۔

"مگر وہ مر گیا۔" منشی نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لا کر کہا ——— "اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتڑے دھوتا ہوتا۔ تھکا ہو کر رہ جاتا مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا۔ یہی مصیبت ہوتی۔ مجھے اس سے عشق تھا۔"

چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں عورتیں ہی سنتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے دینے لگا۔ اس نے پچھلے کمرے کی چپ دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں۔ وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

"توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔"

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

"اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں محلے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی، شادی کی رات کیسی گذری، بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا، توبہ ہے۔" وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً انکار کیا۔ "خدا ہے منٹو صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کالا پیلا ہی تو ہمارا ٹریننگ سکول ہے۔ کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کالج میں مجھے بچے دنیا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے محلے کی عورتیں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔"

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب وب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر تھو تھو کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے کہ قورمے میں کتنی ہلدی، ادرک والا کے دہی پڑے....."

"ارے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔" صفیہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

اور منٹو چڑ گیا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہئے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ بھی اور ہلدی ہی کی جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا۔" اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست بھی اور ہلدی

چھوڑ کچھ پیتا تھا۔ ہم کسی شرط پر بلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کرکے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے، دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھمن گھیر ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی گرہیں الجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے اور سلجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی مگر دونوں لڑتے لڑتے الجھ جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا آنکھیں مورنگھوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے، منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا اور جنگ ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑنے لگتا کہ تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی۔ ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے جو اب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری رعونت کی حدوں کو چھوتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا اور اگر ان دوستوں کے سامنے جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بری طرح چڑ جاتا۔ کرنا تھا اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پلے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں مگر" عام لوگوں کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے، ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے مگر یہ اجلبی اس تصنع سے دل اکتا جاتا اور اس کا بھی اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے آتشبازی اور گولیوں کی سی تندی آجاتی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں الجھا کر مزا لینے لگتے اور ہم پھر مل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے کہ ان کے لیے تفریح بن کر لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی بھی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کر لیں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہئے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہوگا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا مگر مجھے عموماً مورچے سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیتے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کر آجاتا تھا۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگا لیجے۔"

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے ..... اور آپ نشہ میں ہیں۔"

کیسا کیسا منٹو شہرت دیتا کہ وہ لکھنے میں نہیں، وہ اسی وقت بتا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آکر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی مگر کیا شرط لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور ہمارے شرط لگانے کے گلو خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خود ستائی کی عادت تھی مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا اور اس وقت میرے اور اپنے سراپا میں کسی کو ادب نہ مانتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک مرتبہ سے ان کے وجود کو ہی تم قائل سمجھا خاص طور پر ادب کے لیے۔

"بھئی اس کہتے ہیں یہ لوگ۔" وہ جل کر کہتا "جو یہ کہتے جائیں بس اس کا ذکر کرتے جاؤ۔ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں۔ وہ کبھی اتنا چڑھ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ سہی مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجئے مگر وہ بھنا تا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

"مقدمہ دائر کریں گے۔"

میں نے کہا: "کون؟"

کہنے لگے: "ہم یعنی میں اور آپ۔ اس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یکجا کر چھاپی ہے کہ فحش ہے ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہئے۔ اب اس کم بخت سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے تو حق دلوا دیا ہوں کہ ہرجانہ دے۔" پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آتی۔ جب اس کا تذکرہ کیا ہی کہا: "بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار سنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوائی ہو۔"

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا: "کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ۔"

کہنے لگے: "ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش برا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔"

میں نے کہا: "منٹو صاحب! لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے بھتنا ہی اور بھولا سمجھتے ہیں شاید ویسا نہیں۔"

"آپ ہنستی ہیں۔" منٹو نے بُرا مان کر کہا۔ "جبھی تو میں آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں ——— بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔"

"میں بھی تو عورت ہوں۔" میں نے فکرمند ہو کر کہا اور وہ کھسیانا ہو گیا۔

"میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

"مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔"

منٹو نے قہقہہ لگایا۔ "ہو سکتی ہے۔" یہ خوب کہا۔ "مگر منٹو کو ضد ہو گئی۔" آپ کو اس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھئے تو سہی۔"

"میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کم بخت پر عاشق ہی نہ ہونا پڑے۔"

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے سارے عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے وہ دنیا کی ٹھکرائی کوڑے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی ڈھونڈ نکال لاتا ہے۔ کوڑا کریدنے کا اسے شوق ہے کیونکہ دنیا کے سنوارنے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پر بھروسہ نہیں۔ وہ ان کی شرافت اور پاکبازیوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اس کا سامنا کراتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دلہن سے میل اور پسینے میں مڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ "بُو" میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھئے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش پرست طبقے کی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح چھیچھوں دار روح اور کھلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اس جنت کو جس کی دنیا کو جا کر نے زمین پر پہنچنے میں بڑی بیماری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی ہمدردی کی اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

"سب جھوٹ۔" میں دھاندلی کرنے لگی۔

"ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے۔"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سن کر چلے آتے ہوں گے۔"

"مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔"

"گانا سننے۔" میں نے چڑایا۔

"جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔" پھر بھی میں نے کہا۔

"میں نہیں یقین کرتی۔"

"وہ کیوں؟" وہ اٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں۔"

"خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اسے نہ گھسیٹئے۔"

"اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ....."

"مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلوانے میں نے رونٹ میں صفیہ کو چپت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی۔ "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا....." وہ عجب گو گو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں چکلا رنڈی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جیتی مخی اگر میں چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا۔ بہن مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب گھر چلو مگر منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینا شروع کی اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سؤر کا دودھ پیا۔ مگر میں نے اور چڑایا۔

"آپ جائیں گے نہیں اور یہی بانکلا بج بر گھوم کر آ جائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ؟"

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ہی بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

"پھر کیسے یقین دلایا جائے؟"

میں نے کہا: "ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلئے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" صفیہ بگڑی۔ "تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ۔"

"جائے گی کیسے نہیں۔" منٹو غرایا۔

"چلو چلو..." صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے، منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے عجب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا: "مگر اب تو مان جاؤ؟"

میں نے کہا: "قطعی نہیں۔"

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا ہے وہ اس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہوگا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہوگا جو باوجود یکہ سوری کا

کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور برے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا۔ خوشامد جیسے ڈھیٹ اور لگتے انسان کی رگِ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے۔ گوپی ناتھ جیسا رقیق انسان بھی دلوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بلند و ممتاز دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیس کر بولا۔

"آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔"

"دل کا ارمان نکال لیجیے مروت کی ضرورت نہیں۔" میں نے چڑایا۔

"اب جانے بھی دیجیے کوئی موہوم تو بتائیے۔"

"بتا بھی دیجیے ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجیے۔"

"آپ جھینپ جائیں گی۔"

"قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔"

"تو آپ عورت نہیں۔"

"کیوں کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے، چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے، بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بنا سکتے ہیں۔ میں بھی تھی آپ "عام لوگوں" کی سطح سے بلند ہیں۔" میں نے مسکرا دیا۔

"قطعی نہیں..... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔"

"تو پھر کہئے نہ وہ جھینپا دینے والی بات۔"

"نہیں۔ اب غصہ اتر گیا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا دوستی ہی میں سہی بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔"

"کچھ نہیں..... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا۔"

"بس؟" میں نے ناامید ہو کر کہا۔

"یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا۔" نادم ہو کر بولا۔

"مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا میں نے ایسی ایسی گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔" اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا چلو منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملاد جاؤں۔ دروازہ حسبِ معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو صفیہ منہ بنائے بیٹھی ہے۔ منٹو ماتھے میں جھاڑو لیے شاشٹ جنگ کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور

ناک پر گرنے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں۔" میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کرکٹ کھیل رہا ہوں۔" منٹو نے بڑی بڑی مونچھ جیسی پلکیں گھما کر جواب دیا۔

"یہ لیجئے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں۔" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

"ارے! صفیہ! اٹھو بیٹی۔ آؤ آؤ۔"

"کاہے کا جھگڑا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے الجھتے ہیں مجھ سے بھی الجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام! میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور بڑھے۔ کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے۔" صفیہ نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا۔ "صبح ہی صبح نیسلپٹی کے بھبکی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونکی! اب آپ ارمان نکال لیجئے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔"

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دیوار پر مار مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اور سنائیے۔" اس نے حسب عادت کہا۔ ہانڈی کے بگھار سے مجھے زور سے اُبکائی آئی۔

"اُفوہ! یہ صفیہ کیا مُردہ جلا رہی ہے۔" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا۔ باورچی خانے میں صفیہ چیختی رہی اور اس نے بھرا ہوا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آ کر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟" جیسے بچہ میرے نہیں خود اس کے پیٹ میں ہو۔ "میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی بگھار سے اُبکائی آتی تھی۔"

"منٹو صاحب! خدا کے لیے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واہ۔ اس میں کیا برائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔" وہ لپک کر نیچے گیا اور کرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ! ارے صفیہ!" وہ چلایا۔

صفیہ دھوئیں سے اٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی۔ "کیا ہے منٹو صاحب! کتنا چلاتے ہو؟"

"ارے بیوقوف! ان کا پیر بھاری ہے۔" اس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اُف گندگی کی انتہا ہے۔ بھئی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں۔" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب خوب ہنسا اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے گھر دھنے نہیں پڑیں گے۔"

"تمہارے منہ سیب کا مربہ کھانے سے ہچکیاں نہیں آئیں۔"

"دکھ پرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔"

"جاپان میں برف نہ جمتے گا۔ نلکے بھی جاتے ہیں۔ کیوں صفیہ؟"

"ہٹو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔" صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب سیتا پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی نگہت پیدا ہوگئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہیں فوراً آگئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر نیکر بنیان پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور ذلیل ہوا تھا۔ منٹو نے اس لیے بدل لیا کہ اس کا فرش گندہ تھا بچی گھٹنوں چلتی تو پاؤں لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نگہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نگہت چند ہفتوں کی تھی۔

"مجھے بچے سخت ناپسند ہیں۔" منٹو سنجیدگی سے کہتا "ہمان کو چٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انہی کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔" وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی نیتا سے بڑی چاری تھی گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لیے املیاں توڑ کر نیچے سے گزرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیتا کو پاٹ پر بٹھا کر اشنان کرتا اور بچوں کا بہت شاکی تھا کیونکہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاد میں رہتے تھے رات کے کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی "میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں سنتے ہیں۔" منٹو مع نندا جی اور خورشید انور کے اندر آ گئے۔

"یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔" ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں در آئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں ریل کا وقت گذر گیا کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھالیں۔ بس آٹا دال دے دو خود باورچی خانے میں جا کر پکا لیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے نندا جی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیے گئے جو وہ چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آ گئی۔ لوگ پھکڑ اماکر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکانے گئے کھائے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا تھا بڑے سلیقے سے روٹی پکالی اور پھر چھٹ سے پورے کی پٹی بیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی بھاگ

تک رہ گئے تھے۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آدمی ہو، چنگا بھلا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لطف آگیا خوب دعوتیں اڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت چبھنے لگے۔

"میرے پیر بڑے بھدے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے۔" میں نے کہا۔

"اور میرے پیر اتنے زمانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔"

مگر ہم دونوں نے کئی جوڑ جوتے خریدے۔

"آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔" میں نے کہا۔

"بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔"

"بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں۔" میں نے راستے دی۔

"خدا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" منٹو نے چہک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی بحثیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

"محبت کیا ہوتی ہے؟ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے۔"

"میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے۔"

"ہاں..... میں سمجھ گیا۔" منٹو نے دور ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سہمتے ہوئے خود سے کہا۔ "کشمیر میں ایک چھوکری تھی۔"

"پھر؟" میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔

"پھر کچھ نہیں۔" وہ ایک دم بجھ کے لیٹ گیا۔

"آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں۔"

"کون گدھا شرما رہا ہے؟" منٹو نے واقعی شرما کر کہا..... بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

"جس جب وہ موتیے توڑنے کے لیے اپنی کھڑکی اوپر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔ ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔"

"کہنی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا، وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی میں نے پوچھا، مجھے دکھاؤ تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ رُہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اڑ گیا اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے دیا۔

"کیا تھا اس کی ہتھیلی پر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصری کی ڈلی! اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں دیکھتا رہ گیا۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"پھر؟"

"پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دریا میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔"

"اور لڑکی؟"

"کون سی لڑکی؟" وہ چونکا۔

"وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی۔"

"اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔"

"کس قدر بھیس بدلا ہے آپ کا عشق!" میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ "مجھے تو ڈر ہے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی امید تھی۔"

"غلطی بھیس بدلا نہیں۔" منٹو بڑبڑایا۔

"بالکل ردی..... تھوڑا ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔"

"تو اور کیا کرتا؟ اس کے ساتھ سو جاتا؟ ایک حرامی بچہ اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی جوانی کی ٹرجیڈی مناتا۔" وہ بگڑا۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ مصری کی ڈلی کو کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔"

یہ وہی منٹو تھا۔ حسن نگار۔ گندہ دہن!

جس نے 'بو' لکھی تھی۔

جس نے 'ٹھنڈا گوشت' لکھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں جو دھڑکن بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہوا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ جس کی گلابی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں

میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ "نیا قانون" لکھتا ہے اور دوسری طرف "بُو"..... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟..... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ شوارے کے بعد اس کوٹھی کے وہاں اس کوٹھی میں کیے جاتے تھے۔ منٹو اس وقت ملستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم "آٹھ دن" کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ ملستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مگر جی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا۔

"کچھ اس سے مگر جی۔ فراڈ ہے بچا" وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لیے سینیر لوڈ پارٹنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔

"اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی، اشوک کمار ہیرو، بس پھر دیکھیے گا۔"

ایک کہانی منٹو کے زیر غور تھی، اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اسے میری کہانی ضدی پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے۔ ادھر کمال امروہی "محل" کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال رہتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو چال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی تکرار و قطاری میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ جہاں سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ضدی کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور ادھر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ضدی بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی ادھیڑ بن کیا کرتا۔ کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپ کوششوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا۔

"آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔"

"آپ کی کہانی میں اس کا رول رومینٹک نہیں باپ کا ہے وہ کبھی نہیں کرے گا۔" اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر دبی زبان سے ——— یہاں اپنی فکر پڑی تھی اور وہی ہوا کہ "ضدی" اور "محل" بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ ادھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بہنوئی نے اسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ہیں۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بددل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوتے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت، قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا۔ ضدی ختم ہو گئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو۔"

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں بار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر مکتی سے کہہ کر بھی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی نبضوں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں کہیں کہ جی اکتا گیا۔ بے طرح پیسے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں۔ پیشگی پیسہ دو تو سب کہا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی نداست ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ یا میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے؟ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دکھتا ہے نہ رستا ہے۔

خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اوٹلی چھیر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لیے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا، چٹان بن کر دیتی رہی یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے منٹو صاحب کی صفیہ ہیں؟ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدروی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں؟ ان خاموش گیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جب بے مروتی اور لاپروائی سے تمہارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں، دم توڑ گھٹ جاتا تھا؟ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا؟ کیا یہاں اپنے باپ کو پاگل مفلس شرابی سمجھتی تھیں؟ اس نے تمہیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا؟ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انہیں عیب کی طرح چھپایا۔ اسے زعم تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے۔ کبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ خاتے بھی کر سکتا ہے اور اس کا قلم بے کسی سے گھسٹتا رہتا ہے۔

تم عاجز نہیں آ گئیں ادیبوں سے؟ یہ خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں!..... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار رہتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم و بیش یہی انجام۔ جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ہو گی اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں حدیدِ انفرمتی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گزر جائے گا سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

منٹو میرا دشمن

اوپندر ناتھ اشک

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشر بمبئی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے معمار کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو انٹرویو کرشن چندر نے لکھا اس میں اس چپقلش کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی 'دشمنی' کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری افتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا ——— وہ لڑکپن ہی سے دنیا فضلو کھا رکی دوکانوں کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب بھی تاش ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ جوا کھیلا تھا اور میں نے شراب تو دور رہی سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا جب میں بتیس برس کا تھا۔ اس نے کٹڑہ گھنیاں ہو یا ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ، اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے اُدھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر ان پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہی کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے اس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا ہی جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے تو عموماً فحش لطیفے لگاتے تھے ——— کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے! وہ حال ہی میں جیتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردِ عمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا ——— اور منٹو کو میرے اس زہد، حساسیت، بلانگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے سخت نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

..... مجھے منٹو نے فلستان میں کام کرنے کے لیے بمبئی بلایا تھا۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے

ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اس نے انگریزی میں کہا۔

"I LIKE YOU THOUGH – I HATE YOU."

..... ڈیڑھ سال بعد ہم خلستان کی کشتیں میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسب دستور راجہ مہدی علی خاں، واجا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں برابر کی میز پر اپنی پلیٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے داہ کرم سنسکار اور کپال کریا ——— یعنی مُردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا۔ منٹو نے دانت پیس کر کہا ——— "اس وقت جب مرے گا تو اس کی کپال کریا میں کروں گا۔"

..... میں کے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے موت کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا: "منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ چھوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔"

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا "میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے" تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دیا تھا اور نہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا منٹو تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے پھکڑ پنے میں منٹو کو بنا دیکھے بنا جانے بنا پڑھے اس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی "خوشیا" ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور اجندر سنگھ بیدی اس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے اکثر سناتے اور میں لکھتا تو انھیں جا سناتا۔ دونوں مل کر مغربی کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے اور جیسا کہ نوجوانی میں ہوتا ہے، ہماری رائیں خاصی تیز اور تلخ ہوتیں۔ بیدی نے "خوشیا" کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی نہ اسے دیکھا تھا۔ "سرگزشت اسیر" کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے لینن میں دوبارے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال "خوشیا" کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی میں تینوں سے بڑا ہوں اور اس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے "ڈاچی"، "کونپل"، "قصہ" وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبعزاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا اس لیے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ "خوشیا" پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی مصنف کے خلاف تھا۔ "خوشیا" مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ زیادہ مجھے یہ اعتراض تھا کہ "خوشیا" محض کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اس زمانے میں باقاعدہ اس گلی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اس کے آداب و قواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ پچھلے طبقے کی طوائفوں کے (جیسی کہ خوشیا کی کانتا ہے)

دلال عموماً ان سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا۔ اسی لیے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں بھی بھگوڑے کے دن تھے۔ کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی۔ جو منہ میں آیا بک دیتے تھے۔ اسی لیے میں نے کہا "وہ کوڑی کی کہانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا لیکن بیدی نہیں بھولا اور جب کچھ عرصے بعد بیدی دلی گیا اور وہاں منٹو نے جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو دلی میں آ گیا تھا، اپنی عادت کے مطابق اسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے خوشیا کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آ کر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمھاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا ان سنا کر دیا لیکن ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے جانے کے بعد سے پونے دلی ریڈیو اسٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل مل گیا یعنی اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا اس لیے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشہ بنیں۔ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا۔ دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لیے اُدھار کھائے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بار آور نہ ہوئیں ——— ریڈیو کا دفتر اس دنوں ملی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے اسٹیشن ڈائریکٹر، پروگرام ڈائریکٹر اور میوزک ڈپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے اچھے شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے۔ ایک میں راشد، دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کی دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا آیا اور ادھر اُدھر کی بات کر کے اس نے خوشیا کی بات چھیڑی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھیں میری کہانی 'خوشیا' پسند نہیں آئی۔" وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "تمھیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی اصلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میرا تمھارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو۔ فضول کے بحث مباحثے میں مت پڑو۔ لوگ تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں تماشہ بنیں.....

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اس نے طاقت کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے میری سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا "کہانی وہ اچھی ہے لیکن حقیقی نہیں۔"

"کیوں حقیقی نہیں؟"

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا: "تمھیں ایک خیال سوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے روحِ عمل کو تخلیق کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلال ہوتا، کوتا اس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اسے وہیں دبوچ لیتا ——— تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے ان پڑھ دلال نہیں۔"

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو کچھ دیر کو چپ رہا، پھر تلملا کر بولا: "ہاں ہاں! میں وہ دلال ہوں، منٹو وہ دلال ہے۔ تمھیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے؟ تم خود کیا لکھتے ہو؟"

لیکن اس وقت کرشن چندر آگیا یا مجھے اڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا، بہر حال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا۔

..... لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ دل میں جو چبھن اس کے بعد ہی سوجھی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ بھول سکا۔ گذشتہ سال 'نقوش' کے کسی خاص نمبر میں اردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا اس وقت جب اردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (ادھر میرے جو افسانے اردو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوتے ہیں) مجھے آٹھ برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا۔ خوشیا کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کر کے وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے میری چشمک نہ ہو، میں اپنی میز بھی اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

ان دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا، کرشن چندر اردو کا انچارج تھا، میں ہندی سلاح کار تھا اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا: "بھئی کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟" موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈرامہ آرٹسٹ ——— غلام محمد، ناصر، جواب علی، ایکٹرس اشا وغیرہ اسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انھیں ڈرامہ سنایا بھی کرتا تھا اور وہ سن کر منٹو صاحب! آپ ڈرامہ کے بادشاہ ہیں کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر جانے اڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا جینے پلانے کا رشتہ تھا اور اڈوانی اس سے اس لیے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے سیکرٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہر وقت منٹو صاحب، منٹو صاحب، ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ جی کے وقت کبھی اس کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی اکٹھا ہوتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا اور اگرچہ میرے سامنے میں لوگ اس کا ساتھ نہ دیتے، مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا: "دیکھیے بھائی! تم منٹو کو سمجھا دو، وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے ——— میں طرح

دے جاتا ہوں۔"

"تم بھی اسے تنگ کرو۔" کرشن نے کہا۔ "میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا؟"

اور اس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اس کی کہانی "دھواں" شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تلا ہوا تھا اور پھر تکمیل اس دوران میں منٹو کی انانیت کے پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ "میں نے تمہاری کہانی 'دھواں' پڑھی۔"

"کیسی لگی؟"

"اچھی ہے۔ اب تم چھٹی پر لکھو۔"

منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دُہرا دی۔ "بس اب تم چھٹی پر لکھو!"

اس وقت حقیقت نے لحاظ نہ کیا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا اس لیے اس نے کہا۔ "تم کیا جھک مارتے ہو، میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

اس وقت میرا مجموعہ "پاپی" چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا۔ "میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو جیسی جھک مارتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کروٹ میں تم نے آتم کے افسانہ "رین" کے کہانی چرائی ہے۔ "روح کا مالک" اوپرے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے (اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا لیکن طبعزاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بری چیز میری اپنی ہے، کسی دوسرے کی چرائی تو نہیں۔"

منٹو بھڑک اٹھا لیکن میں وہاں نہیں رکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا، اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا گیا۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اس شام دشوار تو اپنے دوست اور بہوتی مسٹر دین محمد بھٹہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں کہ اتنا سادہ اپنے آپ کو سمجھا گیا ہے، اس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ "ادبِ لطیف" میں اس نے افسانہ کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا، کیونکہ فاشسٹ بڑے خوش تھے اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے راتی رتی سنا کر بھولتے تھے لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا

ہی ہوا اور افسوس کہتا رہا کہ بادلِ نخواستہ مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ خوشیا کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ یا فاطمہ، سرمہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، موسم کی شرارت، ہتک، سٹڈی کورسٹا مجھے بہت پسند آتے تھے لیکن جب تک میں دلی میں رہا میں نے کبھی منٹو کے سامنے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی اس لیے خوشامد کرتے پر وہ اگر جھوٹی طور پر خوش ہوتا تھا لیکن خوشامدی کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھ سے آ کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا اس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی۔ منٹو اس طرفداری کا فائدہ اٹھا لیتا لیکن کرشن کے لیے اس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ اسے بھی گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ ان دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کرے یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید پڑھنے والوں سے کرتا خواہ مخواہ خاصی چقلش رہتی تھی۔

ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ کہتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک خاص مواد بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبروریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ ہم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے تمھیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑھا کی تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع ——— یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی ——— پر افسانے لکھے۔ منٹو نے "بلاؤز" اور میں نے "اُبال" دونوں افسانے ساقی دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سال کے) چھپے۔ "اُبال" کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اسے اس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ "بلاؤز" اور "اُبال" اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں بلاؤز کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے وہاں "اُبال" کے انجام میں نوکر کی ٹریجیڈی کے ساتھ سماجی ٹریجیڈی بھی نمایاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی بھی ہے اس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے نظر کو محدود رکھنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں ملوث کا بھی جائزہ لینا چاہیے یہ بحث طویل ہے اور فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال منٹو کے ساتھ ہونے والی چپلک میں میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسا افسانہ لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے کھچڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں وہ اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا تقریباً انہی حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اس فرار کا باعث تھا کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اسی کے حربوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:۔

"میں نے بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا منٹو بھائی!
آگے راستہ نہیں ملے گا ——— کار موڑ روک لو ——— اور باجو کی گلی سے چلے
جاؤ ——— اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔"

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا حالانکہ یہ افواہ اڑی تھی کہ اسے فلم میں نوکری مل گئی ہے لیکن دو سال بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا ——— باجو کی گلی سے ——— آگے راستہ نہ ملنے پر ——— بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے۔ کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے، کے ساتھ ساتھ جو دوسرا فقرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا:۔ "سر تو تم جنگ دائم" ——— اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا اس لیے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیٹنے سے بچنا مشکل ہے۔ پٹو اور پیٹنے والے کو نہ چھوڑو ——— میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور عملی حیات میں جہاں جہاں بھی موقع پڑا ہے میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں میں نے اسے زک دے دی لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ برابر رہی۔

"دھواں" کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن وہ منٹو کے لیے ڈھال بن جاتا تھا اس لیے میرا ارادہ چھا جاتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ انہی دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ "ماورا" کے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے "نیلی گھیں" کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی نظم سے الفاظ لے کر ان کا مذاق اڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مکالمے دیکھئے:۔

سعید (شاعر):۔ کرشن! تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن:۔ ٹھنڈے ہاتھ.....؟

سعید : ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو ——— اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں ——— ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح ٹھنڈے ہوں ——— کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں یکایک داخل ہو جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آ نکلے۔

کرشن (مذاق کے طور پر اپنی دُم سے لاٹین باندھے ——— نہیں ——— چاند کی طرح چمکتا ہوا اور آنکھیں آج ہو گیا گیا ہے سعید۔ یہ ٹھنڈی یخ عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟

کچھ دن منٹو آتا، شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈ لیا اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن راشد اسے بھولے نہیں۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انھوں نے مسودہ واپس کیا۔

"کیسا ہے؟" منٹو نے پوچھا۔

"نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔" راشد نے اس استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔

اور منٹو بقول خود "کباب" ہو گیا۔ اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی اصلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لیے منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا تاہم مجھے پریشان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام ایگزیکٹو) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے۔ پروگرام ڈائریکٹر تک بھی بہت سی باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے اور بہت سی باتیں کرشن براہ راست ڈائریکٹر سے منظور کرا لیتا تھا۔ راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل ہے۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جائے۔ اس لیے انھوں نے اس کو لکھنؤ بھجوا دیا لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے ان کی غیر حاضری میں ان کے خلاف کچھ الزامات لکھے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہ راست رسائی تھی اس لیے فوراً تبادلہ کرا دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد امید کرتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا لیکن جب میں نے کرشن کی طرفداری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا جلنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (سرینہ رچوڑہ) کو گانٹھ لیا اس کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اسے پرزنٹ کیا اور یوں اسے اپنی طرف ملا لیا۔ آخر وہ چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لیے

انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیڈیول پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا ——— نہایت بدصورت، لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اس دن کا کام نمٹانے لگا لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس لکھنوی پی۔ اے پروگرام اسسٹنٹ کو بھیجا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اسے اچھی نہ لگی تھی۔ اس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اسٹک نو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو تو جواب وہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان سرورے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ آپ کی کرسی ہے۔" ساتھ ہی اس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "آپ ادھر آجائیے۔"

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں حکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں ظالمانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا: "میں اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آجائیے گا۔"

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصے کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے ان سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل انھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا کیونکہ ایک بار جب جگل صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے اس کی انگیخت پر، مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی ظالمانہ چمک میرے دل میں دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اس غصے میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ استعفیٰ دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آگئی جھلایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر سامنے آگئی ——— خدا گواہ ہے اگر منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو بھی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اس وقت کمرے میں جا کر بیٹھنا تو کام کرنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پر غصہ آیا۔ اس لکھنوی پی۔ اے پر غصہ آیا لیکن سب سے زیادہ غصہ آیا منٹو پر! اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی۔ اے ہے نہ راشد، منٹو ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزا چکھاؤں گا۔ میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اس میں منٹو ہی کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اس میں

ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا ہو ڈالیں ہو۔ کچھ پہلے کا تھا اور کچھ تازہ بنک کا گھاؤ کام وام چھوڑ کر میں بس کھٹیا پر چت لیٹا پر لفظوں کو رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی جاجلیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان ان سے وابستہ تھا یا بچپن سے والد محترم سے اس مہرشی کے کارنامے سن سن کر میں نے اسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہرحال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی میری کچھ اور مسخ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو "اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے" میں نے کبھی معاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو) اس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اسے بھڑکایا لیکن جو منٹو کے کہنے میں آگیا، اس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اس وقت بھی ہندی میں میرا کافی نام تھا۔ اس نے میرا نام نہ سنا ہو، ایسی بات نہیں۔ وہ سمجھدار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں تماشا نہ بنتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آزما کر بنایا جائے اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ لکھنوی پی۔ اے سینہ تانے چھاتی ٹھوکے پھر رہا تھا۔ لکھنؤ کے اپنے قصے سنا رہا تھا کہ کیسے چیف صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے) اسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ پاؤں کرسی پر رکھے گھٹنے ہاتھوں میں دبائے صرف گوش اس کی لن ترانیاں سن رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چیف صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے ان لکھنوی حضرت سے کہا: "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔" اور میں نے اسے شام کو گھر چائے کے لیے مدعو کر دیا۔

میں ان دنوں تیس پینتیس میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پی کر میں اس لکھنوی احمق کو برج پر لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی بھلی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی قربتیں کرتا رہا کہ کس طرح اس نے ڈرامے لکھے کس طرح چیف صاحب نے کہا کہ ولیا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح انھوں نے اس کی سفارش کر کے اسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اس سے خوف کھائیں گے۔ انھیں آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انھیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ (VETT) کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بھی نہیں پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔ "اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔" میں نے کہا: "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی آرٹسٹ سے ہی آئیں گے وہ آپ مجھ سے سن کر ویٹ کیا کیجیے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجیے کیونکہ خراب ڈرامہ براڈ کاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔" اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈیول تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بیکر گیا تھا۔ میں مہینے دوسرے مہینے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو ہی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک مجھے یاد ہے) "آوارہ" اپلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے ان دنوں لکھے ہوئے ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنوی پی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سنانے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سنانے سنانے میں کہتا "کیوں صاحب! اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے؟" اور وہ کہتا ——— "ہاں ہاں! یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہیں میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ نیا اختتام تجویز کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنوی پی۔ اے نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے بڑا خام ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈ کاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے، ان کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقعہ ہاتھ آیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال پنسل سے گول نشان بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گیا اور اس نے راشد اور اس لکھنوی پی۔ اے کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہو گا تو پورا ایک لفظ کٹے ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

میں اوپر نوٹی کلارک (انگریزی اناؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڑوانی کے کمرے کا روشندان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڑوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہو گا تو انہی تبدیلیوں کے ساتھ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا اور ڈیویی ایشن (DEVIATIN) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری ان کی نہیں ہو گی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے اور منٹو بھرے میں بندشیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تقریباً دھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہو گا تو اسی طرح ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اردو کا ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لیے تھے اور اوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا اس سب کا صلہ ان چند لمحوں کی اس تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔ "ساری ملک ملک لو ہاری آرٹسٹ۔" میں نے من ہی من میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں اڑوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر

پھیلا کر اطمینان کی سانس لی۔

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا ——— آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلاوت اس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں ——— سب کچھ گھوم گیا ——— اور اس تلاوت کا باعث میں تھا ——— میں جو درحقیقت اسے چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا ——— میں جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'چرواہے' اس کے نام معنون کیا تھا۔

'چرواہے' کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام

جو کبھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی جی۔ اسے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو لیکن چونکہ ٹیلی ویژن کا سوال تھا، اگر وہ ڈرامہ نہ ہوتا اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چننے کی بات تھی اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اٹھائی۔ لکھنوی جی۔ اسے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی سو اس نے پڑھ دی۔ بہر حال منٹو کی تنقید ہوا اور وہ بھی بھری میٹنگ میں یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ لکھنوی جی۔ اسے کی سمجھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کہیں اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے ——— اور چونکہ سب قطع و برید میں نے کی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں منٹو نے کیا کہا لیکن غصہ میں اس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے فن میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمھیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمھیں بتاؤں ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی لیکن شور سن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں ہوگا اور جو کچھ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہوگا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رکا۔ اس نے ٹائپ رائٹر اٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوسرے کو خورشید صاحب (سکریٹری انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈکاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے ہوئے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگایا تھا اور پھر انھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا

راشد چونکہ ملے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لیے منٹو نے خود ٹیلیفون کے ذریعہ اسے کنسل کرا دیا تھا۔

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا۔ ڈرامہ اس نے منگا لیا۔ جو تھے پانچویں یا غالباً ساتویں دن سنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری وہ کر رہا ہے کچھ نہیں ملی اور بمبئی میں اسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلستان میں اسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اس کا دوست نذیر جا کر اس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

"وہ تمہارا لال کیا ہوا مسترد وہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔" اچانک منٹو نے کہا۔ یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا نہ اس لکھنوی پی۔ اے پر بلکہ منٹو پر غصہ تھا اسی طرح منٹو کو بھی ان دونوں کے بجائے مجھی پر غصہ تھا اس کا ڈرامہ میں نے کیا کیا ہے یہ بات وہ جان گیا تھا۔

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

"دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر ہمیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے فلستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور بچ رہی تو کیا فائدہ؟"

"نہیں نہیں، ویسا کچھ نہیں ہوگا۔" اور اس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھابی سے کہا "دیکھئے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے میں آنہیں رہا تھا۔ دوبارہ قاہرہ پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ آوارہ کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دلی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشہ بنے ہیں۔ اب اس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجئے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے۔ کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔"

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہ کیے لیکن ہاں کر دی لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا سوچوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو۔ بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سب کو میں نے فلستان اس کے کرتا دھرتا شیشہ گر بمبئی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

۱۔ فلستان کا باس شیشہ گر زمانۂ قدیم کے سادیت پسند ان داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار کر ان سے کام لیتے تھے۔

۲۔ فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔
۳۔ جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔
۴۔ فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں ——— ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے شاہد لطیف اور سنتوشی کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اس نے ہی مجھے بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلمستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کرشنا ٹرینگ لینے بمبئی جا رہی تھی لہٰذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا اس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قصے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے اس لیے میں اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو پہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا ——— گورا چٹا رنگ، پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر اتنا ہی آمیز مسکراہٹ ——— منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں منٹو کے 'نیا قانون' اور شاید 'مسز ڈی کوسٹا' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی۔ لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ ڈھل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم ہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایمان کو رائٹر نے خود آ دلوا دیا تھا۔ چڑھا، میراجی اور راجہ مہدی علی خاں، رائٹر کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی چھیڑ ہو جاتی، خاصی چخ چخ بھی رہتی تھی لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا ——— منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ڈھیلا کر دیا ——— منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد ——— ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ 'بو' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے

اس بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے "بُو" کی خوب تعریف کی۔ مجھے "بُو" کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی۔ میں اس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے "بُو" میں سمویا ہے، وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار رشی پال بھی شامل ہیں اور رشی پال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ "بُو" ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا "لاجونتی" ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اردو ادب میں اس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاجونتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ "بُو" کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا اس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیا کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رُخ کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ٹوائز کیرٹن بوس فلستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بمبئی میں ہوئی۔ منٹو اگر شراب نہ پیتا ہوتا اور دہلی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے "آوارہ" کے اس سمبولے کا ذکر نہ کرتا جسے میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دُھل گئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلستان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا اور شاہد کا پیسہ اور سنتوشی کا گٹ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی۔ اس لیے اس نے میری مخالفت کی۔ جس وقت اس نے مجھے بُلایا اس وقت شاہد لطیف اور سنتوشی فلستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو کو جی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمھارے مکالموں کے پرخچے اُڑا دے گا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے لیکن تمھاری جان مصیبت میں آ جائے گی اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اڑائی تھیں اس کا انتقام لینے کی ترکیب اس نے یوں نکالی تھی اور چونکہ میں "ہاں" کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لیے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلستان میں اپنا لائحہ عمل طے کر لیا۔

میں نے اس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک فلستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی۔ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی کیتن بوس کے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے ہتراسنے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے لکھے اور یوں فلستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے سخت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا فلم "سرور" خواہ مخواہ کس اعتراض

کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم "سفر" باکس آفس پر بھی کامیاب رہا اور ظاہر ہے کہ میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ اب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکرجی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم "چل چل رے نوجوان" اور "شکاری" دو دو سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ جو میرے ذہن میں تھے سنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا ——— میں اس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا ——— لیکن میرا کہنا تھا کہ میں محکمہ نرلیس کی حیثیت سے ملازم ہوں، کہانی نرلیس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار مکرجی کا سالا تھا لیکن ان دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا۔ "آپ مکرجی سے کہئے" لیکن مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجئے گا، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے۔

خلاصہ یہ نہ مل گئی کہ اشوک میرے پاس آئے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اس نے واچا کو ساتھ ملا لیا۔ واچا اشوک کو اپنے غلیظ پرلے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی ملتی تھی۔ اشوک کو انھوں نے اس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اس کا مہورت ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لیے "آٹھ دن" کے فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں، یہ ایک الگ لمبی کہانی ہے لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لیے افسانہ لکھنا منظور کر لیا یہ اور بات ہے کہ جب آدھی فلم بن گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا، اور ابھی خاصی رقم کسے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت برا لگا ——— خصوصاً اس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا ——— مہورت ہو گیا۔ مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے اس لیے سوا اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے منٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ "آٹھ دن" کا ڈائرکٹر بمبئی ٹاکیز کا ایڈیٹر رتن رام پانی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائرکشن تو اشوک ہی کرتا تھا لیکن چونکہ پانی بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اس کی چلتی تھی۔ میں نے پانی کو ساتھ ملا لیا اور "آٹھ دن" میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور لغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا اس لیے پنڈت کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اس کے دو بنا دیتا۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ٹالک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لیے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو

ان کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں بمبئی سے الہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی لکھی تھی لیکن ہم نے کمال امروہی کی کہانی "محل" لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہارے والی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔

درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنہیں کبھی اس نے خلستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ اگلی راستہ بند ہے، کار موٹر نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو جگہیں اشوک اور واچا کو ملی تھیں لیکن منٹو کو آگ لگانا اور خود بیکار رہ جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر شاید تکلیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے منٹو کے فیل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس زن چھوڑیت اور باری صاحب کی زن چھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی زن چھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا جبکہ منٹو کی زن چھوڑیت اس کی زبردست انانیت کے اعتماد تھی اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس جھک کر ان کی خوشنودی کے لیے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں لیکن غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑا ہے) اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوتیا نہ لطیفے سناتے دیکھا ہے۔ ان پڑھ لکھوں اور میوزک ڈائرکٹروں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو کو اس اور دوسرے بزرگ بھی کا نام دیتے تھے) لیکن ان میں سے کسی بھی کا میں اس کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچی کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کم تر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو سنکی سمجھتے ہوں شرابی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈرامیٹک رائٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں جہاں رائٹرز گئے میں نے اور اس لکھنے پڑھنے کی "تنقید" کی اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا اس کے جگری دوستوں نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی اور جب اس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لیے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی مرغی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہنک برداشت کرتا ہوا بھی وہاں جما رہتا لیکن منٹو کی انانیت کے لیے وہ ہنک ناقابلِ برداشت تھی اور دیکھ پٹک کر بیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا اس لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی دوسری بار تو اس کی جان پر آ گئی لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (نادل یا انفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی

لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط نہ کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو غائب کے بجائے مہاریوی وتا کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں، بمبئی میں امریکہ کا ریا انگلستان کا ایک مجھے یاد نہیں، ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چنی لال نے اسے فلستان میں بھی مدعو کیا۔ شام کو فلستان کی کینٹین میں جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی میزیں لگا دی گئیں اور شنکر مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واچا، چنگر، برمن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اس ایکٹر کو جارج ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسب معمول باسز (BOSSES) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بزلہ سنجی ان پر ضائع کرتا رہا۔ میں نیپالی، برمن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سا منہ ——— جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر چپٹا کر دیا ہو۔ بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ ان کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے اس خوگر کو اس شوگر کے پہلو میں لا بٹھایا تھا۔ بہرحال اس کے آگے آگے رائے بہادر چنی لال اور مکرجی آئے۔ کینٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی میزیں لگی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا لیکن منٹو، اشوک کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی بالکل ہی سے تھے مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اٹھ کر چھوٹی میز پر شنکر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا:

"کیوں؟"

"چلو چلیں۔"

"کیوں؟"

"سب بکواس ہے۔"

"بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔"

لیکن منٹو نہیں رکا۔ خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

"گنجے فرشتے" میں منٹو نے شیام پر جو سکیچ لکھا ہے اس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ ڈیڑھ

میں شیام آیا تو اس کو ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی 'انا' کو بار بار ٹھیس لگتی ہے ——— منٹو لکھتا ہے:۔

"شیام نے مجھ سے کہا ——— میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اس سے غلیشی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا۔"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ تھی، اس کی انا تھی۔ اس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹرس کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ مکرجی نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یک لخت اداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اس کے لیے مشکل ہو گیا ——— منٹو، شیام سے ملنے غلیشی بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملا تھا تو عموماً شیام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت، شیفتہ گوئی اور برملا سچی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا لیکن پٹنا نہیں، پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں، اسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے، اسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہرِ نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں انھوں نے اس کے خلاف لکھا۔ بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے نقاب حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں روپیہ بے دریغ اور بھکاری چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیے ——— صفحۂ قرطاس پر زندگی کی وہی چبھی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعوے کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا ———

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا چرچا چلا تھا ——— اس کا نام تھا "ترقی پسند" ——— چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ ویتندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو تصور درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیارتھی کو بھی تھا، ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت

کچھ زیادہ ہو۔ بہرحال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح شام اسے افسانے سنانے لگے۔ بیدی اس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اس کے پاس تھے، جگہ زیادہ نہیں تھی، پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل ——— بیدی شام کو تھکا ہارا آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار رہتے۔ سن کر رخصت نہ لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا ——— مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی "ترقی پسند" کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی رنگ دیا ہے کہ پرماتھی (ترقی پسند میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی غسل خانے ہی میں جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ بیدی کے منہ سے سنا ہوا (منٹو نے قلمبند کر دیا) اس لیے مجھے برا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا، یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھ یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں تمھیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں ورنہ میں اسے تمہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو سے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اسے قلمبند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات و اطوار، شکل و شباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اڑایا تھا، اسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھ کر منٹو کی ذاتی زندگی اور اس کی خامیوں کو اجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے چٹکلے کہ کہانی جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اترتی ——— نام ہے ——— "نئے دیوتا"۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن (نئے دیوتا میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے بافیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی ——— غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی چکی کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا جا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں ——— ان حیوانات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جال میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے ..... ؟"

اور یوں شروع کر کے "نئے دیوتا" کے لکھنے والوں نے نفاست حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، منٹو پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، بدوضعی، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا کہ منٹو بلبلا اٹھا (بعد میں جیسا کہ اس کی عادت تھی) اس نے خود اپنی سنک اور منٹو پن کی تشہیر شروع کر دی[1]

---

[1] گورنمنٹ کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا: "البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خدا ہوا تھا تو میں پن نکالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ منٹو پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔" (لذتِ سنگ)

"نئے دیا" کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت کسی بھی وقت آناً کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ دوست احباب جب اکٹھے ہوتے، کسی نہ کسی بہانے اس کہانی کا، یا ستیا رتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے ——— منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا۔ دنیا جہان کا مذاق اڑاتے ہوئے مذاق کیے جانے پر کس طرح سخت باہر جاتا اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے۔ غپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر جھکائے بیٹھا سب کی سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کیے گھٹنوں کو باہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ راشد، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور میراجی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید تھے، مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید نیچے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے گھٹنے پر ٹانگ رکھے ادھر بیٹھے، ادھر بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دور سے اونچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی اس لیے کرسی پر پڑے ریکارڈوں کے اونچے چھیٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیا رتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کہا: "لیکن نئے دیا" تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔"

"واہ!" کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں۔ ستیا رتھی کا نام سنتے ہی چونکا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

اور تب کسی نے منٹو کو بناتے ہوئے کہا۔ "ارے یار! ستیا رتھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔"

"بیدی کا تو نہیں" تیسرے نے کہا: "لکھا تو ستیا رتھی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے۔"

"ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے....."

اور اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا: "بیدی اور فیض کیا، اس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، جسٹم کا ہاتھ ہے، سنت سنگھ سیکھوں کا ہاتھ ہے، نرنجن سنگھ کا ہاتھ ہے، منٹو از این انسٹی ٹیوشن....."

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقعہ دیے بغیر میں نے کہا: "اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے، وہ شیام لال کپور تھا، گورو گھنٹال کا ایڈیٹر، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا....."

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو جھنجھلا کر اٹھا اور اس نے قہقہہ سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیے۔

کوئی دوسرا موقعہ ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیتا۔ لیکن منٹو کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے گالی دیتا ہے یا ہاتھ اٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زور سے ہنس دیے۔ کرشن بھی ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا: "کیا کرتے ہو؟" اور دوسرے لمحے منٹو اپنے

تالو پالیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا: "ڈو نوٹ مائنڈ اِٹ (DO NOT MIND IT)"

اس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

غلستان کے زمانے کی بات ہے۔ "آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا ایک رول لے لیا تھا۔ چونکہ دن کو مسٹر ڈیوالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لیے "آٹھ دن" کی مستقل شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشغال دوسرے تھے لیکن جب سے میں نے "کلرم بھڑ اکر آٹھ دن" میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں ردوبدل کرنے لگا تھا تو منٹو رات کو بھی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو دو بجا دیا کرتا تھا اور سیٹ پر آتا اسے بے حد شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اس کے مکالموں کو "مسخ" نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا۔ اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اس نے جو زیادتی کی تھی، اس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا اور اس کو تنگ کرنے کے درپے تھا۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شادی، غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے۔ اس موقعہ پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑایا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سننے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

"آٹھ دن" کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر نینی تال چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرانی تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے، ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے سر پر پنڈتوں سی پگڑی سجائے وہی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے اپنا پارٹ لیکچر کر رہی تھیں۔ میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آگیا: "تو کیا میں جھک مار رہا ہوں"۔ یا شاید یہ فقرہ تھا: "میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا"۔ بہر حال جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہدایات دے رہے تھے۔ منٹو بیٹھے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا: "میں یہ ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔"

"کیوں؟" اشوک نے پوچھا

"جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے۔ وہی پر بیٹھا ہوا ویدوں کا ذکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا۔"

"لیکن یہ تو محاورہ ہے۔" منٹو تنک کر اٹھا۔

"بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں لیکن شریف لوگ نہیں بولتے۔ اسی طرح وہی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔" میں بولا۔

"لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔"

"جھک کیا ہے مچھلی۔ جھک مارنا مچھلی مارنا ——— مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔"

"بنگال کے پنڈت مچھلی مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں۔"

"لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں۔ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔" منٹو جھلا اٹھا۔ "تمہیں یہی فقرہ بولنا ہوگا۔"

"میں نہیں بول سکتا۔ میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔"

"میں بھی برہمن ہوں۔" منٹو گرجا۔

"برہمن تمہارے اجداد ہوں گے اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔"

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا کلمہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت پھوہڑ تھا لیکن جو لوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے پھوہڑ اعتراض وہاں سینیوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اعتراض پھوہڑ ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں اس سوال نے اسے ایک دم وزن عطا کر دیا۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا اسٹنٹ وہاں مہورت کرتا ہے حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثے ہوتے ہیں۔ فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اٹھاتے ہیں۔ میری بات اشوک اور واچا کو ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا اور چکر میں مذاق نہ کر رہا تھا اور طرافی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا "دیکھو منٹو میں پہلوان نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو اور تم نے اب بھی کہے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا۔"

معاملے نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رک گئی۔ انہیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈز پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے (یا شاید مجھے لے گئے، یہ مجھے یاد نہیں) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے بھی نہیں مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے۔ اسے لے کر کتنا ہی رہتا تھا لیکن کرشن کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا۔ دو موقعوں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ ان دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ اشوک نے منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لیے سنسوشی کو پھر بلا لیا تھا اور آٹھ دن کے لیے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی لیکن منٹو سنسوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا اس لیے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا۔ ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے کہ میڑھیاں چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم سخت نفرت کرتے تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بلیشم لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا اور اپنے سینئر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ اجودھیا میں رہ کر ان کے سہ ماہی نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہو گئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بڑے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا بچپن کا دوست مکھرجی آتا ہوا دکھائی دیا۔

دوری سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا استقبال کیا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے لپٹ گیر ہو گیا۔ آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اشک اور الہ آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گورکھا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انھیں کہا کہ وہ میرا انگلیا تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں غیر مقدم کی پرانی رسم ہے..... کاش میں اور تجھ میں ایسا یارانہ رہتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے۔ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی اس میں بے تکلفی و تلخی یارانہ تھا صرف تلخی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا "دیکھو منٹو! تم اسرار کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں میں گالیاں دوں گا تو تمھاری طبیعت صاف ہو جائے گی دوبارہ تم مجھے کبھی گالی مت دینا۔"

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کپال کریا کرنے کی خواہش میں منو ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو صاحب گالی دینے پر معافی مانگ چکا تھا۔ اتنا مادہ اس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم لڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر بل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما ایک دوسرے کے بیٹے کو کاٹ کر گوشت بیچنے والے مردوں کی طرح۔

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو ایسی بات نہیں لیکن ہماری انا یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی پیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تیار نہ ہوا منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تیار نہ ہوا۔ بیشک سن یاد نہیں لیکن کرشن لکھنؔوی کا لکھا ہوا شہرہ پروگرام ٹی ڈائریکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے۔ چوپڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پہچانا نہیں تھا۔ منٹو کو مخالفت کا حلقہ اتنے کر دنگ بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ بلب جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کرشن چندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی ——— "اشک!"

"منٹو!" ——— مجھے خیال آیا ——— اور میرا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر ۵۱ حسن بلڈنگ کشمیری گیٹ میں تین چار بار گیا تھا لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا حالانکہ میں تیس ہزاری میں بلبیر کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو دور رہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا (میرے نزدیک ہی رہتے تھے (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ نہ اٹھ کر دروازہ کھولا کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوتی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

"اشک!" وہی کرخت، تیکھی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو صفیہ بھابی اور ان کے ساتھ ایک گورا چٹا بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے والا نوجوان ——— تینوں اندر آ گئے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ یہ مسعود پرویز ہے (میرا بھتیجا) میرا دوست منٹو نے کہا مجھے یاد نہیں، تم سے ملنا چاہتا تھا میں نے

کہا "بیٹھو بلاتا ہوں۔"

میرے پاس اس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال بھارگو میونسپل کمشنر دہلی نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے بارکوں جیسے ۲۴ کوارٹر بنا رکھے تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے، راشد ایک نمبر میں، میں تین نمبر میں اور کرشن باقی نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں میں نے ایک کرسی میز کام کرنے کے لیے رکھ چھوڑی اور بیٹھنے کے لیے ایک دری اور جاجم فرش پر بچھا رکھی تھی ——— اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "بیٹھو بیٹھو!" اور کوشلیا کو آواز دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آئے ہیں۔ منٹو اور پروین بیٹھ گئے۔ صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ اور میں اس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ کوشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں سوا اس کے کہ مسعود پروین کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اس کا ناک نقشہ بھی دلکش تھا اور میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیروئن کی حیثیت سے مشہور ہوگا۔ شاید وہ اس وقت کسی فلم کمپنی میں ذکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ منٹو ادھر اُدھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا۔ بات کریں نے کسی طرف نہیں مڑا۔ پوچھ سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کون سی میری چیز پڑھی ہے وہ کب چھپی تھی ہے کیا کر رہا ہے کب تک رہے گا وہاں چیت کریں نے ذاتی طور پر نہیں دیا منٹو کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا بلکہ جب کوشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پروین مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغل سے فرصت کر کے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابی کوشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی یہ بات بھی مجھ میں آ سکتی تھی۔ صفیہ کوشلیا کو چاہتی تھیں اور کوشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اس نے بنایا اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں اس کے اس طرح آواز دینے میں جیسے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آ کر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکر گزار رہنا چاہیے تھا۔ باتوں میں اس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر چھائی رہی۔ میں بھی آدمی ہوں، منٹو بھی آدمی ہے کا بھگتا رہا ہے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انسانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا اور پاس ہی دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابی اور کوشلیا باتیں کر رہی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور سچ تو میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا جسے اس نے احساس برتری کے زیر اثر روا رکھا تھا اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ بلکہ سارے کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا لیکن ان بلندیوں سے اسے اتار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوتی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا ——— دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں اور اس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اترنا اسے منظور نہ ہوا۔

منٹو صاحب

محمد طفیل

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو صاحب کی زندگی میں اور دوسرا حصہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(۱)

اس وقت سر میں شدید درد ہے، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ درد کی نوعیت نہ بدل جائے۔ اس لیے کہ میں نے منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے سر میں نہ سہی دل میں درد محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک اسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے انداز بیان کی رنگینی اور چٹ پٹے پن سے درد ہوتا ہے۔ میرا شمار کن میں ہے؟ یہ آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس لیے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے ان کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پر لکھنے کا حق ہمیشہ کی طرح نقاد ابن کرم کو سونپتا ہوں۔ ورنہ وہ محاورہ صادق آئے گا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔

ایک دن انارکلی میں ایک صاحب کو افسانوی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو ہونا چاہیے۔ یہ خیال اس لیے بھی ذہن میں آسکتا تھا کہ منٹو صاحب بمبئی سے لاہور آچکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر کے سامنے سے سائیکل پر گزرے۔ سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحب سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن میں پھر آیا کہ وہ منٹو گیا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ برادرم احمد ندیم قاسمی آئے اور انھوں نے بتایا میں آپ کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا۔ لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے۔ اس لیے آدھ گھنٹہ ان سے باتوں میں گزر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پھر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہی جن کو میں نے انارکلی میں دیکھا تھا یا دفتر کے سامنے سائیکل پر گزرتے دیکھا تھا۔

ندیم صاحب نے تعارف کرایا "آپ سعادت حسن منٹو ہیں۔" اور میری طرف اشارہ کر کے "آپ طفیل صاحب ہیں۔"

منٹو صاحب میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ موجود ہوں، تو دوسرا لاکھ کوشش کرے، وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔ باتیں ان کی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

وہ میرے پاس پہلی مرتبہ آئے تھے، اور آتے ہی انھوں نے باتیں شروع کر دی تھیں اس لیے مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ پانی وانی کے لیے پوچھتا۔ پھر بھی میں نے ان کے مسلسل پیاپی میں یہ بات چھوڑ دی۔

"منٹو صاحب چائے پئیں گے؟"

منٹو صاحب اس وقت نان اسٹاپ موڈ میں تھے۔ اس لیے انھیں میری مروت بھی ناگوار گذری اور جھٹ بولے "ہٹاؤ یار، اس وقت چائے سے زیادہ گرم باتیں ہو رہی ہیں ——"

باتوں کا تسلسل تو ٹوٹ ہی چکا تھا۔ اس لیے کسی اور طرف چل نکلے اور ندیم صاحب سے کہا، حیدر آباد دکن میں کئی ایک کو یہ فکر تھی اور ہے کہ میری شادی عصمت سے ہونی چاہیے تھی۔ نہ جانے یہ لوگ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں جب یہ بات میری بیوی نے سنی تو وہ کباب ہو گئی۔ اس لیے کہ دونوں کی آپس میں بڑی دوستی ہے۔ پھر حق زوجیت پر بھی آنچ آ رہی تھی۔ اس لیے اس کا کباب ہونا برحق تھا۔"

—— پھر —— "ارے یار بیٹھنے کا کیا پوچھتے ہو، اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے! بڑے ٹھاٹ سے دن گزار رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی تھی۔ بڑی قدر تھی۔ ہر کوئی منٹو منٹو کرتا تھا۔ مملکتِ خداداد میں آئے تو پبلشروں کے پاس خود جانا پڑا کہ بھئی ہماری کتاب چھاپ لو۔ کئی بار جی چاہا کہ بیچ سڑک کھڑا ہو کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤں، پھر سوچتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے ——"

اس تذکرے پر منٹو صاحب ذرا افسردہ ہو گئے اور شاید افسردگی ہی دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس نکالا، ایک سگریٹ ندیم صاحب کو دیا ایک خود اپنے باریک باریک لبوں پر اٹکایا، جیب سے ماچس نکال ہی رہے تھے کہ ایک دم میری موجودگی کا خیال آیا اور بولے "بھئی معاف کرنا" اور سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔

ندیم صاحب نے مشکل کشائی کی اور کہا کہ یہ نہیں پیتے۔ منٹو صاحب پینے کے لفظ کو لے اڑے "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں، سگریٹ پینا کیا ہوتا ہے۔ پینا تو وہ ہوتا ہے ——"

پھر ندیم صاحب سے پوچھا "قاسمی صاحب آپ نے میرا مضمون "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" پڑھا ہے؟" ندیم صاحب نے حسب عادت "جی ہاں" کہا۔ "چھوڑیار وہ مضمون کیا ہے، بکواس ہے۔"

منٹو صاحب کی عادت ہے کہ اگر ان کی کسی چیز کی تعریف کی جائے تو وہ عموماً یہی جواب دیتے ہیں، یا صرف اتنا کہہ دیں گے "بس ٹھیک ہے" پھر خود ہی اسی مضمون کی تعریف شروع کر دیں گے اور وہ بھی حوالے دے دے کر مثلاً اس میں وہ فقرہ بڑا اچھا تھا کہ

> "صبح کا وقت تھا، عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں، ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا۔ "یہ اُلٹے رُخ کا پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟" اُس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا

"دیکھتے نہیں ہو ——— میں نے دیکھا ——— پکے کا رُخ قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف تھا۔"

پھر انھیں کوئی دوسرا پیرا گراف یاد آگیا تو وہ بھی سنا دیا:

"ایک دم شور برپا ہو گیا کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے سنڈل لیے چلتے رہے ہیں اور اتنا جاؤ صند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں۔ دہلی میں ہوتا پیل گئے لکھنؤ میں فلاں کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا پاکستان کے ایک بحری کی پیش گوئی کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔"

اس وقت انھوں نے یہ فقرے بغیر کسی رکاوٹ کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد بھی رُکے کہاں۔ کہنے لگے آج کل عجیب موڈ ہے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں تو مضمون ہو جاتا ہے اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا اور پھٹ سے بول پڑا۔

"اگر آپ نے بیک وقت ڈرامہ، افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوانحیہ فنان ہی کر رہ جائیں گے۔"

اس فقرے پر منٹو صاحب محظوظ ہوئے اور کہا "اچھا ہے، اچھا ہے۔" چونکہ انھیں اپنے پر کوئی چبھتی ہوئی بات گوارا نہیں ہوتی، اس لیے ذرا سوچ کر بول ہی پڑے "بات تو آپ نے اچھی کہی ہے، بدقسمتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں ہے اس لیے جواب ارسال کرنے سے معذور ہوں۔"

ندیم صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مسکرا کر کہا: "آپ انھیں کوئی جواب نہ دیں۔ یہ ذرا اور قسم کے آدمی ہیں۔" اور قسم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی۔ لیکن منٹو صاحب کی باتوں کا رُخ قسموں کی طرف چل نکلا اور کہا: "آپ نے میرا مضمون ناک کی قسمیں پڑھا ہو گا۔ وہ، وہ، ہاں وہی

آئی جو اُن کی ناک تو آتی چلی گئی

میں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے۔ وہ کیا ہے تکا بھئی وہ تکا۔ ہاں!

ناک میں نیم کا فقط تکا شوخی چالاکی اقتضا ہی کا"

اس کے بعد انھوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے، موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر ندیم صاحب سے پوچھا "آپ یہاں بیٹھیں گے؟"

ندیم صاحب نے اپنا تکیہ کلام دہرا دیا۔ "جی ہاں!" "تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا "اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔"

پھر تو اُن سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب روز۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بخشیں گے۔ کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی ہو گی کہ ملاقاتوں کا رُخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا۔ ان کا یوں روپوش رہنا چند

دنوں کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوگا۔ تانگے سے اترتے ہی دُور سے السلام علیکم کے ساتھ ملاقات پھینک دیں گے۔ پھر یہ کہیں گے۔ "دس روپے یا پندرہ روپے دوائی کے لیے دینا۔" جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت یاب ہوں۔ لیکن یہ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت اور خراب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے۔ پہلے یہ دوائی کو پیتے ہوں گے۔ اب دوائی انھیں پی چکی ہے اور کسی دن بیٹھے بٹھائے ہم یہ سن لیں گے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا ——

یہ سب جانتے ہیں کہ منٹو اُردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے، جو ان کی اس حیثیت سے منکر ہیں، مجھے اُن کی رائے سے اتفاق نہیں۔ لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لیے دیا جس کا نام "لطفہ" تھا۔ میں نے وہ افسانہ پڑھا تو مجھے پسند نہ آیا۔ ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے بُرا نہ مانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔ میری نظر میں وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ جب منٹو صاحب کو دوسرے افسانے کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہوا، تو انھوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دوں گا اور اس وقت تک لکھتا رہوں گا جب تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دیئے وہ دونوں مجھے بے حد پسند آئے۔ ایک کا نام "موذیل" تھا اور دوسرے کا نام "سرمک کے کارے"۔

مندرجہ بالا واقعہ کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اتنا بڑا لکھنے والا اتنے بڑے دل گردے کا بھی مالک ہے۔ ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی شان میں ایک حرف بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فن کار، جو فن کار بھی ہے اور منہ پھٹ بھی۔ اس وقت انھوں نے نہ مجھے یہ طعنہ دیا کہ میں بہت بڑا لیکھک ہوں اور نہ ہی یہ ثابت ہونے دیا کہ منہ پھٹ بھی ہوں۔

ویسے ان کی زبان کے آگے کوئی خندق نہیں۔ کبھی کبھی پی کر آجائیں گے، اور کہیں گے "کل آپ نے فلاں صاحب کے سامنے کیا بکواس کی تھی، میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بھی حرامزادہ، پر آپ کو کیا پڑی تھی کہ وہی بات آپ اس سے بھی کہہ دیں، جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی۔ ویسے میں ڈرتا نہیں ہوں، وہ میرا کیا کرلے گا، میری جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ نے بڑی کمینہ حرکت کی۔ جب میں نے سنا تو کباب ہو گیا میری ..."

میں ایسے مواقع پر خاموش رہتا ہوں، یا صرف مسکرا دیا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس وقت ان کی باتوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور اس وقت منٹو کی بجائے شراب بول رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب منٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت منٹو پر بھی پیار آتا ہے اور اس کی باتوں پر بھی۔ لیکن ایسے مواقع ذرا کم ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ پی کر واہی تباہی ہی بکتے ہیں۔ وہ اپنی انہی باتوں کی بدولت دو بار پاگل خانے جا چکے ہیں۔

پہلی مرتبہ منٹو صاحب ماضی خود ہی گئے تھے۔ دوسری مرتبہ زبردستی ان کے گھر والوں نے بھیجا۔ ان کی دوبارہ واپسی پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ منٹو صاحب آپ کس خوشی میں مینٹل ہاسپٹل جاتے اور آتے ہیں۔

کہنے لگے کہ بھئی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاؤ سے گیا تھا کہ وہاں جا کر ذرا شراب چھوڑ آؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج

کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں جا کر جو طبیعت صاف ہوئی۔ وہ بیان نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ گھر والوں نے زبردستی بھجوا دیا۔ حالانکہ میں نے ان کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کرایا جائے اس لیے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سُنی۔ کل میرے ایک دوست مجھے ملنے آئے تھے، تو میں اُن کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے، ڈھونڈھا کریں۔ پاگل کہیں کے۔

منٹو صاحب کا مزا اس وقت آتا ہے جب اُن سے عریانی یا فحاشی کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بے شمار افسانے نظر انداز کر دیے جن میں جنس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں۔ باقی تو بس افسانے ہیں۔ جن حضرات کو میرے افسانوں میں فحاشی نظر آتی ہے، وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ منٹو کی کوئی نئی کتاب آئی۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں جنھیں میرے فن سے پیار ہے یا "اعتراضیے" پڑھتے ہیں تاکہ مجھے بُرا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ایک کتاب کا انتساب یوں کیا تھا:

"ایڈیٹروں اور دنیا کے نام، جس نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں۔"

اب میں چاہتا ہے کہ قبلہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام بھی ایک کتاب معنون کر دوں، اس لیے کہ موصوف نے میرے خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا ذکر سکا، تو بہت ممکن ہے کہ حشر کے دن مولانا موصوف امن میں ہوں اور مجھے ندامت ہو۔

بعض ان محترم ہستیوں کا تذکرہ چھوڑ دو۔ میرے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی چٹھی لکھ دی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی بند لفافہ لکھ کر چھپوا دوں۔ لیکن قاسمی صاحب کی شرافت آڑے آ گئی۔ عسکری نے سیاہ حاشیے پر دیباچہ لکھ دیا تو یار لوگوں نے اڑا دیا کہ مجھ پر عسکری چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ خود اتنا سیدھا سادا اور بھولا بھالا ہے کہ اپنے اوپر تو چھا نہیں سکا، مجھ پر کیا چھاتا۔

پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اچھالتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ موجودہ پر ہے ——— پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ میں کہتا تھا ٹھیک ہے۔ اب مجھے حلقۂ ارباب ذوق والوں نے اپنا لیڈر بنا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔

مجھ سے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں۔ ہر معاملے میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی جماعت کی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری ماد پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انھوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی۔

پرسوں کراچی سے ایک صاحب آئے تھے نہ جانے ان کا نام کیا تھا وہ کہتے تھے کہ منٹو صاحب میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں ———

کل فلاں صاحب نے شیخوپورہ سے دو کنستر گھی کے اس لیے بھجوا دیے کہ وہ مجھے بڑا رائٹر سمجھتے ہیں۔

میں نے مال روڈ پر ایک دکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لیے دی تھیں۔ کوئی صاحب محبت کے اظہار کے طور پر وہاں سے فریم کے روپے دے کر میری دونوں تصویریں لے گئے۔

میرا سگریٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے لیے ہوئے آ پہنچے اور کہا منٹو صاحب السلام علیکم! یہ اپنا سگریٹ کیس دیکھیے۔ مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں، وہ کہنے لگے واہ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔

اُدھر ممتاز شیریں میرے فن پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ ادھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ چھپ رہا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے لکشمی مینشن میں افیون کھالی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے قے کرانے کے لیے کوئی دوا تجویز کی۔ مگر اس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا۔ شور ہوا تو میں بھی پہنچا۔ میں نے کہا۔ بھئی دوا کھالو۔ اس نے کہا تم کون ہو؟ میں نے کہا۔ میں منٹو ہوں۔ اُس نے اسی حالت میں کہا۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا۔ میں آپ کو بہت بڑا رائٹر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمہیں دوائی پینا ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوائی لی ———

ایک دن میں انارکلی اور مال روڈ کے درمیان بیہوش ہو گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پر کلہاڑا مارا ہے اور میں بیہوش، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ ایک ہجوم میرے ارد گرد اسب منٹو منٹو کر رہے ہیں۔

میں نے کہا "ماجرا کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟"

"میرے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے چٹ کہا "کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے؟"

بعد میں معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے پانی کے چھینٹے مار مار کے، مجھے ہوش میں لانا چاہا تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا، مجھے مرگی کا دورہ پڑا ہے، اس لیے مجھے خوب خوب جوتیاں "سونگھائی" گئیں۔

جب میں نے یہ بات سُنی تو مجھے خطرہ پیدا ہوا۔ ناک کو ہاتھ لگا کے دیکھا کہ چھوٹی سی جوتی اس کے اندر تو نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک دم گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا "میں گھر جانا چاہتا ہوں، تانگہ منگوا دو؟"

تانگہ منگوایا گیا۔ اب سب مُصر کہ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے چنانچہ میں ان لوگوں میں سے تین صاحبان کو ساتھ لے کر گھر کی طرف تانگے پر چل دیا۔ اُن میں سے ایک صاحب نے کہا۔ منٹو صاحب میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار مانتا ہوں۔ میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے سب ہیچ ہیں ———

میں نے اُن صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں، بس افسانہ نگار ہوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں۔ افسانہ نگار اس وقت

ہوتا ہوں جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا، اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں جنھیں لکھوں۔ افسانے اُدھر رہ گئے۔ جو افسانے اِدھر تھے، انھیں بھی مار بھگایا اُدھر یا اُن کے ساتھ کچھ اور کر لیا گیا۔ وہاں ایک سڑک پر کئی افسانے ملتے تھے۔ یہاں کئی سڑکوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڈ کے قریب بیہوش ہو گیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے چھینٹوں اور جوتوں سے تواضع کی۔ میری جان! یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ ——"

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے 'موذیل' کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے۔ وہ افسانہ میں نے تھوڑا ہی لکھا ہے۔ وہ تو موذیل نے لکھوایا تھا۔ بھئی مجھے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ تختہ دوات سنبھالتا ہوں تو کاغذ کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں، کیا لکھوں، کیا لکھوں۔ معاً ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں، یا پیشاب کرنے چلا جاتا ہوں، یا پان کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ واپس آکر "وہ" سے پوچھتا ہوں کہ بتا اب تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے۔ میں لکھتا جاتا ہوں۔ وہ جدھر جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ البتہ میں اسے کنکھیوں سے دیکھتا جاتا ہوں — کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس میں قابلِ غور کون سی باتیں ہیں۔ اُس کے سینے کا اُبھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اُس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل لوٹ کے تو نہیں لے جاتی — یہ مرحلہ میرے لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل لوٹنے پر آتی ہے تو خود لُٹتی بھی ہے یا نہیں۔ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصہ آتا ہے تو اُن تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ بھئی اب بتاؤ تمھاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے یا تم میں سے کس کو کیا کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمھیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی ہوتا ہے اُسے مار دیتا ہوں یا وہ سالا اور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے، میں اُسے مطلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موذیل کا پہلا فقرہ "ترلوچن نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا۔" میرا ہے اور پھر آخری فقرہ "تم جاؤ اپنے اس مذہب کو" میرا ہے۔ باقی سب کچھ موذیل کا ہے۔

پھر موذیل کے وجود پر بحث ہوگی۔ "بمبئی میں ایک یہودن تھی۔ بڑی بڑی رانوں والی، دھڑ کے عورت، وہ اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنتی تھی۔ افسانہ لکھتے وقت وہ دماغ میں اُبھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودی رہتی تھی اور اس کا نام موذیل تھا۔ اُدھر بڑی بڑی رانوں کا تصور ذہن میں اُبھرا۔ اُدھر موذیل کا نام، تو بس افسانہ ہو گیا۔ میرا اس میں کونسا کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موذیل کا ہے — آ —

ویسے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے۔ وہ بھی سُن لیجئے، مزے کی باتیں ہیں:

"اب آپ کو کیا بتاؤں کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ یہ بڑی اُلجھن کی بات ہے۔ اگر میں کسی طرح اُلجھن کو پیشِ نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کاغذ قلم پکڑتا ہوں اور بسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

میری تین بچیاں خود مچا رہی ہوتی ہیں، میں اُن سے باتیں بھی کرتا ہوں، اُن کی تمام باہم لڑائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لیے "سلاد" بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو اس کی خاطر داری بھی کرتا ہوں۔ مگر افسانہ لکھے جاتا ہوں۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا ——— میں افسانہ نہیں لکھتا، حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے بیس سے اُوپر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں، جس پر آئے دن مقدمے چلتے رہتے ہیں۔ جب قلم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرف سعادت حسن ہوتا ہوں، مجھے نہ اُردو آتی ہے نہ فارسی، نہ انگریزی، نہ فرانسیسی ——— بعض اوقات میں بیوی کے کہنے پر قلم یا پنسل اٹھاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اچھل کے باہر آجاتا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب کترا سمجھتا ہوں۔ جو اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے ——— مجھ ایسا بیوقوف دنیا میں کوئی اور ہوگا؟"

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی زبانی سنا ہوگا۔ میرے اور ان کے بیان میں بدیہی فرق یہ ہوگا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمدللہ کہ میرا لکھنے والوں میں شمار نہیں ورنہ میں بھی بعض "اولوالعزم" "ادبا و شعرا" کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہتا کہ فلاں کیا لکھتا ہے۔ فلاں کی زبان ٹھیک نہیں۔ فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے، فلاں جاہل ہے۔

ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کسی کے منہ لگے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔

میرا مجھلا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دوائی کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا، وہاں یہ پیغام ملا کہ ہاجرہ بھی آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھی نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سن لوں۔ پھر دوائی لے جاؤں گا۔

ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی برنبائے تکلف ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چائے پلاؤں گا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز نہ پیوں گی اور غضنفل کی چائے تو کبھی نہ پیوں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب تشریف لے آئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے آرانوی "ذرا ادھر آنا"

---

۵ پانچواں مقدمہ

میں ذرا اُدھر، منٹو صاحب ذرا اِدھر آئے اور ہمارا آمنا سامنا دفتر اور سڑک کے درمیان ہوا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ ذرا میرے ساتھ آؤ اور میری ضمانت دے دو۔ میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا، اُن میں سے کوئی نہیں ملا۔ (اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت یہاں مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر) ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ کل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ عذر کیا کہ میں تو گھر سے بھائی کی دوا لینے کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوال جڑ دیے۔ "آپ کا ذاتی مکان ہے؟ آپ کا بینک بیلنس تو اتنا ہوگا؟" جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے "آجاؤ ہو جائے گی ضمانت، آخر اتنے بڑے ادارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا؟"

ماجرہ بہن نے بھی لقمہ دیا: "چلے جائیے نا آخر ہرج ہی کیا ہے؟"

چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ذہن میں گھریلو پریشانیاں لیے منٹو صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے میں نصیر انور اور حنیف رامے موجود تھے۔ اب تانگہ انارکلی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ "کل جو تھانیدار میرے وارنٹ لے کر آیا تھا بڑا شریف آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھانے میں اپنے ایک ضمانتی سمیت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا۔" کبھی نصیر انور کہتے "منٹو صاحب آپ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں جن پر مقدمے کی نوبت آئے۔" کبھی میں کہتا کہ منٹو صاحب اگر آپ کو وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلوائیے ورنہ مجھے پریشان نہ کیجیے گا۔

جس وقت ہم نسبت روڈ سے میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا: "اگر اس وقت عقیل صاحب نہ ملتے تو بڑی مشکل ہوتی۔" اس پر نصیر انور نے کہا: "آپ کی مشکل تو حل ہو گئی، اب آپ عقیل صاحب کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔"

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا "نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ قصہ ختم ہو۔" اب تانگہ میکلوڈ روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف مڑا، یا آخر تانگہ ڈسٹرکٹ پولیس کے سامنے جا کر رکا۔ ہم نے دفتر میں جا کر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک ملنے والے مل گئے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں آیا ہوں تو انھوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہیر پھیر کریں کہ تھانیدار صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محض مروّت کی بنا پر آگیا۔ اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دل آزاری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ صاحب ضمانت ہو گئی۔ دوسرے لمحے منٹو صاحب نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں کراچی نہ جا سکوں گا اس لیے کہ صحت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھجوا دوں گا۔ اُن کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس لیے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے۔ حیرانی اس لیے بھی ہوئی کہ میں نے اُن کی صحت اُس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منٹو صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ غصہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہیے تھا۔ بہرحال اگر اس وقت مجھے اپنے اوپر غصہ آجاتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر تانگے پر پھر سوار ہوئے اور تانگے کا رُخ ہمارے دفتر کی طرف کرا دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امروز کا دفتر آیا تو تانگہ رُکوا دیا گیا۔ اُوپر پہنچے جس کسی نے سُنا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی ہے تو سب نے یہی کہا کہ منٹو صاحب وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت نہ ہوں گے۔ منٹو صاحب ان ریمارکس پر ہنستے رہے اور کہتے رہے "نہیں یار! کیوں نہ جاؤں گا۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے مجھے کہہ چکے تھے کہ نہیں جاؤں گا۔"

بالآخر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے منٹو صاحب سے کہا: "اگر میں کل صبح کے لیے دو سیٹیں بک کرا دوں۔ تو کیا آپ اور نصیر انور کراچی چلے جائیں گے؟" منٹو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدرے تکلف کے ساتھ قبول کر لیا۔ بعد ازاں منٹو صاحب سے گذارش کی گئی کہ آپ گھر تشریف لے جائیں۔ میں سیٹیں بک کرانے کا بندوبست کرتا ہوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پیدل آیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی۔ سائیکل پر سوار ہوا تو بھائی کی بیماری اور اسکی دوا پھر یاد آگئی۔ سائیکل کے پہیے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی گھومنے لگا۔

سیٹیں بک کرانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ریزرویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں۔ بادجود وقت یہ تھی کہ منٹو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری ظنی۔ چنانچہ شوکت تھانوی صاحب کے پاس ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ انھوں نے پہلے تو خوب سخت سُست کہا۔ لیکن پھر یہ انتظام کرا دیا کہ اگر ہم لوگ کل صبح سات بجے اسٹیشن پر پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے اس کی اطلاع منٹو صاحب کو دے دی اور ان کی بیگم اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انھیں صبح تک تیار کر دیجیے گا۔ تاکہ میری ذمہ داری ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھر والوں نے شکایت کی کہ بھائی اتنا بیمار ہے اور تمھیں دوا تک پہنچانے کی فرصت نہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ لیکن میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا بیتی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیماری کا خیال آتا رہا۔ کبھی منٹو صاحب کی کرم فرمائیوں کا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بجائے اختر شماری کے زخم شماری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ مشغلہ جاری رہا۔ صبح ۵ بجے گھر سے چل نکلا۔ گھر والے میری شب بیداری سے ہی کافی پریشان تھے۔ جب علی الصبح گھر سے نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لیے کہ میں سردیوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح ۹ بجے سے پہلے اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔

اُن کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ابھی آجاؤں گا اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھائی دروازے کے باہر پہنچا تو سوچا کہ تانگے میں بیٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ پھر خیال آیا میں بہت سویرے جا رہا ہوں۔ جلدی پہنچ گیا تو منٹو صاحب کو تکلیف ہو گی۔ اُدھر یہ بھی دھڑکا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں ذرا سی غلطی کی تو منٹو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بجائے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں کتوں نے بھی بھونک بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل و صورت کا انسان آج اِدھر کیسے ایک آدھ جگہ بجلی نے بھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا: "ہٹ جاؤ بابو جی!" اُس وقت بڑا جی چاہا کہ ذرا اس کے پاس رُکوں۔ اس کی خیریت اور

اس کے بال بچوں کا احوال پوچھوں۔ پھر نہ جانے ہمت کیوں نہ ہوئی۔ اس کے باوجود جب منٹو صاحب کے مکان پر پہنچا ہوں تو کافی سویرا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، منٹو صاحب کو جگایا تو منٹو صاحب آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور السلام علیکم سے استقبال کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی سی گرم چادر لپٹی ہوئی تھی، جیسے مفلر لپیٹا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ضمیر انور بھی آپہنچے۔ تانگہ منگوایا گیا۔ ان کی ہمشیرہ، بیگم اور بچیوں نے ہمیں وداع کیا اور خیریت سے واپسی کی دعا مانگی۔

اسٹیشن پر سیٹوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو منٹو صاحب نے شراب کی بوتلوں کو نکال کر ایسی جگہ رکھ دیا جہاں ہر آنے جانے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا، ایسا نہ کیجئے۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی کاپی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا پرمٹ ہے۔ یہ بات اُن کے منہ ہی میں تھی کہ گاڑی چل چھک چھک چھک چھک

دوسرے دن اخبار میں آیا کہ منٹو صاحب عدالت میں حاضر ہو گئے تو جان میں جان آئی۔

ایک وقت منٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے کہنے لگے "ارے بھئی سنو تنا تن تنا تن تنا تم" (پتہ نہیں کیا الا بلا) جو صاحب منٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں، وہ پریشان کہ ایک دم انھیں کیا ہو گیا۔ اِدھر سے استفسار ہوگا کیا سنیں۔ منٹو صاحب کہیں گے ریڈیو، ارے بھئی کہاں ہے؟ جواب ملے گا اِدھر آؤ اور میرے کانوں کے ساتھ اپنے کان لگا دو، آ رہی ہے نا آواز۔ واہ وا کیا گلا پایا ہے کمبخت نے پھر ہاتھ کے اشاروں سے سُر کے اتار چڑھاؤ کا ساتھ دیں گے۔ کبھی کبھی اُٹھ بیٹھیں گے، اور کبھی کھڑے کھڑے جھوم جائیں گے۔ ساتھ ہی تبصرہ بھی "ہائے ظالم نے مار ڈالا۔ یا "قیامت" نے مار ڈالا۔ واہ وا، شاباش، ہائے" اگر اس وقت شرارت سے کسی نے کہہ دیا کہ منٹو صاحب جو کچھ آپ سن رہے ہیں وہ ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں کاغذ پر لکھ کر بتاتے جائیے تو وہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیں گے کہ کانوں میں تیل ڈالا کرو اور سر کی مالش کرایا کرو۔ اور ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے دو تین پنجابی گیت لکھیں گے، پھر کہیں گے "اب اُردو کے گانے سنیئے" وہ بھی تین چار لکھ ڈالیں گے ——— یہ ریڈیو دو تین مہینے تک منٹو صاحب کے کانوں میں بجتا رہا۔ جیسے صرف ان کی اکیلی جان سُنتی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سُنا کر سناتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کے کان کے ریڈیو کے والو خراب ہو گئے اور ریڈیو بجنا بند ہو گیا۔

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ منٹو صاحب گا رہے ہیں۔ کبھی ہاتھوں کو کانوں تک لے جا رہے ہیں اور کبھی سُر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو نچا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر نہ رہ سکا تو آواز دی۔ اُن کا نوکر باہر آیا تو میں نے کہا "ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجئے" اُس نے جا کر منٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ منٹو صاحب نے جواب دیا ان سے جا کر کہہ دو اس وقت منٹو صاحب نہیں آ سکتے، گانا گا رہے ہیں۔"

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب آ کر عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "کون ہے؟" اچھا آپ ہیں بھئی معاف کرنا، میں اس وقت گا رہا تھا۔ آؤ تم بھی گانا سنو۔" میں نے پوچھا "اور کون کون ہے؟" کہنے لگے "کوئی نہیں ہے۔ گھر کے کچھ لوگ ہیں۔ آؤ آؤ۔ آؤ۔"

مقدموں کی بھرمار نے اب انھیں سنبھلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے نہیں سنبھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجموعی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بعد میں لکھتا ہوں

مقدمہ پہلے چل جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دور کہیں چلا جاؤں۔ وہاں بیٹھ کر خوب جی کھول کے افسانے لکھوں اشاعت کے لیے انھیں یہاں بھجوا دوں تاکہ سارے بلشر اندر ہو جائیں۔ اپنی تو جان چھوٹے۔ میں سفید کو سفید کہنے پر مجبور ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کہو۔ سیاہ کو سفید کہو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو کچھ نہ کہو چپ رہو۔ پھلا ہوا سیسہ نگل لو یا خودکشی کر لو ——— پھر مجھے جو سزائیں ملتی ہیں وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی ہیں۔ میں تو ایک ہی طرح کی سزائیں بھگت بھگت کے بور ہو چکا ہوں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ مملکت پاکستان میں مجھے اسلامی سزائیں ملتیں تاکہ ورائٹی ہی کی وجہ سے دل کو ڈھارس رہتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو تھا۔ انگریز بڑی سیانی قوم ہے۔ وہ یہاں سے اپنا جسم بچا کر لے گئی ہے لیکن اپنی روح چھوڑ گئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ہپ ٹلا (یہ اُن کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں جس میں صلاح اور مملکت کے تمام ناسوروں کو ایک ساتھ چھیڑ دوں۔ خوب خوب فشر زنی کروں۔ اس کے بعد بھرپور رنگ پاشی کروں۔ انجام کار اپنے آپ کو گولی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جب انھیں شبہ ہو جائے کہ مخاطب تو اہلِ زبان ہے، تو ان سے استفسار کریں گے۔

"آپ پنجابی سمجھتے ہیں نا؟" ظاہر ہے کہ مخاطب نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلائے گا اور اُردو میں جواب دے گا کہ بول نہیں پاتا، سمجھ تو لیتا ہوں۔

اس پر منٹو صاحب کہیں گے: "معاف کیجئے گا جب میں اُردو بولتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ پک گیا ہے یا پک رہا ہے۔ اُردو بولتے ہوئے میرے جبڑے دُکھنے لگتے ہیں۔ تالو اور زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چٹاپ چٹاپ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اسلیے میرے بھائی معاف کرنا، میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اُردو سے کوئی بَیر ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب لکھنا اُردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اُردو میں بھی باتیں کر کے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔"

منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پچھلی سیٹ پر دُور سے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے۔ جوتے سے رُخ ٹیک لگا کے لیٹا ہو، تو فوراً کوئی رائے قائم نہ کر لیجئے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کر لیجئے گا۔ بہت ممکن ہے وہ منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بوتل و ہم گلاس ساتھ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے اُن قدر دانوں سے کہتے جائیں گے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ چلا تو مجھے دُکھ ہوگا۔ اس لیے کہ میرے ذہن میں خواہ مخواہ یہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فرائض منصبی سے بھی بیگانہ ہو گئی ——— یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ بڑا ہی نفرت کا کلاس ہے ورنہ حکومت ضرور ایکشن لیتی۔

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے اُن میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے اُن پر غصہ آتا تھا، اب ترس آتا ہے۔ میں تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔

(۲)

عمر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا سا رسالہ نمبر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اور دوں

کے پاس بھی گئے ہوں گے میرے پاس بھی آئے، اور جو میری اور ان کی اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی، وہ مندرجہ ذیل ہے:

"یار منٹو نمبر نکالو!"

"جی!"

"میں کہتا ہوں نقوش کا منٹو نمبر نکالو!"

"آخر یہ آپ کیسی باتیں ——"

"تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں!"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا!"

"میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے!"

"مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی ——"

"اب بھی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں!"

"اچھا! یہ بتائیے، اس نمبر میں کیا کیا ہو گا؟"

"اب تک مجھے جتنی گالیاں ملی ہیں، وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہر حال تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر تمہیں میں مرتب کر دوں گا!"

"اگر آپ مرتب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟"

"تم جھک مارنا!"

"اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کریں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ لیں!"

"میں چاہتا ہوں، نقوش کا منٹو نمبر نکلے!"

"تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کر سکتا!"

"تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے!"

"قابلیت کو چھوڑیئے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے!"

"ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے!"

"اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے!"

"اچھا تو تم پھر جیسی میری ذلت بنانی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بنا ڈالو!"

منٹو کے انتقال کو ادیبوں نے ایک ادبی حادثہ قرار دیا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اس نے افسانوی ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اسے کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ مرنے اب نہ جب ۔

میں نے بھی دوسرے رسالوں کی طرح نقوش کا منٹو نمبر نکالا۔ جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر رسائل سے بہتر تسلیم

کیا گیا۔ اس میں مرحوم کی بیس تو غیر مطبوعہ کہانیاں تھیں دس نمائندہ افسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ ان پر لکھنے والوں میں ممتاز شیریں، احتشام حسین، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین تھے۔

شخصیت پر لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابوسعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور راقم الحروف تھے۔

منٹو نمبر پر تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔

جب میں نے منٹو نمبر کے لیے مضامین فراہم کرنے شروع کیے تو قدرت اللہ شہاب کو بھی دعوت دی۔ جسے انھوں نے منظور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "مضمون جلد بھیجوں گا اور وہ ایک خط کی صورت میں ہوگا جو منٹو آپ کو عالم بالا سے لکھیں گے۔" یہ خیال مجھے بہت پسند آیا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کی پوری شخصیت آسکتی تھی۔ اور وہ تمام مسائل بھی آسکتے تھے، جو منٹو سے متعلق ہو سکتے تھے۔

جب شہاب صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے، تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا۔ اُسے یہاں پیش کرتا ہوں۔ جو "منٹو کا ایک خط" کے نام سے منٹو نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کوشش کی تھی کہ منٹو کا اسلوب بھی آسکے۔ کامیابی خدا معلوم:

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمھیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے نیا تھا۔ بہرحال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے۔ جس میں میں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی ——— وہاں جب تک وہ سُولی پہ لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ صفیہ نے مجھے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ ابا فلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو۔ تمھیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا۔ تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا ——— حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے خوں میں گھٹتا رہا۔ نہ صرف گھٹتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔

یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو موت سے بھی بدتر تھی۔ جب بھی کوہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ جانے وہ کیوں تکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔ اس لیے کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی۔ تمہیں علم ہے اگر ہم لوگ ہی تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے۔ مزے میں ہے۔ اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح بھوکے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمہارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے سنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں، تو تمہارے ہاں کے بعض سر پھرے سر بازار پٹیں گے۔

بہر حال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا تمہیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اس پر تبصرہ کر دینا۔

تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف ہمیں خوش فہمی ہی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے۔ تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جانتا ہوں میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر قتل ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو وہاں کون سخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دور بھاگا ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان سے تماشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب بھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کے، اس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہو گا اور نہ وقعت کیساتھ

خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا اُس پر ایمان لانا پڑے گا۔[1]

یہاں شراب طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجئے شراب طہور نوش کیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اس جگر پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا، احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلہ تک نہیں ہے حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس جیب میں دھیلہ چھوڑ اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لیے کہتا ہوں کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں، وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بالکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُر وقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بجھ سی ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اُس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلے ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا چبھتی باتیں کہنے لگا۔ "تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے افسانوں کے عنوان چنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سوجھے تو میرے شعروں کو دھر گڑا اور محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی، اُس میں بجائے میری لشکر گذاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ الٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا، رنڈی باز تھا، جوا کھیلتا تھا اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی" وغیرہ وغیرہ۔

تمہیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہیں تو میں نے دل میں کہا۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری آتی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری آنا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے "میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا" اور میں اُس سے کہتا ہوں "شعر کہنا کوئی کمال ہے۔ مرزا صاحب میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔" بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

بچا سام کا مدیر تو تمہارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو۔

---

[1] نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں، مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے مگر یہی سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بھی سنی ہے کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب اُلّوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں ورنہ پچھتاؤ گے۔ حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں ان سے نمٹ ہی لونگا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمہارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لیے کہ جب تک میں وہاں تھا۔ سب مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آگیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں گھسنے تک نہیں دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں ایسا سلوک تھا۔ ان حالات میں تم سب کو اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیے۔

یہاں میرے کچھ قدردان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے دفتر یہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سرسری رپورٹ پیش کروں۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی ہیپ گلاد رپورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا، اس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دیتا تو میری زبان گدی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے ——— ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء

منٹو کا فن

وقار عظیم

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے ملعون کیا گیا ہے اور اس داد و تحسین اور مجرو تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط تفریط کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولین بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے بس حسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہیں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو نہ محض اچھا ہے اور نہ محض برا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دور رس اور دور بین نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں ـــــ کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت برے۔

ان اچھے، برے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت برے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے ـــــ کلرک، مزدور، طوائف، زہر خرابات اور زاہد پاکباز، کشمیر، ممبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چار خانے کے بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی کیفیتیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں بعض کو جوں میں آتے ہی کہ اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز آشکارا کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کوچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں ـــــ جہاں تک ان گوناگوں موضوعات

کا تعلق ہے اس کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے، بہت سوں کی بُرائی مول لی ہے اور بہت سوں کی گالیاں سنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انہی گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں، وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ کہا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطۂ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے ——— اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار، داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرض اوّلین جانتا ہے۔ ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انھیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقِ دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا اس لیے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو، اس کی روایت کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے اس لیے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں صنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزا اور عناصر ہیں اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ صنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات

اور اظہار و ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیشِ نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا تیکھا پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انہماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے اظہار کے وسائل کو نیا پن اور بلندی ملتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کا رنگ بھی پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا اس لیے کہ ان خاص کوشش نظر کے بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں انحطاط پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوبِ اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی ابھرتے اور اندھیرے میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈراما، داستان، کہانی ——— ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ اس قصے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص اندازِ فکر و نظر یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔ اس افسانے، ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور تصور کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی یہ امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے ——— ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو ایک ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں

کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انھیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں ——— یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں غلو بہت کم اس بڑے کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ ہمارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر یا ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے "نیا قانون" "خوشیا" "نعرہ" اور "نیا سال" پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجزیۂ حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں ——— یہ چیز "نیا قانون" "خوشیا" "نعرہ" اور "نیا سال" کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی بنگلگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ "منتر" اور "میرا" اور اس کا انتقام" اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ ہے ——— ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک ملا جلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔ اسی طرح "ہتک" ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر "ہتک" کی "سوگندی" کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر سوگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود "سوگندی" ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر خاک اگر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف "سوگندی" کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گذری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن

ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے، اپنے افسانہ کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکنے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کر دے، دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں جنھیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہموار اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔ منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور برے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لیے ہیں لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

"نیا قانون" اس طرح شروع ہوتا ہے:-

> "منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کتنے

کیا ہو رہا ہے استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"

اسی طرح "بلاؤز" کی تمہید یہ ہے:۔

"کچھ دنوں سے موسم بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچھ بڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے چلتے اتنی کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ بیسار درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے:۔

"گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے، بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بے سری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ سُر کی۔ بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔"

"میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بیچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے روئے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی بیٹھا ہوا سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا، دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گہرے رنگ کا قالین ہے جسے اُدھر سے اِدھر سمیٹا جا رہا ہے۔"

پہلی تمہید "شو شو" کی ہے اور دوسری "بانجھ" کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک فضا تیار کی ہے اور اس فضا میں دونوں مرقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے پڑھتا ہے۔

"چھاتا" کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے:۔

"گوپال کی ماں پر جب یہ بڑا پھوٹا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔"

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا ——— یہی افسانہ نگار کی جیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر سنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھئے:۔

"ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں وہسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وہسکی کے پیدا کردہ نکھار کو دور کر سکے۔"

یہ تمہید "پہچان" کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے، نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے بلکہ ٹرے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ اگر تم بھی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ ——— اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سنئے:۔

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

یہ "نعرہ" کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر بیٹھی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔"

یہ تمہید "ہتک" کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی نشانے کیے ہیں، اس لیے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا ٹیڑھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان ٹیڑھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ ہتک اور کسر جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے چل کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے مجاہد میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے

انہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے کردار کو متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھڑکتی ہوئی تصویر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید اپنے ذمے لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کرے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کرے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کرے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جماتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں طے کرنے اور پھیلنے والے کانٹوں کی خلش کو گوارا اور آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو مجموعی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالفرض معمولی سی غفلت اور تھکن اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہے ——— منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:۔

"استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے ——— راستے میں اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون 'نیا قانون' چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون 'نیا قانون' کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پرانا"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا ———"

"پھاٹا" کا انجام یہ ہے:۔

"نرملا بڑے انہماک سے پھاٹا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑی نفیس کام

لے رہی تھیں۔ پھاٹک کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا ریم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کولہے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نکلی پر سان کا چھوٹا سا مکمل بلبلا اٹکا ہوا ہے۔
نرملا نے لحاظ پر پھونک ماری اور اس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔

"شہ نشین" کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔
"وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "تجھے زندہ رہنا ہوگا۔"
اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس نکلی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔"

"ہتک" کی ہیروئن سوگندھی ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے:۔
بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل بہلانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

"..... اس کے حلق سے ایک نعرہ..... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا ——— ہت تیری.....!
جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی کہا: "چلا ہے۔"
(نعرہ)

"..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا ——— سیوا جی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔"
(ہیرا اور اس کا انتقام)

"اس واقعہ کو ایک زمانہ گذر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں ——— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر اٹکا رہے گا۔"

(نامکمل تحریر)

"جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔" میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگم کی یادگار!

"ان کو نکالنا نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔" میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔"

(بیگو)

"وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا ——— سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے ....."

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجتمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم ہوتا رہا تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انھیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

"نیا قانون" کے خاتمہ میں استاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ "پھاہا" کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا امید حاسادا اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ "شہ نشین پر" کا انجام جذباتی کھنچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فن کارانہ حل کی تصویر ہے۔ "ہتک" کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے

ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندی کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "بیگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گذار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ "نامکمل تحریر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابلِ فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سجدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتِ بیان اور اس کے اندازِ فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگی بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں، افسانہ اتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے ——— بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عنان و ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام ——— ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے کسی غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ مثلاً کہ

فن کے اس مراحل کا پورا احساس ہے اس لیے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ شروع ہو کر بڑی دھیمی لیکن نپی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اور نپی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے ——— ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جہاں اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوشگوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنھوں نے دی ہے انھوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلائی پر ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔ منٹو کے نزدیک فن کے اس مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجیے۔

'نیا قانون' کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصوں کو اس طرح برتنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے حد درجہ کرب انگیز بن جائے، منٹو کے فنی احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا مظہر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوئی تھی اس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی تاریخ تک منٹو نے کئی ایسے موقعے پیدا کیے جن میں منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسرت آہستہ آہستہ وارفتگی اور دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ روز سعید آ پہنچتا ہے تو اس کی مسرت، وارفتگی اور دیوانگی شوق آزادی کو مجسم دیکھنے کے لیے بیتاب نظر آنے لگتی ہے اور عین اس وقت جب اس وارفتگی شوق کو بظاہر اپنی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اسے حوالات میں داخل ہونا پڑتا ہے ——— اور اس طرح منگو خاں کے جذبات و احساسات کے جو متعدد نازک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرق تعجب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی ٹیس چھوڑ جاتا ہے کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود حد درجہ چونکا دینے والی ہے۔

'نیا قانون' منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی

اتار چڑھاؤ، یہ نازک اونچ نیچ اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ سالار خور سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو فن کے نقطۂ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔ اس اندازے کے لیے منٹو کی چند اور کہانیوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالیے۔

"ممتز" اور "میرا" اور اس کا انتقام" موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انھیں پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ اس نے ایک ہلکی پھلکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں سب پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوتی ہیں۔

"پھاہا" "بلاؤز" اور "کالی شلوار" ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنھیں منٹو کے محبوب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے قریبی تعلق نے منٹو کو اردو کلسب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ "پھاہا" اور "بلاؤز" میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی فضا تیار کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انہماک کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انہماک اور غور و فکر نے دو سیدھے سادے افسانوں کو ایک علمی حیثیت دے دی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت "کالی شلوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ و پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ کالی شلوار طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف حصوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منٹو

کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، ان واقعات کے بیچ اور الجھاؤ، اس اتار چڑھاؤ، بیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطۂ عروج اور اس کا خاتمہ، ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے وہ سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزا و عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لیے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتے اور استعمال کیے ہیں جنھیں ہم اس کے اسلوبِ نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار و ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنھیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو، اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا انکار میں سے کون سا حربہ زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور انہی صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور موثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی

گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہے نہ عمیق منٹو کے انداز اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔
بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

۱۔ سب سے پہلی مثال "نیا قانون" کی ہے۔ استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے بیقرار ہے اتنے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے۔ منگو بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:
"ماتھا لا ادھر! ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔"

۲۔ "پہچان" میں بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے ——— "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں ——— آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔"

۳۔ "پہچان" ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے ——— "موٹیاں اس کے ہاتھوں سے کچھ فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ موٹیاں اس کے آنسو ہیں۔"

۴۔ "پہچان" میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مگر مچھ کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پوری تول نہیں تولے گی۔"

۵۔ "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے ——— "شوشو..... شوشو..... ارے یہ کیا؟ وہ تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔"

۶۔ "شوشو" ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے: "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔"

۷۔ "خوشیا" میں گانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔"

۸۔ "آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔" (بانجھ)

۹۔ "..... محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔" (بانجھ)

۱۰۔ "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے۔" (نعرہ)

۱۱۔ "جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر بڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔" (بلاؤز)

۱۲۔ "نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں۔" (اس کا پتی)

۱۳۔ "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی ٹنگی ہوئی ہے ——— اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا بس ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔" (ٹنک)

۱۴۔ "فضا میں نیند بوجھل ہوتی تھی، ایسی نیند جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔" (دھواں)

۱۵۔ "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی ——— میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اُلجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے سُلجھا رہا ہوں۔"

۱۶۔ "اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔" (نیا سال)

۱۷۔ "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر ماسٹر ٹارزن تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔" (قبض)

۱۸۔ "زندگی کیا ہے؟ ——— میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اُونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔" (ایصری کی ٹوپی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے اندازِ بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبر ۱ میں منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی عورتیں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور گنجے نتھو کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو کہتے ہیں کہ "آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔" تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے اس لیے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے۔ بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ روٹیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اکثر لکھنے والوں کو بحرِ فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہر آبدار نکالنے کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبے کے اظہار کے لیے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جملے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرتِ بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ——— ادنیٰ اس لیے کہ یہ کرشمہ کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبۂ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آ جاتی ہے۔ منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ عمومیت سے بچایا اور سادگیٔ بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۵ تاثر انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے کم ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پرنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے بھی منٹو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی ندرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی زندگی کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ مجسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ بانجھ اور استاد کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لیے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا استاد ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور تکدر کی ایک ہلکی سی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لیے وہ ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے لیکن منٹو کی جادو بیانی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والے کے لیے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دیے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے ——— یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے لے کر پندرھویں مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ لفظوں سے کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتیں جہاں منٹو نے انھیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت کم ملی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے ——— دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور بآواز بلند کہتی ہے کہ دیکھو میں یہ ہوں اسے مجھے اچھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے ناقابل فراموش بن جاتی ہے۔

سولھویں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سنا کر فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے آئینہ کی طرح روشن اور سورج کی طرح تاباں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے یہیں ایک خبر دے کر سنائی کہ محبت

ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لیے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور ہنسی کی ایک بات معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ کوئی سننے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح اس کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں یہاں بھی سادگی بیان اور اہم ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کارفرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج ہے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنا دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور مؤثر ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حقیقت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور مؤثر سے مؤثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ وہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر جیسے نکھار اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے نرکش فن کے بڑے صید افگن تیر ہیں ——— ایسے تیروں کی منٹو کے نرکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے:-

"ان کے لال بھبھوکا چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔"

(دنیا قانون)

منٹو کے دل میں یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں، کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں۔ اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے ——— اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے ——— وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے ——— استاد منگو کی زبان سے ناروا حاکموں کو غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے مکھی کہلوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرتے ہیں کہ "دنیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا" منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب ہستا و منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایک معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی تباین نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن منٹو کا دُور رس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

"وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔"
(ایچاں)

"اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔"
(شوشو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانتا برہنہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ "کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے"۔ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے:۔

"خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے۔"
(خوشیا)

"بانجھ" میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:۔

"کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سنتے کے دوران کسی نے زور سے ہوں کی ہے۔"

تشبیہ بھی غیر معمولی نہ سہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

"گالی ——— یوں بجھے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا۔"
(نعرہ)

"بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے تھوک دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں۔"
(نعرہ)

"دو گالیاں جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر پھینک دیے ہیں۔" (نعرہ)

دو گالیاں ——— اس کے جی میں آئی کہ اپنے بیٹھنے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیسے گھٹنے ہی نہ لگے باہر نکال لے۔" (نعرہ)

ایک گالی یا دو گالیاں ——— میرے اور آپ کے لیے دو ٹھنی سُنائی ہے حقیقت باتیں ہیں جنھیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سُنتا ہے لیکن کیشو لال کے دل پر ان گالیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی تناسب نہیں لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام لیا ہے اس سے عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوتی ہے اسطیت میں گہرائی آتی ہے۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چند اور تصویریں دیکھیے پہلی دو تصویریں 'دھواں' کی ہیں:-

"موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو رجڑکے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔" (دھواں)

"ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم گھٹ کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح ہٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔" (مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے:-

"یہ اشوک کا بھی عجیب چیز ہے پورے پرشش کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکس بنی رہا ہے۔" (سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سُنایا گیا ہو۔" (سجدہ)

"وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔" (سجدہ)

"اس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔" (سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا ——— جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدمقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔" (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ نیکھا اور ہر نقش واضح ہے۔ منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابک دستی اس طرح بروئے استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، تصور اور تشبیہوں کو کیساں اہمیت ہے، مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل ہے ——— اور وہ ہے تکرار۔

تکرار، مشرقی اسلوب اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے لیکن اردو اور خاص طور پر عورتوں کی زبان میں تکرار کو ایک لفظی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترنم اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترنم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقروں کی تکرار خاصی عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے خوشیا، نعرہ، بلاؤز، ہتک، نیا قانون اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں آنو کا پٹھا اور قبض اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

دونوں افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ اس تکرار سے منٹو نے کیا کیا کام لیے ہیں۔

'نعرہ' میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالاخانے سے نیچے اترا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں:۔

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

اس لیے کہ وہ مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔ ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سنئے:۔

"..... مالک مکان نے غصے میں آ کر اسے گالی دی ——— گالی..... یوں لگنے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو بڑھ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا....."

"اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے بھرے ہوئے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے....."

"سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی ——— اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے....."

"ایک نہیں دو گالیاں ——— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔"

"چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے، چاؤں کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے..... گالی..... گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے بھڑ بیری کے کانٹوں میں کوئی پڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔"

"سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا ——— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو ——— پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔"

"جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں نگل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔"

"گالیاں ——— گالیاں ——— کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو نہروں کو جو کسی میلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور پھر کوئی

بھی اس کے سامنے آتے اس کے سر پر دے مارے۔"

"اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ناری صورت میں گندھ گئے ——— دو مہینے کا کرایہ، اس کا پھٹکی بنک میں درخواست لے کر جانا ——— سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، میٹھی کی بھدی آواز، اس کے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور ..... یہ موٹی گالی .... پھر دوسری ..... اور اس کی خاموشی ..... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں سرخ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔"

"نعرہ" میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ "پگلا ہے" ——— منٹو اپنے فن میں افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے نقطۂ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ "نعرہ" میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔ تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطۂ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

"بلاؤز" شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن کو:

"شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آ گیا ..... یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی بغلوں میں جما جائیں۔"

مومن کے دل میں اس کے بعد وقتاً فوقتاً خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے نئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو .....

"روئی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا چندنا آ گیا اور چندنا خود آ ہی ان

کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔"

اور پھر کوہ صاف کرتے ہوئے اس نے ساٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور گھنٹے دن لیوں ہی الگ بیٹھ کر اس کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے.....

"حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا۔ مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا.....؟"

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا تو.....

"..... اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔"

اور بالآخر ایک رات کو.....

"..... جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھاڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا۔ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبار سے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہو گئے۔ بہت اونچے جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آ گئی اور مومن کی روئی گچھی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا۔ پھندنے کی تلاش میں وہ۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا۔ ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔"

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقاء، اس کے نقطۂ اوج اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ نعرہ اور جلوس کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے ہٹک، خوشیا، کوکا پٹھا اور قبض جیسے افسانوں میں

بھی اجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے تکرار کی طرح "تضاد" کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے ——— ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف طبقوں میں اونچ نیچ اور معاشرتی اور معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق و مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا ہو اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب ادا سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزا مل جل کر ایک ندرت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

پہلا اقتباس "نعرہ" کا ہے جس میں کیشو لال کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اونچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے:۔

> "اس گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھڑکیوں پر لٹک کر پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے جو دیوار میں کٹی چمک رہی تھیں۔"

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل "بلاؤز" میں اس طرح دکھائی دیتی ہے:۔

> "..... نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

دو کردار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں اس کا اظہار "جنگ" میں کئی جگہ دھو اور سوگندی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کی تصویروں میں سے ایک یہ ہے:۔

> "ایک ہاتھ سے سوگندی نے چکری والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندی کے ہاتھ میں تھا۔
>
> زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دونوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا "اچھا کیا ——— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُر فریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے ——— اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھئے :۔

"..... مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے جھکا تو سوگندی کی گرج سنائی دی "خبردار ——— پڑی رہنے دے وہیں ——— تو جا تیرے گھر پہنچتے ہی میں اس کو نئی آرڈر کر دوں گا۔"

سوگندی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ آکر جمع ہو گئے ہیں ——— ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تصادم بن کر رونما ہوا ہے۔

'جنگ' کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فن کارانہ تصویر ہے :۔

"بہت دیر تک وہ بیدی کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پر جمانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور اس کو کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری منطقی اور معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بہت سی مثالیں پیش کی گئیں ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں ——— مثلاً 'نمرود' کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے ماسٹر نارنگ ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جنھیں ہم تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں ——— فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے چنانچہ اس خاص نقطۂ نظر سے منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نقوش کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات کو زیادہ

اہمیت دی ہے جنھیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ موضوع کی طرح بیان و اظہارِ خیال کے معاملہ میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انھیں معمولی رنگوں سے شوخ اور نکھیا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھیے:۔

"مار واڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے نارکلی میں دینو حلوائی کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو مسنہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "بہت تیری ایسی کی تیسی"۔"

یہ استاد منگو ہیں "نیا قانون" میں ——— اسی افسانے میں انھی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں:۔

"چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گورے پر بیٹھ گیا۔"

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:۔

"صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں جلاد کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو زخم ہی لکیر تک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔"

انھی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ "پہچان" میں گوپال کے پتاجی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:۔

"اس کو اپنے پتاجی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی ..... اس کے پتاجی اور شرما جی تھانے دار منگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔"

"پہچان" میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:۔

"کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر پیلی سی چادر

بچھی ہوئی تھی تکیے بھی پڑا تھا جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا حقہ تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔"

"کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرتِ استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور چھوٹے نکل آئے تھے کالر کھلا تھا اور قمیص میں ایک اور دھلائی کی مار تھی۔" (بانجھ)

"باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو موسن کے ننگے پیروں کی لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔" (بلاؤز)

"وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس پڑ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ داہنی بازو کی بغلوں میں گھنے اور گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار ہونٹوں کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے بھنی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔" (ہتک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی مصوری کرتے، کسی ماحول یا فضا کا کوئی تاثر قائم کرتے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بتانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو فن کار تھا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی ——— دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں بھی معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں، بشرطیکہ فن کار انھیں صحیح انداز سے اور برمحل برتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت منٹو میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انھیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انھیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو جن میں افسانے کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوبِ نگارش کی ساری خصوصیتیں

شامل ہیں یعنی تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور انداز نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے ——— ان سب باتوں میں اس کے حدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین اور تجربہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی ادارے یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بنائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حد اہم کام کا بیڑا اٹھانا بجائے خود ایک مہم ہے لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص نظر نے انھیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے انھیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں ——— ہر ناانصافی کرنے والا، سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے فریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو سر اکرتا ہے اس لیے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہیے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرأت اور یہ روانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے ——— اچھا بھی اور برا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے انھیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے کہ چوٹ کھانے والا تلملا کر رہ جائے انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور برا اس طرح کہ حیات انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے اسرار کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ——— اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس بڑے پہلو کا ایک اچھا پہلو بھی ہے اور اس کی تاویل یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا، اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ

کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنھوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کیے ہیں، سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار، کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جرأت مندی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لیے فتح کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹکر اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آپ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آتی ہے اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور بھی نمایاں ہوتی ہے ——— لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ ہی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلک نمایاں ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مہینوں کچھ نہیں لکھا۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا مثلاً منٹو کے مجموعہ "ٹھنڈا گوشت" کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۲۳ اور ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ باو شاہت کا خاتمہ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون ۱۹۵۰ء اور ۴ اپریل ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح نمرود (مجموعہ) کے سب افسانے ۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت ہیں منٹو کی اس نجی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر یہ باتیں محسوس کرتا ہے ——— ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنھیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا بجا منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی، ان کی شوخی طبع، ان کی گہری فکر اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منٹو کی تاریخ الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے ——— بہت اچھے اور برے سب افسانے ——— دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت

سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کیا کیا کمزوریاں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان کمزوریوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے ——— لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بظاہر بہت معمولی معلوم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرتا جاتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں اتنا ہی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہم راز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتلانے میں بھی تامل نہیں کرے گا وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے کہانی کہنے والے کی بڑی جیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں رہا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح بتانے کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو اس کے پر فریب تخیل کو اس کی ذہانت کی خوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو سچ مچ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا افسانہ "جیب دان" ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزا پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے کے احساسات میں تعلق اور رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے اس کا اندازہ "پھندنے" جیسے افسانے سے ہوتا ہے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کی آوازیں "نارہ پھر جیت خداوندی کے لیے" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا کتا "پھر" "نکی" اور "والد صاحب" جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح "عجیب و غریب" "نادل" "ظاہر" "خیال" افسانوں میں جگہ جگہ اور منٹو کی جادو بیانی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل ہو سکتا ہے۔ "یہ پیر" "صاحب کرامات" "بادشاہت کا خاتمہ" "کتے کی دعا" "عزت کے لیے" جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے منٹو اپنے ہی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ کیسے کس طرح مجبور مقدمہ کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ منٹو کہانی کہنا جانتا تھا اور اپنی اور دوست کی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دور انحطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا اسی لیے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو مل جل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور افادیت اور عظمت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر جھوٹ دینے والی باتیں لکھتے اور لکھنے پر اصرار کرتا وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہریلے ہوتے تیروں کی طرح برستے اور دوسروں کو چھلنی کر دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے پرہیز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فن کار ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا ——— اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند گنے چنے

کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت ہی غیر معمولی توانائی ——— وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی ——— مٹ مر گیا ——— لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

غالب

(۱)

بنام چودھری عبدالغفور صاحب سرور

جناب چودھری صاحب،

میں تو خدمت بجا لایا۔ مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آرہ میں مولوی سید فرزند احمد کے مکان کا پتہ مجھے لکھ بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت لکھوں۔ دوسرے یہ کہ تمہارا خط مجھ کو واپس بھیجتا ہوں۔ حضرت صاحب کی دعائی جہات اور حرف۔ حرف

---

۱ غالب کے قدر دانوں میں کون ہے جس نے غالب کے خطوط پڑھے ہوں اور وہ چودھری عبدالغفور سرور سے ناواقف ہو۔ چودھری صاحب امروہہ ضلع ایٹہ کے رؤسا میں تھے۔ اور ان کا خاندان کئی صدیوں سے وہاں آباد ہے۔ غالب کے معزز ترین دوستوں میں تھے اور ان کا شمار ان کے مایۂ ناز شاگردوں میں ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اشعار بہت کم ملتے ہیں۔ غالب کا یہ نادر تحفہ راقم نے ان کے خاندان کے ہمزہ سے حاصل کیا ہے (عماد الدین احمد)۔ ۲ سرور نے ۳۰ شعروں کا ایک اردو قصیدہ اور ۹ قطعات اصلاح کے لیے میرزا کے پاس بھیجے تھے۔ یہ قلعہ کا عہد جس پر سرور نے اپنے ہاتھ سے اشعار لکھے ہیں اور جو غالب کی اصلاح سے مزین ہیں تعلق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ قصیدے کے گیارہ اشعار پر غالب کی اصلاح ہے۔ بعض قطعات پر غالب نے خاص توجہ کی ہے۔ ایک قطعہ انہیں پسند نہ آیا تو سرور کے قطعات اور وہ لکھ کر اسے قلم زد کر دیا ہے۔ خدمت سے مراد اپنی شعروں کی اصلاح ہے۔ ۳ صفیر بلگرامی (۱۲۲۱ھ۔ ۱۲۸۰ھ) حضرت صاحب عالم کے نواسے اور میرزا غالب کے شاگرد۔ ان دونوں کے تعلقات کی داستان دیکھنی ہو تو احوال غالب ملاحظہ فرمایئے۔ ۴ صفیر بلگرامی کے گھر میں ۱۲۸۲ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا جسے سرور نے اسی سلسلے میں تہنیت کے قطعات لکھے ہیں اور اب غالب حکیم کو مبارکباد کا خط لکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ان کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔ قیاس ہے کہ غالب نے تہنیت کا خط ضرور لکھا ہوگا لیکن یہ خط بھی ان کے ہزاروں خطوں کی طرح اب تک نامعلوم ہے۔ یہ صاحب نادر سے غالباً سید نور احمد ہیں جو گاہے گاہے ملنے کرتے تھے۔ ان کا ذکر مرثیہ فیض صفحہ ۱۰ (تذکرۂ شاگردان صفیر: اللہ تذکرۂ یادگار حکیم) میں موجود ہے۔ موصوف کی ان کی تصویر بھی چھپی ہے جو راقم نے اور دو شعرا کی تصاویر کے ساتھ رسالہ آج کل دہلی دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع کر دی ہے۔ ۵ مراد صاحب عالم مارہروی (۱۲۱۱۔ ۱۲۸۸ھ) جن کے خطوط سے غالب کی جشن نکالیت دہلی کی ان سے بڑھے نہیں جاتے۔ سرور ہی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

حضرت کی تحریر کا ایک لفظ بھی اگر پڑھا جائے تو دیدے پھر میں ایسا نصیب نہ ہو۔ خط بہت تھوڑا آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ حرف حرف اس کی نقل کر کے پھر مجھے بھیج دیجئے تاکہ جواب لکھنے میں سعادت حاصل کروں۔ (عماد الدین احمد)

اپنے ہاتھ سے لکھو اور مجھ کو بھیجو کہ میں ان کو ہفتیت میں خط لکھوں۔ واللہ ہرگز مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ تشویش و تشویر میں ہوں کیا کروں۔ تم یہ بوجھ مجھ پہ سے اٹھالو۔ تیری بات یہ کہ یہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب جلد آئے۔

غالب۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۹ء

۲

۲ مارچ ۱۸۶۷ء

اے میری جان!

کس وقت مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے لکھ دینے کے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا حال اب میں کو دریافت کرنا ہو وہ اہل محلہ سے دریافت کرے۔ تمہاری خاطر عزیز ہے۔ نظم کی بارے نفس ناطقہ نے بڑی بھلی طرح مدد دی۔ نثر پہنچتے ہیں۔ لیکن نہ شاعرانہ نہ عارفانہ۔

غزل

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہو کے صیاد دیدہ ہوں

ہوں درد مند، جبر ہو یا اختیار ہو
گو نالہ کشیدہ کہ اشک چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں

نہ مجھ سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نہ دانہ فتادہ ہوں نہ دام چیدہ ہوں

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اول خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے، کہ مردم گزیدہ ہوں

(۳)

بنام جناب ذکی دہلوی مرحوم

بندہ پرور!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ از روئے شرافت نسبی و لیاقت حسبی آفتاب و ماہتاب ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے۔ اس

لہ یہ خط نواب امین الدین احمد خاں بہادر والئی لوہارو کے نام ہے۔ اس کے شروع میں درج ہے اس خط میں جو غزل ہے وہ شائع شدہ ہے۔ خط سے معلوم ہوگیا کہ یہ غزل کب لکھی گئی تھی۔ (مالک رام)

عربی علم و فضل میں وہ پایۂ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسرے کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے مثنوی کے اشعار میں نے دیکھے اور پسند کیے بطریق سہل تقطیع کیے ہیں۔ اردو فصیح، جامع سلیس، الفاظ نہایت پسندیدہ و متین، صرف صرف شستہ و رفتہ جو خوبیاں نظم میں چاہئیں وہ سب موجود۔ غیر کی مدح میں اتنا مبالغہ کیوں کیا۔ میں تو کلیم سخن کا گرائے خاک نشین ہوں شہنشاہ کہاں سے ہو گیا۔ خیر آپ کی ارادت میرے لیے موجب سعادت ہے۔ جو صاحب شعر ہیں خود ستائی کو برا جانتے ہیں کیا انھوں نے بجز زلفاء مالا بجز زلیخا نہیں سنا ہے یا اساتذہ مستند الکمال کا تحریر کلام ان کی نظر سے نہیں گزرا؟ ——— اللہ اللہ اس امر خاص میں کیا کیا بلند پروازی اور اپنے کلام کی کیسے کیسے مدح طرازی کی ہے شیدائے مالیری کہتا ہے ؎

چیست دانے بادۂ گلگوں مصفا جو ہرے
عشق ما پرورد گارے عشق ما پیغمبرے

میں شعر میں تمین شاعروں کے بسبیل نمونہ یہاں لکھتا ہوں باقی نادرہ کلام اپنی سخن پر حوالے کرتا ہوں ایک شاعر کہتا ہے ؎

بہ اقلیم معنے رسول اعظم
سنائی و فردوسی از آستانم

دوسرا اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے ؎

بہ ملک سخن آں خدائے قدیم
کہ معنی بیکے باشد از بندگانم

تیسرا کچھ اور ہی راگ گاتا ہے ؎

حوض کوثر کہ مشرب اردست
نادرانے ز بادہ گیر خست

نادران یعنی موری اور پاگلیں اوس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مویشی اور حمام وغیرہ کا پانی جمع رہتا ہے۔ خدوند بالله من شطیات الشعراء میر صاحب میں بہت بڑھا ہوا ہوں اس پر امراض متضادہ مرسنہ میں گرفتار۔ قوی بالکل مضمحل اتنا لکھنا بھی مناسب مشکل اپنا اگر تحریر جواب میں تاخیر ہو جائے معاف رہوں۔ والسلام مع الوفا الاحترام! فقط!

دعائے خیر کا طالب فقیر غالب ۱۲ جنوری ۱۸۶۸ء

بروز چہار شنبہ

---

(۴)

نام نواب امین الدین احمد خاں

بھائی سے دو سوال ہیں ایک تو یہ کہ محمود نگر کے خاتمے کو کیا کروں۔ وہ معنی تھا اس حقیقت پر کہ نواب کشور، نواب ضیاء الدین خاں

لہ نواب امین الدین احمد خاں، نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد لوہارو کے رئیس قرار پائے۔ ۱۸۷۰ء سے اپنی وفات

سے واسطے انطباع کے لے گیا۔ جب یہ واقع نہ ہوا تو اب اس کو نکال، اول الدا اس کی جو کوئی نثر ہیں اور ہیں وہ لکھ دوں۔
اور باقی اشعار مرحومی زین العابدین خاں مستشار ہیں۔ اس واسطے کہ تم اپنے ان کے مجموعے کی تصحیح اس سے کرو۔ پھر یہ امر حاصل ہوا
یا ہونے والا ہے۔
ترجمہ ابی الفدا کی جلد واپس پہنچتی ہے۔

جواب کا طالب۔ غالب

---

(۵)

بنام عزیز اللہ شاہ عزیز[1] مصفی پوری

خان صاحب عنایت مظہر سلامت!

آپ کا عرائض نامہ آیا۔ اور باقی تحریر[2] نظر فروز ہوئی خوشامد ضمیر کا شیوہ نہیں۔ نگارش تمہاری بیخ و بنیاد سابق کی تحریر سے لطافت و صفا بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نازک اور الفاظ آب دار کہاں؟ مگر ایک امر سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ضرور کی نہیں

بقیہ حاشیہ:- ۱۲۰۹ھ تک نواب کی جاگیر کا انتظام انہی کے ہاتھ رہا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں ان کے بھائی تھے اور جائداد میں شریک لیکن انہیں امور ریاست سے کچھ تعلق نہ تھا۔ امین الدین کے انتقال کے بعد نواب علاء الدین احمد خاں علائی ان کے جانشین ہوئے۔ ان سب لوگوں سے غالب کے گہرے تعلقات تھے۔ اس خط میں مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔ لیکن قریب یقین ہے کہ مرزا نے یہ خط نواب امین الدین احمد خاں کو لکھا ہے۔ اس پر تاریخ درج نہیں۔ ناظم کے خیال میں اس کا زمانہ تحریر ۱۲۰۰ھ (مطابق ۱۷۸۴-۱۷۸۵ء) مختار الدین احمد [1] ۱۲۰۰ھ میں منشی نول کشور دہلی آئے اور مرزا سے ملے انہوں نے مجلات نثر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا نے نواب ضیاء الدین خاں سے مشورہ لے کر منشی صاحب کے حوالے کیا۔ چھپنے میں تعویق ہوئی تو مرزا مایوس ہوئے اور انہوں نے یہ خط لکھا۔ بالآخر مجلات چار سال کے بعد ۱۲۰۴ھ میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا۔ یہ اڈیشن اب دست یاب ہے۔

[1] زین العابدین خاں عارف، مرزا کی سالی کے بیٹے جنہیں غالب اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے پھر مرزا سے اصلاح لینے لگے۔ دیوان اردو کے کئی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں۔ [2] غالباً تاریخ عالم مصنف الفنا کا وہ ترجمہ مراد ہے جو مولوی کریم الدین دہلوی نے کیا تھا۔ اور مطبع العلوم دہلی سے ۱۲۴۰ھ میں شائع ہوا تھا (مختار الدین احمد) [1] عزیز مصفی پوری ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہیں عربی و فارسی کی تحصیل کی غدر کے ہنگامے ہوئے تو لکھنؤ چھوڑ کر مصفی پور (اناؤ) اپنی ننھیال چلے گئے اور وہیں انہوں نے اپنی پوری عمر گزار دی۔
تصانیف کی تعداد چالیس سے کم نہیں جن میں دیوان اردو، زرد و زیبت، ختم فکر، کلام نظم فارسی، ارمغان، پیش کش شاہ جہاں، بیخ و بنیاد، ترجمہ شہنامہ، جواب مظلوم اور مخزن فتح مبین (جواب شاہ نامہ) قابل ذکر ہیں۔ عزیز کا انتقال ۲ جولائی ۱۹۲۰ء کو ہوا۔
یہ دونوں رقعے غالب کے مفقودات کے کسی مجموعے میں اب تک شائع نہیں ہوئے (مختار الدین احمد)
[1] شاہ صاحب کی فارسی نثر کا مختصر سا مجموعہ جو چھپ بھی گیا ہے۔

ہے۔ ارادت خاں متخلص بہ واضح عالم گیری سرداروں میں سے ایک شخص تھا۔ مینا بازار[1] اور بیخ رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ قوالی کرات کی طرز ایجاد کی بھی اس کی ہے۔ موہوم سے مقطع بہتر نکلا۔ یعنی تم نے خوب لکھا ہے ؎

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

جہاں آپ نے فقیر کا اصلاح لکھا ہے، وہاں آپ بہ عرف میرے صرف ہوتے ہیں[2]۔ متوقع ہوں کہ یا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو۔

نجات کا طالب۔ غالب

---

(۶)

بنام عزیز اللہ شاہ عزیز صفی پوری

سخن شناس و مشفقا، خدا ایں جاست۔ یہ جملہ کیا میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو موجب ملال خاطر کیوں ہوا اور اس سے یہ مفہوم کیوں کر پیدا ہوا کہ میں تمہارے کلام کو اصلاح نہ دوں گا۔ تمہیں عذر کرو کہ شعر کا علاقہ تخلص سے ہے یا نام سے ..... عرف سے۔ میں نے تو اصلاح دی تم نے کیا مانا، ذہن تمہارا معوج ہے اکثر کجی کی طرف جاتا ہے۔ تمہاری اس نثر میں تک و اصلاح کی گنجائش نہیں۔ بیخ رقعہ سابق سے مقطع و مشاعرہ کی عبارت بہتر ہے۔ اس قول کو یاد نہ کرو گے تو مضار اس کا وہی احوجاج ہوگا جس سے سوء ظن۔

نجات دہندہ۔ غالب

---

(۷)

بنام نامعلوم[3]

بندہ پرور!

آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کر دی اور صبح کو آپ کا کمار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام کا مجھ کو دے گیا۔ اس عنایت کی شکر میں کیا خدمت بجا لاتا ہوں۔ ایک رباعی بھیجتا ہوں اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر واجد صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجئے۔

---

[1] یہ بات مشکوک ہے کہ مینا بازار اور بیخ رقعہ واقعی غدر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس بحث کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد لکھنوی یونی ورسٹی کا تحقیقی مقالہ مینا بازار دیکھا جائے۔

[2] شاہ صاحب نے غالب کی جگہ عرفاً لفظ لکھ دیا تھا۔ غالب کو اپنے عرف سے عوجاج تھی وہ معلوم ہی ہے۔ (مختار الدین)

[3] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ رقعہ کس کے نام ہے (اکبر علی خاں نام پور)

ابد بہ تشدید میم و تخفیف میم دوزن فاع متفعل ہے ابداً ہو کر جناب ممدوح اس کو زمانہ بھیجیں۔ پہلے اور دوسرے مصرع میں بتخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدد ہے۔

غالب!

---

(۸)

بنام نواب علاؤالدین خاں علائی

جانِ غالب!

دو شعر تمہارے متواتر پہنچے۔ مغربی مرثیہ میں سے ہے۔ بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آگیں ہیں۔ لیکن دامانِ گلہ دارد و گریبانِ گلہ دارد۔ اس زمین میں اس کی غزل میں سے نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے ؎

در بزم وصال تو بہ ہنگام نشاط
نقارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ ایک شعر اس کا مجھے یاد ہے۔ بھائی تمہارا باپ بدگمان ہے یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے میرا سلام کہو اور یہ شعر میرا پڑھ سناؤ ؎

گمان ذیست بود رفت زبے دردے
چست مرگ وے بدتر از گمان تو نیست

مجھے کاوروکلن کے ٹکڑے پڑھ رہے ہیں۔ وہ تم کو شعر دس کا طالب ہی زندہ رہتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر یہ تکلیف نہ اٹھاؤ اور تم اسی زمین میں شعر کہہ کر بھیج دو میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ صفا کے پیر بھائی پیر ذوالفقار علی ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں ہے آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا اب کچھ یاد آیا وہ لکھتا ہوں ؎

باش کہ ما شتم سخن از ننگ و نام چیست
در امر خاص حجت و منع عام چیست

بستم زبون دل کہ دو چشم اناں پر است — گوئی غرور شراب و نہ بیخی بجام چیست
یا دوست ہر کہ بادہ بہ خلوت خورد حرام — داند کہ خورد کرد و نہ دار السلام چیست
ما خستگان حدیث حلال و حرام چیست — ما خستگان حدیث حلال و حرام چیست
بذ کاسۂ کرم نصیب است خاک را — تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

غالب اگر نہ عرقہ و صحف ہم فروخت
پارسد چرا کہ زنج مئے لعل فام چیست

ع شعر زیادہ آتے ہیں یاد آگئے نیز لانے کو بھی لانی دیکھتی ہیں[1]

دل بر و دو حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد توان دید و ستم گر نتواں گفت

در روز گلشن ناچ و خنجر نتواں برد
در بزم گلشن بادہ و ساغر نتواں گفت

رخشندگی ساعد و گردن نتواں جست
زیبندگی بادہ و پیکر نتواں گفت

بیرون ز دہ بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ ترا شدت و آذر نتواں گفت

در گرم روئے ساقی و در چشمہ بخویم
با ماہ من از طور بے و کوثر نتواں گفت

ہنگامہ سر آمد چو ز نے دم ز تلطم
گر طور سخن رفت بمحشر نتواں گفت

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار توان گفت و بر منبر نتواں گفت

کاے عجب افتاد بریں شیفتہ ما را
مومن نبرد غالب و کافر نتواں گفت

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جائیے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

---

[1] یہ خط پہلے چھپ چکا ہے مگر نامکمل، یہاں خط اس مصرع پر ختم ہو جاتا ہے۔

بد سد چرا کہ نوح ستے عمل تمام نیست (حافظ ہمہ مکاتیب غالب مرتبہ عرشی، دوم)

خط کی باقی عبارت اس میں نہیں آئی لیکن اصل خط میں موجود ہے جو غالباً کسی وجہ سے ابتدا ہی میں حذف ہو گئی۔ میرزا نے اپنی ایک اور فارسی غزل اور دو اردو غزلیں بھی اس خط کے ساتھ بھیجی تھیں جو مضمون خط سے واضح ہے۔ ردیف سے ایسی غزلوں کی فرمائش آئی تھی جنہیں گانے کے لیے قوال کو دیا جا سکے۔

اس ذلت کا جو اہو وہ بھلے ہیں تو کیا — بات آئیں تو نہیں بات لگائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

سرسید

(۱)

بنام نواب سید علی حسن صاحب مرحوم

جناب والا مناقب مخدوم و مکرم جناب مولوی محمد علی حسن خان بہادر دام عنایتکم

آپ کا نوازش نامہ مورخہ تیسری ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ معہ قطعہ کرنسی نوٹ تعداد پانسو روپیہ پہنچا۔ باعث افتخار و ذریعہ بڑا اعزاز ہوا۔ گو علیحدہ کمیٹی میں شریک کیا ہوں مگر اس فیاضانہ مرحمت کو مدرسۃ العلوم کے اور قوم کے لیے فال نیک جانتا ہوں۔ کچھ شبہ نہیں کہ مدرسۃ العلوم اور میری کوششیں فلاح قومی و دنیاوی امور سے متعلق ہے۔ لیکن اگر نیت نیک اور تمام کام خدا خدا ہوں تو خدا سے امید ہے کہ جزائے اعمال بالنیات سے جو حق ایمان ہے محروم نہ رکھے گا۔

آپ باور کریں یا نہ کریں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ اس اسلامی غیرت اور ہمدردی قومی کی جزائے خیر ضرور خدا تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا۔ یہ توجہ کو یقین کامل ہے جب کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس چیز سے کسی طرح کی غیرت دیا گیا آپ کو منظور نہیں ہے اور جذبہ غیرت محض ہزار درجہ غیرت ملی سے بہتر ہے۔ گو نیک نیتی اور بے ایمانی کو تقسیم کر کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی ضرور ہے کہ اعلان اس قسم کی غیرت کا جو قومی بھلائی سے نہ شخصی مراتب سے متعلق ہے اور قوم کو اس قسم کی غیرت کی شدید ضرورت ہے۔ ذریعہ ہوگا اور دلوں کی ترغیب کا اور غیرت دینے والا اجر بالمثل علی الجزا کا عامل میں ضرور داخل ہوگا۔ پس فلاح کے کاموں میں باعلان غیرت کرنا اگر نیت نیک ہو تو دو چند اجر کا مستحق کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس اعلان سے قومی عظمت اور اسلامی شوکت ثابت ہوتی ہے جو ہماری عین تمنا اور آرزو کے دل ہے۔ آپ نے مدرسۃ العلوم کو ملاحظہ نہیں فرمایا اور جس نے نہ دیکھا ہو اس کے خیال میں آ ہی نہیں سکتا کہ وہ کیسا ہوگا۔ اس کی عمارت جس شان و شوکت سے بنائی قرار دی گئی اور جس قدر اس وقت بن چکی ہے۔ قومی عظمت اور اسلامی شوکت کو ثابت کرتی ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ خیال کہ مسلمانوں میں قومی جوش اور ان میں سے قومی عظمت جاتی رہی۔ علی گڑھ میں جا کر اور مدرسۃ العلوم کی عمارت دیکھ کر بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ جب کہ غیر قوم کے لوگ اس کی دیواروں پر جا بجا مسلمانوں کے نام کثرت سے کندہ دیکھتے ہیں تو اور بھی زیادہ قومی عظمت اور اسلامی شوکت کا اثر ان کے دل میں بیٹھتا ہے۔ پس اس وجہ سے آپ مجھ کو اجازت دیں کہ اس روپیہ کو ایک مناسب فنڈ میں داخل کر دیا

اور اس کے ساتھ آپ کے نام نامی کی بقید ولدیت انشائی قائم رکھوں۔

مدرسۃ العلوم کی درمیانی عمارت جو سنٹرل ہال سے موسوم ہے بہت بڑی عمارت ہے سات ہزار روپیہ اس کی لاگت کا تخمینہ بنایا گیا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ لاگت آوے گی ——— اس میں نہایت خوش اسلوبی سے ایک سو بیس پتھر لگائے گئے ہیں جس بزرگ نے پانسو روپیہ دیا ہے وہ روپیہ اس کی تعمیر کے فنڈ میں جمع کیا گیا ہے۔ اور ان پتھروں میں سے ایک پتھر پر اس کا نام کندہ کر دیا ہے۔ جس قدر نام کندہ ہو چکے ہیں۔ غیر قوم کے لوگ جب آن کر دیکھتے ہیں تو قومی عظمت کا بے انتہا اثر ان کے دل پر ہوتا ہے اور مسلمانوں کے دل بھی ایک قسم کی فرحت پہنچنے میں پاتے ہیں۔ پس میرا ارادہ ہے کہ آپ کے ذریعہ کو بھی اسی فنڈ میں داخل کروں۔ اور آپ کا نام بقید ولدیت کندہ کروں جب کہ آپ نے یہ روپیہ عنایت کیا اور مجھ کو متولی کیا کہ اس کو کسی کار خیر میں صرف کروں تو اب آپ کو اس میں مداخلت ضرور نہیں ہے آپ ثواب میں داخل ہو گئے اب جو گناہ ثواب رہا میری گردن پر ہے۔ اگر میری نیت بخیر ہے تو خدا سے امید ہے کہ مجھ کو بھی میری نیت کے موافق جزا دے گا۔ اس تحریر کا میں آپ سے جواب نہیں چاہتا میں کروں گا وہ جو اللہ چاہے گا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اب کے سال الہ آباد میں ہوگا۔ ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر قواعد اجلاس مقرر ہوئی ہیں۔ پہلے اجلاس میں وہ امور تنقیح پاویں گے جو بحث کے لیے پیش ہوں گے۔ مگر تمام بحثیں تعلیم مسلمانان سے متعلق ہوں گی۔ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں غالباً اسباب تنزل مسلمانان پر لکچر دیں گے۔ جلدے کالج کے ایک نہایت نیک اور عالم پروفیسر انگریز مسٹر آرنلڈ ہیں اور جاوا میں اسلام کی ترقی اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت پر لکچر دیں گے وہ یہ ثابت کریں گے کہ بغیر کسی زور حکومت کے وہاں اسلام پھیلا ہے۔ اس وقت انہی دو صاحبوں کا ارادہ معلوم پڑا ہے۔ مگر غالباً مولوی سید علی بلگرامی جو حیدر آباد سے آنے والے ہیں وہ بھی کوئی لکچر دیں گے۔ غرضیکہ تمام جلسہ میں اے مسلمان اے مسلمان اس کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

گذشتہ سال کی اجلاس رپورٹ بطور نذرانہ آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجتا ہوں، منظور فرمائی جاوے اور آپ مجھ کو ہمیشہ اپنا نیازمند ایک عاجز نیازمند متصور فرماویں، آپ کی خدمت میں نیاز نامجات ارسال کرنے باعث میرے فخر کا ہوگا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

خاکسار سید احمد علی گڑھ ۲۰ نومبر ۱۸۹۰ء

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن مرحوم

بجناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم معظم من الرحمن مولوی سید محمد علی حسن خاں بہادر

نوازش نامہ عالی مخدومہ موجود الجود پہنچا نسخہ عنایت کیا۔ جو کچھ کہ آپ نے رسالہ بہتری مسلمانوں کے حق میں لکھا رعایہ سے سعی فرمائی۔ اور مدرسۃ العلوم اور اس ناچیز کے حق میں کلمۃ الخیر فرمائے اس کی نسبت بکرا اس کے کہ اجر کم علی اللہ اور کیا کہہ سکتا ہوں حاشیہ سرکار عالیہ کو تائید مدرسۃ العلوم میں تامل ہوگا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ مخالفین نے بہت کچھ خلاف بابت نسبت مدرسۃ العلوم کے مشہور

کر رکھی ہیں۔ علاوہ اس کے ایک عام خیال نہضت حسنات و خیرات اور مبرات کے محدود ہو گیا ہے۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ٹھانی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں ..... اور ظاہر ہے کہ دین میں یا مسلمانوں میں کچھ کام آنے والی نہیں ہے مگر انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمان ہندوستان ذلت و خواری میں پڑتے جاتے ہیں۔ عہدہ ہائے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں اعلیٰ عہدے ان کے ہاتھ سے نکلتے جاتے ہیں۔ ہندو بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے جاتے ہیں اور مسلمان ہر امر میں ان کے مغلوب و دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو ہندوؤں و بنگالیوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے یا ان سے مغلوب ہونے دینے کے لیے مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا درحقیقت ہندوؤں اور بنگالیوں پر ان کو فتح مند کرنا ہے اور اس زمانہ میں جو حال مسلمانوں کا ہے درحقیقت ان کی تعلیم انگریزی میں امداد کرنا بڑی حسنات میں داخل ہے مگر سرکار عالیہ کو یا عموماً مسلمانوں کو اس خیال کی طرف ..... خلافت سے ہے۔

مدرسۃ العلوم میں مسجد کی تعمیر مکمل نہ ہونے سے درحقیقت طالب علموں کو نماز کی تکلیف ہے۔ نواب سر آسمان جاہ نے جس قدر روپیہ دیا تھا اس سے مسجد کسی نہج تک تعمیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اس پر ایک چھپر ڈال دیا ہے جس میں نماز ہوتی ہے، وہ سو طالب علموں کے قریب پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے وضو کے لیے پانی کا انتظام بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے کنواں بھی بن رہا ہے۔ مسجد کے صحن میں وضو کے لیے حوض بھی بن رہا ہے۔ اگر سرکار عالیہ مسجد ہی کے لیے تائید فرمائیں گی تو بہتر ہے اسی کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے گی۔ میں کل یہاں سے علی گڑھ جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر کوئی تجویز روانگی بھوپال مقرر کر کے آپ کو اور وزیر صاحب کو اطلاع دوں گا۔ ہمارے سب کام تو کلتہ علی اللہ ہوتے ہیں، جو خدا کو منظور ہوگا ہوگا۔

کار ساز ما بفکر کار ما ست
فکر ما در کار ما آزار ما ست

جو خدا کو منظور ہے وہ ہوگا۔ مگر آپ نے جو سعی و کوشش کی اس کا شکر ہم پر واجب اور اجر دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ والسلام علیکم!

خاکسار

سید احمد۔ الہ آباد ۲۰ اگست ۱۸۹۱ء

---

(۳)

بنام نواب سید علی حسن صاحب

جناب مخدومی و مکرمی!

بجواب عنایت نامہ ملتمس ہوں کہ جو آپ کی خوشی ہے اوس کی تعمیل میں ہم سب کو اختیار ہوگا۔ تعمیل ارشاد ہوگی۔ بعد نماز مغرب ہم سب حاضر دولت خانہ ہوں گے اور وہاں سے کھانا کھا کر اسٹیشن چلے جاویں گے۔

خادم آباد دولت زیادہ والسلام!

خاکسار سید احمد ۳ ستمبر ۱۸۹۱ء

---

(۴)

بنام نواب علی حسن مرحوم

مخدوم مکرم بندہ جناب ابوالنصر نواب سید علی حسن خان بہادر

بعد سلام مسنون التماس یہ ہے کہ بلحاظ اس شفقت اور عنایت کے جو آپ کو میرے حال پر ہے اور بلحاظ اس قومی ہمدردی کے جو مسلمانوں کی ترقی اور بہبودی کی آپ کے دل میں ہے۔ مجھے جرأت ہوتی ہے کہ آپ کی خدمت عالی میں ایک ضروری التماس کروں۔

آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ وقت مدرسۃ العلوم کے ہیڈ کلرک نے بذریعہ جعلی چٹوں کے ایک دو نظیر زر امانت مدرسۃ العلوم میں سے جو بنک میں جمع تھا طلبی و تصرف کر لیا جس کے سبب سے نقصان کثیر زر امانت مدرسۃ العلوم ہو گیا۔ اگر وہ طلبی و تصرف صرف زر امانت ہی میں ہوتا تو صبر کیا جاتا۔ مگر اس طلبی و تصرف کے سبب سے اسی ہزار روپیہ بنک کا مدرسہ پر واجب ہو گیا اور اگر زر واجبات کی ادا کی جلد تدبیر نہ کی جاوے تو اس کا سود اس قدر بڑھ جاوے گا جس کا ادا کرنا ناممکن ہوگا۔ اس لیے یہ تجویز ہوئی ہے کہ اس زر واجب کو چندہ باہمی سے جس قدر جلد ممکن ہو ادا کیا جاوے۔ چنانچہ اس کے لیے چندہ لکھوایا گیا ہے اور احباب اور دوستان کالج نے قریب دس ہزار روپیہ کے چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور اور لوگوں نے بھی اس میں چندہ دیا ہے۔ اس لیے میں آپ سے یہی امر کی درخواست کرتا ہوں اور امید ہے کہ آپ اس پر توجہ فرمائیں گے۔

اول یہ کہ آپ بھی اپنی ذات خاص سے اس نقصان کو پورا کرنے میں کچھ امداد فرماویں تاکہ زر واجب بنک کا ادا کیا جاوے۔

دوسری درخواست یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو حضور جناب بیگم صاحب سے بھی اس باب میں عرض و معروض کریں۔ اگر جناب ممدوحہ بھی کچھ عنایت فرماویں گی تو اس وقت میں نہایت مدد پہنچے گی۔

اگرچہ میرا ارادہ تھا کہ حضور جناب بیگم صاحب کی خدمت میں بھی کوئی عرضی لکھوں۔ مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اگر آپ سے اس باب میں کچھ ممکن ہو تو عرض معروض کیجیے۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ علاوہ اپنی ذات خاص اور حضور جناب بیگم صاحبہ کے اور لوگوں سے بھی اگر ممکن ہو تو اس امر کے لیے کچھ چندہ وصول کیجیے۔ آپ کی کوشش اور سعی سے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔ والسلام علیکم۔

خاکسار

سید احمد - علی گڑھ

۲ جون ۱۸۹۹ء

(۵)

بنام نواب سید علی حسن مرحوم

جناب مخدوم و مکرم منعم من ابرالنصر نواب سید محمد علی حسن خان بہادر!

محمد بیتوب علی صاحب حکام تکار روبکاری جناب کا خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۹۶ء مع نصف قطعہ نوٹ ہائے تمسکی ایک ہزار روپیہ جو آپ نے ازراہ فیاضی و شفقت بزرگانہ بندۂ نمک خوار کی عنایت فرمایا ہے میرے پاس پہنچا ہے۔ آپ کی عنایت اور فیاضی کا دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور شکر ادا کرتا رہوں گا۔ اور یہ عریضہ نیاز بعد رسید نصف قطعہ ثانی نوٹ مذکور خدمت عالی میں مرسل ہے

والتسلیم من المستقیم!

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۹۶ء

محمد حسین آزاد

(۱)

بنام محمد نوح رضوی چھلی شہری

آپ کے حسب الحکم کا خیال تا بلی ہزار تعریف کے ہیں اور یہ عنایت خاص جو بندۂ آزاد کے حال پر مبذول ہوئی ہے اس کا تو شکریہ ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اپنی جمعیت کا حال کیا بیان کروں۔ آپ تصویر مانگتے ہیں میرا یہ حال ہے کہ کئی برس ہوئے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کبھی آئینہ سامنے آ جاتا ہے تو اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ جو شخص خود اپنی صورت دیکھ کر ڈرے اسے دوسرا اور تصویر کو اس عالم شیر کا لک کیا ہوگا۔

دو برس ہوئے ایک دوست رستے میں سے بہادر کے مجھے لے گئے اور میری تصویر اتروالی۔ اگرچہ رنج ہوا۔ مگر پھر شکر کیا کہ الحمد للہ اسے صحیح الاعضا اور سلیم الصورۃ پیدا کیا ہے اور رکھا ہے۔ حقیقتاً اب میں اپنا حال کیا عرض کروں۔ تیرہ مہینے کے بعد آج انشاء اللہ نہانے کا ارادہ ہے۔ اگر خدا پورا کرے۔ کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں کہ چار سطریں لکھوں گا۔ نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دربار اکبری لکھ رہا ہوں۔ اس میں اکبر کے امرائے دربار کا حال آپ اسی طرح پڑھیں گے جس طرح آب حیات میں شعرائے اردو کا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ ہر ایک امیر کے حال کے بعد اس کی تصویر بھی ہو۔ چند تصویریں ہم پہنچائی ہیں۔ مگر بعض اب تک نہیں ملیں۔ اگر آپ کے ذریعہ سے ملیں تو مزید مطلع فرمائیں۔

محمد حسین عفی عنہ۔ فروری ۱۸۸۴ء

---

(۲)

بنام میجر حسن حیدرآباد

جناب من! اعلام اقبالکم وصل اللہ اقبالکم!

تسلیم۔ آپ کا مرحمت نامہ تو پہنچا مگر اس نے رنج کو دوبالا کیا۔ کیونکہ نہایت دل شکستگی پائی جاتی تھی۔ بے دل ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ مولوی اسد اللہ الغالب موجود ہیں۔ انشاء اللہ پہلے سے اچھا ہوگا۔ میں نے انہیں احتیاطاً کچھ نہیں لکھا۔ آپ لکھ دیجئے گا کہ رجوع قلب سے عرض کرتے رہیں۔ سب مشکلیں آسان ہوں گی۔

مجھے پھر کون سی مشکل ہے اے تیر
اگر تیرا علی مشکل کشا ہے

میں گنہگار روسیاہ کس منہ سے کہوں کہ دعا کرتا ہوں۔ خیر جو کچھ ہے خدا قبول کرے۔ دنیا کے اعتبار سے اتنا ہوا کہ جہاں جہاں ہو سکا خیالات کو بدلا۔ جہاں جہاں ہو سکا قلم کو رسائی دی ہے۔ جو کچھ خدمت میں پہنچا ہے ملاحظہ فرمایئے گا۔ میرے پاس کیفیت احوال کے پہنچنے کا کوئی رستہ نہیں۔ آپ ہی کوئی تسلی نامہ لکھیں تو لکھیں اگرچہ غیروں کو اس بات کا یقین نہ آئے لیکن ناتوانی کے دل پر اس فقرہ کا اثر ہوگا کہ مجھے شاید ہی کچھ آپ سے کم رنج ہو۔ میں رویا اور میں نے میرے میاں نے اس مرحوم کی قدر بہت بڑھی۔ مجھے امید نہیں کہ ان کے جیسے نے پڑھی ہوگی۔ حضرت آپ ہم لوگوں کو نہیں جانتے آپ کے جد جانتے ہیں۔ ہم کچھ اور لوگ ہیں۔ اللہ ان کے صدقے سے، ان کی خاک آستان کے صدقے سے، ان کے کتوں کے صدقے سے خیر و برکت شامل حال رکھے۔ اور فی الحال تو میری عرض ہے کہ خدا آپ کی بات کو بنا دے۔

فقط والدعا، بالتماس الدعا!

کانپور ۵ فروری ۱۸۸۳ء

امیر مینائی

(۱)

بنام منشی محمد عسکری اکرم ترمذی علیگڑھی

زبیم من۔ کل قطعات تاریخ بھیج چکا ہوں۔ ایک قطعہ تاریخی اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ اس کے بعد خیال آیا کہ نام سے تاریخ پیدا کی جائے۔ اس وقت ایک صورت سے موزوں ہوئی اس کو لکھے بھیجتا ہوں۔ اگر یہ قطعہ پسند ہے تو خیر۔

ہفت کہ با فرخناک و کتمد اشد بیباک	طاعتش در گوش از دور نجم آمد کنوں
سال مرگ ذاتم آں مرحوم پیدا کرد امیر	در ریاض فاطمہ باد سوم آمد کنوں

۱۲۹۹ = ۱۵۳ + ۱۱۴۶

چاہیئے کہ رسید و ان تاریخوں کی اور کیفیت پسند اور ناپسند سب مرزا ان دیوان آگہی کے لکھ بھیجئے اور جس تاریخ کا کندہ ہونا فرمائیے اس سے بھی اطلاع دیجئے۔ میرے ایک شفیق سخنور شیرازی میرے پاس تشریف رکھتے تھے انہوں نے اس تاریخ

کو پند کر کے دوسرے اول کے اس طرح موزوں کیے۔

اندریں ماتم سرا آ دیدہ چشم روزگار
ماتم زنہاں کہ از دور بکوم آمد کنوں

۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء — راقم آثم امیر احمد از نام پور

---

(۲)

بنام مرزا داغ دہلوی

مصدر تعلب اتم، قدیمی مکرم سلامت۔ سلام مسنون اخلاص مقرون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ آیا۔ ممنون یا قادری فرمایا۔ بندہ نواز مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب تلخ انداز کیا ہو۔ یہ میرے عقد کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ ہر کیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار کوہ کیچھ میں دیکھا۔ میں نے آپ کا خطاب جناب استاد الملک ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا سچا پایا۔ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا۔ مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور کھیت گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار کے تحفہ سے فرمائی وہ میرے سرور اور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں خدا جلد ظہور میں لائے۔

شکایت جو آپ نے "مسلم خانۂ عشق" ویران ورم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے وہ دیوان چھپا کہاں! اور نہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ سے رشک و حسد سے ذرا نہیں انہیں کہ اتنی مدت تک بجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہو گئے ہو یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زہر دستی رکاوٹ کے لیے ایک بات قرار دی ہے۔

اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آگیا کہ مرحوم و مغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو۔ کوئی اور حوصلہ نہیں ہے۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں جو رہ جھوں ابھی افسردہ رہتا ہے۔ کبھی کسی گھر سے والے کے اصرار سے کچھ کہتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغتیں چشم بد دور آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں۔ خدا جمعیت خاطر بڑھائے۔

---

۱ ۱۸۹۱ء میں نظام دکن میر محبوب علی خاں نے مرزا داغ کو "استاد الملک" کا خطاب دیا۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ چھپا۔ امیر مینائی نے بھی دیکھا۔ ان ہی دنوں میں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا۔ لیکن انہوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر صاحب نے یہ خط لکھا۔

۲ یعنی مرزا داغ کے خط میں۔

۳ مرزا داغ نے اپنے خط میں امیر صاحب کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہوگا اس کا جواب ہے۔

ارشد یار، استاد السلطان ہونے کی مثالی توقع: یا استاد، یا استاد برسوں کہا گیا ہے۔ اب جو وہ وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔ امید ہے کہ کبھی کبھی رسم رسل و رسائل رہے۔ میں ابتدا سے تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

۳۱-۱-۹۱ء سنہ ۱۹۰۱ء امیر فقیر

داغ

(۱)

بنام نواب حسن علی خان امیر جاگیر دار

نواب صاحب تعالیٰ شعار سلمہ اللہ تعالیٰ

تین دن سے خط کا منتظر ہوں، جواب ندارد۔ لفظ بی جو شرارت کے واسطے ہے اس پر خفا ہوں میں نے خوب جھاڑا ہے۔ پانچ روپیہ لڑکی سے دلائیں پچاس بدھاں سے گئے دس آپ سے مانگتی ہیں ذرا ان کو جھاڑ دیجئے گا۔ میں نے جو ان کو خط لکھا ہے۔ وہ اتنے کے خط میں ہے اس کو اتنے سے لے کر آپ پہنچائیں تو بڑی عنایت۔ ایک طول طویل خط اور بھیجتا ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ پہلی سب غزلیں بقیہ میں صاف چھپ گئیں کہ ابھی کوئی آتی ہیں۔ یہاں خیریت ہے۔ گرمی کی شدت ہے۔ بچوں کو دعائیں۔ فقط

ضیع الملک داغ دہلوی یکم جون ۱۹۰۳ء مطابق ۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ

---

(۲)

بنام نواب حسن علی خان امیر جاگیر دار

نواب صاحب سلام!

میں غیر کا طالب ہوں، عرض کا منظور نہیں۔ مروت کی کیا صورت ہوئی اس ارشد میں مشکل ہے۔ بی جواب کل سے وارد ہیں۔ اور آپ کی مشتاق۔ ان کا مکان گرا، جان بچ گئی۔ اس کی مروت ہو رہی ہے۔ یہاں تو تھکا نہیں۔ زیادہ نیاز!

ضیع الملک داغ دہلوی

یکم اگست ۱۹۰۳ء مطابق ۲۷ جمادی الاول ۱۳۲۱ھ بروز یک شنبہ

لے اس بے تکلفی اور خلوص کا کیا کہنا!

ڈپٹی نذیر احمد

(۱)

بنام نواب سید علی حسن خان بہادر

جناب عالی!

کرامت نامہ پہنچا۔ میں نے حقیقت واقعی سے کم و کاست بالمشافہ عرض کر دی تھی۔ اب کامیابی ہو تو اور ناکامی ہو تو دونوں صورتوں میں جناب کا احسان میرے ذمہ ثابت ہو چکا اور میں مدت عمر ممنون رہوں گا۔ اگر کسی مقابل کے لیے سفارش نہیں کی گئی تو ناکامی کا احتمال ضعیف ہے۔ لیکن آپ نے خط میں اس کی کچھ صراحت نہیں فرمائی۔ رہی حکام انگریزی کی سفارش اس کا حال یہ ہے کہ میں برس سے میں سرکار انگریزی سے بے تعلق محض ہوں۔ دس برس کے قریب حیدرآباد رہا اور اس کے بعد سے خانہ نشین ہوں۔ اذ سکہ خدمت کی جستجو نہ تھی، طبیعت نے بے فائدہ خوشامد اور دربارداری کو گوارا نہ کیا۔ لیکن جس وقت تک میں سرکار انگریزی میں تھا لیفٹیننٹ گورنر کے سرٹیفکیٹ کتاب میں آپ نے ملاحظہ کیے ہوں گے۔ بڑی خدمت کے لیے بڑے عہدہ داروں کی سفارش درکار ہے اور یوں دلی کے ڈپٹی کمشنر اور کمشنر مجھ کو جانتے پہچانتے ہیں ان لوگوں نے میرے لٹریچر سنے ہیں اور عزت میری نسبت اچھا خیال رکھتے ہیں اور پوچھا جائے تو اچھا ہی ظاہر کریں گے۔ لیکن میں ان کی کوٹھیوں پر ان کے سلام کو بھی نہیں گیا۔

چونکہ آپ کے ایک طرح کا تعلق اس معاملہ سے پیدا کر دیا ہے۔ وقتاً فوقتاً مجھ کو اطلاع ہوتی رہے تو مزید عنایت

خاکسار، نذیر احمد ۳ دسمبر ۱۸۹۹ء

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن خان بہادر

جناب عالی!

السلام علیکم! آپ کو شاید معلوم ہے کہ میں نے بڑی محنت سے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ مجھ کو اس کے لیے تین برس محنت شاقہ اٹھانی پڑی ہے اور تراجم موجودہ اور تفاسیر اور احادیث سے مطابق کرنے کے لیے مہینوں کا اضافہ رکھنا پڑا ہے تب کہیں جا کر یہ ترجمہ میرے نزدیک بامحاورہ سلیس و مطلب خیز، مستند اور تراجم موجودہ سے بہت بہتر ہوا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ اشارات بھی لکھ دیے گئے ہیں اور منظور یہ ہے کہ ان اطراف میں بھی طرح اعلان کر دیا جائے کہ قرآن مجید کا نیا ترجمہ مل سکتا ہے۔ پہلے آپ دیکھ دیکھا کر بھی طرح اطمینان حاصل کر لیجیے کہ آیا واقعی میں یہ ترجمہ تراجم موجودہ سے بہتر ہے یا نہیں اور اگر آپ کے نزدیک بہتر ثابت ہو تو آپ اس کی سرپرستی کیجیے کیونکہ اس کی اشاعت میں مدد دینا گویا اغراض رسالت کی تکمیل کرنا ہے بلکہ اگر

آپ کو لکھیں تو اس ترجمہ کی کیفیت کو سرکار کے گوش گزار کریں اور ان سے سرپرستی کی تحریک فرمائیں۔ ترجمہ کے حجم اور سواد خط اور چھاپہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قیمت جو قرار دی گئی ہے۔ اس میں کوئی ذاتی مفاد مضمر نہیں ورنہ میں اگر اپنی محنت اور مزدوری کی تخمینہ لگاتا تو صد فی جلد لاگت پڑتی۔ مگر میں نے یہ کام استعمالاً کیا ہے۔ ان امری الا علی اللہ

میرٹھ میں آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہونے کا افسوس باقی رہ گیا۔ ترجمہ تو ہدیۃً آپ کی خدمت میں روانہ کیا گیا ہے۔ اور صرف خرچہ کا ..... کیا گیا ہے براہ مہربانی ..... کر لیجئے گا۔ فقط!

خاکسار۔ نذیر احمد مرحوم ۱۸۹۷ء

---

(۳)

نام خاں بہادر شہاب الدین احمد (شاہدہ)

(جواب خط یکم دسمبر ۱۹۰۳ء)

السلام علیکم۔ سب سے پہلے میں آپ کو مرگ عزیز پر جس کی مرگ کا حال آپ کے اخبار میں بھی چھپا ہے۔ تعلیق صبر کرتا ہوں۔ اگرچہ آپ محتاج تعلیق نہیں ہیں۔ حاصل شریف کی جلد بندی کے دام اللہ اللہ ہیں پچیس جلدیں آپ طلب فرماتے ہیں اس کی بابت استفسار طلب بات یہ ہے کہ کیشن جو آپ منظور کرتے ہیں اس کی تعداد کیا ہے۔ مجھے یاد نہیں اور نہ میرے پاس کوئی اس کی یادداشت ہے کانفرنس کی شرکت موقوف ہے۔ اعتذار مزاج بہت ماتل ہوتا ہے۔ دور جانے، اقل دوری سفر دوسرے وہاں کے لوگ اردو کم سمجھتے ہیں اور اکثر نہیں سمجھتے البتہ آپ کا اور آپ جیسے لوگوں کا شریک کانفرنس ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ میں تو اتنے ہی کام کو بوجھ کر فرسودہ مستقل پیش یا آمادہ باتوں کا کھڑے ہو کر اعادہ کر دیا۔

اخبار کی نسبت مجھ کو یہ کہنا ہے کہ عربی کا اہتمام جیسا چاہیے نہیں۔ مذہبی مضامین بھی بعض چھپے ہوتے ہیں۔ جیسے کسی شخص نے آپ کے اخبار میں لکھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے پابندی مذہب ضروری نہیں۔ ابھی شاید پچھلے پرچے میں کسی صاحب نے دخلنا ہم حمار کیون سے دلیل کی پیش گوئی استنباط کی۔ لغو بے اصل۔ بے جوڑ بے ضرورت۔ ایسی باتوں سے قرآن کے ظاہر الفاظ سے انکار اٹھا جاتا ہے۔ اس قسم کے مضامین آپ کے اور آپ کے اخبار کے شایان شان نہیں اور میرے نزدیک ایسی باتوں سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔

ناں ——— حماملیں جو جلد جائیں گی ان کی جلد قسم قبل ہو گی بعض نے اسے قسم ادنیٰ پڑھا۔

خاکسار۔ نذیر احمد۔ ۲ دسمبر ۱۹۰۳ء

مولانا حالی

(۱)

بنام محسن الملک[1]

جناب مولوی صاحب محترم و مکرم و معظم دام مجدہم

بعد تسلیم و نیاز کے التماس یہ ہے کہ دو جلدیں کتاب "حیات سعدی" کی اور دو جلدیں "مسدس مدوجزر اسلام" کی خدمت والا میں ارسال کرتا ہوں۔ ان سے دو سادی جلدیں آپ کے ملاحظہ کے لیے اور دوسری دو جلدیں جن پر روپیہ لگا ہوا ہے حضور نواب صاحب بہادر دام اقبالہم کی نذر کے لیے ہیں۔ پہلی کتاب میں نیاز مند نے شیخ سعدی کی لائف اور ان کی تمام تصانیف پر ریویو کسی قدر جدت کے ساتھ لکھا ہے جس پر منشی محمد ذکاء اللہ صاحب کا ریویو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ مورخہ ۱۶ مارچ ۹۰ء میں چھپا ہے اور جس کو پنجاب اور اضلاع شمال و مغرب کے معتبر اشخاص عمدہ پسند کرتے ہیں۔

دوسری کتاب یعنی مسدس مدوجزر اسلام کے آخر میں ایک نیا تخمیس ۱۰ بند کا اکثر اکابر و احباب کی تحریک سے اضافہ کیا ہے جس کی نسبت ابھی میں نہیں کہہ سکتا کہ پبلک کی کیا رائے ہوگی۔

غالباً جناب کو کثرت مہمات مرجوعہ کے سبب یاد نہ رہا ہوگا لیکن نیاز مند کو خوب یاد ہے کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت جب کہ ان کی ترتیب و تدوین ختم نہ ہوئی تھی۔ خداوند سامی کی طرف سے مختلف اوقات میں اعانت و خریداری کی امید دلائی گئی تھی اور زیادہ تر اسی امید کے بھروسے پر ان دونوں کتابوں کے ایک ساتھ چھپوانے کی جرأت کی گئی ہے التماس یہ ہے کہ اگر ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں مفید سمجھی جائے تو ازراہ نوازش و کرم دو دو سو نسخے جو حضور نواب صاحب بہادر کی نذر کے لیے ارسال خدمت والا کیے جاتے ہیں۔ مع عرضداشت منسلکہ نیاز نامہ ہیں گاہ جناب مختصر ایدہ میں گزران کر جس قسم کی اعانت یا رعایت ممکن ہو اس کے لیے سفارش فرمائیں۔

جو محنت اور دیدہ ریزی مجھ کو برداشت کرنی پڑی ہے اس کا تدارک خاطر خواہ ہو جائے گا۔ اگرچہ ہندوستان میں مصنف کی وقعت ایک بک سیلر سے زیادہ نہیں ہے اور نہ میرا کوئی حق آپ پر ایسا ہے جس کے سبب سے میں آپ کو ایسی تکلیف دینے کا مجاز سمجھوں لیکن سچ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہم لوگوں کو ایک حسن ظن اس قسم کا ہے کہ جس امر کی تحریک کو دو چار برس سے زیادہ گزر چکے ہیں آج تک اس سے قطعی مایوسی نہیں ہوئی۔ خیر کامیابی تو بہت مشکل ہے۔ اگر یہ امید بھی قائم رہے تو غنیمت ہے

زیادہ نیاز

نیاز نامہ خاکسار الطاف حسین حالی از دہلی کوچہ پنڈت ۲۶ ؍ ۱۰ ؍ ۹۰ء

---

[1] غالباً یہ خط موسومہ ہے نواب محسن الملک کا اور اسی عنوان میں ان دونوں کتابوں کی جلدیں حیدرآباد میں حوالہ کی گئیں جنکی رسید کی نقل اور عبدالرحیم خاں کے موسومہ خط کی نقل موجود ہے۔ اصل خط میرے پاس محفوظ ہے (تلخیص کا نمبر)

(۲)

بنام مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب رئیس حکیم پور

جناب من!

لفظ ہاتھ میں جائز ہائے مخلوط ہے۔ لیکن بات اور ہات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگذاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کبھی کی جگہ کبھو اور کبھو کو غیر فصیح سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے اردو دیوان میں قافیے کی جگہ کبھو اور کبھو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں۔ مگر قافیے میں بات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔

نیاز مند

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت محلہ انصاریاں ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء

---

(۳)

بنام مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب، رئیس حکیم پور

مخدومی!

مہمان ناخواندہ عزیز تر از مہمان خواندہ پہنچا باوجود یکہ آج کل ضیق فرصت کے سبب مطبوعات جدیدہ کے مطالعے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ اسی حالت میں قریب نصف کے رسالہ علمائے سلف کو دیکھا گیا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس عمدہ تصنیف پر مفصل ریمارک کرنے کی فرصت نہیں ہے مگر مختصر یہ ہے کہ اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت پہلے سابق کے اضعاف مضاعفہ کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے شاید کوئی ناواقف آدمی یہ سمجھے کہ کیا مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی صدہا کتابیں نہیں لکھیں مگر ایسا سوال کرنا سخت غلطی کی بات ہے۔ آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلف ہیلپ کے لکھنے میں کیا ہے اس نے بھی ہزاروں بائیوگرافیاں پڑھ کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔ مسلمان علما کے حالات لکھنا اور بات ہے اور تمام بائیوگرافیوں کو دیکھ کر چند عنوان تجویز کرنے اور ہر عنوان کے مناسب اس وقت طویل الذیل سے مضامین انتخاب کرنے اور ان کو جدا جدا عنوانوں کے تحت میں درج کرنا نہایت محنت اور لیاقت اور غور و فکر کا کام ہے آپ کی تصنیف میں اور مسٹر سموئل کی کتاب میں صرف یہ فرق ہے کہ اس نے سلف ہیلپ میں کتاب کا موضوع صرف علما میں محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں تمام دیگر امرا اور موجد و مخترع اور سپہ سالار وغیرہ وغیرہ شامل ہیں اور اس رسالے میں صرف علمائے سلف کے حالات سے بحث کی گئی ہے اگر آپ اس کے دائرے کو دوبارہ تحسین کر دیں تو یہ بالکل اسی قسم کی کتاب ہو جاتی جیسی سلف ہیلپ ہے۔ اس کتاب میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں مگر میں نے صرف ایک خوبی کا جو کہ تمام تصنیف کی جان ہے ذکر کرنا کافی سمجھا ہے

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا

پس ناوقتیکہ ندوۃ العلما انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور نہ دے گی اس کی چیخ و پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں مشرقی تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی۔ ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا مقرر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ایسی کتاب لکھ سکے جیسی کہ آپ نے لکھی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دو دو جلدیں ہر مدرسۂ اسلامیہ میں رہنی چاہئیں بلکہ محمڈن کالج کے طلبا بھی اس سے مستفید ہوں تو بہت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہے یا ندوۃ العلماء نے اس کو چھپایا ہے۔ مسلمان اور خاص کر پرانے خیالات کے مسلمان ایسی کتابوں کے خریدنے میں بہت ممسک ہیں۔ اس لیے مدارس اسلامیہ میں اس کو مفت تقسیم کرنا چاہیئے۔ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے عام رئیسوں اور رئیس زادوں کو اسی طرح زیورِ علم و لیاقت و حسن اخلاق سے آراستہ کرے جیسا کہ اس نے شروانی رئیسوں میں آپ کو زیورِ علم و فضل و اخلاق سے آراستہ کیا ہے اور آپ کو جملہ مکروہات روزگار سے محفوظ رکھ کر صدی سال تک زندہ و سلامت رکھے۔

زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی عفی عنہ پانی پت۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۹ء

نواب محسن الملک

(۱)

بنام منشی ذکاء اللہ صاحب

محترم و مکرم بندہ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب زاد لطفہ

مولوی سید احمد مصنف فرہنگ آصفیہ جس کی چار سو کاپیاں سرکار نے خرید فرمائی ہیں یہاں آئے اور جناب نواب مدار المہام سرکار عالی کی ملازمت حاصل کی۔ نواب اختصاد جنگ بہادر اور بندہ نے بھی ان کے مشکلات جو کتاب کے چھاپے کے ختم ہونے میں پیش ہیں سنیں اور سرکار میں عرض کیا کہ کسی طرح اس کتاب کا نام ہو جانا چاہیئے تاکہ جس غرض سے سرکار نے چار سو جلدیں خریدی ہیں وہ حاصل ہو اور اس پر یہ امر قرار پایا ہے کہ یہ معاملہ آپ کے سپرد کیا جاوے اس لیے میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ مہربانی کر کے اتنی محنت اپنے اوپر گوارا فرمائیے کہ جو معاملہ ان کا سرکار سے ہے وہ کس طور پر ہو سکتا ہے اور وہ کس طرح اس کے پنجے سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور سرکار کی کیا مدد اس کام میں مطلوب ہے اور آئندہ باقی ماندہ کتاب کے چھاپنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ سرکاری مطبع حیدر آباد میں چھپوائی جاوے اور مولوی سید احمد صاحب اس کی تصحیح یہاں آ کر یا وہاں رہ کر کیا کریں۔ آپ سے بہتر اس کام کے واسطے دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے آخری تصنیف اس کا آپ کی رائے عالی پر عمدہ

لہ نواب وقار الملک۔

طور پر ہو سکے گا۔ زیادہ نیاز!

محسن الملک ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ (۲ فروری ۱۸۹۰ء)

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن

جناب مخدوم مکرم بندہ نواب علی حسن خان بہادر

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں اور امین الدین کے ذریعہ سے آپ کا پتہ بھی دریافت کیا تاکہ خط لکھوں مگر پتہ معلوم نہ ہوا۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے عنایت نامہ بھیج کر یاد فرمایا۔

آپ نے جو خواہش فرمائی ہے وہ تمام قوم کی معنوی کامیابی ہے۔ آپ کو قومی ہمدردی تو ہمیشہ سے ہے اب وہ آتش اور مشتعل ہو گئی ہے۔ یہ قوم کی خوش نصیبی ہے۔ اگرچہ آپ کا بھوپال سے تشریف لانا دشمنوں کو ناگوار ہوا، قوم کے لیے مفید ہوا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد
خبر ہا دہان شیشہ گر سنگست

قوم کی پہلی خدمت تو یہ ہے کہ آپ تعلیمی مساعات پر وقتاً فوقتاً کچھ معاون ملکر علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھیج دیا کیجئے۔ دوسری یہ ہے کہ اپنے دوستوں اور عقیدتمندوں کو قومی کاموں پر متوجہ کیجئے اور عمدہ مشورہ اور صلاحیں ہم کو دیا کیجئے۔ ایک تجویز ہو رہی ہے کہ تعداد ٹرسٹیوں کی زیادہ کی جائے۔ اس وقت جتنی جگہیں ہیں وہ سب معمور ہیں۔ اگر یہ تجویز منظور ہوئی تو ٹرسٹیوں کی فہرست میں آپ کا معزز نام بھی جلد نظر آوے گا مگر ٹرسٹی ہونا اور بات ہے۔ آپ کی شان اس سے ارفع اور اعلیٰ ہے اور آپ سے ہر طرح کی مدد ملنے کی امید ہے۔

میں ایک درخواست بہ نہایت چھوٹی ہے کرتا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ اس کو منظور فرمادیں گے یعنی علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو آپ کو عربی کی جس کی سالانہ قیمت ۵ ہے اور اگر معاف میں آپ داخل ہونا چاہیں تو ۶ یا ۷ آپ دے کر اس کو مدد دے سکتے ہیں۔ پچھلا اخبار بطور نمونہ آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔

محسن الملک، از علی گڈھ یکم اگست ۱۹۰۲ء

---

(۳)

بنام مولوی بشیر الدین

مخدومی مولوی بشیر الدین صاحب!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کیونکر آپ کے ساتھ کام کروں۔ ایک بری عادت آپ میں یہ ہو گئی ہے کہ آپ

خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ اگر دو سطر میں جواب بھی دے دیا کرو تو اس قدر ترسوں ہو کہ تم زندہ ہو اور مرے نہیں میں نے تم کو تین خط لکھے ہر ایک کا بھی جواب نہیں آیا تمام دنیا میں پارسال کی طرح پھر میری ذلت اور رسوائی ہوگی۔ کہ وقت پر کام نہ ہوا۔ آپ نے نہ اس وقت تک رزولیوشن بھیجے نہ چندہ کی فہرست اور میں اس وقت تک ان سب کمیٹیوں کے ممبروں کو کچھ اطلاع نہیں دے سکا جو مختلف کاموں کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔ آج کا اخبار بھی پہنچا اس میں بھی سب کچھ ہے سوائے کانفرنس کے نہ اس کی کچھ کیفیت ہے نہ رزولیوشن۔ اگر ہے تو پریسیڈنٹ کو سختی کے ساتھ برا بھلا کہا گیا ہے یہ طریقہ یعنی جس سختی سے آپ تحریر کرتے ہیں مجھ کو تو پسند نہیں ہے۔ آپ ہی شاید اس کو پسند کرتے ہوں۔ دوسرے کے ظاہر کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ سختی سے کام لیا جائے۔ بلکہ خوبی اسی میں ہے کہ اپنا مطلب نرم لفظوں میں ظاہر کیا جائے اور انسانیت اور اخلاق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ لیکن مجھ کو اس سے کچھ مطلب نہیں، نہ میں آپ کا ناصح ہوں نہ آپ کسی کی سننے والے ہیں۔ ہاں مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں اور وقت پر میرے خطوں کا نہ جواب دیتے ہیں نہ کام کرتے ہیں۔ آپ رزولیوشن اور فہرست چندہ کی بھیج دیجئے یا جواب دیجئے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کروں گا۔ مجھے پارسال کے سے آثار نظر آتے ہیں کہ باتوں میں دن گذر جاویں گے اور رپورٹ وقت پر تیار نہ ہوگی۔ لیکن میں آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ میں اب اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ رپورٹ نہ لکھ سکیں تو جن لوگوں نے نوٹ لکھے ہیں ان کو میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ میں خود اپنا سر مار دوں اور آپ کو آئندہ تکلیف نہ دوں۔

یہ کیا طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے کہ اول آپ اخبار میں شائع کرتے کالج کو بدنام اور فضیحت کر دیتے ہیں پھر مجھے توجہ دلاتے ہیں۔ کالج کے طالب علموں پر سختی کا کیا جال چلا اور کیا ہوا۔ جس پر آپ میری توجہ چاہتے ہیں۔ اور درصورت توجہ نہ ہونے کے آپ بذریعہ اخبار کالج کی فضیحت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے اس وقت تک کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا جس سے اخبار میں لکھنے کے اول مجھے تو اطلاع دی ہوتی۔ یہ کوئی دوستی نہیں ہے نہ کالج کی خیر خواہی کہ آپ ایسی باتیں کہ جس سے مسلمانوں کو کالج کے خلاف جوش پیدا ہو اخبار میں لکھ دیں اور مجھ کو خبر تک نہ کریں اور پھر بھی لوگ کہیں جس سے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کیا آفت آئی۔ کیا قیامت بپا ہوئی۔ خیر اگر اسی کا نام آزادی اور خیر خواہی ہے تو یہ آپ کو مبارک رہے اور جو آپ کا دل چاہے کریں اللہ احد اور علی محمد کہاں ہیں۔

محسن الملک ۱۵ جنوری ۱۹۰۴ء

نواب وقار الملک

(۱)

بنام سر سید احمد خاں

جناب قبلہ و کعبہ ام سلامت

تسلیم! آپ کا ارشاد تو لبرز علم کے ہے جس کے بعد سکوت کے سوا اس قسم کے معاملات میں کچھ چارہ ہی نہیں ہے۔

لیکن جو وجوہ ارشاد ہوئی ہیں ان کی نسبت اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ان میں سے بھی بہت سے ہوں گے جو ان مضامین کو جن کو وہ سن چکے شاید دوبارہ پڑھنے کی تکلیف نہ کریں اور جن ہزاروں غیر ممبروں نے غلط رپورٹ پڑھی ہے۔ ان کو تو مطبوعہ رپورٹ سے بہت ہی کم تعلق رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پالیٹیکل اخبار کے انگریز پڑھنے والوں کے لیے تو اردو مطبوعہ رپورٹ سے کچھ تعلق نہیں اور اس طرح ہزارہا فائدہ لوگوں کا خیال اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کسی بیوقوف مسلمان نے اس بات کی بھی کانفرنس میں رائے دی کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ اپنے موجودہ مسلمان ماسٹروں کے ذریعے سے مذہبی تعلیم بھی کرا دے۔

مگر میں اوپر عرض کر چکا کہ اگر آپ کی رائے سرسیّد کے اخبار میں جو اردو انگریزی دونوں کا اخبار ہے، اصلاح کی نہیں ہے تو مجھے اس پر کوئی اصرار نہیں ہے لیکن اس حالت میں اپنے آپ کو آزاد سمجھوں گا اگر کوئی موقع مجھے ملے تو میں اپنے اوپر سے اس دھبے کے مٹانے کی کوئی مناسب کارروائی کر سکوں اور اوسی کے ساتھ وہ دوسری اصلاح ہو گی کہ یہ میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہی کروں گا۔ مگر شاید کبھی کروں۔ واللہ اعلم[1]

خاکسار۔ مشتاق حسین۔ امروہہ ۱۵ مارچ ۱۸۹۳ء

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن صاحب

جناب نواب صاحب مخدومی و محسنی نواب حسام الملک بہادر سلامت

السلام و علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! مجھ کو اگرچہ جناب سے شرف قدم بوسی حاصل نہیں ہوا۔ لیکن ذکر خیر اکثر اوقات سنتا رہا ہوں اور خصوصاً جناب مولوی حافظ سید احمد رضا خاں صاحب سے بہت کچھ جناب کے متعلق سنا ہے اور شکر کیا ہے کہ قوم میں ابھی ایسے افراد موجود ہیں۔ میں گزشتہ چند مہینے میں علیل تھا۔ اور اس لیے میں کانفرنس کے مجھے دو چھپے چھپے پرچے اور دیکھنا چاہیئے تھا ان کی نوبت اب آئی ہے اور آج شام ابھی میں نے جناب کا مضمون عرب کی تصنیفات اور یورپ کی فیاضی پر گزشتہ مئی کے معارف میں پڑھا ہے جو کچھ کہ جناب نے اس مضمون میں علی گڑھ کی کوششوں کے متعلق ظاہر فرمایا ہے میں اسے ذاتی تجربہ کی بنا پر جو دو سال زیادہ عرصہ تک مقیم رہنے کی حالت میں مجھ کو حاصل ہوا ہے یہ عرض کر سکتا ہوں کہ وہ بالکل صحیح ہے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کی نسبت جو کچھ وہاں سے صادر ہوتی تھی وہ محض برائے بیت تھی۔ فی نفسہ کبھی یہ ارادہ نہیں کیا گیا تھا کہ طلبا اپنی دنیاوی تعلیم کی ترقی کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی اچھے طریقے سے حاصل کریں اور اسلامی اخلاق ان میں پیدا ہوں۔ لیکن خیر وہ زمانہ گزر گیا ہے اور اب دیکھنا ہے کہ صاحبان حال و حضار زمانہ موجودہ و آئندہ اس میں کیا تغیر پیدا کرتے ہیں۔ اس وقت تک تو اب بھی وہاں جو کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے وہ صرف چند الفاظ سے اور کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وقل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

معارف کے اس مضمون میں جو کچھ کہ حضرت نے تحریر فرمایا ہے اس میں جان صحیح یہ ہے کہ قوم اور علماء میں پھر قریب کا تعلق قائم ہو اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطلب فی زمانہ ندوۃ العلماء کے گروہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مختصراً مجھ کو جب کہ ندوہ کے

---

[1] نواب وقار الملک نے کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۲ء میں تعلیم دیلیات پر جو پیش کیا تھا اس کے سلسلے میں یہ خط لکھا ہے۔

ناظم صاحب اور نائب ناظم صاحب اور چند مشاہیر علماء ندوہ نے مہربانی سے امروہہ کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی تھی۔ اس وقت میں نے ان حضرات سے دریافت کیا تھا کہ کیا بھوپال میں بھی ندوہ کی طرف سے کوئی تحریک ہوئی ہے تو اس کے جواب سے میں اس قدر نتیجہ نکال سکا کہ کوئی مؤثر تحریک نہیں ہوئی اور اب جناب کے ان تازہ اظہار خیالات کے لحاظ سے میرے نزدیک مناسب ہے کہ آئندہ جلسہ ندوہ کا بھوپال میں ہو۔ بشرطیکہ والیۂ جناب اور نواب مدار المہام صاحب بالقابہ اس کو پسند فرمائیں اور پھر حضور عالیہ متعالیہ دامت معالیہا اس کو منظور فرمائیں اور جس وقت کہ یہ ارادہ ہو اور منظوری ہو جائے تب جلسہ کے زمانہ اور اوقات کا تصفیہ ضرور جناب اور نواب مدار المہام صاحب کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہوگا اور حضرات ندوہ یقیناً کمال تفکر و امتنان سے اس کو قبول کریں گے۔ اور پھر یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ ندوہ کا جلسہ بھوپال میں وہ پہلا جلسہ ہوگا جس کی نسبت یہ صحیح طور پر کہا جا سکے گا کہ ندوہ اب تک ایک جسم تھا اور اس جلسہ نے اس میں جان ڈال دی ہے اور اس جسم بے جان میں جان کا پڑنا ان کڑیوں کو پھر درست اور مسلسل کر دے گا جن کے کمزور ہو کر ٹوٹ جانے سے قوم کا سلسلہ علماء قوم کے ساتھ صرف برائے نام باقی رہ گیا ہے اور حضور عالیہ دامت اقبالہا اسی زمانہ میں ندوہ کی درخواست پر ندوہ کا ولی ہونا منظور فرمائیں جو گویا تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی اور قوم کی مرضی کری ہوگی اور بھائیوں کی نفرت اور خداداد علمی قابلیتوں اور شاہانہ مراسم اور ذاتیات کے جو حضور ممدوحہ کی ذات بابرکت کے ساتھ مختص ہیں، ندوہ کے پیرزن کا عہدہ حضور ممدوحہ کے واسطے بے حد موزوں سمجھا جاوے گا۔

حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند کے ذاتی فرمان روائی ہندوستان میں حضور عالیہ متعالیہ ہی اس کی مستحق ہیں کہ وہ مذہبی حیثیت سے مسلمانان ہند کی مادر مشفقہ و معظمہ تسلیم کی جاویں۔ حضرت کے نام نامی کے ساتھ ڈائریکٹری تعلیمات کا انضمام دیکھ کر جس انضمام سے کہ اس عہدہ کو افتخار حاصل ہوتا ہے۔ آج کی ڈاک سے چند کاغذات اردو انگریزی جناب کے ملاحظہ کی غرض سے بھیجتا ہوں اور یہ نتیجہ ہے جو میں نے چار سال کی متواتر کوشش میں اپنے صوبجات متحدہ و ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے واسطے حاصل کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے اب یہ بات خود اہل ملک کے ہاتھ میں آ گئی ہے کہ وہ انگریزی سرکاری مدارس میں مذہبیات کی تعلیم کا انتظام کریں اور جو اس پر بھی نہ کریں تو پھر ان کو خدا سمجھیے۔

ندوہ کے جلسہ بھوپال کی نسبت ایک احتیاطی کارروائی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر پیش کیا تھا مگر تاہم اس قدر اس کے متعلق بھی عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر مدار المہام اس کو پسند فرمائیں تو قبل اس کے کہ اس پسندیدگی کا کوئی اظہار کیا جاوے صاحب ریجنٹ گورنر جنرل سے کسی ملاقات کے موقع پر اس کا صرف زبانی تذکرہ کفایت کرے گا اور ابھی میری طرف سے یہ صرف میرے ہی خیالات کا اظہار ہے۔ حضرات ندوہ پر میں بھی اس کے بعد ہی پیش کروں گا۔ والسلام

خاکسار

مشتاق حسین از امروہہ۔ ۷ جولائی ۱۸۹۹ء

لہ نواب سید علی حسن رضی الدولہ حسام الملک نواب صدیق حسن خاں کے فرزند اصغر تھے۔ مدت تک ملکی تعلیمات کے انچارج رہے۔ پھر لکھنؤ میں اقامت اختیار کر لی وہیں وفات پائی۔

(۳)

بنام محسن الملک

جناب مخدومی!

آپ خفا ہوتے ہوں گے کہ آپ کے خطوں اور خصوصاً تاروں کا جواب وقت پر نہ ملا۔ اصل یہ ہے کہ میں سے شملہ سے لوٹتے وقت الہ آباد کے مقام سے ایک ہفتہ کی رخصت سرکار سے علاوہ عید کی تعطیل کے لے لی تھی۔ پرسوں شام واپس آیا ہوں مگر صحت خراب ہے۔ آپ کا ایک خط، ہرجوانی کا دو خط ہر اگست کے لئے۔ جواب آئندہ کے خط میں دوں گا باقی ہزار روپیہ کے متعلق آپ کا خط مجھ کو وہاں سے چلنے کے دن شملہ میں ملا تھا۔ پہلی ہی منزل میں سرکار نے تار پر روپیہ بھیجنے کا حکم حیدرآباد بھیج دیا تھا۔ خیال ہے کہ اوس وقت روپیہ پہنچ گیا ہوگا۔ میجر ڈارش صاحب کا تقرر درحقیقت اوس قسم کی پالیسی ہے جس کو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں۔ بندہ نے جو کہ جب میں نے پناہ دار کا معتمد حالات جہاں راجہ صاحب کے وقت میں بنایا تھا تو وہ بھی پاسی تھے یعنی کہ اپنی صفائی اور راست بازی کا پاس کیا۔ جواب میں اس لیے دیر ہوئی کہ ..... [1] اور اوس کے بغیر سردی صاحب کو جواب دینا مناسب نہ تھا۔ آپ کے مکان پر سب خیریت ہے خدا کے لیے اب تو جلد آ جائیے گا۔ میں مفصل آئندہ لکھوں گا۔ والسلام والتسلیم!

خاکسار

مشتاق حسین۔ حیدرآباد دکن، ۲ر اگست دوشنبہ [2]

شبلی نعمانی

(۱)

بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

مبارک باد۔ ریویو پڑھا اور بار بار پڑھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ تحسین نہیں بلکہ حسد کے قابل ہیں اور سچ یہ ہے کہ اگر آپ کسی کمپٹیشن کے موقع پر آئیں تو مجھ میں اسی کم بخت فیلنگ کا ظہور ہوگا۔ یہ ریویو اخبار تک محدود رہ کر اڑ پڑ جائے گا۔ اس کو الگ رسالے کی صورت میں چھپنا اور شائع ہونا چاہیے۔ اس سے اور عمدہ نمونے قائم ہوں گے۔ اور

---

[1] یہ مکتوب غالباً نواب محسن الملک کے نام ہے جب وہ معدنیات کے معاہدے کی پیروی کے لیے دولت آصفیہ کی طرف سے لندن گئے ہوئے تھے۔

[2] عبارت پڑھی نہیں گئی۔

عمدہ نمونے قائم ہوں گے۔ اور شاید رفتہ رفتہ حیات جاوید کا کل طوطی تا سد ان نشتروں سے نکل جائے۔ والسلام!

شبلی۔ ۲۴ فروری ۱۹۰۲ء از حیدرآباد

---

(۲)

بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

مکرمی!

یورپ میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو قریباً سال بھر کے لیے مضامین تیار کر لیتے ہیں تب نکالتے ہیں اندوے کے لیے بھی یہ ہونا چاہیے اور چونکہ بڑی دقت پیچھے کی ہے اس لیے میری تو یہ رائے ہے کہ دو تین مہینے کا ذخیرہ اس طرح چھپوا لیا جائے کہ صرف ٹائٹل پیج اور علمی خبروں کے اضافہ کر دینے کے بعد رسالہ بن جائے۔ میں نے ایک چھوٹا سا مضمون بیٹی تفسیر پر، ایک ریویو فن منطق پر، اس میں یونانی منطق کی غلطیاں بتائی ہیں۔ ایک فرنگی عالم کے ایک مضمون کا جو اسلام پر ہے ترجمہ کر لیا ہے۔ مثنوی مولوی روم پر تقریظ کا ایک وسیع سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ بھی اسی طرح جستہ جستہ مضامین لکھ بھیجیے۔ جلسہ کے اخلاق سے شروع کیجیے۔ اور جو جو خیال آتا جائے۔ ان پر چاہیے تنقید کیا ہو۔ کیا اردو رسالے علمی کے برابر؟ لیکن خط اس سے جلی ہونا چاہیے۔ اڈیٹر کا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ دیر سے اچھا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ اوج پر اڈیٹروں کا نام لکھنا ہوگا۔ میں اس کو بھی اڑا دیتا۔ لیکن اول تو سرکاری اسلام سے اس کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے لوگوں میں ندوے کی ہوا اس قدر الٹی چلی ہے کہ محض ندوے کے نام سے اس سلسلے میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔ ان رسالے کے صفحات کس قدر ہوں۔ میں تو دو جزو کافی سمجھتا ہوں۔ والسلام!

شبلی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۳ء

---

(۳)

بنام نواب علی حسن

جناب نواب علی حسن خاں صاحب بالقابہم!

نثار عیسیٰ کہ ہر ساعت کہنہ دلرا — طراز مسند جمشید و فرّ تاج خسرو را
خماں از گرمی ہنگامہ خوبان زد و شستی — بہم آمیختہ لوازمات عارض نکہت و اعضو را

---

۱ مولانا شبلی کی یہ غزل کلیات کے حصہ ارمغان میں شائع ہو چکی ہے۔ صفی اور وحید الملک نواب علی حسن خان بہادر کے نام کے مکاتیب بھی مکاتیب شبلی میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن یہ مکتوب کہیں شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ اس میں غزل کے سوا کچھ نہیں لکھا۔

۲ یہ شعر خرابات زردشتی سے متعلق ہے اور زردشتیوں یعنی پارسیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ایک یزدانی دوسری اہرمنی۔ اسی کو نور و ظلمت سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اسی کا نام وحدت کے مقابلے میں ثنویت ہے۔ خرابات زردشتی نے زلف و عارض سے ظلمت و نور کو باہم ملا دیا۔

ہر سو اند ہجوم دلبران شوخ بے پروا — گل شتن از سر رہ مشکل افتادست رہرو را
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب رکناباد و گلگشت مصلا را

بیا شبلی بیاد چنبر گیر اے مرغ خوش
دگر رہ پارہ گردان بر فلک نہ صد نوا

شبلی۔ از لبیبی کلیر روڈ، بنگلہ دھن کاسٹ پوسٹ آفس بانی کلا
۹ ستمبر ۱۹۰۹ء

اکبر الہ آبادی

(۱)

بنام منشی محمد الدین فوق

الہ آباد۔ مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ

عمریں گذریں آپ سے مراسلت نہیں ہوئی۔ میں کیا کہوں ایک مدت سے کس مصیبت میں ہوں۔ صرف علیل ہی نہیں ہوں۔ اس کے سوا اور بہت کچھ ہوں۔ تفصیل کیا عرض کروں ؎

پڑ گئے گیسوئے اوہام بتاں کے پھندے
پا بہ زنجیر ہے اکبر کا قلم آج کے دن

بہرحال دعا ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے۔

رسالہ طریقت ماہ دسمبر ہاتھ آیا دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ زوائد اور تصنع، لفاظیوں، خود آرائیوں، خود فروشیوں سے پاک۔ سچے روحانی مفید مضامین سے مالا مال۔ جزاک اللہ۔ مس کوریتی کی تقریر سبحان اللہ ذوق تو ملا صاحب کے خیالات بھی طرب۔ کیا اچھا ہوتا اگر پرچہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا۔ کچھ ضرور نہیں کہ اسی درجہ کا انگریزی لٹریچر ہو۔ کام سے کام مطلب سے مطلب۔ کاش گورنمنٹ اسی طریق کی حامی اور مددگار ہو۔ امیر محمد دنیا پرستی کا دھوکہ کر گیا اپنا سی گرلز اسکول کی بنیاد قائم کرتا ہے اپنی خیریت لکھئے۔ دعا لیجئے، دعا دیجئے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء — اکبر

(۲)

بنام مولوی شمس الدین صاحب مرحوم ایڈیٹر البشیر

جناب ایڈیٹر صاحب، جناب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے قرآن مجید کا جو ترجمہ اور دو ترجمہ

لے چوپانی اور پاولیبی کی مشہور تصنیف ہیں۔

شائع کیا ہے۔ وہ درحقیقت نہایت عمدہ بلکہ لاجواب ہے۔ اس سے بہتر خدمت اسلام کی اس زمانے میں ذہن میں نہیں آسکتی۔

اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے ان کے علم و قابلیت سے قوم کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور بہت فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔

بعض مقامات پر مجھ کو شبہ پیدا ہوا ہے یا تو میرا شبہ بے جا ہے اور ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کیونکہ بغیر علم کی روشنی کے محض عقل و قیاس کو اس منزل میں کہاں تک رسائی ہو سکتی ہے اور یا فی الواقع ترجمہ میں کچھ غلطی ہو گئی۔ ایسا ہونا بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ مولوی صاحب کے مددگار اور بزرگ وار بھی تھے۔ شاید کسی نے غلطی کی اور نظرثانی میں اس پر نگاہ نہ پڑی۔ اتنے بڑے عظیم الشان قانون فطرت کے ترجمے میں اگر کہیں دو چار لفظوں پر نظر نہ پڑی تو کچھ تعجب نہیں۔ اب میں ایک شبہ بیان کرتا ہوں سورہ والتین کے ترجمہ صفحہ ۹۵۱ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین کا ترجمہ حسب ذیل کیا گیا ہے۔ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو رذیل کر کے کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا دیتے۔

بریکٹ میں جو الفاظ توضیح کے لیے بڑھائے گئے ہیں اس کی صحت میں مجھ کو شبہ ہے۔ درحقیقت ترجمہ غلط نہیں ہے معنی میں شاید غلطی ہوئی میرا خیال تھا اور ہے کہ یہاں جوانی اور بڑھاپا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کا بیان ہے ترک دنیا کس درجہ۔

دوسری آیت الا الذین آمنوا و عملوا الصلحٰت فلھم اجر غیر ممنون اس خیال کی تائید کرتی ہے

اگر میرا خیال صحیح تسلیم کیا جائے تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح چاہیے اگر میرا خیال صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔ تو بات زیر بحث ہو گی

سید اکبر حسین، الہ آباد

مولانا عبدالحلیم شرر

(۱)

بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

جناب من۔ اسلام و علیکم۔

آپ نے اپنے والد کے مورخہ ۳ ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ میں جناب حکیم سید علی حسین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی حسرت ناک وفات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے بجا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کا بہت زیادہ حصہ آپ ہی لوگوں میں گزرا۔ اور جس طرح آپ نے ان لوگوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ اسی طرح ان کو بھی مرتے دم تک آپ ہی کے ساتھ تعلق رہا۔ جس

رئیس کے گھر انتقال ہوا وہ بھی آپ کے ایک صدمۂ عزیز ہی اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جس دن انتقال ہوا ہے عین مہینے تاریخ جناب خلیل اللہ خاں صاحب کے گھر کے لوگوں کا علاج کرنے کو جانے والے تھے۔ میں آپ کا نہایت ہی شکر گزار ہوں۔ اور اس طرح حکیم صاحب مرحوم کے تمام متعلقین آپ کے ممنون ہیں کہ ایسی غم و اندوہ کی حالت میں آپ نے دل دہی اور تسلی دینے کی کوشش فرمائی۔ حکیم صاحب مرحوم کے جن اوصاف کا آپ نے تذکرہ فرمایا، وہ اوصاف بے شک ایسے ہیں کہ اس طبقے کے بزرگوں کے ساتھ ختم ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے خود ان مرحوم کو تعلق تھا۔ مگر عزیزی میں کہتا ہوں کہ آپ پھر بھی اس عظیم صدمے کو محسوس نہ کریں گے جو اس نیک ذات کے اٹھ جانے سے ہم لوگوں کو ہوا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی بگڑ گیا۔ آپ کو شاید نہ معلوم ہوگا کہ جس خاندان کی یادگار حکیم صاحب مرحوم تھے۔ اس کی پچھلی یادگار اکیلے وہی تھے۔ اور اس کا ادنیٰ نتیجہ تھا کہ ضعیفہ اور بیوہ عورتوں کی ایک بڑی جماعت کی خبر گیری وہی کرتے تھے۔ اب ان لوگوں کی بے کسی کی حالت ایسی نازک ہے کہ بیان کرنے سے بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اگرچہ مرحوم کے بعد قدرۃً ان تمام باتوں کا ذمہ دار میں ہوں۔ مگر ایسی فیاض و نیک ذات کی جانشینی کے لیے بہت سی لیاقتیں چاہیئے ہیں۔ جو مجھ سے ناکارہ شخص میں بالکل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ میرے زخم جگر پر مرہم رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے دلوں کو دھاس بندھانا انسان سے باہر اور خدا ہی کے اختیار میں معلوم آتا ہے جس کو اب مرحوم کے بعد زندگی کے باقی ماندہ ایام بسر کرنا دشوار جلد خیز تا بل برداشت مصیبت معلوم آتا ہے۔ حکیم صاحب مرحوم کو آپ کے خاندان بھر میں آپ کے والد ماجد سے بہت زیادہ تعلق تھا ان کو ہمیشہ یاد کرتے تھے اور ان کے نیک اخلاق اور ان کی کریم النفسی کے ہر وقت معترف رہا کرتے تھے۔ یقیناً ان کو بھی بہت بڑا صدمہ ہوا ہوگا۔ آپ کی طرف سے میں نے جناب حکیم صاحب مرحوم کے گھر میں لوگوں کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی۔ اور وہ سب آپ کے شکر گزار ہیں۔ میں ان دنوں لکھنؤ سے باہر تھا اور اسی وجہ سے والا نامے کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مجھے ندامت ہے کہ لکھنؤ میں بھی ایک اتفاقی اور فوری بیماری کی وجہ سے مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

۲۳ اپریل ۹۹ء

میں ہوں آپ کا خادم محمد عبدالحلیم شرر از لکھنؤ

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن

بھائے دامادے من۔

آداب و نیاز اور السلام و علیکم کے بعد بعد ادب عرض ہے کہ گرامی نامہ مورخہ ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء وصول ہو کر باعث سرفرازی ہوا۔ میں وعدہ کر گیا تھا اس کو بھولا نہیں۔ آتے ہی مولوی سید عبدالمجید صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس بارے میں جناب نے ان سے بھی مراسلت فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس معاملہ میں غور کرتا رہا ہوں خاندانی تعلقات کا جناب نے تذکرہ فرمایا ہے۔ ان کا پتہ لگانا دشوار ہے اس لیے کہ میں دنوں کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں بیٹا

وفات کی ایسی اجزہات تھی کہ کسی اگلے خاندان کا اب پتہ لگانا قریب قریب غیر ممکن کے ہے۔ اور بالفرض پتہ لگے بھی تو حاصل کیا۔ اس لیے کہ ان کے ثبوت سے کوئی خاص حق حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

رہا یہ امر کہ جناب یہاں توطن اختیار فرمانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے کسی اجازت کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص آزادی کے ساتھ یہاں آ کے رہ سکتا اور جائداد خرید سکتا ہے۔ اور توطن اختیار کرنے کے چند ہی روز بعد سے اُسے جملہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے کہ ملازمت کے لیے بارہ سال تک یہاں مقیم رہنا مشروط ہے۔ مگر یہاں چلنے اور مکان خرید لینے کے بعد اگر درخواست کی جائے تو جیسا بارہ سال کی شرط بھی اُٹھ سکتی ہے۔ الغرض آپ کے لیے کوئی امر مانع توطن حیدرآباد نہیں ہے۔

لیکن یہ بات کہ آپ کے تشریف لانے سے پیشتر حضور سے کوئی اجازت حاصل ہو تو بقول سید عبدالمجید صاحب کے ایسی درخواست کو اعلیٰ حضرت مستقبہ منظوری سے دیکھیں گے۔ اور خیال ہوگا کہ اجازت توطن کے پردے میں کوئی اور حق حاصل کرنا منظور ہے اور ایسے شبہ کا پیدا ہونا اچھا نہیں۔ میرے خیال میں اگر جناب کو یہاں رہنے کا شوق ہے تو عمدہ کوٹھی یہاں خرید لیجئے اور اس میں آ کے رہنا شروع کر دیجئے۔ اور یہیں کے قیام کے زمانہ میں وہ کوششیں عمل میں لائیے جن کو جناب یہاں آنے سے پہلے کر رہے ہیں۔ آ جانے اور مکان خرید لینے کے بعد سب باتیں بہ آسانی بلکہ خود بخود پوری ہو جائیں گی۔

میں یہاں حضور کی سیرۃ لکھنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اور میرا سابق کا وظیفہ ۵۰ کے پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ قرار پائی تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس کام کے لیے تین سو تیس ماہوار کا عملہ ۔۔ اور مواد جمع کرنے کی کوشش شروع ہو گئی اور دفتر کا نام دفتر شوکت ثمانیہ قرار پایا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایک فرمان سے حکم ہوا کہ مجھ ہی سے ایک مکمل تاریخ اسلام تصنیف کرائی جائے اور اس کی بابت جداگانہ ماہواری جائے۔ اس حکم کے مطابق میرے لیے علاوہ ماہوار سابق کے دوسری ماہوار پانچسو روپیہ اور تین سو چہتر روپیہ ماہوار کا عملہ منظور کر کے بارگاہ خسروی میں پیش ہوا ہے۔ شاید آج ہی کل میں منظور ہو کے آ جائے مگر ان سب جائزوں پر اشخاص یہیں سے نامزد ہو گئے ہیں۔ بہرحال سنگ ہے۔ میں حضور میں بواسطہ عرائض پیش کر سکتا ہوں اور جو لکھتا ہوں اس کا فوراً جواب ملتا ہے۔ میرے حال پر منظر عنایت بھی غیر معمولی ہے۔ مگر ماہوار کا موقعہ ابھی ایک ہی بار ملا ہے۔ لیکن صاحب اور شاہی مزاج کی نزاکت کی یہ حالت ہے کہ اپنے امور متعلقہ کے سوا اور کسی بات کے عرض کرنے کی مجھے یا کسی اور کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ آئندہ اگر زیادہ صحبت ہوئی جس کے چار پانچ ماہ بعد قطعی امید ہے اس وقت شاید کسی اور بات کے عرض کرنے کا موقع بھی مل سکے۔ والسلام

۲۵ جنوری ۱۹۱۸ء — خاکسار محمد عبدالعظیم قریشی

پیارے صاحب اور اچھے صاحب کی خدمت میں سلام نیاز اور آداب قبول ہو

دفتر، محبوب پورہ، جام باغ حیدرآباد دکن

ریاض خیر آبادی

(۱)

بنام احسن مارہروی

مکرمی!

کارڈ ملا۔ ریاض اخبار کی بابت عرض کرو قیمت قبول فرمانے کا شکریہ۔ مجھ سے پوچھتے تو عرض کرکے آج ہی کا اخبار روانہ کر دوں گا۔ مگر دیکھتے کا۔ ناگوار نہ ہو میری صاف روش جرأت دو تی ہے۔ ورنہ بقول میرے ؎

میں جانتا ہوں زر طلبی کو کمال عیب
دینار و رخ ہے مرے دست سوال کا

اگر میرا یہ فعل کچھ بھی گراں ہو تو بے تکلف واپس کر دیجئے گا میں نادان کو سزا قصور سمجھ کر پھر وہی پرچہ پوسٹ روانہ کر دوں گا۔ یہ امر کہ انعام زیادہ ہے لوگ پسند نہ کریں گے۔ میں نے صرف رائے کا اظہار کیا تھا۔

ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند

آپ کو ضرور مجھ سے دلی انس ہے۔ اس قدر متاثر ہوں کہ بے تکلف آرزو سے یک جانی کر بیٹھا۔ آپ میرا خیال صحیح سمجھیں بات یہ ہے کہ میں زر سے پریشان ہو رہا ہوں۔ اول تو بالکل تہی کیسہ چہ خورد و بامدار فرزندم کی ہر وقت فکر دوسرے محض تنہا بے تجارتی کام تنہا جب ہی چل سکتے ہیں کہ انسان فارغ البال ہو صیغۂ ملازمت وسیع ہو۔ معانی

نگی تموار اور میں لاغر
کیا چھوڑے گی کیا بنائے گی

یک جانی کا کوئی مناسب طریقہ ممکن ہوتا تو آپ کی ذاتی مالی وعنایت سے ایک مرتبہ ذہن سر پر اوٹھا لینے کی کوشش کی جاتی۔ مگر یہ حسن اتفاق کہاں ممکن۔ پریس ضرور قائم کیجئے صرف کتب کے لئے۔ تجارتی چھپائی یا اخبار نکالنے کو مارہرہ بہت ہی چھوٹا مقام ہے۔ بہرحال کچھ کرتے رہیئے۔ خصوصاً نام آوری کے کام۔ طرح میں غزل تو دوں مگر بہت ہی امتیاز خاص چاہتا ہوں یہ آپ کا کام ہے۔ ریاض خلیل کے ذریعے پبلک کے روبرو جس طرح چاہے مجھے نمایاں کیجئے۔ آپ دفتر اخلاق سے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ کرا دیجئے کے ساتھ پیچھے کچھ موزوں الفاظ میں خیر مقدم کیجئے۔ تصویر پھولوں سے لدی ہوئی شائع کیجئے۔ یہاں تک کہ دنیا میں میرا کوئی ثانی نظر نہ آئے۔ مگر جب کلام پر نظر پڑے گی تو سب مسرت انسوں سے بدل جائے گی۔ آنکھ میں آنسو آ جائیں گے۔ کلام اس قابل ہوتا تو نقد کا مضائقہ نہ تھا۔ نہیں حضرت نہیں۔ واللہ مجھ کو آپ خلصی سادگی کے ساتھ معمولی درجہ کے شعرا کی آخری حالت میں لیجئے۔ یہ باتیں مذاق کی تھیں۔ میں غزل ضرور بھیجوں گا۔ میرے نام کے ساتھ زائد الفاظ نہ ہوں گے۔ صرف ریاض کافی ہوگا۔ دعوے تو اس نہاٹ سے کر رہا ہوں کہ غزل بھیجوں گا۔ اور قصد یہی ہے۔ مگر غزل بھی تو ہو جائے۔

آج آپ نے محبت جتا کر میرا بہت ہی وقت لیا خدا آپ کا بھلا کرے۔ باتوں میں چند منٹ دل خوب بہلا۔ اب نہ وہ ہم نہ ہماری حالت، نظر دنیا کھا گئی۔ کچھ روز سے اور عالم ہو گیا ہے۔

یاد ہوں گی تجھے گلشن کی بہاریں کیا ہیں
چٹکیوں تو تھی تو شور رضا دل ہوتا

بشمردہ ریاض ۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء

---

(۲)

بنام چودھری فتح محمد صاحب شیفتہ بی اے

عالی جناب چودھری فتح محمد صاحب بالقابہ!

ہندوستان میں رسوم ہے کس کے کام کی
وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں

عنوان تو شاعرانہ تھا ہے مگر کیا کروں راز حقیقت اتنی ہے کہ ریاض اخبار ہفتے میں دو بار "تحفہ" ہفتہ وار "تاریخی" روزانہ "عطر تحفہ" ہفتہ وار "گل ہیں" "اخبار" "صلح کل" روزانہ یہ سب میری ایڈیٹری اور حکمت میں رسوں شائع ہوتے رہے اس زمانے میں اخبار کم تھے "کوہ نور" پنجابی لاہور سے "اودھ اخبار" روزانہ لکھنؤ سے "ادریس گوٹ" ہفتہ وار میرٹھ سے شائع ہوتے تھے۔ میرے نام اور تخلص کی شہرت کا یہی سبب تھے۔ یعنی وہ پرچے جنہیں میں نکالتا تھا۔ سر عبدالقادر صاحب قریب قریب اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ یقیناً خط و کتابت کے ذریعے سے میرے شاسا بھی۔ نیز ان کی تحقیق و تدقیق و ذکاوت و ذہانت اور عالمانہ وسیع معلومات کا مدت سے معترف ہوں۔ سر اقبال شاعرانہ حیثیت سے مجھے جانتے ہیں اور اخباری حیثیت سے بھی۔ مجھے اس وقت مرحوم گرامی کی یاد بے اختیار آئی۔ وہ مجھ سے حیدرآباد میں اس وقت ملے تھے جب میں سر مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا مہمان تھا۔ میں ان کی فارسی شاعری کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس سے میری یہ غرض نہیں کہ سر اقبال کی اردو شاعری کا احترام ان کے بلند خیالات کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں فرق کے ساتھ ہے۔ میں سمجھتا ہوں سر اقبال کے بلند خیالات نے ان کے ہر مصرع کو ہمالیہ کی بلند چوٹی کا مصداق زری بنا دیا ہے۔

پچاس سال ہوئے سر سید مرحوم کے زندہ دل پنجاب کا فقرہ لکھ کر پنجاب کو اور صوبوں سے امتیازی حالت میں ظاہر کیا تھا۔ ممکن ہے اس وقت کی تعلیمی دلچسپیاں لاہور کو گل سر سبد بنائے ہوں مگر دیکھتے ہی دیکھتے تمام اصناف میں پنجاب نے اپنی زندہ دلی سے تابو حاصل کر لیا۔ بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے ؎ ریاض

تری امتحان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

مجھے بہت زیادہ حیرت زبان کی ترقی پر ہے۔ پنجاب کے شہری افراد ہوں یا اہل تصنیف و تالیف روزانہ ہفتہ وار

رسالے ہوں یا ماہوار شائع ہونے والے رسالے۔ قریب قریب کسی پاکیزہ اور ساختہ دبے ساختہ زبان میں استعمال کرتے ہیں پنجاب ٹکسالی اردو میں بھی دہلی و لکھنؤ سے قریب قریب یکسانیت حاصل کر لیا۔ مگر ٹکسالی زبان تو جو وہ اپنے خاص مرکزوں سے وقعت ہو رہی ہے۔ پھر بھی مایوسی میں امید کی جھلک اس اعتبار سے نظر آ رہی ہے کہ زندہ دلان پنجاب اگر ٹکسالی زبان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو ضرور اس پر بھی قابو حاصل کر لیں گے۔ وہ ٹکسالی زبان جو غالب دائیں کا حصہ بھی جاتی ہے اور زمانہ سر سید سے اب تک خان بہادر میر ناصر علی مرحوم مدیر صلائے عام کا جو حصہ ہو گئی تھی۔ ضرور ٹکسالی اردو کی نظم کو امیر داغ، جلال نے چار چاند لگائے۔ زندہ دلان پنجاب کاش ادھر بھی توجہ فرمائیں۔ جو زبان اسکولوں اور کالجوں میں اور ابتدائی مکاتیب میں داخل درس ہو چکی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ خاص توجہ سے ٹکسالی زبان ہو سکتی ہے۔ ورنہ تاریخی اردو دیوار کی کی مصداق جیسی اب ہے آئندہ بھی رہے گی۔

میں آپ کو کیا لکھنا چاہتا تھا اور کیا لکھ گیا گویا کسی اخبار کے لیے بے امید مضمون کا مسودہ کر رہا ہوں۔ مجھے جناب کو نیاز نامہ لکھنے کا اتفاق اس بنا پر ہوا کہ میں نے قضا صاحب کو ایک خط اس غرض سے لکھا کہ میرے دیوان کے طبع کا جو چرچا تو پنجاب وغیرہ میں زیادہ عرصہ سے ہے مگر تاخیر نے ہر طرف ناامیدی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس لیے قضا اور دوسرے احباب کو میں یقین دلانا چاہتا تھا کہ دیوان کی طباعت و اشاعت کا زمانہ اب قریب ہے اور اعتبار دلانے کو میں نے ملک کے سرمایۂ ناز سر سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد کی چٹھی جو اسی دن میرے نام آئی تھی بصورت نقل اسی خط میں ملفوف کر دی تھی۔ قضا صاحب نے اس چٹھی سے متاثر ہو کر یہ چاہا تھا کہ دیوان ریاض کے متعلق اپنے صوبے کے سرمایۂ ناز حضرات یعنی سر عبدالقادر صاحب بالقابہ، سر اقبال صاحب بالقابہ، ملک سر فیروز خاں نون ایم اے وزیر تعلیم پنجاب سے ایسی ہی چٹھیاں یا نوٹ حاصل کیے جائیں۔ کہ دیوان ریاض کو ان کے ذریعے سے بھی روشناس عالم ہونے کا موقع حاصل ہو سکے۔

قضا صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک "نیاز نامہ" جناب کو بھیجوں۔ آپ محاسن اور مختلف خوبیوں کا مجموعہ عجیب ہیں۔ مجھ پر آپ کی ستائش کا بخصوصیت تخلص یعنی کیل ہیں کہ قافیہ گل بوریں است یہ اثر ہوا کہ میں آپ کو خط بھیجنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ آپ جواب لکھنے کی تکلیف گوارا کریں یا میری اس بے سر و پا طولانی تحریر کے پڑھنے میں وقت ضائع کریں۔ میں جس اونٹ کے پوزیشن میں ہوں میں جانتا ہوں۔ مالی حالت سے بہ لحاظ کثیر اولاد ہونے اور صرف لعبہ ماہوار پنشن ہونے کے مجھ پر ضرور دنیا تنگ کر دی ہے۔ مگر دیوان کی اشاعت انشاء اللہ ضرور میرے لیے اطمینان پیدا کر دے گی۔ بقول میرے ؎

اس اک چیز ہے دنیا میں اگر قوت نہ جائے

سر نواب قاضی عزیز الدین وزیر دنیا میرے واسطے بہتری ذریعہ تھے کہ میں لکھنؤ میں اعلیٰ حضرت نظام دکن سے ملوں۔ مگر میری قسمت نے مجھے روک دیا۔

بے شک سر عبدالقادر صاحب، سر اقبال صاحب، ملک فیروز خاں صاحب نون ایسی بلند پایہ شخصیتیں ہیں کہ وہ میرے

دیوان کے متعلق اظہار خیال فرمائیں تو محمود حسین کی یہ قدر شناسی ملک کی شکر گزاری کا باعث ہوگی۔ مگر میں محمود حسین سے ایسی استدعا کرنا اس خدا رسیدہ بزرگ کے ادب اور شان کے خلاف سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے بے بضاعت کم ایسے شخص کی شاعری کو اس مرتبے پر پہنچایا کہ انگریزی تعلیم یافتہ بلند پایہ حضرات میں کی قابلیت کے دور جدید کی شاعری کو کچھ سے کچھ بنا رہا ہے۔ میرے لیے تو نہیں مگر میرے اشعار کے لیے اچھے الفاظ سے کچھ نہیں فرماتے ہے

کہتا تھا کل زخموں سے دیا تھا شکستہ حال
مجھ کو نہ دیکھئے مرے اشعار دیکھئے

میرا خیال یہ ہے جو حضرات میرے دیوان کے لیے عارفانہ فرمائیں گے وہ اپنے لیے میرے دیوان میں اپنی مستقل یادگار قائم کر دیں گے۔

نوشتہ ہاند سیہ بر سپید

فقا صاحب نے اپنی امید میں جو آپ کے دامن سے وابستہ کی ہیں۔ ان کا لحاظ فرماتے ہوئے آپ حضرات محمود حسین کو تکلیف دیا جائیں اور مزید اعتبار کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہو تو آپ سلیمان صاحب چیف جسٹس کی چٹھی نقل شدہ جو ملفوف بھیجتا ہوں آپ پیک شدہ صورت میں یا یونہی ان کی خدمت میں بھیج دیں یا خود کسی وقت دکھا دیں گے۔ میں وہ غزل بھی ملفوف بھیجتا ہوں جس کے لیے اچھے الفاظ خان بہادر نور الٰہی صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے اپنی چٹھی موصولہ حال میں مجھ کو لکھے ہیں ہے

قدر داں گوہر سخن کے دیا تھا
منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

سید ریاض احمد ریاض حیرآباد دکن اودھ اصلع سیتاپور
۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء

حبیب الرحمٰن شروانی

(۱)

بنام سید مخدوم عالم صاحب

مخدومی، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

الطاف نامے کا سپاس گزار ہوں۔ آپ بے کاری کی شکایت کرتے ہیں۔ اور مجھے بالکل بننے کی تدبیر میں مشورے کے خواستگار ہیں مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ ایسا شخص کیوں کر بیکار ہو سکتا ہے جس کے قبضے میں شباب، علمی استعداد، روشنی خیال، خاندانی عظمت معاش وغیرہ اسباب قوت ہوں جس کا کام کرنے کے اتنے میدان کھلے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کام کا شائق ہو تو بقول شخصے دل ہی کشد کہ جا اینجاست۔ کا مضمون ہوتا ہے۔ ابھی آپ کی کانفرنس میں جو پریسیڈنشل ایڈریس مسٹر ایمن نے دیا اس میں کالجوں

کا ماضی و مادی اخلاص جس پیرائے میں دکھایا ہے وہ دلوں پر تاثر دینے کا کام نہ دے تو سمجھنا چاہیے کہ دل مر چکے۔ ہر ایک مسلمان جو ارادہ کرے، اس اخلاص کو دور کرنے اور قومی قول میں اضافہ کرنے میں مدد دے سکتا ہے کس طرح؟ یہ مجھ سے سنیئے۔ مسلمانوں میں جو مرض ساری ہے وہ بے فکری کا ہے۔ باقی کل خرابیاں اس مرض کے اعراض ہیں۔ اگر اس مرض کا علاج کیا جائے یعنی مسلمان اپنی حالت پر غور کر کے اس کا اندازہ حقیقی طور پر کریں تو ابھی کامیابی ہے۔ آپ خانقاہوں میں، مسجدوں میں، عربی مدارس میں، کالجوں میں، اگھروں میں، بازاروں میں، احباب کی مجلسوں میں، غرض مسلمانوں کے ہر طبقے میں جا کر دیکھئے بے دلی اور کم حوصلگی کا سناٹا ہر جگہ آپ محسوس کریں گے۔ اور یہ رنگ آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ ایک یا دو مسلمان جوان مردانہ کسی کام کے کرنے میں جان نثار رہے ہیں۔ اور ان کی ساری حرکات و سکنات سے حوصلے کی گرمی ٹپک رہی ہے۔ جو دیکھنے والوں کے دلوں میں کچھ نہ کچھ برقی اثر دوڑا دیتی ہے۔ کیا اس سے اعلیٰ اور پاکیزہ کام کسی مسلمان کے واسطے ہو سکتا ہے کہ وہ اس بددلی کے دور کرنے اور حوصلے کی گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقتاً یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے ایک اعتبار سے خوش قسمتی کا زمانہ ہے اور یہ یوں کہ جو وقت مسلمانوں پر کبھی کبھی آن کر پڑا ہے وہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اور جو موقع قومی خدمت کا ہم کو حاصل ہے وہ بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔ اگر کوئی جوان مرد نیک دلی کے ساتھ اس خدمت میں جان دے دے تو شہادت کے مراتب پانے کی امید کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کی بے فکری کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا خواب دیکھتے ہیں تو ان دنوں دماغوں کے دربار کے سامنے نہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یعنی وہ یہ منصوبے باندھتے ہیں کہ جب بغداد کا دربار آراستہ ہو اور ہم شان و شوکت کے ساتھ اس میں جا کر پایۂ تقرب میں کھڑے ہوں تو اس وقت علی گڈھ میں یونی ورسٹی کے واسطے ایسا وقف حاصل کریں جس کی آمدنی کیمبرج اور آکسفورڈ کو ان واحد میں گرو کر دے۔ لیکن آہ بغداد کا دربار نہیں ہم میں بڑی عروج کا کچھ شائبہ نہیں پھر ہم قومی خدمت کیا کر سکتے ہیں۔ جب اس خواب سے آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے دماغ کی طرح خستہ اور مضمحل پاتے ہیں جس نے ابھی کسی دماغی دورے سے نجات پائی ہو۔ اور اس خواب کا سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ چند روز تک خواب دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ جب وہ ایسا خواب دیکھنے لگتے ہیں تو اس کا خیال نہیں کرتے۔ کہ بغداد کا دربار دربار یوں کے عروج نے نہیں سجایا تھا بلکہ وہ ان پاک دل کاریگروں کی محنت کا ثمرہ تھا۔ جو راہ خدا میں لڑ گئے تھے۔ اگر ہم بھی پاک دلی سے قومی خدمت کے لیے مزدور بنیں تو پھر عظمت قومی اور شوکت ملی کا دربار سجا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم مزدوری کرنے کہاں جائیں۔ جواب یہ ہے کہ جہاں ہم ہیں وہیں مزدوری شروع کر دیں۔ قومی عمارت کا سلسلہ اس کلیا سے ہمالیہ تک جلد دنیا کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ہر جگہ مزدور بننے سے کام بنتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل سنیئے۔ آدم بر مطلب سب سے اول ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم تو قومی عمارت کے ایک جز ہیں۔ لہٰذا یہیں سے کام شروع کر دیں۔ دوسرے

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم امارت کے علاوہ علم و فضل میں بھی بلند مرتبہ شخصیت کے مالک تھے۔ اور جو کتب خانہ انہوں نے فراہم کیا تھا۔ وہ دور حاضر کے نوادر میں سے تھا۔ وقت کے تمام اکابر علم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ان کے بعض مکاتیب محمود کا روان خیال میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہیں تو تحصیل علم کریں۔ تحصیل کے لیے مزدور نہیں کہ کالج میں ہی پڑھیں۔ باہر جانے کی وسعت نہیں تو گھر پر پڑھیں۔ مکتب پڑھ تو جاگ دوڑ کر جو خواندہ مل جائے اس سے سبق لیں کوئی نہ ملے تو بیٹھنے سے حساب کے گر ہی سیکھیں۔ اگر ایسے گرے میں ہیں جہاں کوئی پڑھنا لکھنا نہیں تو جو کام گاؤں میں ہوتے ہوں ان کو سیکھیں۔ ہل جوتیں۔ لوہار کا کام کریں۔ تجارت حاصل کریں فرض کچھ کریں، ہو کر اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم اس حسرت میں وقت کھو دیں کہ ہم کو وظیفہ ملتا اور کالج میں جا کر پڑھتے۔ ہاں ہم جوان ہیں۔ گھر میں بیوی۔ بچے۔ بوڑھی ماں ہیں۔ رہنے کو مکان ہے۔ تھوڑی سی معاش بھی ہے۔ جہاں ہم رہتے ہیں وہ شریف مسلمانوں کی بستی ہے جو گزشتہ تاریخ بھی رکھتی ہے۔ ہمارا بھائی بھی ہے۔ دوست احباب بھی ہیں ہم کچھ لکھے پڑھے بھی ہیں۔ صحبت کی بدولت مسلمانوں کی ضرورتوں اور دوسری قوموں کی حالتوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اب تو بے انتہا کام ہم کو کرنا ہے۔ جس سے ساری عمر فرصت نہیں ہو سکتی۔ ہم کو اول تنگ دلی اور وسعت خیالی اور تحمل کی عادت اپنے نفس میں پیدا کرنی چاہیے۔ اس کے ذریعے سے ہم ان لوگوں سے جن سے ہم کو سابقہ پڑے محبت و ہمدردی کے ساتھ مل سکیں گے۔ کفایت شعاری سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمدردی و محبت ملنے والوں کو ہمارا گرویدہ کر دے گی کفایت شعاری اطمینان قلب پیدا کرے گی

اب ہم گھر میں جاتے ہیں تو بیوی کو علم کا شوق دلاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو اس کو لکھنا پڑھنا بتاتے ہیں۔ رسوم بے جا کی برائی ذہن نشین کراتے ہیں۔ احکام دین کی پابندی کی تعلیم کرتے ہیں۔ جو نقائص عورتوں کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں ان کے مقابلے زور سے جہاد کرتے ہیں۔ لڑکی کی تعلیم کی فکر کرتے ہیں یعنی اس کو کم سے کم جو ممکن ہے لکھاتے پڑھاتے ہیں۔ سینا پرونا سیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بوڑھی ماں سے بکشادہ پیشانی پیش آتے ہیں۔ سعادت مندانہ بات چیت کرتے ہیں۔ جو خدمت قابل سرانجام ہو وہ انجام دیتے ہیں۔ مکان کی صفائی کا اہتمام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے اس تھوڑی سی دیر میں کتنی خدمتیں انجام دیں۔ تعلیم نسواں۔ مادی ترقی۔ حفظ صحت وغیرہ بہت سے کام ہیں۔ دوست احباب سے ملتے ہیں تو ان سے ان کا دکھ درد سنتے ہیں۔ ان کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں ان کے دکھ سے مغموم۔ مگر یاد رہے منافقانہ نہیں مخلصانہ پھر دیکھتے ہیں کہ ان کو کس خدمت کی ضرورت ہے اس خدمت کو بخوش اسلوبی ادا کرتے ہیں۔ فرض کیجئے ہمارا دوست خوش حال ہے مگر لڑکے کی تعلیم سے بے فکر ہے۔ اس کو اس طرف توجہ دلائیں گے یا وہ بے جا خرچ کرتا ہے۔ اس کو اس کی مضرتیں سمجھائیں گے، فضول خرچ ہے تو کفایت شعاری کی ترغیب دیں گے۔ فیاض ہے تو روپیہ مفید کاموں میں صرف کرنے کا شوق دلائیں گے وقس علی ہذا۔ اس کے ساتھ ہی یہ توقع نہ کریں کہ ایک مار کی فرمائش و نمائش بار آور ہو گی۔ نہ اس سے عمل ہوں گے۔ کہ دوست نے ہماری نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ فرض کیجئے ہمارا دوست مفلوک ہے۔ اس کی بے کاری رفع کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ نہ کچھ ہو سکے تو اپنے ہمدردانہ برتاؤ اور کلام سے اس کی مصیبت کے ہلکے کرنے کی کوشش کریں یہ بھی تھوڑی بہادری نہیں۔ بھائی سے برادرانہ شفقت کا برتاؤ رکھیں۔ اس کی ناز برداری کریں اپنے اور اس کے حقوق کو برابر سمجھیں۔ تنگ دلی سے کام نہ لیں۔ اسی طرح دوسروں کے لیے عمدہ نظیر قائم کریں۔ فرصت کا وقت مطالعہ وغیرہ علمی مشاغل میں صرف کریں۔ شادی وغیرہ تقریبوں میں شریک ہوں تو سب سے اول ایسا شگفتہ مزاج قائم رکھیں کہ صاحب تقریب کے ہماری مہمان داری میں وقت

پیش نہ آئے۔ بلکہ ہماری آسائش کی فکر کرے تو بھی ہم نہ بگڑیں اور اس طرح دل میں گنجائش پیدا کرکے کچھ مناسب حال الفاظ اس کے کان میں ڈال دیں جو ہمارا کہا اس تقریب میں کام نہ آئے تو آئندہ آئیں گے۔ یہ بھی نہ ہوا تو دوسروں کے لیے تیر ہوگا۔ تیر بھی نہ ہوا تو ہم اپنے فرض سے ادا ہوں گے۔ نیز ایک پریشان حال بندۂ خدا (صاحب تقریب) کی مصیبت نہ بڑھائیں گے۔ ہمارے محلے میں جو مسلمان دکاندار ہیں ان کو ہم صفائی معاملہ کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں کہ جو ہمارا اسطرح اس سے ہمراہ میں صفائی رکھیں اور ان کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کریں۔ موقع موقع سے بہت استقلال کے متعلق دو چار لفظ بھی ان کے کان میں ڈالتے رہیں۔ اپنی بستی کی گزشتہ تاریخ کے مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے عمدہ معنی تقریباً تقریباً ابتدائے زمانہ کو سناتے ہیں۔ بزرگوں کی علمی یادگاروں کو جو ہماری دسترس کے اندر ہوں قائم و محفوظ رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اس سب کچھ کرنے کے بعد جب (بالفرض) ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو کوشش ہم نے کی وہ بالکل بار آور نہیں ہوئی۔ بلکہ سب جگہ اکارت گئی۔ تو پھر ہم یہ خیال کرکے مطمئن رہتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور یہ اطمینان ہم کو کوشش میں برابر مصروف رکھتا ہے۔ میرے مخدوم! اگر ہم نے اپنی زندگی اس طرح پر کی تو کیا ہم بے کار رہے اور کیا بالکل اس کا ہم ہے کہ ہم ذکر کے پابند ہو کر بے کار ہو جائیں؟ دراز آہنگی معاف فرمائیں۔ والسلام بالاکرام۔

خاکسار حبیب الرحمن

حبیب گنج ۲ر جنوری ۱۹۴۲ء

علامہ اقبال

(۱)

بنام مولانا عرفان صاحب

۲۵ر جولائی ۳۳ء (بصیغۂ راز)

جناب مولانا!

السلام علیکم۔ مولانا شوکت علی تو اس وقت مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ آپ ان سے دریافت حالات کرکے اس خط کا جواب دیں۔ کچھ روز ہوئے میں نے ان کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ہندو بزرگ مسٹر قت کا خط میرے پاس آیا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ ڈاکٹر مونجے ہماری اسکیم کو جو ہم نے لیگ کی صدارتی ایڈریس میں پیش کی تھی تسلیم کرتے ہیں۔ پنڈت مدن سے بھی مشورہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کریں گے۔ اس وقت علانیہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کرنا مصلحت نہیں ہے۔ یہ خط بصیغۂ راز تھا اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے مولانا شوکت علی صاحب سے بھی گفتگو کی ہے۔ وہ بھی صلح پر آمادہ ہیں۔ اسکیم جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے یعنی شمالی ہندوستان کے مسلمان صوبوں کا ایک ہو جانا۔

اس خط کے موصول ہونے پر میں نے مولانا شوکت علی کو لکھا اور انہوں نے اس بات کی تصدیق کی مسٹر قت ان سے ملے تھے۔ میں نے مسٹر موصوف کو دو خط اس کے جواب میں لکھے تھے مگر یہ خط قریباً ایک ماہ دو لیٹر اس کے ذریعہ سے میرے پاس آگئے ہیں۔ پہلے مجھ کو شبہ تھا کہ اس میں کوئی چال اور عیاری ہو مگر اب خطوں کے واپس آجانے سے یہ شبہ رفع ہوا۔ مسٹر قت اب معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ اور مذکورہ بالا خط لکھنے سے ان کا کیا مقصد تھا۔ ممکن ہے۔ مولانا شوکت علی اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔ بعض لوگ مشورہ دے رہے ہیں کہ میرے خطوط کے واپس آجانے کے بعد مسٹر قت کے خط کو شائع کر دینا چاہیئے۔ اگر ممکن ہو تو حالات دریافت کرنے کے بعد مجھ کو مطلع فرمائیں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

افسوس کہ بمبئی کے فسادات ختم ہونے میں نہیں آتے۔

مخلص محمد اقبال

مولانا محمد علی جوہر

(۱)

چندوڑہ ۔ ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر واجب الاحترام!

السلام علیکم۔ ۲۰ اپریل کے محبت نامہ کا جواب آج دیتا ہوں اور مجرم ہوں کہ اس تاخیر کا باعث سوائے اس کے کچھ نہیں بیان کر سکتا کہ اس عرصہ میں رنج و غم و فکر کا شکار رہا۔ میں جو بڑے بڑے معاملات میں بھی آئی کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام بیکاروں کو مسٹر رضی سے زیادہ نہیں سمجھتا، ۲۰ اپریل کے فیصلہ پر کیا: بندہ دام فریب ہوں گا مگر دوستوں کی موت اس زمانہ میں بھی جب کہ موت کا بازار گرم ہے دوچار آنسو بطور مزاج کے وصول کر ہی لیتی ہے۔ ۲۰ اپریل کو میرے چند عزیز ترین دوست تہ و بالا ہو گئے اس لیے میرا غم و فکر بے جا نہیں۔ مگر موت جسمانی نہیں اس لیے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مردوں کو جن کی ہڈیوں تک کا بھی پتہ نہیں چلتا: علی الاعلان میں شامل کرتا ہوں مگر ان جیتی جاگتی کٹھ پتلیوں کو جو مسجد پر نچائی جاتی ہیں اور نچائی جا رہی ہیں مردوں سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آئی بلکہ ان کی روحوں کو۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ ؎

محروم ہوں، مجبور ہوں، بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزا میرے لیے ہے

پھر جس چیز کا صحیح معنوں میں اجارہ تم کو اس دربار سے مل گیا ہو اس میں شرکت کے دعویٰ کی مجھ سے جرأت نہیں ہو

ہو سکتی۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں بھی کسی قدر محروم و مجبور ہوں۔ اس پر بھی میں نے انصاری صاحب کو واہ راست پر استقامت کی، جس طرح مجھ سے ہو سکا، ترغیب دی اور امید کی کہ میری اس دعا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا" میرا خط و جدان کو بھیجا گیا تھا، کوئی تحریر معمولی نہ تھی۔ اس میں میرے نگارول کے مقدور بھر خلوص منسلک تھے مگر بدقسمتی یہی معلوم ہوا کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ اس دنیا سے بہت مختلف ہے جہاں یہ ہمارے عزیز بس رہے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات، تمام اندازے، تمام تخمینے غلط اور غیر منطقی ہیں۔ میں نے غالب کے ایک مصرع پر جو غزل لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا ؎

تقوے کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن کہاں

تقوے کا دعویٰ کرتے بھی ڈر لگتا ہے اور یہ سب جھوٹا فخر ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ میں متقی اور خدا ترس ہوں، مگر باوجود بار بار انتباہ اور کم از کم چھوٹی موٹی تکلیفوں کے اب تک اس وعدۂ الٰہی کو سچا جان رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ بھی پورا ہو رہا ہے کہ "منطقی فی قلوب الذین کفروا الرعب" اس لیے باوجود فاسق و فاجر اور بندۂ حرص و ہوا ہونے کے اپنے کو اپنے زیر بنا احباب کی دنیا سے ایک الگ دنیا میں پاتا ہوں اور گو اس دنیا کو اس پرانی دنیا سے بدرجہا بہتر جگہ پاتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس کی سرحد میں داخل ہو رہا ہوں۔ تاہم پرانے تعلقات دامن گیر ہوتے ہیں اور گو طرح طرح چھڑا لیتا ہوں۔ تاہم دامن کے ٹکڑے اس خارستان گلستان منزل میں لٹکے رہ جاتے ہیں۔ جن کے لیے آنسوؤں کا ایک چھوٹا موٹا قافلہ رواں ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ اعزاز [1] سے زیادہ محبت والے نہ نکلے۔ اب انہی کی نہیں بلکہ خود صرفیت کی بات سنائی ہو رہی ہے مگر اس کا زیادہ رنج نہیں۔ رنج پرانے دوستوں دوستوں کی رفاقت چھوٹنے کا ہے۔ غالب نے سچ کہا تھا کہ ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

مگر اچھا ہوا یہ جھوٹا سہارا بھی گیا۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کا باقی تھا اور اب بھی ہے۔ غالب کی غزل کا ایک شعر پچھلے کئی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے ؎

چاک مت کر جیب کو بے فصل گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

اس پر ایک نامکمل غزل قافیہ کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے ؎

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیے

---

[1] یہاں پڑھا نہیں گیا۔

لکھنے کو تو لکھ گیا۔ خود اب جا کر کہیں اس کا مفہوم سمجھا ہوں اور پھر سورۂ یوسف پڑھتا ہوں تو اس آیہ کریمہ کا مطلب اب کچھ میں آتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے قیدیوں کے جام بردار سے اس کی رہائی کے وقت کہا تھا۔ کہ بھئی ہمارا بھی ذکر اپنے آقا سے کر دینا کہ سخت ظلم ہوتا ہے اور وہ بھول گیا اور اس طرح چند سال اور حضرت یوسف جیلخانے زندان رہے۔ جب ایسے بزرگ پیغمبر کے لیے بھی قیدیوں کی یاد دہانی داخل شرک نہیں تو کم از کم مذموم بھی نہیں۔ اور اس وضاحت کے بعد اس میں بھی استعانت غیر اللہ کا شائبہ معلوم ہوا تو پھر ہمارے تمام تعلقات تو شرک جلی ٹھہرے۔ اقامت صلوٰۃ میرا ایمان، اجماع امت پر میرا اعتماد، تاہم بعض اوقات اس تنگ و تاریک بند کمرہ میں عبادت اپنی نجات کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں ایک وقت میں ایک ہی عبادت کرنے والا اپنے معبود کے حضور میں کھڑا ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مذہب کی وسیع فراخ مساجد میں خانے کے ساتھی اور خود امام بھی مجھے کفر و شرک کی طرف دھکیل نہ لے جائیں اور دوسروں کی اصلاح تو کجا خود اپنی نجات سے مایوس ہونا پڑے۔ سب کچھ ہو چکا اب یہی رہ گیا ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کروں اور مدرسہ کو چھوڑ کر پھر خانقاہ میں اعتکاف کروں۔ بھائی دعا کرو کہ اگر اپنی نجات کے متعلق خوف و ہراس میں کمی ہو تو کم از کم دوسروں کے متعلق یہ بے اعتباری باقی نہ رہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کہیں کا نہ رہا۔ البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے بھی زیادہ بہن کا، جو نہ صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس طرح ہمت و جرأت کے ساتھ سنبھالے ہیں اور صامت و ساکت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو بآواز بلند سب کو سنا رہی ہیں تو یہ بے اعتباری دور ہوتی ہے۔ اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں اسی طرح اس کے بندوں سے بھی قریب کفر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ قومی اسٹیج کی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں، وہی عرب اور کمزور لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتدا کی تھی۔ رہے یہ حضرات قرآن کے متعلق تو جہالت بہت پہلے سے تھی۔ چنانچہ میں نے متعدد بار ان آزادوں کے مضمون کو غزلوں میں باندھا۔ مثلاً ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

یا ؎

ہیں اتنے لاف شوق پہ مرعوب حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور
ہے نجد کو جلا سے بھی، قرب یزید بھی
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہوں، نجدیوں سے دور

یا ؎

دشمنوں سے جب تکلف ہے تو کچھ
دوستوں سے بھی مدارا چاہیے

دعا فقط تکلف کو دوستوں کے لیے اور ہمارا کو دشمنوں کے لیے لازمی گردانتے تھے۔ ہم دوستوں کے لیے (۱)
یہ سب کچھ لکھ دیا ہے اور آج بھی اس طرح لکھ رہا ہوں کہ گویا ہم ہی انبیاء اللہ اور احبار اللہ ہیں۔ مگر یہ لوگ اپنی حیرت انگیز
عقلوں کو دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ کہیں پڑ ابول آگے نہ آئے۔ بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد آیا ہے جس کا قرآن کریم میں مذکور
ہے: "قولوا لا تقولوا منہم" خود مسلمانوں نے بعض اوقات اس غیر مقرون میں بھی سنت بنی اسرائیل کی تقلید کی تھی۔ چنانچہ
معتزلین کو حد سے کہا گیا تھا کہ "وقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ وقد رأیتموہ وانتم تنظرون" دعا کرو کہ یہ حال اپنا
بھی نہ ہو بلکہ آخر تک ایمان اور صالح عمل پر قائم رہیں۔ تمہاری دعا ضرور مقبول ہوگی۔ اس لیے کہ اول تو آل رسول پھر تقلید
سنت پر سنی سے مشرف ہو چکے ہو۔ اب چونکہ تم نے مجھے بھی اپنے زمرہ میں بھی جو ابرار اور اخیار کا ہے شامل کر لیا ہے
اور خود لکھ چکے ہو کہ

؎ خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے

خیر یہ تو ہوا۔ میں نے لکھا تھا کہ تم پیش گوئی کرتے ہو کہ جمہور کی خواہش کے خلاف اصحاب اعتماد ایک ذلیل یونیورسٹی
قائم کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اور اے بھائی اس میں پیش گوئی ہی کیا ہے۔ تم تو ان کے تابع ہو جو خوابوں کی صحیح تعبیریں
بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح مجلس سے نکل کر تخت تک پہنچ گئے۔ میں کہ اس مقام سے بہت دور ہوں۔ یہ تو میں بھی
جانتا تھا اور سال گذشتہ ہی میں سب کو جتلا چکا تھا کہ جو زیان من صد مریوتی ورسٹی کا نہیں ہے بلکہ قوم کی سنگی اور تمہاری خود کی
وخرابی کا، اور رہی یونی ورسٹی تو سن لو کہ اسے ہم بنائیں گے ہم۔ نہ تمہارے قوم فروش اور کالج فروش۔ کیونکہ ہم سے کسی
نے حتمی وعدہ کر لیا ہے اور وہ وعدہ کا سب سے پکا بھی ہے کہ "ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین"
اگر خوف ہے تو اس لیے کہ "ان کنتم مومنین" سو خدا سے دعا ہے کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے اور ان بزرگوں کی تقلید کی توفیق
عطا فرمائے جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ "فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین"
اگر ہم ایمان پر قائم رہے تو پھر سنت اللہ میں کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارا انعام کہیں نہیں گیا ہے۔ وہاں تو ملے ہی گا، مگر
بعینہ یہیں مل جائے گا کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ:

"فاتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرۃ واللہ یحب المحسنین"

اس پر میں نے لکھا ہے کہ:

انعام کا حقدار کے تو کیا پوچھنا لیکن
دنیا میں بھی ایمان کا صلہ ہی کے لیے ہے

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تمہارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔ اور تمہارے
سخن کا ہر ہے اب اگر یہ لکھتا ہوں کہ

؎ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

---

(۱) یہاں کچھ عبارت پڑھی نہیں گئی۔

تو اس کے صریح معنی یہ ہوئے کہ جو تمہیں الہ آباد، جھانسی، پرتاب گڑھ اور فیض آباد میں جھیلنا پڑیں، ان سے زیادہ کا مستحق ہوں۔ مگر یہ بھی ہو تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی متحمل ہوگے۔ اس لیے کہ وہ خود کسی شخص پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالتا اور جو جس کے رتبے میں سوا ان کو سوا ملتا ہے۔ غم واندوہ کے لیے لکھا گیا ہے تم میری غزلیں منگواتے ہو، اچھا بھیج دوں گا۔ مگر بھائی تم شاعر تھے میں شاعر نہ تھا۔ البتہ عنایت ایزدی نے تمہیں بھی دیوانگی والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت نے مجھ سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں۔ پہلے بھی تک بندی کر لیتا تھا۔ مگر کاغذ کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ اب کچھ بو باس آنے لگی ہے، سو طفیل تمہارے ہے۔ تو سے غم کو نہ دے کچھ تو دل والا۔ اس وقت صرف تقریبی کی پہلی غزل لکھے بھیجتا ہوں۔ بھی کوئی خط لکھوں گا۔ تم میری انتہائی کا ذکر کر کے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ ورنہ وہ ناراض ہی رہیں گی کہ جواب کیوں نہ دیا۔

تمہارا مرید باعقیدت: محمد علی

راشد الخیری

(۱)

بنام منشی اعلاء مولوی سید ممتاز علی

مکرمی و معظمی!

السلام علیکم۔ اس نادر کا ممنون ہوں۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ میرے متعلق جو اعتراض تھا اس کی تردید کروں بلکہ محض کے مضمون سے آپ کو میری طرف سے بدگمانی نہ ہو اور اب کہ چل چلاؤ کا وقت ہے کوئی خط بھی نہ ہو جائے آپ عزت نہیں خیال فرماتے تو جانے دیجئے۔

حاجیہ تاج بیگم صاحبہ کے معاملہ میں جس قدر میں نے کوشش اٹھائی وہ تھوڑی بہت آپ کے علم میں ہی ہے۔ آپ اس سے باخبر ہیں۔ اب یہ آپ ہی فرمائیے کہ رہائی کے بعد اگر ان کے شوہر سے سفلی اختیار کی تو مقدمات میں وہی سے سیشن جج صاحب کی خدمت میں کیونکر لے جاتا۔ میرے اعضا اب وہ نہیں ہے۔ اگر بیمار رہتا ہوں۔ ایک آنکھ کمزور ہو گئی ہے۔ ایک ٹانگ میں ہر وقت درد رہتا ہے۔

کاشی وہ سات روپیہ اس سے پہلے یاد آ جاتے۔ اس کے بعد دو تین حساب رہا۔ کبھی کے محسوب ہو چکے ہوتے۔ اگر یاد فرمائی پر بھی تساہل کرتا تو بد معاملگی کہی جا سکتی تھی۔ مجھے جہاں تک یاد ہے۔ یہ پہلی مرتبہ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کے بعد عرصہ دراز تک سینکڑوں روپیہ کا حساب رہا۔ میاں افتخار نے جو روپیہ بھیجے تھے۔ اس کا حساب آپ دیکھ لیں۔ اور مجھے جہاں تک یاد ہے وہ میں نے مضامین کے واسطے..... اور شاید ایک آدھ مضمون روانہ بھی کیا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ مضمون کی ضرورت نہیں ہے۔

میں صحت ۔ سے اپنا نام علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وسط اکتوبر میں دہلی جاؤں گا ۔ مہربانی فرما کر آپ میاں امتیاز سلمہٗ سے فرما دیجئے کہ وہ وسط اکتوبر میں ایک کارڈ حساب کا لکھ کر مجھے دہلی روانہ کر دیں ۔ میں تمام حساب صاف کر دوں گا ۔

کتاب کے متعلق اگر تغیر و تبدل کی ضرورت ہو اور دوبارہ محنت کرنے پر درست ہو سکتی ہو تو میں حاضر ہوں ۔ اگر نہیں تو میں انشاء اللہ کسی اور کو دلوا دوں گا ۔ اور جس وقت اب کوئی درخواست کتاب لکھنے کی آئی تو آپ سے منگواؤں گا ۔ میاں امتیاز سلمہٗ کو دعا !

نیازمند : راشد الخیری ۔ ۲۲ جولائی ۱۹۲۱ء

منشی دیا نرائن نگم

(۱)

بنام احسن مارہروی

عنایت فرمانده ۔ تسلیم !

نوازش نامہ باعث مشکوری ہوا ۔ تصویر کی نسبت معترضین کا اعتراض ہے کہ اس کا ایک گراؤنڈ قلعہ معلیٰ ہے ۔ جو اس وقت موجود نہ تھا ۔ اور خاندان کے آخری دور کی عمارتوں میں ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تصویر اکبر اعظم کی نہیں بلکہ اکبر ثانی کی ہے ۔ مروجہ تصویروں سے اس کی شباہت بھی مختلف ہے ۔ اس میں چہرا کسی قدر لمبا ہے ۔ عام تصویروں میں بالکل گول ہے ۔ چہرے سے بڑھاپے کے آثار نمودار ہیں ۔ اکبر ثانی بڑھاپے میں سلطان عالم پناہ سے جوابی ہو گئے تھے اور ڈاڑھی کا بالکل صفایا کر دیا تھا ۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے مگر یہ باتیں بھی قابل لحاظ ہیں ۔ اس ایک تصویر کا ڈپ چھپوانا چاہتا ہوں ۔ آپ کے پاس ہو یا کہیں سے دستیاب ہو سکے تو ضرور عنایت فرمائیں ۔ چاک بننے کے بعد میں اقتباسات کے ساتھ اصل تصویر کی واپسی کا ذمہ دار ہوں ۔ مجھے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ امسال انجمن ترقی اردو کے آپ سیکرٹری مقرر ہوئے ہیں اس انتخاب پر آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں ۔ انجمن ترقی اردو نے اب تک کوئی کارنمایاں نہیں کیا ہے ۔ خدا کرے آپ کے زمانے میں یہ ایک مردہ انجمن کی حالت میں نہ رہے ۔ زمانے میں علمی خبروں اور نوٹس کا ایک مفید سلسلہ شائع ہوتا رہا ہے اور اب بھی بالکل بند نہیں ہو گیا ہے ۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلے کا ایک حصہ انجمن ترقی اردو کے لیے وقف رہے ۔ جس میں آپ اس انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے لکھتے رہیں ۔ اس طرح سے زمانہ انجمن اردو کا ایک باقاعدہ آرگن ہو جائے گا ۔ جس کی خریداری ممبران انجمن کے لیے ضروری ہونی چاہیئے ۔ محض اس حصے کی علیحدہ کاپیاں بھی شائع ہو سکتی ہیں ۔ انجمن کا ایک باقاعدہ رسالہ جس میں اس کے متعلق کل ضروری امور و کارروائی سے پبلک کو اطلاع ملتی رہے ہونا ضروری ہے ۔ میں زمانے کے لیے خواہ مخواہ اصرار نہیں کرتا ہوں ۔ مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ انجمن موصوف ایک کارگزار انجمن ہو جائے ۔ مضامین خاص کے لیے پیشتر سے تکلیف دے رہا ہوں ۔ راجہ کندن لال انجمن کی سوانح عمری جو ہی

کے پرچے میں جو اول ہفتہ فروری میں شائع ہوگا ہدیۂ ناظرین ہوگی۔ اب مارچ یا اپریل کے رسالے کے لیے کوئی چوتھی تاضمون عنایت فرمایئے۔

زیادہ نیاز

۲۲ر جنوری ۱۹۰۹ء — بندہ دیا نرائن نگم کانپور

نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی

(۱)

بنام پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

عزیز مکرم۔ سلام شوق۔

۱۰ر کو آپ کی محبت کی وہ یادگار رائج عظیم آبادی مطبوعہ الناظر لکھنؤ ملی۔ ممنون ہوا۔ مضمون دل لگا کر پڑھا۔ حق یہ ہے کہ آپ نے اردو پر، مذاق سخن پر، پھر اپنے صوبہ و شہر پر احسان کیا ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ رائج کا درجہ میر سے کم نہیں۔ بلکہ بعض اعتبار سے کچھ بڑھا ہوا ہے اور اس ضمن میں آپ نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ہر گز طرف داری و مبالغہ نہیں ہے۔

تمہید میں جو کچھ آپ کے جلے دل سے نکلا اسے بھی ایک حد تک جائز سمجھتا ہوں۔ لیکن آثار یا کسی اور کے متعلق آپ کے سے اہل علم کے قلم کا اتنا بے قابو ہو جانا درست نہیں۔ بلاشک آثار نے سہل انگاری سے کام لیا اور اس پر ایرادِ مزید بھی مگر آپ دھاں کریں، ضرورت سے زیادہ دوڑ گئے ہیں۔ پھر جس چشمہ سے اپنی سیرابی بیان کرتے ہیں، دیکھنا چاہیے کہ خود اس میں کیا دھرا ہے.....[1]

رائج کے ذکر میں نوائے وطن میں مثنوی کشش عشق کا سعادت علی خاں کے نام سے معنون ہونا بتاتی ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی آصف الدولہ کو نذر کی گئی۔ نواب وزیر کی تعریف میں اس شعر کو یاد کیجیے۔

فقط ہے یہ تیرا ہی یمن قدم
ہوا لکھنؤ جس سے رشک ارم

---

[1] یہ اشارہ اپنے خالی ماموں مولانا سید علی محمد شاد عظیم آبادی کی ایک تالیف "نوائے وطن" کی طرف ہے۔ اب جب کہ دونوں ماموں بھانجے دار فنا میں جا بسے، یہ امر کوئی راز باقی نہ رہا کہ دونوں ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ یہ ایک خاندانی عاشقہ الدود و رشتہ تھا۔ جس سے اہل دنیا کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ دونوں اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ ایک فخر روزگار شاعر۔ دوسرا صاحب طرز نثر نگار۔ اللہ دونوں کو مغفرت کرے۔

(ذاتی گفتگو بھی اس حد سے حذف کر دی گئی ہے۔ مسلم)

کون نہیں جانتا کہ یہ آصف الدولہ ہی تھے جو ماں اور بی بی سے رنجیدہ ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ آ رہے۔ پھر سنیئے عمارات کی تعریف میں :-

عمارات عالی کا ہو وصف کیا — نہیں اپنا ادراک اتنا رسا
نہ ہو خوبی قطع ان کی بیاں — ورق ہے مرقع کا اک اک مکاں
نظر کیجئے جس پہ سو تصویر ہے — عجب رنگ سے طرز تعمیر ہے

کیا یہ اس کے بعد بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ عمارات کی بنا شوق آصف الدولہ سے منسوب ہے، نہ کہ سعادت علی خاں سے۔ اب صاف سنیئے۔

تو اے آصف الدولہ عالی جناب — رہے تا قیام جہاں کامیاب
نہیں کچھ سا حاجت دوا خلق کا — بہت خوش ہے تجھ سے خدا خلق کا

آپ سے بہتر اسے کون جانتا ہے کہ تذکروں کی ایسی غلطیاں ناقابلِ معافی ہیں۔ نوائے وطن میں اس ذکر کو دیکھ پڑھ کر راسخ کی مٹی خراب ہوتی ہے۔ لوگ اسے مستند سمجھ کر مثنوی کشش عشق کو سعادت علی خاں کے زمانے کی چیز سمجھتے ہوں گے۔ حالانکہ وہ آصف الدولہ کے وقت کی ہے۔ یعنی جب کہ مثنوی میر حسن علی۔ عزیز کیجئے مصنف کی تحقیق نے غریب راسخ کو کتنا پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اسی طرح مثنوی حسن و عشق کے ذکر میں نوائے وطن کی عبارت ملاحظہ ہو: غازی الدین حیدر کے زمانے میں پھر لکھنؤ آئے۔ ایک مثنوی مسمّٰی بہ حسن و عشق ان کے نام سے موزوں کی۔ مگر اب شریعت نے رنگ ہی بدل دیا تھا۔ اس نے بھی کام نہ کیا۔ وار خالی گیا۔" یہ دوسری تاریخی غلطی ہے لکھنؤ میں شریعت نے محمد علی شاہ کے وقت میں رنگ بدلا نہ کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں۔ اسی عہد میں "فسانۂ عجائب" تالیف ہوئی۔ اور ضبیح نے اپنی مشہور مثنوی "تان و رنگ" (تصوف میں) تصنیف کی۔ پھر شریعت نے وہ کون سا رنگ بدل دیا تھا کہ فسانۂ عجائب و مثنوی ضبیح تو عام ہو جائیں، مگر راسخ کی مثنوی مقبول نہ ہو؟

کلکتہ میں مرآۃ الجمال لکھی گئی۔ اس میں نواب جان ایک کسبی کے حسن و جمال کا ذکر ہے۔ نوائے وطن اس ذکر سے بھی خالی ہے۔ عظیم آباد میں مجمعۂ عشق تصنیف ہوئی جس میں ایک کسبی پر اپنے عاشق ہونے کا نہایت صفائی و دلیری سے حال کھلا اور اس کی تعریف و توصیف کی ہے :-

بہت اس شہر میں ہیں خوبرو پر — نہیں ہے دلبر اپنا کوئی دلبر
دل اپنا اس صنم کا ہے فقط رام — کہ شرفو جس کا ہے نام خدا نام
اسی گل کی ہوا ہے دل میں اپنے — یہی آتش ہے آب و گل میں اپنے

دنیا کے شاید ہی کسی شاعر نے اپنے عشق کو اس طرح بیان کیا ہو۔ یہاں تو "گفتۂ او در حدیثِ دیگراں" نہیں سب کچھ کہا جاتا ہے اور راسخ کا یہی وہ رنگ ہے جسے آپ اس کا امتیازی طرہ کہتے ہیں.....

زمانے وطن میں راسخ کی وفات کی تاریخ ۱۲۳۸ھ دی گئی ہے۔ مگر گلشن بیخار اور اذکار آسی میں ۱۲۴۰ھ ہے اور آسی نے راسخ کو تو نہیں مگر شیفتہ کو جو ان کے ہمعصر یا کچھ دنوں بعد کے ہیں دیکھا تھا۔

راسخ کے ذکر میں ہمارا عظیم آباد کی زبان و شاعری کی تحقیق تعلق سے خالی نہیں۔ راسخ نواب صفات جنگ کے زمانہ یعنی ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کی عمر اگر پندرہ برس کے سن سے شمار کی جائے تو ۱۱۷۹ھ ہوگا۔ یعنی پلاسی کے دو برس بعد۔ اور ان کی زبان بنا دینے کی کوشش کا یہ نتیجہ نہیں۔ بلکہ پشتوں اگر نہیں تو ایک پشت کی ریاضت و صفائی کا نتیجہ ضرور ہے۔ اور اس ایک پشت کا زمانہ کم از کم پچاس سال مقرر کیا جائے گا۔ یعنی سنہ ۱۱۷۹ھ سے کبھی ادھر کی یہ زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ فرض کر لیا جائے (جس کا فرض کیا جانا قیاساً نادرست نہیں) تو وہ زمانہ عالمگیر کا ثابت ہوگا۔ جو ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا۔ اس لیے عالمگیری عہد تک اس سے بہت قبل اردو ہی نہیں، بلکہ شاہجہانی یعنی ٹھیٹھ اردو کا عام رواج آپ کے صوبے میں تھا۔ اور اس وقت لکھنؤ تو لکھنؤ، فیض آباد میں بھی ٹھیٹھ اردو عام رائج تھی۔ فیض آباد محمد شاہ یا زیادہ سے زیادہ فرخ سیر (۱۷۱۹ء) کے وقت میں آباد ہونا شروع ہوا۔ اس لیے عظیم آباد کی زبان اودھ اور دکھن سے بھی قدیم اور مستند ہے۔

اشرف علی خاں کو کہ خلاق دلی سے عظیم آباد راجہ شتاب رائے کے زمانے میں آئے۔ اور ۱۱۸۲ھ میں وہیں مرے راسخ کی عمر اس وقت ۴۰ سال سے کم نہ تھی اور اس وقت ان کی شاعری بھی جوانی پر ہوگی۔

فرخ سیر عظیم آباد امیر الامراء نواب حسین علی خاں کے ساتھ ۱۷۱۳ء میں دلی گیا ہے۔ اس وقت عظیم آباد امرائے دلی کی جاگیر بنا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے وہاں ٹھیٹھ اردو کا بازار گرم تھا۔ انہیں امرا میں سے نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ المتخلص بہ منیر (صاحب سیر المتاخرین کے باپ) بھی تھے جو فرخ سیر کے آخر عہد سے لے کر شاہ عالم ثانی کے وقت تک دلی و عظیم آباد میں رہے۔ نواب اسد جنگ عمریاں، ہولی اور دوہرے خوب کہتے تھے۔ اردو میں بھی ان کی غزلیں ہیں۔ نواب محمد خلیل الجام وزیر محمد شاہ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نواب صاحب کی جاگیر میں پرگنہ جیلہ (پٹنہ حسین آباد) تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ اپنے محلوں اور شاگرد پیشہ سمیت جو دلی کے تھے، عظیم آباد میں رہتے تھے .....

حاجی گنج (پورب دروازہ اور نزد گولہ امرائے دلی کا مسکن رہا ہے ..... شاہ ارزاں (خواجہ کلاں رحمی کے نام سے مشہور ہے) اور شاہ صادق رحمی کے نام سے خانہ صادق پور ہے، ان سب کو دلی سے توسل تھا۔ اور یہ سب عمدہ شعرائے اردو میں سے تھے۔ آپ کے خاندان صادق پور میں بھی زبان کا خاص ذوق و شوق رہا۔ جسے علم و فضل اور فراغت ہمیشہ جلا دیتی رہی۔

غرض راسخ کے ذکر میں عظیم آباد کی زبان کا ذکر بھی ضرور ہے اور جب اس پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ آپ کے گھر میں جس وقت اردو عام و فصیح تھی، لکھنؤ اس وقت شجاعوں اور کسوجیوں کا قصبہ و مسکن تھا اور سعادت علی خان کے وقت تک وہاں کی زبان رحمی تھی۔ جو کاکوری، موہان، بہرائچ اور محمود آباد میں رائج ہے۔ عمدۃ الملک مکتب کا اثر فیض آباد پر پڑا۔ اس لیے کہ انجام کے بعد صفدر جنگ و سعادت جنگ اردو کے اسکول اور دفتر کو بوجہ دوستی عمدۃ الملک فیض آباد اٹھا لے گئے۔ شاہ عالم

وغیرہ دلی میں عمدۃ الملک کے غلام اور اُردو کے دفتر میں کلرک تھے۔ اُن پر زبان کا اثر پڑتا رہا اور اس وجہ سے ان کے شاگردوں کی زبان بھی درست ہوئی۔ اسی دفتر کے لوگوں میں میر ضاحک اور آتش کے چچا اور اماموں صفدر جنگیوں کے ساتھ فیض آباد آئے اور اُردو کا دفتر اب وہاں قائم ہو گیا۔ میر حسن، صاحب لکھنوی اسی دفتر اور زبان فیض آباد کے محلوں میں پرورش پائی۔ میر خلیق وہیں پلے۔ میر انیس کی خالہ حسینی بیگم اور بہو بیگم صاحبہ کی مصاحب تھیں اور میر انیس اسی محل میں بڑے ہوئے۔ اتنے اثار مرثیہ کے بعد انیس کی زبان ایسی ہوئی ہے۔ اور اسے دقت کر لیجئے کہ انیس کے قبل تک لکھنؤ کی زبان وہی تھی جو ناسخ و دبیر کے ہاں متعمل ہے۔ یہ انیس کے گھر اور عمدۃ الملک سکول کا صدقہ تھا کہ لکھنؤ کی زبان اس پایہ کو پہنچ گئی۔

عظیم آباد پر لکھنؤ کی زبان کا کوئی معتد بہ اثر کبھی نہیں پڑا۔ وہاں کے بعض شعرا مصحفی کے ابتدا شاگرد ہوئے اور آپ کے ہاں کے اکثر شعرا نے اپنے شاگردوں کو ناسخ وغیرہ کے مقابلے کے لیے تیار کیا اور وہاں بھیجا ہے۔ یعنی اس وقت تک لکھنؤ کی شاعری و زبان عظیم آباد والوں کے لیے سند نہ تھی۔ فکر و سانس اور بیت وغیرہ الفاظ شاہ عالم ثانی کے وقت تک موقوف تھے، وہی لکھنؤ پہنچے اور اسی رستے سے عظیم آباد آئے۔ دلی میں پہنچا اور آگرہ وغیرہ کے اثر سے وہ مذکر ہو گئے مگر لکھنؤ اور عظیم آباد میں پرانا اثر قائم رہا .....

۲۱ مئی ۱۹۱۹ء — خیال

سید سلیمان ندوی

(۱)

بنام نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم

مخدوم محترم دام مجدہٗ السامی! السلام علیکم۔

آپ سے رخصت ہو کر اعظم گڑھ پہنچا۔ یہاں بھی چند روز مرارت اور پھوڑے کی تکلیف رہی۔ مگر آج اچھا ہوں۔ پھوڑے سے بھی ورم نکل گئی ہے اور اب صاف ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اسی دن صبح کو الہ آباد سے آئے وہ سخت علیل ہو گئے تھے۔ عفونت کا خطرہ تھا۔ الہ آباد میں بروقت علاج ہوا۔ اور اب اچھے ہیں۔

جب سے آیا ہوں ندوہ کا تخیل قائم ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ندوہ میں کوئی ذمہ دارانہ عہدہ لینے پر کسی طرح راضی نہیں اور نہ مستقل قیام لکھنؤ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے لیے بالکل آمادہ ہیں کہ سال میں چند مہینے وہ وہاں اقامت کریں اور تنظیم و تعمیر میں اور فراہمی چندہ میں مدد دیں اور اس کے لیے وہ بہت جلد کارروائی شروع کریں گے مولوی عبد السلام صاحب عنقریب جائیں گے کہ ایک دو مہینہ رہ کر آخری سال کے طلبا کو ادبی علوم میں مدد دیں اور ذیلوں کی تعلیمی نگرانی کریں۔ مولوی مسعود صاحب نے طلبائے قدیم کو خطوط لکھے ہیں۔ اور ان کا جلسہ بلانے والے ہیں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں تعلیمی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ معتمد دار العلوم بنا دیجئے۔ سال میں متعدد پھیرے کروں گا۔ ندوہ کی نظامت کا بار اگر

ڈالیں گے تو ضرور اجہرا برداشت کروں گا۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا خط آیا ہے۔ مشورہ پوچھا ہے۔

مولوی شبلی صاحب کا خط آیا ہے کہ بھوپال میں جس حد تک کوشش کرنی تھی ہو چکی اور اب آپ کے ایما سے حیدرآباد جاتے ہیں۔ عبدالحق صاحب کے لیے کوشش کی اور مجھے لکھا بلکہ قم جنرل صاحب کو لکھو کہ اس کا وظیفہ ہو جائے چنانچہ میں لکھوں گا اور امید ہے جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کو مل جائے گا۔ اس طرح ان کی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا

مولوی مرتضیٰ صاحب جو پہلے کتب خانہ میں تھے میرے پاس آئے تھے کہ ان کو کتب خانہ میں کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اگر کتب خانہ میں آپ کے کام کا دیکھا تو اچھا ہے تو مجھے اختلاف نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نواب صاحب خود طرح تھے، اگر آپ نے ان کے کام کو پسند کیا ہے تو ضرور ان کو کتب خانہ میں جگہ دے دیجئے۔ کتب خانہ کی حفاظت ضروری اور لازمی ہے۔ اس کا بند رکھنا کتابوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

آپ ایجنٹ تو جاری فرما دیجئے۔ اور نفاست کی تجویز بھی درج کر دیجئے۔ اگر عارضاً میرا نام بھی لکھ دیجئے تو حرج نہیں۔ مستقل انتظام میری نظر میں ہے۔ انشاءاللہ۔

مولوی عبدالرزاق اور مولوی عبدالحق صاحب گرامی کو خط لکھے گئے ہیں۔ والسلام

۱۷ر فروری ۱۹۲۳ء — سید سلیمان۔ اعظم گڑھ

---

(۲)

بنام مولانا عرفان صاحب

۳۳-۳۴۔ انڈرسن اسٹریٹ مدراس۔

مخدوم محترم دام کرمہٗ۔ السلام علیکم۔ آپ کے اخبار نے مجھے بے چین کر دیا۔ کئی دفعہ تار لکھوایا اور پھر لکھوایا۔ یقین جانیے کہ رات بھر سکون سے نیند نہیں آئی، آنکھیں بھی دماغ کی خشکی اور معدہ کی تبخیر کے باعث تین چھینے ہو گئے کہ نیند کی اصل لذت سے محروم ہوں، مگر آج کی شب تو صرف کروٹ ہی بدلتے بدلتے گزر گئی اور زبان پر یہ مصرع تھا "دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور" مگر میں اپنے پہلے خط میں اپنی معذرت کے اسباب پوری طرح لکھ چکا ہوں، مگر آپ نے شاید پڑھا نہیں کیا۔ اس لیے میں دوبارہ اپنا عذر بیان پیش کرتا ہوں اور یہ اس لیے کہ مجھے آپ کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ سے یہ خیال کر کے دل میں تکلیف محسوس کرتا ہوں کہ آپ میرے عذرات کو محض بہانہ تصور کرتے ہیں۔

۱۔ میں یہاں چند ہفتوں کے لیے مسافرانہ آیا۔ اسباب و سامان جو ایسے بڑے سفر یعنی حجاز کے لیے درکار ہے وہ سارا ساتھ نہیں۔ پاسپورٹ میرے پاس نہیں۔ کچھ پاسپورٹ کہیں اعظم گڑھ میں پڑا ہے۔ پاسپورٹ مدراس میں نہیں مل سکتا بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ پھر کیونکر اگر ابھی ہمبرے سروسانی چل کھڑا ہوں تو ۱۹ر کو کراچی یا ۲۱ر کو بمبئی پہنچ کر اسے روانہ ہو سکتا ہوں غور فرمایئے۔

۲۔ ہر شخص جو کچھ بھی اپنے پیچھے تعلقات رکھتا ہے۔ وہ کسی بڑے سفر سے پہلے کچھ انتظامات کرتا ہے۔ میں چھوٹے

جلسے میں شریک ہو کر ابھی تک اعظم گڑھ نہیں گیا۔ چند ہفتوں کے لیے دارالمصنفین اور معارف کا کام سنبھال کر اور مطبع میں چھپنے کی چیزوں کا سامان کر کے مدراس چلا آیا۔ میں نے مجلس عاملہ میں شرکت وفد سے انکار کر دیا تھا۔ اب ادھر آپ کے تاروں نے بتایا کہ میرا نام ضروری ہے اور مٹ نہیں سکتا۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ میں اعظم گڑھ جا کر چند مہینوں کے کام منتظم کر دوں۔ مطبع میں کتابوں کی چھپائی کا کام مقرر کر دوں۔ معارف کے مضامین کا سامان کر جاؤں۔ پچھلی دفعہ جب یورپ گیا خوش قسمتی سے میرے شریک ادارت مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی تھے۔ انھوں نے معارف سے مجھے مستغنی کر دیا تھا۔ اور مطبع میں سیرت دوم کا کام سال بھر کے لیے کافی تھا۔ دوسری مرتبہ تین مہینوں کا کام درست کر کے گیا۔ اب نہ مولوی عبدالماجد صاحب ہیں اور نہ مولوی ابوالحسنات مرحوم، اور نہ کوئی اور کام سنبھالنے والا ہے۔ بایں ہمہ مجھے عرب کے سفر کے لیے مدراس سے واپس جا کر چند مہینوں کے انتظامات اپنی غیر حاضری کے زمانہ کے درست کر کے تیار ہونا چاہیے تھا۔ اور اس کا موقع نہیں، ایسی حالت میں جانے کے معنی معارف اور دارالمصنفین کے بند کر دینے کے ہیں۔

۳۔ مصیبت جب آتی ہے ایک ساتھ آتی ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب کی بھتیجی کی شادی دو مہینے سے بہت دنوں سے وہ ٹال رہے تھے، نومبر کا مہینہ فرق دوم نے آخری مہینہ مقرر کیا ہے، کہ شادی کیجئے یا جواب دیجئے اور یہی مہینہ ان کے دو ہزار ادا کے قرض کی قسط کا ہے۔ جس کا قصہ شاید آپ جانتے ہوں، اس لیے وہ ہر اگلے نومبر سے ایک ماہ کے لیے دارالمصنفین چھوڑ کر مجبوراً مکان رہیں گے اور دارالمصنفین کے لیے ہم میں سے ایک کا رہنا ضروری ہے اور اسی لیے ان کو آزاد کرنے کے لیے مجھے یہاں سے دو چار روز میں روانہ ہو جانا ہے۔ کیونکہ یہاں جو لیکچر دینے تھے وہ ختم ہو چکے، صرف ایک باقی ہے جو آج کل میں ہو جائے گا۔

۴۔ میں باقاعدہ دارالمصنفین کا ذکر ہوں۔ اس میں دونوں طرح کے دکان ہیں۔ پچھلے یورپ گیا تو جو اخلاع گیا اور تنخواہ جاری رہی مگر اس وقت میرا ایسی تھی کہ وہ مخالفت نہ کر سکے۔ دوسری دفعہ حجاز گیا تو ان کی اجازت سے کہ تین مہینہ کی رخصت پر گیا۔ مگر اس دفعہ باہم بدمزگی ہوئی، اب اس دفعہ پھر اس بدمزگی کو بڑھا سوسائٹی یعنی دارالمصنفین کو برباد کرنا ہے۔ ان میں بعض وہ ممبر بھی ہیں جن کے ذریعہ سے حیدرآباد کی امداد آتی ہے مجھے یا تو مستعفی ہو جانا چاہیے یا دارالمصنفین کو باہمی اختلاف کی بنا پر توڑ دینا چاہیے۔ گو میں اب بھی زبردستی جا سکتا ہوں۔ مگر بار بار درخواست کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

۵۔ ندوہ کا قصہ یہ ہے کہ نومبر کے آخر میں اس کا سالانہ جلسہ ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب اپنی خانگی مجبوریوں کے باعث گھر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اب مجھ کو اس جلسے کو سنبھالنا ہے۔ اس مہینے میں میری غیر حاضری کے باعث بعض مخالف ارکان نے مدرسہ پر مجلس تحقیقات تعلیم و اخلاق یعنی انکوائری کمیشن مجھ پر قائم کیا ہے، تاکہ میرے زمانہ معتمدی پر الزام دھر کر مجھے بدنام کیا جائے، اس سے پریشان ہوں، اس کے پکارنے کی صورت کرنا ہے، ایک مدرس کا انتقال ہو گیا اس کی جگہ کا انتظام مجھے کرنا ہے، نصاب بنانا اور بنوانا ہے اور سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کرنا ہے۔

یہ سب تو درد دور کی یعنی آفیشل مجبوریاں تھیں۔ اب میں آخر اپنا جسم آپ کو دکھاتا ہوں۔ اوپر سے یہ تکلیف سے کر آیا کر کھانے کے دو گھنٹے بعد جگر سے لے کر گردہ تک درد ہوتا ہے۔ علاج سے دب جاتا ہے اور پھر ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خاص طریق سے رہا جائے۔ آپ اپنی مہربانی سے ہر قسم کا انتظام اپنے مریضوں کو تیار ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں عرب کو دیکھ چکا ہوں اور آپ مرت سی کر فرماتے ہیں۔ پچھلی دفعہ عرب کے سفر نے پھر مرض کو پیدا کر دیا۔ بلکہ اور ایک نئے مرض میں مبتلا کر دیا۔ عرب میں گوشت عموماً دنبے کا ہوتا ہے جو میرے لیے زہر، روٹی بازاروں میں غیر کی پکتی ہے۔ نہایت ثقیل، سیزیاں اور ترکاریاں جو میں کھاتا ہوں وہاں نہیں ملتیں۔ پچھلی دفعہ ہندوستانی باورچی رکھا گیا۔ مگر گوشت اور روٹی کی قسم کو وہ کیا کرتا، وہاں درد شروع ہو گیا۔ تو دوا بھی بمشکل میسر آ سکی۔ ایسٹ کو آگ میں گرم کر کے اس سے جگر، پیٹ اور گردہ کو سینک کر علاج کرتا تھا اور تسکین حاصل کرتا تھا۔ یا خانہ کا وہاں سسٹم ایسا ہے۔ جو ایک دائم المرض کے لیے سوہان روح ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ ایک مہینے میں اس کی کیا تکلیف وہاں اٹھائی ہے۔ اس سے مرض بنا یہ تھا لایا ہوں کہ دونوں سرین کے بیچ میں کوئی رگ پھٹ جاتی ہے۔ اس میں درد ہو جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس حالت میں موٹر کی سواری پر بھی حرکت ہوتی ہے تو جان نکل جاتی ہے۔ ایسی حالت میں رائے ہے کہ منفرد تک کئی دن اونٹ یا شغدف کی سواری میرے لیے ناقابل تحمل ہے دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ذرا سی فکر یا کسی خیال کی آمد سے نیند جاتی رہتی ہے۔ اتنی مہینے سے یہ حال ہے۔ قلب پر یہ اثر ہے کہ بالکل افسردگی اور پژمردگی آ گئی ہے۔ ذرا سا جوش ہوں تو تھک جاتا ہوں اور سینہ میں درد ہو جاتا ہے۔ یہاں آیا تھا کہ کام کے ساتھ کچھ تفریح اور تبدیل آب و ہوا ہو جائے گی۔ یہاں ایک مرض جو جاتا رہا تھا عود کر آیا یعنی قارورہ میں سوزش اور ایک مرض ترقی کر گیا یعنی سوزش اور درد کے ساتھ دو تین دفعہ دست۔ ڈاکٹری علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا آخر ایک ہفتہ کے لیے بشکور گیا تھا۔ وہاں حکیم صاحب قبلہ کے ایک شاگرد مستعد حکیم ہیں انہوں نے دیکھا اور دو تین یونانی قرص، اسہون اور شربت تجویز کیا ہے جو روزانہ استعمال میں ہے اور اس سے کسی قدر تخفیف ہے۔

میں نے اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ صرف سچ ہے۔ تازہ تکلیف اور بہانہ کی عادت نہیں، اور نہ طمع دنیا میں کرتا ہوں۔ میری سات آٹھ برس کی ملاقات آپ سے ہے۔ آپ جیسے آدمیوں کی شناخت کے بعد سے میرا کوئی عیب یا ہنر چھپا نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے کہ آپ کی خواہش کی پوری نہ کرنے کا کس درجہ افسوس ہے۔ میں گناہگار ہوں۔ اور اپنی گناہگاری کی سزا آپ کے ہاتھ سے برداشت کرنے کا تیار ہوں۔ کیا کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟

میں دو چار روز میں یعنی یکم دسمبر کو اعظم گڈھ روانہ ہو جاؤں گا۔ والسلام

۲۹ر اکتوبر ۲۵ء — سید سلیمان

خواجہ حسن نظامی

(۱)

بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد

دین پناہ، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دہلی ——— تاریخ خواجہ دہلی

مہاری شاہ صاحب، السلام علیکم۔ خط رجسٹرڈ مورخہ ۱۲ دسمبر وصول ہوا۔ درویش کے مضمون میں جماعت علی شاہ صاحب ہی کے واقعہ کا اشارہ تھا۔ آپ مجھ سے پہلے اس قصہ کو فرما چکے ہیں۔

اگرچہ آپ کا خیال بحافظہ تو بہ درست ہے کہ جماعت علی شاہ صاحب جیسے لوگ ان جرمانات سے قائل نہیں ہوں گے بلکہ اور رد کریں گے مگر ملک میں ان کے علاوہ بھی ایک جماعت کثیر ایسی ہے جو اس قسم کے مضامین شائع ہونے سے بدگمانیوں اور بغض اقوام سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میں نے وہ مضمون شائع کرنا ضروری سمجھا اور مناسب معلوم ہوا کہ آپ کا یہ خط بھی عائلی الفاظ قلم زد کرنے کے بعد شائع کر دیا جائے گا۔ کہ اس خط میں نہایت مخلصانہ سچی تحریر ہے۔ اگر خط شائع ہوا تو جماعت علی شاہ کا قصہ درج نہ ہوگا۔

میں کل ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں اور دوتا دبھی آپ کو دیئے ہیں۔ امید ہے کہ وصول ہوئے ہوں گے۔ میں خود آمنے سامنے ملنا اور بات چیت کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ خدا کے فضل سے حور بانو کو بھی اب آرام ہے۔ یعنی قابل فکر حالت نہیں ہے۔ شادی اگر مقرر ہو گئی تو فوراً چلا آؤں گا۔ ورنہ پندرہ دن کے بعد ارادہ ہے۔ محض آپ ہی سے ملاقات کرنی چاہتا ہوں کہ مریدوں کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر کہیں ٹھہروں۔ خواجہ بابا اور بچوں کو دعا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء — دعاگو۔ حسن نظامی

---

(۲)

بنام مولانا وحید احمد

جناب منیجر صاحب ہوٹل دی ہارٹ[۱]

کسی برائے کرم آواز دیجئے کہ کمرہ نمبر ۱ کا مسافر ناشتہ مانگتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ ۱۲ اپریل کا خط آج ۱۵ کو ملا۔ جب آپ یہ خط لکھ رہے تھے میں اپنے گھر سے دس میل دور اجمل خاں کے ہاں سے ملنے جا رہا تھا۔ لاکھوں عورت مرد جمع ان کے گھروں میں واپس جا رہے تھے۔ قدم قدم پر اندیشہ ہوتا تھا

---

[۱] میں نے منیجر کے متعلق کوشش کی تھی کہ ایک ہوٹل میرے یہاں ہے اس میں قیام فرمائیے اور اس کا نام (HOTEL de HEART) ہے۔

کہ کسی سے ٹکر ہو جائے گی۔

مجھے معلوم دتا بیساکھی کیا چیز ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا پرچار پنجاب میں زیادہ ہے۔ اب پنجاب کے پانچوں دریا دلی کے کوزے میں بند ہیں۔ اکم ٹیکس آفیسر قطب الفقراء ہندو ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہا آج نیا سال ہے۔ شگون بہت اچھا ہے ساس نے سونے کی گھڑی کلائی پر باندھی اور خدا نے آپ کو گھر بیٹھے بھیج دیا۔

یہ سن کر کہ بیساکھی حساب کا نیا سال ہے۔ مجھے اس لیے دل نواز معلوم ہوا کہ میں بھی اپنے انکم ٹیکس کا حساب بیٹھے بٹھائے لے گیا۔

پھر کل صبح درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں گیا۔ سالانہ عرس میں شریک ہوا۔ سیکڑوں زائرین کو چیخیں مار کر روتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ مزارات کو شکستہ پایا۔ درگاہ کے دروازے پر سائنبورڈ اس کی تحریر تھی جس پر لکھا تھا کہ ؎

مرقد ویراں پہ بھی فاتحہ پڑھتے جانا
اس سے کہ وہ جو ہیں اس جگہ سے اپنے جانے والے

دیکھا تو یہ کتبہ ویران تھا۔ شاعر نے ویران مخلص رکھ کر یہ شگون کی تھی۔ میں نے آج سے چالیس برس پہلے ایک کارڈ بنایا تھا کہ اسکول ماسٹر صاحبان ٹوکی شاہ ایمان شاگرد کر پڑھا رہے تھے۔ مگر موجودہ "ایمان" شاگرد جواب دیتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ یہ لفظ ویران ہے، ایمان نہیں۔

مجھے آپ کے بچوں کے نام پڑھ کر ایسی خوشی ہوئی۔ گویا ہوٹل وی ہارٹ میں ٹھہر گیا ہوں۔ اور میری خاصی بھی دعا آپ کی خواصی کے ساتھ باتیں بنا رہی ہے۔

یہ بتانا کہ مسافر ہوٹل وی ہارٹ میں کب آئے گا۔ دشوار ہے کیونکہ بیماریوں نے اتنا زور پکڑا ہے کہ کل دوپہر سے آج سہ پہر تک کچھ نہیں کھایا اور پان چھوڑے ہوئے سات دن سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ خیال آیا، لکھنؤ جاؤں گا اور ممانی لکھنؤ کے پان کی گلوری بھیجیں گی تو کیونکر انکار کروں گا۔

قطب عالم سے اگر ملنا ہو بھی جائے کہ موسیٰ کی طرح انجان میں رہوں گا یا خضر کی طرح قطب عالم کو انجان پاؤں گا۔ یہ تصورات اور تخلیقات کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی حکمتیں ہیں ورنہ آدم نہ بود و من ہم حنانہ بود و من ہم۔ اور خود نہ بود و من ہم من عاشق ویرنہ ام۔

آج شام کو ایک مسٹر صاحب کے ہاں میں مجھے بھی ان کے ساتھ کھانا کھانا ہے ان کا نام نوری ہے اور وہ بیرسٹر بھی ہیں اور میرے پرانے دوستوں میں ہیں۔ بہادر کے رہنے والے ہیں۔ اگر آج بات کروں اس سے ملوں اور کہوں کہ آپ رسی پیلک کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اور وہ جواب دیں کہ آیم نو۔ رسی تو میں کہوں گا جس مقام پر آپ رہتے ہیں اس کا نام بھی فارسی ہندی سے مرکب ہے۔ پہلا لفظ بیا دوسرا لفظ ور۔ بیا ور اور ور ہندی میں طاقت دار اور غالب کو کہتے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ۱۴ شعبان تک اگر میں اپنے جسم سے باہر نہ چلا گیا تو اس کے بعد رمضان میں آؤں گا۔ تاکہ روزہ نہ رکھنے کا بہانہ ساتھ آ جائے۔ وجود و شہود کی بحث میں نے اس لیے پسند کی کہ ساری عمر عام فہم وجودی رہا ہوں اور مولانا

سید ظہور احمد وحشی شاہجہانپوری نے میری شان میں ایک فارسی غزل لکھی تھی جس میں میرے وجودی عقائد کو بہت شاعرانہ انداز سے ظاہر کیا تھا۔ وجود، شہود، کبود، بہت سے قوافی تھے۔

حضرت اکبر فرمایا کرتے تھے آنے والے انقلاب کے سیلاب میں سب بہہ جائیں گے فقط صوفی باقی رہیں گے آپ کی کتاب تصوف کو جب پڑھتا ہوں اکبر یاد آتے ہیں۔ آپ کے کچھ مقولات قرن اول کے کہیں ہوں تو میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کی زندگی کے ارتقائی دورہوں کو سمجھ سکوں۔ نہ آپ کے لیے نہ اپنے لیے، نہ قوم کے لیے، نہ ملک کے لیے بلکہ ہوئی دی ہارت کے لیے۔

دمشق کے ہوٹل دارالسرور میں ٹھہرا ہوا تھا کہ غالب پاشا گورنر شام ملنے آئے میں نے کہا آپ ملک عرب کے گورنر ہیں۔ آپ کا قرآن عربی ہے، حدیث عربی ہے۔ پھر آپ عرب بچوں کی ابتدائی تعلیم میں عربی کو داخل کیوں نہیں کرتے جواب دیا۔ میں نے مرکزی حکومت کو لکھا ہے۔ کل وہ بات یاد آئی جب جاوس سے پیام ادب کتاب آئی۔ جس میں جواہر لال کا ایک مضمون اردو کی حمایت میں شائع ہوا ہے۔ میں نے خیال کیا غالب پاشا باوجود غالب نام کے مغلوب تھے اور جواہر لال باوجود بڑے حاکم کے عوام کے محکوم ہیں۔

آپ شعر بھی لکھتے ہیں؟ اور اگر لکھتے ہیں تو کس زبان میں۔ اور جب آپ خواب دیکھتے ہیں تو سننے والوں سے بات کس زبان میں کرتے ہیں۔

میرے بچوں کے ناموں کی فہرست یہ ہے۔ بڑی لڑکی حسین دوسرے علی، تیسرے زید پاشا ان کے بعد حسن، ابوطالب پھر مہدی۔ تیسری لڑکی محمد بانو مر گئی۔ دوسری لڑکی روحا بانو۔ تیسری کوثر۔ حسین کے چار لڑکے سلمان۔ نعمان۔ امان۔ دیان ایک لڑکی قدیر۔ علی کے دو لڑکے ولی اور وسی اور دو لڑکیاں طاہرہ قرۃ العین اور فریدہ۔ دوحہ کے پوتے لڑکے روحم دوسرے نوحم۔ ایک لڑکی گل رعنا۔

میری بینائی بہت کمزور ہے۔ دائیں آنکھ سے کچھ تھوڑا سا نظر آتا ہے۔ بائیں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر وقت جلا جلا بخار رہتا ہے۔ گردہ، معدہ، جگر خراب ہیں۔ نیند بھی کم آتی ہے۔ غم غصہ زیادہ آتا ہے اور یہ قرآن کی بتائی ہوئی مومن کی شان نہیں ہے۔ باقی سب صفات مومن میرے اندر ہیں۔ ایک کوتاہی میرے ذہن اور دماغ میں پیدا ہو گئی ہے کہ میں چاروں طرف دیکھ کر بتاؤں کہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ مگر ان کو کام کرنا نہیں آتا۔ مجھے کام کرنا آتا ہے لیکن کام لینا نہیں آتا۔ اس واسطے میرے کسی کام میں ترتیب اور موزونیت باقی نہیں رہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے دماغی اور ذہنی اذیت میں ہر وقت مبتلا رہتا ہوں۔

گزرانی گزرانی مانی ڈیر اکل

۱۵ اپریل ۱۹۵۰ء

حسن نظامی

منشی پریم چند

بنام سید امتیاز علی تاج

مشفقی من السلیم!

لفافہ ملا۔ مشکور ہوں۔ مئی جون کے پرچے خوب پڑھے۔ اور جگہ اٹھایا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ایسا دلچسپ رسالہ اس وقت اردو زبان میں نہیں ہے۔ پبلک اگر قدر نہ کرے تو مجبوری ہے۔ بالخصوص اختصار اور اصل اثاث پر مضمون تبلیغ تمنا زحمی صاحب کے تحریر فرمایا ہے وہ رسالہ کی جان ہے۔ ان موضوعات پر ایسا صاف اور روشن مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ مجھے اب تک نہ معلوم تھا کہ حضرت ممدوح کو علمی مضامین پر اتنی دسترس ہے۔ . . . . . کچھ زیادہ دلچسپ نہیں لیکن شبنم کی سرگزشت بہت اچھا ہے۔ لگی کہ پہلا روسلوں میں کوئی معمولی تنقید نہیں لگی۔ اس لحاظ سے و نیز تنقید کی خوبی کے اعتبار سے آپ کا رسالہ اول ہے۔ اردو کے نقاد پر اچھی چوٹ کی ہے حالانکہ کسی قدر غیر منصفانہ ہے۔ عام خواب مجھے بہت پسند آیا ہے علامہ بے دو اطرب ہے۔ معلوم نہیں طبعزاد ہے یا کچھ اور۔ حقہ نظم بھی دیگر رسالوں سے کہیں بلند تر ہے۔ میں تعریف کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ حق کا اظہار کر رہا ہوں۔ گستاخ صاحب تو بڑے کھاڑ معلوم ہوتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب لکھتے ہیں

پریم پچیسی حصہ دوم کی سو جلدیں آپ کے یہاں بھجوا دی ہیں۔ پریم تیسیں حصہ اول کی چھپ رہی ہے۔ غالباً دو مہینے میں تیار ہو جائے گی۔ کیا تیسیں کا حصہ دوم آپ اپنے اہتمام سے نہیں شائع کر سکتے؟ بازار حسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو اسی اثنا میں اگر تیسیں حصہ دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ دس میں دے دوں گا۔ کل دس جلدوں کی کتاب ہو گی۔ آپ کے لیے ایک قصہ لکھ رہا ہوں۔ خون جگر تو بہت صرف کر رہا ہوں پر معلوم نہیں کچھ رنگ بھی آئے گا یا نہیں۔ خون ہی نہیں ہے تو رنگ کیا خاک پیدا ہو۔ اور کیا التماس کروں اپنے والد صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا دست بستہ سلام کہیے گا۔ آپ کے خلوص سے ایسا خلوص ٹپکتا ہے کہ بے اختیار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ غلامی کی قید اور سفر کی درازی ہمت توڑ دیتی ہے۔ والسلام

نیاز مند، دھنپت رائے۔ گورکھپور ۸ اگست ۱۹۱۹ء

لے یہ لفظ پڑھا نہیں گیا۔

قطعات

جوش ملیح آبادی

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں
گھڑیاں روکیں مگر گذرتی ہی رہیں
امید کا رخسار میں بھرتے رہے رنگ
اور یاس کی جھریاں اُبھرتی ہی رہیں

دوڑو کہ سبو ٹوٹ رہا ہے یارو
دامانِ چمن چھوٹ رہا ہے یارو
یادوں کے جواہر کو بچاؤں کس طرح
نسیان مجھے لوٹ رہا ہے یارو

سو بار مری دھوپ کو سنولایا ہے
خود میرے ہنر سے مجھے شرمایا ہے
آیا ہے مری راکھ پہ سجدے کرنے
وہ جس نے مری آگ کو ٹھکرایا ہے

جھومتی برسات

جوشؔ ملیح آبادی

۱

ہاں، دیکھ، ذرا دیکھ، مرے سرو لب جو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادو
زرتار دوپٹوں کے یہ اُڑتے ہوئے پلو
یہ کنج میں رندانِ سیہ مست کی یا ہو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۲

ساحل پہ یہ اُڑتے ہوئے جنت کے نظارے
افلاک پہ یہ سرخ دوشالوں کے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے
اُمڈے ہوئے دریا کے اُبلتے ہوئے دھارے
دھاروں میں گھری ناؤ کے مڑتے ہوئے چپو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۳

کیا جوش میں ہیں جھاگ اُڑاتے ہوئے نالے
بادل کے خزانوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے تالے
گلیوں کے یہ کانچے ہیں کہ چھلکے ہوئے تالے
دبکے ہوئے چھجوں کے تلے خوبچے والے
ٹاپوں میں کہیں راہ، کہیں راہ میں ٹاپو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۴

کس ناز سے وہ دیکھ گھٹا باغ میں لوٹی
لو عرضِ تمنا جھوم گئی کھول کے چوٹی
برکھا سے کھری ہو گئی جو چیز تھی کھوٹی
جنبش میں اُدھر سبزہ، اِدھر بیر بہوٹی
ہر باغ میں، ہر راغ میں، ہر راہ میں، ہر سو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۵

پتی کوئی کالی ہے، تو بوٹا کوئی گورا،
لبریز ہے ہر گل کے پیالے کا کٹورا
ہر نرگس شہلا میں نئی عمر کا ڈورا
لڑکوندا ہر اک گل ہے، تو ہر خار ہے گھبرو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۶

خود سوچ دوانے ہوں نہ کس طور سے لمحات
جب ناز سے اُبھرے ہوئے کولے پہ بھرے ہات
دن کو ہو فروشندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
لہراؤں سماوات پہ، چل جائے جو قابو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۷

شاخوں میں جھما جھم ہے فضاؤں میں روانی
بہتی ہوئی چھکار، مچلتا ہوا پانی
بھونرے ہیں کہ اُڑتی ہے کہانی پہ کہانی
اک خیمہ ہے، اور خیمہ رنگین جوانی
بھیگے ہوئے پودوں کی یہ چھبتی ہوئی خوشبو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۸

ہر مست صدا، خواب زلیخا کی ہے تعبیر
ہر زمزمہ ہوش ربا، حسن کی تفسیر
تصویر میں آواز ہے، آواز میں تصویر
اک کیف کی پازیب ہے اک نشے کی زنجیر
باغوں میں گھنی چھاؤں میں، کوئل کی یہ کوکو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۹

ہر لحظہ رواں، تند عناں ابر کا توسن
ہر آن سکتا ہوا افلاک کا دامن
ہر وقت نئے رنگ کی اٹھتی ہوئی چلمن
ہر لمحہ پُر دار میں پرواز کی سن سن
ہر ساعتِ سرشار میں نازِ رمِ آہو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۰

شیشوں پہ یہ دربار جھلکتی ہوئی بوندیں
شاخوں سے یہ مے ریز ٹپکتی ہوئی بوندیں
یہ دوب کے ریشوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندیں
یہ آم کے پتوں پہ کھنکتی ہوئی بوندیں
بوندوں کے مجیروں میں یہ بجتے ہوئے گھنگرو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۱

یہ سر پہ کڑکتی ہوئی ساون کی کمانیں
کھنکتی ہوئی بن میں یہ جواہر کی دکانیں
موجوں میں یہ آنکھیں، یہ ہواؤں کی زبانیں
بھیگے ہوئے لمحوں کی یہ ڈوبی ہوئی تانیں
بہکی ہوئی راتوں کے یہ بھیگے ہوئے جگنو
اے دولتِ پہلو
ہاں تان اُڑا تان، قسمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۲

گھنگھور گھٹاؤں میں یہ خوابوں کے فسانے
بوچھار میں، ہاروں کے یہ ٹوٹے ہوئے دانے
پُروائی کی سن سن میں یہ شاخوں کے ترانے
بہتے ہوئے یہ سُر، یہ برستے ہوئے گانے
یہ مور کی جھنکار، پپیہے کی یہ پی ہو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۳

اِک سمت مُغنّی جنوں خیز و خروشے
اِک سمت بُتِ لالہ وَشے، عشوہ فروشے
اِک سمت سرود و سخن و سوز کے گوشے
اِک سائے میں صہبا کے مہکتے ہوئے خوشے
اِک سیج پہ برہا کے دہکتے ہوئے آنسو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

۱۴

یہ پستی، یہ گیندی، یہ سرمئی بادل
یہ فاختی، سردی، فیروزی مخمل
یہ نقری، یہ کتھئی، یہ اگری آنچل،
اور فالسئی طشت میں یہ چمپئی بوتل
بوتل میں بھرا کتا ہوا یہ شعلۂ وارو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

۱۵

ہر سجدۂ صد دانہ ہے اک زلفِ تہ دام
ہر سجدۂ شکرانہ ہے اک جست سُوئے جام
ہر گردشِ پیمانہ ہے اک رقصِ خوش انجام
ہر نعرۂ رندانہ ہے اک نغمۂ الہام
ہر لغزشِ مستانہ ہے اک قوتِ بازو
اے دولتِ پہلو
ہاں تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

۱۶

اس رُت میں خرابات کی پوشاک ہے دھانی
اور جوش کے ساغر میں خرابات کی رانی
اِس شیخ سے کہہ دے کہ ارے دشمنِ جانی
خاموش کہ اس وقت ہے موسم کی جوانی
رخشندہ بہر کوچہ و رقصندۂ بہر کو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قسم پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو
اے زینت پہلو
اے جنّت پہلو
اے آفت پہلو

○

جگر مرادآبادی

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے
کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے

مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جرأتِ شوق
کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گزرے

خطا معاف! زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے

مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں
یہ اک جہاں ہی نہیں سینکڑوں جہاں گزرے

اسی کو کہتے ہیں جنت، اسی کو دوزخ بھی
وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گزرے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو، انھیں کی یاد جگر
وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گزرے

○

جگر مراد آبادی

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے

مری تباہیٔ دل پر تو رحم کھا نہ سکے
مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے

وہ سبزہ رنگ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گل ہے زخمِ بہاراں جو مسکرا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمعِ دانش کا
جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے

انھیں سعادتِ منزل رسی نصیب ہو کیا
وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے

نہ جانے آہ کہ اُن آنسوؤں پہ کیا گذری
جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل،
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

نہ ہے خلوصِ محبت کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا، مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

مری نظر سے گریزاں بہت رہے، لیکن
مرے حدودِ محبت سے بچ کے جا نہ سکے

یہ مہر و ماہ مرے ہمسفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا
وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انسان
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے

○

فراق گورکھپوری

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے

وہ چوٹ جو کیا جانے کہاں سے اُبھر آئے
وہ درد فرشتوں کو جو انسان بنائے

آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آئے
زرّیں کمرے، کج کلہے، تنگ قبائے

اک برقِ ادا، شعلہ قبا، پیکرِ رنگیں
دامانِ مہ و مہر کو پہلو میں دبائے

کوندا ہو گداز۔ اُف یہ تبسم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک، لو جو ستاروں سے چرائے

وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے
وہ چستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے

دوشیزہ جوانی کی اُدھر ٹوٹتی انگڑائی
تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے

وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے

یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی
دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ بنائے

کچھ ایسی بھی گذری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

جگنو

فراق گورکھپوری

یہ مست مست گھٹا، یہ بھری بھری برسات
تمام — حدِ نظر تک — گھلاوٹوں کا سماں
فضائے شام میں ڈورے سے پڑتے جاتے ہیں
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے
دہک اٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آکاش
زفرش تا فلک انگڑائیوں کا عالم ہے
یہ مدبھری ہوئی پُروائیاں سنکتی ہوئی
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا
یہ شاخسار کے جھولوں میں جھینک پڑتے ہوئے
یہ لاکھوں پتیوں کا ناچنا یہ رقصِ نباتات
یہ بیخودی مسرت یہ والہانہ رقص
یہ تال سم، یہ چھما چھم — کہ کان بجتے ہیں!
ہوا کے دوش پہ کچھ کاہ وی اُودی شکلوں کی
نشے میں چور سی پرچھائیاں تھرکتی ہوئی
اُفق پہ ڈوبتے دن کی جھپکتی ہیں آنکھیں
خموش سوزِ دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام

مرے مکان کے آگے ہے ایک صحن وسیع
کبھی وہ ہنستی نظر آتی ہے، کبھی وہ اُداس
اسی کے بیچ میں ہے ایک پیڑ پیپل کا
سنا ہے میں نے بزرگوں سے یہ کہ عمر اس کی
جو کچھ نہ ہوگی تو ہوگی قریب چھیانوے سال
چھڑی تھی ہند میں جب پہلی جنگِ آزادی
جسے دبانے کے بعد اس کو غدر کہنے لگے
یہ اہلِ ہند بھی ہوتے ہیں کس قدر معصوم
وہ دار و گیر وہ آزادیٔ وطن کی جنگ
وطن سے تھی کہ غنیمِ وطن سے غداری
بپھر گئے تھے ہمارے وطن کے پیر و جواں
دیارِ ہند میں رن پڑ گیا تھا چار طرف
اُسی زمانے میں کہتے ہیں میرے دادا نے
جب ارضِ ہند پہ خون سے سپوتوں کے
میانِ صحن لگایا تھا لا کے اک پودا

جو آب و آتش و خاک و ہوا سے پلتا ہوا
خود اپنے قد سے بجوشِ نمو نکلتا ہوا
فسونِ روحِ نباتی رگوں میں چلتا ہوا
نگاہِ شوق کے سانچوں میں روز ڈھلتا ہوا
سنا ہے راویوں سے دیدنی تھی اس کی اٹھان
ہر اک کے دیکھتے ہی دیکھتے چڑھا پروان
وہی ہے آج یہ چھتنار پیڑ پیپل کا
وہ ٹہنیوں کے گھنڈل لیے جٹا دھاری
زمانہ دیکھے ہوئے ہے یہ پیڑ بچپن سے
رہی ہے اس کے لیے داخلی کشش مجھ میں
رہا ہوں دیکھتا چپ چاپ دیر تک اس کو
میں کھو گیا ہوں کئی بار اس نظارے میں
وہ اس کی گہری جڑیں تھیں کہ زندگی کی جڑیں؟
پس سکونِ شجر کوئی دل دھڑکتا تھا
میں دیکھتا تھا کبھی اس میں زندگی کا ابھار
میں دیکھتا تھا اسے ہستیِ بشر کی طرح
کبھی اداس کبھی شادماں، کبھی گمبھیر

فضا کا سرمئی رنگ اور ہو چلا گہرا
گھلا گھلا سا فلک ہے دھواں دھواں سی ہے شام
ہے جھٹپٹا کہ کوئی اڑ رہا ہے مائلِ خواب
سکوتِ شام میں درماندگی کا عالم ہے
رکی رکی سی کسی سوچ میں ہے موجِ صبا
رکی رکی سی صفیں ملگجی گھٹاؤں کی۔
اتار پر ہے سرِ صحن رقصِ پیپل کا
وہ کچھ نہیں ہے اب اک جنبشِ خفی کے سوا
خود اپنی کیفیتِ نیلگوں میں ہر لفظ
یہ شام ڈوبتی جاتی ہے چھپتی جاتی ہے
حجابِ وقت سرے سے ہے بحرِ حرکت
رکی رکی دلِ فطرت کی دھڑکنیں یکلخت
یہ رنگِ شام کہ گردش ہی آسماں میں نہیں

بس ایک وقفۂ تاریک، سر بسر تاریک
سماں میں جنبشِ مبہم سی کچھ ہوئی — فوراً
تلی گھٹا کے تلے بلکے بھیگے پتوں سے
ہری ہری کئی چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں
کہ جیسے کھلتی جھپکتی ہوں بے شمار آنکھیں
عجب یہ آنکھ مچولی تھی نور و ظلمت کی
سہانی نرم لویں دیتے اَن گنت جگنو
گھنی سیاہ خنک پتیوں کے جھرمٹ سے
مثالِ چادرِ شب تاب جگمگانے لگے
کہ تھرتھراتے ہوئے آنسوؤں سے ساغرِ شام
چھلک چھلک پڑے جیسے بغیر سان گمان
بطونِ شام میں ان زندہ قمقموں کی دمک
کسی کی سوئی ہوئی یاد کو جگاتی تھی —
وہ بے پناہ گھٹا وہ بھری بھری برسات
وہ سین دیکھ کے آنکھیں مری بھر آتی تھیں

مری حیات نے دیکھی ہیں بیس برساتیں
مرے جنم ہی کے دن مر گئی تھی ماں میری
وہ ماں کہ اس کی شکل بھی جس ماں کی میں نہ دیکھ سکا
جو آنکھ بھر کے مجھے دیکھ بھی سکی نہ، وہ ماں
میں وہ پسر ہوں جو کہلا نہیں کہ ماں کیا ہے
مجھے کھلائیوں اور دائیوں نے پالا تھا
وہ مجھ سے کہتی تھیں جب گھر کے آتی تھی برسات
جب آسمان میں ہر سو گھٹائیں چھاتی تھیں
بوقتِ شام جب اڑتے تھے ہر طرف جگنو
دیئے دکھاتے ہیں یہ بھولی بھٹکی روحوں کو
مزہ بھی آتا تھا مجھ کو کچھ ان کی باتوں میں
میں ان کی باتوں میں رہ رہ کے کھو بھی جاتا تھا
پر اس کے ساتھ ہی دل میں کسک سی ہوتی تھی
کبھی کبھی یہ کسک ہوک بن کے اٹھتی تھی
یتیم دل کو مرے یہ خیال ہوتا تھا
یہ شام مجھ کو بنا دیتی کاش اک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
کہاں کہاں وہ بچاری بھٹک رہی ہوگی

کہاں کہاں مری خاطر بھٹک رہی ہوگی
یہ سوچ کر مری حالت عجیب ہو جاتی
پلک کی اوٹ میں جگنو چمکنے لگتے تھے
کبھی کبھی تو مری ہچکیاں سی بندھ جاتیں
کہ ماں کے پاس کسی طرح میں پہنچ جاؤں
اور اس کو راہ دکھاتا ہوا میں گھر لاؤں
دکھاؤں اپنے کھلونے دکھاؤں اپنی کتاب
کہوں کہ پڑھ کے سُنا تو مری کتاب مجھے
پھر اس کے بعد دکھاؤں اُسے میں وہ کاپی
کہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنی تھیں کچھ جس میں
یہ حرف تھے جنھیں میں نے لکھا تھا پہلے پہل
دکھاؤں پھر اُسے آنگن میں وہ گلاب کی بیل
سُنا ہے جس کو اُسی نے کبھی لگایا تھا
یہ جب کی بات ہے جب میری عمر ہی کیا تھی
نظر سے گزری تھیں کل چار پانچ برساتیں

گزر رہے تھے مہ و سال — اور موسم پر
ہمارے شہر میں آتی تھی گھر کے جب برسات
جب آسمان میں اُڑتے تھے ہر طرف جگنو
ہوا کی موج رواں پر دیئے جلائے ہوئے
فضا میں رات کے جب درخت پیپل کا
ہزاروں جگنوؤں سے کوہ طور بنتا تھا
ہزاروں وادیٔ ایمن تھیں جس کی شاخوں میں
یہ دیکھ کر مرے دل میں یہ ہوک اُٹھتی تھی
کہ میں بھی ہوتا انھیں جگنوؤں میں اک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
وہ ماں میں جس کی محبت کے پھول چن نہ سکا
وہ ماں میں جس سے محبت کے بول سُن نہ سکا
وہ ماں کہ بھینچ کے جس کو کبھی میں سو نہ سکا
میں جس کے آنچلوں میں منہ چھپا کے رو نہ سکا
وہ ماں کہ گھٹنوں سے جس کے کبھی لپٹ نہ سکا
وہ ماں کہ سینے سے جس کے کبھی چمٹ نہ سکا
ہمک کے گود میں جس کی کبھی میں چڑھ نہ سکا
میں زیر سایۂ اُمید جس کے بڑھ نہ سکا
وہ ماں میں جس سے شرارت کی داد پا نہ سکا
میں جس کے ہاتھوں محبت کی مار کھا نہ سکا
سنوارا جس نے نہ میرے جھنڈ ٹوٹے بالوں کو
بسا سکی نہ جو ہونٹوں سے سوئے گالوں کو
جو میری آنکھوں میں آنکھیں کبھی نہ ڈال سکی
نہ اپنے ہاتھوں سے مجھ کو کبھی اچھال سکی
وہ ماں جو کوئی کہانی مجھے سُنا نہ سکی
مجھے سُلانے کو جو لوریاں بھی گا نہ سکی

وہ ماں جو دودھ بھی اپنا مجھے پلا نہ سکی
وہ ماں جو ہاتھ سے اپنے مجھے کھلا نہ سکی
وہ ماں گلے سے مجھے جو کبھی لگا نہ سکی
وہ ماں جو دیکھتے ہی مجھ کو مسکرا نہ سکی
کبھی جو مجھ سے مٹھائی چھپا کے رکھ نہ سکی
کبھی جو مجھ سے دہی بھی بچا کے رکھ نہ سکی
میں جس کے ہاتھ میں کچھ دیکھ کر ڈپک نہ سکا
ٹھٹک ٹھٹک کے کبھی پاؤں میں ٹھٹک نہ سکا
کبھی نہ کھینچا شرارت سے جس کا آنچل بھی
دچا سکی مری آنکھوں میں جو نہ کاجل بھی
وہ ماں جو میرے لیے تتلیاں پکڑ نہ سکی
جو بھاگتے ہوئے بازو مرے جکڑ نہ سکی
بڑھایا پیار کبھی کر کے پیار میں نہ کمی
جو منہ بنا کے کسی دن نہ مجھ سے روٹھ سکی
جو یہ بھی کہہ نہ سکی جا نہ بولوں گی تجھ سے
جو ایک بار خفا بھی نہ ہو سکی مجھ سے
وہ جس کو جھوٹا لگا منہ کبھی دکھا نہ سکا
کثافتوں پہ مری جس کو پیار آ نہ سکا
جو مٹی کھانے پہ مجھ کو کبھی نہ پیٹ سکی
نہ ہاتھ تھام کے مجھ کو کبھی گھسیٹ سکی
وہ ماں جو گفتگو کی رو میں سن کے میری بڑ
کبھی جو پیار سے مجھ کو نہ کہہ سکی گھامڑ
شرارتوں سے مری جو کبھی الجھ نہ سکی
حماقتوں کا مری فلسفہ سمجھ نہ سکی
وہ ماں کبھی جسے چونکانے کو میں ٹک نہ سکا
میں راہ چھینکنے کو جس کے آگے رک نہ سکا
جو اپنے ہاتھ سے ہر دپ میرے بھر نہ سکی
جو اپنی آنکھوں کو آئینہ میرا کر نہ سکی

گلے میں ڈالی نہ بانہوں کی پھول مالا بھی
نہ دل میں لوح جبیں سے کیا اجالا بھی
وہ ماں کبھی جو مجھے بدھیاں پہنا نہ سکی
کبھی مجھے نئے کپڑوں سے جو سجا نہ سکی
وہ ماں نہ جس سے لڑکپن کے جھوٹ بول سکا
نہ جس کے دل کے در ان کنجیوں سے کھول سکا
وہ ماں میں جیسے بھی جس کے کبھی چرا نہ سکا
سزا سے بچنے کو جھوٹی قسم بھی کھا نہ سکا
وہ ماں کہ آیت رحمت ہے جس کی چین جبین
وہ ماں کہ ماں سے ہوئی ہے بڑھ کے جس کی نہیں
دم عتاب جو بنتی فرشتہ رحمت کا
جو راگ چھیڑتی جھنجھلا کے بھی محبت کا
وہ ماں کہ گھڑکیاں بھی جس کی گیت بن جائیں
وہ ماں کہ جھڑکیاں بھی جس کی پھول برسائیں
وہ ماں ہم اس سے جو دم بھر کو دشمنی کر لیں
تو یہ نہ کہہ سکی اب آؤ دوستی کر لیں
کبھی جو سن نہ سکی میری توتلی باتیں
نہ دے سکی جو کبھی تھپکیوں کی سوغاتیں
وہ ماں بہت سے کھلونے جو مجھ کو دے نہ سکی
مزاج سرخوشی سرمدی جو لے نہ سکی
وہ ماں میں جس سے لڑائی کبھی نہ ٹھان سکا
وہ ماں میں جس پہ کبھی مٹھیاں نہ تان سکا
وہ میری ماں میں کبھی جس کی پیڑھیر نہ چڑھا
وہ میری ماں کبھی مجھ جس کے کان میں نہ کہا
وہ ماں کبھی جو مجھے کر دھنی پہنا نہ سکی
جو تال ہاتھ سے دے کر مجھے نچا نہ سکی
وہ ماں نہ دیکھ سکا زندگی میں جس کی راہ
اسی کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ

یہ سوچ سوچ کے آنکھیں مری بھر آتی تھیں
تو جا کے سونے بچھونے پہ لیٹ رہتا تھا
کسی سے گھر میں نہ راز اپنے دل کے کہتا تھا
یتیم تھی مری دنیا، یتیم میری حیات
یتیم شام و سحر تھی، یتیم تھے شب و روز
یتیم میری پرچھائی تھی میرے کھیل یتیم
یتیم میری مسرت تھی میرا غم بھی یتیم
یتیم آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا تھا
کسی سے گھر میں نہ کہتا تھا اپنے دل کا بھید
ہر اک سے دور اکیلا اداس رہتا تھا
کسی شمائل نادیدہ کو میں تکتا تھا
میں ایک وحشت بے نام سے ہر کتا تھا

گزر رہے تھے مہ و سال اور موسم پر
اسی طرح کئی برساتیں آئیں اور گئیں
میں رفتہ رفتہ پہنچنے لگا بہ سن شعور
تو جگنوؤں کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی
اب ان کہانیوں اور دادیوں کی باتوں پہ
مرا یقیں نہ رہا، مجھ پہ ہو گیا ظاہر
کہ بھٹکی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
وہ سن گھڑت سی کہانی تھی اک فسانہ تھا
وہ بے پڑھی لکھی کچھ عورتوں کی تھی بکواس
بھٹکتی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
یہ کھل گیا مرے بہلانے کو تھیں یہ باتیں
مرا یقیں نہ رہا ان فضول قصوں پر۔

ہمارے شہر میں آتی ہیں اب بھی برساتیں
ہمارے شہر پہ اب بھی گھٹائیں چھاتی ہیں
ہنوز بھیگی ہوئی سوندھی فضاؤں میں
خطوط نور بناتی ہیں جگنوؤں کی صفیں
فضائے تیرہ میں اڑتی ہوئی یہ قندیلیں
مگر میں جان چکا ہوں اسے بڑا ہو کر
کسی کی روح کو جگنو نہیں دکھاتے راہ
کہا گیا تھا جو بچپن میں مجھ سے جھوٹ تھا اب

مگر کبھی کبھی حسرت سے دل میں کہتا ہوں
یہ جانتے ہوئے جگنو نہیں دکھاتے چراغ
کسی کی بھٹکی ہوئی روح کو — مگر پھر بھی
وہ جھوٹ ہی سہی کتنا حسین جھوٹ تھا وہ
جو مجھ سے چھین لیا عمر کے تقاضے نے

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دُنیا تھی
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے چھین لی مجھ سے
سمجھ سکے کوئی اسے کاش عہدِ طفلی کو
جہان دیکھنا مٹی کے ایک ریزے میں
نمودِ لالۂ خودرو میں دیکھنا جنت
کرے نظارۂ کونین اک گھروندے میں
اُٹھا کے رکھ لے خدائی کو جو ہتھیلی پر
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں
سنا؟ وہ قادرِ مطلق ہے ایک ننھی سی جان
خدا بھی سجدے میں جھک جائے سامنے اس کے

یہ عقل و فہم بڑی چیز ہیں مجھے تسلیم
مگر لگا نہیں سکتے ہم اس کا اندازہ
کہ آدمی کو یہ پڑتی ہیں کس قدر مہنگی
اک ایک کر کے وہ طفلی کے ہر خیال کی موت
بلوغِ سن میں وہ صدمے نئے خیالوں کے
نئے خیال کا دھچکا نئے خیال کی ٹیس
نئے تصوروں کا کرب، الاماں، کہ حیات
تمام زخم نہاں ہے تمام نشتر ہے
یہ چوٹ کھا کے سنبھلنا محال ہوتا ہے

سکوتِ رات کا جس وقت چھیڑتا ہے ستار
کبھی کبھی تری پائل کی آتی ہے جھنکار
تو میری آنکھوں سے موتی برسنے لگتے ہیں
اندھیری رات کے پرچھاویں ڈسنے لگتے ہیں
میں جگنوؤں کے تو تجھ تک پہنچ نہیں سکتا
جو تجھ سے ہو سکے اے ماں تو وہ طریقہ بتا
ترے کو پالے وہ کاغذ اُچھال دوں کیسے
یہ نظم میں ترے قدموں میں ڈال دوں کیسے

نوائے درد سے کچھ جی تو ہو گیا ہلکا
مگر جب آتی ہے برسات کیا کروں اس کو
جب آسمان میں اُڑتے ہیں سمت جگنو
شرابِ نور لیے سبز آبگینوں میں
کنول جلاتے ہوئے ظلمتوں کے سینوں میں
جب ان کی تابشِ بے ساختہ سے جھیل کا
درخت سرو چراغاں کو مات کرتا ہے
نہ جانے کس لیے آنکھیں مری بھر آتی ہیں

بات سمجھنے والا

حفیظ جالندھری

روزِ روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

دورِ بالغ نظراں اور ہے۔ یہ دور نہیں
ہم بزرگوں کے مقامات سمجھنے والا

جلوۂ صبحِ قیامت کے لیے ہے بیدار
چاند تاروں کے اشارات سمجھنے والا

منتظر ہے۔ کہ ہو مغرب سے طلوعِ خورشید
اپنے اللہ کی آیات سمجھنے والا

تو سمجھتا ہے جسے رنگِ بہارِ گلبار
میں اسے خون کی برسات سمجھنے والا

آج کل تو بھی نشے میں ہے تو مجھ سے نہ الجھ
میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھنے والا

میرے بگڑے ہوئے تیور بھی سمجھ لے اے کاش
میرے بگڑے ہوئے حالات سمجھنے والا

درِ زنداں پہ ہے اک طرفہ غضبناک ہجوم
شانِ رندانِ خرابات سمجھنے والا

اس نئے دورِ سخن سے ہے پریشان حفیظ
شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا

○

آرزو لکھنوی

زندگی مجبوریوں کا راز ہو کر رہ گئی
سانس اک فریادِ بے آواز ہو کر رہ گئی

دل کی دھڑکن نغمہائے راز ہو کر رہ گئی
جو محبت سوز تھی وہ ساز ہو کر رہ گئی

کی بمشکل آہ اور پھر دے گئی طاقت جواب
غم کی لمبی داستاں آغاز ہو کر رہ گئی

بات کیا ہے خود نہیں سمجھے تو سمجھاتے کسے
وہ جو الجھن دل میں تھی اک راز ہو کر رہ گئی

ہر نفس اک نالۂ دل اور دل پابندِ غم
زندگی زنجیر کی آواز ہو کر رہ گئی

اب کہاں قربانگہِ الفت میں ہم سا جاں نثار
اچار دن مشقِ ادا و ناز ہو کر رہ گئی

اوّل اوّل جھوٹے غمخواروں کی یاد آئی بہت
آخر آخر بے کسی دمساز ہو کر رہ گئی

جس کے بل پر پھڑپھڑا کر ہم نے توڑا تھا قفس
اب وہ حسرت حسرتِ پرواز ہو کر رہ گئی

ناتواں دل کی فغانِ آخری اے آرزو
کان میں گونجی ہوئی آواز ہو کر رہ گئی

○

فیض احمد فیض

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں درد مندی ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد ترمیمِ زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی صبحِ وصالِ ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر و باراں

آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسنیمِ مے فروشاں پیغامِ مے گساراں

آگ میں پھول

فیض احمد فیض

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن، کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں،

مگر گذارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

○

سیماب اکبر آبادی

جو در پردہ انھیں جلوہ نمائی کی نہ خو ہوتی
میں سچ کہتا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی

متاعِ ضبط وقتِ واپسیں کی رائگاں میں نے
نگاہِ حسن میں ایک اشک کی کیا آبرو ہوتی

مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تجھے منزل
اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی

حدیثِ طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں میں
ہوئی تھی گفتگو اُن سے تو کھل کر گفتگو ہوتی

غلط ہے عشق پر الزامِ آوارہ نگاہی کا
جو ہوتا حسن یک سُو تو نظر کیوں چار سُو ہوتی

دل اک قطرہ تھا۔ ژولیدہ، چکیدہ سیلِ غم دیدہ
ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی

میں برقِ حسن کو روکے ہوئے ہوں دل پہ اے دنیا
اگر یہ کوند کر گرتی تو میں ہوتا نہ تو ہوتی

وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اک کم سے کم جلوہ
جزائے آرزو یارب، بقدرِ آرزو ہوتی

دلِ اے سیماب خالی آرزو سے رہ نہ سکتا تھا
نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی

○

عبدالمجید سالک

مرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ مغاں سے
کہ ملا جمالِ ساقی کو یہ طمطنہ کہاں سے

وہ یہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا
تو اٹھا سکا نگاہیں نہ بتا سکا زباں سے

جو انھیں وفا کی سوجھی تو نہ زیست نے وفا کی
ابھی آ کے وہ نہ بیٹھے کہ ہم اٹھ گئے جہاں سے

میں عدم کے لالہ زاروں میں فراگرِ ازل تھا
مجھے کھینچ لائی ظالم تری آرزو کہاں سے

مری سرنوشت میں تھا وہی داغِ نامرادی
جو ملا مری جبیں کو ترے سنگِ آستاں سے

بچے بجلیوں کی زد سے وہی طائرانِ دانا
جو کڑک چمک سے پہلے نکل آئے آشیاں سے

یہ ہے سرگزشتِ وحشت کہ ملا سراغِ محمل
نہ درائے کارواں سے نہ غبارِ کارواں سے

شبِ غم جو آئی سالک مٹے عارضی اندھیرے
مرا دل ہوا منور تب و تابِ جاوداں سے

○

تاثیر

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم نظری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ، وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

○

چراغ حسن حسرت

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی
موت ہی غم گسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل پہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

○

اختر شیرانی

اٹھا ساغر، کہ دنیا درپئے آزار ہے ساقی
مشیت ہو کہ قسمت، برسرِ پیکار ہے ساقی

غضب ہے یہ جوانی اور ہم اس طرح سے کاٹیں
کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی

محبت کر۔ غمِ دنیا ستائے تو محبت کر
محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی

خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیائے غمگیں میں
مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی

محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدر ہے
مگر اس کے لیے کچھ زندگی درکار ہے ساقی

پریشاں کر دے تو بھی زلفِ مشکیں دوشِ رنگیں پر
کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گلکار ہے ساقی

عجب کیا ہے یہ کافر رات آنکھوں ہی میں کٹ جائے
ادھر بے خواب ہے اختر ادھر بیدار ہے ساقی

○

وحشت کلکتوی

کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ اُمید کھا رہا ہوں
ہزار ہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں

وفا مری معتبر ہے کتنی، جفا وہ کر سکتے ہیں کہاں تک
جو وہ مجھے آزما رہے ہیں تو میں اُنھیں آزما رہا ہوں

کسی کی محفل کا نغمہ نے محرک نالہ و فغاں ہے
فسانۂ عیش سن رہا ہوں فسانۂ غم سنا رہا ہوں

زمانہ بھی مجھ سے ناموافق میں آپ بھی دشمن سلامت
تعجب اس کا ہے بوجھ کیونکر میں زندگی کا اُٹھا رہا ہوں

نہ مجھے جستجوئے منزل مگر ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف کو تو جا رہا ہوں

یہی تو ہے نفع کوششوں کا کہ کام سارے بگڑ رہے ہیں
یہی تو ہے فائدہ ہوس کا کہ اشکِ حسرت بہا رہا ہوں

خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشت
وہ جتنی الفت گھٹا رہے ہیں اُسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

○

اثر لکھنوی

صلہ جاں بازیوں کا پا رہے ہیں
نظر سے ہم گرائے جا رہے ہیں

ہوا مدِ نظر پھر دل دکھانا
توجہ پھر ادھر فرما رہے ہیں

جو آئے تھے مجھے تسکین دینے
تماشا ہے کہ خود گھبرا رہے ہیں

گلِ تر کا ہوا جاتا ہے دھوکا
وہ اس انداز سے شرما رہے ہیں

تغافل کشتگانِ بے نیازی
تری باتوں سے دل بہلا رہے ہیں

چلی کیسی ہوا گلشن میں یارب
خزاں سے پہلے گل مرجھا رہے ہیں

اثر اب شکر کرتے ہیں جفا پر
محبت کی حدوں میں آ رہے ہیں

○

احمد ندیم قاسمی

کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا
چاند ابھرا تو اندھیرا چمکا

صبح کو راہ دکھانے کے لئے
دستِ گل میں ہے دیا شبنم کا

وقت سستا کے بڑھے گا پھر سے
غم مقدر تو نہیں آدم کا

مجھ کو ابرو، تجھے محراب پسند
سارا جھگڑا اسی نازک خم کا

حسن کی جستجوئے پیہم میں
ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا

ہوئے اس دور میں فتوے جاری
کہ غزالوں کو جنوں ہے رم کا

مجھ سے مر کر بھی نہ ٹوٹا جائے
ہائے یہ نشہ زمیں کے غم کا

اب سیو چاک گریبانِ حیات
کہ تقاضا ہے یہی موسم کا

غنچہ پھر لگا کھلنے!

احمد ندیم قاسمی

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکوتِ بے پایاں
یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ جل رہا ہے چراغ

کچھ ایسے ٹوٹ رہی ہیں رگیں تخیل کی
کہ جیسے تندیٔ مے سے چٹخ رہا ہو ایاغ

ہوا چلی کہ مشیت کو دل لگی سوجھی
سمندروں سے نہ پوچھو کبھی صدف کا سراغ

ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تحیر ہے
ہوا کے بھیس میں اُمڈے سکوت کے دھارے

یہاں تو گل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے
کہ تیرگی میں گھلے جا رہے ہیں بے چارے

اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ جیسے جھیل کی تہ تک اُتر گئے تارے

نشیبِ شام سے نجمِ سحر کی چوٹی تک
تمام ریگستے کہرے، تمام سناٹے

تھکے تھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیور
کہ جیسے شیر ہرن کو رگِ گلے کے لب چاٹے

سنا ہے ایسی ہی شبہائے تار تھیں، جن میں
بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے

مری نگاہ سے اوجھل ہے کاروانِ سحر
مگر جرس کی صدا تھی کہ رات بھر دھتی

سجے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر
مجھے یہ وہم کہ آغوشِ گل میں برف جمی

جو آنسوؤں نے سرِ بام دل جلائے تھے
بجھا گئی وہ دیئے دامنِ صبا کی نمی

افق لرزنے لگا، رات کے قدم اکھڑے
ستارۂ سحری نے مجھے نہ پہچانا
یہ اور بات مجھے تابِ ضبط ہے کہ نہیں

قدم اُٹھا تو چھنکنے لگی ہیں زنجیریں
کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھ میں پھاوڑا
دہک رہا تھا وہ پندار ان کے چہروں پر

گھر بجا کہ عروسِ سحر ہوئی بیدار
اٹھی افق سے وہ مجبورِ شگفتہ مزاج
زمیں سے تا بہ فلک رنگ لہلہانے لگے

میں سوچتا ہوں، سحر نے مجھے شعور دیا
مچل رہی ہیں شعاعیں، اُبل رہا ہے لہو
چمک تو خوب تھی لیکن جھلس گئے ہیں بدن

سحر کی ایک ہی تفسیر ہے ـــ طلوعِ سحر
نہ مسکرائے گا غنچہ بہار آنے تک

سحر کے بند دریچے پہ کیوں نہ دستک دوں
تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں
سحر کی انجمنِ نور میں قدم تو دھروں

نظر اُٹھی تو دکھائی دیے کئی احباب
کسی کے پاس قلم تھا، کسی کے پاس کتاب
دیا ہے اہلِ حکم نے جسے جنوں کا خطاب

تنی ہوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی
جو شب کو پردہ نشیں تھی تو دن کو ہرجائی
مگر یہ دھند سی کیسا ذہن پر اُتر آئی

مگر یہی کہ سلاسل کے سلسلے ہیں طویل
اُمڈ رہی ہے تجلی، اُبھر رہی ہے فصیل
نہ جانے آتشِ نمرود ہے کہ صبحِ جمیل

مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں

کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصلِ گل تو نہیں
کہ بوئے گل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

اسرار الحق مجاز

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی
ہاں لطف جب ہے پا کے بھی ڈھونڈا کرے کوئی

دنیا لرز گئی دلِ حرماں نصیب کی
اس طرح سازِ عیش نہ چھیڑا کرے کوئی

رنگینیٔ نقاب میں گم ہو گئی نظر
کیا بے حجابیوں کا تقاضا کرے کوئی

یا تو کسی کو جرأتِ دیدار ہی نہ ہو
یا پھر مری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی

مجھ کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقابِ خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

تم نے تو حکمِ ترکِ تمنا سنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنا کرے کوئی

ہوتی ہے اس میں حسن کی توہین اے مجاز
اتنا نہ اہلِ عشق کو رسوا کرے کوئی

ایک گیت

میرا جی

انجانے نگر من مانے تھے من مانے نگر انجانے رہے
اپنی باتوں کی مستی میں
سنتے رہے دل کی بستی میں
وہی گیت جو کچھ من مانے رہے وہی راگ جو کچھ کے بہانے رہے

راتیں بیتیں دن بیت گئے
راتیں بھی نئی پھر دن بھی نئے
مورکھ من ایسا ہٹیلا ہے اسے یاد وہ رنگ پرانے رہے

انہونی کا جسے دھیان رہا
ہونی نے اسے چپکے سے کہا
نہ وہ باتیں رہیں نہ زمانے رہے جو رہے بھی تو باقی فسانے رہے

اب گیت میں رس ٹپکاتے ہیں
یوں دل کی آگ بجھاتے ہیں
اب سب کے لیے وہی بادلے ہیں جو بیتے سمے میں سہانے رہے

○

میراجی

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسی بھی گزری ان کے سہارے گزری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دُوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں، تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادی ہم ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

○

صوفی تبسم

وفا کی آخری منزل بھی آ رہی ہے قریب
جو اس جگہ بھی نہ تو مل سکے تو میرے نصیب

فغانِ حق و صداقت کا مرحلہ ہے عجیب
وہ بے تو بند و سلاسل اُٹھے تو دار و صلیب

ترے خیال کا مسکن چمن چمن کا سفر
مری وفا کا نشیمن فقط دیارِ حبیب

نظر سے بچ کے ملے ہیں وہ بارہا مجھ کو
ہزار بار ہوا ہے یہ دل نظر کا رقیب

اُلجھ نہ جائیں کہیں اور دل کے افسانے
کہاں حدیثِ محبت، کہاں بیانِ خطیب

نہ جانے کونسی شے چشمِ غمگسار میں تھی
کہ جس کو دیکھ کے لرزاں ہوا ہے دستِ طبیب

ابھی فسردہ ہے ساقی ترا تبسم لب
کسی کی یاد کو لے آؤ میکدے کے قریب

○

عابد علی عابد

چین پڑتا ہے دل کو آج نہ کل
وہی الجھن گھڑی گھڑی پل پل

لاکھ آندھی چلے خیاباں میں
مسکراتے ہیں ڈالیوں میں کنول

لاکھ بجلی گرے گلستاں میں
لہلہاتی ہے شاخ میں کونپل

کھل رہا ہے گلاب ڈالی پر
جل رہی ہے بہار کی مشعل

بات نرمی سے یوں وہ کہتے ہیں
جیسے لہرائے ریشمی آنچل

مجھے دھوکا ہوا کہ جادو ہے
پاؤں بجتے ہیں ان کے بن چھاگل

میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
ان کے مرنے کا نام تاج محل

کبھی بگڑا نہ کام دیو کا روپ
وہی سج دھج رہی وہی چھل بل

پیار کی راگنی انوکھی ہے
اس میں لگتی ہیں سب سریں کومل

دم رخصت وہ چپ رہے منہ سے
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

نہ ہوا رفع میرے دل کا غبار
کیسے کیسے برس گئے بادل

یا کبھی عاشقی کا کھیل نہ کھیل
یا اگر مات ہو تو ہات نہ مل

میں نے ہائے جو کی وہ بات ہے اور
تیری چاہت کے دکھ نہ تھے بوجھل

کوہکن سے مفسر نہیں کوئی
بے ستوں ہو کہیں کہ بندھیاچل

ایک دن پتھروں کے بوجھ تلے
خود بہ خود گر پڑیں گے راج محل

کیا سہانی گھٹا ہے ساون کی
ساوری نار مدھ بھری چنچل

وہی کرتی ہیں دل میں گھر عابد
جو ادائیں ہیں آنکھ سے اوجھل

○

ن۔م راشد

تیرے کرم سے خدائی میں یوں تو کیا نہ ملا
مگر جو تو نہ ملا، زیست کا مزا نہ ملا
حیاتِ شوق کی یہ گرمیاں کہاں ہوتیں
خدا کا شکر ہمیں نالۂ رسا نہ ملا
ازل سے فطرتِ آزاد ہی تھی آوارہ
یہ کیوں کہیں کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا
یہ کائنات کسی کا غبارِ راہ سہی
دلیلِ راہ جو بنتا وہ نقشِ پا نہ ملا
یہ دل شہیدِ فریبِ نگاہ ہو نہ سکا
وہ لاکھ ہم سے بہ اندازِ محرمانہ ملا
کنارِ موج میں مرنا تو ہم کو آتا ہے
نشانِ ساحلِ الفت ملا، ملا، نہ ملا
تری تلاش ہی تھی مایۂ بقائے وجود
بلا سے ہم کو سرِ منزلِ بقا نہ ملا

اِنقلابی

ن - م راشد

مورخ، مزاروں کے بستر کا بارِ گراں
عروس اُس کی نارس تمناؤں کے سوز سے
آوبرلب
جدائی کی دہلیز پر زلف در خاک، نوحہ کناں!
یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اس غمزدہ سے
کہا: "اوٹھ، اب لاؤ، در یوزۂ غمزۂ جاں ستاں!"

مگر خواہشیں اشہبِ باد پیما نہیں،
جو ہوں بھی تو کیا
کہ جولانگہِ وقت میں کس نے پایا ہے
کس کا نشاں

یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا،
کہ تاریخ دانوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی روحِ رواں کو اُجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟

جو آنکھوں میں اُس وقت آنسو نہ ہوتے،
تو یہ مضطرب جاں،
یہ ہر تازہ و نو بنو رنگ کی دلربا!
تری اس پذیرائی چشم و لب سے
وفا کے سنہری جزیروں کی شہزاد ہوتی
ترے ساتھ منزل بمنزل رواں و دواں!

اسے اپنے ہی زلف و گیسو کے دامِ ازل سے
رہائی تو ملتی،

مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دیوِ تاتار کا مجرۂ تار
جس کی طرف تو اُسے کر رہا تھا اشارے،
جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں
جہاں چار سُو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راہگیروں
کی بے انتہا استخوانیں پڑی ہیں؟
ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر فغاں!

○

حفیظ ہوشیارپوری

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی

دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی

وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجومِ بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی

نظر کہ تشنۂ دیدار تھی رہی محروم
نظر اٹھائی تو دل میں اتر گیا کوئی

نگاہِ شوق کی محرومیوں سے ناواقف
نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی

اب اُن کے حسن میں حسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے نکھر گیا کوئی

کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اٹھا سوئے در گیا کوئی

نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی

اٹھا پھر آج مرے دل میں رشک کا طوفاں
پھر اُن کی راہ سے با چشمِ تر گیا کوئی

یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظ دوست مجھے
وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

○

احسان دانش

بزم میں جب وہ وفا نا آشنا بھی آئے گا
کیوں نہ آئے عشق کے لب پر گلا بھی آئے گا

دار و زنداں کے پرستارو یونہی ہنستے رہو
آئے گا دورِ مکافاتِ جفا بھی آئے گا

تہ نشیں ہو موجِ طوفاں کا دامن چھوڑ کر
خود بخود کشتی ڈبو کر ناخدا بھی آئے گا

روحِ گلشن خاک کے ذروں میں لے گی کروٹیں
اک امامِ وقت اس انداز کا بھی آئے گا

پہلے اپنے دست و بازو پر تو کر لے اعتماد
پھر مرا ذمہ تعاون کو خدا بھی آئے گا

آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے ہوئے
کیا مرے دل میں خیالِ ماسوا بھی آئے گا

گھر میں بیٹھے گمرہی کا شکوہ بے جا نہ کر
رہروؤں کو جمع کر لے رہنما بھی آئے گا

ہو گئے جرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیر
ان کے لب پر نعرۂ زنداں کشا بھی آئے گا

عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی
جس پر اک وقت احساسِ وفا بھی آئے گا

ہر قدم اب قافلے کو ہے یقینِ گمرہی
جانے کوئی میرِ منزل آشنا بھی آئے گا

جو دعا نکلے گی دل سے کیوں نہ ہو گی مستجاب
جب کوئی بندہ پکارے گا خدا بھی آئے گا

زندگی میں یہ جنازوں کی پرستش تا بہ کے
ایک دورِ احسانؔ حسبِ مدعا بھی آئے گا

تقابل

معین احسن جذبی

کیا یہی انقلاب ہے قلب اِدھر جگر اُدھر
نالۂ بے قرار اِدھر، شورشِ چشمِ تر اُدھر

اُف ری سیاستِ چمن، رنگ کو بُو سے سوءِ ظن
کور ہے نرگسِ وطن، نور اِدھر نظر اُدھر

ایک تبسمِ فرنگ، ہر دو افق لہو ترنگ
نعش بدوش و نالہ رنگ، شام اِدھر سحر اُدھر

اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو
آج اُسی عقاب کے بال اِدھر ہیں پر اُدھر

کام و دہن کی تلخیاں، کوئی مٹائے اب کہاں
وائے بہ حالِ تشنگاں، شیر اُدھر شکر اُدھر

قلتِ صلح کل یہاں، قلتِ صلح کل وہاں
کثرتِ فتنہ گر اِدھر، کثرتِ فتنہ گر اُدھر

اہلِ ہنر کے واسطے، خاک بسر کے واسطے
جور و جفا کا گھر اِدھر، قہر و بلا کا گھر اُدھر

برگ سے برگ پوچھئے، نخل و شجر سے پوچھئے
کون ہے بارور اِدھر، کون ہے باثمر اُدھر

ایک مریضِ نیم جاں، ایک مریضِ خستہ جاں
کون ہے چارہ جُو اِدھر، کون ہے چارہ گر اُدھر

اہلِ فراق کچھ بتاؤ، اہلِ مذاق کچھ بتاؤ
کون سی شے ہے خوب اِدھر، کون سی خوب تر اُدھر

ہجر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح دُور ہے
جذب ابھی ہے ناتمام، خام ابھی شعور ہے

قطعات

جاں نثار اختر

حسن کا عطر، جسم کا صندل
عارضوں کے گلاب، زلف کا عود
بعض اوقات سوچتا ہوں میں
ایک خوشبو ہے صرف، تیرا وجود

یادِ ماضی میں یوں خیال ترا
ڈال دیتا ہے دل میں اک ہل چل
دوڑتے ہیں کسی حسینہ کا،
جیسے آجائے پاؤں میں آنچل

میری راتوں کی تیرگی جب بھی
روح پر یاس بن کے چھاتی ہے
میری انجم، تری حسیں صورت
شمع کی لو میں مسکراتی ہے

○

اختر انصاری

خزاں میں آگ لگاؤ، بہار کے دن ہیں
نئے شگوفے کھلاؤ، بہار کے دن ہیں

بصد خلوص و عقیدت خزاں کی تربت پر
گلوں کی بھینٹ چڑھاؤ، بہار کے دن ہیں

اُلٹ دو تختۂ خزاں کی تباہ کاری کا
بساطِ عیش بچھاؤ، بہار کے دن ہیں

گرائے ہم نے جہاں اشکِ خوں وہاں اب تم
ہنسی کے پھول گراؤ، بہار کے دن ہیں

عذارِ گل کی دہک سے جلا کے کانٹوں کو
مُراد لیتے ہیں جس سے گلِ مراد وہ پھول
گلی دلوں کی بجھاؤ، بہار کے دن ہیں

ملا کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گل
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بہار کے دن ہیں

بھرے کٹورے چمن کے یہ درس دیتے ہیں
کوئی شراب بناؤ، بہار کے دن ہیں

چٹکتی کلیوں کے جادو بھرے ترنم کو
چھلکتے جام لنڈھاؤ، بہار کے دن ہیں

وہ عندلیب نے دل دوز راگنی چھیڑی
بہشتِ گوش بناؤ، بہار کے دن ہیں

اب احتیاط پسندی ہے سعیِ نامشکور
رباب تم بھی اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں

اچھال دو گل و لالہ کو ماہ و انجم تک
متاعِ ضبط لٹاؤ، بہار کے دن ہیں

چمن سے بلکہ جہاں سے بھی کر کے قطعِ نظر
نرالی دھومیں مچاؤ، بہار کے دن ہیں

شرارِ گل سے زمانے میں شعلے بھڑکا دو
فلک کو سر پہ اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں

زمیں زمیں نہ رہے اور فلک فلک نہ رہے
حسین فتنے جگاؤ، بہار کے دن ہیں

جنونِ شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف
اٹھے حشر اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں

نشاط و مستی و رعنائی و حلاوت کو
کوئی دلیل نہ لاؤ، بہار کے دن ہیں

خزاں رسیدہ امنگوں کے پھیکے رنگوں میں
دماغ و دل میں بساؤ، بہار کے دن ہیں

تصورات میں، افکار میں، عقائد میں
دھنک کے رنگ ملاؤ، بہار کے دن ہیں

فروغِ رنگ و ہجومِ ضیا کی بھٹی میں
چمن کی روح بساؤ، بہار کے دن ہیں

پرانی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے
دل و جگر کو تپاؤ، بہار کے دن ہیں

گراں گزرتی ہے دل پر نوائے فرسودہ
نئے چراغ جلاؤ، بہار کے دن ہیں

فضائے دشت کو ویرانے کو، بیاباں کو
اچھوتے زمزمے گاؤ، بہار کے دن ہیں

لچک رہی ہے وفورِ ثمر سے شاخِ حیات
چمن فروش بناؤ، بہار کے دن ہیں

جنابِ اختر جاں دادہ رُخِ گل کو
یہ بارِ منت کے اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں

اہم وقت بناؤ، بہار کے دن ہیں

○

پنڈت آنند نرائن مُلّا

سنبھال ساقیِ محفل اب اپنے پیمانے
کہ آ گئے صفِ رنداں میں آج دیوانے

ہر انقلاب کی سُرخی انھیں کے افسانے
حیاتِ دہر کا حاصل ہیں چند دیوانے

فصیلِ باغ سے یہ آندھیاں رکیں گی کہیں
چمن کی سمت بڑھے آ رہے ہیں ویرانے

خدائے ہر دو جہاں خوب ہے تری تقسیم
زمیں پہ دیر و حرم اور فلک پہ میخانے

ابھی تمام نہیں داستانِ محفلِ شب
چراغِ کشتہ کے باقی ہیں چند پروانے

خیالِ یار! شبِ غم کی محفلوں کی قسم
ترے بغیر کبھی پر سہوئے نہ پیمانے

گزر گئی جو ستاروں کے دل پہ آخرِ شب
شعاعِ خندہ زنِ آفتاب کیا جانے

الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کارواں کو مرے کیا ہوا خدا جانے

یہ جبرِ زیست محبت پہ کب تلک آخر
کہ دل سلام کریں اور نظر نہ پہچانے

یہ حسن و عشق کی محفل بھی ہے عجب محفل
یہاں شراب کسی کی کسی کے پیمانے

ہماری جا بھی کہیں ہے خدائے دیر و حرم
حرم میں غیر ہیں اور بتکدے میں بیگانے

نہ پوچھ دورِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ
ترس گئے لبِ افسانہ گو کو افسانے

کہوں تو کس سے کہوں میں حدیثِ دلِ مُلّا
بیاورید گرایں جا بود سخن دانے

○

فضل احمد کریم فضلی

کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے
کچھ تیری توجہ کی نظر کم بھی بہت ہے

اشکوں سے بھی کھلتا ہے وہ دل جو ہے گرفتہ
کلیوں کے لیے قطرۂ شبنم بھی بہت ہے

ہم خود بھی نہیں چاہتے صیاد سے بچنا
سازشِ نگہ و دل کی منظم بھی بہت ہے

ہے رشتۂ دزدیدہ نگاہی بھی عجب شے
قائم یہ ہوا پر بھی ہے محکم بھی بہت ہے

ہاں نیم نگاہی سے یوں ہی کام لیے جا
یہ تیری عنایت کی نظر کم بھی بہت ہے

اب ظرف کی یہ بات ہے جو بھی جسے مل جائے
دنیا میں خوشی بھی ہے بہت غم بھی بہت ہے

ڈھائے دلِ نازک پہ بہت اس نے ستم بھی
پھر لطف یہ ہے مجھ پہ وہ برہم بھی بہت ہے

یہ طرفہ تماشہ ہے، کیا قتل بھی مجھ کو
اور پھر مرے مرنے کا انھیں غم بھی بہت ہے

کچھ بانگِ دہل کے بھی یہاں کان ہیں عادی
کچھ لے مرے اشعار کی مدھم بھی بہت ہے

پڑتے ہیں ستمگر کے وزا وار بھی اوچھے
اور فضلیؔ بسمل میں ذرا دم بھی بہت ہے

○

میکش اکبرآبادی

وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے
اُن سے بھی یاں نبھ نہ سکی جو عاقل تھے فرزانے تھے

آپ یہ طے کرتے رہیے کچھ تھا کہ نہ تھا کچھ ہے کہ نہیں
کٹ ہی گئی اپنی تو ان میں خواب تھے یا افسانے تھے

سناٹا سا محفل میں ہنگامہ سا برپا دل میں
کیا کہتے کیا چپ رہتے کچھ جانے کچھ انجانے تھے

حسن کی فطرت ہرجائی اور دل کو ذوقِ رسوائی
مسجد میں تھے مے خانے اور کعبے میں بُت خانے تھے

موجِ صبا سے اُس نے چھیڑا بوئے گُل سے یاد کیا
ہم بدقسمت پھر بھی نہ سمجھے کہنے کو فرزانے تھے

اگلی پچھلی باتوں کا کیا ذکر ہے اب جانے دیجے
آپ کے در پر آ ہی پڑے ہم تھے جب تک بیگانے تھے

مغروروں کو دیکھ کے ہم نے یہ سیکھا ہے اے میکش
جس سے ملے اس طرح ملے جیسے جانے پہچانے تھے

○

عندلیب شادانی

کوئی اداشناسِ محبت ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے، وہ کیوں ہم کو یاد آئے

کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دل نشیں نگاہ میں، اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

کچھ ہم سے بے خودی میں ہوئیں بے حجابیاں
چٹکی زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے

آزردگی نہیں کہ یہ فطرت ہے حسن کی
بس دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہمیں منائے

ناداں سہی، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کھتے فریب کھائے

وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اُس کی یاد غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے

کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے

مایوسیوں میں دل کا وہ عالم دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے

تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

○

عرشی رامپوری

ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا
نہیں جب ہوش میں ہم جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا

جنوں کے ساتھ تھوڑی سی فضائے لامکاں بھی دے
مری وحشت کو اس دُنیا کے ویرانے کیا ہوگا

ہے مرجانا کلیدِ فتح، سمجھایا تھا رندوں نے
مگر ناصح یہ کہتا ہے کہ مرجانے سے کیا ہوگا

زہے قسمت اگر حضرت خود اپنا جائزہ بھی لیں
ہماری زندگی پر تیر برسانے سے کیا ہوگا

اگر ہمدرد بنتے ہو تو زنجیریں ذرا کھولو
مری پابستگی پر یونہی غم کھانے سے کیا ہوگا

درِ پیرِ مغاں چھوڑیں یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
کوئی واعظ سے کہہ دو تیرے بہکانے سے کیا ہوگا

جسے دیکھو وہ ہے سرمستِ صہبائے خرد یکسر
خداوندا! یہاں اک تیرے دیوانے سے کیا ہوگا

نہیں قلب و جگر میں خون کا قطرہ کوئی باقی
عزیزو! اب ہمارے ہوش میں آنے سے کیا ہوگا

دکھوں کو کم نہیں سکتے اگر اہلِ خرد عرشی
تو خالی سینۂ افلاک برمانے سے کیا ہوگا

○

اشک رامپوری

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگذر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

بگڑی کا ساتھ خوب دیا ہمدموں نے آہ
دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں

بیٹھے رہو گے دید کا وعدہ لیے ہوئے
بیمارِ غم نے آنکھ نہ کھولی اگر کہیں

من رازداں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
گوش و زباں بھی رکھتے ہیں دیوار و در کہیں

اہلِ وطن کے دل میں نہیں گھر تو کیا ہوا
عمرِ رواں گذرتی ہے دنیا میں ہر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھیے !
میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں

اُس نکتہ چیں کو عشق جتانے چلے تو اشک
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

پس منظر

اختر الایمان

کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر
یونہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں چپکا بیٹھا
کہیں کسی کا ماس نہ ہڈی، کہیں کسی کا روپ نہ چھایا
کچھ کتبوں پر دھندلے دھندلے نام کھدے ہیں۔ میں جیون بھر
ان کتبوں، ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بنا کر
مستقبل اور حال کو چھوڑے دکھ سکھ سب میں لیے پھرا ہوں
ماضی کی گھنگھور گھٹا میں چپکا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر؟

بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں — ہوک سی بن کر ایک اک مورت
درد سا بن کر ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں۔ دور کہیں سے
آوازیں سی کچھ آتی ہیں، "گذرے تھے اک بار یہیں سے"
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے، ہر جانی پہچانی صورت
گویا جھوٹ ہیں یہ آوازیں کوئی میل نہ تھا ان سب سے
جن کا پیار کسی کے دل میں اپنے گھاؤ چھوڑ گیا ہے
جن کا پیار کسی کے دل سے سارے رشتے توڑ گیا ہے
اور وہ پاگل ان رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے!

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے دکھ کے۔ جس کو
اپنی روح سمجھ کر اب تک لیے لیے پھرتا تھا ہر سو
لیکن آج اڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوندھی خوشبو
جس میں آنسو بوئے تھے میں نے، بیٹھا سوچ رہا ہوں جو ہو
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کروں اور آنکھ بچا لوں
اس منظر کی تاریکی سے، جو رہ جائے وہ اپنا لوں

○

عدم

زباں پر آپ کا نام آرہا تھا
غمِ ہستی کو آرام آرہا تھا

خیانت کر کے موسیٰ کو ملا کیا
ہماری سمت پیغام آرہا تھا

خدا کا شکر تیری زلف بکھری
بڑی گرمی کا ہنگام آرہا تھا

ستارے سو گئے انگڑائی لے کر
کہ افسانے کا انجام آرہا تھا

تڑپ کر میں نے توبہ توڑ ڈالی
تری رحمت پہ الزام آرہا تھا

عدم دل کھو کے آسودہ نہیں ہم
برا تھا یا بھلا! کام آرہا تھا!

افسانہ آں شبے....

جگن ناتھ آزاد

اک رات کی بات کہہ رہا ہوں آزاد
شعلوں کی ندی میں بہہ رہا ہوں آزاد
جس کو کبھی ضبطِ نطق میں لا نہ سکوں
دل پر وہ عذاب سہہ رہا ہوں آزاد

پہلا رُخ

وہ رات کہ جب خلدِ بریں تھا پہلو
وہ رات تصور میں بسی ہے ایسے

چہرے پہ وہ سیلابِ تبسم ہے ہے
کانوں میں مرے گونج رہا ہے اب تک

انسان کے حالات ہیں کس کے بس میں
اک رات ملی تھی اتفاقاً ورنہ

گردوں پہ گھٹا تلی تھی گھنگھور اے دوست!
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں کہیں

کل شب کہ فضا تھی مست بے جام و سبو
اڑ اڑ کے حریمِ روح تک جاتی تھی

وہ کاکلِ دل نواز مہکی مہکی
ہنگامِ سحر بھی دل میں ہے رقص کناں

جب موج ہوا تھی موجِ مے وقت اسبو
جس طرح شراب میں نشہ پھول میں بو

سینے میں وہ اک جوشِ تلاطم ہے ہے
وہ رات کا خاموش ترنم ہے ہے

اڑتے ہوئے لمحات میں کس کے بس میں
دنیا ترے دن رات میں کس کے بس میں

رہوار ہواؤں کے تھے منہ زور اے دوست!
ہم تم تھے پسینے میں شرابور اے دوست!

تھا ہوش کی قید میں نہ میں اور نہ تو
وہ تیرے بدن کی بھینی بھینی خوشبو

ہر بات کلی کی طرح لہکی لہکی
اے دوست! تری نظر وہ بہکی بہکی

دوسرا رُخ

ہاں محوِ سفر زمیں ہے جاگو جاگو!
آنکھوں کو ملو، نظر اٹھاؤ، کہ یہ رات
پھر وقتِ سحر قریں ہے جاگو جاگو!
سونے کے لیے نہیں ہے جاگو جاگو!

امکان ملاقات کے پھر کم ہوں گے
جب صبحِ اُفق پہ جلوہ فرما ہوگی
سمٹے ہوئے لمحات یہ برہم ہوں گے
کیا علم، کہاں تم اور کہاں ہم ہوں گے

اس سے پہلے کہ صبح پھوٹے اے دوست!
اُڑتے ہوئے لمحات کو یوں اپنا لیں
بجلی کی طرح وہ ہم پہ ٹوٹے اے دوست!
اک لمحہ بھی ہاتھوں سے نہ چھوٹے اے دوست!

بزمِ طرب و نشاط برہم نہ کرو
اے صبح کی زرنگار کرنو! رُک جاؤ
یہ محفلِ انبساط برہم نہ کرو
خود جم کے مری بساط برہم نہ کرو

ساعت ہے فراق کی پھر آنے والی
لمحے یہ گراں بہا ہیں اے دوست کہ پھر
ہے کوئی گھڑی میں رات جانے والی
ہے صبحِ اُفق پہ جگمگانے والی،

اب رات کے خاتمے کا ہے وقت قلیل
جی بھر کے انھیں دیکھ، کہ بجھ جائے گی
ہونے کو ہے یہ سماں سحر میں تبدیل
اس بزمِ طرب کی خود بخود ہر قندیل

ذوقِ نظر اک مقام پر رہ نہ سکے
اور نطق اگر بیان کرنا چاہے
جلووں کا یہ طوفان کہ دل سہہ نہ سکے
اس وقت کی کیفیت کبھی کہہ نہ سکے

یہ خنکیٔ ماہتاب میں دل کی جلن
یہ نیند کے وقت گفتگو سانسوں میں
سینے کی یہ خامشیٔ شب میں دھڑکن
میلے سے یہ اک مکاں میں خوشبوئے بدن

فردوس کا باب ہے یہ رات اے ساقی
اس رات کو لمحات کا پیکر نہ سمجھ
اُڑتا ہوا خواب ہے یہ رات اے ساقی!
پی لے کہ شراب ہے یہ رات اے ساقی

فریاد کہ رات ہاتھ میں آ کے گئی
ماحول کی تیرگی میں فسانہ،
اک لطفِ عظیم ہم پہ فرما کے گئی
فریاد کہ رات نور برسا کے گئی

اے مہر! کبھی ترا اشارا نہ ملے
اے نور! کبھی ترا سہارا نہ ملے
میں رات کے طوفاں میں بھٹکتا ہی رہوں
اے صبح! کبھی ترا کنارا نہ ملے

تیسرا رُخ

آخر سحر آ کے دل کو تڑپا ہی گئی
یہ تیرگی آ کے نور پر چھا ہی گئی
ضو ریز جو دل میں تھیں امنگیں آزاد
کالا کفن اُن کو آ کے پہنا ہی گئی

رات اپنا جمال کھو رہی ہے سو جاؤ
چہرہ شبنم سے دھو رہی ہے سو جاؤ
ٹوٹے ہوئے جسم پر ذرا رحم کرو
اب صبح طلوع ہو رہی ہے سو جاؤ

جو نیند میں ہو نیند میں رہ جاتا ہے
بیدار سے رازِ زیست کہہ جاتا ہے
اک نور کا دریا کہ سحر سے پہلے
ظلمات کی وادیوں میں بہ جاتا ہے

اک رات اگر کرم پہ مائل ہو جائے
انسان کے ہر نفس میں شامل ہو جائے
یہ رات — یہ شام سے سحر تک کا سماں
پھیلے جو تو زندگی کا حاصل ہو جائے

پھولوں کی طرح نفس لہک جاتے ہیں
شاخوں کی طرح بدن لچک جاتے ہیں
مل جاتے ہیں بھٹکے ہوئے دو دل جو کہیں
وہ رات کی ظلمت میں چمک جاتے ہیں

○

قتیل شفائی

خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے
ہم اپنے ساتھ ہی اپنا مقام لے کے چلے

سکوتِ شام کا مطلب کوئی سمجھ نہ سکا
بس اک ہمیں تری محفل میں جام لے کے چلے

بٹھا دیئے ہیں کسی نے بہار پر پہرے
صبا چلے بھی تو اذنِ خرام لے کے چلے

خدا کے نام سے واقف ہر ایک راہ نہ تھی
کبھی کبھی تو ہم اپنا بھی نام لے کے چلے

فریب کھا ہی گئے اہلِ جستجو آخر
چراغ ڈھونڈنے آئے تھے شام لے کے چلے

بنامِ ساقیٔ صہبا نظر ملے ہیں سراب
اب ایک دور ہمارا بھی نام لے کے چلے

قتیلؔ جن سے پریشاں ہیں طائرانِ حرم
وہ پھر سے دانۂ ہمرنگِ دام لے کے چلے

○

ظہیر کاشمیری

جب کبھی تذکرۂ شعلۂ رخساں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زن قافلۂ گشتہ سراں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے

دلِ مرحومِ تمنا پہ دمکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زرّیں مکراں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیرؔ
حسن پرسایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

مجید امجد

تنگ پگڈنڈی ——— سر کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ ——— اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند،
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں، آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے، ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں،
آہ ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی،
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

○

عبدالمجید حیرت

کسی کے دم سے راحت بھی ہوئی ہے
مگر برپا قیامت بھی ہوئی ہے

کوئی پوچھے، کسی کا دل دکھا کر
کسی کو کچھ ندامت بھی ہوئی ہے

روا ان کی عنایت کی بدولت
کسی کی کوئی حاجت بھی ہوئی ہے

لیا ہے عقل سے ہم نے بہت کام
یہی ہم سے حماقت بھی ہوئی ہے

اگر تکلیف پہنچی ہے، تو کیا غم
بہت ہم پر عنایت بھی ہوئی ہے

کسی کے سامنے مجبور ہو کر
بیاں غم کی حکایت بھی ہوئی ہے

علاجوں سے مریضِ خستہ جاں کی
بہت کچھ سلبِ طاقت بھی ہوئی ہے

جگر پر جب کوئی صدمہ پڑا ہے
دگرگوں دل کی حالت بھی ہوئی ہے

مشقت کا کبھی پھل بھی ملا ہے
کبھی محنت اکارت بھی ہوئی ہے

اٹھایا ہے جنھوں نے بارِ کلفت
میسر ان کو راحت بھی ہوئی ہے

کسی کا جور جب حد سے بڑھا ہے
تو اے حیرت شکایت بھی ہوئی ہے

○

شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

ہر اک جذبہ ہر اک ذوقِ طلب ناکام ہو جائے
محبت ہی محبت کا اگر انجام ہو جائے

وہی نالہ وہی نغمہ بس اک تفریقِ لفظی ہے
قفس کو عشرتِ کردو نشیمن نام ہو جائے

تصدق عصمتِ کونین اُس مجذوبِ الفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے

یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

جو میرا دل ہو شعری حریف اُن کی نگاہوں کا
تو دنیا بھر میں برپا انقلاب عام ہو جائے

دولت کی خدائی

پروفیسر شور

انگڑائیوں کی مستیاں دوشیزہ رخساروں کی آگ
میری مٹھی میں ہے حسنِ مصر و روما کا سہاگ
عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں،
رقص فرما ہیں مرے سازوں پہ مریم زادیاں
عصمتیں اکثر پگھل جاتی ہیں میری آگ میں
ایسی زنجیریں بھی گل جاتی ہیں میری آگ میں
میر و سلطان و وزیر و کجکلاہ و تاجدار
میرے فتراکوں کے آہو میرے تیروں کے شکار
فرِ جاگیر و وراثت قصر و ایواں کا وقار
میری ٹھوکر کے خزف، میری شرابوں کا خمار
چترِ جم اورنگِ پرویزی، قبائے بختِ یار
میری صبحوں کے دھندلکے میرے رستوں کے غبار
نخوتیں میری وراثت، عشرتیں میری برات
ساغر و مینا کی صبحیں، عارض و گیسو کی رات
زمزمے میرے اُجالے، قہقہے میرے چراغ
خونِ آدم زاد سے دہکے ہوئے میرے ایاغ
سیم و زر میرے نبی، لعل و گہر میرے رسول
میرا اعجازِ خلافت کھیتیوں کا عرضِ طول

مرہم حج و زیارت، زخم دینار و درم
میرے ناسوروں کے چھلنی سینۂ مصر و عجم
میرے ناخن سے کلیساؤں کے سینوں پر خراش
معبد و ہیکل کی نورانی جبینوں پر خراش
راہب و صوفی مرے گم کردہ منزل راہ گیر
میری محرابوں میں دل میرے ہی طاقوں میں ضمیر!
جبہ و دستار کو میری غلامی کا شرف
سبحہ و زنار میرے ہی خدنگوں کے ہدف
ہر عزاخانے میں بے گور و کفن میرے شہید
ہر حسینؑ آباد میں میرے تراشیدہ یزید
میرے بوجہلوں کی زد پر ہر پیمبر کا وقار
کھیلتے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار
جرم و جہل و کذب و عصیاں میرے ہی نشے میں چور
میرے کس بل پر رذالت کو شرافت کا غرور
مجھ سے نسلیں سرگراں، مجھ سے نجابت کا حشم
مجھ سے چہرے معتبر، مجھ سے ضمیروں کے بھرم
مفلسی سب سے بڑا میری شریعت میں گناہ
زہر میرا ہر تبسم، طنز میری ہر نگاہ!!
خود فروشی میری فطرت، پردہ پوشی میرا کام
مجھ سے چھپ جاتا ہے نسل و آدمیت کا جذام
میری راتیں میرے دن میرے شبستاں میرے خواب
چھین لوں میں جس سے چاہوں ماہتاب و آفتاب
طاعت و تقدیس و عرفاں آؤ میری قسمت آؤ
اپنے سر، اپنی جبینیں میرے قدموں پر جھکاؤ!
کونسی دوکان پر دیر و حرم بکتے نہیں
یا خدا بکتا نہیں ہے یا صنم بکتے نہیں
اطلس و دیبا میں بھی عریاں ہیں جن کے بدن
اُن غلاموں کے بھی ہاتھوں پر ہے سونے کی شکن

○

سیف الدین سیف

کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے
اک آہ میں راہ کٹ گئی ہے

پھر سامنے ہے پہاڑ سی رات
پھر شام سے نیند اُچٹ گئی ہے

پہلو میں یہ کیسا درد اُٹھا ہے
یہ کونسی راہ کٹ گئی ہے

آپ آئے نہیں تو موت کمبخت
آ آ کے پلٹ پلٹ گئی ہے

اُٹھ اُٹھ کے مریضِ غم نے پوچھا
کیا ہجر کی رات کٹ گئی ہے

پھر سیف ہوائے یادِ رفتہ
ہر غم کی نقاب الٹ گئی ہے

○

غلام ربانی تاباں

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
وہ بوئے گل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

دیا جو ساتھ تو پھر کس بلا کا ساتھ دیا
شکستِ غم نے ہر اک مدعا کا ساتھ دیا

فروغِ بادہ نے رنگِ حیا کا ساتھ دیا
غرض اُسی بتِ کافر ادا کا ساتھ دیا

خیالِ یار ترا شکریہ رہِ غم میں
بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا

نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے
کہ ہر نظارۂ صبر آزما کا ساتھ دیا

میں کس طرح سے کروں کم نگاہیوں کا گلہ
تری جفاؤں نے ذوقِ وفا کا ساتھ دیا

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے
کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں توبہ
جفا کے بعد بھی اہلِ وفا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجد یہ میکدہ تاباں
یہاں تلک تو کسی پارسا کا ساتھ دیا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

ابن انشا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں

ہیں لاکھوں روگ زمانے میں، کیوں عشق ہے رسوا بیچارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی، انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں پیکل پیکل رہتا ہے، ہو بیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں

یہ بات عجیب سناتے ہو، وہ دنیا سے بے آس ہوئے
اک نام سنا اور عشق کیا، اک ذکر پہ آپ اداس ہوئے
وہ عقل میں افلاطون سے، وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
وہ تیس برس کو پہنچے ہیں، وہ بی اے ایم اے پاس ہوئے

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں

گر عشق کیا ہے تب کیا ہے کیوں شاد نہیں آباد نہیں
یہ بات تو تم بھی مانو گے وہ قیس نہیں فرہاد نہیں
جو جان لئے بن ٹل نہ سکے یہ ایسی بھی افتاد نہیں
کیا ہجر کا وار دعا ہے؟ کیا وصل کے لسخے یاد نہیں
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں پہچان گئے پہچان گئے
ہاں ساتھ ہمارے انشا بھی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی انجان رہے انجان گئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں کیا انشا کو سمجھانا ہے؟
اس لڑکی سے بھی کہہ دیں گے، گو اب کچھ اور زمانا ہے
یا چھوڑے یا تکمیل کرے یہ عشق ہے یا افسانا ہے؟
یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے
یہ باتیں کیسی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودائی ہیں

○

ادا جعفری بدایونی

کرن نگاہ کی بہلا گئی تو کیا ہوگا
خلوصِ شوق پہ آنچ آگئی تو کیا ہوگا

فریبِ ہوش، فریبِ حیات سے بچ کر
فریبِ اہلِ وفا کھا گئی تو کیا ہوگا

یہی نگاہ کہ آوارہ ہے خلاؤں میں
جب آفتاب سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا

گلوں کے رنگ میں خونِ جگر کا رنگ سہی
بھری بہار بھی کترا گئی تو کیا ہوگا

اندھیری رات سے پوچھو، وہ بے قدم ہی سہی
حیاتِ نو کی سحر آگئی تو کیا ہوگا

یہی حیات کہ ہے واقفِ رموزِ حیات
جنوں کا راز کبھی پا گئی تو کیا ہوگا

گماں بھی کر نہ سکے تھے سحر کے متوالے
سحر فریبِ ضیا کھا گئی تو کیا ہوگا

تری نگاہ سے روشن ہیں داغِ دل کے کنول
تری نگاہ بھی ترسا گئی تو کیا ہوگا

شعورِ غم بھی غنیمت ہے زندگی میں ادا
غموں کی دھوپ بھی کجلا گئی تو کیا ہوگا

○

شاد عارفی

کھری باتیں بہ اندازِ سخن کہدوں تو کیا ہوگا
عدو سے جان و تن کو جانِ من کہدوں تو کیا ہوگا

نگہبانِ وطن کو راہ زن کہدوں تو کیا ہوگا
کسی بھی بد چلن کو بد چلن کہدوں تو کیا ہوگا

غریبی جن کے لئے لے گئی تا حدِ عریانی
جو ہیں اُن عصمتوں کو سیم تن کہدوں تو کیا ہوگا

اندھیرے کو اندھیرا ہی کہیں گے دیکھنے والے
سوادِ شام کو صبحِ وطن کہہ دوں تو کیا ہوگا

جو مستقبل کے رُخ پر روشنی ڈالوں تو کیا دوگے
چمن کی تاک میں برقِ چمن کہدوں تو کیا ہوگا

غلط باتوں پہ دنیا کب توجہ صرف کرتی ہے
بُتوں کو بے زبان و بے دہن کہدوں تو کیا ہوگا

کہیں فطرت بدل سکتی ہے ناموں کے بدلنے سے
جنابِ شیخ کو میں برہمن کہدوں تو کیا ہوگا

غرورِ سیم و زر ہے مبتلائے نازِ خود بینی
وہ خود بینی جسے دیوانہ پن کہدوں تو کیا ہوگا

قد و گیسو کو تم شمشاد و سنبل کہہ کے کیا لوگے
قد و گیسو کو میں دار و رسن کہدوں تو کیا ہوگا

ستارے توڑتی ہے جبکہ ذرّوں کی توانائی
ستاروں کو تمہاری انجمن کہدوں تو کیا ہوگا

بتوں نے بے سبب اے شاد جب اُلجھا دیا مجھکو
جو ان کی شان میں کوئی بھجن کہدوں تو کیا ہوگا

میراث

یوسف ظفر

ذی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
(رومی)

ابنِ آدم! — ابنِ آدم!! — یہ تری میراث ہے
ایک جبڑا — یہ درانتی کے سے دانت
ایک دل — آتش فشاں
آنکھیں — بلائے ناگہاں
عافیت دشمن — چراغِ خانہ سوز
ابنِ آدم! — تیرے ہاتھوں میں زمامِ اختیار
اور پنجے اپنے مرکب کے لہو سے تر بتر

(۱)

شفق اپنی بانکی سہیلی سے ملنے چلی
چمکتی جبیں پر ستاروں کی دھول
لبوں پر تبسم کے نوخیز پھول
دوپٹے پہ زرکار نغموں کا جال
نظر میں کوئی شاعرانہ خیال
گھلے رنگ آپس میں نیلے سے پیلا، حنائی سے لال
کہیں سبز سے لاجوردی ملا، پھول کھلنے لگے
ہواؤں کے باغات ہلنے لگے
دھڑکنے لگے ابر پاروں کے دل
شفق شام سے جا ملی

شام سے
اپنی بانکی سہیلی، دلہن سی سہیلی سے یوں جا ملی
جیسے اُس کے لئے ان پہاڑوں میں چھپ کر گزارا تھا دن
جا ملی — ساتھ لے کر خدا جانے کن وادیوں میں مسرت کی تانیں
اُڑانے لگی
کیا سنانے لگی! — رات چپ چاپ چھانے لگی

(۲)

دریچے شبِ زندگی کے کھلے، ماہ و انجم نے دیکھا، تبسم کیا
گزرگاہِ ہستی پہ منزل کے مارے چلے پا بجولاں
پہاڑوں کی ہیبت، فضاؤں کی وسعت سے ترسندہ انساں
مخالف ہواؤں کے تیروں سے لرزاں —
زمینوں کے سینوں میں نفرت کا لاوا
زمینوں کے ناسور میں مار پیچاں
کہیں بچھوؤں کے شبستاں
یہ کوہ و بیاباں کہ جن میں درندوں کے پُرہول مسکن ہیں آلودۂ خونِ انساں
یہاں قوتِ نامیہ سے پنپتے ہیں خارِ مغیلاں
وہ پودے کہ پتوں پہ ہے جن کے مرگِ خزاں
کہ پھولوں پہ ہے جن کے مرگِ خزاں

ہواؤں کی پاکیزگی میں حقونت کے سموم اجزا پریشان و یکجاں
ہواؤں کے دامن میں قاتل ہوائیں
زمینوں کے سینوں کے پروردہ قاتل زمینوں کے اُوپر
زمینوں کے سینوں میں خوں بن کے رہتے ہیں خونی عناصر
یہی وہ فضا ہے جہاں پرورش تو نے پائی
یہ گہوارہ ہے تیری انسانیت کا
یہیں سے ملا ہے تجھے جو ملا ہے یہی تیرا مولد یہی تیرا مسکن،
یہی تیرا مدفن
یہی تیری میراث ہے ابنِ آدم یہی تیری میراث ہے۔ ابنِ آدم!

(۳)

پہاڑوں کی ظلمت میں نوخیز کلیوں کا جوبن لٹا
درانتی چلی
سسکتی رہی سرد، کمسن ہوا
لرزتا رہا ہر ستارے کا معصوم نغمہ دیا
درانتی چلی —
جھنجھوڑا ہوا نے گرانڈیل پیڑوں کو — جاگو اٹھو
مرے صاحبو!
حسیں دلنشیں چاند تاروں کی کرنوں کا خوں ہو گیا
وہاں کنج میں دیکھ لو — صاحبو! — صاحبو!!"
مگر دیوار
گراتے رہے اپنے پتوں کی شمشیر سایوں کے خار
قدم دو قدم چل کے خود دیکھنے کی سکت کس میں تھی
درانتی چلی —
ستاروں کے سایوں میں نوخیز کلیوں کا جوبن لٹا
درانتی چلی — ابنِ آدم یہی تیری میراث ہے دیکھ لے
درانتی چلے

(۴)

اذانوں کی تانوں سے سینوں کے غم دھل گئے
مساجد کے در کھل گئے
جھکے اپنے معبود کے سامنے زندگی کے امیں
بہرِ دنیا و دیں
لبوں پر دعائیں — "الٰہی گناہوں کو تو بخش دے
لوث نگاہوں کو تو بخش دے
عطا کر رہِ راست جو تو نے دی
عبادت گزاروں کو — توفیق دے
کہ بن جائیں ہم نیک بندے ترے
ہمیں کام کرنے کی توفیق دے
الٰہی میں عاجز گنہگار ہوں
مگر میں ترا ہی نمک خوار ہوں"

یہ الفاظ خالی — نہیں جن میں سوز
یہ الفاظ رٹتے ہوئے روز روز
زباں ایک عادت سے مجبور ہے — یہ عبادت نہیں
دعائیں لبوں پر — مگر دل میں طوفانِ امید و بیم
نگاہوں میں تصویرِ بالِ یتیم
خیالوں میں بیوہ کا رنگیں شباب
تصور میں رشوت کی دولت کے خواب
زباں پر دعا — اور خواہش یہی
کہ حاصل ہو ابلیس کی زرگری
لُغ عجز پر پارسائی کا نور
مگر دل تنور
لپکتے ہوئے جس سے شعلوں کے سانپ
مگر ابنِ آدم! — نہیں منہ نہ ڈھانپ

یہی تیری میراث ہے دیکھ لے
درانتی چلے

(۵)

سحر آگئی
دہکتے ہوئے کندنی رنگ پر
حنائی عروسانہ ہاتھوں میں گجروں کی سیمیں کھنک
نگاہوں میں خوابوں کے گیتوں کا رس
اداؤں میں دل کی لرزتی امنگ
مسلسل معطر حسیں ریشمیں گیسوؤں میں گلابی گلابی سے پھول
سحر آگئی ——
پرندوں کے نغموں نے آواز دی
چہکنے لگی زندگی ——

پرندے —— یہ نغموں کے پرزے اڑے
اڑے اور صباحت کو بھی لے اڑے
دھوپ ہے —— دھوپ ہی دھوپ ہے —— دیکھ لے
درانتی چلے ——

(۶)

یہ چرواہا، گلہ لئے گائے بھینسوں کا انسانیت سے بہت دور ہے
پھر بھی سرور ہے
ڈیکھی سے محدود ہے اس کی دنیا یہی سبزہ زار اور یہی گاؤ میش
یہی اس کے خویش
نہ اس کو مقامِ بشر کی خبر ہے نہ دردِ بشر
اسے کیا خبر یہ بھی اک جزوِ اعظم ہے نقشِ کل کا
ورق ہے یہ شیرازہ حسنِ کل کا
اسے کیا خبر کیا ہے یہ کائنات جمال و جلال
وہ تصویرِ ماضی —— یہ تنظیمِ حال ——

اسے کیا خبر کیا ہے تقدیرِ معلول و رازِ علل
اسے آج ہے آج اور کل ہے کل
یہ راہی ہے، منزل وہی ہے فنا —— اس کا ہونا ہے کیا!
چارۂ گاؤ میش

مگر —— اس کی بنسی کی آوارہ تان
ہوا میں سندیسے لٹاتی ہے خوابِ سکوں کے
فضا میں پری بن کے صوتِ طرب کی بہے جا رہی ہے
یہ بنسی کی آواز —— جیسے سنہری روپہلی حسیں تتلیوں کی قطار
جو نادیدہ انجانی دنیا کی جانب چلی جا رہی ہے
یہی ناشخص ترنم ہے اس کی دلیلِ حیات
یہی ہے یہی اس کی کل کائنات
نہیں تو یہ چرواہا خود اپنی بھینسوں سے بہتر نہیں ہے
وہی بے شعوری، وہی کم نگاہی
نہ جادہ نہ منزل نہ احساسِ جادہ، نہ احساسِ منزل
جئے جا رہا ہے ——
درندہ ہے درپردہ آدمیت، مگر اس کو اس کی خبر کچھ نہیں
یہ نادان حیوان معصوم و مظلوم بے ذوقِ ہستی ہے مجبورِ ہستی
—— مرے شیرِ دل سادہ صورت گڈریے مجھے کچھ خبر ہے
تری بنسری کی لرزتی ہوئی تان کیوں کاٹتی ہے فضاؤں کے دل کو
ہواؤں کے دل کو!
بتاؤں تجھے! —— پر تجھے کیا بتاؤں —— بجے بنسری وقت کٹتا ہے
یہی تیری میراث ہے ابنِ آدم —— یہی تیری میراث ہے، دیکھ لے
بجے بنسری یا درانتی چلے ——

(۷)

سکوں نام فطرت بڑی بھولی بھالی، بڑی سادہ سادہ
ہزار اس کے عشوے ہیں غمزے ہزار

جمال اس کا پھولوں سے تانوکِ خار
رگ و پے میں ہے اس کے برقِ تپاں
کہ جیسے ہو ریگِ رواں پر غزالِ دواں
مگر اس کے چہرے پہ رقصِ تبسم، سرودِ سکوں
یہ معصومیت، ایک پیغمبرانہ محبت کی دعوت
مسرت کا، انسانیت کا، سکوں آفرینی کا پیکِ نبوت۔

یہ بچے، یہ معصومیت کے شگوفے، یہ منظوم خواب
گلستانِ فطرت کی رنگین و نایاب و تازہ شراب
یہ آواز ان کی، ستاروں کی جھلمل سے ملتی ہوئی
یہ عارض مجسم بہارِ چمن
یہ باتیں — یہ نغموں کے پھولوں کے ہار
یہ آنکھیں۔ یہ گیتوں کی خاموش جھیلیں شفق در کنار۔
اسی حسنِ معصوم کے سازِ میں ڈھیں لے رہے ہیں حیات کے راگ
اسی سینۂ پاک میں جاگنے کو ہے دوزخ کی آگ
اسی دستِ نازک کی شاخِ بہاریں سے پھوٹیں گے خار
محبت کے اس تختۂ گل سے لپٹے ہوئے ہیں تباہی کے خونخوار ناگ
یہی تجھ کو سینہ بسینہ ملا ہے یہی تیری میراث ہے۔
ابنِ آدم!

(۸)

شب تار میں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں کہاں جا رہے ہیں جسے جانے والے
تجسس کی آنکھوں میں شب کا سرمہ ہے لیکن یقینِ بصارت نہیں ہے
تجسس کے ہاتھوں میں ہے فلسفے کا عصا، لیکن اس کا سہارا یقینی نہیں ہے
تجسس شب تیرہ و تار میں وقت کی ٹھوکریں کھا کے بھی نارسا ہے
ہوس بھونکتی ہے۔ مگر اس کا چہرہ ہے انساں کا چہرہ
ہوس کاٹتی ہے۔ مگر اس کا جبڑا ہے انساں کا جبڑا
بدستور شیروں کی دھاڑ اور فیلوں کی چنگھاڑ انساں کی آواز سے پھیکی ہے
شب تار میں پالیا۔ پالیا کی صداؤں سے ارض و سما کانپتے ہیں
مگر کیا ملا ہے — فقط رازِ یک ذرۂ کائنات
کہ جس سے فنا کا طلسم دوامی ہوا پختہ تر —
شب تار میں آدمی کو ابھی تک وہی قطب تارہ نظر آ رہا ہے
کہ جس سے جدا باختر سے ہے خاور
کہ جس سے سفید اور سیہ کی ہے صورت نمایاں
کہاں ہے وہ تہذیب و مذہب کہ جس کی حقیقت پہ ہیں
علم و ادراک نازاں
کہاں ہے — کہاں ہے — وہ انساں! — وہ انساں!!

○

انجم رومانی

دن ہو کہ رات، کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ
آلامِ روزگار سے حاصل نہیں فراغ

رغبت کسے کہ لیجیے عیش و طرب کا نام
فرصت کہاں کہ کیجیے صہبا سے پُر ایاغ

ویرانۂ حیات میں آسودہ خاطری
کس کو ملا اس آہوئے رم خوردہ کا سراغ

آثارِ کوئے دوست ہیں اور پاشکستگی
خوشبوئے زلفِ یار ہے اور ہم سے بے دماغ

کس کی جبیں پہ ہیں یہ ستارے عرق عرق
کس کے لہو سے چاند کا دامن ہے داغ داغ

کرتے ہیں کسبِ نور اسی تیرگی سے ہم
انجم ہیں دل کے داغ گہرہائے شب چراغ

یہ پھول

قیوم نظر

ہر طرف بکھرے ہوئے تارے، یہ پھول
تیرگی کے بل پہ رقصاں جگمگاتے قہقہے
حسن کی رعنائیوں میں غم خوشی کے چہچہے
ماہ سے بڑھ کر یہ مہ پارے، یہ پھول

ان میں لہراتی ہوئی خوشبو کی شیرینی بھی ہے
آرزو کی سادگی گلشن کی رنگینی بھی ہے
دور افق تک پھیلے نظارے، یہ پھول

اس بلندی پر مگر اتنے قریب آئے ہوئے
آسماں کی رفعتوں کو خاک پر لائے ہوئے
جھلملاتی رات کے پیارے، یہ پھول

ان کی جلتی محفلوں میں اک عجب بے چارگی
خود فریب آشفتگی بے اختیار آوارگی
سرگراں، مسلے، تھکے ہارے، یہ پھول

جانے کیا کیا روپ دھارے مسکراتی شام نے
سیم و زر کی دلکشی نے نکہتِ ایام نے
دم بخود ہیں درد کے مارے، یہ پھول

ان کی دنیا میں دل آویزی کی دولت اب کہاں
منظرِ عالم پہ پھر ہنسنے کی جرأت اب کہاں
اب کہاں یہ بجھتے انگارے، یہ پھول

زندگی کی راہ سے کٹ کر غم فردا لیے
دن کے ویرانے میں کھو جانے کو یکسر نغمے دیے
دور افق تک پھیلے نظارے، یہ پھول

○

ناصر کاظمی

وا ہوا پھر درِ میخانۂ گل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن
پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر کسی گل کا اشارہ پا کر
چاند نکلا سرِ میخانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

افسانے

دور کا نشانہ

چودھری محمد علی ردولوی

لالہ بنسی دھر تھے تو ذات کے بنیے، اور دہلی کشور حسن جو بنیوں میں اونچی ذات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اپنے انداز شرافت سے جیوں بقال، ٹوڈرمل، بھارگو رسب کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ گھر کے اندر چھپ کر جو چوپاٹ کر لیتے ہیں مگر باہر آزاد خیال، آزادہ رو مشہور تھے۔ آج کل کی آزادہ روی نہیں کہ باتیں کرنے میں بدتمیزی تمغۂ خود داری سمجھا جائے۔ اور کھلم کھلا ہر چیز کھانا پینا نئی روشنی کی پہچان ٹھہرے۔ جنسی خیال سے سخت پرست بھی واقف ہوئے تھے۔ اس لئے لکھنؤ کے چوک اور شہر کے بھی حصے سے جہاں قدیم گھر کے نام لیوا نواب رہتے ہیں زیادہ واقف تھے۔ لکھپتی مشہور تھے، مگر بیں مہاجنی، عدالت دیوانی سے خریدی ہوئی زمینداری سب ہی کچھ تھا مگر صحبت کے لئے یقیناً ایسے تھے کہ باوجود مصروفیت کے ان جلسوں کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ چوک بھر کی خبر رکھتے تھے۔ جہاں کہیں جلسہ ہوتا یا پرائیویٹ مجرا ہوتا وہاں پہنچ ہی جاتے تھے اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ان جلسوں میں حاشیہ نشین ہو کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ مسند کا کونہ دبا کر بیٹھنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں کہیں ارباب نشاط کے انتخاب کا سوال پیش ہوتا تھا وہاں ان کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ اور ایسے اہم معاملات میں جو خوش قسمت ان کا مشورہ حاصل کر سکتا وہ مطمئن ہو جاتا تھا کہ صورت، دل، بن اور فن کے لحاظ سے اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ آدمی منکسر مزاج اور خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، مگر جہاں سے دل کے معاملات شروع ہوتے تھے وہاں سے ان کی خودداری ان کو اجازت نہیں دیتی تھی کہ کسی دوسرے کے معاملات سے واسطہ رکھیں۔ تجربے نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جتنا بڑا دوست ہو یا کتنا ہی دولتمند ملاقاتی ہو، اگر ان پرائیویٹ معاملات میں یہ کسی کی مدد کریں گے تو ذلیل ہو جائیں گے۔ میرے پڑھنے والے کہتے ہوں گے کہ لکھنے والا سٹھیا گیا ہے۔ نہ معلوم کہاں کی دقیانوسی بداخلاقیوں اور بدتہذیبیوں کو پیش کر رہا ہے اور یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ نوجوان لوگ بچھڑ کر بے راہ ہو جائیں گے۔ چوک اور چوک بازاروں کا ذکر قانوناً ممنوع ہو جانا چاہیئے۔ میں عرض کروں گا کہ کہیں ایسا کیجئے گا بھی نہیں، نہیں تو نہ معلوم کتنے ریستوران، کتنے ہوٹل، کتنے کافی ہاؤسیز، بلک کارنر پر قفل چڑھ جائیں گے اور نوجوانوں کو جو سبق فطرت پڑھا چکی ہے وہ تو بھولنے سے رہے لیکن زیب النسا کی طرح چلا اٹھیں گے کہ ــــ

پاکبازی من باعث گناہ من است

جس زمانے کی میں باتیں کر رہا ہوں اس وقت عید اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر باضابطہ محفلیں ہوتی تھیں جن میں

بچے، بوڑھے، جوان سب باضابطہ شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قدر پہچان کر برتاؤ کرتا تھا۔ کوئی خالی سم پر گرہ لگا دیتا تھا۔ کوئی "آں" بھی کہہ دیتا تھا۔ کوئی خالی واہ کرنا اپنا منصب سمجھتا تھا، کوئی موسیقی کے نکات بیان کر دیتا تھا اور بزرگ عقل خالی شگفتہ مزاجی چہرے سے ظاہر کرتا تھا اور ان ہی مواقع پر بعض نوجوانوں کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے زبانِ حال سے کہتا تھا

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لالہ بنسی دھر کے ایسے لوگ آرٹسٹ سے تہذیب کے ساتھ باتیں کر کے اس کا دل بھی بڑھاتے تھے۔

بچے صاحب، سارنگی پر الاپ شروع ہوا۔ یہ راگ کی تصویر کہیں کرتے جاتے ہیں کہ سری کرشن کی لیلا ہے۔ سری کرشن جی بچپن میں گیند کھیل رہے تھے۔ گیند سمندر میں جا گرا۔ ناگ دیوتا نے منہ میں لے لیا۔ سری کرشن جی نے اس کو پھانس لیا ہے۔ سمندر میں جا کر اس کے منہ سے گیند لا رہے ہیں۔ ناچنے والی نے بایاں ہاتھ کاندھے کی سیدھ پر پورا لٹا دیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کاندھے کی سیدھ پر رہا۔ مگر کہیں سے خم ہو کر نیچے کے سامنے آ گیا۔ بائیں ہاتھ کے پنجے نے سانپ کا پھن ثابت کیا ہے۔ داہنے ہاتھ کی انگلیوں نے ٹھمکیاں دے کر یہ ظاہر کیا کہ جب سانپ پھنس گیا تو سری کرشن جی نے یوں ٹھمکیاں بتائیں۔ ناچنے والی نے پیش و پیش چال سے بتا دیا ہے کہ سانپ کی گنڈلیوں پر چڑھ کر سری کرشن یوں گیند سمندر سے لائے تھے۔ ہاتھ کا پنجا ماتھے کے سامنے آ گیا۔ کلائی ماتھے سے چھو گئی۔ انگلیاں اوپر کو اٹھی رہیں۔ جیسے محفل کی طرف رہی۔ یہ کرشن جی کا تلک ہو گیا۔

اب جھاڑ پیچی کا ناچ شروع ہوا۔ تیزی سے گھوم گھوم کر چاروں ہاتھوں سے دنیا بتا رہے ہیں۔ لالہ بنسی دھر اس طرح ارتھ بتاتے ہیں کہ ہر توڑے، ہر پلٹے کے معنی آئینہ ہوتے جاتے تھے۔ اے بچے، پاربتی کے ناز و انداز شروع ہوتے۔ ہر پہلو سے اپنے کو بتاتی ہیں ؎

وہ کیا کرے کہ محبت کا مقتضی ہے یہی!
وگرنہ فائدہ اس کو مرے ستانے سے

تے کی نزاکتوں، پرن کی مشکل جگہوں کی داد الگ دیتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والوں کا لطف دوگنا ہوتا جاتا ہے۔ بچے صاحب، اس کے بعد بھاؤ شروع ہوئے، وہ حنائی ناخنوں، ہونٹوں کی سرخی اور آنکھوں کے لال ڈوروں کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ جو رکھے خونِ دل کا پتہ دیتے ہیں کہ خوشی کی خبریں بھی یوں رنج میں لہو کے آنسو رلاتی ہیں ؎

"اپنی بپتا میں کاسے کہوں
تیرے کارن جو دکھ پاوا"

کے معنی اب آئینہ ہو گئے۔ اس نے انگوٹھے کی آرسی دیکھی، زرد دوپٹے کا آنچل ہاتھ پر لیا۔ کہ رنگ ایسا ہو گیا ہے۔ کلائی سے نیچے کو ادھر ادھر الٹے پلٹے دے کر رات کو دیں بدلتے کٹی ہے۔ پچھتاوے کے انداز سے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھڈی جمائی۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی کہنی کے نیچے رکھ کر خیالی زانو قائم کیا۔ انھوں نے انترے کے معنی ہویدا کر دیئے کہ "کدر پیا تری کتا دھطا نا ایا" مرا کیا موسے آگے آ" یوں ثابت کرتے ہیں خیال کر اور چوکھا بنانے کے لئے مرتی کا شعر بھی پڑھ دیا۔

ذرا اٹھاؤ تو نظر اداس کیوں ہو اس قدر!
یہ خشک لب، یہ چشم تر، یہ کیا نصیب بتاں!

یہ حصہ تو لالہ جسی دھر کا ہوا۔ اسی طرح بڑے چھوٹے صدر نشین، حاشیہ نشین، صف نعال والے سب مل کر کلچر کا معیار مضبوط کرتے ہیں، یہ نہیں کہ ہر موقع دعوت پردہ دری دے اور بے پروگی خلوت و جلوت کا فرق مٹا دے یہ تو باضابطہ جلسوں کا حال ہوا۔ اب لالہ جسی دھر کی پرائیویٹ تفریحوں کا حال سنیئے، دن کو بڑا چوکور زمرد ہاتھ میں پہنے رہتے تھے۔ شام کو جب سیر کے لئے نکلتے تھے تو انہیں میں کیرٹ کا ہیرا انگلی میں اضافہ ہوتا تھا۔ گلے میں سونے کی دو موٹی موٹی لڑیں ہوتی تھیں۔ عطر کے معاملہ میں ذری نکسانی گلاب کا قیمتی عطر ملتے تھے جس کی خوشبو سے نازک مزاجوں کو چھینکیں آنے لگتی تھیں۔ اتنی غیر داری ضرور تھی کہ جس کا عطر صرف گریبوں ہی میں لگتے تھے۔ مگر اس کے آگے نفاست کا لحاظ کم رہ جاتا تھا۔ مثلاً کیوڑے کا عطر جو صرف آبدار خانے اور بھنڈی خانے میں کام آتا ہے سر کے تیل میں ڈال لیتے تھے۔ زنانہ مردانہ عطروں میں فرق نہیں کرتے تھے۔ پھولوں کے ہلکے عطر جیسے چنبیلی جاڑوں میں بھی لگا لیتے تھے۔ جاڑوں کے عطریات مصالحہ والے جیسے حنا خاتمۃ البغر گرمیوں میں استعمال کر جاتے تھے۔ مجموعوں کی نزاکتوں کا خیر کون ذکر جنھیں مختلف عطروں کا خیال ہو اور پھر بھی تمیز نہ ہو سکے کہ بھینی بھینی ہلکی ہلکی خوشبو جنت سے آئی یا اسی دنیا میں پیدا ہوئی۔ جب بے فصل کی لپٹیں آتی تھیں تو نفیس مزاج اسے اٹھتے تھے کہ "بڑے کچھوری سی آید" جہاں آدمی تھے اس سے دل کے معاملات میں بھی حدود کے باہر پاؤں نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن بے تکلفی میں کہنے لگے کہ سال میں ہم سب سے پہلے تو وہ پونجی نکال لیتے ہیں جو کاروبار میں لگائی تھی۔ اس کے بعد خانہ داری کے اخراجات الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد منافع میں سے جس قدر مناسب ہوا پونجی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سب کے بعد کچھ روپیہ اپنے دل کی خوشی کے لئے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ یہ روپیہ ہم بے دھڑک صرف کرتے ہیں اگر کوئی گومتی کے کنارے بیٹھ کر ہمارے ساتھ روپیہ پانی میں پھینکے اور یہ کھیل ہم کو پسند آجائے تو ہم اس میں بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب دل کی خوشی والا مال ختم ہو جائے گا تو ہم آٹھ کھڑے ہوتے پھر دل اور دل کے افکار کو خدا حافظ۔

ایک دو اور ہیں دل ایک سے لاکھ ہجاروں (ہزاروں) کھڑے" لالہ آدمی وسیع الاخلاق ہے اس لئے گو منظور نظر ایک ہی رہتی تھی۔ مگر غیر صلاحیت کی پوچھ آتے ہیں۔ شام سے لے کر دس بجے تک۔ "رات ہی بھر گورے ہے لیکن گلوں میں ہم اچھے" کا آواز بلند کیا کرتے تھے۔ کسی سے تکلف اور تہذیب کی ملاقات ہوتی تھی۔ کسی سے خلوص اور بے تکلفی تھی۔ بعض سے مذاق اور گالیوں کی چوٹیں چلتی تھیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ محفل ایسی بھی ہوتی تھی جہاں غالب مرحوم یاد آجاتے تھے ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھتے تھے غالب پیش دستی ایک دن

لالہ جسی دھر تھوڑے سے فلاسفر بھی تھے۔ جب دوستان ناصح ان کے پاؤں کے سیفر آنا نے پر معترض ہو کر کہتے تھے کہ "ایک دو گھر و عکم گیر" خود کو پانی سے پتلا ہوا سے ہلکا نہ کریں اور ہر جگہ کی حاضر باشی سے باز آئیں تو یہ جواب دیتے تھے کہ جسمی تقاضے الگ چیز ہیں اور صنف نازک سے ہم کلامی اور ہم نشینی کی خواہش دوسری چیز ہے۔ لیکن جن ممالک میں پردہ ہوتا ہے وہاں آدمی طے نہیں کر سکتا کہ کس قدر تقاضا آدمی میں پہلی بات کا ہے اور کس قدر دوسری بات کا۔ اور انسان غلطی سے دوسرے تقاضے کو بھی

پہلا تقاضہ ہی سمجھا کرتا ہے۔ اگر ملک میں پردہ نہ ہو تو دوسرا تقاضہ پورا ہوا کرے اور پہلا اپنے حدود سے باہر نہ جائے۔ بات پتے کی کہتے تھے مگر نصیحت کرنے والوں کی عقل ان باریکیوں تک کہاں پہنچتی ہے ؎

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں ناصح صاحب تو کچھ دوانے ہیں!

ناظرین لالہ جنسی دھر کی آوارہ گردی سے ان کی آبرو ریزی ہوئی۔ اور ہمارے ناصح کی طرح "گرگئی تو کوئی ہرج نہیں" مطلب دونوں حالتوں میں نکل آیا۔

ایک دوست کے یہاں کوئی چھوٹی سی تقریب تھی۔ ناظرات لالہ جنسی دھر کے متعلق نہ ہوتی تو کس کے ہوتی۔ سب سے بہتر گانے والی سب سے زیادہ شوخ طرار انتخاب کی گئی۔ جلسہ اور دعوت صرف ایک دن کی تھی۔ رات کا مجرا عام تھا۔ تقریب ختم ہوگئی بھیڑ کا مجرا خاص تھا جس میں پانچ احباب تھے۔ اس سے بھی فرصت ہوئی۔ سازندے سلام کرکے باہر چلے گئے۔ نشے میں تھرتھل ہونے لگا۔ بڑی ستھری صحبت، بڑے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سازندہ پریشان کمرے میں گھس آیا اور کہنے لگا کہ ایک کانسٹیبل نے ہم کو خدا واسطے کر ایک تھپڑ مارا ہے۔ عورت کی موجودگی کی وجہ سے جتنے تھے سب کے دل میں صرف ہمدردی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا جوش پیدا ہوا مگر بڑھے لکھوں کا جلسہ تھا۔ پہلا جوش طرفۃ العین میں ختم ہوگیا۔ قانونی پہلو سب کے دل میں آیا کہ بغیر ہم لوگوں کا نام آئے کیا چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ سب نے صاحب تقریب کا منہ دیکھا۔ رنڈی نے لالہ جنسی دھر کی طرف نظر کی۔ زبان حال سے کہنے لگی "ہمارا آدمی ذلیل کیا گیا ہے۔ اس کی تلافی کیا کی جائے گی۔ ہم صاحب تقریب کو کیا جانیں، ہم تو تمہارے بلانے سے یہاں آئے تھے۔ ہر چیز کے ذمہ دار تم ہو۔ اٹھو اور کانسٹیبل کو پھانسی پر چڑھا دو۔" لالہ جنسی دھر نے سر نیچا کیا۔ ایک ذرا سے غور کے بعد نہایت سنجیدگی سے بہت نرم اور معاملہ فہمی کے لہجے میں سازندے سے مخاطب ہوئے:۔

لالہ جنسی دھر: "جاؤ اس کانسٹیبل کے نام کا پتہ لگا آؤ۔"

رنڈی: "آپ ہیں اچھے نامے آؤ کے پیچھے۔ ہمارا آدمی مارا گیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تم بجائے اٹھ کر وہاں جانے کے نام کا پتہ لگاتے ہو۔ گردن کو نیم حقارت نیم طنز کا جھٹکا دے کر "پتا۔ آ۔ آ۔ لگا آؤ۔"

لالہ جنسی دھر: "بی بی غصہ نہ کرو۔ ہماری بات سنو۔ غصے سے کام بگڑتے ہیں۔ سنورتے نہیں۔ ہمارے ایک برادر ہیں، انھوں نے فلاں دیہاتی رئیس کو قرضہ دیا۔ ان کا نام تم نے بھی سنا ہوگا۔ ان کی مونچھوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ بڑی دھاک بیٹھی تھی۔ پولیس ان کے دروازے جاتے ڈرتی تھی۔ نہ معلوم کتنے مقدمے فوجداری کے ان پر چلے، مگر روپے کا زور اور ان کا خوف ایسا تھا کہ ثبوت کے گواہ کبھی نہ ملے۔ پڑھے لکھوں میں نہ سہی مگر لوگوں سب پر ان کا رعب تھا۔ سینکڑوں بدمعاش ان کی نگاہ دیکھتے تھے۔ جو چاہا کر گزرے۔ جس کو چاہا پٹوا دیا۔ ہمارے برادر ان کے یہاں قرق لے کر گئے۔ انھوں نے قرق امین کی خبر لفنگے سے لی اور ہمارے برادر کو صرف پٹوایا ہی نہیں بلکہ بری طرح ذلیل کیا مگر ہمارے برادر نے غصہ غضب بالکل نہیں کیا اور زیادہ تابعدار ہو گئے اور بے دھڑک قرضہ اس طرح دینا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ آج اس کے گھر کی نیو کا ٹکا کھدوا لیا۔ رئیس صاحب آج کوڑی کے تین مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ کانسٹیبل ملکہ کا آدمی کون چیز ہے بس نام معلوم ہو جائے ہم کل ہی سے دوستی کرکے سالے کو قرضہ دینا شروع کر دیں گے۔ تم اطمینان رکھو۔"

اپنے دُکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب نکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا اور اندر سامنے شالو میں لپٹی ہوئی اندھیرے کی بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر نکلی بھابی، دریا باد والی بھابی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا۔

"کہاں، کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کی طرف بارش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے، نہ برسے تو نہیں مانتی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کا کلیجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ میں پڑا اسی وقت کا منظر تھا۔ پھر شامت اعمال پڑوسی بیٹے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ رہی تھی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا ——— ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جاتی ہے۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔ تبھی اس نے سوچا ——— اندھیری ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں ——— شالو میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا..... مدن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا جیسے دیکھنے کی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھر پڑا تھا

نظر آرہا تھا ٹھوڑی تک پہنچتے پہنچتے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف اگال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگھریالے بال ———

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے برہنہ سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دامن کا چہرہ پھر سے اوپر کر اٹھا دیا اور شرابی سی آواز میں کہا۔

"اندو!"

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس کیلئے بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور صرف اتنا سا کہا "جی!" اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی اب جو چلی سو چلی وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی۔ جتنی دیر زندہ رہی بے چاری، مدن نے کہا، باجی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھٹا باشی گھر میں چیر ٹیلیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ——— ۲۸ مارچ کی شام ——— اور دن چھپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا ادھر اور گھنگھی سے ذرا ادھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو بھی اپنے بن سے اور سرا اور بھگانے بن سے گھسیٹ کر اپنا بنا دیا تھا..... مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا "میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی ——— میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بہنیں اور لوگ دیکھے ہیں اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں..... میں اب تمہاری ہوں ——— اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا "کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔"

"سچی بات؟" اندو بولی۔

مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا "ہاں ہاں ——— کہا جو سچی بات!"

لیکن اس سچی میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا ——— یہ اکاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے نازک ہاتھوں میں سمیٹے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے دکھ مجھے دے دو!"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اسے اپنے آپ سے ایک بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرہ

دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سر جھکا یہ ماں یا کسی سہیلی کا ٹھہرا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ تبھی ایک جلتا ہوا آنسو دن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا: "رو لیے ——— لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی ہیبت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ منجھلی بھابی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اونچی نیچی سے تیرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریا باد والی پھپھی جو اپنے "نو لکھے" ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی "واویلا کرتی ہوئی بیہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر جا جا گئے جن کو ان کے جے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے ملی تھی اور جو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابی کی بغل ہی میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کوئی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے تو کتنی دیر تک دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔ لیکن کالکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے مدن اور اس کے سامنے رک جاتے اور کسی بھلی بھانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے ہونے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں پیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آ لیا تھا اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ جیسور اور آسام کی طرف سے مٹکوایا ہوا بروز مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی اس پر مدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ تبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سیٹ کر کل کے لیے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے ہیں ——— بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا، کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سوگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام دہی ڈانٹ دیتا ——— "کھاؤ تم ——— وہ کہتا: "وہ بھی کھائیں گے۔" اور پھر رسوئی میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے: "رہنے دے بہو برتن صبح ہو جائیں گے۔"

اندو کہتی: "نہیں بابو جی ——— میں ابھی کیے دیتی ہوں چھپا کے سے۔"

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے: "مدن کی ماں ہوتی تو یہ سب تمھیں کرنے دیتی؟" ..... اور اندو ایکدم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلہن کی گود بھٹ سے بھری ہو۔ منجھلی بھابی اور دریا باد والی پھپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے اندو اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا رہتا، پاس آتا نہ دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق تھا

ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہاں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے: "ارے جا! ——— بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے؟"
..... اور دلاری تو بھیا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے "میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی" کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا
ایک رات اسی بات پر دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر سے دوپٹہ
اڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابو جی!" اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔
..... ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ لگاتے
ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر میں سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے تکیے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بارہ اچھوٹے
ایک طرف کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی رہتی اسے گدگدا بھی رہی تھیں اور مزا بھی
دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر پڑے پڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا
"ہائے ری مُنی اتیری ساس مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پر ———!"
مُنی نے مُنی کی طرح کہا: "گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی۔"
"ہاں مُنو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔
مدن کو کسی بات پر غصہ تھا، وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا، بولا: "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔"
"کیوں اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔
"ہاں ——— نہ آگے بانس نہ بجے بانسری ..... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔"
اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا: "تم جاؤ بھی، سو رہو جا کے ..... بڑے آئے ہو ..... آدمی جیسا ہے تو ڈرتا ہے نا!
مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمہارا کیا کام؟"
مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو رحمی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے فتر
میں چٹھیاں سارٹ ہوتی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ اختیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے
ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔
دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو
گئی جب منی کو سلانے کے لیے اندو کی لوری سنائی دی: "تو آنند یا رانی، بر دانی مستانی۔"
وہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی۔ سفید
چادر کے سر پر لینے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی
دلہن، اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی روتی
چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولہے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے۔ پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد
کرتی ہے: "لوگو! میں لٹ گئی۔" اب اسے دوپٹے کی پروا نہیں، قمیص کی پروا نہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چڑیاں، جذبات
اور خیالات کے طوفان تک اڑ چکے ہیں ———

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے حالانکہ روتی میں اندو ہنس رہی تھی پل بھر میں اپنے سہاگ کے اُجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا..... اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی روتی روتی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ بھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی جیسے کھلکھلاہٹ کوئی گناہ ہے۔ نہ ہنسی وہ چپ اور روتی روتی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے جیسی باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا..... وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹ آیا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی ——— اندو اور پھر چپ ہو گیا۔ اس اندھیرے میں وہ بورانی مسافی نندیا اس سے لپٹ گئی ——— ایک انگڑائی لی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات اندھی بڑھی سیٹھ کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اٹھا پھر روتی کی طرف دیکھتے ہوئے کروٹ بدلتے ہوئے جمائیاں لے کر لیٹ گیا ——— سو گیا ———

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں سیدھی کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں بھی جسم کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو تو جیسے نیند آ ہی جاتی اور ایک بار اٹھے تو محبت دم توڑتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندو کی آگ سے چھلک رہا تھا اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سو ——— تم آگئیں!"

"ہاں!"

"تمہیں ——— سو گئی؟"

اندو جھجکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "ہائے رام!" اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "کیا کہہ رہے ہو۔ مرے کیوں بے چاری ماں باپ کی ایک ہی بیٹی!"

"ہاں ——— !" مدن نے کہا "بھائی کی ایک ہی نند!" اور پھر ایک دم تھکا ہوا لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا "زیادہ نہ مت لگاؤ اس چڑیل کو!"

"کیوں اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے!" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا "وہ بچا ہی نہیں چھوڑتی تھا رہا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے دھیان ہی نہیں ہوتی!"

"تو ——— !" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "ہنسوں اور کھیلوں کروں تو دھکا نہیں چاہیے۔ بے چاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل نہیں تو پرسوں ایک دن چلی ہی جائے گی!" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں باپ بھائی بہن اچھا تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو چہکتے ہی نیاری ہو گئی اور پھر دن رات اس کے بھلے جانے کی باتیں ہونے لگیں جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بلا ہے جس میں کوئی آگ رہتی ہے اور جب تک وہ پھر کر پھنکارتی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے پکیلنے والے، انتخاب کرنے والے، دانت پھر ٹٹنے والے، اندو کی طرف سے

بڑے بڑے دھنوتری اور مرقی ساگر ——— آخر ایک دن اُس جہنم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوشے کنارے میں بیٹھی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی پیچھے گھر میں، ایک مجرہ بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی.....

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا ——— "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے؟"

"ہاں!" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے..... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمھارا مطلب ہے میں ———"

"دکھاوا ہے یہ سب ——— ہاں!"

"اچھا جی!" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب دکھاوا ہے میرا!" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو ——— ہوا کیا ہے تمھیں؟" ..... شوہر اندو جب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آ گیا۔ "جاؤ جاؤ ——— سو جاؤ جا کے۔" مدن نے کہا۔ "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمھیں کچھ نہیں لینا مجھے تو لینا ہے۔" اندو بولی۔ "زندگی بھر لینا ہے۔" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے روکتا تھا اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہو۔ ہچکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ———

"پھر مجھے، لچا لچا کٹنی کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو ——— تمھاری تو ———" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو ——— اور اس نے مدن سے کچھ منگایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرا دیا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے میں اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی۔ "تم مرد لوگ کیا جانو؟ ——— جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی اور کیا بہن ———" اور پھر اکا اکی کہیں دور دیکھتی ہوئی بولی۔ "میں تو لاڈلی بنی کا بیاہ کروں گی۔"

"صد ہو گئی۔" مدن نے کہا۔ "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں۔"

"تمھیں ایک ہاتھ کی پڑتی ہے نا؟" اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو ———" مدن نے سچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی۔ "اب کھولو بھی..... ابھی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" تبھی مدن نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں بنی بیٹھی ہے اور وہ کھو سا گیا ———

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ رنگ الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے" اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی: "تم کیوں پریشان ہوتے ہو..... یاد نہیں اپنا وچن!" ——— "تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو"

"ہیں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ چمٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی.....

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا، خواب کے تاروں سے بنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قصوں کی زرتاری سے چمکا ہوا، جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے روشناس صدیوں سے اس دروپدی کا چیرہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں ہیروئن کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا نہ ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گر پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی، عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور ——— مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوتے جسے شکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ان کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلتا ہوا، ایک تشنگی کیفیت میں ہی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا ——— اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور..... کبھی جب اندو کی آنکھ کھل جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے ———

"ارے بھئی! گھر میں چھوٹے بڑے بھی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟"

مدن کہتا: "چھوٹے سمجھتے نہیں ——— بڑے انجان بن جاتے ہیں"

اسی دوران میں بابو رمنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کمرے رہ سکتے تھے لیکن بابو رمنی رام اس میں اکیلے ہی ٹھاٹھ سے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے سخت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہاں اسکولوں میں پڑھتے تھے، سال کے خاتمے سے پہلے انھیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بار بار گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن پاشی اور رواداری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا ——— رمنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے بچوں ہی کی طرح، جہاں کہیں سے آتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں بیٹھتے پھرتے، اپنے مدن سے دور، اسانی ہوتی رہتی۔ اندو تو اپنے پہاڑ کے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ

رسوئی میں یوں لپکتی تھی جیسے کوئی ڈوبتی میں گرے" باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دام کرنے کے بعد وہ بھی اندر ٹرکوں پر لیٹ جاتی کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے جو آنگن میں کھڑا سیکڑوں ہزاروں پرندوں کو ٹھکانے دیتا تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں نئی نویلی ہوئی ٹرکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں ——— جھولہ کی نے ڈارو رے امریاں ——— اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چادل جاتیں تو پھول پھلیاں ہو جاتیں۔ ماجیہ کی بڑی بھی جھولتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جھولے وہ منہ پھیلتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے، اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس کی شلوار کو جو سو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندوق کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انہیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں۔ کبھی ابھی شلوار کو سیٹ کر مڑتے ہی تو پیچھے کوئی میں نگاہ بہو کے عموم پر جا پڑتی تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور دو دن شتابی کرنے سے عجلت جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی ——— اوم نمو بھگوتے واسودیوا ———

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پیارے اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے "ہم تو دھنیہ ہو گئے" ای چندر کی ماں، شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں رنگ کے عارضے تھے، دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا جیرشیوں کے بل، نگاہ قریب آتی تو انہیں موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے نظر آتے جو جانگھیہ، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے صحت مند ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آ رہے ہیں۔ پہلو پر پڑی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولہے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ ہمارے بچے جنتی جا رہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ سبھی ایک سے ——— جوان ——— اوم نمو بھگوتے ———

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے لئے جب رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دم سلام دین کو جبرنے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا "بی بی ہمیں بیٹا آ۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو۔ اللہ تم کو اجر دے گا۔" اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا۔ وہ بھی صابر ٹر، جو نہ ہو سکا اس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باتی میں پھینٹ گلاس میں ڈال بہو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی "نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"پیا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ ہی پیجئے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی یہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں ——— ہوں ———" اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنہیں منانے والا کوئی نہ ہو لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ——— اور لے یہ پڑا ہے ——— تیری مرضی ہے پی ——— نہیں مرضی تو نہ پی ——— کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر رمنی رام دلاری منی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کی بابوجی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور سیٹ منہ رکھ کر پھکڑا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابوجی اور منی کھیل رہے تھے ہنس رہے تھے تو منی نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دودھ تو کھر اب ہو جائے گا بوجی ——— بھائی تو پیتی ہی نہیں۔"

"پیئے گی سنر در پیئے گی بیٹیا ——— بابوجی نے دوسرے ہاتھ سے پاتھی کو پھٹکارتے ہوئے کہا: "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔"

ابھی یہ فقرہ بابوجی کے منہ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہش ——— ہے ہے کھا کی" آواز آنے لگی۔ پتہ چلتا ہو تی کہ بھاگی ہے اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دی اور سب جان لیتے ہیں ——— بھائی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن بابوجی کے پاس آتا اور کہتا۔

"بوجی ——— بھائی رو رہی ہے۔"

"ہائیں؟" بابوجی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ کھنچے ہوئے کندن سے کہتے: "جا ——— تو سو جا ——— وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ۔"

اور پھر سے لیٹے ہوئے بابو رمنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے ——— "چاندنی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل اوہو کی آواز سنائی دیتی جیسے گھنٹے ہوئے وہ کہتے: "عجیب سے دنیا ہی ہے انسان کتنا رویا ہے!" ——— اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے کہا: "میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے اگر وے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی منی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابوجی کے ایک دوست سے تفریح کی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ بنا تو ایک ٹیلی تار ——— جوابی ——— جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی: "اتنا منہ پھلائے بیٹھے ہو ——— میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا: "چھوڑ ——— دور ہو جا میری آنکھوں سے ——— کہیں ———"

"یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بلایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہٹاؤ اب۔"

"خبردار ——— یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم جو آتا چاہتیں تو کیا بابوجی روک لیتے؟"

اندو نے بے بسی سے کہا: "ہائے جی ——— تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی اور پھر تو تم نے بھی

بلوا کر بابو جی پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں ——— ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"

"اور میرا جی؟"

"تمہارا جی؟ ——— تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مداخت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "بابو جی تم سے بہت خوش تھے۔"

"ہاں!" اندو بولی۔ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم!"

"اپنی قسم نہیں ——— میری قسم کھاؤ۔"

"تمہاری قسم تو میں نہیں کھاتی ——— کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سر جھکتے ہوئے کہا۔ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس؟" اندو نے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "گندے کہیں کے ——— شرم نہیں آتی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"تو بابو جی کو شرم نہ آئی تجھے یوں دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے بابو جی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"

"تمہارا منہ گندا ہے۔" اندو نے نفرت سے کہا۔ "اسی لیے تمہارا کاروبار بھی گندے پر ہوتے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی ……. وہ تھا کڑا ——— جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے۔" اور پھر اندو بولی۔ "بابو جی کہاں ہوں گے۔ ان کا دل بھی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر مدن ہی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں بند کر کے رونا شروع کر دیتا ——— اوم نمو بھگوتے واسودیوا۔ اوم نمو ……. اب وہ نہیں چاہتا تھا باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ نہیں نہیں

ایسے میں جبکہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا: "ابھی ہم نے دو بابو جی کو شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکے ہیں۔"

تیسرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے دن کے مخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شرمانے میں ڈھل گئے تھے۔ لکھا تھا: "بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ تمہاری ماں کے دن جب جاری کی گئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی اتھرا تھی۔ ایسے ہی تار سے ہوتے کپڑے ادھر ادھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی جیبوں خفیفگی میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں، کچھ نہیں تو وہی بڑے پارٹی دوڑا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا خالی ہے ....." اور پھر ایک آدھ سطر اور دھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا: "دفتر سے لوٹنے کے یہاں کے بڑے بڑے اندھے گھروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہول سا اٹھتا ہے ....." اور پھر ——— "بہو کا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹکی پکڑ لی، سانس کھینچی، آنکھیں پھیلائیں، شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی: "میں مر گئی۔ بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا؟"

مدن نے چٹکی چھڑاتے ہوئے کہا: "بابو جی کیا بچے ہیں؟ ——— دنیا دیکھی ہے۔ جنہیں پیدا کیا ہے۔"

"ہاں مگر" اندو بولی۔ "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں!"

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور پھر جیسے بابو جی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ تبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ——— "تمہاری سسرال سے نیچے آئے گی۔"

"میری سسرال؟ ——— اوہ!" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا: "کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے۔" اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"چلا آیا ہے یا تم دے ہو؟"

"تم ——— یہ سب قصور تمہارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں؟"

"ایک دم نہیں۔"

"کیوں؟"

"چار دن تو مزے سے بیٹھے زندگی کے۔"

"کیا یہ زندگی کا مجا نہیں؟" اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ "مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ جگہ جگہ سے بن مانگے پانا؟ پھر ان سے جان کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سادھوؤں، مجاوروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم چھوڑ کر سیدھوں کے کنارے لگی ہو کر سر کنڈے کے کانٹے شاخوں میں سان جگاتی ——— "

"اچھا اچھا" مدن بولا۔ "تم نے بکواس ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تو ولی مر پڑتی تھی؟"

"ہوگا تو!" اندو نے سر نفی کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمہارا نہیں میرا ہوگا۔ تمہیں تو اس کی ضرورت نہیں پر اس کے دار اکو بہت سہارا ہے یہ میں جانتی ہوں۔"

اور پھر کچھ تحمل کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سمجھتی تھی ہیشٹ میں اس نے ہی جان کر ہارنے کے سلسلے میں ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹھی کے خاص انداز میں بولی: "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب نیچے ہوگا۔ پہلے تو نہیں ہوں گی ہی نہیں..... مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔"

مدن بھی جیسے خائف ہو گیا ——— یہ خوبصورت "چیز" جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے مر جائے گی؟ اس نے پیچھے کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا: "تجھے کچھ نہ ہوگا اندو..... میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کے لے آؤں گا تجھے ——— اب ساوتری کی نہیں ستیہ وان کی باری ہے ———"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے.....

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ کہا البتہ صدمہ زدہ سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی۔ سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہیشٹ کی طرح مدن کی آنکھیں مندھیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ——— اوم نمو بھگوتے.....

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ——— "بابو جی! چلے آؤ..... بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ———"

لیکن آخر کو کری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چٹھی کا بندوبست کر رہے تھے..... ان کے بارے میں مدن کا احساس جرم بڑھنے لگا: "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا ———؟"

وہ بے وجہ سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں نیچے والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی: "مبارک ہو بابو جی ——— لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا؟" مدن نے کہا اور پھر منگرانہ لہجے میں بولا: "بی بی کیسی ہے؟"

بیگم بولی: "خیر ہے ——— میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے..... زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا!"

"او....." مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی: "تمہارا اندر کیا کام؟" اور پھر اپنا ایک دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں ——— تسلی سے۔ شاید اس لیے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر یہی نیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے ابھی ہی دیواریں کانپ رہی تھیں..... زچگی کے لیے چکی جان تو نہ

آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا البتہ دریا بادوالی پھولچی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام، رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی پھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھولچی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ——— "اندو ٹھیک ہے نا پھولچی ———؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" پھولچی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، ہوا اور باہر لپک گئی ———

پھولچی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی کے بچے سو رہے تھے۔ پھولچی نے ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر ڈھال سی ہو کر نئی کے پاس لیٹ گئی ——— اندو کی ——— اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا..... پھولچی تو کئی دہائیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اٹھی ہے ———

پھر اندر کے کمرے سے ہرل کی بو باہر نکلی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ بھیگے ہوئے کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مرکھنی سی آواز آئی ——— "ہا ——— ئے" اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا۔ کمرے کو اندر آنے سے روکا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو ——— نند اور سبھو دھا ——— اور دوسری طرف نند لال..... اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ڈھیلے کے سے انداز میں بولی ——— "بالکل تم ہی پر گیا ہے۔"

"ہوگا۔" مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں ٹھیک ہے بھگوان کا کرم کی گئیں۔"

"ہاں!" اندو بولی۔ "میں تو کہتی تھی ———"

"سبھو شبھو بولو۔" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے..... میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔" اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"توبہ کرو۔" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے..... اور اندو نحیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ذات ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھر گھر کر اس بچے کی تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصل ماں کو بھول گیا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی ——— معلوم ہوتا تھا اس نے

مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیتے ہیں اور اب دیوی بن کر دیا اور کرونا کے پرسادبانٹ رہی ہے..... مدن نے اندو کے منہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا ——— اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ بھی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے..... جبھی یکایک اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے۔

"کیا ہوا؟" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اندو نے مسکرانے کی کوشش کر کے بولی "اسے بھوک لگی ہے" اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے؟ ——— بھوک؟ ———" مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"مر کھیتے نہیں؟" اندو نے بچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی "سب گیلا ہو گیا ہے"

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے دھڑ کی طرف دیکھا جہاں دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اسے مجھے دے دو"

مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم جاؤ..... باہر"

"کیوں؟..... باہر کیوں جاؤں؟" مدن نے پوچھا۔

"جاؤ ———" اندو نے کچھ جھجکتے کچھ شرماتے ہوئے کہا "تمہارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی"

"ارے؟" مدن حیرت سے بولا "میرے سامنے؟..... نہیں پلا سکے گی؟" اور بھیا بھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ——— اتنی خوبصورت اندو آج تک نہیں لگی تھی۔

بابو جی، ام جی پر سوار تھے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے بچا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نہیں آیا تھا جو چیں گھٹنے انھیں سولی پر لٹکا سکتا۔ اگر تانہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ام جی کے برابر پندرہ بیس گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انھیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی بھر گئی تھی۔ رات انھیں متلی سی محسوس ہونے لگی اور انھوں نے پکارا ——— "بھوانی راماتی تو دیا نوائد بہت خراب ہو رہا ہے۔" بھوانی بھی جاگ گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ یکایک ابکائی آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گھر میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا بھول پہچان لیا تھا ———

سنے کریدا ہوئے کل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے سر نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر دیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ دو گرہیں کھل گئی تھیں۔ کسی جگہ اس نے ایک دو روز

آواز میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ ہم ٹٹ گئے۔

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر پڑا تھا۔ اس کا ابھی مدن کو پوری طرح سے اندازہ نہ تھا۔ صبح ہوتے ہی اس کا دل ایک کرب میں آ گیا۔ وہ شاید نکل جاتا اگر وہ گھر کے باہر جو رو کے کنارے سیل پڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو ٹھکانے پہ نہ لاتا..... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن سرداری مٹی اور پانی میں چلا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹ چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے نیچے چھپا لیتی تو اندو ——

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو دنیا میرے لیے ختم ہو گئی۔ کیا میں بھی کبھی زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور لڑکھڑا کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسلخانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا ——— میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ ——— اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی جھنگ میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے جانے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ نس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتے دار محلے والے سن سے رہ گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی۔ عورتیں باہری سے شمشان کے کنوئیں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی رات کے گھر آنے پر پھر سے ہوا میں ڈھل گئی..... اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو عورت سے بھی بڑا ہے۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جھنگ رہ رہی اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس مدام کو اپنی بانہوں میں لے لیا..... اس رات اگر اندو اپنا آپ یوں مدن پر نثار نہ کر دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود یہ کیا کہ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوتی اندو کو نہ بلاتا تو شاید وہ اتنا جلدی نہ چل دیتے لیکن پھر وہ باپ کی محبت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا..... کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ——— پھر آ چل نکلا ———

ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو بیکے چلی گئی تھی۔ بچے کو طرح طرح کی ضد کرتا تھا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں مانی ——— بیکے سے اندو کا خط آیا ——— مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اسے کوئی مارتا تو نہیں؟ ..... مدن کو بڑی حیرت ہوئی ——— ایک جلال آن پڑھ عورت..... ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے! ——— پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا ——— کیا یہ بھی کوئی پڑھا ہوا خط ہے ———؟

سال گزر گئے۔ جیسے کبھی اتنے نہ آتے کہ ان سے کچھ حساب ہو سکے لیکن سال کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ وقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا..... کندن کا داخلہ دیا ہے کالج میں کا فیس بھرنا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو

ایک طرف سے آتی مسکراتی ہوئی اور کہتی "کیوں دکھی ہو رہے ہو؟" مدن امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "دکھی نہیں! کندن کا بل سارے کا داخلہ دینا ہے..... بس....." اندو پھر ہنستی اور کہتی "چلو میرے ساتھ" اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جیسے کسی کو "مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا "مروگی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا" اور اندو کہتی "ہاں لے جاؤں گی" پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے..... تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے؟"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ اپنا کام چلاؤ"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا" اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی۔ "میں چوری ہوں ——— تم نہیں جانتے؟ ——— کبھی شیرا ——— جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب گرباکو دے دیتا ہے"..... اسی طرح مدن کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی ٹرٹ کے زیور کے ——— قرض چڑھا اور پھر اتر بھی گیا۔

ایسے ہی کندن بھی بڑا ہو گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی "ہتھ لبھا" کرتی تھی اور ماں کی جگہ کشمی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں کچھ کہتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا" اور پھر ماں جی اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا "تم تو سو کے ہاتھ کی بھی کھا آتے ہو" اس کا نتیجہ بھی دیکھا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا" ——— اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شو تک پہنچا۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا ——— اور یوں ان "بات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی ——— اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی.....

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو سندر دیو تو کیا خود مدن سے بھی لڑ پڑتی ——— مدن راستبازی کی اس دیوی کو خفا ہو کر پریم چند کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچی ہی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جاتا۔ مدن اپنے شوہری دھرم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر بھی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کی شرن میں آتے تھے اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں اس کے اُلٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جب پی چاچا کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائداد اور ایک حصہ اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آ گئیں اور اندو کچھ محسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اندو کا نیا گھر دن ہی میں جھگڑا کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں بچی گوشت کے اس لوتھڑے پر فخر کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی اور بچی کو سامنے جھنگے میں پھینکتے ہوئے

کہ اشتی ۔ تو مجھے بھی جیسے رہنے گی ——— ماں ———؟"
اور بچی چیخ چلا کر رونے لگتی ۔

مدن اندو سے کھنچنے لگا ۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا ۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور اس نے بہت سارے پیمانوں سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا ۔ باپو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا ۔ پوری آزادی تھی ۔

گریا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی ۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا ۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں ۔ کبھی کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہر آکر اسے کاٹ دیتی ہے ۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی ۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کرٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا ۔ کبھی روشنی کی چوکور لہر ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی ہو گئی ۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے ہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ نیچے کوئی ہنسنے لگا ۔ رونے لگا ' اوپر بھیل نے اس کی آواز ڈبو دی ۔

مدن کو اس کے تصور کے خدوخال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا ' یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا ۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو شالی شہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا ' پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا ۔ اس کو اٹھا کر سبطے نے بیگم کے منہ پر دے مارا معلوم ہوتا تھا کسی غریب تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک ' اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں ۔ کمر دوہری کر کے گالی بکتی ہوئی بیگم نے صاحبے کی ٹوکری میں سے گورا اور بچی اٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے ۔

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں ۔ ایک تو اندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا ۔

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر ..... نہا دھو ' اچھے کپڑے پہن ' انگوٹھی کی ایک جوڑی جس میں خوشبودار قوام لگا ہو سر میں کر کر ..... لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی ۔ اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا ۔ گالوں پر روج لگا رکھی تھی ۔ لب اٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ مانجھے کی بندی سے رنگ لیے تھے ——— اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں الجھ کے رہ گئیں ۔

"کیا بات ہے آج ؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا ۔

"کچھ نہیں" اندو نے مدن سے نظریں بچاتے ہوئے کہا ۔ "آج فرصت ملی ہے ۔"

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر پرچھائیاں چلی آئی تھیں ۔ ناک پر ایک سیاہ سی کالی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں ..... آج اندو نے

ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عجوبوں میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ جوں کی تھی کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی ——— یہ نہیں ہو سکتا ——— مدن نے سر جھاڑا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا ——— جیسے گھوڑوں کے سیریا کسی نامی گھوڑی کی چال دیکھتے ہیں ——— وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی ..... یہاں جو خلا ملا تھے تھے شرابی کی آنکھوں کو نہ دیکھ سکے ..... اندو بھی خوبصورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد بچوں، رشیدہ، ستر، رابرٹ اور ان کی بیویوں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں ..... پھر دن کو رحم آنے لگا اور بیٹھ گیا۔

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔ ادھر گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا ..... اندو بھی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔ مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں، کھولیں تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر ——— نہیں نہیں، وہ اندو تھی۔ اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں جو اپنی آنکھوں کے سہارے سے مسکراتی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج عطر کی خوشبو نے بوکھلا دیا تھا۔ بجلی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اس لیے باہر کا پانی اور کسی کھڑکی میں سے رستا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا ..... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نشے میں اس کی آنکھیں مچنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

"اندو ——— مدن نے کہا ..... اور اس کی شادی کی رات والی پکار سے دو گنا اونچی تھی ——— اور اندو نے پہلے کی طرح کہا "جی ——— اور اس کی آواز دور سے آتی تھی ..... پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی .....

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا۔ اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا "تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں"

"جیوتشی!" اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل نے"

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گیا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی "اب کیا ہونے والا ہے؟" آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ ابھی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا؟ مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں مگر ——— یہ آنسو؟"

"خوشی کے ہیں" اندو نے جواب دیا "آج کی رات میری ہے" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ مدن سے جھٹ گئی۔ ایک تحفظ کے احساس سے مدن نے کہا "آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ———"

"لیکن تم نے کہا نہیں" اندو بولی "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں!" مدن بولا "اپنے دکھ مجھے دے دو"

"تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے"

"میں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا "میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا میرے بچوں سے پیار ——— ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں، پیارے پیارے بچے ——— یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" اندو بولی۔ "لیکن اب جا کر پتہ چلا ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رک کر کہا۔ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا سر پرے کرتی ہوئی بولی۔ "اپنی لاج ——— اپنی خوشی ..... اس وقت تم بھی کہہ دیتے ——— اپنے سکھ مجھے دے دو ——— تو میں ....." اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ ان پڑھ عورت؟ ..... کوئی شاہراہ فقر ——— نہیں تو ..... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے .....

کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا۔ "میں سمجھ گیا اندو۔"

پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے ——— اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے .....

پریتو

کرشن چندر

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔ اس کی شخصیت بڑی پُروقار قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ رنگ سرخ و سپید، بڑی نورانی داڑھی۔ اس نے کالی سرج کے رنگ کا اونی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا، میرے قریب آکر رکا۔ جھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔ سیٹ اس کے وزن سے پیچھے کو ہو گئی۔ اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر پیچھے کو ہٹنے والی کلاسٹیں بہت عمدہ ہیں! میں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاک دان میں بجھا دیا۔ بڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے کہا شکریہ! مجھے تمہارا دھواں واقعی بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ بیحد سپید اور مضبوط دانت جڑے جڑے اور ہم سطح اس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پایا جاتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے۔ دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی میں وی "V" کا سا نشان بناتے تھے اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کے لیے ذرا اوپر کیے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی کئی ایسے چھوٹے چھوٹے بھیانک نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش کی ہو۔

جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ خوبصورت اور وجیہہ انسان کی بانہہ یا ٹانگ نہیں گئی ورنہ کتنا بُرا معلوم ہوتا یہ آدمی!

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ آکے کھانا کھا لیں ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کر دیتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بوڑھا سکھ میرے ساتھ اٹھ گیا۔

"حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا مگر اس وقت پھر بھوک محسوس کر رہا ہوں" بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا اور میں اس سے دیر میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی" میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا اور کھڑکی سے باہر ٹک ٹک کر پورن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہات مرد کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہات کے دبانے میں لڑکی کے چہرے پر ایک گھنا مسکراہٹ کھل اٹھتی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکے کے ہات میں کوئی سوئچ (SWITCH) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے یہ مسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی۔ لڑکی کے بال خوش نما طریق سے کٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی دل ربا صورت والی، موہنی ادا اور دل والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچن معلوم ہوتی تھی جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا مرا تھا۔ چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا گٹھے چکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی جماعت بھی بالکل تازہ تھی معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے اور اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں!

لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے ہات میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دباتا تھا جس طرح گرما وہ اس میں برقی رو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہات سے وہ اس کی نیلی ساڑھی کا پلو بار بار سمیٹے جا رہا تھا اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی نہ ہو حسن کی ایک پلیٹ ہو۔ محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے۔ میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر اور بل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گھنا مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گھنا مسکراہٹ اس کے جسم کی ادا بے حد پسند آئی۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی کتنی جماعت اور سپردگی تھی اس کی نگاہ میں کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ بس اسی وقت وہ سب سے پیاری معلوم ہوتی ہے۔ مسکرانے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر تھک کر اس کا ہات پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کمر میں ہات ڈال کر اسے ویٹی بول میں لے گیا تھا اور ان کے جانے کے بعد نوجوان کا اور بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی اور کھڑکی میں لگا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یا صرف انہیں کے لیے نکلا گیا تھا۔ میں نے بات بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بوڑھا سکھ میری حرکت پر مسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بوڑھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگریٹ پینے کے لیے باہر ویٹی بول میں آ گیا۔ ویٹی بول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔ یہ آنسو کیسے؟

کچھ نہیں بولی! لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے چہرے پر وہ دلآویز تبسم پھر محبت میں ڈوبا ہوا۔ کھلا تبسم!

لڑکے نے پھر اسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کانپے۔ اس نے مضطرب کہا۔ چلو اندر چلیں یہاں سردی ہے..... اس نے خاموشی سے اپنی نگاہوں سے میری طرف اشارہ کیا۔ میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پورنیما کے چاند کو دیکھ رہا تھا لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا مجھے ابھی جھڑک دے گا۔ پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ہات ڈالا اور اسے دھیمی چال سے نکال کر اندر ڈبے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا سکھ بھی کافی پی کر ریستوران کار سے نکلا میں نے بھی اتنے میں اپنا سگریٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس ڈبے میں آکر اپنی سیٹوں پر دراز ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبے میں آیا۔ اس نے سب بتیاں بجھا دیں لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر پھیل چکی تھی اور اس کی سپید مدھم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور سوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا۔ مجھے اس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا دوں!

نہ اٹھو۔ بوڑھے سکھ نے بہت ہی دھیمے لہجہ میں بے حد پرسوز آواز میں کہا۔ یہ پورنم کی رات بہت بھیانک ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے مگر میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں! چاند کو تو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں۔ ہمارے تمہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں۔ میں نے اندوہ تبسم کے ساتھ کہا۔ بوڑھا سکھ مسکرایا اس کا بایاں رخسار چاندنی میں تھا اور صلیب کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ میں رخسار کی وہی (۷) تاریکی میں گم تھی۔

میں نے کہا۔ تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کیے ہیں؟ جنگ! جنگ! بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں! جنگ ہی تو تھی۔ وہ موت کی آہٹ سے بولی۔

کون سی جنگ! پہلی جنگ عظیم یا اس سے پہلے کی کوئی جنگ! میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا۔ پھر اچانک بے بنیاد ثابت ہوا اس لیے میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ میں نے پوچھا پھر یہ زخم کیسے؟

بوڑھے سکھ نے ادھر ادھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا۔ لڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے کہ جہاں تھے وہیں کے وہیں اپنی آرام کرسیوں پر دراز سو رہے تھے۔ ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر آخیر میں تاریک کونے میں وہ لڑکا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے بیٹھے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر آنکھیں دونوں کی بند تھیں۔

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ یہ قصہ ضرور سنو گے؟ اگر نہیں نیند نہ آتی ہو سنا دو۔

نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہیں آتی! بوڑھے سردار نے بڑے لاڈ سے مجھے کہا۔ پھر اس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ قصہ سنانے کے لیے تیار ہو چکا ہو۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ اچھا تو سن لو تم میرے لیے مکمل اجنبی ہو اس لیے تمہیں سنانے میں کوئی حرج نہیں

گاڑی کی کھڑکیوں میں دہرے شیشے لگے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے میٹھے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دورویہ پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹتے ہوئے سر جھکائے ہوئے لگا بگا فقیروں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوئے ہوئے سراٹھے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جوانی میں میں بھی اسی طرح سوتا تھا۔ اور بالکل اور خود سر۔ میرا باپ گیندر سنگھ موضع حاصلاں کا نمبردار تھا اور اس کے علاوہ چک نمبر ۴ بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ مگر باپ نے مجھے بی اے پاس کرایا تھا لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشاق تھے۔ جانے میں نے بی اے کیسے کر لیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ کرنیل بنوں مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک، شلغم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دور دھواں کے ٹیلے پر پانی بھرتی ہوئی ناریوں کی قطار اور میری منہری گھوڑی کی ٹوکی چال، بچے، انتوں پر ہلکی ہلکی دھول جگاتی ہوئی..... آہ!

میں نے کہا تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہو گے۔ عورتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی۔

بوڑھے سکھ نے حزیں مسکراہٹ سے کہا ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔

کون تھی وہ؟

میری بیوی تھی!

بیوی!

جب میں بی اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جھمان کے نمبردار کی لڑکی پریتو سے میرا بیاہ کر دیا۔ پریتو بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ دبلی اور ہلکی گوری اور سنہری پھلیل اور نرم جیسے کی رنگدل ٹہنی۔ میں تو اس کی آنکھوں پر مرتا تھا۔

کیوں؟ اس آنکھوں میں کیا بات تھی؟ میں نے پوچھا۔

بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ! مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں پھر بات کیا تھی؟

کہہ نہیں سکتا۔ ان آنکھوں کا رنگ رنگ نہیں رنگ نہیں۔ ان آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

وہ آنکھیں بولتی تھیں؟

بولتی تو نہیں تھیں۔ لیکن بولنا چاہتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سپنا سا دیکھا کریں۔

جوانی میں بھی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں میں نے کہا۔

ہاں! لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں۔

بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ میں تو اپنی پریتو پر مرشاغلہ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لیے ہوا کہ میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی نہ آئی تھی نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد.....

ہاں تو تم نے نہیں دیکھی۔ دور نہیں رکھتے۔ وہ تو ایسی عورت تھی جس سے اس کے بیوی ہونے کے بعد بھی اس سے عشق کیا جا سکتا تھا اور پھر میں ہی ہوا۔ جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوراً میرا بیاہ کر دیا اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں اٹلی میں فرانس میں یا میسوپوٹیمیا یا وہ غیر میں کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا برا ہوا۔

یکایک وہ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اپنی پریتو کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی اور ہم کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسر اپنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا اور پریتو کو اپنے میکے جانا پڑا۔ اس کا باپ بیمار تھا۔ اس لیے میں بھی اسے کیسے روک سکتا تھا چنانچہ پریتو چلی گئی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں کھیتوں میں، اپنی گھر ساری میں کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے۔ لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سرپٹ ہو لیا۔ اپنی سسرال کے گھر چک جھمراں جو ہمارے گاؤں سے تیس کوس پر واقع ہے لیکن میری گھوڑی نے تیز رفتار ہے۔ میں شام ہونے ہوتے چک جھمراں پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے جلد ہی اسے خاصا ہشاش بشاش پایا۔ ساس اور سسر دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ دادا پے سسر کی صحت اچھی چلا آیا ہے۔ تو وہ میری سعادت مندی پر بہت خوش ہوئے۔ دن بھر تیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا اس لیے جلدی کھانا کھا کے میں سو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو سوؤں گا تو پھر صبح ہی آنکھوں گا۔ میں نے پریتو سے کہہ دیا تھا کہ مجھے صبح ضرور اٹھا دینا۔ میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح میرے گاؤں کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا ہی رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اس رات تیسرے پہر ہی میں میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے دور کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے کھلنے سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گزرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھوں یہ کیا ماجرا ہے! سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ کرپان کو تکیے کے نیچے سے نکال کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کر لیتیں۔ کوئی کے چھرے ذرا اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونک کر انہیں اپنی گود میں دبا لیتے میرے پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں اور کھیتوں میں گزرتا ہوا اپنی پریتو کے تعاقب میں جا رہا تھا پہلے میں نے سوچا وہ کھیتوں میں ضروری حاجت سے فارغ ہونے جا رہی ہے لیکن جب اس نے ایک کھیت کو پار کر لیا۔ دوسرے کھیت کو پار کر لیا۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم نیچے کے خشک نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی تو مجھے کچھ عجب طرح کی تشویش، حیرت اور کوفت سی ہونے لگی۔ دل کو دھچکا سا لگا اور اب میں ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اس کے تعاقب میں چلنے لگا

تاکہ اسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ میرے کھیت کی ڈھلان سے اتر کر نالے کو پار کیا۔ پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو قدم بڑھائی۔

سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سایہ دار جھاڑ تھا جھاڑ کے نزدیک ایک چارپائی بچھا تھا۔ چارپائی کے قریب ایک پختہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس چارپائی پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پریتو میری بیوی اس سے بہت پیار کر رہی تھی وہ بار بار اس کی آنکھیں چومتی اور اس کے رخسار اور کتنی شدت تھی اس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اترنے لگا میں چپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا ان لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پریتو! مجھے پیاس لگی ہے اندر سے پانی لا دے!

پریتو نے اپنا سر اس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی بچنے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا اس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لیے۔ پریتو آہستہ سے چارپائی سے اٹھی اور آدھ کھلے دروازے سے پختہ مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی۔

یکایک میں نے کرپان نکالی اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کے اوپر اٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا بچنے کے منہ سے خوف کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لیے رک کر اپنی کرپان کو مٹی سے بھی طرح صاف کیا اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی تو اسے میان میں رکھ کر گھر کے اندر آ گیا اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پریتو میرے گھر میں دھیرے سے داخل ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پریتو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے میرے تکیے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اسے کھول کر دیکھا۔ اور جب اسے بالکل صاف پایا تو گویا اس کے دل کا شبہ دور ہو گیا اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی۔ چپ چاپ پتھر کی سل اوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

کچھ نہیں ہوا؟ اس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس لیے میں پریتو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

دن بیتے۔ مہینے بیتے، سال بیتے۔ میں نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا نہ پریتو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اسے کسی بات کا بھی شبہ ہوا تھا یا اسے کسی بات کا کوئی علم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی۔ میرے بچے پر یا اپنے باپ کے احوال پوچھنے نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعہ کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے میرے اور پریتو کے بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے ہمارے۔ باپ اور دیپ اور ہرنام کور۔ بڑھتے بڑھتے بچے بھی

بڑے ہو گئے اور سکول جانے لگے۔ سکول سے کالج جانے لگے تو ہمارے ان تینوں کا پیدا ہوا۔ ہر نفس شکر اب ہمارے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور صحت جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کے گھر کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاب اور دیپ کالج سے واپس آ گئے تھے گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لیے۔ ہر نام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہرنس گلی کے کھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرتو گھر کے پیچھے ایک کونے میں چولہے میں لکڑی کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا۔ اور اس کی لذت کی خوشبو میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کپاس کھول کر الگ رکھ دی اور دست مزدور پرتو کے سامنے ہو کر بیٹھ گیا اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

"پرتو جلدی سے کھانا دے دے!"

"پرتو نے سب سے پہلے میرے لیے کھانا پروسا پھر باپ کے لیے، پھر دیپ کے لیے، پھر نام کور کے لیے، سب سے چھوٹا ہرنس نے مچل کر کہا: "میں تو ماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

میں نے پرتو سے کہا "تو بھی بیٹھ جا اب!"

"میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟" پرتو نے ذرا ناک چڑھا کر کہا۔

اس وقت چولہے کی روشنی میں اس کے رخسار دہکتے تھے اور اٹھی ہوئی ناک ماتھے پر اترتی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"اچھا! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے۔" دیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرتو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کڑچھی بھر کر اسے دیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔

میں نے کہا "ہرنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزا دوبالا ہو جائے۔"

"اچار تو اندر کوٹھڑی میں ہے۔" پرتو نے ٹوک کر کہا۔

"تو کیا ہوا اندر سے جا کے لا دے۔"

پرتو سہم کر بولی "اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے!" یکایک میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن اس رات کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا؟ یکایک میں نے تلک کر کہا جانے کیسے کہہ دیا اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا کیسے وہ بات یوں طعنہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

پرتو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان جیسے میرے سر پر کھڑی ہے پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار کرپان میرے رخساروں کو چھوتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا۔ اور چلایا۔ "پرتو! پرتو! رک جا۔" مگر پرتو ایک بھری شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کرپان

اس کے ہاتھ سے چھین لی اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اٹھا کر اور اپنے جسم اور روح کی پوری طاقت سے پریتی کی گردن پر
جھپٹ وار کر دیا۔ پریتی کی گردن کٹ کر برہنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری اور وہاں سے لڑھک کر میری تھالی میں اوندھی ہو گئی اور
اس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے۔

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک مجسمہ ساکت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور
سہمے ہوئے تھے۔ جیسے وہ چہرے نہ ہوں۔ ہمدردیوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا
رہی تھی۔ اور چاند مجبور اور بے کس بنا اور اکیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بوڑھے سکھ نے دلگیر لہجے میں کہا۔

عورت کبھی نہیں بھولتی۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کر کے، ایک چکر پر لگا کر
چار بچے پیدا کر کے اس کے دل کا سپنا اس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔

عورت کبھی نہیں بھولتی!

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے رخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ
صلیب بہت گہری اس کے دل کے اندر گھس چکی ہے!

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے مٹھیوں میں لمبے لمبے سانس اندر کو لیے پھر
اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا ہاتھ ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا اور لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے
شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یکایک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ آہستہ سے اپنا ہات
لڑکے کے کندھے سے نکالا اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے تو لڑکی نے نوجوان کا بازو اپنے
شانے سے الگ کیا اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا۔ پھر ایسی حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اس کی کنوار سلاست کی ہر قدم پر نکذیب
کرتی تھی۔ میں بالکل بھول چکا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک کرپان سی چمکتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے لمحے جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا
چہرہ نہ دیکھ سکا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

ننھی کی نانی

عصمت چغتائی

ننھی کی نانی کا ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گڑیوں میں ناک مٹر مٹر تاکتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں۔ اور جب بسم اللہ جانے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا ہو۔ کنوئیں اگلا اس پکڑنے کی عمر سے دوسرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھر لی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے۔ یہ کچھ کھیلے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

زندگی کی دوڑ بھاگ میں کچھ عورتیں پھسل بھی گئیں۔ اور زندگی کے کچھ سال ماما گیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں چھینکی بگھاری اور روٹیوں میں کھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً ریٹائر ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ننھی کی نانی بس نائی بھائی کرنے بادھر کی اُدھر پہنچانے کے سوا اور کسی کرم کی نہ رہیں۔ یہ نائی بھائی کا پیشہ بھی خاصا منافع بخش ہوتا ہے۔ محلے میں کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جاکر اگر ہوشیاری سے تریاں پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر پھیک مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں۔

"اے بہو گھیاں ڈالی ہیں گوشت میں؟" وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گھیا تو کوڑی آج کل کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔"

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے ابا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز ہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوشت۔ جب دیکھو آلو گوش۔ ہا..... اب تو مہینوں گند جاویں آلو گوش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے..... اے بہو کو تمیز چھوڑ دیا؟"

"نہیں بوا کو تمیز تو سب مار گیا موا سنتے کا کتا گیا ہی میں لوٹ گیا۔"

مجھے بے بیر کو تھیر کے بھلا آلو گوش کی خاک مزہ دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"ارے نہیں نانی حکیم جی کے نوٹے نے کل شبن میاں کی ٹانگ میں کلی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو مجھ پر قدم رکھا تو۔۔۔"

"ارے میں کوئی تمہارے دام سے تھوڑی مانگوں گی۔" اور نانی برنج سنبھال سیپیں پٹخاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ رعب کھانے کے بہانے کھسکتی کھسکتی کیاری کے پاس منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چکھی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مار نانی نے کو تھیر پر بیٹھا کو تھیر پیسا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو تولے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لیے سارے محلہ میں مشہور تھیں۔ کھاتے پیتے کی چیز دیکھی اور نظر مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی دو گھونٹ غٹ لیے۔ شکر کی چینی مار لی۔ گڑ کی ڈلی تاؤ سے چکھی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی بنٹے میں اڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر آدھی ادھر اوپر سے مرچ کرتا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کوٹھی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے۔ پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت تھی اور بے چارے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا سے شبہے پر ہی وہ غیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور آتی قسمیں کھاتی تھیں۔ قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

شری چور اور چکر باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقعہ تھا جو ہر دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقعہ میں نقاب بھی تھی پر جو کسی جوئیں محلے کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا۔ مگر گنگوروں دار فیشن ایبل برقعہ کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے سین کرتے کے نیچے بنیان سر پر پیچھے برقعہ بادشاہوں کی بھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گٹھری مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ بنجر قبرستان کے لیے جانماز اور جب محلہ کے کتے دانت کھولیں تو ان سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کنڈا پتلی پر پکا ہوا نانی کے برقعہ کا گھیر اس کے منہ پر چپکا رہتا تھا۔ زحمت میں چھوڑ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں جہاں کوئی چندی کترلی اور احتیاطاً پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہوا کرتا تھا جب یہ برقعہ بھی چل بسے گا۔ کفن کو اٹھا کر جڑ جاوے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج ان کے والدین میں تو کل اس کی بھتیجی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا۔ جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اوڑھا آدھا بچھایا لمبی تان لی۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی نجمی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر چھپٹے لئے پوتے تلے دبے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے۔ مگر جب باہر پیروں نے جواب دے دیا اور محلہ والے پہنچ گئے۔ ان کی جوتیوں کی گھس گھس سن کر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایے سے مانگنے کو سنا ان سنا کر جاتے۔ تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ نجمی کو اس کے ابا کی پیٹھ پیچھے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انہوں نے اسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ نجمی فکر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلا اٹھیں۔ پر نصیب

کا کھا کہیں پڑے ہاتھوں سے مٹا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نانی منڈیر پر جامن کی چھاؤں میں چھکی لے رہی تھی۔ ڈپٹیائن تو اپنے ماموں کے ہاں بیٹے کی بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکار خس خانے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی رسی تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لیے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم بید مجنوں کی یہ بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نوبرس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلہ چھان مارا کوئی سراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی ننھی ماندی کو ٹھڑی کو ٹوٹی ٹوکرے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی میلی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ اسے گالیاں دینے لگی۔ "حرامزادی اچھا چھکا۔ یہاں ماں کھری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوج گئیں۔ ٹھہر تو جا سرکار سے کہیں چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانی سر پر دو ہتڑ مار مار کر چیخنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب..... محلے کے مکھیا تین قاسموں کے نانا۔ پنجوقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ نہ سے چھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی آٹے گڑ کا حلوا کھلا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹے پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلہ کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

"نہیں..... نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی۔

"ارے یہ چوڑیاں پہن لو۔ نانی کو کیا خبر ہوگی.....؟" بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں.....

"کیا ہوا..... کیسے ہوا.....؟" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناکوں پر دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی..... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کچی تعبیل از وقت توڑ کر کھلانے سے چکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں..... ٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم چکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر چھلکا اور روڑیاں۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایک دم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں۔ بلکہ ٹیڑھی میڑھی عورت جس پر کسی دیوانے دوگز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھنگنی۔ موٹی۔ کچھ اسی جیسے کچی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کولہے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کے چٹکیاں بھرتے۔ صافی کے دونے پکڑاتے ننھی کی آنکھوں میں شیطان متحرک اٹھتا..... مگر اب نانی بجائے سے ہوئے ماڈلے ٹھسنے کے اس کا دھوبی گھاٹ کرتی، مگر میلی صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جانور۔ ربڑ کی گیند، پٹا کھایا اور اچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی جوانی کی بھنک سے محلہ لرز اٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ ٹھن گئی۔ پھر سنا مسجد کے مکتبی

کو زچرا کہار نے مانتے مارتے چھوڑا۔ پھر کبھی صدیق پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

ہنسے دن نھی کی ناک کٹنے کٹنے بچی اور گلیوں میں لہو پونچھا ہوتا۔

اور پھر نھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھرنے کی رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور نھی کی جوانی نے محلہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سلنے میں بوتی، جیبتی میں اس مال کی عنوک میں کھیت۔ ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن نھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے گھوڑی چپ چپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ میٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے نھی روٹی کھالے۔" نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے نھی اب دیر ہو گئی سو جا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی ..... اے نانی بی" "سبحان اللہ۔" "سن لو یا ہے کہ نہیں۔ نانی نے سنا فرفر یاد!"

"جا بیٹی اب سو جا۔" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اسے سمٹ سمٹ کرتے سن کر کہا۔ کبھی خالگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسنے لائی ہے۔

پھر صبح میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ نھی عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اور صبح نھی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے تو خبر آجاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے نھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ ٹھم ٹھم ہے سنوں سوٹا ہے بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اسے سونا گاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے نھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی موت پڑ کر مر گئی۔

نھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطی بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو ——" بھابی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کہوں! لا اپنے خصم سے کرا دے۔" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی خاوند سے کرو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ چیزیں گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھر بھر کے رہ جاتے۔

"صلی تو جائے بھڑوا ..... ڈاڑھی نہ اکھیڑ لوں تو کہنا۔" مگر جب خاوند کبھی کبھی نکڑ پر مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں۔

علاوہ محلہ کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موٹے نگوڑے بندر تھے جو پیڑھیوں سے اسی محلے میں پلتے بڑھتے آئے تھے۔ جو ہر فرد کا کچا کھٹا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بدذات مگر عورتیں تو صرف ڈر پوک ہوتی ہیں۔ پر نانی بھی انھیں بندروں میں پل کر بڑھیا تھیں۔ انھوں نے بندروں کو ڈرانے کے لیے کسی بچے کی طبیل ہتھیالی تھی۔ اور سر پر برقعہ کا پگڑ باندھ کر وہ طبیل تان کر جب اچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو مشتعل ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے ان کی آئے دن باسی ٹکڑوں پر جنگ چلتی رہتی۔ محلہ میں جہاں کہیں شادی بیاہ چلا چالیسواں ہوتا، نانی جوٹھے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ مگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ چکمہ دے کر حصہ لیتیں۔ منوں کھانا جٹور لانے کے بعد وہ اُسے حسرت سے تکتیں! کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں چھٹی ہوتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لیے نانی رات کے بسیروں پر جوٹھے ٹکڑے پھیلا کر سکھا لیتیں پھر انھیں مٹکوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چٹکر کے پانی کا چھینٹا دیا چٹکی بھر نون مرچ بگھار لذیذ لغو تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ اُن پر بیضہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ بس جانے پر طوعاً و کرہاً ان ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ خول تو کیا تحفۃً بھی ان خوانکات کو قبول لینے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز از جان جوٹھے ٹکڑے جنھیں جٹورنے کے لیے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنھیں دھوپ میں سکھانے کے لیے انھیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پر ٹٹے بیٹھے ہیں۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھپر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پر غوغا کر رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مرد میدان بنی سر پر برقعہ کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں طبیل لیے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "گھے۔ گھے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو اُن سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہاں بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے۔ اور کیوں بدذات لال کھچائے والا ابی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو ننھی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو برقعہ کے ساتھ اُن کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ اُن کی گڑیا۔ وہ اپنے سارے دکھ اُس تکیے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انھیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھئے نانی منڈیر سے لگی برقعہ کی آڑ میں غیظ سے جو مٹھیاں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے بھاگا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں وہ چلائیں کہ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور پیچھے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا

دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چلا رہا ہے۔ پیاز دے روٹی دے۔ جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹکی بھر ٹکڑے لٹا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑا۔ سوچتی کے مگر گئے مگر اُس کا جی نہ بھرا۔ اور اُس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کئے۔ دبی غلاف جنہیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گوندھا تھا جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلاف بھی اتر گیا۔ اور بندر نے ایک ایک کر کے چھجے پر سے چمکانا شروع کئے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبین کی نتوئی۔ نجو سقے کا انگوچھا..... حسینہ بی کی انگیا..... منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور عمیراتی کا کچھنا.....

خیرن کے لونڈے کا طمنچہ..... منشی جی کا عطر اور ابراہیم کی قمیص کی آستین معہ کف!

صدیق کی تسمہ کا کٹورا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بلقاس کی کلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ ——— ملا جی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہوا نال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ دوب اور چاندی کا چھلا۔ اور بشیر خاں کا گھٹ کا تسمہ جو اُسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکار عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا ——— بس دیکھا تو اُس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ کر چھوڑا تھا۔

"چور ——— بے ایمان..... کمینی"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے"

"پولیس میں دے دو"

"ارے اس کی تو شکل بھی دیکھو اس میں نہ جانے کیا کیا ہوگا؟" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رک گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا۔ اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات ابھی جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں دابے مل بل کر سوکھی سوکھی چھکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں..... دم بھر کو اونگھ جاتی پھر جیسے پرانے ناسوروں میں چیونٹے چلنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی ہچکی ہچکی روتیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ وہ دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو اُن چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بیچارے خود کو نئے لگتے تھے۔ تکلے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبین کی نتوئی اب مہینوں سے دھیلا گھشتی کرنے کے قابل کہاں تھی۔ وہ اُس کے ملنے کے انتظار میں اپنی ترشوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بیکار سمجھ کر اُسے خیرباد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہندکلیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اُس دیو کی جان تھی ایک بھرنے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا اُس صندوق

میں ایک اور صندوق اور اُس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا..... اور اُس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑ دی، اُدھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اُس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اُس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی۔ اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اُتر گئی۔

دنیا کا کوئی دکھ کوئی ذلت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو نانی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں، پر جب بہو آئی تو کفن پہنائے تھیں تو یقین ہو گیا کہ اونٹ کی پیٹھ پر یہ آخری تنکا ہے۔ اور جب ننھی منہ پر کالکھ لگا گئی تو نانی سمجھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جھیلیں سات بار تو چیچک نے ان کی صورت پر جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا کو موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے مڑ گئے۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اُجالے اپنی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن بوتے پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتیں۔ نچلے جسم میں نانی سنورنے کی بھی رہی ہوں گی۔ جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا وا سطہ جو ان کے قریب پھٹک جائے۔ لیریاں لگائے پھریں گی مگر مُردہ کا کپڑا تن سے نہ چھو جائے، کہیں مرنے والا سلوٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نازوں کی پالی نانی کو آن دبوچے! مگر یوں عاقبت بندروں کے ہاتھوں لٹے گی، اس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھپریل کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں، منہ کھلا ہے، کھلیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ انھیں مردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے۔ مگر نانی ہمیشہ ہڑبڑا کر ملغم بکتی جاگ پڑتی تھیں اور جو سننے والے کو ہزار صلواتیں سنا ڈالتی تھیں۔

مگر اُس دن سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں۔ زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ کروٹ کروٹ کاٹتے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

الحمدُ للہ

احمد ندیم قاسمی

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کمر دریا تھے کی تربند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں ٹہلتی رہ جاتی تھی۔ قدمے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو دنوں سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور پھر مولوی ابل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ابل ماہیے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کئے ہوئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹلی چھن سے آ گرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے گاؤں کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا "مجھے دعائیں نہ دو، اس اللہ جل شانہٗ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں سے اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے دعائیں نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان، بے فکری، مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہئے!"

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ مولوی ابل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے نظام تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو۔ اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی ابل کی جان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قمیص برسوں پہلے پوتڑوں کے روپ اختیار کر چکی غائب ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چوغے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اسے بھگتے وقت جلاہے نے سوت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہے۔ مطلا کلاہ کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ لڑکیوں کے بگڑوں جھگوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی

آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی ابُل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا تاہم تو ڈھب سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تابڑ توڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی ابُل نے اپنی پہلوٹی کی بیٹی مہر النساء کے لیے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بچی عمدۃ النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا۔ اور جب مولوی ابُل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے۔ قیمتیں یوں ایکدم زن سے اوپر ہو گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے ایک چونی کما رہا ہوں، چلئے آپ چونی کو بھی جانے دیجیے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریاتِ زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی ابُل خدا سے اپنی عمدہ کے لیے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا۔ اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر مولوی ابُل کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دوکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہٗ کو حاظر و ناظر مان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی۔ اور اولاد کے ساتھ مولوی ابُل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہر النساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا اُدھر مولوی ابُل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اُٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابُل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسبِ دستور اسی کے سپرد ہوئی، مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا، کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔ البقرہ سے النساء میں جا نکلا۔ اور سورۂ رحمٰن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھوا لا۔ چودھری فتح داد کرسی نشین ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی ابُل کے جی میں آئی کہ پکار اُٹھے "آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چودھری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو سمجھاتا کہ ایک سورت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔" لیکن چودھری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی۔ ورنہ یہی چودھری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابُل کے گھر میں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سیکورا اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہو گیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بنفسِ نفیس مولوی ابُل سے معافی مانگنے آتا "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا قبلہ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائن ذرا بیمار تھی اور کھانا نائن نے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا۔"

یہ "وظیفے" مختلف نوعیت کے تھے۔ اور جمعرات کو تو مولوی ابُل کے ہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔

مولوی اُبّل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں آجاتی تھیں۔ اور جیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی کچھ نہ کچھ سے "وظیفوں" پر ذرا سا نمک رکھ کر لاتی تو زیب النساء کو دو چنگیریں ان کے لیے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت سب خوب سیر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفے باقی بچتے انہیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا اور مہینے میں چار بار انہیں گڑ کے شربت میں اُبال کر میٹھے ٹکڑے تیار کیے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اتنا ہی کر پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لیے کپڑا بھی تو چاہئے، چودھری فتح داد سرخی فصل پر مولوی اُبّل کو ایک پوشاک بھی بھیجتا تھا۔ لیکن جب یہ پوشاک گھر میں آتی۔ ایکا ایکی درزی کی دوکان سج گئی۔ زیب النساء، مہرن اور زبدہ اور شمس کو پاس بٹھا کر لٹھے کے ترشے کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں نخوں کے بہت سے جوڑے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لیے مولوی اُبّل کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا نماز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آ نکلتے تو وہ مہر النساء کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیئے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا ——— زیب النساء کے کنگن جو کبھی اس کی ساعدی کلائیوں میں کڑے رہتے تھے۔ اب ذرا سے جھٹکے سے پیچھے بہا جاتے تھے اور اس کی لانبی لانبی پلکوں کے نیچے جوانی کا بھوپال سرد راکھ بن چکا تھا۔ اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی اُبّل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل بچی ہو کر رہ گیا تھا۔ انہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی اُبّل کہا جانے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی ریخوں میں سیٹیاں سی اٹھتی نہیں مگر آواز کا ٹھاٹ وہی تھا۔ صبح محراب سے نکلے ہوئے جو وت یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھالی پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں لرزش سی ضرور آ گئی تھی۔ جو پرانے نمازیوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن چودھری فتح داد کو اس اداتعاش کا سبب معلوم تھا کیونکہ مولوی اُبّل اس سے مہر النساء کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لیے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا۔ اور کئی نوجوان اسے اچھے بھی لگے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی اُبّل کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہر النساء سو کے ٹکڑوں پر پلی ہے، اور سو کے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ۔ اور پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی اُبّل کو عیدین پر بیس پچیس روپے ملتے جن سے مہر النساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہوگا دوسرے نو بچوں کے لیے جوتا ٹوپی بھی شاید ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پتیوں میں سے اچانک بچھو نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی اُبّل اور زیب النساء کی دعائیں رائگاں نہ گئیں۔ انہی دنوں سابقہ خدا یار اور حال شمیم احمد شہر سے گاؤں اٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دوکان کھول لی۔ خدا یار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی اُبّل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب مہینے بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے، اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے گزرتے ہوئے دیکھا تو اسے ایک دکان پر بٹھا دیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدا یار کی بے وی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدا یار کی

بجائے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے گاؤں آ گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی ابّل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دوکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز ابّل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا "عارف کی ماں! شمیم احمد کہتا ہے کہ وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا۔ تم کہو تو مہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں۔ جہیز کے لیے ضرورت تو ہے ہی، ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی اس لیے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائے گا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے۔ دوسرے حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نورِ نظر ہے، نظیر ہے۔" مولوی ابّل نے رک کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا "عارف کی ماں۔ اللہ جل شانہٗ کی قسم مجھے تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے مہرن ہی کے لیے آسمان پر سے اتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لیے تو بھبھل میں بدل گئی "تمہارے منہ میں گھی شکر" وہ بولی اور گلے میں لٹکی ہوئی چابی قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی۔ صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولوی ابّل کے سامنے رکھ دیا "خدا تیری زبان مبارک کرے۔ میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پرانا قصہ پرویز تک پڑھے پڑھے جلنے لگا ہے!" وہ رونے لگی ساتھ ہی مسکراتی بھی رہی۔ اور جب مہرالنساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بول اٹھی "دیکھی! باہر دھوپ میں ٹکٹکے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا الٹ کر رکھ دو، ورنہ سب کٹھے کوؤں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بیٹی" ——— اور مہرالنساء کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں۔ شمیم احمد کی دوکان پر ابا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہرالنساء باہر چلی گئی تو مولوی ابّل نے ڈبے کی کل متاع یعنی تینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا "دعا کرنا مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لیے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔"

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی ابّل شمیم احمد کی دوکان پر چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظر کیا رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہو۔ مولوی ابّل دوکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں میں بچھ بچھ گیا۔ اور جب مولوی ابّل نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر سنہلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے "ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو۔" مولوی ابّل نے معمول سے ذرا بلند آواز میں کہا اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار ——— پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی ابّل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں ——— محض تحفۃً پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی ابّل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا۔ صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا۔ کھنکھارا اور بولا "چھ روپے گز کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دوکان میں بیٹھے ہوئے سب لوگ جیسے مولوی ابّل کے دماغ پر دھب دھب گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے

ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک پر اور ناک سے اُبھر کر ہوا میں جیسے جم کر رہ گئیں۔ مولوی اُبّی نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "تمہارے بوہنی ذرائی ہے اس لیے میں نے زحمت میں کوئی ساعت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں، پھر ملاقی کر دوں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولوی اُبّی کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد سے کہہ دے "اللہ جل شانہٗ بہتی ملائی کرے گا۔ میں شمیم احمد" اس لیے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے" لیکن یہ تو ایکدم سے جیب کے خالی ہو جانے کا غبار تھا، جس پر اٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور وہ بولا "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی! اللہ جل شانہٗ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور بھاری اور بھیں کو دیکھ کر مولوی اُبّی کے ان الفاظ کے جواب میں کہا "اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری بہن کا سہاگ مہکے۔"

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی اُبّی کے دروازے کی زنجیر بجی، اس وقت آنے والے عموماً چاول یا حلوہ یا کھیر وغیرہ لاتے تھے اس لیے زنجیر کی آواز سنتے ہی بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ لیکن جانے مولوی اُبّی کو کیا سوجھی۔ خلافِ معمول کواڑ کھول کر بولا "ٹھہرو" بچے رک گئے، سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النساء تو رو بھی دی، مگر مولوی اُبّی ان کو دلاسہ دیئے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا۔ جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک خوارہ سا اٹھا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ"

یہ شمیم احمد تھا۔ صافہ کے بلے بڑھا تو لٹھے کا نیا تہ بندیں کی طرح بج اٹھا۔ اور جب اس نے رک رک کر کہا "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں قبلہ۔ اسی لیے آپ کو بے وقت زحمت دی" تو مولوی اُبّی کو شمیم احمد کی پوشاک سے اٹھتی ہوئی مہک کچھ کھٹکتی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی، لیکن مولوی اُبّی گردن موڑ کر پکارا "میں ابھی آیا عادت کی ماں" اور پھر شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نئے تہ بند کا شور و خوخار دکھنے کیلئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند غازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے، دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا۔ یہاں ٹھوا اندھیرا رہتا تھا، اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلّہ کشی کے لیے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی اُبّی پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لایا اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کروٹے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس آ گیا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور داڑھی کے خشخشی بالوں پر عطرِ حنا دیئے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

"کہو" مولوی اُبّی کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے مہمان کے لیے ایک ایوان کی آرائش و زیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی لو

بے پناہ دل چھوڑ دی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو گم کیا اور بولا "آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں"

"کہو، کہو" مولوی ابل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیند میں سی دکھی تھیں۔ "کہو ناصر یزم"

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے، ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا "اصل میں یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات بات پر بھول جاتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں۔ اسی لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں"

"تم نے بہت اچھا کیا" مولوی ابل نے بڑی شفقت سے کہا۔

"میں آپ کا پرانا خادم ہوں" شمیم احمد نے سمٹتے، پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا "میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کے لیے ——— " اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا ——— "حضور مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی میں لے لیں" شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی ابل کا جی چاہا کہ چٹکی بجائے، رسماً ذرا ہنستے ہوئے بولا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد"

شمیم احمد نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی ابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید کے کئی دشوار مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ "غلامی" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ وہی ہلکی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری ہچکی لی۔ "جی میرا مطلب ہے کہ حضور ——— حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرما لیں"

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی ابل کی تسلی ہو گئی! اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مرتا رہا، اور جب مولوی ابل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بصد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا۔ مولوی ابل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے ڈک گئے تھے، شمیم احمد کی داڑھی پر جیسا جھجک رہا تھا اور مولوی ابل کی داڑھی میں آنسو جگمگا اور تھرتھرا رہے تھے اور چراغ کی لو پھر ڈھیروں دھواں اگلنے لگی تھی۔ مگر اب کے شمیم احمد کو بتی گم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا۔ مولوی ابل نے ایکا ایکی جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جل شانہ! ——— کتنی مسکین!" اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انہیں پرو لیا "دیئے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے۔ آؤ، ادھر آؤ ——— " اور مولوی ابل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا "کہاں سے آ رہے ہو؟ عطر کی لپٹیں آ رہی ہیں؟"

ہما النساء توے پر آخری روٹی ڈالنے جھکی تھی، بولی "بھیا ابا سارا گھر مہک اٹھا ہے"

"کیا بات ہے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

مولوی اہل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا اس لیے سب کے منہ نکلنے لگے تھے۔ سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لیے بولا "آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا" کھلے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور مہر النساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

"بات سنو عارف کی ماں" مولوی اہل باہر جاتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو"

مولوی اہل جھلا "اللہ جل شانہٗ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے رب کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو جل شانہٗ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی!" اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی، وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی بھیگی بھیگی داڑھی رکھ دی۔

"دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں" مولوی اہل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا "الحمد للہ! یوں سنتا ہے سننے والا یوں دیتا ہے پھر پھاڑ کے سنتی ہو زمین" آج مولوی اہل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کے بجائے زمین کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "جب شمیم خلیا رہتا تھا جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو یوں بھیگی بھیگی نگاہوں سے دیکھتا تھا مہری کو جیسے ——— کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو ——— اللہ قسم"

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

"ٹھہرو" اب کے مولوی اہل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی "میں خود جاؤں گا" پھر بچوں کے پاس آ کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا "ندیدہ پن بہت برا ہوتا ہے۔ مجھے باہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لیے بھی آ نکلتے ہیں۔ سمجھے؟ جاؤ" پھر ذرا بلند آواز میں بولا "انھیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی۔ یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں"

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چودھری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی اہل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا "مبارک ہو قبلہ! ہزار بار مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں"

اس وقت مولوی اہل کی نظروں میں چودھری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی "اللہ جل شانہٗ کا شکر اور آپ کا احسان ہے" اس نے چودھری سے بڑے پگھلے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

"خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا" چودھری فتح داد بولا "اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجیے۔ شمیم احمد اچھا لڑکا ہے، پھر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دوکاندار ہے۔ دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دوکان پر آتی ہیں، اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسا نگا زمانہ آ گیا ہے، لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا کب پڑے پڑے بھک سے پھٹ جائیں۔ شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا گٹھیا سی گئی ہے، کوئی بات

اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات پشتیں تو ہم ڈالتی ہے کہنے۔ ابھی ابھی ٹھیم نے آکر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے۔ میں نے اسے جلدی شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجئے۔ میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔ آپ کل تک سوچ لیجئے اور یہ ——— یہ ———" چودھری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی ——— "یہ میری بیٹی کو دے دیجئے گا۔"

مولوی ابل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا "اللہ قبول فرمائے!"

"آمین" مولوی ابل کے منہ سے عادتاً لفظ نکل گیا۔

مولوی ابل نے اندر آکر پوٹلی کھولی تو ایک بڑے سے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے۔ جن کی بڑے سے بلبلے جتنی کٹوریوں میں جانے کیسے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اور چیز کی امید میں رومال کو جھاڑ کر چلی "ٹھیم احمد نے بھیجے ہیں!"

اور ابھی مولوی ابل جواب نہیں دے پایا تھا کہ مہر النساء جھاگ کو باہر نکل گئی۔

"ارے!" مولوی ابل نے حیرت سے زیب النساء کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

"سمجھ گئی!" زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشت شہادت کو ناک کی کیل پر رکھ کر بولی۔

"تم نے بھی تو منہ بھر کر کہہ دیا ——— ٹھیم احمد نے بھیجے ہیں!" مولوی ابل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری اور دبکے جو ابھی تک بعض حیرت زدہ تھے، مخلوط ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھگوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چودھری فتح داد دے گیا ہے مہر ان کے لیے" مولوی ابل نے بڑی بے پروائی اور رواداری میں راز فاش کیا۔

"اللہ قبول فرمائے" زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہر النساء بیاہ دی گئی۔ اس کے ہاتھوں پیروں پر مہندی تھپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی کیونکہ شادی کا گھر بھی پر آخر مولوی ابو البرکات کا گھر تھا جس نے حضور پر نور صلعم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دفیں بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا اور پنجاب اتنا بدنصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ "دف ہو تو ڈھاڈا اور بجاؤ اور گاؤ۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا!" مولوی ابل نے پیر صاحب کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں مہر النساء کو اپنے حلقے میں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈھولک کے بغیر ہی اپنی سریلی آوازوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دوستی، پھولوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے نغمات بنتی رہیں۔

لیکن بھلا ٹھیم احمد کو ڈھول شہنائی بجوانے اور گوے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی ابل کی ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ ہوا کہ معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی ابل کے بچے کھچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی ابل اور زیب النساء نے رکشا کے ایک کونے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے گھسٹنے، کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں۔ اور جب دوسرے دن صبح کو جھیر کا دالان، آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں کی لالچی نظریں تو تو ہو کر پیچھے ہٹ گئیں۔ کپڑے تو خیر ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

مولوی اُبّی کے پاس دستِ غیب کا تعویذ ہے" کسی نے رائے دی۔

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکتی ہوئی جھلی میں انگلی ڈبو کر کہا: "کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لئے ہیں کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ سگھڑ ہے اس لئے اوڑھ کے لئے رکھ چھوڑے۔ یہ لگن اور یہ ناک کی کیل۔ یہ سب کچھ بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟" اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھلی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہر النساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو اکنیوں اور چھوہاروں کی ایک لہر سی اس پر سے نچھاور ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے۔ مولوی اُبّی کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے۔ ایک دم اپنی جگہ سے یوں اُچھلے جیسے ان کے قدموں تلے لچک دار کمانیاں ابھر آئی ہیں "ٹھہرو" مولوی اُبّی گرجا۔ کمانیاں دھرتی پر اتر گئیں۔ بچے جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ صرف عارف ایک اکنی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا۔ اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی اُبّی کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور مولوی اُبّی بالکل گلاب ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے نظاروں کے لیے بانٹ لیا ہے، ایک موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور دور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر بھینچا اور پلٹ کر گھر کو جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن میں بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی اُبّی کے ہونٹوں میں دیر سے جو مسکراہٹ اور کھلی ہو رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنی چمکتی دکھائی دی۔ لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ زیب النساء شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی۔ مولوی اُبّی کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے دائرے بنا کر بولی "ہمارے لیے تو بس یہ قبرستان کا سا سناٹا چھوڑ گئی ہماری مہرن۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے" مولوی اُبّی نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا "مہرن چلی گئی تو کیا زبدہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا تمہیں بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟" پھر ذرا رک کر بولا "عارف میاں! زبدہ کیا کر رہی ہے؟"

"وہی رو رہی ہے" عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

"کہاں؟" مولوی اُبّی نے پوچھا۔

"وہی جہاں مہرن آپا مایوں بیٹھی رہیں" عارف بولا۔

"زبدہ" مولوی اُبّی پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبدہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کے سبب جگہ جگہ سے نیا ہی مائل سرخ پڑ گیا تھا۔ اور زبدہ نے اپنے بنی مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چکنایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور ———

مگر مولوی ابل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آگیا تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ زبدۃ النسا چند قدم پر آکر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی ابل نے زیب النسا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے "عارف کی ماں! سنو! یہ زبدہ تو جوان ہو گئی ہے!"

اور زیب النسا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں تھرن کے عقب میں بیٹھی بیٹھی بڑھتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی ابل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النسا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "فکر نہ کرو بیوی اللہ جل شانہ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔"

زیب النسا نے مولوی ابل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر گرا دیا "شرم کرو۔ پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے گئے، اب کندھا سہلا رہے ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے ——— ؟" زیب النسا نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا ہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی ابل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پکارا "شمس!"

شمس النسا قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی ابل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النسا کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی۔ پھر تلوے کا خم جھکتا تھا اور اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لچک لچک کر دھرتی کو چھوتی تھیں۔ تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹی۔ کچھ نہیں۔ جاؤ" مولوی ابل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمس النسا حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النسا زار و نار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زبدہ اور شمس اس کی طرف لپکیں۔

مولوی ابل نے باہر جا کر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے جھکتی ہوئی اکنی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں کل دو ہی کس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں تھرن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے تھوں کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا۔ اس لیے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اسی لیے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے پندرہ روز کے بعد ابالے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی ابل اذان دے کر وہیں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ کی نماز پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو وہ بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین

کی خدمت کے برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا "تمہیں یاد ہوگا کہ کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا؟ کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو زمین نگل گئی، کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں، کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہرِ الٰہی ہے۔ یہ آثارِ قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ!——" اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد عقیدتیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی کے وظیفے آنے لگتے۔ مگر پھر وہی سناٹا ہو کر رہ جاتا جس میں زبیدہ کی آنکھیں چمکتیں، شمس کا جسم لچکتا، ثمین کے خالی بکسوں میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے بلوری جھنجھنے بجتے اور تالیاں بجاتے۔ اور قمرن کی گڑیاں ننگی ہو ہو کر ایک دوسرے میں گھسی پڑتیں۔

مولوی ابل کے صرف دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ اللہ جل شانہٗ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جل شانہٗ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی ابل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی، اور زیب النساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تھا کہ زبیدہ اور ثمین کے لیے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی ابل جس شدت سے مہر النساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اسی شدت سے وہ زبیدۃ النساء اور شمس النساء کے لیے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا "ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی۔ ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمس نے تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا ذرا سی چوٹی ایسی بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھر میں پٹخ آؤں؟ زبان دیوان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا" وہ زیب النساء سے زبیدہ اور شمس پر بے تحاشا آئی ہوئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا "اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا۔ توکل بڑی چیز ہے عادت کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جل شانہٗ پر توکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ یہی توکل بیج کو چٹخاتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے، اور سبز پتیوں کی کوکھ میں بالیوں اور بھٹوں کو پروان چڑھاتا ہے، سمجھیں عادت کی ماں؟"

"پر کسان بیج تو بوتا ہے نا!" زیب النساء بحث کرتی "تم نے کیا کیا ہے؟"

"الحمد للہ" مولوی ابل کہتا "میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگی ہیں!"

اور زیب النساء لاجواب ہو جاتی۔

دعاؤں کے بعد مولوی ابل کا ذہن چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا۔ اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی ابل کو پوشاک پہنائی تھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے حجامی کا کام کرتا تھا، چودھری کی ریڑھ کی ہڈی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شام تک سوج کر پھوٹ پڑا اور بہنے لگا۔ ساتھ ہی چودھری کو لرزے کے بخار نے آ لیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ ان دنوں مولوی ابل کے گھر روزانہ ہی چھائی رہتی۔ ایک تو مہر النساء سے اس کی ساس کا برتاؤ سوہانِ روح تھا۔ اس پر چودھری فتح داد کی علالت! بچے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی ابل چیخ اٹھتا "چپ رہو نامرادو! ادھر چودھری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم ہنس کھیل رہے ہو۔ ناشکرو! یہ چودھری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے

آدھے آدمی تو قاقوں سے مر گئے ہوتے۔ اللہ جل شانہٗ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو!"

مولوی ابلی ان دنوں ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا۔ لیکن وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔ بس اتنا ہوتا کہ مولوی ابلی کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح صبر کے بل گر جاتا "دعا فرمائیے قبلہ" وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی ابلی آنسو لا کر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا "وہی شافی مطلق آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا" ——— لیکن ایک روز جب مولوی ابلی چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چودھری کی طبیعت بھی خلاف معمول سنبھلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسب عادت تعظیماً کچھ اٹھا۔ لیکن کراہا نہیں۔ لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا "بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟"

"الحمد للہ۔ اچھی ہیں۔ دعا گو ہیں" مولوی ابلی نے جواب دیا۔

"سنا ہے بہت پیغام آ رہے ہیں؟" چودھری نے پوچھا۔

مولوی ابلی ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈنکا پٹتا ہے تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا "جی ہاں بہت آ رہے ہیں"

"پھر! کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟" چودھری مسلسل مولوی ابلی کو دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی ابلی گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو و زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نگل کر بولا "جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہٗ کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈار گھر میں فلاں کے لیے تنکا تک نہ ہو وہاں بیٹیوں کے رشتے کون لے کر آ پھرے"

"تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟" چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی جھلاہٹ تھی۔

"آپ کے دشمن مریں" مولوی ابلی فوراً بول اٹھا "آپ اللہ جل شانہٗ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر دونوں بیٹھ کر طے کر لیں گے"

"جی ہاں" چودھری نے بھدے انداز میں کہا "فوراً طے ہونا چاہئے۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سامان کر دے گا ——— وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟"

"جی ہاں" مولوی ابلی نے جواب دیا "باقاعدہ"

"اللہ قبول فرمائے" چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

"آمین" مولوی ابلی نے عادتاً اس دعا کی تائید کی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ چودھری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا "سنا ہے بیٹی مہر النساء اور شمیم احمد کی تو خوب بھندی ہے پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی"

"جی ہاں" مولوی ابلی نے بڑے دکھ سے کہا "لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتی ہے"

"پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟"

"بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ تو کنگلی ہے، تو سوکے ٹکڑوں پر پلی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بُو آتی ہے، تو اپنے ساتھ خاک لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔"

"ہوں" چودھری کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا "بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقعہ ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہر النسا کو کنگلی کہتی ہے نا! اب ہماری بیٹی کے بچہ ہوگا تو اس کے لیے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گھنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح بیٹی کا مان بھی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟"

ٹھیک ہے، مولوی اہل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی اہل کا وہاں زیادہ تک پچھلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النسا سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا اور زیب النسا نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی اہل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولتے پھرنے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی اہل ڈیوڑھی ہی سے پکارا "عارف کی ماں!"

زیب النساء جاگی آئی "خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چودھری کیسا ہے؟"

"اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا" مولوی اہل بولا "عارف کی ماں! سنو، مہرن بیٹی کیسی ہے؟"

"زیب النسا چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

"کب تک ہوگا؟" مولوی اہل تو آج آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"بس اللہ چاہے گا آج کل میں" زیب النسا جھینپ کر بولی "پر تمہیں کس نے بتایا؟"

مولوی اہل تقریر کے سے انداز میں بولا "بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو اس کی ساس کے طعنوں تشنوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لیے بہت سا ——"

"اللہ کرے نواسہ ہو" زیب النسا نے مولوی اہل کی بات کاٹ دی۔

"جو کچھ بھی ہو" مولوی اہل نے ٹوٹے تار کو جوڑا "ہم بچے کے لیے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ہمیشہ کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟" زیب النسا نے پوچھا۔

"تو کل عارف کی ماں۔ تو کل" مولوی اہل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا "اللہ جل شانہ پر تکیہ کر۔" خود مولوی اہل کو اس وقت چودھری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النسا نے برقعہ اوڑھا۔ عارف کو ساتھ لیا اور مہر النسا کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی "بھاگ لیجیے ہو عارف کے ابا؟"

"ہاں عارف کی ماں۔ کیوں؟" مولوی آبل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

"بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی۔ تیمم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔ شاید کل تک ہو جائے گا" زیب النساء نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"سچ اماں؟" زبدہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"اے!" مولوی آبل اور زیب النساء حیران رہ گئے، اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مائے دور کے جیتی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی آبل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ سارا گھر جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی آبل زیب النساء کے پاس آیا "اب کیا ہوگا؟"

"چودھری کیسا ہے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"اللہ جل شانہٗ ہی رحم فرمائے" مولوی آبل نے کہا۔

زیب النساء اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "طلائی ٹوپیوں اور سونے کے کنگنوں کو تو مجھ کو بھاڑ میں۔ میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک چوڑا بھی ہو جائیں تو ناک رہ جائے۔ کوئی سبیل ہے؟"

"سبیل!" مولوی آبل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا "تمہاری عقل بھی تو ایڑیوں میں ہے۔ اور جانے وہاں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لتے اور گہنے پاتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی جہیز میں دے ڈالے۔ آخر ایک بھوکے مرجھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے وہ ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟ — نہیں ہے کوئی سبیل، کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نواسے کو پہنا دیتا"

"بکنے کیوں لگے؟" زیب النساء بھی غصے میں بولی "کفن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ خالی ہاتھ نکلتی مہرن کے پاس جاؤں اس کی کمینی ساس کے سامنے، اور زبانی زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آجاؤں لعنتوں کی گٹھری اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا۔ جینا اجیرن ہو جائے گا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے۔ زبدہ اور شمسی کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اگل بیٹھے اور اب دہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں۔ ساری عمر کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔"

"بیٹھی رہیں" مولوی آبل طیش میں آگیا "اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے۔ کچھ نہیں میرے پاس، سمجھیں؟ میرے پاس کچھ نہیں..... " مولوی آبل باہر نکل گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنکھ میں کچھ دیر ٹہل کر اندر آجائے گا مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بلبلا کر رو دی۔ اور زبدۃ النساء اور شمسی النساء تڑپ کر بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئیں۔

مولوی آبل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی اور سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔ اور زبدہ اور

شمس اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر آنروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مڈھیر نہ ہو سکی، پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ رہا گیا۔ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر ہری ہری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا "ادھر آؤ"۔

زیب النساء اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب تک مولوی ابل موم ہو چکا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

"مسجد میں" مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے؟"

"کیوں جاتے ہیں؟"

"کچھ سوچا؟"

"ہاں"

"کیا سوچا؟"

"یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہراں کے ہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے"

"خالی ہاتھ؟"

"نہیں"

"پھر"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟"

"یہی"

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"سنو" زیب النساء بولی "کہیں سے دس روپے تک قرضہ مل جائے گا؟"

مولوی ابل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے، اٹکتے ہوئے لہجے میں بولا "ابو البرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں۔ مجھے سب لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سو کے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لیے دو گز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کاہے کو رہوں گا؟"

زیب النساء بڑی صبر سے اٹھے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی "چودھری کیسا ہے؟"

"میں جاتا ہوں" مولوی اہل نے جمائی لے کر کہا "ذرا سا بھی اچھا ہوا تو مہرن کا ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہٗ کوئی سبیل پیدا کر دے"

مولوی اہل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبدہ اور شمس نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے جلسے کو دیکھنے جائیں گی "ابھی ٹھہرو بیٹی!" زیب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار ———

انتظار ———

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے کھل کر کھلے اور مولوی اہل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا، "عارف کی ماں اسے عارف کی ماں"

زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے زبدہ، شمس، عارف، مہرن، زبدہ اور دوسرے سب بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انہیں اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔

اور مولوی اہل اسی بھیگتے ہوئے لہجے میں چلایا "مبارک ہو عارف کی ماں! تم نواسے کے چولے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہٗ نے چولے، ہتی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا ——— چودھری فتح داد مر گیا ہے نا!"

زیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مارا کہ بچے تک دہل کر رو دیئے۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی اہل کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی اہل چیخ مار کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا خاصا چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا۔

———

موذیل

سعادت حسن منٹو

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اوڈوانی چیمبرز کے پیڑھیوں پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری لمبائی پر تنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ستارے روشن تھے۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں، اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ـــــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا تھا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا جیسے رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اب وہ صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ـــــ محلے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو چکا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ـــــ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ـــــ اور ترلوچن لازماً مضطرب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے۔ بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ـــــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی گلائی پکڑ کر موت کے کنویں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیوالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا۔ فسادات کی تیزی و تندی کے

متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "نرنجن ایر فیلڈ دیکھے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا گھر پر رہنا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارہ کر لیا کرتا ہے" ——— مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سُن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا "یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ——— میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبئی ہے ——— بمبئی، تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ——— بارہ برس سے"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں اگر فسادات برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی چھومنتر ہے ——— یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ——— محلہ قطعی محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا ——— وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا تاکہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ——— ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے ——— کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی۔ مگر بہت ہی نرم و نازک اور لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں، مگر اس میں وہ سختی، وہ گھٹاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح سرسوں مائز ڈکپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ اور وہ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر وہ زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ——— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا۔ اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ۔ پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بُری نہیں تھی ——— خاکستری رنگ کے تنبو کی

چھت میں ہزار ہا دیئے روشن تھے۔ اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا۔ اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں لگی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی، جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تیسری چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیدوں سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے، مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ، اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چٹوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی ——— ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور وہ اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی ——— بڑی مکڑی ٹانگیں اس کے ادھر اُدھر تھیں اور ..... جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل ——— ساری موذیل سے الجھا، جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی "یہ کھڑاؤں ایکدم کنڈم چیز ہے" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو، لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، پیتی تھی، اس کے ساتھ سینما جاتی تھی، سارا سارا دن اس کے ساتھ جو ہو پر نہاتی تھی، لیکن جب وہ باہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تھا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر سے گھر کی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ لمبی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت اکھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں گوڈے گوڈے، دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سینما جانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا

تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لیے پُر تکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ خوامخواہ چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا، جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ فولاد کی طرح مضبوط ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو ——— یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کونسی نازک باتیں ——— تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر رکھ کر اپنی ٹکڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔ ——— ہاں وہ میرے یار ہیں ——— اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو"

ترلوچن بڑے دلکش انداز میں پوچھتا "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی "تم پرلے سکھ ہو ——— ایڈیٹ۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ——— اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو ——— میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے، مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں بیچ دی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی ——— پسند ہی نہیں، جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڑے گوڑے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جبکہ موذیل موج میں تھی ——— ترلوچن نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ——— کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیر درست کرنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی بھوری آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ——— "موذیل، تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ——— یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"

موذیل اٹھی۔ اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا "سکھ شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال

کھلے چھوڑ دو۔ تو میں شرط لگاتی ہوں، کئی لونڈے تمہیں آنکھیں مارنے لگیں ـــــ تم خوبصورت ہو"

ترلوچن کے گیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں۔ ـــ تم تکلیف نہ کرو"

ترلوچن چلایا "موذیل!"

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جن پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں "خدا کی قسم ـــــ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ـــــ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ـــ بس تھوڑا سا پیٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ـــــ اس میں جو پنیں لگی تھیں، وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے گیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کی مانند اپنے اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دباتے ہوئے وہ مسکرائی "تمہارے بال بہت ملائم ہیں ـــــ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ـــــ ترلوچ ـــــ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوہ بناؤں گی"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوا "میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ـــــ تم کیوں اڑاتی ہو ـــــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ـــ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا، مگر صرف اس لیے کہتا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ـــ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟"

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا "مجھے معلوم ہے"

"پھر" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ـــــ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

"مجھے معلوم ہے" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لگی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی "میں

بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی"

ترلوچن اچھل پڑا "سچ؟"

موذیل کے جنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لمحے کے لیے چمکے۔

"ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا "تو..... تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی "جب ——— تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے؟"

ترلوچن اس وقت "جو ہو سو ہو" بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا "میں کل ہی کٹوا دوں گا"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ——— تم میں اتنی ہمت نہیں ہے"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے بہت سے خیال کو نکال باہر پھینکا "تم دیکھ لو گی"

"دیکھ لوں گی" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ——— وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی ——— یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

ترلوچن دہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا جو بیلوں سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی اور دیر تک اس کو چھیڑتی اور گدگداتی رہی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے، مگر وہ آئے بغیر نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز صبح موذیل کو چٹ بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آ جائے۔ موذیل آئی، ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی، پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ گلابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور نارنگی رنگ پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی۔ اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ——— موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ——— ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ——— ایسے ہی چلتا ہے"

ترلوچن کو وہ پہلی رات یاد آ گیا جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔

مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا "شادی کل ہوگی؟"

"ضرور" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونہ میں ہو، چونکہ سول میرج تھی۔ اس لیے ان کو پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا ——— ترلوچن مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہاں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟ ——— یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور موذیل کو بھول گیا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کی مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کی مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کڑکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ——— وہ بے حیا تھی، بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی موٹر کار خریدی تھی، یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے ——— اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے اور نہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے، بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی، اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے ضد کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا تھا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارے کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو ——— مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ اندھیرا اس کو ناپسند تھے، اس لیے کہ

ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا۔ مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ سمجھی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا کیا اس ہے ——— اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیا کرو ——— تم مجھے یہ بتاؤ، کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ——— یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ——— مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ——— تم سکھ ہو ——— مجھے معلوم ہے کہ تمہاری کے نیچے ایک سلی سا انڈر ویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہئے تمہیں ——— اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈر ویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی رک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موزیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بیکار اتنے زائد بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موزیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کرپال کور، ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کثر قسم کے مسلمان رہتے تھے۔ اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہاں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چال کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں، اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک بار بڑھا تھا۔ وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری ——— اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے ——— بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موزیل کو دیکھا جو یہودیوں کی خاص وضع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ——— اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کی ہوا چیخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ——— اور اس وقت یہاں پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موزیل نے ایک اور انگڑائی لی ——— اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ——— ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے

نیل اُبھر آئے۔ وہ زور سے کھانستا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ڈیل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی سی داڑھی دیکھنے لگی "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن!"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلو سکرٹ صاف کر سکے ——— مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب!"

ترلوچن اپنی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا، تاہم اس نے صبح کے دھندلے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ——— کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا "بیمار رہی ہو!"

"نہیں" موذیل نے اپنے تراشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو!"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی "تم گویا کہ ——— اب پھر ——— نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی سے جواب دیا "ہاں"

"مبارک ہو" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اُتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "ہاں"

"مبارک ہو ——— اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"

"یہ بہت بڑی بات ہے" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے"

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گالوں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی "قسم اب یہ داڑھی منڈوا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کروں گی"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ——— موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے۔ مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا "موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ——— جو مذہب کی پابند ہے اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے"

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ ——— کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

اس کو ابھی تک معلوم نہیں ——— داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ——— محض اتفاقی طور پر ——— اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سر میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ——— مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے" ترلوچن نے اپنے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنی شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی "یہ بہت اچھا ہے ..... مگر یہ کمبخت مچھر یہاں بھی موجود ہیں ..... دیکھو کس زور سے کاٹتا ہے؟"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا۔ انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا "ترلوچن ——— تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی "تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو ——— جاؤ، اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! ——— موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت نہیں سمجھ سکتیں ——— کسی بھی معاملے کی نزاکت ——— تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری "افسوس بی ڈیڈ ——— سلی ایڈیٹ ——— تم یہ سوچو کہ تمہاری اس ..... کیا نام ہے اس کا ..... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ..... تم جیسے گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ..... تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے ——— تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو ——— اور بہت ڈرپوک، مجھے نڈر مرد چاہیئے ..... لیکن چھوڑو ان باتوں کو ..... چلو آؤ، تمہاری اس کو رکھ لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ——— ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے ——— میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ——— چلو آؤ میرے ساتھ"

"مگر سنو تو ——— کرنیو ہے"

"موذیل کے لیے نہیں ——— چلو آؤ"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری داڑھی ——— لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے ——— ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو"

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو ——— میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"

"کیوں ٹھیک نہیں؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ——— وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ——— گدھے کہیں کے ——— اسکی جان کا سوال ہے ——— کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو؟"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی"

موذیل چڑ گئی "اوہ تمہاری محبت بی ڈیمڈ ——— میں پوچھتی ہوں کہ سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں ——— اسکی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ——— اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی"

ترلوچن نے کہا "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں"

"بہت اچھا کرتے ہو ——— مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ——— تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا "مجھے اس کی پرواہ نہیں ——— اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا"

موذیل جھنجلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے ——— تمہاری

محبت ہی کہاں رہے گی جب تم نہ رہو گے ——— تمہاری وہ ——— کیا نام ہے اس بھڑوی کا ——— جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔ تم سکھ ہو ——— خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن جھنجھلا گیا "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ بھینی بھینی بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی باہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا ——— "ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی ——— جاؤ پگڑی پہن آؤ ——— میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا "تم کپڑے نہیں پہنو گی؟"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا "نہیں ——— چلے گا اسی طرح"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن پچھلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تکڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے قریب پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا "تم بہت ذلیل ہو"

موذیل مسکرائی "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ——— اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کیس ہیں"

بازار بالکل سنسان تھا ——— ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے، جیسے کہ لہو سے خوف زدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرامیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں وہ اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی، اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتہ کھڑکتا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی، جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گونجی "اے ——— کدھر جا رہا ہے؟"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا "اوہ، تم ——— ہم کو پہچانا نہیں تم نے ——— موذیل....." پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا "ادھر اس باجو ——— ہمارا بھائی رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے ——— ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے....."

سپاہی اس کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا "لو، پیو ———"

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا "ہیئر از لائٹ!"

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی جس میں سے گزر کر انھیں ——— محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی بیل تن لہروں سے ٹکراتی، پھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی۔ اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تھی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا، مگر اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رُک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا "ترلوچن ڈیر ——— اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ——— تم ڈرو گے تو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا ——— سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رُک گئی ——— کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا "کوئی بات نہیں ——— چلے آؤ"

دونوں چلنے لگے ——— ایک آدمی سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے نیفے میں ہاتھ ڈالا ——— موذیل آگئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی، جیسے نشے میں چور ہے۔ اس نے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا "اسے کیا کرتا ہے؟ ——— اپنے بھائی کو مارتا ہے ——— ہم اس سے شادی کرنے کو مانگتا ہے" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی "کریم! ——— اٹھاؤ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا "عیش کر سالی ——— عیش کر" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا "کوئی ذلیل حرکت نہیں ——— سب چلتا ہے ..... آؤ"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں ——— نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی۔ مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ——— ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ "ترلوچن ڈیر ——— یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی "تمہاری مرضی ——— لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ——— صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پُراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو، ایسا کرو ——— میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ——— تم میرے پیچھے آنا ——— بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ——— سمجھے ——— مگر یہ سب ایکدم جلدی جلدی میں ہو!"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ——— سیڑھیوں کے پاس ترلوچن ہانپ رہا تھا مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا مالا؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا!"

"چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "مہنگا سنگھ جی ——— مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین سی آواز آئی "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ——— ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے ——— موذیل نے اپنی بغل میں ایک دُبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ——— جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لمحے کے لیے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو چوڑے پچکے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل کے جسم سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ——— اور اپنی ماتا جی سے بھی ——— لیکن جلدی کرو"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی "اسے پکڑ لیا انھوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی "پکڑ لیا تو پکڑا ہوا ——— تم یہ کپڑے اتار دو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر ترلوچن سے کہنے لگی "جاؤ، اسے لے جاؤ ——— لیکن ٹھیرو"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا "جاؤ ——— جلدی نکل جاؤ"

ترلوچن نے اس سے کہا "آؤ" مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں"

"جہنم میں جائیں وہ ——— تم اسے لے جاؤ"

"اور تم؟"

"میں آ جاؤں گی!"

ایکدم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انھوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا "سنو! اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے ——— میں دروازہ کھولتی ہوں....."

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی "دروازہ"

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں ——— تم میرے پیچھے بھاگنا ——— میں اوپر چڑھ جاؤں گی ——— تم بھی اوپر چلے آنا ——— یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے"

ترلوچن نے پوچھا "پھر؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری ——— کیا نام ہے اس کا ——— مرتھا کر نکل جائے ——— اس لباس میں اسے کوئی پکڑ نہ سکے گا"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے۔ ساتھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ——— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی ——— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، سنبھل کر اس کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ——— اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لڑھکتی، جھٹکے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی ——— پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی "موذیل ——— موذیل"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی بیہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا "جاؤ، دیکھو ——— میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں ——— میرا مطلب ہے وہ....."

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے سے کہا "تم سچ مچ سکھ ہو..... جاؤ دیکھ کر آؤ"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا "میرا میاں بھائی ہے..... لیکن بہت داد اقسم کا..... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے..... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا "اوہ ڈیم اٹ....." یہ کہہ کر اس نے اپنی بھیگی بھیگی بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی "آل رائٹ ڈارلنگ ——— بائی بائی"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی "مجھے جانا ہے اسکو ——— اپنے اس مذہب کو" اور اسکا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

سایہ

غلام عباس

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے رہتے، سبحان کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو ابھی سورج نہ نکلا ہوتا کہ وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اس کنارے لا کھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی عمارت نہیں تھی۔ زمین جھوجھل کی طرح تھی اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا جس میں پیپل کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزلے مکان کے پیچھے سے ابھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پیپل کی چوٹی سے اترنی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں میدان کا احاطہ کر کے، ڈھلوان پر چڑھ کے سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی، تو وہ اپنا ٹھیلہ سڑک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر لا کھڑا کر دیتا۔ اور یوں اس اونچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔ لیکن جب سورج عین سر پر آ جاتا تو ناچار اسے اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے دھکیل کر میدان میں پیپل تلے لے جانا پڑتا جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد جب سورج ڈھلنا شروع ہوتا تو پیپل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے کو سرکنی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پہنچ جاتا جہاں زمین جھوجھل کی طرح تھی اور جہاں اس نے علی الصباح ٹھیلے کو کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں گرمیوں اس کی دکان یوں ہی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔

وکیل صاحب کا مکان اسے دھوپ ہی سے پناہ نہیں دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سرپرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بڑے با اخلاق، ملنسار اور مہمان نواز تھے جب تک گھر پر رہتے ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ کچہری جاتے تو پیچھے بیگم صاحبہ ان کی ہر دلعزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی ملنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اس پر وکیل صاحب کے مؤکلوں کی بیویوں کی خاطر داریاں کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ دن بھر سبحان کے ٹھیلے سے سوڈا لیمن کی بوتلوں، برف، پان، سگریٹ وغیرہ کی تھاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے آخری سرے پر تھا جہاں شہر کی حد ختم ہو جاتی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جگہ مکان خال خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی۔ بھلا دو ایک گھروں کے آسرے پر کون ایک مستقل دکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا سبحان تو اس کی بات دوسری تھی۔ اول تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ نہ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتے دار تھا نہ عزیز۔ گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریاتِ زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہو جاتی

تھیں۔ اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹھیلے والوں اور دوسرے دوکانداروں کی باہمی چشمکوں سے الگ تھلگ اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

وکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انھیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان کرایہ حد سے بڑھا ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا۔ اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انھوں نے اس نواح میں ایک موکل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ کئی برس تک یہ زمین یونہی پڑی رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے تعمیر کے لیے خاصا روپیہ جمع کر لیا۔ آخر جب ان کے حسب منشا مکان بن گیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اٹھ آئے۔ ان کے دم قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دور دور سے تانگے والے ان کے موکلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر کچہری جایا کرتے تھے۔ اس لیے دو ایک تانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی تھوڑی دیر کے لیے ان کے مکان کے نیچے رک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

وکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبحان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکا دکا راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے دو ایک پیسے کی بیڑیاں، گڑ کی ریوڑیاں یا بھنے ہوئے چنے خریدنے شہر جاتے۔ مگر ان سے یافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتیں دوپٹے کو سر اور ٹھوڑی پر بل دیتے، ناک اور منہ چھپائے، اپنی پھدڑی جوتیاں گھسٹ گھسٹ کر چلتیں تو سڑک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سبحان کو سوٹے کی نوکوں پر سے گرد صاف کرنے کے لیے پانی کا ایک اور چھینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں کمر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاکی پاجامہ پہنے ہوتے تھے مگر تلپنی سے کم درجے کا سگرٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا۔ اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برف میں لگے ہوئے لیمن کے اوتھے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جب سبحان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں، کتوں اور فقیر لڑکوں کی معیت میں پیپل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دولہا دلہن سمیت، پسینے میں شرابور، گلے ماتھے اور کلائیوں پر سستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے زبانیں لٹکی ہوئیں، اس پیپل تلے سستانے اور بڑھاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور سبحان کی کئی دنوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

سبحان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا ورنہ اس کی ساری عمر گھر گھر منے پھرنے میں گزر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ نکمے معاش نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیوں ہی دھندے کیے تھے۔ آج اس شہر میں ہے تو کل اس شہر میں۔ کبھی کبھی گھر میں اوپر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چپراسی ہے۔ کبھی ریلوے شاپ میں تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی۔ آزاد مزدوری کو ہر کام پر ترجیح دی۔ مگر جب جوانی گزر گئی۔ اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود کترانے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ

خریدے۔ پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں ٹھیلے پر رکھ کر شہر کا چکر لگانا شروع کیا مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے بددل ہو گیا۔ اوّل تو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور مول تول کرنا اس کی فہم سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکا کھا جاتا تھا۔ پھر مال نہ بکے تو گل سڑ کر باسی ہو کر خراب ہو جاتا۔ اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھرکیاں اور جھڑکیاں سننی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑا اور پان سگریٹ کی دکان پر اکتفا کی۔ اور شہر کا ایک ایسا الگ تھلگ گوشہ تلاش کر لیا کہ جہاں کسی قدر چین سے زندگی کے دن پورے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسرے ہی پر لگائی گئی ہے، اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکید تھی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں مشکی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں، وہ خود اس کا بندوبست کر دیں گے۔ مگر سبحان کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا تھا۔ وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا پلا کے ہمیشہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

یوں بھی وہ ہنس مکھ، لطیفہ گو اور ہمدرد انسان تھا۔ لگائی بجھائی کی عادت نہ تھی۔ اس لیے سب سے خوب بنتی تھی۔ ٹھیلہ لگانے کے ساتھ ہی اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ لمبی کتر دیتا تھا۔ خشخشی بال، ایک تنکوں کی بنی ہوئی مخروطی وضع کی ہلکی پھلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رہا کرتی۔ چار خانہ تہمد، گاڑھے کا کرتا، اس پر خاکی زیبی کا کوٹ۔ اپنی اس وضع سے وہ خاصا دیندار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ صوم و صلوٰۃ سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے سائے میں گذارے تھے، وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کی عادات و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور سبھاؤ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں کیونکہ دوسری چھاتی پر وہ چھنبل لیتا۔ وہ جانتا تھا کہ منجھلی صاحبزادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ چھبیلی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑے نقاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے لینے والوں کو سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ گھر تو گھر اس نے کبھی سیڑھیوں میں بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحبہ ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہیں۔ بڑی صاحبزادیاں اور صاحبزادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ ہارمونیم کون بجاتا ہے۔ وہ پہچانتا تھا کہ جس گھنٹے کبھی رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں سنائی دیا کرتا ہے کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اور نوکر چاکر کس طرح رہتے سہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں۔ لیکن انھیں معلوم کرنے میں اس کی کسی بری نیت کو دخل نہ تھا۔ بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجیے یا دل بہلاوے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ تو لگاؤ ہونا ہی چاہیے تھا ورنہ اس ویرانے میں ایک ایسے شخص کا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، زندگی گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سبحان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو ننھے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے کمی گودوں میں رہتے تھے وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سبحان کی دکان سے اپنی مٹھائی کی گولیاں لینے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لیے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے بڑے دو صاحبزادے علی الصباح سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس۔ ایک ہی طرح کے کوٹ۔ ایک ہی طرح کی ٹوپیاں، ایک ہی طرح کے بستے۔ اسکول روانہ ہونے سے پہلے وہ سبحان سے دو دو پیسے کی چوسنے والی سنگترے کی پھانکیں خریدتے۔ سبحان سب سے پہلے ان ہی کی بوہنی کیا کرتا۔ جس دن انھیں آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی پھانکیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں خرید کے لایا کرتا۔ اور نفع کا خیال نہ کر کے ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:۔

"افضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی نا! دیکھنا آج کیسے کان اینٹھیں گے ماسٹر صاحب!"

اور افضل میاں اس کے سانولے رنگ کو گھور کر کہتے:۔

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا" اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔

ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اس نے پھانکیں خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالے تو سبحان نے پوچھا:۔

"افضل میاں کہاں ہیں؟"

"وہ اماں میاں کے ساتھ گاؤں گیا ہے" لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی اسکول روانہ ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک سبحان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز کھو گئی تھی جو اب مل گئی ہے۔

ان لڑکوں کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رکتا اور کوچوان گھنٹی بجاتا۔ سبحان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انھیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچوان بے صبری سے پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بجارے میں سے بوڑھی ماما چق کو سرکا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی:۔

"ہم لوگ میاں دم لو۔ آتے ہیں ابھی آتے ہیں۔"

یہ سن کر تانگے والا بڑبڑاتا ہوا تانگے سے اتر کر سبحان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے تمباکو کے دو سگریٹ خریدتا۔ یا سونف ملٹھی والا پان بنوا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اترتیں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ برس، اس سے چھوٹی کی سولہ برس اور اس سے چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے سر پر وضع کے برقعے، ایک کتھئی رنگ کا، ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا۔ تینوں کے پاؤں میں سینڈل۔ دو بڑی بہنیں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں۔ اور چھوٹی بہن اور ماما

اگلی سیٹ پر۔ اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ماما سیر بھر برف کا ٹکڑا کر کے تھرمس بوتل میں بھروا لیتی۔ وہ اپنے لیے سبحان سے ایک برابر کا پان بھی بنواتی۔ جس میں وہ بہت سا کالا تمباکو ڈلوایا کرتی۔ کبھی کبھی منجھلی صاحبزادی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی تو وہ کھانے پانی کا ایک آدھا ماما سے منگوا کے پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمشاد وکیل صاحب کے دونوں بڑے صاحبزادے موسم گرما کے ہلکے پھلکے سوٹ پہنے، اپنی اپنی سائیکل کندھے پر اٹھائے سیڑھیوں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ سڑک کو پار کر کے سبحان کے ٹھیلے کے پاس آ کھڑے ہوتے سبحان انھیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گرما گرم بحث میں الجھے رہتے کہ سبحان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ سبحان کے کچھ بھی پلے نہ پڑتا۔ ان کے جوش و خروش تیز لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی اہم اور دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سبحان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا:۔

"شمی۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا اغلاطون.....؟"

"لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا غور فرمائیے کہ ارسطو.....؟"

"شمی میں کہتا ہوں تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ.....؟"

"وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں.....؟"

"یہ سراسر ہٹ ہے تمہاری شمی.....؟"

"بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب.....؟"

"شمی.....؟"

"بھائی جان.....؟"

"شمی.....؟"

"بھائی جان.....؟"

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ ہاکی کھیلنے جاتے۔ ہاکی کھیل کر آتے۔ جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے، یہ بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا۔ ایسے موقعوں پر سبحان نظریں نیچی کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ نوجوان تھا۔ صحت و توانائی کا مجسمہ۔ بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید چہرہ، شربتی رنگ کی آنکھیں، بھورے گھنگھریالے بال۔ شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اور سبحان نے بارہا یہ محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور یہ شمشاد کی سعادتمندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

سبحان ان کے لیے حسب معمول دو کرائے دیسی پان چن کر نکالتا اور ان پر چونا کم اور کتھا زیادہ لگا کے انھیں بیچنے کے لیے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بحث کے دوران میں اس سے جھاڑن مانگتے۔ اور بائیسکلوں کو بھی جھاڑتے پونچھتے جاتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پہیے میں ہوا کم ہوتی تو وہیں سے ملازم لڑکے شبیر کو آواز دے کے پمپ منگوایا جاتا اور پہیے میں ہوا بھری جاتی۔ مگر اب بھی کیا مجال کہ بحث لمحہ بھر کے لیے بھی رکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگریٹ کی دو ڈبیوں میں تھینی کے پانچ پانچ سگریٹ پہلے ہی ڈال رکھتا۔ اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ، سگریٹ سلگا، بائیسکلوں پر سوار ہو، تیز تیز پیڈل مارتے ہوئے کالج روانہ ہو جاتے مگر بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رکتا۔ اور سبحان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے کچہری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا ٹھیکہ وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے باہر میں کھڑا ہوتا۔ وہ پہلے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیروانی پہنے، سر پر مشہدی پگڑی باندھے، چھڑی لٹکتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھرکم آدمی تھے مگر چاق و چوبند، فرانسیسی تراش کی داڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے قناعت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ کثرتِ اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں ایک آدھ بات کرنا خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے:۔

"بھئی سبحان آج کل خربوزے بڑے پھیکے آ رہے ہیں"

"ہم بھی تو کھٹے ہیں سرکار"

"سچ کہتے ہو" یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ جاتے۔ اور سبحان معمول کے مطابق پان، تھینی کی ڈبیا، دیا سلائی کا بکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر تھوڑا سا چونا رکھ کر، کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے، تانگے کے پاس جا کر یہ چیزیں انھیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا مختار بھی فائلیں لیے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لیے پان میں بہت سی سوانگ ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم کے بہت سے ملنے والوں کو بھی جاننے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پہر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کا تانگہ آ کے رکتا وہ لاحم جوس، دس بھری وغیرہ کی بوتلیں پہلے ہی سے دھو دھا کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اسے پتہ تھا۔ اتوار کے روز قصوہ ڈاکٹر علیم الدین یا خیر اللہ جانا والے کے خاندان آیا کرتے۔ موخر الذکر وکیل صاحب کے دور کے قرابت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح کثیر الاولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آ جاتے۔ اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی بزازی کی دکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا۔ اور کبھی وہ اسے واپس اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا۔ جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

سبحان، مختار اور شمشاد کے بعض دوستوں کو بھی جانتا تھا جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا اس لیے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سُرخ و سفید نہ تھی، تاہم اس کی ملاحت میں ایک خاص بانکپن تھا۔ متبسم چہرہ، زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے ٹھیلے کے قریب، جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین بالمقابل سڑک کے دوسرے کنارے ہوتا، یہ تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھامے، رخصت سے پہلے کچھ دیر باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا پھر تو بحث طول ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سبحان سے بار بار پان اور سگریٹ لیے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا مگر رخصت نہ ہو پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گزر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا، بار بار ایک رنگین سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا، جسے سبحان کی کن انکھیوں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے، سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایکدم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھی ماما کے علاوہ وکیل صاحب کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دکان پر سودا لینے آیا کرتے۔ ان لوگوں کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سبحان ٹوہ لگا لیتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں۔

وہ شبیر سے ہنس کر کہتا:۔

"پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑھائی میں"

شبیر حیران ہو کر پوچھتا:۔

"کیا کہا تم نے؟"

"زیادہ ہو نہیں ہم سے، سب خبر ہے ہمیں"

شبیر اب بھی لاعلمی ظاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں۔ اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اسے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سارے بچے ان ہی کی گود میں پلے تھے۔ اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی رشتہ دار ہی تھا۔ ان بچوں سے انھیں دلی محبت تھی۔ اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں دخل دینا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا:۔

"نوج جوان لوگوں میں رشتہ ہو۔ مجھے تو یہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے" پھر ذرا تامل کر کے کہتیں: "گھبراؤ نہیں۔ وہ دن بھی آ جائے گا۔ چاند سی بیٹیاں ہیں میری ——"

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں ٹھہری۔ ایسے ہی کسی موقع پر وہ افضل میاں سے کہتا:۔

"شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا!"

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوتی ہوتی تو افضل بیان شہا کر چل دیتے۔ یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے:۔

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا"

ایک دن ایسے ہی موقع پر جبکہ کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی پان لینے آئیں۔ ان کا سانس پھولا ہوا تھا مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سبحان نے ان کی طرف منتظرانہ نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پڑیں:۔

"کسی سے ذکر وکر نہ کیجیو خبردار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی"

"کب؟"

"ابھی ابھی"

"کون لوگ ہیں؟"

"شہر کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی۔اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھیو۔ سو دشمن ہیں سو دوست، میں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہہ دیا ہے۔ تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے بھی نہیں۔ نوکروں سے بھی نہیں.....؟"

اس کے دو تین ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی کی بات کی تصدیق کر لی۔ حویلیوں میں میل جول بڑھنے لگا۔ عورتیں تو آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے۔ اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا صاحبزادہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ خاصا قبول صورت تھا مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بی نے کہا "امتحان کی فکر ہے بچارے کو" سبحان کو نام بھی معلوم ہو گیا۔ جمیل احمد۔ قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لے گا تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لیے بڑی سرعت کے ساتھ جو زیورات و ملبوسات وغیرہ تیار کرائے جا رہے تھے سبحان کو ان کی ایک ایک تفصیل کا علم تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ آ کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے۔ اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے وہ رنگین سایہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو! یہ بات اسے کسی نے نہیں سمجھائی تھی۔ اور سمجھاتا بھی تو کون۔ کیونکہ وکیل صاحب یا گھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اس نے مختلف زبانوں سے اس کے بارے میں مواد حاصل کر کے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گذاری تھی۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ بڑی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے۔ ایک دن دیکھا کہ تانگے میں سوار ہوتے ہوئے وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی۔ بلکہ دوسری وجہ سے گھر ہی میں رہی۔ مگر اسی شام کو جب مختار اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے۔ اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے سائے کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ بے چین دیکھا۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا تھا۔ طرح طرح کی اجناس تانگوں میں لد لد کے آ رہی تھیں۔ طرح طرح کا فرنیچر۔ سنگھار میز، پلنگ، کرسیاں، تپائیاں، تانبے اور پیتل کے

برتن جتنے تھے گرنے جانے کا بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں مہمانوں کی وہ ریل پیل تھی کہ سبحان کو دکانداری سے عمر بھر کی بھی فرصت نہ ملتی تھی مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا تھا اس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی۔ اور اسے ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔ وکیل صاحب اب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے:۔

"سبحان ہم تمہارے لیے بھی ایک جوڑا سلوائیں گے۔ برات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا"

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں مگر یہ مژدہ بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکا۔

ایک روز علی الصباح سبحان نے ابھی ٹھیلہ سڑک کے کنارے لا کے کھڑا کیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد کندھے پر بائیسکل اٹھائے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی داڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔

"کہئے شمشاد میاں صبح صبح کدھر کی تیاری ہے؟" سبحان نے پوچھا۔

"کہیں نہیں، ذرا ڈاکٹر کو بلوانے جا رہا ہوں" شمشاد نے جواب دیا۔

"خیر تو ہے؟" سبحان نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں خیر ہی ہے" یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز تیز پاؤں مارتا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تاکہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزادے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت یکدم خراب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رکی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا سبحان اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا تھا مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اسے جرأت نہ ہو سکی۔ اور وہ اور بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ بڑی بی یا شبیر کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ تانگہ آیا جس میں بیٹھ کر لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں مگر بڑی بی نے اسے اوپر ہی سے "آج نہیں جانا ہے" کہہ کر لوٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شبیر بوت لینے آیا تو اس سے سبحان کو معلوم ہوا کہ بڑی صاحبزادی کو سرسام ہو گیا ہے۔ مگر زیادہ فکر کی بات نہیں۔ ڈاکٹر دو گھنٹے بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کے بھی اسے جرأت نہ ہوئی۔ اس دفعہ بڑی بی پان لینے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ حالت میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

اس روز وکیل صاحب کچہری نہیں گئے۔ تیسرے پہر لڑکی کا ہونے والا شوہر جو خود بھی ڈاکٹر تھا، اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹے تک اس کے پاس رہا۔ اور لوگ جو بھی کی خبر کو آئے انہیں جلد ہی رخصت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور مختار کالج سے جلد ہی واپس آ گئے تھے۔ شام کو وہ باقی کھیلنے نہیں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹھیلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا۔ تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں ابھی افاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج رات خیریت سے گزر گئی تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

سبحان کی نظر بے اختیار دوسری منزل پر چھتوں کی طرف اٹھ گئی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے سوا وہ کچھ اور نہ دیکھ سکا۔ تھوڑی دیر میں دیا غل رخصت ہو گیا۔

شمشاد نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا:۔

"برف اور لا رکھنا شاید رات کو ضرورت پڑ جائے"

"فکر نہ کیجئے میں نے من بھر برف پہلے ہی سے منگوا رکھی ہے"

سبحان رات کو فرما تو بجے دکان بڑھا دیا کرتا تھا مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک دکان جمائے رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازمین سے برابر بچی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تھی تو زیادہ بگڑی بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے حسب معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کر لیٹ رہا مگر آنکھوں میں نیند غائب تھی۔ کان وکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اونگھنے لگا تھا تو اچانک ایک طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اندر وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کی طرف جا کر دیکھا مگر گھر میں خاموشی تھی۔

اس نے اینٹ پھینک کر کتے کو بھگا دیا۔

سہارے کی تلاش

حیات اللہ انصاری

ریاست منی پور کے راج محل کے شاندار باغ میں مہاراجہ کی سالگرہ منائی جا رہی تھی اور ریاست کے چوٹی کے عہدیدار، اعلیٰ افسر، جاگیردار اور معززین اکٹھے تھے۔ سالگرہ کی رسوم ادا ہو چکی تھیں، ایٹ ہوم بھی ختم ہو چکا تھا، اور اب مہمان گھوم پھر کر ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

مسٹر جان فارسٹر جو ریاست کا نیا انگریز وزیر داخلہ تھا مہاراجہ کو مبارکباد دینے کے بعد صدر میں لگے ہوئے زرتابی شامیانے سے نکل کر ایک جاگیردار مسٹر جوشی سے باتیں کرنے لگا۔ وزیر داخلہ کو دیکھ کر انسپکٹر جنرل پولیس اور چند اور معززین اکٹھے ہو گئے۔ فارسٹر باتیں تو ان لوگوں سے کر رہا تھا لیکن اس کے کان اس کھوج میں تھے کہ عفت اور عصمت کے تذکرے کس کس طرف ہو رہے ہیں۔ اتنے میں اسے ذرا دور پر ایک زنانی آواز جوش میں بھری ہوئی سنائی دی۔

"جس دیس میں اس کی بیٹیوں کی لاج محفوظ نہ ہو وہ مٹ جائے تو اچھا ہے۔"

پھر ایک مردانی آواز سنائی دی۔

"اتنا مبالغہ نہیں کرتے مالتی!"

مردانی آواز میں ایسا التجا بھی تھی کہ ایسی باتیں کم سے کم یہاں تو نہ کرو۔

مالتی نے جواب دیا۔

"میں اتنا جانتی ہوں جیا جاتی کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔"

شاید کسی نے چپکے سے کہا کہ مسٹر فارسٹر پاس ہی کھڑے ہیں۔

مالتی نے چہک کر جواب دیا۔

"جس کا جی چاہے سن لے میں سچ بات کہنے سے نہیں رک سکتی۔"

مسٹر فارسٹر ہندوستانی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے، یہ سب باتیں سمجھ گئے اور جوشی سے کہنے لگے۔

"آج کل عفت و عصمت کی باتیں بہت ہو رہی ہیں"

"کچھ نہ پوچھئے۔ ہر طرف اسی کا چرچا ہے"

فارسٹر کے لہجے میں تلخ غصہ موجود تھا جو دبایا جانے پر بھی چھلک آیا تھا۔ اب تو فارسٹر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب بھی عصمت کا تذکرہ سنتا تھا تو یہ محسوس کرتا تھا کہ سوامی کا مرد برت بھیس بدل کر مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ ایسے لمحے برداشت کرتے کرتے وہ اپنے سینے میں ایک ڈائنامیٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

دوسری جنگ عالمگیر جاری تھی اور ہندوستان میں رنگروٹ بھرتی کر کے چند ہفتوں کی تربیت دے کر محاذ پر بھیجے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک فوجی ماہر نے یہ دریافت کیا کہ ریاست منی پور کے پہاڑ اور جنگل ایک خاص قسم کی جنگی تربیت کے لیے بہت موزوں ہیں۔ حکومت ہند نے مہاراجہ سے ٹیلی فون پر رسمی اجازت لی اور چند ہفتوں کے اندر اندر ضروری انتظامات کر کے وہاں تربیتی کیمپ کھول دیا گیا۔

تربیتی کیمپ اپنے ساتھ مسٹر فارسٹر کو بھی بحیثیت ریاست کے وزیر داخلہ کے لیے آیا۔ مسٹر فارسٹر کو انگلستان سے آئے صرف ۵ سال گزرے تھے لیکن اس نے اپنے کو اس تھوڑے سے عرصے میں بہت کامیاب سول لین کر دکھایا تھا۔ اس نے سرحد کے ہنگاموں کو فرو کرنے میں ایسی ہوشیاری دکھائی تھی کہ حکومت اس کی انتظامی قابلیت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ فارسٹر ایسے ہندوستانیوں کے مزاج دان انگریز ہندوستان میں بہت کم ہیں اس لیے حکومت کو بھروسہ تھا کہ مسٹر فارسٹر ریاست میں کوئی بات ایسی نہ ہونے دے گا جس سے کیمپ کے کاموں میں رکاوٹ پڑے۔

منی پور کی جس وادی میں کیمپ کھولا گیا تھا اس سے دو دو تین تین میل کے فاصلے پر تین چار گاؤں واقع تھے۔ کیمپ کھلنے کے چند ہی روز کے بعد مسٹر فارسٹر کو معلوم ہوا کہ راتوں کو فوجی ان گاؤں میں اچانک گھس جاتے ہیں اور وہاں کی عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ مسٹر فارسٹر نے یہ شکایت فوجی ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی۔ تیسرے دن وہاں سے رسمی جواب آ گیا کہ "ضروری کارروائی کی جائے"۔

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد دس پندرہ فوجیوں نے ایک گاؤں پر چھاپہ مارا اور وہاں سے چند عورتوں کو اٹھا لے گئے۔ یہ عورتیں بہت بری حالت میں جنگل میں پڑی ہوئی ملیں۔ ان بیچاریوں کو ان کے عزیز اٹھا لائے۔ اسی دن شام کو ان میں سے ایک عورت نے جس کا نام سینا تھا موقع پا کر غیرت کے مارے خودکشی کر لی۔ اس خودکشی سے گاؤں والے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ریاست کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رو رو کر فریاد کی۔ جواب میں ان سے کہہ دیا گیا کہ وزیر داخلہ نے فوجی ہیڈ کوارٹر کو لکھا ہے کہ ایسی حرکتوں کا سدباب کیا جائے اور ہیڈ کوارٹر نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ وعدہ جلد پورا ہو گا۔ یہ جواب سن کر گاؤں والے واپس چلے گئے اور بظاہر بات ختم ہو گئی۔

لیکن دو ہفتوں کے گزر جانے کے بعد ایک سوامی نے درخواست دی کہ مجرم فوجیوں پر جلد سے جلد مقدمہ چلایا جائے اور اس سلسلے میں انھوں نے مسٹر فارسٹر سے ملاقات کی خواہش کی۔ فارسٹر نے سوچا کہ وہ فوجی جنھوں نے ایسی حرکت کی تھی اپنے دستے کے ساتھ ریاست سے جا چکے ہیں اور اب تک وہ برما یا افریقہ یا یورپ کے محاذ پر بھیجے جا چکے ہوں گے۔ ایک معمولی سے سوامی کی بھٹ پوری کرنے کے لیے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ محاذ پر لڑتی ہوئی ایک پوری فوج کو بلا لیا جائے اور اس طرح لاکھوں روپوں کا خرچ اور فوجیوں کی عام بددلی مول لی جائے۔ فوجیوں کی بددلی اور ایسے زمانے میں جب کہ ان میں جنگ سے اکتاہٹ پھیل رہی تھی اور ان کی دل دہی کی حد سے زیادہ ضرورت تھی!! ظاہر ہے کہ یہ ان ہونی بات تھی۔ فارسٹر نے یہ سوچ کر سوامی سے ملنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن سیکرٹریٹ نے سوامی جی کا ایک خط فارسٹر کو دکھایا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اگر مجرموں پر دو دن کے اندر مقدمہ نہیں چلایا گیا تو میں مرن برت رکھوں گا۔

یہ خط پڑھ کر مسٹر فارسٹر نے کہا۔

"کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟ مسٹر گاندھی نے ابھی جو اکیس دن کا برت رکھا تھا اس کے پیچھے ایک طاقت تھی کیونکہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے اسے مہاتما سمجھتے ہیں اور پوجتے ہیں۔ لیکن ایک ادنیٰ سوامی جسے اس ریاست ہی کے بہت تھوڑے سے لوگ جانتے ہوں، وہ بھوجن کرے یا بھوکا رہے، زندہ رہے یا مر جائے، منہ کالا کر کے کہیں نکل جائے یا پھاڑے گلے کر خودکشی کرے۔ پبلک پر اس کی ان بچی باتوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور حکومت اس سے کیوں دبے گی؟ سوامی یا تو سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے یا پاگل ہے ——"

فارسٹر سے سوامی نے عورت کی لاج کے نام پر اپنی ذاتی اور اسی کی رکھوالی کے لیے وہ جان دینا چاہتا تھا۔ عورت کی لاج!! جس دنیا میں ہر طرف آوارگی اور بدخلقی ہو، جہاں پاک دامنی نام ہو صرف نامسرتی اور سماج کے خوف کا، جہاں پاکباز مرد ایسے موقعوں پر جہاں بدنامی کا اندیشہ نہ ہو کبھی نہ چوکتا ہو جہاں وفادار بیویاں دل کی خلوتوں میں آزادی سے غیر مردوں سے ہم بستر ہو جاتی ہوں، وہاں ایک ادنیٰ لڑکی کی عصمت کے لیے اتنا اودھم!! یہ حرکت صرف احمقانہ اور بے نتیجہ آدرش پرستی ہے ——— سیتا نے خودکشی کر لی حماقت کی اگر وہ جیتی تو اس کا مستقبل ماضی سے بڑا تو نہ رہتا۔ ایک مرد اسے مسترد کر دیتا تو دوسرا پسند کر لیتا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے ———

سوامی نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔ یعنی دو دن کے بعد مرن برت شروع کر دیا۔ فارسٹر نے جنگ کے زمانے کے اختیارات سے کام لے کر اخباروں کو برت کی خبریں چھاپنے کی ممانعت کر دی، اور اس سلسلے میں ہر قسم کے جلسے اور جلوس خلاف قانون قرار دے دیئے اور پھر اس واقعہ کو اس نے اپنے ذہن سے نکال پھینکا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر رہا تھا کہ ایک دم سے سیتا ہر ہر گھر میں عفت و عصمت کی دیوی بن کر نمودار ہو گئی۔ شاعروں نے اس کی شان میں نظمیں اور کویوں نے کویتائیں کہیں۔ گویوں نے وہ گائیں اور اخباروں میں چھپیں۔ اخباروں میں عصمت پر مضامین نکلنے لگے۔ کسی مصور نے سیتا کی ایک فرضی تصویر بنا دی جو ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگی۔ ہر ہر گھر ہر ہر مجلس اور ہر ہر آفس میں یہ بحثیں ہونے لگیں کہ عصمت بہت ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ یہ نہ رہے گی تو سماج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر شوہر بیویوں پر بھروسہ کیسے کریں گے؟ کنواری لڑکیوں کے جو بچے ہوں گے ان کو پالے گا کون؟ اس طرح کے درجنوں سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جو گھوم پھر کر کسی نہ کسی راستے سے جواب کی تلاش میں فارسٹر کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ہندوستانیوں کی احمقانہ آدرش پرستی پر ہنستا اور ان سوالوں کے جواب موقع اور محل کا لحاظ کر کے کوئی چبھتا ہوا فقرہ کس دیتا تھا۔ لیکن جب ان سوالوں کا اور عصمت کی عظمت پر بحثوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تو فارسٹر کو کچھ پریشانی ہونے لگی کہ سوامی کے برت کے اس غیر مخلصانہ حملے کو کیسے روکا جائے۔

جوں جوں فارسٹر کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہر خاموش ہونٹ اور ہر چار ہونے والی آنکھیں اسی مسئلے پر اس سے بحث کرتی ہیں اور اس سے متعلق سوالوں کو اس سے پوچھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ فارسٹر کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ عصمت

کے مسئلے کا حوالہ دے دیتا تو فارسٹر اندر ہی اندر کھول جاتا۔ اور غصے کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

آج سوامی کے برت کو پانچ ہفتے گذر چکے تھے۔

مسٹر جان فارسٹر کا ریمارک اور مسٹر جوشی کا جواب سن کر انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا۔

"ہر جگہ یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ بازار، کلب، اسکول، کالج، بار، غرضیکہ ہر جگہ یہی مسئلہ زیر غور ہے، شادیوں اور غمیوں میں بھی یہی باتیں ہو رہی ہیں"

فارسٹر: ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کے سب کام رکے ہوئے ہیں اور جب تک عصمت کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا ہے زندگی کی گاڑی ایک دم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی"

فارسٹر کے اس فقرے پر ایک باتمیز قہقہہ لگا۔

فارسٹر: (ذرا اونچی آواز میں) میں جانتا ہوں کہ عصمت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن بعض چیزیں اہمیت میں اس سے بدرجہا زائد ہیں۔ آج مہذب ملکوں میں وطن پر ہر ہر چیز قربان کی جا رہی ہے۔

انگریز مہمانوں کے لیے ایک میز الگ لگا دی گئی تھی جس پر شراب اور سور کے گوشت کے کباب اور انگریزوں کے پسند کی دوسری چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ فارسٹر گفتگو ختم کر کے ادھر گیا اور وسکی کا ایک بڑا سا پیگ لے کر اس نے ایک گھونٹ پیا۔ اتنے میں پاس سے آواز آئی۔

"مسٹر فارسٹر! کیا آپ سوامی کے برت کا مقابلہ اسی طرح کرتے رہیں گے خواہ وہ مر جائے؟"

اس سوال کے پوچھنے والی پیس لیب تھی جو ریاست کے ایک سابق انگریز دیوان مسٹر جیمس لیب کی اکلوتی بیٹی تھی۔

فارسٹر: مس پیس اگر کوئی شخص مرنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

پیس: جس طرح آپ اس برت کا اور اس کے پس منظر میں ہندوستانیوں کے جو دنیاوی اقدار ہیں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں میں اسکی تعریف نہیں کر سکتی۔ ونڈرفل۔

فارسٹر: تھینک یو۔

پیس: آپ نے مجھے ایک بہت بڑی چیز بتا دی۔ وہ یہ کہ مغرب کی ٹھوس حقیقت پسندی اور دنیاوی سوجھ بوجھ کیسی ہوتی ہیں۔ اور وہ ہندوستان کے دنیاوی اقدار کا مقابلہ کس خوبصورتی سے کر سکتی ہیں اور ان کو اپنی جگہ نقل و حرکت سے کس طرح پاش پاش کر سکتی ہیں۔

مس پیس حسین کسی پہلو سے نہ تھی۔ بہت معمولی صورت تھی اس کی، بال تھوڑی سی لہروں کے ساتھ کندھوں پر ریشم کے پھول کی طرح جھول رہے تھے۔ آنکھوں میں ساکن تال کی نیلاہٹ تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے تھے جو اس وقت جوش اور جذبے سے کانپ رہے تھے۔ گالوں پر بیماری کا سایہ تھا۔ چہرے پر کچھ ایسا بھولا پن اور ناتجربہ کاری تھی کہ وہ باوجود ۲۵، ۲۶ سال کی ہونے کے بیس سال کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ مس پیس کا باپ پندرہ سال ریاست کا دیوان رہ کر مر گیا تھا۔ مہاراجہ نے اس کی خدمات کے صلے میں اس کے خاندان کو ایک جاگیر دی تھی لیکن یہ شرط لگا دی تھی کہ یہ جاگیر اس وقت تک اس خاندان کے پاس رہے گی جب تک کہ وہ ریاست میں مستقل سکونت رکھے۔ کچھ

اس جائداد کی وجہ سے اور کچھ میں کی صحت کی مستقل خرابی کی وجہ سے یہ خاندان اسی ریاست میں بس گیا تھا۔

پھر میں کہنے لگی۔

میں مجھ سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مجھے ایک سپنا نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی انگلستان سے کوئی نہ کوئی انگریز ایسا ضرور آئے گا جو مجھے سچا انگریز بنا دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری پیدائش انگلستان کی ہے! جی ہاں۔ میں چار سال کی تھی جب پاپا کے ساتھ وہاں سے آئی تھی ——— لیکن میری زندگی بیماری کے بستر پر گزری۔ پڑے پڑے میں سوچا کرتی تھی کہ مغرب کی وہ کونسی خصوصیتیں ہیں جن سے اس نے دنیا فتح کر لی ہے۔ لیکن میرا مطالعہ صرف ہندوستانیوں سے تھا۔ وہ انگریزی بولتے تھے اور ماڈرن انگریزی مصنفوں کی باتیں کرتے تھے لیکن مجھے سب کے سب دقیانوسی اقدار کے پجاری۔ کچھ ان کے اثرات، کچھ گاندھی کی شہرت اور اس کی تحریریں، ان چیزوں نے مجھے فتح سا کر لیا۔ لیکن اندر ہی اندر میں اس ذہنی غلامی سے گھبراتی تھی اور اس جال کو توڑنے کے لیے اپنی قوم کی طرف دیکھتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی انگریز آ کر مجھے اس دلدل سے ضرور نکال لے گا۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ سوامی کے برت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں اور اس کے خیالات اور عمل کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں اور اپنے مغربی اقدار پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں تو میں نے اپنے سے کہا ہے پیس، وہ آ گیا!"

فارسٹر کو ایک دم خیال آیا کہ پیس دو ہفتوں سے انگریزی کلب میں میرے گرو چکر کاٹا کرتی ہے۔

فارسٹر : مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے خیالات سے آپ کو کچھ فائدہ پہنچا۔

پیس : فائدہ سا فائدہ ——— ہاں میری ایک تمنا اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی قوم کی کچھ خدمت کر سکوں۔ افسوس میری طویل بیماری نے میرے جسم کو کمزور بنا دیا ہے۔ اور میری کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہو سکی ہے۔ اس لیے نہ میں جسمانی خدمت کر سکتی ہوں اور نہ دماغی۔

فارسٹر : گھبرائیے نہیں۔ آپ کو بھی کبھی نہ کبھی کوئی موقع مل ہی جائے گا۔

پیس کی باتیں سن کر فارسٹر کی خود اعتمادی اک دم سے دگنی بلکہ چوگنی ہو گئی۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے خیالات نے جلد ہی کہ وہ ایک عقلمند لڑکی کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر بن گئے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں ایک بڑے مشن کو پورا کر رہا ہوں جو مغربی تہذیب نے مجھے سونپا ہے یعنی ہندوستان کو اعتقاد آدرش پرستی کی جگہ مغربی حقیقت پسندی عطا کرنا۔

(۲)

سوامی کچھ نہ کچھ چھپ کر ضرور کھا لیتا ہوگا۔ اس لیے وہ مرے گا نہیں۔ سوامی اپنے برت کو مجھ پر کارگر ہوتا ہوا نہ دیکھ کر ضرور توڑے گا۔ وہ نہ توڑے گا تو اس کے بھگت اصرار کر کے تڑوا دیں گے۔

یہ تھیں فارسٹر کی قیاس آرائیاں جو سب کی سب غلط ثابت ہوئیں۔ اور سوامی دو مہینے پورے کرنے سے پہلے ہی چل بسا۔

سوامی کے مرنے سے پہلے ہی شہر کے حالات بگڑ چکے تھے۔ چار مقامی اخباروں میں سے دو کو باغیانہ تحریروں کے الزام میں بند کرنا اور دو کو بھاری قیمت پر خریدنا پڑا تھا۔ ایک شاعر کو اس جرم پر کہ اس نے برت کی خوبیوں پر ایک نظم ایک صحبت میں پڑھ دی تھی دو سال قید بامشقت کی سزا دینا پڑی تھی۔ شہر کے کچھ نوجوانوں نے کئی بار جلسے کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان جلسوں

کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا تھا۔ ایک بار تو انھوں نے 'سیتا ڈے' منا کر خلاف قانون جلوس نکال لیا تھا جسے منتشر کرنے کے لیے ایسا سخت لاٹھی چارج کرنا پڑا کہ کچھ آدمی مر گئے اور سو سے اوپر زخمی اسپتال پہنچائے گئے۔ آخری ہفتے کے اندر اس چھوٹے سے شہر میں تیس ہندوؤں کو گرفتار کر کے بلا مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دینا پڑا تھا۔

فارسٹر سوامی کے برت کے چوتھے ہفتے کے بعد ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ عصمت اس کی صف میں انتشار پھیلا رہی ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی صف کے لوگوں کے جذبات بھی سوامی کی صف میں شامل ہو رہے ہیں اور اس کی حکومت صرف ان کے ہاتھ پاؤں پر رہ گئی ہے۔ 'سیتا ڈے' کے موقع پر شہریوں نے دن بھر کا برت رکھا تھا۔ اس دن رات کو فارسٹر کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ بڑے بڑے سرکاری افسروں کی بیویوں اور بیٹیوں نے بھی اس دن 'خواہ مخواہ عصمت' کی بنا پر دن بھر کا فاقہ کیا تھا۔

فارسٹر اوپر سے تو بالکل ویسا ہی مضبوط تھا جیسا اول دن تھا، لیکن اس کے اندر ایک طوفان اٹھتا رہتا تھا جس کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ جب وہ لوگوں کو اس جرم پر سزا دیتا تھا کہ وہ عصمت کی صورت سے زیادہ حمایت کرنے کی وجہ سے بغاوت کے مرتکب ہو گئے ہیں، یا نہتے مجمع پر لاٹھی چارج کراتا تھا تو اسے اپنے آپ کو اس سخت کام کے لیے پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا پڑتا تھا۔ اور کام ختم ہونے کے بعد دیر تک اپنے آپ سے بحث کرنا پڑتی تھی کہ میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اور آخر کار اسے وہسکی کی آڑ میں چھپ کر اس بحث سے جان چھپانا پڑتی تھی۔ دن بدن یہ تیاری اور یہ بحث اور یہ آڑ لے کر چھپنا، یہ سب کام مشکل سے مشکل تر ہوتے جاتے تھے۔

ایک دن فارسٹر کو یہ رپورٹ ملی کہ ایک ادنیٰ سی رنڈی نے یہ کہہ کر 'سیتا فنڈ' میں چندہ دیا ہے کہ اگرچہ میں خود عصمت کی خریدار ہوں، لیکن خوب جانتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے اور اس کی رکھشا کتنی ضروری ہے۔ یہ رپورٹ پا کر فارسٹر اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ واقعی یہ چیز جس کا نام عصمت ہے، ایسی ہی ضروری ہے کہ لوگ اس کے اتنے دیوانے ہو جائیں! لیکن اس سوال نے اس کے دماغ کو خیالات کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھا دیا جس کا اسے کوئی اور سرا نہ ملا ———

ایک رات فارسٹر نے پولیس کے دو افسروں کو سادے کپڑوں میں ساتھ لیا اور معمولی شہریوں کی طرح سوامی سے ملنے پہنچ گیا۔ وہاں وہ خود کچھ نہیں بولا۔ پولیس کے افسر باتیں کرتے رہے۔ سوامی نے اپنے برت کا مقصد بتایا اور پھر کہنے لگا۔

"یہ سمجھنا کہ یہ برت کسی شخص کی مخالفت میں ہے، بہت سخت غلطی ہے۔ عصمت کی رکھشا کرنا حکومت پر فرض ہے، اور وہ اس فرض سے اسی وقت پہلو تہی کر سکتی ہے جب حق اور انصاف کا اثر سماج پر کم ہو جائے۔ میں اپنے برت سے حق اور انصاف کو جگانا چاہتا ہوں۔ وہ اگر جاگ اٹھے تو دل بدل جائیں گے۔ برے اچھے ہو جائیں گے، اور جو اچھے نہ ہوں گے۔ سماج ان کی رائے کو مانے گا ہی نہیں؟

پھر سوامی کہنے لگا "جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں وہ بھی عورت کی لاج کی قیمت جانتے ہیں۔ پھر میں ناحق پر کیسے ہو سکتا ہوں؟"

فارسٹر نے سوامی کے الفاظ سے زیادہ اس کے دل کو محسوس کیا۔ وہاں واقعی اس کے خلاف یا کسی اور کے خلاف ذرا بھی نفرت نہیں تھی۔

اس ملاقات نے فارسٹر کو اور کمزور کر دیا۔ جو شخص تم سے نفرت کرتا ہو یا تم سے ڈرتا ہو یا تم کو غصہ دلاتا ہو، اس کے سینے پر نشانہ باندھنا اور گولی مارنا آسان ہے لیکن جو شخص نہ نفرت کرتا ہو، نہ ڈرتا ہو، نہ غصہ دلاتا ہو، بلکہ الٹا اپنے طریقے سے تمہارا بھلا چاہتا ہو اس پر نشانہ باندھنا یا گولی مارنا آسان کام نہیں، مشکل اور بہت مشکل ہے۔

سوامی مر گیا اور مر کر ایک سخت مسئلہ چھوڑ گیا وہ یہ کہ سب شہر والے مل کر اس کی ارتھی اٹھانا چاہتے ہیں، اس بات کی ان کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے ملکی انتظام کی زبان میں یہ سوال یوں اٹھتا تھا کہ عوام کو پہلے ڈھیل دی جائے اور پھر ان کے گلے میں پھندا کسا جائے۔ یا شروع ہی سے پھندا کس دیا جائے!

سوامی کے مرنے سے عصمت کا معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔ ریاست کے عوام کی حالت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ ندیدی بلی کی طرح ان کی عورتوں کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس لیے عوام قدرتی طور پر اپنی عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لیے سربکف ہیں۔ غم و غصہ کا ایک آتش فشاں سلگ رہا تھا اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے پیٹ میں کتنا لاوا بھرا ہے۔

فارسٹر تذبذب میں تھا کہ کیا کروں۔ عوام کو شروع ہی سے دباؤں یا پہلے ڈھیل دے دوں پھر دباؤں۔ لیکن انگریزی کلب میں ایک بات ایسی ہو گئی جس نے فارسٹر کو سہارا دے دیا اور اس سہارے سے اس نے اپنا تذبذب ختم کر دیا۔ کلب میں ریاست بھر کے انگریز موجود تھے اور سب کے سب جلوس کے نام سے بہت خوفزدہ تھے۔ سب یک زبان تھے۔ وہ یہ کہ ہم کو گاندھی والوں کے عدم تشدد پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ کیا معلوم وہ کس وقت تشدد پر اتر آئیں!

ایک میم نے کہا:۔

"فرض کرو جس وقت جلوس نکل رہا ہو اس وقت گاندھی والوں کا افسر اپنے آدمیوں کو بزن کا حکم دیدے اور ایکدم لاکھ دو لاکھ غنڈے ہم پر ٹوٹ پڑیں، تب مسٹر فارسٹر تم کیا کرو گے؟"

کپتان ڈرجٹ جو اپنی چھٹیاں گذارنے حال ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس منی پور آیا تھا، کہنے لگا:۔

"مسٹر فارسٹر! آپ کو ہم لوگوں کی جانوں پر تجربہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

چمن لیمپ کے ٹال میں نظر آنے والے آسمان کے رنگ کی آنکھوں سے فارسٹر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ مذبذب کیوں ہیں؟ کیا ہندوستانیوں کے وفاداری اقدار نے آپ کو بھی توڑ ڈالا؟"

فارسٹر کا انگریزی غرور رعود کر آیا۔

"میں ٹوٹنے کا نہیں مس لیب!"

فارسٹر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جلوس نہیں نکلے گا۔ بس صرف ۵۰ آدمیوں کو ارتھی کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائیگی۔

(۳)

جلوس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن شہر والوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور خلاف قانون دس ہزار آدمی ارتھی لے کر اس نیت سے روانہ ہوئے کہ شہر کے خاص بازار سے ہو کر شمشان جائیں گے۔ فارسٹر نے خلاف قانون جلوس کو منتشر کرنے کا پہلے سے انتظام

کر لیا تھا۔ بازار کے دوسرے سرے پر مسلح پولیس کھڑی کر دی تھی اور خود بھی موقع پر موجود تھا۔

بازار سے گذر کر جلوس جب نکڑ پر پہنچا تو پولیس نے اس کا راستہ روک دیا۔

ارتھی کے آگے سوامی کے کچھ چیلے تھے، ان کے بعد ریاست کے سیاسی کارکن تھے جن کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا تھا ——— اس کے پیچھے آدمیوں کا سمندر تھا جس میں ایک طرف عورتوں اور بچوں کا غول بھی تھا۔ لوگوں کے ہاتھ میں ایک چھڑی تک نہ تھی۔

پولیس نے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا کہ اگر مجمع نکڑ سے آگے بڑھا تو اس پر فائرنگ کر دی جائے گی، لیکن مجمع نے اس اعلان کی کوئی پروا نہ کی اور آگے بڑھتا رہا۔ جیسے وہ بازار کی حد سے نکلا فارسٹر نے حکم دیا۔

"فائر"

ڈن، ڈن، ڈن، ڈن، دو راؤنڈ چلے۔ آگے کی قطار ——— ڈھیر ہو گئی، ارتھی گر پڑی اور لوگ بدحواسی سے بھاگنے لگے۔ ان میں کچھ تو دور ہٹ کر ٹھہر گئے، کچھ دکانوں پر چڑھ گئے اور کچھ، جسے بھاگنے کا راستہ نہیں دیکھا، جب مجمع منتشر ہو گیا تو فارسٹر نے حکم دیا کہ ارتھی پر قبضہ کر لو۔ پولیس آگے بڑھی تو ایک ایک نوجوان پاگلوں کی طرح بھیڑ سے نکل آیا اور زمین پر پڑے ہوئے جھنڈے کو اٹھا کر اس نے نعرہ لگایا۔

"انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد"

بھاگنے والوں میں ایک لہر دوڑ گئی اور ان کے قدم تھم گئے اور وہ پھر اکٹھے ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ فارسٹر نے نوجوان کے ہاتھ پر اپنے پستول سے ایک فیر کیا۔ وہ مع جھنڈے کے گر پڑا۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی تڑپ کر اٹھا اور دوسرے ہاتھ میں جھنڈا تھام کر نعرہ لگایا۔

"انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد"

فارسٹر نے دوسرا فیر کیا اور نوجوان پھر اس طرح ڈھیر ہو گیا کہ لوگ سمجھے وہ مر گیا، لیکن ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کروٹ بدلی اور پاس پڑے ہوئے جھنڈے کو دانتوں میں دبا کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے لگا اور اٹھتے اٹھتے نعرہ لگایا۔

"انقلاب ———"

فارسٹر کو اس کی ضد پر غصہ آ گیا اور اس نے پورا پستول اس زخمی پر خالی کر دیا۔ نوجوان جہاں تھا وہیں خون میں نہا کر لوتھڑے کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اس بات پر مجمع چھٹنے کی بجائے اکٹھا ہو کر نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا۔

"انقلاب زندہ باد"

"سوامی جی زندہ باد"

"عصمت و عفت زندہ باد"

فارسٹر نے پھر فائرنگ کا حکم دیا۔ اب کی چھ راؤنڈ چلے تب جا کر مجمع منتشر ہوا۔ بھاگنے والے نوجوان کی لاش تو اٹھا لے گئے، لیکن سوامی کی ارتھی تک نہ پہنچ سکے۔ پولیس نے ارتھی پر قبضہ کر لیا اور شمشان لے جا کر پھونک دیا۔

(۴)

فارسٹر کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی شریک زندگی وہ کسی تھی جو جلوت و خلوت،

خوشی و غم ہر موقع پر وفاداری سے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ فارسٹر جب سوامی کی لاش پھینکوا کر واپس آیا تو اس نے بہت بدحواسی سے اپنی شریک زندگی کو یاد کیا۔ لیکن آج وہ کسی طرح بھی فارسٹر کے دل کی پیاس نہ بجھا سکی۔ اس کے سینے میں ایک خنجر پیوست تھا جو کسی طرح نکالے نہیں نکلتا تھا۔ اس خنجر کی نوک دانتوں میں جھنڈا دبانے والا نوجوان تھا۔ پھل سوامی اور سینتا۔ یہ سب گھسے ہوئے اس کے کلیجے کا تیر بنا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے سینے میں جسے میں نے کئی زہروں سے چھپا رکھا تھا اس خنجر نے کیسے راستہ پا لیا۔ اس نازک وقت میں اس خیال سے بھی کچھ سہارا نہیں مل رہا تھا کہ میں کمزور انگریزوں کا محافظ ہوں۔ کیوں کہ نہتے مجمع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس بات پر یقین کرنا کہ یہ کبھی لوٹ مار بھی کر سکتا ہے محال ہو چکا تھا۔

فارسٹر سوچنے لگا کہ کاش کوئی نسوانی آواز ہوتی جو پیار و پریم میں ڈوبی ہوئی میرے دل پر ملائم ملائم ہاتھ پھیرتی اور کہتی "ڈارلنگ جان" تم نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے۔ تم غلطی پر نہیں ہو، غلطی پر تھا وہ سوامی جو اپنی حماقت میں مر گیا، اور غلطی پر تھا وہ نوجوان جس نے پاگل پن میں اپنی جان دے دی۔" لیکن ایسی نسوانی آواز ہے کہاں!

ایک دم سے دبلی پتلی مس چیس کیب فارسٹر کے دل میں رونما ہو گئی۔ فارسٹر کی نگاہوں سے پردے سے اٹھنے لگے اور اسے محسوس ہونے لگا کہ ڈیڑھ مہینے سے، جب سے کہ میں برت سے لڑ رہا ہوں وہ میرے لیے رجھی رہی ہے اور لوری بھی جب مجھے جگ پر جانا تھا تو وہ خیالوں کے تاروں پر رقص کرتی ہوئی آئی ہے اور اس نے مجھے گدگدا گدگدا کر جگایا ہے اور اپنی بھیروں سے میری ہمت بندھائی ہے۔ پھر جب میں تھکا ہارا واپس آیا ہوں تو وہ مسکراتی ہوئی تصور میں آئی ہے اور اس نے خود اعتمادی کے چھاپے لگا کر میرے زخم مندمل کیے ہیں۔ فارسٹر نے پلٹ کر اپنے سے کہا جان تم بیوقوف ہو جو ابھی تک تم نے یہ نہیں محسوس کیا کہ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ لڑکی تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تم انجن ہو تو وہ بھاپ ہے۔ اگر تم ہوائی جہاز ہو تو وہ پٹرول ہے۔ تم کو اسے اپنا بنا لینا چاہیے۔

فارسٹر چیس کی تلاش میں کلب گیا۔ لیکن وہاں وہ نہیں ملی حالانکہ وہ بہت پابندی سے آیا کرتی تھی۔ فارسٹر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گئی۔ لیکن اسے ایک اندیشہ اور بھی ہوا۔ جس سے وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ یہ کہ کپتان ڈرجٹ اس کے پیچھے لگا رہتا تھا اور وہ اس خطرناک قسم کا عورت کا شکاری تھا جو کسی نہ کسی چال سے عورت کو اپنے اوپر ترس دلا کر اس کے مادرانہ جذبے کو کھولا دیتے ہیں اور پھر اس حالت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ فارسٹر نے طے کیا کہ مجھے فوراً چیس کے یہاں جانا چاہیے۔

فارسٹر ایسا شخص تھا جس کے سینے میں طاقت اور اختیارات حاصل کرنے کی امنگوں کا طوفان امنڈا کرتا تھا۔ اور جو اپنی منزل کے لیے بلا جھجک خون کا دریا بھی پار کر سکتا تھا۔ لیکن آج کل یہ امنگیں ایسے نامعلوم بھاری بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھیں جن کے نیچے سے ان کے اجزا یہ گیت آہ بن کر نکلتے تھے اس لیے اس کو خارجی سہارے کی ضرورت تھی اور فوری ضرورت۔

فارسٹر بہت بیتابی سے چیس کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کا گھر ایسی پہاڑی پر تھا جہاں کافی دور تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ کاٹنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔

چیس نے فارسٹر کو آتے دیکھ لیا۔ وہ خوشی سے چلا کر اس کی طرف دوڑی۔

"مسٹر فارسٹر ——— میں اس وقت آپ سے ملنے کے لیے کتنی بے چین تھی!! لیکن اس بات کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ میں اتنی

خوش نصیب ہوں۔ کہ آپ یہاں آجائیں گے۔ آیئے مسٹر فارسٹر!"

مسٹر فارسٹر کو میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔

"میں آپ کو ایک خبر سنانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ یہ بات ایسی ہے جسے میں دنیا میں صرف آپ سے کہہ سکتی ہوں اور صرف آپ ہی اس کی عظمت محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ میرے جگری دوست بھی ہیں اور گرو بھی۔ اور ساتھ ساتھ مغربی اقدار کی آپ زندہ تصویر ہیں۔ وہ خبر ہے کہ آج مجھے اپنی مادرِ وطن کی ایک خدمت کرنے کا موقع مل ہی گیا ——— جی ہاں مجھ بیمار لڑکی نے مادرِ وطن کی خدمت کی۔ میں نے ایک ننگے مانڈے فوجی کو تازی ہمت دے کر محاذ پر بھیج دیا ——— ایک کچی ماڈرن انگریز لڑکی کی طرح ———

فارسٹر کے سینے پر ایک نامعلوم گھونسہ لگا۔

فارسٹر: کیا مطلب! میں نہیں سمجھا۔

پیس: (ہنس کر) آپ خیال بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ میں نے کیا کیا ہوگا۔ کپتان ڈرجٹ کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں لیکن وہ لڑائی سے اتنا اکتایا ہوا تھا کہ کہتا تھا کہ میں محاذ پر جانے کی بجائے سامنے کے پہاڑوں میں بھاگ جاؤں گا اور وہاں مارا مارا پھروں گا۔ جب اس کی سکت نہیں رہے گی تو اپنے کو کسی چوٹی پر سے گرا دوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ مارڈالنا وہ کاروبار ہے جس کے لیے انسانی دل کو ایک خاص قسم کے راشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے چاہت، نرم و نازک نسوانی لمس! اور مجھے یہ ملا نہیں ہے دو سال بیت گئے اس کے بغیر۔ جب وہ یہ باتیں مجھ سے کیا کرتا تھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہ ہوتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر اپنے دل سے پوچھا کرتی تھی کہ ایک ماڈرن لڑکی جو ہندوستان کے دقیانوسی اقدار کی نہیں بلکہ یورپ کے حقیقت پسند اقدار کی یعنی ان اقدار کی جن کا مجسمہ آپ فارسٹر ہے، بیچارہ ہے اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ کیوں نہ اس ننگے مانڈے سپاہی کو اس کا مطلوبہ راشن دے دے۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

فارسٹر: (اپنی بے چینی کو بہت سخت کوشش سے چھپا کر) "کیا کیا!"

پیس: جس چیز کا وہ بھوکا تھا وہ اسے دے دی۔ ہم دونوں نے ایک وادی میں جا کر خوب داد عیش دی۔ ہاہا! مسٹر فارسٹر میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ڈرجٹ اس وقت ہوائی جہاز پر نہیں جا رہا ہے بلکہ میں اسے اپنے بازوؤں پر اٹھائے محاذ کی طرف لیے جا رہی ہوں۔ اور جب وہ ہماری مادرِ وطن کے لیے دشمن سے لڑے گا تو اس وقت وہ اپنے بازوؤں سے نہیں (اپنے ہاتھوں کو اونچا کر کے) بلکہ ان کمزور ہاتھوں سے لڑے گا۔"

فارسٹر: کیا اس نے تم سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے؟

پیس: شادی کا وعدہ!! اس کی بیوی لندن میں موجود ہے۔

فارسٹر: پیس کیا تم اتنی ہی احمق ہو؟

پیس: کیا مطلب؟

فارسٹر: تم نے اپنے کو ایک بدمعاش کی خواہشوں کا شکار بنا دیا اور سمجھتی ہو کہ مادرِ وطن کی خدمت کی ——— کیا واقعی تم سے اتنی

بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے؟

پیس : اتنی بڑی غلطی، جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب واقعہ ہے۔ لیکن اس میں غلطی کیا ہے؟ آدمی کا انتخاب غلط تھا، یا فعل غلط؟

فارسٹر : (جھنجھلا کر) کیا تم اتنی بھولی ہو پیس! تم میں عملی سوجھ بوجھ بالکل نہیں ہے۔ جو بات چھوٹی سے چھوٹی لڑکی سمجھ سکتی ہے تم وہ بھی نہیں سمجھ رہی ہو ——

پیس : میں سمجھی۔ تم کو میرے مستقبل کی فکر ہے۔ ممی کو اگر معلوم ہو جائے تو ان کو بھی یہی فکر ہوگی۔ لیکن مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ہو سکا تو میں مغرب کو چلی جاؤں گی۔ اور یہ نہ ممکن ہوا تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ میری سب سے بڑی تمنا علی کہ میں غریب الدیار اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکوں سو وہ پوری ہو گئی اب جو بھی ہو، سب بھگت لوں گی۔

فارسٹر : یہ بتاؤ تم ڈرجٹ کی محبت میں تو نہیں گرفتار ہو گئی تھیں؟ یا ایسا تو نہیں ہوا کہ اس کے رونے کی وجہ سے بہت زیادہ پگھل گئیں؟

پیس : میں اتنی جذباتی تو نہیں ہوں، اتنا تو تم محسوس کر ہی سکتے ہو۔

فارسٹر : پھر کیا تم کو اس میں جنسی کشش نظر آئی؟

پیس : نظر تو آئی۔ لیکن پہلے نہیں۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس کے بعد۔

فارسٹر : توبہ توبہ۔ تم عصمت باختہ عورت ہو۔

یہ سن کر پیس پر بجلی گر پڑی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ پھر اپنے کو قابو میں کر کے کہنے لگی۔

پیس : عصمت باختہ! تم اس لڑکی کو عصمت باختہ کہتے ہو جس نے تمہارے خیالات پر عمل کیا؟

فارسٹر : خیالات، خیالات، خیالات کا کیا۔ آدمی سینکڑوں باتیں روز کہا کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کیا جائے؟

پیس : لیکن تم تو کہتے تھے کہ تمہارے خیالات ہندوستانی آدرشوں کی طرح ناقابلِ عمل نہیں بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کی چیزیں ہیں۔ اب میں سمجھی۔ میں نے واقعی دھوکا کھایا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ڈرجٹ کے ہاتھ سے دھوکا کھایا، نہیں اس نے تم سے دھوکا کھایا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کسی فوری جذبے سے کیا؟ میں اس قربانی کے لیے اپنے کو ڈرجٹ کے آنے کے ایک مہینہ پہلے سے، جب سے کہ میں نے اپنے کو تمہارا چیلا بنایا ہے، تیار کر رہی ہوں، تاکہ موقع پڑنے پر اس طرح خدمت کر سکوں جب میرا دل اس کے خلاف فریاد کرتا تھا تو میں اس کو سمجھاتی تھی کہ تجھ پر آدرش پرستی کا سایہ ہے اس لیے تو ایسی باتیں کرتا ہے۔ عصمت کے حامیوں کے خلاف جنگ نے میری ہمت بندھائی اور میں نے اپنے دل کا گلا گھونٹ گھونٹ کر اسے خاموش کر دیا۔ لیکن افسوس ——— راز اب کھلا کہ میں نے جس آواز کو مار ڈالا وہی سچی تھی۔ میں نے اپنے کو پوری طرح برباد کر ڈالا ——— لے پیس یہ ہے تعبیر تیرے اونچے خوابوں کی! پیس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فارسٹر غم و غصہ اور کوفت سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ لیکن چند منٹ میں اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"دیکھو پیس ——— مجھے الزام نہ دو، میں نے جو کچھ کیا تھا وہ سوامی کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹھیک تھا۔ لیکن تم نے اس پر عمل کر کے بہت غلطی کی۔"

پیس پھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس کیجئے! اپنی قیمتی باتوں کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے ——— اچھا خدا حافظ.....؟"

فارسٹر : تم کو اس حالت میں چھوڑ دوں!

پیس : میں آپ کی صورت نہیں دیکھ سکتی ہوں، جائیے ——— ابھی جائیے۔

پیس رنج و غم سے گری پڑ رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ فارسٹر کے ٹھیرنے کی روادار نہیں ہوئی اور اسے نکال دیا۔

فارسٹر کو گھر آکر یہ خبر ملی کہ سوامی کی خاک شدہ ارتھی نے دوسرا جنم لے لیا ہے یعنی شہر والے کل شہید نوجوان کی ارتھی بڑی دھوم دھام سے نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فارسٹر کی حالت اس کسان جیسی تھی جس کا کھلیان اسی کے ہاتھوں جل کر اپنی زندگی گزارنے کی تمام امیدوں کو لیکر خاک ہو گیا ہو۔ اور خونخوار قرض خواہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو ——— اختیارات کی بھیک، عزت و ترقی کی خواہشیں، اس قسم کی سب امنگیں نجانے کس طرح خاک ہو چکی تھیں۔ صرف اس بات کا احساس تھا کہ جیسے بنے زندگی قتل و غارت کا کاروبار کرنا ہے۔

فارسٹر خود اعتمادی کی بھیک مانگتے پھر وسکی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ صبح جب وہ فائرنگ کرانے جا رہا تھا تو اس کے جسم میں ارادے کی جگہ نشہ کام کر رہا تھا۔

ڈیڈ لیٹر

خواجہ احمد عباس

"ڈارلنگ!"

"جی!"

"پرشاد نے آج شام کو برج اور کھانے کے لیے بلایا ہے، یاد ہے نا؟"

"جی!"

"تو میں آفس سے کوئی ساڑھے پانچ تک آجاؤں گا۔ تم تیار رہنا"

"جی!"

جی! جی!! جی!!! بارہ برس سے وہ یہ دو حرفی لفظ اپنی بیوی کی زبان سے سن رہا تھا۔ دس باتوں میں سے نو کا جواب وہ صرف "جی" سے دیتی تھی جیسے پڑھایا ہوا طوطا جو صرف ایک لفظ بول سکتا ہو۔ جی! جی!! جی!!!

سدھیر سکسینہ آئی، سی، ایس ڈپٹی کمشنر ضلع نرائن گنج کے بارے میں ہر ایک کی رائے تھی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی نہ ہوگا۔ اونچا عہدہ، اچھی تنخواہ، رہنے کے لیے آرام دہ مکان، ابلا جیسی حسین، سلیقہ مند اور پڑھی لکھی بیوی جو کمشنر صاحب کے ساتھ برج کھیل سکتی تھی۔ راجہ صاحب رام نگر کے ساتھ ڈانس کر سکتی تھی، سوسائٹی میں ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے کے سب قاعدے قانون جانتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ تین خوبصورت اور ذہین بچوں کی ماں تھی۔ سب سے بڑا نند ھیر جو دس برس کی عمر ہی میں نینی تال کے ایک انگریزی سکول میں جونیئر کیمبرج میں پڑھ رہا تھا اور اپنی کلاس کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ اور بالکل اینگلو انڈین لڑکوں کی طرح انگریزی بولتا تھا۔ اس سے چھوٹی رات سالا اوشا جو ماں کی طرح ہی دبلی پتلی اور نازک تھی۔ اور ویسی ہی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اور ویسے ہی گھونگھر والے بال تھے۔ وہ نرائن گنج ہی کے ایک کانونٹ سکول میں تھرڈ سٹینڈرڈ میں پڑھ رہی تھی۔ اور اسے سارے نرسری رہائمز زبانی یاد تھے۔ اور "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار" جیسی نظمیں تو وہ فر فر سے گا کر سنا سکتی تھی۔ اور پھر سب سے چھوٹی شانتی جو ابھی مشکل سے تین سال کی تھی اور "بے بی" کہلاتی تھی اور ماں باپ دونوں کی آنکھوں کا تارا تھی اور بڑے پیارے انداز سے تتلا تتلا کر "ڈیڈی ٹاٹا" یا "ممی بائی بائی" کہنا سیکھ رہی تھی۔

ہاں تو سب ہی سدھیر سکسینہ آئی، سی، ایس کو انتہائی خوش قسمت سمجھتے تھے اور کبھی کبھی وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا۔ جو کچھ

اسے حاصل تھا، اس سے زیادہ زندگی میں کوئی کس چیز کی امید کر سکتا ہے؟ مگر جب وہ اپنی بیوی کی زبان سے یہ دو حرفی لفظ "جی" سنتا... بلا کے مخصوص، پھیکے، بے رنگ، تھکے ہوئے انداز میں ..... تو اس کی خوشی اور خوش قسمتی دونوں پر زنگ اور شبہ اور ایک عمیق مایوسی کے بادل چھا جاتے۔

"جی!"

کب سے یہ لفظ اس کی زندگی میں گونج رہا تھا؟

تیرہ برس ہوئے وہ پہلی بار مسوری میں ملے تھے۔ سدھیر مہینہ بھر پہلے ہی انگلستان سے آیا تھا اور تقرر ہونے سے پہلے چند ہفتے چھٹی منانے آیا ہوا تھا۔ مسوری کھاتے پیتے گھرانوں کی خوبصورت، خوش پوشاک اور دلچسپ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لائبریری کے سامنے ہر شام کو امراقی ہوئی رنگین ساڑھیوں، چست قمیصوں، ریشمی شلواروں اور گلے میں جھولتے ہوئے دوپٹوں کی نمائش ہوتی تھی۔ اونچی ایڑی کے جوتوں پر اٹھلاتی ہوئی چال، بے باک نگاہیں، شوخ جوانیاں، ہلکی چھوٹیں، ولایتی سینٹ میں ڈوبے ہوئے ہوا کے جھونکے، گلنار لب، مرچنے سے باریک کیے ہوئے کمان جیسے ابرو، خانے سے دمکتے ہوئے بال، کٹے ہوئے اور "پرم" کیے ہوئے گیسو، ہر نوجوان کے شوق نظارہ کو دعوت عام تھی۔ مگر نہ جانے کیوں سدھیر کو سارے مسوری میں صورت پسند آئی تو صرف ایک "بلا" جس سے پہلی بار اس کی ملاقات "ہیک مینر" ہوٹل میں ایک شام کو "ٹی ڈانس" کے دوران میں ہوئی تھی۔

"ہیلو سدھیر!" اس کے ٹینس کے دوست ماتھر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنی میز کی طرف بلاتے ہوئے کہا تھا "یہاں آؤ یار اور ان سے ملو۔ آپ ہیں مس بلا میز جی۔ ہیں بنگالی مگر لکھنؤ میں پلی ہیں۔"

سدھیر نے دیکھا کہ بغیر پاؤڈر کے گورے چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ جن کی گہرائی میں کوئی غم ڈوبا ہوا ہے اور ان کے گرد سیاہ حلقے ہیں اور لمبی، نکیلی، شرمیلی پلکیں ہیں جو دانتوں کو جاگتے ہوئے پپوٹوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔

وہ ماتھر کے اصرار کا انتظار کیے بغیر ہی بلا کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس کے لیے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال روم میں بلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

بارہ برس کے بعد بھی ان کی وہ سب سے پہلی گفتگو آج تک اس کی یاد میں تازہ تھی۔

"تو آپ آئی، ٹی کالج میں پڑھتی ہوں گی؟"

"جی!"

"بی، اے میں؟"

"جی!"

"اگلے سال فائنل کا امتحان دیں گی؟"

"جی!"

دو برس تک انگریز عورتوں کی کرخت مردانہ آوازوں کو سننے اور دو ہفتے مسوری کے شور و غل میں گزارنے کے بعد کتنا سکون تھا بلا کی کم گوئی میں۔ جیسے آندھی اور طوفان اور کڑک چمک کے بعد بارش ختم ہو گئی ہو اور گلاب کی پتیوں پر سے چند ننھی ننھی بوندیں گھاس پر

ٹھیک ہی ہوں۔ کتنی ہندوستانیت تھی اس "جی!" میں۔ کتنی ملائمت اور مٹھاس، کتنی معصومیت اور حیا!

"آپ ڈانس کرتی ہیں؟"

"جی نہیں"

ان کے دوست ناچنے والوں کی بھیڑ میں کھو گئے تھے اور اب وہ دونوں اپنی میز پر اکیلے تھے۔ سدھیر نے سوچا آخر کار میری تلاش آج ختم ہو گئی۔ بلا سے بہتر بیوی مجھے نہیں مل سکتی۔ وہ حسین ہے مگر شوخ نہیں ہے ایک پھول سے دوسرے پھول پر بھٹکتی پھرے۔ پڑھی لکھی ہے مگر خود رائے اور زبان دراز نہیں، کھاتے پیتے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اتنی امیر بھی نہیں کہ ایک آئی سی ایس کی درخواست ٹھکرا دے۔ اس سے شادی کر کے انسان واقعی سکھ اور سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اور اس نے کہا "تو آپ کے پتا.....؟"

"وہ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ آرٹ سکول میں پڑھاتے ہیں!"

"اوہ! آپ آرٹسٹ بیرجی کی بیٹی ہیں۔ ان کی تصویروں کی نمائش تو ہمارے پٹنہ میں بھی ہو چکی ہے" اور پھر اس نے صفائی سے جھوٹ بولا "مجھے ان کی تصویریں بہت پسند آئی تھیں" حالانکہ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ نہ جانے ان بیڑھی میڑھی لکیروں اور نیلے پیلے رنگ کے دھبوں میں کیا دھرا ہے۔ جو لوگ ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے ان تصویروں میں سے ایک خاص تصویر یاد آ گئی۔ ایک گیارہ بارہ سالہ شوخ و شریر بچی کی تصویر جو صابن گھلے ہوئے پانی کے رنگین بلبلے بنا کر اڑا رہی تھی۔ تصویر کا نام تھا "بلبلے"

"وہ تصویر بلبلے، آپ کی ہی تھی نا؟"

"جی!"

"اس میں آپ بہت شریر معلوم ہوتی تھیں۔ اب تو آپ کتنی سیریس ہو گئی ہیں"

صرف اس بار اس نے "جی" کہہ کر جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی، ٹھٹکی ہوئی، بجھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "بلبلے کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور بلبلہ ٹوٹ گیا۔ بس ختم!"

جب تک وہ مسوری رہا اس کا بیشتر وقت بلا کی رفاقت میں گزرا۔ اکٹھے وہ چنڈال چوٹی تک چڑھے، کیمل بیک روڈ کے گرد گھومے، کیمیٹی فال پکنک کے لیے گئے۔

اس تمام عرصے میں بلا نے مشکل سے ایک درجن جملے اس سے کہے ہوں گے۔ سدھیر کی باتوں کو وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے سنتی۔ جب تک وہ براہِ راست سوال نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہ کرتی۔ مگر سدھیر کو بلا کی کم گوئی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ باتونی لڑکیاں جو دنیا کے ہر مسئلے پر رائے رکھتی ہیں۔ اور اس کا اظہار ضروری سمجھتی ہیں اسے بالکل پسند نہ تھیں۔ اسے تو یہی اچھا لگتا تھا کہ وہ بولتا جائے اور بلا میٹھی سنتی رہے اور "جی! جی!" کرتی رہے۔ جب سدھیر کو یقین ہو گیا کہ وہ بلا کو بہت پسند کرنے لگا ہے بلکہ شاید محبت بھی کرنے لگا ہے۔ تو ایک دن تنہائی میں موقعہ پا کر اس نے "پرپوز" کر ہی ڈالا۔

"بلا! تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں"

"جی!"

"تمہارے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"جی!" اس "جی" میں سوال بھی تھا اور جواب بھی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی "دیکھئے میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اس لیے میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔"

"کیا تم کسی اور سے محبت کرتی ہو؟"

بیلا کی زبان سے "جی نہیں" شاذ و نادر ہی نکلتا تھا مگر اس بار اس نے کہا "جی نہیں" اور پھر ایک پل کی خاموشی کے بعد جس میں گہری ٹھنڈی سانس کا شائبہ تھا، کہا "ایسا کوئی نہیں ہے۔"

سدھیر کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا "تو پھر کوئی حرج نہیں۔ میں تمہیں اپنے سے محبت کرنا سکھا دوں گا۔"

اس دن جولائی ۱۹۴۰ء کی چودہ تاریخ تھی۔

نوکر نے ڈاک کا پلندہ ناشتے کی میز پر سدھیر کے سامنے لا کر رکھا۔ سب سے پہلے جو خط اس نے کھولنے کے لیے اٹھایا تھا اس کی نظر ڈالنے کی مہر پر پڑی "تمائی گنج — چودہ جولائی ۱۹۵۲ء" دفعتاً سدھیر کی یاد میں پورے بارہ برس پہلے کا وہ دن چونک کر بیدار ہو گیا۔

لفافے کو چھری سے چاک کرتے ہوئے سدھیر نے بیلا سے پوچھا "جانتی ہو آج کیا تاریخ ہے؟"

"جی!" اور اس کی نظر سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف گئی۔

"بارہ برس پہلے کا وہ دن یاد ہے مسوری میں — جب میں نے تمہیں پرپوز کیا تھا؟"

"جی!" مگر اس "جی" میں صرف اقرار تھا۔ کوئی گرمجوشی نہ تھی۔ سدھیر بارہ سال پہلے کی جس راکھ کو کریدنا چاہتا تھا وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس میں کبھی بھی کوئی چنگاری نہ تھی۔

مگر سدھیر نے بیلا کے چہرے پر ایک رنگ جاتے اور دوسرا آتے نہیں دیکھا۔ وہ خط کھول کر پڑھ رہا تھا جو اس کے کالج کے پرانے اور بے تکلف دوست ماتھر کے پاس سے آیا تھا۔ جواب پٹنہ میں وکالت کرتا تھا۔ خط پر نظر ڈالتے ہی سدھیر مسکرایا۔ کیونکہ ماتھر نے لکھا تھا "یار تم کتنے خوش قسمت ہو۔ بیلا جیسی بیوی پائی ہے۔ بھیا ہمیں دعائیں دو کہ اس دن بیک منیجر میں تمہاری ملاقات اس سے کرائی۔ مگر اس دنیا میں کون کسی کا احسان مانتا ہے۔"

"سنا تم نے، ماتھر نے کیا لکھا ہے؟"

"جی!"

سدھیر نے بیلا کے بارے میں جو جملے ماتھر نے لکھے تھے وہ پڑھ کر سنائے اور پھر دوسرے خطوں کو کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس نے یہ نہیں دیکھا کہ ماتھر کے دوستانہ مذاق کو سن کر بیلا کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی۔ صرف ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ کا نقش پیدا ہوا اور پھر یکایک غائب ہو گیا۔

دوسرا خط جو سدھیر نے کھولا وہ کلب کا بل تھا۔ وہ اس نے بیلا کی طرف بڑھا دیا۔ کیونکہ بلوں کی ادائیگی وہی کرتی تھی۔ تیسرا خط

آئی۔سی۔ایس ایسوسی ایشن کی طرف سے آیا تھا۔ سالانہ جلسے اور انتخابات کے بارے میں۔

"سنا بلا تم نے؟ اس سال بلدیو اور احسان وغیرہ سیکرٹری کے لیے میرا نام پروپوز کرنا چاہتے ہیں"

"جی!"

چوتھا خط ——— مگر یہ اس کے نام نہیں بلا کے نام تھا۔ ایک سادہ مگر پیلا سا پرانا لفافہ جس پر کتنی ہی مہریں لگی ہوئی تھیں اور کئی بار پتے میں کانٹ چھانٹ کی ہوئی تھی۔ اور یہ کیا؟ مس بلا میرٹھی! یہ کوئی بدتمیز ہے جو مسز بلا سکسینہ کو شادی کے بارہ برس بعد بھی مس لکھتا ہے!

..... سدھیر نے ایک نظر بلا کی طرف دیکھا جو اس وقت نوکر کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ بلا نے اپنا خط نہیں پہچانا۔ سدھیر نے چائے دان سامنے رکھ کر لفافہ چاک کیا۔ شادی کے بعد کئی برس تک اس نے بلا کے نام آئے ہوئے کتنے ہی خط چپکے چپکے کھول کر پڑھے تھے۔ مگر سوائے کالج کی سہیلیوں یا رشتے کی بہنوں وغیرہ کے کوئی "مشتبہ" خط نہ ملا تھا۔ نہ جانے کیوں اس خط کے لفافے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی پرانا بھید ضرور ہے۔ شاید آج اسے معلوم ہو سکے کہ اس "جی" کی اکتاہٹ اور بے دلی کے پیچھے کون سا راز چھپا ہوا ہے۔

لفافے میں سے کئی ورقوں کا طویل خط نکلا مگر اس کی پہلی چند سطریں ہی سدھیر کے سکون کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کرنے کو کافی تھیں۔ لکھا تھا۔

"جان سے پیاری بلا!

تم سے ملے دو مہینے ہو چکے ہیں اور میرے لیے یہ دو مہینے دو برس سے بھی زیادہ طویل ہیں۔ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح چھپ چھپ کر ہی مل سکیں گے؟ یہ دیوار جو ہمارے درمیان کھڑی ہے ——— کیا یہ کبھی ڈھائی نہ جا سکے گی!....."

غصے اور نفرت کے جوش سے سدھیر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس سے آگے اس سے یہ خط پڑھا نہ جا سکا..... یہ خط جو اس کی بیوی کی آوارگی اور بدچلنی کا اعلان نامہ تھا۔ جلدی جلدی ورق الٹ کر اس نے آخری صفحے پر نظر ڈالی۔ خط کے اختتام پر لکھا تھا "ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا انیل!"

"انیل!" اس کے دماغ میں یہ ان جانا نام بم کے گولے کی طرح پھٹا۔

"بلا!" وہ چلایا اور بلا جو اس وقت کمرے کے باہر جانے والی تھی ٹھٹک کر دروازے کے پاس رک گئی۔

"جی!"

جی! جی!! جی!!! وہی ملائم، ٹھنڈا، پھیکا "جی" اور اس وقت سدھیر کو ایسا لگا جیسے یہ دو حرفی لفظ ایک طعنہ ہو ایک گندی گالی ہو۔ ایک طمانچہ ہو جو اس کی بیوی نے اس کے منہ پر دے مارا ہو۔

"ادھر آؤ" وہ پھر چلایا اور بلا خاموشی سے میز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے چہرے پر حیرت پکار پکار کر کہہ رہی تھی "جی؟"

"انیل کون ہے؟"

سدھیر نے یہ سوال اتنا اچانک کیا کہ چند لمحوں تک بلا بھونچکی کھڑی رہی جیسے سمجھی ہی نہ ہو کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے..... یا یقین نہ آتا ہو کہ یکایک اس کے شوہر کو یہ بھید کیسے معلوم ہو گیا..... مگر پھر جیسے دھیرے دھیرے سوچ پر سے

بادل ہٹ جاتے ہیں اور برسات کی نم آلود دھوپ زمین پر پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دھیمی، میٹھی، نرم مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔

"انیل!" اس نے بڑی ملائمت سے نام دہرایا..... جیسے ماں بچے کا نام لیتی ہے، جیسے تپسوی بھگوان کا نام لیتا ہے۔ جیسے شاعر اپنا محبوب شعر گنگناتا ہے..... اور اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک اٹھیں..... وہ روشنی جو بارہ برس تک سدھیر نے کبھی اپنی بیوی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی.....

"ہاں! ہاں! انیل۔ کون ہے وہ؟" بیلا کی آنکھوں میں اس نئی روشنی کو دیکھ کر سدھیر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

مگر بیلا کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس کی آنکھیں دور ——— بہت دور..... نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ کوئی بہت خوبصورت منظر؟ کوئی دلکش یاد؟ امید کی کوئی کرن؟

"وہ سب کچھ ہے"..... اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں نے سدھیر سے نہیں بلکہ خود سے سرگوشی کی..... پھر ان ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اور ان کے غم میں ایک کڑوا طنز ابھر آیا "اور اب وہ کچھ بھی نہیں ہے....." پھر کسی نامعلوم غم کے بوجھ سے اس کی گردن جھک گئی۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ" سدھیر چلایا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میز کو الٹ دے۔ تمام چینی کے برتنوں کو چکنا چور کر دے۔ چائے دان کو اٹھا کر بیلا کے سر پر دے مارے "سچ سچ بتاؤ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟"

جھکی ہوئی گردن پھر اٹھ گئی۔ آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں میں سے پھر وہ عجیب روشنی جھلکنے لگی۔ پھیکے اور بے رنگ لفظوں میں صرف "جی" کہنے والی بیلا نے فخر انداز سے سر اٹھا کر سدھیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "جی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے"۔

اور اس لمحے سدھیر کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ اسے ایسا لگا کہ بیلا نے اس کی عزت پر، اس کی آئی۔ سی۔ ایس کی شان پر، اس کی مردانگی پر ہمیشہ کے لیے کالک پوت دی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ بیلا نے اسے ایک ایسی غلیظ گالی دی ہے جو عمر بھر اس کے کانوں میں گونجتی رہے گی۔ اس وقت تعلیم اور تمدن، تہذیب اور اخلاق کے سب چھلکے اس پر سے اتر گئے۔ اب وہ لندن کا پڑھا ہوا بیرسٹر نہیں تھا۔ آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کا ہونے والا سیکرٹری نہیں تھا۔ کلب کا ممتاز ممبر نہیں تھا۔ ٹرانس گنگ ضلع کا ڈپٹی کمشنر نہیں تھا جس کی مٹھی میں ایک لاکھ سے زائد انسانوں کی قسمت تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک ننگا وحشی تھا۔ غصے کے جوش میں بھرا ہوا ایک مرد جس کی عورت نے اسے دھوکا دیا تھا۔

وحشی چلایا "نکل جاؤ اس گھر سے، اسی وقت، اسی دم"

بیلا کے چہرے پر نہ غصے کے آثار پیدا ہوئے نہ غم کے۔ وہ اب بھی کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس نے سدھیر کی چیخ کو ایسے سنا جیسے بہت دور سے کوئی دھیمی سی آواز آتی ہو..... اور ایک بار پھر اس کے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ سے کھل گئے..... جیسے کھوئے ہوئے مسافر کو بڑی تلاش کے بعد راستہ مل جائے۔ جیسے وہ مدت سے بارہ برس سے ——— اسی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی اور آخر کار وہ مبارک ساعت آن ہی پہنچی ہو۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک نظر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شکایت نہیں تھی، شکوہ نہیں تھا، رحم تھا، معافی تھی، جیسے اس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں "اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے" پھر وہ اپنے بیڈ روم میں گئی اور وہاں سے اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر برآمدے میں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے قدموں کی آواز دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ باہر سڑک کے شور میں ہمیشہ کے لیے کھو گئی۔

سدھیر کا خیال تھا کہ وہ رو دے گی، گڑگڑائے گی، اپنی صفائی پیش کرے گی، اپنے گناہ کی معافی مانگے گی، آئندہ اپنے اعمال کو درست کرنے کا وعدہ کرے گی۔ مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ بلبلا بغیر گھبرائے چلی جائے گی۔ اس خاموش طمانچے سے اس کی ساری ہستی جھنجھلا اٹھی۔ بھوکے کی طرح اس کے دماغ پر ایک ہی چوٹ پڑتی رہی "انیل! انیل! انیل!!! انیل!!! یہ انیل کون ہے؟ میں اس کا پتہ لگا کر چھوڑوں گا۔ اس پر ایک بیاہتا عورت کو اغوا کرنے کا دعویٰ کروں گا۔ اسے جیل بھجواؤں گا۔ اسے جان سے مار دوں گا.....!"

پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا وہ بلبلا کے کمرے میں پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی وارڈروب کے ایک خانے میں بلبلا اپنے خطوط وغیرہ رکھتی ہے۔ چابیوں کا گچھا سامنے پلنگ پر پڑا تھا۔ جاتے جاتے وہ پھینک گئی تھی۔ سدھیر نے وارڈروب کھولی۔ خانے کو چابی لگا کر باہر کھینچا۔ اس میں رکھے ہوئے خطوں کے پلندوں اور کاغذات کو ٹٹولا۔ سب سے نیچے کی تہہ میں سرخ ریشمی فیتے سے بندھے ہوئے چند خط رکھے تھے۔ ہر خط پر انیل کے خط ہوں گے۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ ہر خط میں اعلان محبت "بلا میری جان"۔ "میری اپنی بلا"۔ "تمہارا اور صرف تمہارا انیل"۔ "اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں تمہارا تمہارا تمہارا..... ہر فقرہ زہر آلود نشتر کی طرح اس کے دل میں چبھ کے لگاتا رہا۔ ایک ایک کر کے وہ خط فرش پر گرتے رہے۔ مگر یہ کیا؟..... خطوں کے بیچ میں تہہ کیا ہوا اخبار کا ایک تراشہ..... کھولنے پر دیکھا کہ ایک نوجوان کی تصویر ——— گہری چمکتی ہوئی آنکھیں، اونچا ماتھا، مسکراتے ہوئے ہونٹ ——— اس کے نیچے یہ خبر چھپی ہوئی تھی:-

نوجوان شاعر کی موت

ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی صدمہ ہے کہ لکھنؤ کے نوجوان ترقی پسند ادیب اور انقلابی شاعر انیل کمار انیل کا انتقال ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کی سنیما گرہ تحریک میں وہ جیل گئے تھے اور وہیں انھیں دق کا منحوس عارضہ ہو گیا تھا.....

سدھیر ساری خبر نہ پڑھ سکا۔ اس لیے کہ تراشے پر اخبار کی اشاعت کی تاریخ دی ہوئی تھی۔ ۱۴ جون ۱۹۴۷ء۔ اس کے ہاتھ سے باقی خط اور تراشہ فرش پر گر پڑے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ انیل! انیل! انیل!!! کیا کوئی مر کر بھی زندہ ہو سکتا ہے؟

کھوئے ہوئے مسافر، بلکتے ہوئے جواری کی طرح وہ کھانے کے کمرے میں واپس آیا۔ میز پر انیل کا خط اور الفاظ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے الفاظ اٹھا کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ دو جنوں گول مہروں کے درمیان میں ایک چوکور مہر لگی ہوئی تھی۔ جس پر انگریزی کے تین حروف چھپے ہوئے تھے ——— O. L. D. ڈی۔ ایل۔ او۔ ڈیڈ لیٹر آفس۔

ممتا!

اختر اورینوی

"اللہ، اُدون لاوے کی ہم دانا کی اُلٹی پر ان کا ٹکی دھوکے پیاریں!"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے اپنی اٹھارہ گاؤں کی ہم راز عورتوں سے کہا۔ تو یا وہ منشی جی کی ٹکی واقعی ٹکی پر پھیلا رہی ہو۔ اس کا تیار گندمی چہرہ تمتما ہوا تھا۔ اس کے دھیان میں چھوٹے سرکار کے منشی جی کی سبز چادر دار ٹکی بسی ہوئی تھی۔

ان دنوں اس پر وارفتگی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بوڑھی تھی۔ بیوگی کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ یہ دن اس نے سینے پر پتھر کا سل رکھ کر بتائے تھے۔ لیکن اس کے قدم ڈگمگائے نہ تھے۔ اس کے ایک لڑکی تھی جو اب دس سال کی ہو گئی تھی۔ یہی ایک دو سال کی بچی چھوڑ کر اس کا چوڑا چھلا کائنات میان مٹی میں مل گیا تھا۔ لڑکا بالغ، اپنے باپ پر تھی۔ چوڑی چکلی، محنتی، خاموش، ابھی کوئی اُبھری بھی نہ تھی۔ غرابا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی اس کی گھات میں بیٹھی ہے۔ اب ٹوٹ پڑی کہ تب ٹوٹ پڑی۔

کوئیاں ہو رہی تھی۔ اس کے کس بل کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے مرنے والے شوہر کی تصویر پھر جاتی تھی وہ بے چین ہو اٹھتی تھی۔ رات رات بھر بستر کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ اوڑھنی پر کروٹیں بدلتی۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتی۔ اس کے تن من میں آگ سی لگ جاتی وہ تلملا اٹھتی۔ زیتون اور عاقو کے آباد پیڑوں کی گرمی کو سوچ سوچ کر وہ انگاروں پر لوٹتی رہتی تھی۔

زیتون اور عاقو سے وہ بغیر چھیڑ کر نہ رہتی۔ باتیں بناتی۔ گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے مردوں کو جھانکتی۔ عورتوں کی ٹولیوں میں بیٹھ کر چھیڑ چھاڑ کرتی۔ گالیوں کو شربت کی طرح پیتی۔ کسی اس کی تشفی کو کم نہ ہو پاتی۔

"مرتا گئی ہے!" زیتون کہتی۔

"سنک گئی ہے!" عاقو بولتی ——

اور گاؤں کی دوسری عورتیں فقرہ کستیں۔

"چھوڑ دے ہے!" "چرکھا کرے ہے!" "نکل جائی!"

"بستی کا ناک کٹوا دے گی!" "باپ دادا کا نام ڈبو کر رہے گی!" ——

ٹھوکر کی ٹوکا کرتی۔ آٹھ سال پہلے ایک عورت اس کے دل کی چتا کے اندر بیٹھ گئی تھی اور اب آٹھ سال کے بعد چتا کی راکھ سے دیپک کی طرح وہ عورت پھر سے اٹھی تھی۔ پھر راکھ میں آگ کے شعلے سے لپک اٹھتے تھے۔

ناجو ہنستی، گیت گاتی، ہنسی مذاق کرتی، فحش گالیاں بکتی، روتی اور گاتی اور اکثر لڑکے کرتے ملتی یا اسے دوشیزہ دیکھ کر کرتی تھی۔ لڑکے اس کے بے درد شوہر کی ضمانت تھی جو اسے یوں تنہا سلتا چھوڑ گیا تھا۔ یوں بھری جوانی میں مر جانا بھی بڑا ظلم ہے ——!

نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا؟ یہ کس اندھیرے سے جرأت جاگ اٹھا تھا۔ ناجو کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ آخر اس کے تن بدن میں ایک زلزلہ سا کیوں آ گیا تھا، اچانک، انجان طور پر۔ دھرتی اور عورت! عورت اور دھرتی! دھرتی دھس رہی تھی، پھٹ رہی تھی، پھٹک رہی تھی۔ اندر تک ایک شعلے جل رہے تھے۔ آگ کا پھن پھیل رہا تھا۔ اور اس میں آتشیں بس رس رہا تھا۔ دھرتی ناگ کے پھن پر دھری ہے اور دھرتی کی کوکھ سے عورت جنم کر اوپر کھڑی ہے۔ کوکھ کے اوپر کوکھ! ناجو کے اندر عورت چلا رہی تھی تو دا اگیر شکتی! اور شکتی کی مورت کے ہزار ہاتھ! ناجو کے ہزار ہاتھ خلا میں وجود کی طرف کے لیے اٹھ رہے تھے —— اور پھر ایسا ہوا کہ چھوٹے سرکار کی ڈیوڑھی اس کے لیے ہموار ہو گئی۔ وہ دن دن بھر اور رات گئے تک چھوٹے سرکار کی حویلی میں رہتی اور بہانے بنا بنا کر ڈیوڑھی پر جا براجتی اور باہر جھانکتی رہتی، منشی جی کے درشن کے لیے۔

منشی جی گاؤں میں نئے نئے آئے تھے۔ چھوٹے سرکار کے دربار میں، منڈوے تھے اور ابھی کام کے تھے۔ ان کی خاندانی روایات بھی بہت اونچی تھیں۔ منشی جی کے ایک بھائی نے اس سے قبل گاؤں میں ہومیو پیتھک کی پریکٹس شروع کی تھی اور رہتے رہتے حویلی کی پردہ دار ایک باندی سے جو ان سے عمر میں بڑی تھی، عالیہ ہو گئے تھے۔ منشی جی پر بھی معتقد بستیوں کی نظریں تھیں۔ لیکن ناجو کو تو منشی جی سے گویدگی تھی۔ عالم بے خبری میں آ جو بدل گئی تھی۔ اب وہ کسی کی تاک جھانک نہیں کرتی تھی۔ فحش مذاق سے بھی بچتی تھی۔ وہ ہم راز عورتوں سے اپنے دل کی بات کہتی ——

"اب میرا دل تو دور ہو گیا ہے اپنے دل کے ہے کی منشی جی پر۔ گھر کر بیٹھیں، بڑے اچھے ہیں منشی جی!"

"کھاک اچھے ہیں! بچھو مندرا ہے!"

زچتن بول اٹھتی۔

"ناہیں ہمرے بڑے اچھے لگے ہیں۔ جی چاہے ہے کی ان کی صورتیا دم دیکھتے رہیں!"

ناجو جواب دیتی۔

"وہ جو اکا اچھے لگی ہیں! مگر منشی نمبر منشی کے آگے پیچھے ڈورتے رہے ہیں۔ نمبر منشی مرا!"

حاکم منشی ہوتی یوں کہتی جیسے منشی جی کی آمد کی اس کی دل پسند ہو مگر وہ غیر کے لیے کیوں ہو۔ خود مار کے لیے کیوں ہو۔ وہ مرے تھے بہت بڑے اور انتخاب ——! اور منشی جی کھیلے کھائے بڑے تھے۔ بستی والوں نے ایسی ایسی کئی نسبتیں منشی جی کے ساتھ جوڑیں۔ لیکن انہوں نے کسی ایک کو بھی نہیں کہا۔ تین بیوی کی نسبت سے کر گئی اور جاتی رہی۔ ناجو کا یقین اس کے وجود میں اتارا۔ پھر اتارا۔ پھر اتارا۔ اور منشی جی کی بھولی بھالی شکل پر پھدتی رہی اور دیگروں پر وہ زور دھونے کی نوبت آتی رہی۔ لڑکے کھانے پینے کی چیزیں منشی جی کو بھولی جاتی ہیں اور لڑکے پراب وہ انتظار میں رہتے تھے کہ کبھی اس نے جانے اور بھی بھاؤ میں دبی دبی دلچسپی تھی۔ اس کی بادامی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں مسکرا مسکرا اٹھتیں۔ منشی جی اسے دیکھ کر ہنستے اور اس کی ہنسی سنی سنی کھیلی اور معنی کے اندر ان کے چھوٹے چھوٹے دیدے گھٹتے جاتے۔ جیسے لڑکے امرود کے درختوں میں بے ترتیب امرود ڈھونڈنے کے لیے اپنی گردنیں اڑائے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور کوئی پھل نہیں پاتے۔ لڑکوں کی بھری بھری شاخیں اب گدرانے والی ہی تھیں۔ منشی جی کا بس چلتا تو وہ لڑکے ہی اپنی نسبت پختہ کروا لیتے۔ بیتا بیس سال کی عمر میں بھی وہ بڑے دل گردے کے آدمی تھے وہ ناجو کو ساس بنانا زیادہ پسند

کرتے۔ مگر تاجو اُن کی نگاہوں کے دریے تھی۔ آخر منشی جی نے دوسرے قصبے میں ایک تیرہ سالہ لڑکی سے نکاح کر لیا۔ یہ خبر سُن کر تاجو کے گھر بیٹھی مگر منشی جی اپنی قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نہ گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ رفتہ رفتہ سوائے تاجو کے سب کو حقیقت معلوم ہو گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ منشی جی اپنے بھائی کی پیروی کر کے اس گاؤں کے ہونے والے نہیں لیکن تاجو کو اس بات کو ماننے والی تھی وہ تو منشی جی کو اپنا چکی تھی، اپنے کھرب چکی تھی، اپنی سمجھ چکی تھی۔

سچ بھی بڑی بُری چیز ہے، تلخ اور نکیلی، اندر گھسنے والی، پردے چاک کرنے والی، سچ خود بھی ننگا اور دوسرے کو بھی ننگا کرنے پر تُلا ہوا۔ تاجو کی عقل میں سچ گھس پڑا۔ مگر اس کے دماغ کے گہرے اندھیارے میں جو اندھی عورت بیٹھی ہوئی تھی اس کے دیدے نہ کھول سکا دونوں میں پیچھے جھاڑ شائی شروع ہوئی اور تاجو کو ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ یہ دورے کے وقت بڑی بے حیائی سے منشی جی سے بیاہ رچانے اور وصل محبوب کے باب میں شعروں کی کھال اُدھیڑتی۔ اور اس خواب دنیا کا اثر یہ ہوا کہ تاجو کے بھائی نے ایک روز اس کی خوب گندی کری۔ اور روزانہ اس کی گندی ہوتی رہی۔ مگر وہ منشی جی کی کھتی ہری فصل میں انگار کر دھوئے اور ملکانے پر مصر رہی۔ بلیاں بھیگتی اور سوکھتی رہیں اور تاجو کا جھگڑا بڑھتا رہا۔ آخر تنگ آ کر تاجو کے بھائی نے ایک "لفاتی" قسم کے آدمی سے تاجو کا بیاہ کر دیا۔ تاجو دوسرے گاؤں چلی گئی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی کوکھ میں بچے کو لے کر واپس آئی اور بیٹے میں ہی بچہ پیدا ہوا۔

اُن ہی دنوں منشی جی ایک ماہ کی چھٹی لے کر گھر چلے گئے جب واپس ہوئے تو بڑے شاداب تھے۔ لوگوں نے تاڑ لیا کہ شادی رچا کے آئے ہیں۔ لیکن اب بھی منشی جی اپنے منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔ اب وہ جلد جلد چھٹی لے کر گھر جاتے رہے۔ لیکن کب تک چھوٹے سرکار نے روک ٹوک شروع کی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی نئی بیوی کو ساتھ لے آئے اور حویلی سے قریب ہی ایک چھوٹے سے افتادہ مکان کو درست کرا کر اس میں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگے۔

لوکو حویلی میں کام کرتی تھی اور کام کرنے پر مجبور تھی۔ بیوہ ماں کی شادی کے بعد بھی گھر کی حالت نہیں سنبھلی۔ ماں کے ٹکروں پر پلنے بھی پڑی تھی اور بعد بھی پڑی رہی۔ اب یہ ہوا کہ ماں کو لکھنؤ جانا پڑا۔ جو خود بھی کبھی کبھی سسرال ہی آ رہتا تھا اور کھانے والا ایک منہ اور پیدا ہو گیا۔ جب تک دودھ پیتا ہے تو خیریت ہے۔ ورنہ لوکو کے منہ کا لقمہ چھن جائے گا۔ لوکو کی ماں، تاجو نے اسے مستقل حویلی میں رکھوا دیا۔ اور پلنے کے لیے۔ مگر اس کو پرکھنا کی فہرست ماننا ہی تھی۔ لوکو بڑے صبر سے، راہ طے کرتی رہی۔ کرنا ہی تھا اسے۔

لوکو رخصت کے اوقات منشی جی کی بیوی کے کام کاج بھی کر دیتی تھی۔ ان کے کام بڑی چاہ سے کرتی تھی۔ وہ انہیں اپنی سہیلی سمجھنے لگی تھی۔ نئی دلہن کا جی بھی لوکو سے لگ جاتا تھا۔ وہ لوکو کو پہننے پرانے کپڑے دے دیا کرتی تھیں اور منشی جی اس سے مذاق کر لیا کرتے تھے۔ دونوں باتیں دل کش تھیں۔

جاڑے کا موسم آیا۔ لوکو ٹھٹرتی رہی۔ دن تو خیر، رات بڑی ظالم ہوتی تھی۔ رات گئے تک وہ حویلی میں کڑکتے جاڑے کی برچھیاں سہتی ہوئی کام کرتی رہتی تھی۔ چپ چاپ ایک دن وہ منشی جی کے گھر گئی۔ وہ حویلی سے رات کو واپس ہو رہی تھی۔ رہی میں آئی ذرا منشی جی کے ہاں جھانک لیں۔ دونوں میاں بیوی ایک حالت میں صوفے اسی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لوکو کو عشرتی کی پرلطف پرچھائی اور ٹھٹک کر شرم، حسرت اور احساس کا مجسمہ بنی کھڑی ہو گئی۔

"آؤ لوکو! رُک کا ہے گئی، اندر آ جاؤ!" منشی جی کی بیوی نے بے تکلفی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"تیرے جاڑا نہیں لگتے ہے لوکو! جوان ہو رہی ہے نا!"

منشی جی نے اس کے جواب سے پرانے اتار کر اور بھاگ سے بھیگی بھیگی اوڑھنی کو نگاہوں سے اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

لوکو کی کالی کالی پتلیاں لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں ناچنے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ اندر آ گئی۔ گول گول پتلیاں تھرکتی رہیں اس نے اپنے پھٹے چھٹے کپڑوں کو ذرا سمیٹ لیا۔

"دیکھو! لوکو کیسا کانپ رہی ہے!" لوکو کو سردی سے نہیں کانپ رہی تھی۔ وہ انجانے ہیجان و تند جذبات سے کانپ گئی تھی۔ کون جانے اس کی حیات کے کتنے تار لرز اٹھے تھے۔ "تم اسے اپنا مارینے والا پرانا گرم شلوکہ کیوں نہیں دے دیتیں؟" منشی جی نے بیوی سے کہا۔

"دے گی لوکو؟" بیوی نے رحم کھاتے ہوئے پوچھا۔

لوکو خاموش کھڑی رہی۔ اس کی گہری سیاہ پتلیاں چمک اٹھیں، جیسے اوس لگے ہوئے کالے کوئلے سے چنگاری نکل پڑی ہو۔

منشی جی کی بیوی نے بھیس کے پیٹھے سے مارینے کا شلوکہ نکال کر لوکو کو دیا۔ اور منشی جی نے اصرار کر کے اسے وہیں شلوکہ پہننے پر مجبور کیا۔ لوکو نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ کے اوپر واسکٹ کی طرح شلوکہ پہن لیا۔ دلہن جی کا شلوکہ اسے اٹ گیا۔

"ایں!" منشی جی زور سے قہقہے سے چونکے۔ دلہن جی نے اپنے ابھرے ہوئے سینے پر اٹھتی ہوئی ترچھی نگاہ ڈالی اور پھر لوکو کو مسکراتی ہوئی گھورنے لگیں۔ لوکو شلوکے کے بھاروں کو اوڑھنی سے چھپانے لگی۔ خاموشی اور خود اعتمادی کے ساتھ بہت ہی خفیف سی مسکراہٹ اس کے بند لبوں کے ایک گوشے میں ابھر کر غائب ہو گئی۔ لوکو اپنے گھر چلی گئی۔

"کون دیس ہے شلوکہ؟" لوکو کی ماں ناجو نے پوچھا۔

"منشی جی کی دلہن دیس ہیں۔" لوکو نے جواب دیا۔

ناجو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ گود کے اندر چھچھر چھچھر کی آواز اچانک رک گئی۔ ناجو اٹھ کر شیرنی کی طرح لوکو پر جھپٹی۔ اور آن کی آن میں اس نے گرم مارینے کا شلوکہ چھین لیا اور چھین کر خود پہن لیا۔ وہ شلوکہ اسے اٹ نہیں رہا تھا۔ سانس روک روک کر اس نے اتنا پایا۔ بہت مشکل سے دو دبلے بیٹوں کو کس کس کر داب داب کر، سیپ کے ہٹوں کے درمیانی حصے تن تن گئے کئی توسیعیں بن بن گئیں۔ ان کی کئی توسیعوں کی زنجیر سے بھی بھرے بھرے سینے زور بلے اور زنجیر کے حلقوں سے جھانکتے رہے دباؤ سے دودھ ابل پڑا اور گرم شلوکے پر دو بڑے بڑے نم دھبے پڑ گئے

ناجو نے یہ حرکت سوچ سمجھ کر نہیں کی۔ یہ سب کچھ بڑی بے شعوری سے ہوا، بڑی بے دردی سے ناجو پر ایک جن سوار ہو گیا اور رہا۔ لوکو حیرت زدہ رہ گئی اور اپنے آنسو پی کر گھورتی ہوئی سو رہی۔

دوسرے ہی روز گاؤں کی عورتوں میں شلوکے کی کہانی منشی جی اور ان کی بیوی کی زبانی پھیل گئی۔ ناجو ہر وقت اس شلوکے کو پہنے رہتی تھی۔ لوکو سے اس کی تصدیق کرائی گئی اور طعنے مشنے کا بازار گرم ہوا۔

"بھئی، لو گرے چھین کر گرم شوربہ پی لیں۔" بے شرم بڈھی عورت اُٹھ کر نے لشتر لگایا۔

"کیسی لتا مر گئی ہے چرو صدی میں!" فوراً سے مصلحانہ شان سے کہا۔

منشی جی کی بیوی بھی جل کر ناجر پر وار کر گئیں۔ عورت بھی کتنی کچھ دار ہوتی ہے! وہ تہ کی باتیں جان لیتی ہے۔ وہ گہرے بھید پا جاتی ہے۔

منشی جی اس جوڑے سے ہوا کی شلوکے کے تصور سے لطف لیتے رہے۔ جس کے بازوؤں میں تین جوڑے پہنے متوجہ ہوئے۔

"ہائے بجب! تیری لتا کیا مر گئی تھی ناجر!" نیتوں نے پوچھا۔

"تو ں سب بھی تو صدر دے۔ لو کان لے جائے! نہ پوچھ ذات! اسے ہم تو پیا دودھ گرم رکھتے و شوربہ پیا رہے۔ جھٹ بھرے لو کا کر دست پر دست۔ مجھ اللہ دودھ پیتے پیتے منٹ منٹ پیتے۔ ہائے ہے ہائے کاول! ہم صدقے جائیں اپنے دونوں اول پر سے!" ناجر کے جواب دیا!

جل پری

علی عباس حسینی

—— اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ——

میں ڈاک بنگلے میں بالکل اکیلا تھا۔ میرا اردلی جماری قریب کے ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔ سرکاری خانساماں جو چوکیداری کے فرائض بھی ادا کرتا تھا مجھے کھانا کھلا کر کچھ دیر کے لیے قصبہ چلا گیا تھا۔ قصبہ ڈاک بنگلے سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ انگریز کا سے آدمیوں میں مل جل کر رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ مگر نہر کے انگریز انجینئر نے اسی لیے یہ بنگلہ آبادی سے فاصلے پر بنایا تھا۔ بنگلے کے تین طرف ادھر اور ایک کے کھیت تھے چوتھی طرف نہر تھی۔ نہر کے اس پار ایک فرلانگ کے فاصلے پر ڈھاک اور جھاؤ کا جنگل تھا۔ یہاں لومڑیوں، گیدڑوں، لکڑ بگھوں اور بھیڑیوں کے بھٹ تھے۔ نہر نہ ہوتی تو شاید یہ جنگلی ان کا رمنہ ہی جاتا۔

رات بچپنے سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ وہ صحن کے کی چھلا ہٹوں پر گہری تاریکی کی سنسناہٹ غالب آتی جا رہی تھی۔ بنگلے پر ایک سناٹا سا چھایا تھا۔ اردگرد کی فضا پر بھی وہ سکوت طاری تھا جو دس بجے شب کے قریب دیہاتوں، جنگلوں اور غیر آباد مقامات کو بھیانک بنا دیتا ہے۔ اس سناٹے اور خاموشی کے پردے کو کبھی کبھی لکڑ بگھوں کی قہقہہ نما چیخ چاک کر دیتی تھی، یا کبھی کبھی کسی الو کی آواز۔

میں نو وارد تھا۔ ضلع کی خصوصیات سے ناواقف۔ میرے لیے ماحول بھی نیا تھا اور مقام بھی۔ نہر کے ماتحت انجینئر کی حیثیت سے تیس میل کے دورے سے پلٹا تھا۔ یکہ کی سواری نے، پختہ اور نیم پختہ سڑکوں کے ہچکولوں نے چور چور کر دیا تھا۔ جسمانی تھکاوٹ کا تقاضا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ نیند کی دیوی آتی تو ضرور مگر خراماں خراماں، اور دل و دماغ میں اپنا نشیمن بنانے کی جگہ صرف پلکوں کو چھو کر چلی جاتی۔ میں الف لیلہ کا سوتا جاگتا ہارون الرشید" ہی گیا تھا۔ جو رام چندر جی کی طرح رعایا کا دکھ سکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے راتوں کو بھیس بدل بدل کر نکلتا تھا۔ اور جس کی راتیں بہت چھوٹی اور دن بہت بڑے ہوتے تھے۔ اور میرے دل میں بھی ہارون الرشید جیسا ذہن تھا۔ اس لیے کہ جس طرح وہ اپنے معمولی لبادے کے نیچے کمر میں مرصع تلوار لٹکا لیتا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی اپنی پیٹی سے دو نالی بندوق لٹکا رکھی تھی۔ اسے انسانوں کا خوف مسلح نکلنے پر مجبور کرتا تھا۔ میرے دل میں جانوروں کا ڈر تھا۔ اودھ کے بعض اضلاع میں لکڑ بگھوں اور بھیڑیوں نے ان دنوں آفت مچا رکھی تھی۔ نہ جانے کتنی جانیں ان کی بدولت تلف ہو چکی تھیں۔ ایسے میں بندوق پاس ہوتے ہوئے قریب نہ رکھنا بیوقوفی ہی تو ہوتی۔

میں نے بستر کے قریب چھوٹی میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی تیز کی اور اپنی کتابیں اٹھا لیں۔ اس دورے میں تین کتابیں ساتھ

لایا تھا۔ پریم چند کی پریم پچیسی، سمرسٹ ام کی ایزس آف اور ناٹول فرانس کی چنگوئی ٹیلز آف۔ یہ کتابیں بار بار پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے پریم چند کی جرأت، غیرت، عجمت، شرافت اور محبت کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ ان کے کردار بنتے تھے۔ ان سے سیرتیں درست ہوتی تھیں۔ ان سے طبیعتوں میں توازن و استقلال پیدا ہوتا تھا۔ وہ آج کل کی کہانیوں کی طرح بے نتیجہ نہ تھیں۔ ناٹول فرانس کی ساری تصنیفوں میں مجھے اس کی تیسری ناول جو مجھے پسند تھی، طنز کا یہ شاہکار موجودہ تہذیب کے اوقات کی مکمل تاریخ ہے۔ حال ہی میں پریذیڈنٹ ٹرومین نے جو بجٹ کے سلسلے میں کانگریس کو سفارشات کی ہیں۔ اور جس طرح ایک امریکہ کے بجٹ کو سارے عالم کا بجٹ بنا دیا ہے۔ اس کا خاکہ اسی ناول کے آخری ابواب میں بڑی خوبی سے موجود ہے۔ میں بار بار اس حصے کو پڑھتا تھا۔ اور اس ادیب کی حیرت انگیز سیاسی سوجھ بوجھ پر انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ ایزس آف میں ہیرو کا استاد عجیب و غریب ہے۔ وہ نہ صرف دولت و ثروت کی جانب سے بے پروا ہے، بلکہ وہ حسن و جنس کے معاملے میں بھی متقی ہے۔ مجبوری اشارے کام لے کر اس سے شادی کر سکتی ہے تو وہ خوش، اگر وہ دولت کے حرص میں کسی اور شے کی تلاش میں غرق ہو جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں۔ سزا یافتہ چور اور بدمعاش اس کی ہمدردی کے مستحق، اور جانی بوجھی بدکردار عورتیں اس کے تحفظ کی حقدار۔ اگر ان میں سے کوئی اس کے احسان کا بدلہ جسمانی لذتوں کے ذریعے چکانا چاہتی ہے تو اسے معاوضہ کے قبول کرنے میں عذر نہیں۔ اگر خود ہی اصرار کرنے کے بعد وعدہ فراموشی سے کام لیتی ہے تو وہ اس سے ناخوش نہیں ہوتا۔

میں ایزس آف کی جلد پر ہاتھ کے نام کے عجیب کردار پر اور اس کی انوکھی تکنیک پر غور کر رہا تھا جو اس نے اس سوانحی ناول میں اختیار کی ہے کہ دفعتاً مجھے شاد عظیم آبادی کا مشہور شعر یاد آگیا:—

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور دماغ جسم و روح کے مابعد الطبیعاتی مسائل میں الجھ گیا۔ یہ "میں" کون سی چیز ہے؟ گوشت و پوست کا مجموعہ یا کچھ اور؟ روح محض حرارت جسمی ہے یا اس سے الگ کوئی دوسری چیز؟ اگر محض حرارت ہے تو انسانی دماغ اس کے پیدا کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتا؟ اگر جسم سے علیحدہ کوئی شے ہے تو اسے قفس عنصری میں کون بند کرتا ہے، کون نکال لیتا ہے؟ پھر یہ پیدائش سے پہلے کہاں تھی، مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے؟ کیا روحانیت کا ادعا صحیح ہے کہ وہ روحوں کو بلا سکتے ہیں؟ ان سے گفتگو کر سکتے ہیں؟ ——— اور مجھے کچھ تصوف کی باتیں یاد آئیں۔ کچھ ویدانت کی، کچھ عیسائیت کی، کچھ سائنس کی ——— اور میں نے آنکھ کر قلب کی روشنی کم کی، آنکھیں بند کیں اور غنودگی کے لیے شاد کا مصرعہ دہرانے لگا۔

ع: نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ——— دفعتاً کمرے کے دروازے سے ایک شخص نے جھانکا۔ بڑے بڑے الجھے الجھے بال لمبی کھچڑی داڑھی اور وحشی چمکتی آنکھیں۔

میں نے ڈر کو دل میں چھپاتے ہوئے کہا "کون؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ جیسا ایک چہرہ، اچھی قمیص، اچھا پاجامہ، ننگے پاؤں، سارے جسم اور کپڑوں پر گرد کی ایک تہہ جمی ہوئی۔ اس پر اس قدر لاغر معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے یا کوئی مصری ممی۔ میرا دل ہچکولے کھانے لگا اور مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں نے بھی افسردہ لب و لہجہ میں پوچھا:

"تو کون ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

"پانچ پیسے!" وہ پہلی بار بولا۔

بھیک مانگنے والے میری چڑ ہیں۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے دستِ سوال پھیلانا انسانیت کی سخت ترین توہین ہے اور بے حیائی اور بے عزتی کی آخری حد۔

میں نے اسی بے جھجک کر کہا "تو اندر کیوں گھسا آ رہا ہے، دروازے پر کھڑا ہو کر صدا لگا!"

اس کی آنکھوں کی چمک اور بھی بڑھ گئی۔ جیسے نکلتے ہوئے کولوں پر سے پھونک کر خاک اڑا دی گئی ہو۔ مگر وہ عاجزی سے بولا "جی مجھے اتنے کا کام بھی تو کرنا ہے۔"

فقیر کی زبان پر کام کا لفظ سن کر میں بھونچکا سا ہو گیا۔

"کیسا کام؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی پانچ پیسے کے عوض کام" اس نے کہا۔

"یہاں کوئی کام نہیں ہے!" میں نے ترش روئی سے جواب دیا۔

وہ اطمینان کے ساتھ میری مسہری کی پٹی کے پاس فرش پر بیٹھ کر بولا "جی آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں۔" اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے اپنا سوکھا ہاتھ بڑھایا ———

میرے دماغ میں چکوں، چوروں، ڈاکوؤں کی ساری کہانیاں فلم کی بدلتی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ دوڑ گئی جو شکار کردہ چوہے سے کھیلتے وقت بلی کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کہا "ڈریئے نہیں بابو جی، میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں، میں ——— میں ایک دوائی ملک کا بھائی ہوں!" اس کی آواز میں غرور کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے کہا "تم! ———" اور میں بے ساختہ زور سے ہنس پڑا۔ یہ صورت، یہ حالت، پانچ پیسے کا سوال، پاؤں دبانے کی مزدوری اور دوائی ملک کا بھائی! مختلف جذبات کے رد عمل نے اس ہنسی کو ایک دیرپا قہقہہ میں تبدیل کر دیا۔ دونوں طرف آنکھوں سے آنسو نکلے، میرے بال ہنسی کی افراط کی وجہ سے اور اس کے بال جھٹکے جانے کے غم و غصہ سے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پہلے جلتی شمعیں اٹھیں، پھر دو آبگینے خشک چہرے کی خاک دھوتے ہوئے فرش پر گرے۔ اس کی تکلیف کی شدت کے احساس نے میرے قہقہے کی آواز اس طرح یکایک روک دی جس طرح "چالو" کارخانے کا شور بجلی کا سوئچ دبانے سے دفعتاً رک جاتا ہے۔ اور مجھے اس طرح کا ایک جھٹکا لگا جیسا تیز چلتے ہوئے موٹر میں اچانک بریک لگانے سے محسوس ہوتا ہے۔

میں نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی بات پر شک کرتا ہوں۔"

اس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "نہیں بابو جی، آپ کی ہنسی بجا تھی۔ میری صورت شکل، میری حالت دیکھ کر ہر شخص کو ہنسی آتی ہی ہے۔ کوئی مجھے دیوانہ کہتا ہے، کوئی مجنوں، لیکن میں نے آج تک کسی کو نہ تو یہ بتایا کہ میں کون ہوں، اور نہ کسی کو اپنا قصہ سنایا۔ ایک عجیب داستان ہے ———"

میں نے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو سے محسوس کیا کہ وہ ایک پڑھا لکھا شریف زادہ ضرور ہے۔ اور میں نے دل دہی کرتے ہوئے

کہا "نہیں نہیں، میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مگر ۔۔۔ اچھا آپ مجھے اپنی کہانی سنائیے" اور میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر جھکا کر کہا "میں نے کہا کہ میں ایک والی ریاست کا بھائی ہوں۔ ریاست کا نام اگر نہ بتاؤں تو آپ برا نہ مانیں گے۔ ریاست بہت بڑی نہیں مگر اس کے نواب کو اپنے حدود کے اندر بڑی سے بڑی سزا دینے کا حق ہے۔ اور اس کے اشارے پر اب بھی ریاست کا بڑے سے بڑا آدمی موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا وزیر اعظم تک کا عہدہ پاتا ہے۔ والد مرحوم نے ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت پر لاکھوں روپے صرف کیے۔ ہم عربی، فارسی، انگریزی، فرنچ ہی نہ پڑھائے گئے بلکہ ہمیں فنشانہ لگانا، سواری کرنا اور جملہ سپاہیانہ فنون سکھائے گئے۔ بھائی صاحب کو اسپورٹس کا زیادہ شوق تھا اور مجھے مطالعہ کا ——— میری فرمائش پر اسٹیٹ لائبریری میں ہزارہا نئی کتابوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ میری خاص پسند کا موضوع فلسفہ تھا۔ میں شروع ہی سے مابعد الطبیعات کی باریکیوں میں الجھنے میں ایک خاص لذت پاتا تھا۔ میرا محبوب ترین مشغلہ یہ تھا کہ میں اپنے استادوں میں سے کسی ایک سے کسی فلسفیانہ موضوع پر بحث کرتا رہوں یا پھر کسی شعر یا کسی نظم کی انوکھی تشریحیں کیا کروں ——— مجھے زیبائش و آرائش، رقص و سرود سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میں نے بدھ کی زندگی اور اس کا فلسفہ بڑے غور سے پڑھا تھا اور میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے اس نیم پختگی ہی کی حالت میں یہ طے کر لیا تھا کہ میں دوسرا بدھ بن کر رہوں گا۔ انھوں نے کچھ دنوں تو تامل کی زندگی بسر کی، ابھی وہ بھی نہ کروں گا۔ میں عیسیٰ کی طرح بن بیاہا رہوں گا۔ اسی لیے جب حضور نے میری شادی کی بات چیت چھیڑی تو میں نے ان سے کہہ بھیجا کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ ان کے لیے میں کی کئی سو بیویاں تھیں، یہ بات بالکل عجیب تھی۔ ڈاکٹر، حکیم، وید بھیجے گئے۔ سرکاری حکم تھا معائنہ کرانا پڑا۔ سب نے باتفاق فیصلہ کیا، کوئی بیماری نہیں۔ ایک خوجہ سرا نے منہ ہوا کر بتایا۔ میری خدمت کے لیے مرد ملازموں کی جگہ کنیزیں رکھ دی گئیں۔ ایک سے ایک ہوش ربا، ایک سے ایک شریر۔ میں نے ان کے افعال و حرکات، جذبات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور پورے محل کو جنسیات کی ایک تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیا۔ جب مہینوں کی روزانہ رپورٹوں میں انھیں میرے رویہ میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا تو وہ بھی آ بیٹھے اور انھوں نے حکم دے دیا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے سب چھوٹے بھائی بہنوں کی شادی ہو گئی مگر میں اپنے مشاغل میں لگا رہا۔

ایک دن صبح کے کوئی سات بجے تھے۔ میں نماز سے فراغت پا کر پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ روش کی دونوں جانب گلاب کھلے ہوئے تھے۔ سرخ، زرد، سیاہ، سفید اور ان پر ہندوستانی، ایران اور مختلف چھوٹی چھوٹی گل دار چڑیاں گر رہی تھیں۔ شہد کی مکھیاں اور بھونرے بھی اپنے اپنے طور پر طواف میں لگے تھے۔ میں دور سے اس حسین منظر کو دیکھ رہا تھا اور غالب کا یہ مصرع میرے دماغ میں گونج رہا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اس پر غور کر رہا تھا کہ کیا واقعی نتائج صحیح ہے۔ کیا ہم چولے بدل بدل کر آتے رہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟ مرتے کیوں ہیں؟ بار بار پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے۔ پھر دفعتاً دماغ اس طرف مڑ گیا کہ ہمارے بوس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی طرح نباتات میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ خوشی بھی محسوس کرتے ہیں، درد و تکلیف بھی۔ پھر جس تحقیق تک سائنس اتنی دیر میں اتنی جستجو کے بعد پہنچی۔ شاعر کی تخیل نے اسے کیونکر اتنی مدت پہلے، محض معمولی مشاہدے کے ذریعہ معلوم کر لیا تھا۔ کیا ایک بڑے شاعر کو الہام ہوتا ہے؟ کیا موجودہ سائنس کی نظر میں الہام بھی کوئی چیز ہے۔

پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ مجھے چھوتی گزرتی جاتی۔ اور میرے خیالات ایک جگہ جمنے کی بجائے نئی نئی پٹریاں بدلتے جاگتے چلے جاتے اور لاینحل سوالات کا ایک بار گونجتے جاتے تھے۔ دفعتاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھائی حضور ولی عہد بہادر، اپنے مشکی پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سائیس میرے عرب نقرہ کی لگام کھینچے لا رہا ہے۔

میں نے سلام کیا تو بولے "ارے یہاں راہب!" انھوں نے مجھے راہب کا خطاب دے رکھا تھا۔ "آؤ چلیں تفریح کرائیں۔"

مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا بہت شوق تھا۔ ایک مہینہ سے زائد ہوا تھا کہ محل کی چار دیواری کے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ آج جو اپنا گھوڑا دکھائی دیا تو دل بے ساختہ چاہا کہ اچک کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤں۔ پھر بھی میں اس وقت صرف کرتہ پائجامہ پہنے تھا۔ اپنے محل کے اندر تو اس لباس میں گھوم سکتا تھا، باہر اس طرح جانے کے خلاف احکام تھے۔ ریاست کے والی کے لیے تو ہر موقع و محل کے لیے مناسب لباس ضروری ہے۔ میں نے بھائی صاحب سے اجازت لے کر جلدی جلدی لباس بدلا اور اپنے عرب پر سوار محل سے نکل گیا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا، برسات ختم ہو چکی تھی۔ زمین نے ہر جگہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے سبزہ و جواہر سنہرے اور ہریالی کی صورت میں اگل دیئے تھے۔ ہوائیں بہت ہی دل پذیر خنکی تھی۔ طائر درختوں پر چہچہا رہے تھے، مشکی اور نقرہ و ملر اور عرب، سبا ہی و سپیدی، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے نرالے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں کچھ بنجاروں کے تمبو دکھائی دیئے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں پورا پورا خاندان۔ ان کے کالے کالے لونڈے دوڑ رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ ان کی عورتیں میلی میلی پھٹی شلواریں، ساریاں، پائجامے اور شلکے پہنے بال گردن سے اٹے ہوئے کوئی ہنڈیا مانجھ رہی ہے، کوئی چولہے میں آگ روشن کر رہی ہے۔ کوئی کھٹرکی دونوں ہاتھوں سے جوئیں پڑے بال کھجا رہی ہے۔ مرد یا تو بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، یا اپنے چھوٹے چھوٹے ٹٹو مل رہے ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نظیر کا مصرعہ نکل گیا: ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

بھائی صاحب نے کہا "جلدی نکل چلو، یہ ٹھہرنے کی جا نہیں!"

ہم نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور چند منٹ میں اپنی مشہور جھیل "رام ساگر" کے کنارے پہنچ گئے۔ کوسوں لمبی جھیل پر ریاست نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے اسے قابل دید بنا دیا ہے۔ اس میں گھاٹ ہیں، سنگ مرمر و سنگ مرمری کے کنارے ہیں۔ اس میں جنگل میں بسنے والے جنگلوں کے مناظر ہیں، پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی ندیوں کے مناظر ہیں۔ اس کے کنارے پر سنگ مرمر کی بنی ہوئی کشتی گاہیں ہیں۔ اس میں تیرنے کے وقت سامان ہیں جو اس دلربا کو حوض بنا سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کا پانی صاف ہے، شیریں ہے اور اس میں کسی قسم کی گندگی کی بھرتی کی اجازت نہیں۔

ہم جھیل کی اس عمارت کی طرف مڑے جو شاہی خاندان کے غسل کے لیے مخصوص تھی اور جہاں کسی دوسرے کو نہانے کی اجازت نہ تھی۔ اور ہم نے دیکھا ——— ہم نے دیکھا ———"

بھکاری شہزادے نے بے تکلف جھپٹ کر میرے سرہانے سے سگریٹ اور دیا سلائی اٹھائی اور ایک سگریٹ جلا کر کئی لمبے لمبے کش لیے۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ اسے یہ دنیاوی بن و سلوی مدتوں کے بعد ملا ہے۔ لیکن وہ اس سے لذت یاب ہونے کی بجائے اسے کسی دوا کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے بیان کرے۔ اس نے آدھی جلی ہوئی سگریٹ زمین پر رگڑ کر بجھا دی اور بجھے ہوئے ٹکڑے کو کان کے پیچھے ٹھونس لیا۔ پھر وہ اسے کان سے نکال کر چٹکیوں سے مسلتا ہوا بولا:

"شہزادیوں کے گھاٹ پر تنگی مادر زاد کھڑی تھی۔ اس کے چکنے رنگ پر طرح طرح ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں طبع آزمائی کر رہی تھیں۔ اس کے لمبے کالے بال ہوا میں اڑتے اور لہراتے سانپ کی طرح بل کھاتے تھے۔ وہ خود پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ ایک چلتے ہوئے جگنو کی طرح اس کا چہرہ ایک بار پھر روشن ہوا۔ ایک چھپاکے کی آواز آئی اور وہ پانی میں غوطہ لگا گئی۔ میں بے ساختہ گھوڑے سے کود کر ادھر لپکا۔ مجھے زوالی عہد بہادر کا خیال تھا۔ نہ اپنی شہزادگی کا، نہ ماحول کا خیال تھا، نہ حالات و واقعات کا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے آج جل پری اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور وہ نظروں سے غائب ہو جانی چاہئے۔ میرا دل پکار رہا تھا کہ اس مجبور روزگار کی اگر پھر جھلک دیکھنی ہے تو جلدی کرو۔

بھائی حضور مجھے آواز دے رہے تھے "کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کچھ نہ سنا۔ میں دوڑ کر دریا پر پہنچ گیا۔ جھک کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ جھیل کی سطح سے بالوں میں چھپا ہوا ایک آدھا چہرہ ابھرا۔ ایسے گھس جیسے نازک اور سفید ہاتھوں نے ان کو جھک کر نیچے کھینچ دیا۔ اور ایک آن واحد کے بعد وہ نظر آنکھوں سے میری آنکھیں لڑیں اور اس نے ایک ہلکی چیخ کے ساتھ پھر غوطہ لگا دیا۔

بھائی صاحب نے اتنی دیر میں عمارت کی نگراں ملازموں کو آواز دے دی تھی۔ اندر سے دوڑتی ہوئی ساری ملازمائیں۔ بھائی حضور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جو نکالنے کی کوشش کی۔ میرے منہ سے بدحواسی میں نکلا "جل پری!" وہ ہنس دیئے "ابھی آئی ہے تمہاری پری گرفتار ہو کے" انھوں نے کہا اور ملازموں کو اشارہ کر دیا۔ ان میں سے دو فوراً جھیل میں چھلانگ پڑیں۔ معلوم ہوا وہ مگر کچھ ایک دو ہوکے تعاقب میں چلے۔

بھائی حضور میرا ہاتھ پکڑ کر ادھر لائے جہاں ہمارے گھوڑے کھڑے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں بالکل انہیں کے سہارے چل رہا ہوں۔ مجھ سے تو بے عمل بالکل سلب کر لی گئی ہے۔ میں دہرہ کر کانپتا تھا جیسے میں کسی بھیانک خواب سے چونک اٹھا ہوں۔ میری اب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ لرزش وہ نوخیز بیٹھے تھے جو ان بندھنوں کے ٹوٹنے سے ہو رہے تھے، جو میں نے اپنی جنسی میدانات کے گرد باندھ رکھے تھے۔ میں نے اپنے لب کی زین سے ہونٹ نکالی اور کھڑے کھڑے سگریٹ جلائی۔ جلدی جلدی دو تین کش لگائے جب جا کر میری یہ کیفیت کم ہوئی۔

ملازمین اسے پکڑ کر لائیں۔ بھیگے جسم پر بیل خوشک سلوٹ کر کے نیچے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوا۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مشک کے دو ناقوں کے درمیان کافور کی ایک ڈلی۔

بھائی حضور نے کڑک کر پوچھا "کون ہے ری تو؟"

اس نے نڈری سے جواب دیا "شہزادی!"

وہ مسکرا دیئے "اچھا، جب ہی آپ شہزادیوں کے گھاٹ پر نہا رہی تھیں!"

ملازموں میں سے ایک بولی "سرکار یہ نجارن بڑی نٹ کھٹ پاجی ہے، نہ جانے کیسے گھس آئی سرکاری گھاٹ میں۔"

بھائی حضور نے کہا "اچھا! اسے شام کے دربار میں پیش کرنا۔"

اتنی دیر میں کئی سرکاری ملازم بھی آ گئے تھے۔ سب نے سلام کیا اور "شہزادی" کو گھیرے ہوئے گھاٹ کی عمارت کی طرف لے گئے۔ میں خاموش تھا۔ بھائی حضور ولی عہد تھے۔ سرکار کے بعد انہیں کا ساری ریاست میں حکم چلتا تھا۔ میں اگر کچھ کہتا تو نہ جانے ملازم اور ملازمین مانتے بھی یا نہیں۔ لیکن دل میں پھنکے گئے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور منہ کا ذائقہ کڑوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے بخار کا مریض ہوں۔

بھائی صاحب نے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا "لو تمہاری بلا ٹلی تو بخشاں نکلی!"

میں نے کہا "آپ نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا ہوتا۔ دوبارہ میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولے "شاہی گھاٹ پر نہانے کا جرم چھوٹا نہیں، اس کی سزا سات برس کی قید سے لے کر موت تک ہے۔ اس لیے سرکار ہی فیصلہ فرمائیں گے۔"

میں نے کہا "مگر ——— مگر!" ——

ان کے چہرے پر دفعتاً وہ سختی اور بے رحمی جھلکنے لگی جو مطلق العنان والیوں کے چہرے پر تازہ احکامات صادر کرتے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہی جو ان کو انسان کی جگہ درندوں سے مشابہ بنا دیتی ہے۔ اور وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ میرا فقرہ ادھورا ہی خود بخود ساتھ ہو لیا۔ جیسے وہ بھی تنگی کے قدم بقدم چلنے میں اپنی فلاح سمجھتا ہو۔

محل میں واپسی پر میں اپنے بستر پر جا کر گر پڑا۔ کنیزیں میرے جوتے اور کپڑے اتار لے دور ہٹیں تو میں نے جھڑک دیا۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو میں نے ایک کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا سن سترہ برس سے زیادہ نہ تھا اور وہ سب میں حسین تھی۔ وہ اس وقت کچھ سہمی سی بیٹھی میں دیکھنا چاہتا کہ کیا ہر عورت کے اعضا میں وہی تناسب ہوتا ہے جو شہزادی کے نیم عریاں لباس سے جھلکتا تھا۔ کنیز تھوڑی دور پر آ کر دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ میں نے اشارہ سے اور قریب بلایا۔ وہ آئی مگر ڈرتی ہوئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے اچانک التفات سے گھبرا گئی ہے۔

میں نے کہا "ڈرو نہیں، میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

میرے لب و لہجہ سے وہ ذرا مطمئن ہوئی۔ اس کے لبوں پر بھی سی مسکراہٹ آ گئی۔

میں نے پوچھا "تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے؟"

اس نے سر جھکا کر کہا "آپ کی خدمت کے لیے"

"کس طرح کی خدمت؟"

اس نے کہا "ہر طرح کی!"

میں نے کہا "میرے سامنے ننگی ہو کر ناچو گی؟"

اس نے کہا "کنیز ہوں، جیسا حکم ہو!"

مجھے غصہ آ گیا "نہیں چاہیے مجھے تمہاری کنیزی ——— جیسوں پر بکنے والو جاؤ چلی جاؤ میرے سامنے سے، دور ہو جاؤ!" میں چیخا اور وہ ایک پٹے ہوئے کتے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔

میں پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ دو حسین تصویریں بار بار میری آنکھوں میں پھرتی تھیں۔ غوطہ لگاتی ہوئی مچھلی پری اور ملاحوں کے درمیان کھلا کی کلی ——— جو بے عاقبت اندیشی کی صلاحیت دفعتاً سلب ہو گئی میں جھپٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ پھر "شیر دل" پر بیٹھا اور سرپٹ بھاگتا ہوا جھیل کے کنارے شہزادیوں کے گھاٹ پر پہنچا۔ ملاحیں اب کے باقاعدہ پہرہ دیتی ہوئی ملیں۔ انھوں نے شہزادی کو ایک کمرہ میں بند کر رکھا تھا۔ وہ اس کے دروازے پیٹ پیٹ کر ان کو کوس رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوا تو اس کی ساری کا آنچل کمر میں پھنسا تھا۔ اور اس کے بال کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ اور اس کے گال بالکل لال ہو رہے تھے۔ یہ تیسری تصویر پہلی دو تصویروں سے بھی زیادہ دلربا تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں پڑے ہوئے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"آپ جھوٹے شہزادے ہیں؟" اس نے سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔ اور مجھے دفعتاً یہ یاد آیا کہ میں ایک شہزادہ ہوں۔ میں ایک سرکاری جرم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ حضور عالی کے احکام بڑے سخت ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بن کھلی کلی ہی نہ ہمیشہ کے لیے مرجھا جائے بلکہ مجھے بھی نظر بندی یا قید تنہائی کی سزا بھگتنا پڑے۔ میں جلدی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شہزادی میرے قریب کھسک آئی۔ ساتھ ہی دیر میں اس کی نسوانی فطرت نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کا مالک و شیدا، اس کا غلام بھی چکا ہوں۔ وہ مجھے موم کی طرح جدھر چاہے موڑ سکتی ہے۔ اس نے دفعتاً میرے کندھے سے سر لگا کر کہا:

"میرے شہزادے! مجھے چھوڑ دیجئے!"

میں حضور عالی کی خفگی کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے پلنگ سے اتر کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہا "میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، چھوڑ دیجئے!"

"میں بے بس ہوں شہزادی، مجھے چھوڑنے کا اختیار نہیں!"

وہ طنز سے ہنسی "اچھے شہزادے ہیں! ایک جرم بھی چھوڑ نہیں سکتے!"

میں نے کہا "اگر چھوڑ بھی دوں، تو بھی تجھے پھر پکڑ لیں گے۔ شاہ کے دربار میں حاضری ضروری ہے"

وہ بولی "ہونہہ! بس اس گھاٹ سے نکل جانے دیجئے۔ پھر دیکھوں گی کون پکڑ لیتا ہے"

میں نے کہا "اچھا چلی جا! مگر ــــ مگر ــــ میں کیسے ــــ"

اس نے جھک کر سرگوشی کی "میں ملنے آؤں گی شہزادے!" اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ ملازموں نے روکنا چاہا۔ میں نے کہا "جانے دو!" اور وہ تیز لپکتی ہوئی اس طرف چلی گئی جدھر بنجاروں کا قافلہ پڑا تھا۔

شاہ کے دربار میں وہ تو نہیں پیش ہوئی۔ البتہ سارے بنجارے بندھے کھڑے تھے۔ لیکن حضور عالی کے بار بار پوچھنے پر بھی کسی نے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں گئی۔ دھمکیاں دی گئیں، پیٹا گیا لیکن کوئی بھی اس کے سوا نہ بولا کہ وہ بھاگ گئی۔ مجھ پر بھی عتاب شاہی نازل ہوا۔ قانون شکنی کی گئی۔ جرم کو فرار میں مدد کیوں دی گئی۔ میں خاموش سر جھکائے سب سنتا رہا۔ حضور عالی نے ڈانٹا۔ بھائی حضور نے مذاق اڑایا۔ وزرا نے نصیحت کی مگر میرا سکوت نہ ٹوٹا۔ بالآخر حضور عالی نے جھلا کر ایک مہینہ محل میں نظر بند رہنے کا حکم سنا دیا۔ میں اسی طرح چپ سادھے اپنے حصہ میں چلا گیا۔ اور پلنگ پر لیٹ کر اس پر غور کرنے لگا کہ خوشہ شہزادی کہاں گئی۔ اور میں اسے پھر کیسے دیکھوں گا۔ پھر یہ بھی الجھن کہ میں اس بنجارن کے پیچھے کیوں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ والئ ملک کا بیٹا اور نیچ ذات کی عورت کا عشق۔ لوگ کیا کہیں گے؟ بھائی حضور نے تو آج بھرے دربار میں رسوا کیا۔ کل سارے ملک میں تشہیر ہوگی۔ حضور عالی کے غصہ کا پارہ کس ڈگری پر پہنچے گا۔ سرکار عالیہ کے سامنے اگر پیشی ہوئی تو ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مگر ــــ مگر ــــ کیا اسی کو عشق کہتے ہیں؟ میں تو اس سے کوئی بھی غرض نہیں رکھتا۔ میں تو شہزادی کو صرف خوش، چلبلی کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھر اس قدر فکر کیوں؟ ممکن ہے کہ اس کا بھی کوئی جنازہ ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم بھر میں کسی نے ایک ساتھ بہت سی سوئیاں چبھو دیں ہیں

تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہرگز نہیں! وہ میرے ہی ساتھ رہے گی۔ میں اسے سب کچھ کھو کر جیت لوں گا! میں نے ٹہلنا شروع کیا۔ پورے کمرے کی سینکڑوں بار پیمائش کر ڈالی، فرش کچل ڈالا۔ لیکن الجھن بڑھتی ہی جاتی تھی۔ میری خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہے کیا کہ کبھی سارے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رگوں میں برف اتاری جا رہی ہے۔ میں نے کمرے کے باہر روش پر ٹہلنا شروع کیا۔ مختلف طرح کے ہندوستانی اور انگریزی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا ان کی خوشبو سے معطر تھی۔ لیکن مجھے سوائے اس کے کسی بات کا احساس نہ تھا کہ میرے دماغ میں کوئی کیل سی ٹھونکتا جاتا ہے۔ کھٹ! کھٹ! کھٹ!

اور اس نے وقفتاً اپنی لمبی لمبی انگلیاں بڑھا کر اپنی کھوپڑی پر اس طرح ماریں کہ معلوم ہوتا تھا واقعی ہتھوڑی سے کیل ٹھونکی جا رہی ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ قصہ بیان کرتے کرتے اس کی وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ اور کہانی کی ابتدا میں جو رحم اور ہمدردی کا جذبہ مجھ میں پیدا ہوا تھا اس کی ایک ہلکی سی گھبراہٹ، ایک خفیف سی سراسیمگی غالب آتی جاتی ہے۔ رات کا سناٹا، تاریکی، دور دور تک ہمارے سوا کسی انسان کا موجود نہ ہونا۔ ان چیزوں نے پھر تحت الشعور میں دبا ہوا خوف ابھارنا شروع کیا تھا۔ اور اس کے ابھارنے کا سبب قصہ کا موضوع نہ تھا۔ وہ تو کافی شیریں، دلچسپ اور دلپذیر تھا، بلکہ بنگلے کا پورا ماحول تھا اور قصہ گو کا انداز اور اس کا حلیہ۔

میں نے اسی لیے قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے سوال کیا "تو شہزادی سے آپ کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

وہ بولا "نہ ہوتی تو آج یہ گت کیوں بنتی! اسی رات ہوئی۔ تقریباً بارہ بجے جب میں اپنے کمرے میں پٹائینہ کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے خیال کیا نگاہ کا دھوکا ہے۔ آنکھیں مل ڈالیں۔ وہ اتنی دیر میں اچک کر اندر آ چکی تھی۔ میں نے کہا "تم! تم!"

وہ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑا کر بولی "میں نے وعدہ کیا تھا شہزادے!"

میں نے شرع و آئین سب کو پس پشت ڈال کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا "میں اس لیے نہیں آئی شہزادے۔"

"پھر کیوں آئیں؟"

وہ بولی "مجھے آپ کی مدد کی اب بھی ضرورت ہے۔ مجھے ایک تیز اور مضبوط گھوڑا چاہیے۔ کل میں آج ہی رات ریاست کی سرحد سے نکل جاؤں۔"

میں نے کہا "اور میں؟"

وہ بولی "آپ شہزادے ہیں! آپ میرے جیسی عورت کو بیوی نہیں بنا سکتے!"

"مگر میں تو بغیر تمہارے زندہ ہی نہیں رہ سکتا!"

"تو پھر آپ کو ہمارہ بننا پڑے گا!"

میں نے کہا "منظور!"

اور ہم اسی رات اپنے نقرہ اور مشکی پر سوار ہو کر سرحد سے نکل گئے اور میں چھ ماہ تک اس کے ساتھ بنجاروں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہمارے سر پر کبھی ایک کمبل کا سائبان ہوتا، کبھی وہ بھی نہیں۔ مگر ہر لمحہ جنتی ہوتا۔ شہزادی کے ہر فعل میں ایک خاص ادا ہوتی۔ دلفریب،

دلپذیر، راحت انگیز اور میرا جی چاہتا تھا میں اسے دیکھے جاؤں۔ چلتے پھرتے، چلتے بولتے، کام کرتے، سوتے، اٹھتے بیٹھتے۔ اور میں جی بھر کر دیکھتا پھر بھی دل سیر نہ ہوتا۔ طبیعت نہ بھرتی۔ میں کبھی کبھی سوچتا، کیا جنت میں اس سے زیادہ خوشی ممکن ہے اور ہماری اس جنت میں ایک دن ایک سانپ آ ہی گیا۔

میری مفروری اور گم شدگی کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ اشتہارات دیئے گئے تھے۔ حلیہ شائع کیا گیا تھا۔ انعامات کا اعلان ہوا تھا۔ آدمی پھیلائے گئے تھے۔ اس ہی میں سے ایک کمبخت اتفاقاً جنگلوں کے بیر تلے کو دیکھتا، تو وہ لیتا ہم تک پہنچ ہی گیا۔ وہ مجھ سے ملا۔ حضور عالی کی بیماری کی اطلاع دی۔ سرکار عالیہ کے بستر مرگ پر ہونے کی خبر سنائی۔ میں نے کہا "سوائے شہزادی کے اب میرا کوئی نہیں!" اس وقت تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا مگر شب میں جب ہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے، دس بارہ آدمیوں نے ہمیں اچانک گھیر لیا اور شہزادی کو رسیوں سے باندھ کر ایک فیٹن میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہا گیا "گھوڑا حاضر ہے، آپ کو ہی چاہیے تو ساتھ چلئے ورنہ ہم اسے لیے جا رہے ہیں" چارہ کار ہی کیا تھا۔ ہم دونوں سفر کر کے دربار میں حاضر کیے گئے۔ حضور عالی نے حکم دیا "اس پاجی عورت کو سپاہیوں میں سے کسی ایک کو دے دو کہ اپنا گھر بسائے اور صاحبزادے کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا کر میرے سامنے حاضر کرو" میں اس ذلت کا تحمل نہ ہو سکا۔ میں نے بھرے دربار میں کہہ دیا کہ "شہزادی میری بیوی ہے۔ اگر کسی سپاہی نے ہاتھ لگایا تو میں اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر جیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔"

حضور عالی نے طنز سے پوچھا "بیوی ہے؟ کس نے نکاح پڑھا تھا؟"

میں نے کہا "میں نے خود!"

وہ جانتے تھے، مذہباً میں اسے کر سکتا ہوں۔ اس لیے ان کے لیے جواب تو ساکت ضرور تھا مگر اس سے ان کا غصہ بھڑک اٹھا۔ انھوں نے حکم دیا "ان دونوں کو جیل میں ڈال دو، مگر الگ الگ کر دو میں!"

ہم دونوں قید کیے گئے۔ مگر اتفاق کی بات کہ اسی شب میں حضور عالی کو قبض و درد پڑا اور صبح ہوتے ہوتے وہ اپنے سے بھی زیادہ سخت مگر عادل نگی کی عدالت میں طلب کر لیے گئے۔ آٹھ بجے دن کو جب میں قیدیوں کا لباس پہنے اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تھا یہ خبر ملی۔ مجھے اس حادثہ پر کوئی رنج نہ ہوا۔ اس لیے کہ میں انھیں باپ کی جگہ اپنی شہزادی پر ظلم کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے انھیں افسوس کیا اور نہ ہی میں نے آنسو بہائے۔ ہاں اس کی خوشی ضرور تھی کہ بھائی حضور کو تخت ملا۔ وہ نسبتاً یقینی رحم دل تھے چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں اس کا ثبوت ملا۔ وزیر اعظم خود میری رہائی کا پروانہ لے کر قید خانہ آئے۔ میں نے کہا "میں بغیر شہزادی کے رہا ہوں گا" اس کی رہائی کا بھی حکم آ گیا اور ہم دونوں بند موٹر میں بٹھا کر محل میں پہنچائے گئے۔

میں نے اپنے خاص محل میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدلے اور شہزادی کے بارے میں خواصوں کو ہدایت دے کر میں بھائی حضور کی خدمت میں نذر گزارنے حاضر ہوا۔ انھوں نے گلے لگایا۔ دلدہی کی اور حضور عالی کے وقتی دکھی کے سارے فرائض میرے سپرد کیے۔ میں نے انھیں بخیر و خوبی انجام دیا اور میں بہ اطمینان اپنے محل میں رہنے لگا۔

شہزادی کو سارے ممکن آرام مہیا تھے۔ ماما، دائیاں، خواصیں، کنیزیں ہر وقت خدمت میں لگی رہتیں۔ میں اب بھی بھونرے کی طرح اس کے گرد پھرا کرتا۔ تفریح کے لیے موٹریں تھیں، خرچ کے لیے روپے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ سست رہنے لگی۔ اس پر محل میں قیام کا وہی اثر ہوا جو ایک آزاد چڑیا پر ایک سونے کے پنجرے میں بند کر دیئے جانے کا ہوتا ہے۔ اس کے شہابی رنگ پر طلائی رنگ غلبہ کرنے لگا۔ اس کی

سیاحت نے مجھے بری طرح کی انجماد بت اختیار کرنا شروع کی۔ میرے خوشی کے چمن میں فکر کی کانٹے دار جھاڑیاں نکلنے لگیں۔ میں اس کو خوش رکھنے کی مستقل پر غور کر رہی رہا تھا کہ ایک شب کو جب میں بارہ بجے کے بعد دربار سے پلٹا تو میں نے محل کو اس سے خالی پایا۔ گھر کا کونہ کونہ ڈھونڈ ڈالا وہ کہیں نہ تھی مگر کمرے میں بدحواس پھر پلٹا تو تکیے کے نیچے ایک پرزہ ملا "شہزادے! میں جاتی ہوں مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے لیکن بنجاروں کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ!" میں نے اس شب میں پہلی دفعہ شراب پی اور اتنی پی کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

صبح کی اعصاب شکنی اور دوسرے نے مجھے پہلی دفعہ اپنی ظاہری حالت کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے دیکھا کہ کرتے کے گلے کے سارے بٹن کھلے ہیں۔ دامن اور آستین پر بدبودار دھبے ہیں اور کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی سے پڑی ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے شب میں شراب پی، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شرمندگی اور خجالت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سر کا درد اتنا تھا کہ جیسے میں نے رات بھر خاک چھانی ہے۔ کچھ ترش، کچھ کڑوا سا تھا۔ حد درجہ پیاس، حلق میں کانٹے سے پڑے تھے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور حمام میں گھس گیا اور محل میں میں نے پہلے دن آباد خانے کے سرد سرد گھاس کی جگہ پائپ کا پانی چھلو لگا کر پیا۔ پھر جلدی جلدی کپڑے اتار کر نیم گرم پانی سے خوب نہایا۔ جب میں تولیہ لپیٹے باہر نکلا تو میں نے دیکھا زہرہ میرے بستر کی چادر بدل رہی ہے اور خود بخود اس بلی کی طرح سکڑ رہی ہے جس نے تھوڑی دیر قبل گھر کا پالتو سفید چوہا کھا ڈالا ہو۔ اس کے بھیگے ہوئے بھیگے بال اس کے شاہد تھے کہ وہ بھی ابھی غسل کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نیم سپردگی، نیم ناشناسا جھلک تھی۔ مجھے یقین آ گیا کہ رات کی مدہوشی میں میں نے اسے شہزادی کی جگہ دے دی ——— اور مجھے خود اپنے سے نفرت ہو گئی۔ میں ڈاکو تھا، بے زبانوں اور کمزوروں کی پونجی لوٹنے والا ڈاکو! میں نے ایک کنیز کو اپنایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی بلکہ اس لیے کہ اس کا جسم میرے لیے خریدا گیا تھا۔ میں نے اس سے اس کی پسند کا حق زبردستی چھین لیا تھا۔ پھر میں نے شہزادی کی ملکیت پر دوسرے کو قبضہ کر لینے کا موقع دیا۔ میں نے چند گھنٹوں میں اپنی تمام روایات کو بھلا دیا جو دامن و مجنوں و فرہاد و سیر نے اپنا سب کچھ کھو کر محبت کرنے والوں کے لیے چھوڑی تھیں۔

میں اسی پیچ و تاب میں گرفتار تھا کہ بھائی حضور کا حکم نامہ آیا "سرکار عالیہ نے یاد فرمایا ہے، فوراً حاضر ہو" مجھے یقین ہو گیا کہ مخبروں نے سارے واقعات کی خبر پہنچا دی ورنہ میں یوں نہ یاد کیا جاتا۔ سرکار عالیہ نے جس دن سے شہزادی کے متعلق یہ معلوم کیا تھا کہ وہ بنجارن ہے، مجھے عاق کر دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ جب تک یہ ناگوار اور ذلیل تعلق قائم رہے گا، وہ میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ شاید اس دیوانگی سے پہلے اس طرح کا حکم میرے لیے موت کے برابر ہوتا۔ اس لیے کہ میں ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور مجھے بھی وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ لیکن شہزادی کی محبت نے میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کیا تھا کہ میں اس کے علاوہ نہ کچھ سوچ سکتا تھا اور نہ مجھے کسی اور کی دنیا میں پرواہ رہ گئی تھی۔ اس لیے مجھ پر نہ تو حضور عالی کی خفگی اور موت کا کوئی اثر ہوا تھا اور نہ سرکار عالیہ کی ناراضگی کا ——— میں نے دنیا اسی کے پیچھے تج دی تھی ———

اس دن جبکہ میری محبت نفرت میں تبدیل ہو رہی تھی مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی کس حد کا خود غرض، کینہ خصائل اور رذیل طبیعت ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک بنجارن کی محبت میں باپ کی شفقتوں کو اور ماں کی محبتوں کو بھلا دیا۔ مجھ میں نہ تو خاندان کا لحاظ رہا نہ باقی رہ گیا تھا اور نہ اس کا احساس کہ میں ریاست بھر میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہوں۔ دنیا مجھے کیا کہتی ہو گی۔ اور میرے فعل سے ریاست اور اس کے والی کی کتنی سبکی ہوتی ہو گی۔

میں نادم و ہراساں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کے لیے جھکا ہی تھا کہ ان کے اشاروں پر کنیزوں، خلاصیوں نے صدقہ اتارنا شروع کیا۔ غلہ، کپڑا، روپے، میں نے اجازت لے کر بیٹھنا چاہا اور انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے چھاتی سے لگا لیا اور ماتا سے بے چین ہو کر رونے لگیں، میری آنکھوں سے بھی ندامت کے آنسو گرے۔ ایک لفظ شکایت یا نصیحت کا زبان پر نہ لائیں۔ جس بار بار چہرہ دیکھتیں اور باغ باغ ہو جاتیں۔ میں دل میں کٹتا رہا کہ ایسی چاہنے والی ماں کے ساتھ میں نے اس طرح کا سلوک کیا۔ انھیں اس حد کی اذیت پہنچائی۔

غرض وہاں سے دل میں طے کر کے اٹھا کہ شہزادی کا خیال دل سے نکال کر رہوں گا اور اب اسی طرح کی زندگی بسر کروں گا جو ایک والئ ریاست کے بھائی کے شایانِ شان ہے۔

ان سے رخصت ہو کر نکلا ہی تھا کہ اطلاع ملی، بھابی حضور منتظر ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے خوب خوب سلام لیے۔ ان کو بھی اس کا دکھ تھا کہ میں نے کبھی ایسی عورت کا اپنے لیے انتخاب نہیں کیا جو ان کے ہم پلہ ہوتی۔ جس سے وہ بہنوں کا سا سلوک کر سکتیں۔ میں نے ہنس کر کہہ دیا "یہ تو آپ بزرگوں کا کام ہے، آپ نے کیوں تلاش نہ کی" وہ خوش ہو گئیں، بولیں "آج ہی لوہیں سرکار عالیہ کا عندیہ لے لوں، پھر دیکھو اس کی بجائے ایک چاند سی دلہن نہ لے آئی تو تم ہی کہنا" انھوں نے اسی دن سے کچھ اس طرح کی جوڑ توڑ لگائی کہ ہمسایہ ریاست کے والی کی صاحبزادی سے جس کا بقول مشاط "ایک گال چاند تھا تو ایک گال سورج" ایک ہی ہفتہ کے اندر رشتہ طے پا گیا۔ اور یہ بھی طے ہو گیا کہ سرکارِ عالی کا سوگ اترتے ہی یہ بیاہ کی شہزادی میری دلہن بنا دی جائے گی۔ میں نے اس دوران میں اپنے کو اس قدر مشغول بنا رکھا تھا کہ مجھے اپنی شہزادی کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ صبح کو میں غسل کرنے کے بعد فوجی بارکوں سے چلا جاتا۔ وہاں ایک گھنٹہ تک معائنہ کرتا۔ پھر مقدمات سنتا۔ بارہ بجے کے قریب واپس آ کر کھانا کھاتا اور فوراً لائبریری میں چلا جاتا۔ وہاں مطالعہ کرتا یا لکھتا۔ چار بجے کے قریب چائے پی کر گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کو نکل جاتا اور اسی سلسلہ میں فوجی بارکوں سے ہوتا ہوا آٹھ بجے شب کو پلٹتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بھابی حضور کے پاس بیٹھتا۔ اکثر ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ کبھی ان ہی کے ساتھ سے نوشی میں مشغول ہو جاتا، کبھی گھر آ جاتا اور زہرہ ساقی کے فرائض ادا کرتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب تک میں اپنے حواس میں رہتا میں اپنے کو اور زہرہ کو حد درجہ تنفر کی نگاہ سے دیکھتا۔ لیکن جہاں مدہوش ہوتا تو پھر جسم کی پکار دل کی پکار پر غالب آ جاتی۔

اسی طرح تقریباً دو سال گزر گئے اور وہ دن بھی آ گیا جب میں نئی دلہن کو رخصت کرا کے گھر گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بلا کی آندھی آئی تھی۔ ہر طرف سے بادل اٹھے چلے آ رہے تھے۔ زہرہ و مشتری تو کہیں، ایک ننھا سا تارا بھی کہاں نظر نہ آتا تھا۔ پھر اس پر وہ گرج کہ الامان۔ ہر جاندار اپنی اپنی جگہ پر سٹا غافل بیٹھا تھا مگر ہمارے وہاں محل میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ چھاتک پر شہنائی بج رہی تھی۔ محل میں بجلی کے رنگین بلبوں اور چمکتے ہوئے قمقموں سے قوسِ قزح کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ ریاست کے سارے امرا اور رؤسا دعوتِ ولیمہ کھانے میں مصروف تھے اور میں دولہا کی مصنوعی متانت سے اپنے ہمسنوں کے مجمع میں کچھ شغل کر رہا تھا کہ اندر سے حکم آیا، میں بلایا جا رہا ہوں۔

میں کچھ جھومتا کچھ جھکتا اس مقام پر پہنچا جہاں بھابی صاحبہ سہیلیوں کے جمگھٹ میں ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں، مجھے دیکھتے ہی بولیں "کیا آج کی رات بھی اس موئی شراب کی مدد کی ضرورت تھی؟"

اور قبل اس کے کہ میں اپنی خجالت مٹانے کے لیے کوئی جواب دوں انھوں نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا اور قہقہوں

کے پھول بکھراتی چلی گئیں۔

جس ذاتی کو صنعت گری و فنکاری جس قدر دلآویز و دیدہ زیب بنا سکتی ہے اس کا نمونہ اطلس و حریر میں لپٹا پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر ساکت و ساکن پڑا تھا۔ مستی و مدہوشی پیدا کرنے والے بخورات فضا میں عطر بیزی کر رہے تھے۔ کمرے کی ہر شے قیمتی اور نئی ہونے کی وجہ سے اپنی جگمگاہٹ سے آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور چھاتک پر بجتی ہوئی سریلی بانسری کی ہلکی ہلکی سحر کن آواز پاؤں کو ایک خاص تال و سم پر اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نیم وا آنکھیں مسہری پر جمائے، کچھ جھومتا، کچھ لڑکھڑاتا، دار فنگی اور سرخوشی کی حالت میں کام و دہن میں ایک خاص طرح کا ذائقہ محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً کمرے کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرم ریشمی دھاگا جو مجھے مسہری کی جانب کھینچ رہا تھا۔ دفعتاً ٹوٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی شریر نے خاص طور پر اس کمرے کی روشنیاں گل کر کے مجھے اندھیرے میں اپنی منزل اور اپنا مرکز کشش ڈھونڈنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں پورے محل کے شور و غوغا نے بتا دیا کہ یہ تاریکی عام ہے۔ میں نے مسہری پر ایک سرسراہٹ محسوس کی۔ دروازے کی طرف پلٹتے پلٹتے اُدھر چلا۔ غالباً نئی دلہن لیے گھونگھٹ سے میرا دامن دیکھ رہی تھی اور اب اندھیرے نے مجھے ایک تاریک تر سایہ بنا کر اس کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ حرکت منزل تک پہنچنے کے لیے میرا سہارا بن جاتی لیکن دفعتاً ایک جانا پہچانا نرم نرم ہاتھ مجھے کھڑکی کی جانب کھینچنے لگا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا "شہزادی؟"

کان کے قریب منہ لا کر جواب دیا گیا "ہاں! باہر چلیے" ——— اور میں خاموش ساتھ ساتھ ہو لیا۔ لان پر دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ بھائی حضور کا مشکی اور میرا اقرہ۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چور دروازے سے ہو کر جہاں آج کے بنگلے میں کوئی پہرہ نہ تھا، محل کے باہر نکل گئے۔ میں نے شکایتوں کا باب جب کھولا تو شہزادی کے جواب نے مجھ میں بازپرس کا یارا باقی نہ رکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے سر کو جھٹکا دے کر بولی "میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارا معصوم پہلی سانس کھلی فضا کی جگہ کہیں اور لے۔"

اب حرف و حکایت تھی تو اس کی کہ وہ کیسا ہے، کہاں ہے، کب پیدا ہوا اور اس وقت اس کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟ اس خوبصورت شیریں کو اس نے دراز سے دراز تر کر کے بیان کیا۔ اور میرا دل ہی نہ بھرتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس افسانہ کی جلدیں بڑھتی ہی چلی جائیں۔ ہم ساری رات چلتے رہے۔ کبھی تیز کبھی آہستہ، مگر اس پورے طویل سفر میں مجھے ایک سیکنڈ کے لیے نہ تو بھائی حضور کے غم و غصہ کا خیال آیا اور نہ وہ غریب قمر چہرہ دلہن یاد آئی جو میرے اس طرح غائب ہو جانے سے مختلف طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنی ہو گی۔ دو سال سے چھوٹی ہوئی شہزادی میرے ساتھ تھی، مجھے کسی اور سے کیا مطلب؟۔

صبح کے قریب ہم ریاست کے حدود سے باہر پہاڑوں کے ایک ڈیرے میں پہنچے۔ وہاں پہلی دفعہ اپنے نور نظر کو شمع جلا کر دیکھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے پالنے میں سو رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ بھولی صورت میرے دل میں اتر گئی۔ یہ بھولی شہزادی کی تصویر تھی۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ، وہی خلائی آنکھیں، اور سونے میں وہی ہلکی مسکراہٹ جو میں نے بارہا شہزادی کے چہرے پر دیکھی تھی اور جس نے اکثر راتوں میں مجھ سے میری نیند چھین لی تھی۔ ہم دونوں اس پر جھک پڑے۔ کبھی جگر پارے کو دیکھتے، کبھی ایک دوسرے کو۔ شہزادی کی نظر میں غرور، افتخار، تفخر تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھاتے وقت ایک کامل صناع کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہ کہتی تھیں "دیکھیں تم نے میری تخلیق؟

بھلا یہ پھول تمہیں شیش محل میں کہاں نصیب ہوتا؟ یہ تو پہاڑوں کا پھول ہے۔ کھلی ہوا، آزاد فضا اور شبنم و یاسمین، لالہ و گلاب، سنبل و بنفشہ کی آمیزش وغیرہ وہاں کہاں نصیب؟" میری آنکھیں بار بار اس تطریق میں منہمک تھیں کہ ان دونوں میں دلربائیت کس میں زیادہ ہے۔ بلال میں یا بلبل میں۔ غنچۂ ناشگفتہ میں یا گلاب تازہ میں۔

پھر نے ماں کی خوشبو پائی، سوتے میں کلبلایا، اس کے پنکھڑیوں جیسے لب کھلے اور اس نے "امی! امی!" کہہ کر ادھر کروٹ لی جدھر شہزادی کا چہرہ تھا ——— اور میں نے شہزادی کی چوتھی تصویر دیکھی جو پیشتر کی تینوں تصویروں سے بھی زیادہ دلکش تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سنہری لہر دوڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک برق سی کوندی۔ اس کی کنپٹی کی سبز سبز رگیں سکیڑیں اور پھیلیں۔ اور اس نے جھک کر بچے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں کے گرد ایک سفید ہالہ بن گیا!"

اس نے پھر مڑ کر سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے سگریٹ پیش کی۔ وہ دو تین لمبے لمبے کش لگا کر بولا "میں نے بہت دنوں سے کوئی اچھی سگریٹ نہیں پی تھی۔ آہا آپ نے پلائی تو شہزادی کے دن یاد آ گئے!" پھر اس نے سگریٹ کو فرش پر رگڑ رگڑ کر چور کر دیا۔ جیسے وہ اپنی ان ساری یادوں کو خاک میں ملا رہا ہے۔ جو شہزادی سے ملاقات کے قبل والی زندگی سے متعلق تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:-

"ہم نے دو برس عجیب طرح کی خوشی میں گزارے۔ کبھی ہم جھونپڑیوں میں سوئے، کبھی اپنی چھوٹی سی راوٹی میں، کبھی ہم نے درختوں کے نیچے بسیرا جمایا، کبھی ہم نے جنگلوں میں شاخوں پر بسیرا کیا۔ مگر ہر لمحہ مسرت سے لبریز تھا۔ ہر وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہا ہوں جس کے لیے میری تخلیق ہوئی تھی۔ مجھے کبھی بھی بنجاروں کے بیچ میں بیٹھ کر اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔ میں نے کبھی ان کی سادہ و جفاکش زندگی میں کوئی غیریت نہیں پائی۔ انھوں نے مجھ کو اپنا لیا تھا اور میں نے ان کو ———

جب ریاست کا کوئی جاسوس یا پولیس کا کوئی سپاہی ہمیں ڈھونڈتا ہوا ان کی جانب آ نکلتا تو ہمیں بہت پہلے سے اطلاع ہو جاتی اور ہم کسی قریب کے جنگل میں کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتے۔ پھر ہم نے کبھی ایک ٹولی کے ساتھ ایک ماہ سے زیادہ بسر نہ کیا۔ ہم ان خانہ بدوشوں کے جس گروہ میں پہنچ جاتے۔ شہزادی ان کی لڑکی ہوتی اور میں داماد۔ ہر ایک ہماری آؤ بھگت کرتا اور دل و جان سے ہماری خدمت پر مستعد دکھائی دیتا۔ ہم نے ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ لیکن شہروں کے قریب پہنچتے ہی ہم ہمیشہ ان میزبانوں کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ہم جانتے تھے شہروں میں پولیس کے اڈے ہیں اور ان کے پاس ہمارے حلیے۔ پہلے ایک ریاست کو میری گرفتاری کی فکر تھی اب دو ریاستیں میری تلاش میں ہیں۔ اس لیے آزادی کی زندگی دیہاتوں میں تھی، پہاڑوں میں تھی ——— شہزادی اور میں نے فرار کے وقت اتنا کچھ ساتھ رکھ لیا تھا کہ وہ ہماری عمر بھر کے لیے بہت کافی تھا۔

وہ رک کر کچھ سوچتا رہا۔ اس کی نظریں فضا میں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے لمبی سانس لے کر کہا "ہمالیہ کی وادی میں میری پہلی بار لنو سے ملاقات ہوئی۔ لنو اپنی ٹولی کا سردار تھا۔ بہت لمبا، گورا چٹا، خاصہ وجیہہ، سن تیس سے زائد نہ تھا۔ کالے کالے بچوں پر اس کی چھوٹی گلابی پگڑی اور اس کے کانوں میں سونے کے موٹے گول چھلے بڑے اچھے لگتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں کجلائی ہوئی آگ بھی تھی۔ اس کا انداز بھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ خاموش اور وہ تپاک جو عام طور پر میرے بھلے میں ہر ایک نے ظاہر کیا تھا اس کی بھی لنو کے ہاں کمی محسوس ہوئی۔ وہ بے موقع ہنس پڑتا تھا اور باتیں کرتے کرتے دفعتاً چپ ہو جاتا تھا۔ اس

میں ایک اضطرار تھا۔ ایک بے چینی تھی۔ مجھے تعجب ہوا اور میں نے تنہائی ہوتے ہی شہزادی سے اس کا ذکر کیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے بتایا کہ کسی زمانے میں ہوئے اس کا رشتہ تھا۔ بس شادی ہونے والی ہی تھی کہ بیچ میں میں چلا آیا اور شہزادی کی زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

میری محبت میں پہلی دفعہ رقابت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ناگ پھنی کے انبار میں ڈال دیا ہو۔ میں اس تکلیف سے بے چین ہو کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں محلوں سے میلوں دور نکل گیا۔ میرے دماغ میں بس ایک چرخی سی چل رہی تھی۔ میری شہزادی اور نہ۔ یعنی میرے ناموس پر دوسرا بھی نظر ہوس ڈال سکتا تھا۔ میں شہزادہ تھا۔ دسیوں پشتوں سے ہماری بیویاں محلوں میں رہتی تھیں۔ وہی جو فخریہ کہتی تھیں ع۔ برہنہ نہ دیدہ تم آفتاب۔ اور آج ایک بنجارے کی یہ ہمت! مجھے یہ یاد نہ تھا کہ میں خود بھی اب بنجارہ ہوں۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ شہزادی بنجارن ہے جسے میرے ساتھ بھاتی حضور بھی غوطہ لگاتے دیکھ چکے ہیں۔ میں یہ بھی فراموش کر گیا کہ میں نے واقعی شہزادی سے نکاح نہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی نہ تھی کہ نہ سے اور اس سے صرف سگائی ہوئی تھی، معشوقہ اور محبوبہ تو بنی وہ میری ہی!

دل میں اٹھنے والے اس طوفان کے شور میں نہ تو مجھے اس کا خیال رہا کہ میں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہا ہوں اور نہ اس کا دھیان رہا کہ شام قریب ہے۔ میں ایک چٹان پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر تو میں اپنے خیالات میں اتنا محو رہا کہ میں نے کسی طرف نظر ہی نہ ڈالی۔ دفعتاً کہیں دور پر ایک لکڑ بھگا چیخا، اس کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرائی اور اس کی بازگشت سے ساری وادی گونج اٹھی۔ میں نے چونک کر چہار جانب نظر ڈالی۔ سامنے بہت دور بھالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹی پر ڈھلتے آفتاب نے سنہری ملمع چڑھا دیا تھا اور بلند درختوں کے اونچے سبز سروں پر ایک زرتار گوٹ ٹانک دی تھی۔ نشیبوں کے لمبی گھاس والے میدان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی نے انھیں بھالو کی کھال سے ڈھک دیا ہے۔ چٹان کے نیچے جو گہرا غار تھا وہاں روشنی کی جگہ دھند لگا تھا اور اس میں بہنے والے چشمے کے پانی کو تاریکی نے کاہی بنا دیا تھا۔ ہوا مرطوب تھی اور ٹھنڈی، منظر دلفریب تھا اور فرحت بخش، لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ ڈر سا لگنے لگا جیسے ہر چٹان کے پیچھے کوئی دشمن بیٹھا ہے اور ہر تاریک گوشے میں کوئی حملہ آور ——— اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کا گھوڑا چڑھا لیا۔ میری سانس کچھ تیز چلنے لگی اور میں چٹان سے جلدی جلدی اترنے لگا۔ میرے پاؤں ابھی زمین پر پہنچے نہ تھے کہ دفعتاً سن سے ایک تیر گیا اور میرے کوٹ کی آستین کو پھاڑتا ہوا پتھر سے جا ٹکرایا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مجھے کوئی نہ دکھائی دیا۔ مگر سو گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی اس طرح ہل رہی تھی جیسے کوئی اس میں چھپا ہے۔ میں نے بے سمجھے بوجھے اس کو نشانہ بنا کر دو فیر کر دیئے۔ جھاڑی کا ہلنا بند ہو گیا۔ میں تقریباً پانچ منٹ تک اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ تاریکی سرعت سے بڑھتی جا رہی تھی۔ خیمہ تک راستہ میں نشیب و فراز تھے۔ دشمن سامنے آ کر مقابلہ نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ کمین گاہ سے چھپ کر حملہ کرتا۔ میرے لیے ہر منٹ خطرہ بڑھتا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے اسی طرح زمین پر لیٹے لیٹے جھاڑی کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب جھاڑی کے پیچھے سے کوئی نہ کوئی اٹھ کر مجھے دوسرے تیر کا نشانہ بنانے ہی والا ہے، پھر بھی جی یہی چاہتا تھا کہ حملہ آور کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ اگر کسی کا نشانہ نہ بننا ہی ہے تو میں بھی تو اس پر وار کر لوں ——— اسی لیے جھاڑی جب کوئی دس قدم رہ گئی تو میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں اور تیز دوڑ کر میں جھاڑی کو پھاند گیا۔ اس جانب کوئی بھی نہ تھا، ہاں اس سے آگے ایک ٹیلے پر ایک سیاہ سایہ سا بھاگتا محسوس ہوا اور میں نے پھر فاصلہ کا خیال کئے بغیر فیر کر دیا اور اس کے تعاقب میں دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ حملہ آور بھاگ رہا ہے، اسے اس کا موقع نہ ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے حواس درست کر کے پھر کوئی کمین گاہ ڈھونڈ سکے۔ اسی لیے

میں بھی تیزی سے ٹیلے پر چڑھ گیا مگر ٹیلے کے دوسری جانب پھر کوئی نہ دکھائی دیا۔ راستے میں اب بھی کئی چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کے پیچھے چھپ کر دم لے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے قریب ترین چٹان کی طرف رُخ کر کے پھر فیر کر دیا اور ٹیلے سے اتر کر اس طرف بڑھا۔ جلدی اور تاریکی میں پھر پاؤں پڑا اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ چوٹ زیادہ نہ آئی۔ لیکن دم پھول گیا اور میں کئی منٹ تک پڑا پڑا اپنی سانس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا اور میں نے سُنا، کوئی مجھے پکار رہا ہے "شہزادے! شہزادے!" اور ساتھ ہی تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

میں چلّایا "یہاں! یہاں!" اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد شہزادی اپنے مشکی پر سوار وہاں آ پہنچی۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا؟ کس پر فیر کیا؟" میں نے کہا "گھر چلو، پھر بتاؤں گا!" اور ہم دونوں ایک ہی گھوڑے کی پیٹھ پر خیمہ تک آئے۔ راستے میں میں نے شہزادی کے اصرار پر اسے سارا واقعہ سُنا دیا۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ مگر جب میں گھوڑے سے اترا تو وہ اسی طرح اس پر بیٹھی رہی۔ میں نے سمجھا وہ گھوڑوں کے لیے گھاس اور دانے کا انتظام کر کے آئے گی۔ میں خیمے میں چلا گیا۔ مجھے تھکن محسوس ہوئی جیسے میں بڑی منزل مار کر آ رہا ہوں، جیسے میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور تھوڑی دیر کے لیے اسی طرح سفری پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ اسی ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ یہ کس نے تیر مارا۔ اس جنگل میں آبادیوں سے دور کون دشمن پیدا ہو گیا۔ کیا جاپانی حضور کے جاسوس ہیں یا میری سسرال کے آدمی یہاں آ گئے؟ مگر انھیں میری گرفتاری کی فکر ہوتی نہ کہ قتل کی۔

میں اسی طرح اُلجھ رہا تھا کہ دفعتاً خیموں میں ایک شور سا ہوا جیسے بہت سے لوگ جوش میں باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

سارے خیموں کی لالٹینیں ایک دائرے میں باہر گاڑ کر جلا دی گئی تھیں۔ لکڑی کے ایک بڑے ٹھیہ کا لاؤ سلگ رہا تھا اور سارے جنگلے اس روشن مقام پر جمع ہو رہے تھے۔ بیچ میں کچھ بوڑھے لوگ کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہزادی کھڑی تھی۔ وہ لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں ادھر لپکا۔ میں نے سنا۔

"ہاں میں نے اس کی جگہ شہزادے سے شادی کی!" میں اپنا ذکر سنتے ہی ایک درخت کے تنے سے جہاں اندھیرا تھا لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی آج اپنے بچوں کے سامنے کوئی مقدمہ پیش کر رہی ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ دیکھوں شہزادی کو اس قوم والے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ وہ غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کی بوٹی بوٹی میں ایک بجلی سی کوند رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صاعقہ بن کر کسی نہ کسی پر گرے گی۔ اور اسے خاکستر بنا دے گی۔ وہ کہہ رہی تھی "آپ ہی سے انصاف چاہتی ہوں، اس کا اور شہزادہ کا کوئی مقابلہ ہے؟ صورت میں، شکل میں، ذات میں، صحت میں، طاقت میں، ہنر میں، علم میں یہ کس چیز میں ان کی برابری کر سکتا ہے؟"

مجمع میں سے ایک بولا "ہم خود شہزادے ہیں۔ ہزاروں برس ہم نے بادشاہت کی ہے!"

شہزادی پلٹ پڑی "ضرور، مگر آج تو ہم اچکے ہیں، چور ہیں، بدمعاش ہیں۔ شہروں میں جاتے ہیں تو پولیس ہماری نگرانی کرتی ہے۔ نہ ہمارے مکان ہیں، نہ ایک بالشت زمین۔ ہم چینڈے لگائے پھرتے ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی اپنے کو ہم سے اچھا سمجھتا ہے!"

ایک نوجوان خفا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "اگر کوئی ہمیں ذلیل سمجھتا ہے تو وہ خود ذلیل ہے۔ ہم جنگلوں کے بادشاہ ہیں۔ ہم کسی کا دیا نہیں کھاتے، ہم اپنا قانون خود بناتے ہیں ———"

ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر ڈانٹا "تم چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ مستو! شہزادی نے ہمارے سامنے مقدمہ دائر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے نمونے آج ہمارے مہمان شہزادے پر تیر چلایا۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہم کیا فیصلہ دیں گے ——— !"

نمونہ کھڑا ہو گیا۔ سب خاموش ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ نصف منٹ تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجمع پر نظر ڈالی۔ اور بولا:۔

"شہزادی کا الزام صحیح ہے۔ میں نے تیر مارا، اور مجھے بڑا تعجب ہے کہ وہ کیوں مر نہ گیا۔ تم جانتے ہو میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا ——— خیر! ——— میں تم لوگوں کا سردار ہوں۔ میں تمہارے فیصلے سے پہلے اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں ——— میں شہزادی کے چیلنج سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تلوار سے، تیر سے، چاقو سے ——— جو ہتھیار اس کو پسند ہو اس سے!"

مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی، ایک شور سا ہوا "ہم سب کو منظور! منظور! منظور!"

شہزادی جھپٹ کر سامنے آ گئی "مجھے ہرگز منظور نہیں ——— وہ شہزادہ ہے، وہ پستول، بندوق چلانا جانتا ہے۔ وہ چاقو اور تیر کیا جانے! نمونے سے مقابلہ میں کروں گی، میں!"

"چھپا لو شہزادے کو اپنے گھاگرے میں!" ایک نوجوان نے طعنہ کیا۔

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں لپک کر مجمع کو چیرتا اوڈ کے پاس پہنچ گیا۔ ہر ایک مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں ساری تعلیم، سارا فلسفہ، ساری تہذیب، ساری ثقافت بالکل بھول گیا۔ میں اس وقت بالکل وحشی تھا۔ میں نے کہا:۔

"بھائیو! نمونے مجھ پر چھپ کر حملہ کیا، میں بچ گیا۔ میں اس کا کوئی قصاص نہیں چاہتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا ——— "

اور تو چپ رہے مگر ایک بوڑھا بول اٹھا "بھئی بڑے کی بڑی بات!" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ میں نے کہا "مگر نمونے ابھی مجھ سے مقابلہ کی خواہش ظاہر کی ہے، میں اسے قبول کرتا ہوں۔ چھرے سے، تلوار سے یا پستول سے، ان میں سے جس حربے میں وہ اپنے کو ماہر سمجھتا ہو، میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔"

شہزادی چیخی "نہیں! نہیں!"

میں نے اسے ڈانٹا "تم چپ رہو، عورتوں کے مجمع میں جا کر بیٹھو!"

جب وہ گردن جھکائے عورتوں کے مجمع کی طرف چلی تو میں نے نمونے سے پلٹ کر کہا "بتاؤ کس حربے سے لڑو گے؟"

نمونے مسکرا کر کہا "چاقو!" اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس نے ایک سگریٹ جلائی۔ شہزادی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا "نہیں! نہیں! شہزادہ چاقو سے لڑنا کیا جانے؟"

ایک نوجوان طرّا کے بولا "شہزادی بنجارن ہے، وہ اسے جیتنا چاہتا ہے تو ہمارے ہی حربوں سے لڑنا پڑے گا!"

"نہیں، نہیں" اور "ہاں، ہاں" کا شور اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ نمونے اس فن کا ماہر ہے۔ سارے مجمع کا انداز بتاتا تھا کہ اسے نمونے کی جیت اور میری ہار کا یقین ہے۔ مگر مجھے مطلقاً خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بچپن میں ہر حربے کا استعمال سکھایا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں مجھے کھیل کود، جنگ و جدل سے زیادہ مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا۔ میں نے سوائے پستول کے کسی دوسرے حربے کے استعمال میں مہارت نہیں حاصل کی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جیتوں گا۔ میں نے نمونے کے ایک گوشے میں سگریٹ

ہائے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی زردی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتھنے پھیلتے سکڑتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ غالباً اس کی یہ گھبراہٹ ہی میری خود اعتمادی کو مضبوط و مستحکم بنا رہی تھی۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نمو کے طرفدار نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی کے لیے اسی چہرے سے لڑنا پڑے گا جو آپ کا قومی چہرہ ہے۔" معاً خیال آیا کہ نمو کی گھبراہٹ میں کیوں نہ اضافہ کر دیا جائے۔ جیب میں پڑے ہوئے پستول کو میری انگلیاں بار بار چھو رہی تھیں۔ خود بینی نے بھی مجھے اپنی مہارت کی نمائش کی طرف اکسایا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور نمو کی طرف مڑ کر کہا "میری پسند کا چہرہ تو یہ ہے۔" اور ساتھ ہی ایک فیر کر دیا۔ نمو کے منہ میں جلتی ہوئی سگریٹ آدھی کٹ کر اڑ گئی اور پورا مجمع چیخ اٹھا "ارے مار ڈالا" "نمو ڈھیر" گرنے لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا "ڈرو نہیں نمو، میں نے سگریٹ کو نشانہ بنایا تھا، تمہیں نہیں۔" وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی سگریٹ لبوں سے نکال کر دیکھی۔ پھر اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کا داہنا ہاتھ تیزی سے کمر تک گیا اور اس نے وہیں سے چاقو نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں اپنی حرکت کے ردِ عمل کے لیے تیار تھا۔ میں نے جلدی سے پینترا بدلا مگر میرے قریب ہی بغل سے ایک دوسرا چاقو سن سے گزرا۔ ہوا میں دونوں چاقو ٹکرائے اور دونوں زمین پر گر گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہزادی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے نمو کو غصے سے ہانپتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر بولی "شہزادے کے منہ میں کہاں سگریٹ تھی کہ تم نے نشانہ لگایا تھا نمو؟"

مجمع کو ان جلد جلد ہونے والے واقعات کی سرعت نے ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔ اب شہزادی کے سوال پر پھر ایک شور سا اٹھا۔ شہزادے نے بھی اس پر فیر کیا تھا۔ "شہزادے نے اس پر نہیں سگریٹ پر فیر کیا تھا۔" "جھوٹ ہے۔" "سچ ہے۔" میں نے خاموشی کیلئے پھر ہاتھ اٹھایا۔ وہ چپ ہوئے تو میں نے پہلے شہزادی کو ڈانٹا "ایسے موقعوں پر مردوں کے بیچ میں عورتوں کا دخل دینا میں اچھا نہیں سمجھتا۔ تم بیٹھ جاؤ" اس کا منہ نتھنا اٹھا۔ مگر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے مجمع سے کہا "آپ لوگوں کو میرے نشانے پر شک ہے اچھا تو میرے پیچھے سے تین موم بتیاں لے آئیے" ——— ایک ان میں سے دوڑ کر تین موم بتیاں لے آیا۔ میں نے نمو کو اس جگہ سے ہٹا کر ایک تپائی رکھوا دی۔ اور تینوں موم بتیاں جلوا دیں۔ پھر ہر ایک کو اس جانب سے ہٹا کر میں نے اپنے مقام سے کھڑے کھڑے تین متواتر فیر کیے۔ جب تینوں موم بتیاں بجھ گئیں تو میں نے کہا "اب تینوں کو دیکھئے، کوئی بتی کٹی یا ٹوٹی تو نہیں" شہزادی سب سے پہلے لپکی ہوئی دوڑی ساس نے تینوں بتیاں اٹھا کر دکھائیں۔ سوائے فتیلے کے کوئی حصہ نہ کٹا نہ ٹوٹا تھا۔ مجمع واہ واہ کرنے لگا۔

میں نے کہا "آؤ نمو، اب ہمارا تمہارا بجاروں کے حربے میں مقابلہ ہو جائے؟" اور میں نے کوٹ اتار ڈالا۔ قمیض اتار ڈالی، صرف شلوار پہنے رہا۔ نمو نے اپنا کرتہ اتارا، تہمد کھول کر پھینک دی۔ وہ پہلے ہی سے چست جانگھیا پہنے تیار تھا۔ دو بوڑھوں نے اپنی اپنی کمر سے دو چھرے نکالے۔ ان کے وزن اور قدوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں یکساں تھے۔ ایک چاقو انھوں نے مجھے دے دیا اور ایک نمو کو۔ ہم دونوں نے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ عورتیں اور بچے پیچھے کر دیئے گئے۔ چست جانگھیے میں نمو دراز قد کا نمونہ تھا۔ اس کے ہاں تناسب اعضا بلا کا تھا اور چھرے کی گرفت یہ بتاتی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں قدرتِ کامل رکھتا ہے۔ سچ عرض کرتا ہوں، میرے دل میں پہلی دفعہ ڈر پیدا ہو گیا۔ میں چھرے کے استعمال سے یوں بھی کم واقف تھا۔ پھر مشق چھوٹی ہوئی تھی۔ بس اتنی امید تھی کہ میں "جوجسٹر" سے واقف ہوں، مجھے کوئی آسانی سے زخمی نہیں کر سکتا۔ اس وقت نمو کا کسرتی چھریرا جسم دیکھ کر مجھے اس مقابلے کے نتیجے کی طرف سے کھٹکا پیدا ہو گیا۔ ممکن تھا

کر یہ جذبہ بڑھتا مگر نمو نے بڑھ کر وار کر دیا اور میں نے پینترا بدل کر اسے خالی دیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھلا اور ہم دونوں وار کرنے اور بچنے کے لیے پینترا بدلنے لگے۔ میں نے چند ہی منٹ میں محسوس کیا کہ نمو جس پھرتی سے وار کرتا ہے یا جھکائی دیتا ہے وہ میرے ہاں مفقود ہے۔ اگر آنکھ جھپک گئی تو چھرا سینے کے پار ہو گا۔ معاً مجھے استاد کا قول بھی یاد آ گیا "دست بدست لڑائی میں دشمن کے جسم کی حرکت نہ دیکھو، صرف آنکھوں کو دیکھتے رہو، وہیں سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کیا قصد ہے؟" اسی لیے میں نمو کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے تھا اور اس کے ہر وار کو روکنے یا خالی دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ مجھے خود وار کرنے کا اب تک موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک امر البتہ میرے لیے باعث مسرت تھا کہ میرا جسم خشک تھا، میری سانس نہ پھولی تھی اور نمو پسینے میں نہا گیا تھا اور وہ تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ غالباً نمو نے بھی اس فرق کو محسوس کیا۔ اس لیے کہ وہ وار کرتے کرتے ایک دم پیچھے ہٹا اور بجائے اس کے کہ وہ پینترا بدل کر میرے وار سے بچے اس نے اچھل کر پوری قوت سے میرے سینے پر لات ماری۔ میرے ہاتھ سے چھرا چھوٹ گیا اور میں زمین پر چت گر پڑا۔ وہ اچھل کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے پھر پورا ہاتھ مارنے کے لیے چھرا اٹھایا۔ میں اتنی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس کا جسم میرے جسم سے مس ہو جائے اور میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچ جائے۔ نمو نے وہ موقع مجھے اپنی حماقت سے دے دیا۔ اس کا چھرا میرے سینے میں پیوست ہونے کے لیے محمد آور سانپ کی طرح تیزی کے ساتھ چلا۔ میں نے بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر ٹھیکی دی۔ چھرا نمو کے ہاتھ سے جا کر دور گرا اور میں جو جھٹکا پیچ کر کے نمو کی پیٹھ پر تھا اور اس کی دونوں کلائیاں میرے ایک ہاتھ میں تھیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ کر میں نمو کو ہمیشہ کے لیے لولا کر دوں مگر میں نے غصہ کو ضبط کیا۔ جاہل تھا، وحشی تھا، میری فتح اس کو ذلیل کرنے میں ہی تھی۔ میں نے اسی لیے وہیں سے بیٹھے بیٹھے ہونٹوں سے کہا "اس نمو نے مجھے دوبار مار ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ آخری حملہ بھی اسی نیت سے تھا۔ میں بدلہ لے سکتا ہوں۔ اک ذرا سی حرکت میں اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن میں اپنے کو اسی کی سطح پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اس کی پھر جان بخشی کرتا ہوں۔"

میں نے اٹھ کر قمیص پہنی، کوٹ کندھے پر ڈالا۔ نمو کو اس کے دو ساتھیوں نے سنبھال کر اٹھایا۔ وہ اس کا منہ دھلا کر پانی پلانے کے لیے ایک طرف لے گئے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور مجمع پر نظر ڈال کر کہا "میں نے بنجارہ بننے کی کوشش کی، آپ لوگوں نے بننے نہ دیا۔ شہزادی یقیناً آپ کی ہے وہ میری نہیں ہو سکتی۔ ایک بار وہ مجھے چھوڑ کر چلی آئی تھی، آج میں اسے چھوڑ کر جاتا ہوں۔"

شہزادی چیخ کر دوڑی۔ میں نے اسے ڈانٹا "تم محض نام کی شہزادی ہو، تم ان بنجاروں کی کفو ہو، میری نہیں! میں نے اپنے کو بہت گرایا، اب اس سے زیادہ نیچے نہیں گر سکتا۔"

اور میں نے جلدی جلدی اپنے نقرہ پر زین کسی اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شہزادی خوشامدیں کرتی رہی، بنجارنیں روکتی رہیں مگر میں نے ایک نہ سنی۔ شاید کئی پشتوں کی روحیں اپنے غرور، تمکنت، جلال و جبروت کے ساتھ میرے دل و دماغ پر اس وقت مسلط تھیں۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ میں حد درجہ رسوا ہوا۔ میری بے انتہا ذلت کی گئی۔ مجھے اس وقت شہزادی سے نفرت تھی، اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے سے نفرت تھی اور اس پوری زندگی سے نفرت تھی۔ جو میں نے اس کے عشق میں کاٹی تھی۔ اور میری دماغی حالت ایسی تھی کہ اگر کوئی اس وقت میرا تعاقب کرتا تو شاید میں اسے مار ڈالتا۔

میں رات دن سات روز سفر کرتا رہا۔ بس کچھ گھنٹوں کے لیے کسی چشمے، کسی دریا یا کسی کنوئیں کے کنارے یا کسی ہرے بھرے میدان میں سو رہتا۔ میں نے اس دوران میں کیا کھایا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ دو ایک دن تو جنگلی میووں پر بسر ہوئی۔ ایک دن پستول سے ایک تیتر شکار کیا تھا اسے آگ پر بھون کر بغیر نمک کے کھایا۔ ایک دن ایک مچھلی چشمے میں پانی پیتے وقت بہت آسانی سے ہاتھ آگئی، وہ بھی بھون کر کھائی۔ ایک دن ایک دیہاتی مسجد میں شب بسر کی، وہاں نمازیوں نے اپنے گھروں سے لا کر کچھ کھلایا پلایا تھا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے اتنی مدت تک شکم سیر ہو کر کبھی نہ کھایا اور نہ میں نے بند بھر سویا۔

آٹھویں دن میں ریاست کے حدود میں داخل ہوا اور اسی شام کو اپنے محل میں ——— میں نے حمام کیا، کپڑے بدلے اور راجا صاحب کے سلام کو حاضر ہوا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ فرمائیں، میں نے دست بستہ عرض کی "میرا جنونی دور ختم ہو گیا ——— میں سزا کے لیے حاضر ہوں!"

ان کی غصہ بھری نگاہیں محبت بھری نگاہوں میں بدل گئیں اور انھوں نے مجھے سینہ سے لگا لیا اور مجھے ساتھ لیے ہوئے اندر آئے۔ وہاں جا بھی صاحبہ سے بھی میں نے معافی مانگی اور سرکار عالیہ سے بھی۔

اس نے اٹھ کر پھر میری سگریٹ کو لپکتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے ڈبیا بڑھا دی۔ اس نے حسب معمول ایک سگریٹ جلا کر چند لمبے لمبے کش لیے اور ٹرامل کو زمین پر پھینک دیا۔ پھر وہ بولا:۔

"میں نے تقریباً ایک سال اپنی پچھلی زندگی بسر کی۔ اب کے معمولات میں دو فرق ہوئے۔ ایک تو یہ کہ زہرہ کی جگہ اس دلہن نے لے لی تھی جو دو برس سے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کا حسن یقینی چاند کو شرماتا تھا لیکن اس کی محبت چاندنی کی طرح ہلکی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ اس شہزادی جیسی گرمی نہ تھی۔ نہ تڑپ تھی نہ مدہوشی، اسی لیے پھر وہی شراب نوشی شروع ہو گئی تھی۔ سرخوشی اور بے خودی کے لیے کچھ تو بہانہ چاہیے تھا۔ دوسری بات جو اس شراب کی بالکل ضد تھی اس کی بھی میں نے عادت ڈال لی تھی۔ یعنی میں نے روزانہ تھوڑی سی ورزش کرنا اپنے اوپر فرض کی طرح عائد کر لیا تھا اس سے فارغ ہوتے ہی میں تقریباً ایک گھنٹہ چاند کی روشنی میں صرف کرتا تھا۔ میں نے ریاست کے سب سے بڑے بانک اور ہنوٹ جاننے والے کو ملازم رکھ لیا تھا اور اس کی زیر ہدایت قدیم ہندوستانی حربوں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لینا تھا۔ اس ورزش سے میری صحت بھی درست رہی اور مجھ پر سے نوشی کا زیادہ برا اثر نہ پڑا۔ غرض زندگی ایک ڈھرے پر لگ گئی تھی اور ظاہر بین نظریں اس کا یقین کرنے لگی تھیں کہ میں شہزادی کو بھول چکا ہوں اور اس سے کیف ہموار طرز حیات کا عادی ہو چلا ہوں کہ دفعتاً ایک شب میں جب میں گیارہ بجے قلعۂ معلیٰ سے اپنے محل واپس آ رہا تھا۔ ایک شخص میری موٹر کی روشنی میں دونوں ہاتھ پھیلائے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے موٹر روک کر پوچھا "کون ——— ؟"

وہ بولا "منو!"

میں نے اندر کی روشنی جلا کر جب دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ منو کے دونوں ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہیں اور اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے ———

میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے منو! کیسے آئے ؟"

وہ ہانپتا ہوا بولا "سرکار، شہزادی یہاں سے بیس میل پر مر رہی ہے۔ اس نے بلایا ہے!"

میں نے منو کو اندر کھینچ لیا اور ڈرائیور سے کہا "موٹر چھاؤنی تک لے چلو"

وہاں پہنچتے ہی میں نے سنتری سے اس کی بندوق اور کارتوس کی پیٹی لی اور ڈرائیور کو موٹر ہٹانے کا حکم دیا۔

جب ہم شہر کے حدود سے باہر نکل گئے تو میں نے نو سے پوچھا:۔

"کیا بیمار تھی شہزادی؟"

وہ عجیب طرح ہنسا "بیماری ——— ! بیماری، آپ کی محبت ——— !" پھر وہ رک کر بولا "اسے کل بھیڑیے نے کاٹ لیا ہے۔ وہ مر رہی ہے!"

میں نے جھلا کر نو کو گھورا۔ اس پاجی کے لیے شہزادی کی موت ہنسی کی بات ہے۔

پھر میں نے ڈرائیور سے کہا:۔

"اور تیز چلاؤ!"

ہم کچی سڑکوں اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے نصف گھنٹہ میں وہاں پہنچ گئے جہاں شہزادی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ صرف اس کا چہرہ کھلا تھا۔ اس کے چہرے کو جس کی خوبصورتی کا مقابلہ وہ تصویریں بھی نہیں کر سکتی تھیں جو فنکار کے دلوں کو جمالیات کا سرچشمہ بناتی ہیں، اس وقت بھیڑیے کے پنجوں نے بھیانک بنا دیا تھا۔ ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ ایک گال اس طرح کھا لیا تھا کہ جبڑے کی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نیچے کا ہونٹ تقریباً ندارد تھا۔ گردن کے پاس کا گوشت بچا ہوا تھا اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو مجروح نہ ہو۔ نہ جانے کیونکر وہ اب تک زندہ تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ ڈوبی پڑی رہتی پھر بھی جب آنکھ کھولتی تو "شہزادہ! شہزادہ!" کی رٹ لگاتی۔

میں نے کیونکر اپنے کو پتھر کا بنا کر اس تک پہنچایا۔ اس سے باتیں کیں، مجھے معلوم نہیں۔ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ بس اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ لگاتار کوئی میرے جسم میں چھرے مارتا چلا جا رہا ہے۔ میرا گوشت کھرچ کھرچ کر کاٹ رہا ہے اور میں بار بار کانپتا، بار بار مٹھیاں کس لیتا، بار بار دانت بھینچ لیتا اور شہزادی پر جھکا ہوا اس کی دکھ بھری کہانی سنتا۔ وہ رک رک کر کہہ رہی تھی:۔

"تم آ گئے شہزادے! میں نے تمہیں دیکھ لیا! میں تمہیں ہر دوسرے تیسرے روز محل کی جھاڑی کے پیچھے آدھی آدھی رات تک دیکھنے کے لیے بیٹھی رہتی تھی۔ تم بھول سکتے تھے شہزادی کو! وہ اپنے شہزادے کو نہیں بھول سکتی تھی! کل میں جاوید کو بھی لے جا رہی تھی۔ وہ "ڈیڈی! ڈیڈی!" کی بہت دنوں سے رٹ لگائے تھا۔ میں نے کہا، اس کا منہ دھلا دوں، اچھے کپڑے پہنا دوں، تب لے چلوں۔ اسی میں پاس والے جنگل میں چشمے پر لے گئی۔ بھیڑیا نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا جھاڑی میں۔ اس نے جاوید کو منہ میں دبا کر بھاگنا چاہا! میں لپٹ گئی، اس نے مجھ کو خوب خوب کاٹا، نو آ گیا اور اس نے مجھے بچا لیا مگر میرا ——— میرا جاوید!"

وہ ایک بار چیخی "ہائے میرا لال! کہاں ہے میرا چاند!" اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ایک بوڑھی بھاری نے خون سے بھیگی ایک تھیلا بڑھا دیا ——— مجھے چکر سا آ گیا اور میں وہیں بے جان ہو کر گر پڑا۔"

اس نے پھر ایک سگریٹ پی اور مسلی۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ بولا:۔

"میں اسی دن سے ان دونوں کی قبر کی مجاوری کرتا ہوں اور پانچ پیسے روزانہ روشنی اور ہار پر صرف کرتا ہوں۔ پانچ پیسے سے زیادہ نہیں! لائیے بابو جی آپ کے پاؤں دبا دوں!"

اور اس نے اپنے سوکھے سوکھے ہاتھ میری پنڈلیوں پر رکھ کر انھیں دبایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے برف کی قاشیں نور زور سے

میری پنڈلیوں میں کلی جانے لگیں اور میں چیخ کر جاگا اور میں نے بے ساختہ اپنی ٹانگیں زور سے جھٹک دیں۔ ایک سانپ پلنگ سے ملی ہوئی کھڑکی پر گرا اور تیزی سے نیچے اتر کر کھیت میں بھاگنے لگا۔ میں نے جھپٹ کر بندوق اٹھائی اور دو فیر کیے مگر وہ اکھ کے پتوں میں غائب ہو گیا۔

بنگلے کا چوکیدار دوڑا ہوا آیا "کیا ہوا بابو جی! کیا ہوا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں جی، سانپ تھا!"

وہ بولا "ارے صاحب وہی ناگ بابا ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کسی کی قبر تھی۔ انھیں نے سانپ کا روپ دھارن کیا ہے!"

وہ تو جات کی ایک پوری داستان سنانے کو تیار تھا مگر میں حیات و موت، خیال و خواب کے سلسلۂ لاتناہی پر غور کرنے لگا اور میری زبان پر شاد کا یہ شعر آ ہی گیا ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی ۔۔۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

صنم تراش کا خواب

ل - احمد

کون نہ کہے گا کہ قدیم یونانیوں کی نزاکت ذہنی اور عمدہ خیال ان کی اصنام پرستی کا نتیجہ تھی! یونان قدیم کے ذہن و ذکا کا بہترین ثبوت اور نمائش ان کی دیومالا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کا ایک ایک کردار یونانی فکر و فراست کی زرخیزی پر دلیل ہے۔ دیومالا کے علاوہ ان کا ادب بھی ایسی کہانیوں سے مالا مال ہے جو زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو روشن کرتی اور ایک فلسفیانہ نتیجہ نکالتی ہیں۔ یہ کہانیاں بجائے خود ایک دیومالا بن گئی ہیں۔ دیومالا کا عنصر تو مانی ہی جائیں گی؛ ان میں سے بعض کہانیوں کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور ان میں سے ایک صنم ساز کی کہانی بھی ہے۔ جس کو اپنے ہی بنائے ہوئے بت سے عشق ہو گیا تھا۔ اور جس کی محبت یا قوت خیال نے اس مرمریں پیکر میں جان ڈال دی تھی۔

مغربی ملکوں کے ادب میں جتنا لطف اور تحمل پایا جاتا ہے۔ یونانی ادب ہی کا فیض ہے۔ میرے خیال میں یہ حکایت ایک نازک استعارہ و تمثیل ہے۔ اور کوئی صاحب ذوق اس سے خاص اثر لیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ حکایت جس پرواز سے پیش کی جا رہی ہے شاید اس میں کوئی ندرت نظر آئے!

پگمیان ایک صنم تراش تھا اور بہت دن سے ایک ایسی مورت گھڑ لینے کی آرزو کر رہا تھا جو اس کی تمام پچھلی مورتیوں سے بہت عالی و اشرف ہو۔ چنانچہ اس نے ایک پیکر مکمل کر لیا۔ اور آخری چھینی چلا کر کے جب ہاتھ سے چھینی چھوڑی، دیکھی تو قدرتی طور پر ایک جائزے کی نظر ڈالی۔ ایک دفعہ اوپر سے نیچے تک نظر گئی تو وہ بے اختیار مسکرایا۔ ایک بہت پہلی دفعہ پوری دنیا کو پا کر جتنا خوش ہو سکتا ہے۔ پگمیان کی یہ مسکراہٹ شاید ویسی ہی اضطراری مسرت کا نتیجہ تھی۔

جو شے وہ ایک بڑی سندر اور سروپ مورتی تھی۔ ایسی مکمل کہ اس سے بہتر تصور نہیں کی جا سکتی تھی! کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں بت تراش دیوی دیوتا کی مورتی بنا کر پہلے خود پوجا کیا کرتے تھے۔ پگمیان بھی اپنے بنائے ہوئے اس اصنامی پیکر کے سامنے سجدے احترام و پرستش کے گہرے جذبات پیش کر سکتا۔ اور اس کے سامنے ماتھا ٹیک سکتا تھا!

پگلیان کے مکان کا وہ کمرہ جہاں وہ کام کرتا تھا۔ ایک ایسا صنم کدہ تھا جہاں پتھر کی انگڑ بھوکیوں پر، فرش پر، الماریوں اور طاقوں میں ہر طرف اور ہر جگہ، مرمر کی مخلوق آباد تھی۔ کسی کا انداز عظمت و تعصب کا تھا تو کسی کا شان و رعنائی کا، کسی کا شرمی و شادمانی کا تھا تو کسی کا رنگی و انگرکا، کوئی مست عیش و مسرت تھا تو کوئی گیان و دھیان میں ڈوبا ہوا تھا۔ غرض آزمند صناع کی جولانی پتھر کے اندر جتنے خواب دیکھ سکتی تھی یہ صنمستان ان خوابوں سے معمور تھا! اس کا یہ نگارخانہ پتھر کی ایک کان تھی جو زندہ تھی۔ زندگی سے معمور تھی، شاید اس کا جذبہ خلاق — صحیح تو ماورائے ہے — اس بات کا ذمہ دار ہو کہ وہ کسی اور کو اس کمرے میں داخل نہ ہونے دیتا تھا۔ کوئی اگر اس پیکرستان کو دیکھ پاتا تو وہ اثر پرستش کرنے لگتا یا لکھنے لگتا! اور پگلیان یہ دونوں باتیں برداشت نہ کر سکتا تھا! اس کمرے کے اندر تو اس کی روح برہنہ پڑی تھی!

گھڑے ہوئے اور انگڑ سنیہ پتھر کے تول اور سیمیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ کوئی طیاری کے قریب اور کسی کا بس ڈھول نکلا ہوا۔ ہر طرف بکھری ہوئی تھیں یا بکھرے کرہم اور بے ربط خیالات کا ہجوم تھا۔ ایک سل میں بیٹھی ہوئی عورت، پہلو اور کولہے کا صرف خم ہی گھڑا گیا تھا۔ دوسری میں صرف بیٹھنے کا اجمار ہی نکل پایا تھا۔ خود پگلیان اگر دیو کی طاقت و رفتار میں پھنس جاتا اور اس وقت اس کی پیشانی پر شکنیں پڑتیں، ایک مجسمے کی پیشانی پر ویسی ہی شکنیں نمودار تھیں۔ ایک سل پر ابھی صرف گہری دراڑ ہی پڑی تھی، جس سے خیال ہوتا تھا کہ پگلیان نے اس پتھر کے اندر زندگی کا انداز پیدا کر دینے کے لئے زور کے ہتھوڑے چلائے ہیں۔ مختصر یہ کہ چھینی ہتھوڑی کے پہلے وار کے کام سے لے کر مکمل صورت بننے تک، مرحلے کے مرحلے موجود تھے۔ اور پگلیان کے تصور و احساس کی جانکنی کا مفہوم اظہار معلوم ہوتے تھے!

ایک ہی کل کی سنتان، ایک ہی خاندان کی نسلیں، یہ تمام مجسمے یہ اصنامی مخلوق، ایک ہی جذبے اور شوق کے رشتے میں بندھی تھی۔ اور ان کے اندر اچھوتی گلاتیا کا مجسمہ بے مثال تھا! گلاتیا کے ایک بات میں آئینہ ہے اور اس کا پھول کی سی سادہ چہرہ اس آئینے پر جھکا ہوا ہے۔ وہ اپنی "بڑی ادا" کی "ادا" کو بناؤ کر دیکھنے میں کھو گئی ہے۔ پگلیان کی جادو دستی نے شاید گلاتیا کو ساتھی کی تجلی بن کر اتنی کمال سنا دیا تھا! گلاتیا کے نازک و سبک پاؤں، پاؤں جو فرشتوں کے پر محسوس ہوتے تھے۔ اس کی بانہوں کا گداز ایک دعوت تھی کہ ان کے پھندے میں پڑ کر جان دے دینا ہی صراط زیست ہے!

یقین و مسرت کی آخری نظر ڈال کر مسکراہٹ جنبش لبوں کی بنا سکتی تھی۔ اسی حالت میں پگلیان نے اپنے فن کو دیکھا۔ سفید گرد کی ایک تہہ جم گئی تھی۔ لیکن پگلیان کا یقین کامرانی اس حیرت سے بدل گیا کہ کیا انہیں ہاتھوں سے پتھر میں جان ڈال دی ہے! اب اسے اقرار تھا کہ انسانی محنت اور دست کاری دیوتاؤں سے حسن کار، زیبائی لے سکتی ہے!

جس ساعت میں پگلیان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ اس کا بنایا ہوا مجسمہ مکمل ہے۔ ایک ساعت کا۔ ہے بہت اس کا اعجاز ہے تو وہ ساعت کی کا ایک الہامی ساعت تھی! اس نے اپنے نفس کو دھوکا نہیں دیا بلکہ اس کا وہ یقین الہامی تھا۔ پگلیان کو وہ موقعے بھی یاد آئے۔ جب وہ کوئی پیکر مکمل کر کے اس کے اندر اپنے احساس و خیال کو دم توڑتے دیکھتا تھا۔ جب وہ اپنی آرزوؤں کو جان کنی کی حالت میں دیکھتا تھا جب کبھی پگلیان اپنے بنائے ہوئے مجسمے کو اپنے خیال و تصور سے بالکل متفاوت دیکھتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ ناکامی کا احساس تھکنے میں بدل جاتا اور ایک وہ بہت سنگین دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا تھا!

مرمرستان کی دھیما اور اچھوتی آبادی کے اس ہجوم پر شام کی اداس فضا چھانے لگی۔ لیکن صنم آباد کی مسرت و عشق کے سے مغلوب

ہو جانا چاہتی نہ تھی۔ اصنام کی سفید روئی پھیلے ہوئے دھندلکے سے مقابلہ کرتی معلوم ہوتی تھی۔ اور جب دیواروں پر شام کا رنگ چڑھ گیا تو خوش ہو جانا ہی نظر آتا تھا۔ اور اس دھندلکے میں سفید پتھروں کی عریانی زیادہ نمایاں اور دل کش محسوس ہونے لگی تھی۔

اس وقت گلیتیا اپنے صنم کدے کی مرمریں ہیئتوں میں ایک ایسی دھڑکتی زندگی محسوس کر رہا تھا۔ جیسی پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی خنائی اصنامی بتوں کے اعضا کو شباب کے ہلکے رنگ میں رنگ رہا تھا۔ اور آخری کرن ان کے ہونٹوں اور سینے کے پر سے پھر کر بجھ گئی معلوم ہوتی تھی۔

پگمیلیان کے اس نگارستان کے سمندر کا کنارا زیادہ دور نہ تھا۔ سمندر جہاں زہرہ کا بے پردہ اچھتا پن۔ اس کی عریاں عظمت نگراں ہے۔ اس مکان سے قریب تھا۔ اور اس وجہ سے سمندری ہواؤں کے ساتھ ایک خوش آئند و گوارا قسم کی لاپروائی مکان کے اندر داخل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ نبض شام یعنی ہوا کے بلکے سے ایک جذبے کی تحریک تھے۔ فضا کی یہ جادو گری پگمیلیان کے احساس مسرت پر اس طرح چھا گئی۔ کہ اس نے اسفراد کی حالت میں گلیتیا کے برہنہ قدموں کو چوم لیا۔ اور اندر سے دھڑکتے سر کو اس کے ٹخنوں اور۔ ٹخنے سے زانو پر رکھ دیا اور پھر اچانک، گھٹنے کی چوکی پر کھڑا ہو کر اس اصنامی پیکر سے چمٹ گیا۔ اس کے خوش ہونٹوں کے بوسے لینے لگا۔ محبت کے بے شمار بوسے!

پھر جب ردعمل ہوا تو خود سے بھی شرما گیا۔ لیکن اس کی شرم سے جھکی ہوئی آنکھوں نے کیا کچھ دیکھا کہ وہ حیرت سے چیخ کر رہ گئیں؟ وہ کانپنے لگا۔ اس پیکر میں تو جان پڑ گئی تھی! وہ مجسمہ تو متحرک محسوس ہوتا تھا! اس کے سفید گالوں میں سرخی کی جھلک تھی! اور لعاب کی کلی کی مانند چہرے سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک میں زندگی کی ایک رو گزرتی محسوس ہوتی تھی! جس طرح موسیقی کے اندر بار بار سانس گونجتی ہے۔ بالکل اسی طرح گلیتیا کے سینے میں زندگی کا جلا جلا موج تھا! اور جاتی ہوئی کرن کی مدھم روشنی میں گلیتیا کی باکی پلکیں جھپکنے لگیں کسی خوف سے کانپ گئیں۔ شاید زندگی کے ڈر سے!

پگمیلیان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دل میں شک کا شائبہ بھی نہ تھا! اب وہ گلیتیا کے جسم کو، جسم کے ہر حصے کو، ایسے ہلکے ہاتھ سے چھو رہا تھا جیسے مالی کا ہاتھ کسی نازک پھول یا پودے کو چھونے میں نرم ہو جاتا ہے! اب گلیتیا کے جسم میں نہ پتھر کی سختی تھی۔ اور نہ اس میں وزن محسوس ہوتا تھا! مرمریں سینے ہوتے ہوئے بال ایسے سیاہ ہو گئے تھے جیسے رات نے آ کر لپیٹ لیا ہو! آنکھوں کے اندر ایسی چمک تھی۔ جیسے سمندر کے اندر سورج چمکتا ہے! لیکن گلیتیا ابھی تک چپ تھی کیوں!

اس سوال کو ابھی پگمیلیان اپنے ذہن میں پوری طرح قائم کرنے نہ پایا تھا کہ گلیتیا یکایک مسکرا دی۔ اور مسکرانے سے اس کے چہرے پر حیرانی کا سا رنگ چھا گیا۔ معصومانہ انداز سے اس کا ہاتھ بڑھا۔ اور پگمیلیان کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ کافوری تھم اسی لمحے سے اس نے پگمیلیان کی انگلی نکالی اور ہنس پڑی۔ ایک بجتی ہوئی سی ہنسی جس کی تشبیہ مشکل ہے!

پگمیلیان نے نہ جانے اس سے کیا کہہ دیا کہ اس کو ہنسنے کے لیے گلیتیا کی جبریں پیشانی پر ایک بال سا پڑ گیا۔ زندگی کی پہلی ناگواری کا احساس! اور پھر ایک نازک سی کاہلی، ایک ملیح سی تکان میں جلوہ دکھائی دی۔ ابدی سکون میں پڑے رہنے کے مقابلے میں زندگی ہی تھکا دینے والی چیز!

جب پہلی! پگمیلیان نے اپنی صناعت کے شہکار میں جان پڑتی دیکھی تھی تو کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی عمر بھر کی کمائی

چھینی جا رہی تھی۔ اور اس سے اس کی حالت بڑی تو نہیں مگر اسی قسم کی ہو گئی تھی۔ گلاتیا کے گداز بدن کو ماحت اندوزی کے انداز میں پٹخا دیکھ کر اسے ایک قسم کی حیرت تھی۔ گلاتیا کے دونوں ہاتھ چھپا کی شکل بنے سینے پر رکھے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا مدھ بھرا تھا، اور گلاتیا کے اندر جینے کی یہ نشانیاں اس کو ایک دیوی کے بدلے گوشت پوست کا ایک انسان بنا رہی تھیں۔ جو محبت کی تلاش میں اداس ہو گیا ہو!

مقدمات کی یہ اپیل یہی تھی کہ گلاتیا کی نرالی تخلیق معمولی مٹی سے نہیں بلکہ اچھے اور پاکیزہ مرمر سے ہوئی! اور تخلیق کائنات کے وقت جو صورت و حالت رہی ہوگی۔ اس وقت پگمیلیان اپنے اندر کچھ ویسی ہی الوہیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ فخر آمیز احساس تھا کہ اس ہستی نور و صباحت کو خود اس نے تخلیق کیا ہے۔ اس کا خالق وہ خود ہے!

گلاتیا ابھی تک جیتی جاگتی تصویر تو تھی مگر خشکی بولتی صورت نہ تھی۔ ہر بات سے بے خبر اور ہر چیز سے ناآشنا! اسے تربیت درکار تھی، اور پگمیلیان کے سوا اور اس سے بہتر معلم و اتالیق کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ جب اس نے یہ ذمہ داری اٹھائی تو پگمیلیان اپنے جذبات کو صاف طور پر سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنے اس نئے مشغلے سے بہت خوش تھا۔ اسی میں سرشار رہتا تھا! وہ اس مرمریں پیکر کے احساس و جذبات کو تو نہیں سمجھ سکتا لیکن اب اس کی سماعت میں انسانی چاہت جھلکنے لگی تھی!

وقت گزرنے کے ساتھ گلاتیا کو اب اپنے خالق کے نگارخانے میں مرمر کی سلوں اور ٹکڑوں کے درمیان رہنے سے الجھن ہونے لگی۔ سنیہ پتھر کی چکی پر بیٹھے رہنا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب اصلی چکی پر لیٹتی تو جسم اور مرمر مل جاتے معلوم ہوتے تھے اور شاید گلاتیا کو ابھی دھندلی سی یاد تھی کہ مرمر اس کا عنصر اصلی ہے! مرمریں عفت اور اچھوتے پن کے اندر سے بیدار ہونے کا احساس گلاتیا، ہر لمحہ پگمیلیان کی حیرت میں اضافہ کرتی رہتی تھی کہ ایک خواب کے مجسم ہو جانے کا معجزہ کیونکر رونما ہوتا ہے! سامنے کھڑی ہوئی گلاتیا مجسمہ جمال بن کر پگمیلیان کے سارے جذبات نیائش و پرستاری کا مرکز بن جاتی۔ اور پگمیلیان کی روح اس کے ہونٹوں پر لرزنے لگتی اور جب گلاتیا کسی سوچ میں پڑ جاتی تو اس کے چہرے کی صباحت پر بادلوں کے سائے پڑتے اور اس کے خیالات معلوم کرنے کی آرزو میں پگمیلیان کا دم گھٹنے لگتا!

اس پیکر کے بنانے سے پہلے پگمیلیان نے جتنے مجسمے بنائے اور گھڑے تھے، ان سب کو محنت رائیگاں سمجھنا۔ لیکن اس مورت کو گھڑنے کے بعد سے اسے ایک نامعلوم خدا کی نامعلوم خالقی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ وہ خود خالق ہے اور گوشت پوست کی مخلوق پیدا کر سکتا ہے! کسی وقت وہ اپنی پہلی اور پرانی حالت و کیفیت یاد کرنے لگتا تھا۔ کسی نازل نہ ہونے والے الہام کی آرزو میں غمگین ہو جاتا، راتوں کو ناقابل آمیزش رہتا، عالم رویا میں رہنے والے کی اداس تنہائی اور سرد مہر طلوع صبح کی تصور شکنی۔ پگمیلیان اپنی اس تمام ابتلائی عزیمت کو سزا و عقوبت سمجھتا تھا! لیکن آج وہ پرانی حالتیں اور کیفیتیں اس کے خیال میں سزا و عقوبت نہیں رہی تھیں۔ اس لیے کہ ایک عمر ناکام رہنے کے بعد بالآخر تخلیق کر سکا۔ اپنے دست و بازو میں قدرت پا کر اور خدا بن جانا اس کے خیال میں عفت نہیں مل سکتا تھا۔

لیکن جب بھی پگمیلیان ان خیالات میں کھو جاتا تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان نمودار ہو جاتے اور چہرے پر التجا کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے مذہبی زبان میں دعا مانگنا کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور گلاتیا

کے بل جھک کر اس نے گلوتیا کی بھری بھری رانوں سے اپنی باہیں لپیٹ لیں۔ اور محسوس کیا کہ گلوتیا کی ہستی سے ایک جھلک، ایک نسوانی جھلک نکل کر زرد ہستی اس کے اوپر اس طرح چھائی جا رہی ہے جیسے لپٹ جانے لگی ہے! جگیلیان سوچنے لگا۔

"میں نے اس کے بوسے لیے، جی بھر کے بوسے لیے اب اور کیا چاہتا ہوں؟
ہماری فطرت، دوگانہ فطرت پر غالب آ بیٹھے اور متصرف ہو جانے کی بیہودہ خواہش
جس کا دوسرا نام مردانہ کمزوری ہے۔ ہماری پاکیزہ ترین حالتوں میں بھی ہم سے
الگ نہیں ہوئی چھپی رہتی ہے!"

ایک دن شام کا وقت تھا اور جذبات کو اکسا دینے والے کیفیات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ گلوتیا کی پتلیاں پھیل گئیں اور اسے نسوانی جذبات کی محرکیت تیزی اور اس کی لذتوں کا احساس ہوا! جذبۂ محبت کے دیوتے میں بہہ جانے والی ہستی، عورت، کی ساخت میں اس کے جسم کی بناوٹ میں کوئی اضافہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اندر تجسس و تعرف کی یہ دیوانگی، اس کی آہیں اور آنسو، راتوں کی کاہلانہ لذتیں اور نرمیاں اور دل پسند تکان و خستگی، یہ سب کچھ اس کے ساتھ یا اس کے جسم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام کیفیتیں اس کی ہستی کا جزو ہیں!

بوسہ اور محبت کے یہ دو دیوانے سمندر کی ہر گھڑی بدلنے والے مناظر سے وجود، بچوں کی سی تشابہت میں اظہار جذبات و محسوسات کرتے رہتے تھے۔ محبت کرنے والوں کے دھندلے اور قسمیں جو ہر عہد میں ایجاد ہوتی رہتی ہیں، دوہرائی جاتی تھیں۔ شاید اس طرح وہ محبت کی کم عمری یا ناپائیداری کے خیال کو محو و فراموش کرنا چاہتے تھے۔ سمندر کی ہر وقت بے چین موجیں زندگی کی حقیقت سمجھاتی رہتی تھیں لیکن محبت میں نصیحت پر کس نے کان دھرا ہے؟ وہ نہ زندگی کی قبل مدت پر دھیان دیتے تھے۔ نہ اپنی محبت کی ابدیت پر شک کرتے تھے!

لیکن اس کے باوجود جگیلیان اپنے دل کی اندیشہ مند حالت کو، اپنے احساس خوف کو گلوتیا پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں وسوسوں نے گھر بنا لیا تھا۔ اور وہ سوچتا رہتا تھا۔

"آہ، اے فردوس پرور گلوتیا، تو ہر چند پاکیزہ طریق سے پیدا ہوئی۔ تیری اصل لطیف و نفیس ہے، لیکن اس انسانی جسم میں تجھے بقا کے دوام نہیں۔ تو بھی فانی بن گئی ہے۔ اور ایک دن کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جانے والی ہے! ہر چند میرے سارے خواب ابدیت کے خواب تھے! انہیں سوچوں میں گلوتیا میں تیری ہستی بھی بھول جاتا ہوں کہ میری بنائی ہوئی چیز پر دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کا نفاذ کیوں ہو؟ خدا کی قدرت ثابت کرنے کے لیے وہ گلوتیا جو میری بیٹی ہے۔ موت کے قانون کی پابند کیوں بنا دی جائے؟ اور اگر یہ قانون بدلا نہیں جا سکتا تو گلوتیا میں چاہتا ہوں کہ قدرت اپنے قانون میں بس اتنی تبدیلی کر دے کہ روز وصال کا اثر تیرے اوپر نہ ہو اور اس کے بدلے میں مجھے آج ہی فنا کر دیا جائے! آہ، گلوتیا، علی تو میری ہے ——— میں نے تجھے محبت کرنا کیوں سکھایا؟

محبت کی گھڑیوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ زمانہ تیزی سے گزر جاتا ہے اور وہ وقت آ پہنچا جب دو فانی انسانوں کی محبت بلندی کے آخری نقطے تک پہنچ کر اپنے پروں کو سمیٹ لیتی اور اس بلندی سے اتر آتی نہیں، گر پڑتی ہے!

وہ وقت بھی آگیا کہ ایک دن پگمیلیان نے شدید صدمہ و الم کے ساتھ محسوس کیا۔ شیرو خواب کا مجسمہ گلاتیا، جوانی کو آواز لگاتا مرجھا چلا ہے! پگمیلیان نے اس کی آنکھوں کے گوشوں پر ہلکی ہلکی جھریاں پڑتی دیکھیں! لیکن انسانی ذہانت ابھر کر حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور پگمیلیان نہ صرف ایک انسان تھا۔ بلکہ دل گرفتہ محبت بھی تھا! اس نے خود فریبی کا سہارا لیا۔ جو دیکھا تھا اسے ان دیکھا سمجھا اور گلاتیا کا جوں جوں ڈھلنے کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی محبت کی عمر کو چند سے طویل کر لیا! لیکن وہ انسان اور عاشق ہونے کے ساتھ ایک صناع بھی تھا۔ اور ایسی نظر رکھتا تھا۔ جو پتھر کی چٹان کے اندر سماوی حسن و جمال کو دیکھ سکتی تھی۔ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ دیر تک دھوکے میں رکھ سکے؟ انجام سے زیادہ مدت تک نظر نہ چرا سکتا تھا۔ اس کے خوابستان صناعت میں صناعی کمزوری پن نظر آنے لگا۔ گلاتیا کے سوتے سروپ پر جب اس کی نظر پڑتی۔ جب وہ اس کے جمال خوابیدہ کو دیکھتا۔ تو زندگی کے بوجھ کی تھکن کے آثار صاف دکھائی دیتے اور اس منظر کو دیکھ کر پگمیلیان مایوسی کے سمندر میں ڈوب جاتا تھا!

لیکن گلاتیا خود اس حقیقت سے بے خبر اور بالکل بے پرواہ تھی۔ اس کی جوانی اب بھی برسوں کا تقاضا کر رہی تھی وہ اب بھی ایک سوئے ہوئے بچے کی طرح پیاری اور دل نشین تھی! ہر چند اس کی جوانی کا مدعا اپنی خواہش اور دعا کو آسمان تک اونچا کر دینے کا اشارہ کرتا محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ تکان جو ہر حسن کو افسردہ کر دیتی ہے، اس میں کوئی نظر آتی تھی!

زوال حسن اور انجام ہستی کا خوفناک احساس پگمیلیان کو مایوسی کے تاریک گڑھے میں دھکیلتا جا رہا تھا وہ اپنے صنم خانے کے کونوں میں منہ چھپا کر آنسو بہاتا اور ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اور جب طاقت ضبط جواب دے دیتی تو دل ہی دل میں یہ کہنے لگتا

"گلاتیا، تو نے مجھے سب کچھ دیا، وہ متبرک اور وہ افزائیں دیں جن کی یاد بھی آدمی کو سرشار رکھ سکتی ہے! مگر جس طرح دکھ و غم انسان کو افسردہ و مضمحل کر دیتا ہے۔ اسی طرح خوشی و مسرت بھی تھکا دیتی ہے!

"گلاتیا، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ خواب جسم اختیار کر کے خود ہو جاتے ہیں، اپنے جیون پا کر خراب ہو جاتے ہیں! ان میں سے تیری تخلیق کی۔ مگر مجھے بتا کر میں نے جو حقیقت قائم کی وہ اور نئے تھی۔ فانی حسن ہے، ازلی حقیقت، حسن کو تو ابدی ہونا چاہیے۔ سروپ کو تو امر ہونا چاہیے!"

"گلاتیا، آج میں تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں اور نفرت بھی کرتا ہوں۔ پیار کرنے کے ساتھ دکھی بھی ہوں، اور اس طرح دوہرے عذاب میں مبتلا ہوں۔ ایک انہونی بات اور ایک انسانی خواہش کی کشمکش کے شکنجے میں پھنس گیا ہوں۔ انہونی یہ کہ میری جان محبت ایک روز زندہ نہ ہو گی! اور خواہش اس کی کہ تو اپنی تمام جہاں آرائیوں اور حسن سامانیوں کے ساتھ لافانی بن جائے اور میں اس کے اندر مسرور ہوں!"

ایک دن پگمیلیان دور رہا تھا اور رات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ خاموش ہو کر رات پھیلے کے دیا جلا رہا تھا اور سمندر سے ایک آواز آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ صدا ضمیر و منکسب دل و دماغ کے لیے محبت کے نغموں کا مفہوم رکھتی ہے۔ پگمیلیان کے جان میں ایک جھرجھری آئی اور اس کے ذہن میں نئے اور پرانے تصورات پیدا ہونے لگے۔ اب وہ نئی تخلیق ترشنے کی آرزو کر رہا تھا! لیکن اس کی یہ نئی حالت چند روز تک رہی اور پھر وہ شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ جوش اور ولولے کی جگہ پھر تھکن اور افسردگی نے لے لی!

رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ پجیلیان فن و صناعت کو بھی مکر و فریب سمجھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ صناعت فریب محض ہے کیونکہ وہ محبت کے جذبے کو فنا کر دیتی ہے۔ محبت کی جگہ خود چھین لیتی ہے! صناعت اب اس کی نظر میں ذہن کی غلامی اور تصور کا قید خانہ معلوم ہونے لگی! ایسی واہمہ پرستی خرافاتی جو صرف غلام فطرت انسان کے لیے ہی مناسب ہو سکتی ہے!

فن و صناعت سے اس طرح بیزار ہو کر پجیلیان اصل اپنے جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا۔ صنم سازی سے لات اٹھا لی اور خواہش آرزو کے نئے نئے مجسمے بنانے لگا۔ کسی وقت اگر گلاتیا کی آنکھیں بھیگی نظر آتیں تو پجیلیان دل سوزی کے جذبے سے تڑپنے لگتا۔ مگر گلاتیا اس کی حالت کو اصل نہیں سمجھتی تھی۔ پجیلیان کے احساس کی نزاکت اور جذبے کی گہرائی کا سمجھنا اس کے لیے ممکن نہ تھا! عورت اور مرد کی تخلیق ہوئی اسی عنوان پر ہے!

پجیلیان جب اس سے باتیں کرتا تو ایسی نرمی اور عاطفت سے مخاطب کرتا جیسے بچوں کے خواب کا تانا بانا نازک ہوتا ہے۔ سمجھانے کے لیے اس سے کہتا۔

"پیاری گلاتیا، تجھے معلوم ہے کہ پتھر کی مورتیاں گھڑنا میری زندگی کا مشغلہ رہا ہے۔ لیکن جذبہ و احساس سے مجھے تو نے متعارف کرایا۔ جینے کے معنی مجھے تو نے سکھائے۔ اس لیے جب میں تجھے رنجیدہ و ملول دیکھتا ہوں تو جینے سے بیزار ہو جاتا ہوں! اس لیے گلاتیا اس کو موت کا طلب گار نہ بنا، خاک نژاد ہونے کے باوجود مجھے آسمان سے الہام ہوتا ہے، جو فانی ہو کر بھی قدرت کے اشارے دیکھ سکتا ہے

"میرے من موہن پہلے، پیاری گلاتیا۔ اگرچہ ہواؤں کے ساتھ اڑ جاتے ہیں۔ لیکن میرے دلوے ابدیت کی ساعتیں ہیں! اس لیے اچھی گلاتیا تو اگر چاہے تو میری اس دیوانہ آرزو کو، ابدیت کے اس لمحے کو بچا سکتی ہے!

"گلاتیا۔ انسان، جذبہ انسان کی فطرت کا ایک مختصر ہزار ایک بے حقیقت، جتنا یعنی اس کی محبت کی ابدی نشانی، زندہ اور باقی رہتی ہے! انسانی محبت کا لمحہ فنا نہیں ہوتا! اس طرح ہم نے محبت کر کے اپنی ہستیوں سے سارے عالم کو بھر دیا ہے کائنات کو معمور کر دیا ہے! بتا، میری پیاری گلاتیا مجھے بتا۔ کیا تو میرے غم کا راز، میرے دکھ کا بھید سمجھتی ہے؟

مگر گلاتیا اس زبان کو سمجھنے کے قابل نہ تھی۔ اس کی پہلی اپنی جگہ ایک مستقل تھی، اس کی پہلے خبری اپنے مقام پر شیریں و لذیذ تھی! وہ پجیلیان کا مطلب و مقصد تو نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس کے جیسے کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی! لیکن پجیلیان کی آرزو تشنہ ہی رہی۔ اس کے سوال کا جواب نہیں ملا

وہ دن بھی بالآخر آ پہنچا۔ جب گلاتیا کی آنکھوں کی روشنی، آنکھوں کی جوت جو ہیرے کی طرح کوری تھیں، مدھم پڑنے لگی۔ اس کے سینے پر جلد کا رنگ پھیکا پڑ چلا۔ اس کے پہلوؤں کے ثمر و رج سے خالی دکھائی دینے لگے، گلاتیا کا رنگین و گداز سراپا اس طرح بے رنگ اور پھیکا پڑتا جا رہا تھا جیسے مقدر کا مجسمہ بے زور و بے رنگ ہوتا ہے۔

جوں جوں دن بیت رہے تھے، گلاتیا کا شباب زائل ہو رہا تھا۔ مگر گزری ہوئی شان آفریں و تابناک گھڑیوں کی یادیں محبت کے تازہ افراد ہوتے اور حسرت ناک برسوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ شاید گلاتیا کی حسن زیبائی اور اجزاء روپ پجیلیان کے اندر پرستش کے جذبے کو پھر ابھار دے گا۔ لیکن فطرت انسان کبھی بدلی بھی ہے۔

چمپیان، وہ خلوتِ من و جمال جسے اپنی تکمیل کی آرزو تھی۔ گلتیا کو اپنے نئے خواب سناسنا کر بہلاتا رہتا تھا۔ اور گلتیا، وہ پیکرِ حسن و شباب زندگی جس پر غالب آچکی تھی۔ پرانی اداؤں سے چمپیان کو پھسلاتی رہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کی خواہش و آرزو کے باوجود جدائی کا وقت قریب آرہا تھا، دوری بڑھنے لگی تھی، کیونکہ جذبات مرجھاتے جا رہے تھے۔!

صحت کی مرمری تحریک سے جب گلتیا اپنا مقابلہ کرتی تو اس رنگ میں جذب ہو جاتی کہ یہ تجھے اعتدال وقت سے متاثر ہوتا جانتے ہی نہیں۔ نہ انہیں کوئی غم سے زنگ، اور وہ اس آرزو پر مجبور ہو جاتی جو دیوی دیوتاؤں ہی کو زیب دیتی ہے۔ یعنی وہ جلدی موت آنے کی تمنا کرنے لگی۔

——— لیکن اپنی مرضی سے مرتا کون ہے؟

بالآخر چمپیان کو ایک دن صبح کے وقت گلتیا کی شکل بگڑی سی نظر آئی۔ اس نے ایک خیال قائم کر لیا اور بے چینی سے رات ہونے کا منتظر رہا۔ گلتیا جب اپنے بستر پر جا سوئی تو چمپیان نے ہتھوڑی اٹھا کر سوئی ہوئی گلتیا کے سینے پر ایک ضرب لگائی اور ضرب کے ساتھ حسرت کا دائمی خوشی سنائی دیا۔ فضا اداس ہو گئی۔ ایسی اداس جس کے اندر شاعروں کے خواب پلتے ہیں۔ چمپیان کا دل رنج و غم سے دو نیم تھا وہ بے تاب ہو کر بکھلنے لگا۔

"اے جمال و رعنائی، کاش میں جانتا ہوتا کہ تو اتنا بے رحم بھی ہو سکتا ہے! کاش میں اس وقت اندھا ہو گیا ہوتا! کیونکہ ہر خواب کی تعبیر ایک دوش لگتی اور ہر سپنے کا نتیجہ ایک رتھی ہوتی ہے؟"

چمپیان نے پھر ڈرتے ڈرتے اس کے بدن کو چھوا۔ بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ چمپیان کے خیال نے دفعتہً پلٹا کھایا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک دوسرا مجسمہ رونما ہو رہا ہے۔ تو وہ کانپ گیا! گلتیا پھر پتھر کی مورتی بن گئی تھی! اس کا بدن مرمر کی طرح سخت اور چکنا ہو گیا، اور وہ پھر وہی پاکیزہ و سماوی ہستی بن گئی، جیسی جان پڑنے سے پہلے تھی۔ مگر اس کے رخسار پر آنسو کی ایک بوند بھی جم کر رہ گئی تھی! یہ منجمد آنسو اس مجسمے پر ایک اضافہ تھا۔

وہ چونکہ ایک صناع تھا۔ اس لیے چمپیان کی حیرانی اندازے سے باہر ہے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا خود اس کی روح کی تجسیم تھی، موت یا معجزے کا جذبہ تھا! اسے دھیان آیا کہ خون و گوشت کے پیکر میں جو صناعی مادہ ہے۔ اس کو اپنی صناعی کی قوت سے دور کر دے۔ چنانچہ اس نے اندھیرے میں اپنی چھینی ہتھوڑی ڈھونڈ نکالی اور رات بھر کام میں لگا رہا۔ رات کی حیرت اور خموشی میں ہتھوڑی کی ضربیں کسی خائف دوشیزہ کی طرح سنائی دیتی تھیں۔

اس دنیا میں قدم رکھ کر انسان ایک چادر اوڑھ لیتا ہے۔ اور وہ غم کی چادر ہوتی ہے! اور انسانی فطرت جب غم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو وہ کامیابی بس اتنی ہوتی ہے۔ جتنا چھینی ہتھوڑی چلا کر چمپیان کامیاب تھا۔ اور اس کامیابی کی اہمیت غم کی ناقابلِ فتح سندیوں کے مقابلے میں پل بھر کی خوشی کے برابر ہے!

ایسی سوگواری جس میں اس وقت چمپیان مبتلا تھا۔ ایک جذباتی تخلیق کے مناسب حال اور روحانی صناعت کے لیے موافق تھی ہے۔ چمپیان نے اپنے ہاتھوں پر پروں کی سی کپکپاہٹ محسوس کی۔ ایسی نرم اور ہلکی کپکپاہٹ جو حالتِ اختلاط میں اس کو گلتیا کے سینے پر محسوس ہوا کرتی تھی! چمپیان ابھی تک ایک جوش و شوق سے معمور عورت سے اتنا قریب محسوس کر رہا تھا کہ اس کو گلتیا کے مرمریں جسم کا زندگی اور محبت کی گرمی سے خالی اور عاری ہونے کا حق الیقین نہ تھا۔ اس احساس میں محبت کی وقتی آرزو نے چمپیان کی چھینی ہتھوڑی کے اندر

اس جذبے کو روندا رہا تھا! ہتھوڑی پڑنے کی آواز خطرمندی کا نعرہ اور خوشی کا غلغلہ بن گیا تھا جس کی آواز تال بکھر گئی تھی۔ گویا مرمر کی اس مورت کے اندر زندگی تازہ ہو جانے کی آرزو اپنا کام کر رہی ہے!

پگمیلیان نے پھر جو نظر ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ پیکر اس کی صناعت دوست کاری کا نتیجہ نہیں تھا، وہ گلاٹیا دکتر اس کا مجسمہ نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کڑی کمان کا صنم غائب تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں انسان کی غم نصیبی کا بیان بن گئی تھیں۔ جذبۂ اہمیت سینے پر جم کر رہ گیا تھا۔ راتوں کا گداز بڑی طرح زخمی تھا، اور رعنائی و دل ربائی کا یہ پیکر ماد و ارض کی بغل میں سو جانا چاہتا تھا! چنانچہ پگمیلیان اب ایک پیکر جادو طراز کی جگہ رازِ غم کے مجسمے کو کھڑا رہا تھا! اس کے ہات دغا اور آنکھیں فریب دے رہی تھیں! پگمیلیان غم زدہ تھا اور اس شخص کے غم سے بڑا غم کس کا ہوگا۔ جو خود خالق ہو کر یہ دیکھے کہ کل کا دن ہو کا عالم ہوگا، ایک ایسا عالم جہاں نہ الہام آفریں سبزہ و سایہ ہوں گے۔ اور نہ کوئی چشمہ و چمن زار!

انسان کو جہاں غم نصیب بنایا گیا ہے۔ وہاں اس پر ایک احسان بھی کیا گیا ہے۔ اس کو دل کا سہارا سکھا دیا گیا ہے! لیکن جب دل کو سمجھانے کے لیے بھی بوجھ کا مشغلہ ہی ہو تو وہ ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے۔ جب آدمی ہر چیز اور ہر بات پر موت ہی کو ترجیح دیتا ہے! اور جو شخص فنا سے اس طرح فریب ہو اس سے کسی لافانی صناعت پارہ کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے! پگمیلیان کی حالت اس وقت اگر کچھ تھی تو بس یہ کہ وہ خالق ہو کر ناقص مخلوق سے محبت کرنے کی سزا پا رہا تھا! اور اس کی مثال ایسے شخص سے دی جا سکتی ہے جو ایک دیوانے کو دیکھ کر رو رہا ہو!

اُوئی اللہ

ممتاز مفتی

اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو صمد کبابیے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی۔ اگر اسلم کو مس رنگی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔

اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشا ہنسنے کی عادت نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بیٹے جمیل کے اس جواب پر کہ اندر عورتیں بیٹھی ہیں جی، مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس قدر شدت سے نہ ہنستے اور حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال نہ ہوتا اور جملہ متعلقین ان کی وفات کے بعد بے یار و مددگار نہ رہ جاتے۔ تو اس صورت میں جمیل مدار ڈنگ روڈ کی کوٹھی چھوڑ کر ایورگرین لاج میں ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ اگر خدا بخش کو صمد کبابیے کے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی تو وہ ایڈورڈ ہوسٹل کو نہ چھوڑتا۔ ایورگرین لاج میں آنے سے پہلے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صمد کبابیے کی دوکان کے پڑوس میں رہ سکے۔

اگر اسلم کو مس رنگی سے عشق نہ ہوتا اور وہ دن رات رنگی کے بال روم کے چکر نہ لگاتا اور یہ خبر لاہور سے چل کر ان کے گاؤں ماچ کوٹ تک نہ پہنچتی اور اس کے والد موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے اس کا عقد اس کی بنت ام زینب سے کروا دیتے تو اسلم کے سسر سید حبیب اللہ نئے محلے میں وہ مکان ہمارے لیے خالی نہ کرواتے اور ایورگرین لاج کی بنیاد ہی نہ پڑتی۔

اگر میں چغتائی خطوط سے متاثر ہو کر دنیا کے مشہور نقوش سے چند نیم برہنہ نرتے اپنے کیمیکل کی دیواروں پر نہ سجاتا تو سپرنٹنڈنٹ میرے خلاف پولیس سے شکایت نہ کرتے تو میں بورڈنگ سے سزا کے طور پر نہ نکالا جاتا۔ اس صورت میں ایورگرین لاج بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ اس واقعے کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے شیخ اجمل حسین کو ہنستے ہنستے جام اجل پینا پڑا۔ اور قدرتی طور پر جمیل کی ساخت ایسی بنائی گئی کہ وہ عورت سے دلچسپی کا اظہار شرما کر کرے۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے اسلم اور مس رنگی کے عشق پر دائمی بندش قائم کی گئی۔ خدا بخش کو کباب کھانے پر اکسایا گیا اور صمد کو ایسے کباب کھانے کے بعد اسے نئے محلے میں کباب کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا گیا۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لیے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ اور پھر جمیل، اسلم، خدا بخش اور میرے علاوہ وہ بڑی کوٹھی کی طرح جھکی ہوئی بڑھیا اور اس کی پوتی مینا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا اور بلا عذر ہمارا لڑکا بدصورت ہے

بدھو نہ تھا۔

اور ان سارے واقعات کو مجتمع کرنے کے لیے مجھے ہر شکل سے نکالے جانے کا حادثہ رونما ہوا۔ جب میرے پرنسپل مولانا نے ان نیم برہنہ تصویروں کے پیش نظر جو میں نے اپنے کمرے میں ٹانگ رکھی تھیں، پرنسپل سے شکایت کر دی۔ شام کو جب ہم اکٹھے ہوئے تو اسلم مولانا کے حکم کے متعلق سن کر ہنسنے سے بل کھانے لگا اور انہیں گالیاں دینے لگا۔

"یہ ٹھیک ہے بیٹا" خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا: "مولانا کو بھلا کہہ کر دل ٹھنڈا تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے؟"

اسلم نے سر کھجا کر کہا: "یار ایک مکان تو مل سکتا ہے۔ سارے شہر سے یہ فائدہ بھی نہ اٹھایا تو ——"

"تو لعنت ہے تم پر" خدا بخش نے بند چھاتے ہوئے بولا۔

"کہاں ہے وہ مکان؟" جمیل نے مسکرا کر پوچھا۔

"نئے محلے میں۔"

"بھئی واہ ——" خدا بخش بولا: "اپنے صمدو کی دوکان کے پاس ہوا تو دوست میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔"

اور جمیل بھی تو کوئی چھوڑ رہا ہے اس کی والدہ جا چکی ہیں نا؟" اسلم نے کہا اور اس طرح ایورگرین لاج کی بنیاد پڑی۔

لیکن ممکن ہے کہ ایورگرین لاج بننے کے بعد یہ واقعہ ظہور پذیر نہ ہوتا۔ حقیقت میں تمام تر قصور ہمارے نوکر بدھو کا تھا۔

آپ جانتے ہیں آج کل نوکر کا ملنا کس قدر مشکل ہے۔ ہم نے بورڈنگ کے باورچیوں سے بات کی تھی۔ بھئی کوئی نوکر مگر اور غلام علی نے بہ حسن کر ہاتھ کا پنجہ ویلچی کے ٹھکنے پر رکھ دیا تھا اور نوکر ——؟ کہہ کر یوں سوچ میں پڑ گیا تھا جیسے اسے کوئی خبر سنانے کو کہا گیا ہو۔ احمد حسین بولا "علیہ تو بیٹھ کی کالج میں لگ گیا ہے اور گھاٹکھنڈ والے صاحب کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ ہندوستانی اسے کسی مہرے پڑی بلا لایا ہے۔"

—— اچھا بابو جی میں دیکھوں گا۔

ایورگرین میں چار ایک دن تک تو ہم نوکر کے بغیر ہی رہے پھر ایک روز جب خدا بخش صمدو کباڑیے کی دوکان سے واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے بدھو تھا جیسے کوئی پالتو کتا ہو۔

"لو جناب" خدا بخش نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا: "یہ دیکھو آپ کا نوکر، آپ بدھو ہیں خالص بدھو۔"

"جی ہاں جی ہاں" بدھو کی لمبوتری پھوٹ نکلی۔

"اب کیا یقین؟" خدا بخش نے خطیبانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں جی ہاں" بدھو کا منہ کھلا اور اس میں سے تھوک کے لعوبے چھینٹے دور دور تک اڑے۔

اس کے بعد بدھو جب بھی کام کاج سے فارغ ہوتا تو چپکے سے کرسی پر جا بیٹھتا بلکہ چھوٹے موٹے کام بھی وہ وہیں پر بیٹھ کر کیا کرتا۔ اس پر بھی اسے ڈانٹتے۔

"ارے بدھو!" اسلم چیختا۔ "تو جاگ کر کرسی پر کیوں چڑھ جاتا ہے؟"

جی ہاں بابو جی" اس کی باچھیں یوں کھل جائیں جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔

"ابے دھو" خدا بخش ہنستا۔ کوٹھے پر کیا دھرا ہے؟ دھرا ہے کچھ؟

"جی ہاں بابو جی" کچھ بھی نہیں دھرا جی ہاں بابو جی"

دھو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاہے اس کی تعریف کرو۔ چاہے اس پر رعب جمانے کی کوشش کرو چاہے ڈانٹنے کی ہر صورت میں اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ سہ روزن کی طرح جہاں سے دہان تک کھل جاتا۔ تھوک کے قطرے ہوا میں اڑتے اور وہ خوش ہو کر چلاتا۔ جی ہاں بابو جی ہاں جی بابو جی۔

اگر دھو کو کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ کیوں کہ اس صورت میں ہمیں کوٹھے کے جملہ اسرار کا علم ہی نہ ہوتا۔

دھو کی دھوپ کھانے کی عادت کو چھوڑیئے۔ اگر وہ بڑھیا عادت کے طور پر بڑی گڑیا کی طرح نہ چیختی تو ہماری توجہ پڑوس کے مکان کی طرف مبذول نہ ہوتی۔

"اے ہے لڑکی سر پر دوپٹہ لے" بڑی گڑیا چیختی اور ہمارے کان کھڑے ہو جاتے اور ہمیں شدت سے احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی موجود ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے۔

"اے ہے میاں ذرا سنبھل کے بیٹھو تمہیں اپنا ہوش بھی ہے" اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گذر رہی ہے جہاں اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا اور جہاں سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ بڑی گڑیا چیختی اور جمیل خواہ مخواہ شرمائے جاتا اور اسلم کے دل میں مس رنگی کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ وہ دھن گنگنانے لگتا جو اس نے مس رنگی سے سیکھی تھی "خانگ ان کرائیں" اور خدا بخش تو بند مجاڑ کر کہتا یار بڑے ام مصالحے ڈالنے لگا ہے۔ صعود کہاروں میں گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ اور میرے دل میں بیتابی کا عمل ابھرتا اور ہلکے ہلکے دھماکے ہوتے اور خطوط دھکتے اور سیاہ آنکھیں دوڑتیں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے کوٹھے کا راز جمیل پر کھلا تھا۔ وہ صبح تو ہمیں ہی لوٹ کر کوٹھے پر چلا جایا کرتا تھا۔ اور پھر دیر تک نہ جانے وہاں کیا کرتا رہتا اور جب واپس آتا تو اس قدر دھیرے پاؤں رکھنے سے ڈرتا کہ چاپ تک سنائی نہ دیتی۔ زینہ اترتے ہوئے وہ آپ ہی آپ شرماتا اور مسکاتا شرمائے جاتا اور مسکائے چلا جاتا۔

میں اس زمانے میں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ جھینپ جھینپ کر بھی انتقام محبت لیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جھینپنا اور نیچی نگاہوں سے مسکرانا انسانی خصوصیات میں اور عورتوں کے دل میں اس سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

ان دنوں مجھے زندگی کا تجربہ نہ تھا۔ اور میرا علم چند سستی کتابوں کے اوراق تک محدود تھا جیسے ہر کالج کے لڑکے کا ہوا کرتا ہے اس لیے میں نے جمیل کے شرمانے کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ عورت کی بات پر جمیل کا جھینپنا اس بات کا شاہد ہے کہ اسے عورت سے قطعی طور پر دلچسپی نہیں۔

جمیل ایک اونچے لمبے قد اور دبلے جسم کا لڑکا تھا۔ اس کی جلد کا رنگ سنہری تھا۔ اس کی آنکھیں شربتی تھیں جو جھینپنے کے علاوہ نیم وا

دمتی تھیں ——— اس کے سنہرے بال شاعرانہ انداز میں پریشان رہتے تھے۔ اس کے ان ہر بات کا ایک ہی جواب تھا دبی دبی مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظر جیسے ساون میں پھوار پڑ رہی ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ فطرت نے اس کے تکلم کے بیشتر حصے کو اس کی نظر اور مسکراہٹ میں مرکوز کر دیا تھا۔ اور اس مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظر سے وہ دل کے بڑے بڑے پیچیدہ جذبات کا اظہار کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ ان دنوں مجھے بھیگی نظر اور دبی مسکراہٹ کے مختلف لطیف درجوں کا احساس نہیں تھا۔ اور نہ ہی میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ تکلم جو نگاہ اور ہونٹوں کی لطیف جنبشوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ اپنا اپنا مفہوم دور دور تک نشر کر سکتا ہے۔

جمیل کے بعد کوٹھے کے اسرار کا راز اسلم پر کھلا۔ اس روز جب وہ نیچے آیا تو غیر معمولی کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا تھا اور ان جانے میں غالباً ان نوجیں گنگنا رہا تھا۔ لیکن اس کے گیت کی دھن سراسر بدلی ہوئی تھی۔ بول تو انگریزی تھے۔ لیکن دھن میں لوک گیت کا رنگ نمایاں تھا۔ سب سے پہلے خدا بخش نے اس بدلی ہوئی دھن کو محسوس کیا۔ حالانکہ خدا بخش کو علم و ادب اور راگ رنگ کی باریکیوں کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ دہقانی انداز میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ بن سمجھے مزا آجاتا۔ بولا "یار تکلم آج مس رنگی کو ہیر کا روپ دے رہے ہو تم۔ خیریت تو ہے؟"

اسلم نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا "مغربی رقص میں مجھے ایک ہی چیز کھلتی ہے اور وہ ہے اس کی تنگی۔ اگر ٹانگوں میں مغربی رقص ہو اور نگاہوں میں مشرقی جھکاؤ تو مزا آجائے۔"

"ہی ہی ہی" خدا بخش ہنسا "لو بھئی مس رنگی کے جسم کا اوپر کا حصہ تو غائب ہوا۔ کیوں بدھو!"

"جی ہاں بابو جی" بدھو کی باچھیں کھلیں۔

جمیل کے سنہرے رنگ پر زرد دھبے تیرنے لگے اور آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگی۔

اسی شام اسلم مرتی چنتائی کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا "یار کالے یہ جھکی جھکی آنکھ بھی کیا چیز ہے!"

لیکن مس رنگی کی تو کٹورہ سی کھلی رہتی ہیں" خدا بخش ہنسا۔

"ارے یار اس کا مزہ اور ہی کچھ ہے" اسلم نے ایک آہ بھری۔

"جی ہاں جی ہاں بابو جی" بدھو نے سمجھا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔

"نیم وا" جمیل مسکرایا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

"نیم وا جو یا کٹورا سی" خدا بخش نے تہ بند جھاڑتے ہوئے کہا "سب ایک ہی وقت آنے پر کٹورا سی نیم وا ہو جاتی ہیں۔ اور نیم وا کٹورا سی کھل جاتی ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے!"

"جی ہاں بابو جی" بدھو کے پھٹے ہوئے منہ سے چھینٹے اڑے اور دو خالی کٹورے ہمیں گھورنے لگے۔

سب سے آخر میں ان نیم وا آنکھوں کی بات خدا بخش تک پہنچی۔ اور اس روز وہ دبا دبایا رومان منظر عام پر آگیا۔ خدا بخش نے کس بے دردی سے ان ڈولتی کشتیوں کا جھانڈا سمندر میں پھوڑ دیا۔

"ارے یار وہ کوٹھے سے ہی چلو یار کالے۔ اسلم، جمیل، بھئی یہاں تو مس رنگی کا پاکستانی ایڈیشن کھلا پڑا ہے۔ جاگ کے

آنا، بھاگ کے۔"

اور ہم سب یوں کرتے کہ بھاگے جیسے ہمیں اس پاکستانی ایڈیشن کے متعلق کوئی علم ہی نہ ہو۔ سب سے آگے اسلم تھا۔ اس کے پیچھے میں اور سب سے پیچھے جمیل ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔

اس روز کے بعد کوٹھے کے امرود کی حقیقت ایک کھلا راز بن گئی۔ اور سب نے مل کر کوٹھے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ کوٹھے کے امرود سے کماحقہٗ واقف ہو چکے تھے۔ اگرچہ ہر کوئی اس راز کو یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا جیسے وہ اس کا اپنا راز ہو۔ ہر کوئی اس راز کو اپنے کی دھن میں شدت سے مصروف تھا۔ کاش یہ بات مجھے ان دنوں معلوم ہوتی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے جمیل کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ اس روز اتفاق سے میں کالج سے جلدی آ گیا۔ گھر پہنچا تو دھوکے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ بلکہ دھوکے مجھے کہا بھی: "بابو جی! آج تو آپ سب سے پہلے آ گئے۔" کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اتفاق سے میں پیر صاحب میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جمیل پیر صاحب کے باڑے میں کھڑا مسکرائے جا رہا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہاں جمیل دیوار سے لگ کر مسکرائے کیوں جا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور پھر معمول کے خلاف اونچی آواز میں کہنے لگا: "آؤ۔ آؤ۔ رک کیوں گئے؟" اوپر جا کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وہاں جمیل کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور وہ اسی طرح کھڑا مسکرائے جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور اس نے مسکرانا چھوڑ کر کھانا شروع کر دیا اور پھر جلد ہی وہ اٹھ کر نیچے اتر آیا۔

کچھ دیر تک میں بے مصرف ٹہلتا رہا۔ اوپر دو تین صرف ایک مزار مکان تھا۔ اس کے ایک طرف گلی تھی۔ دو جانب تین منزلہ مکانات کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ اور ایک طرف پرانی ساخت کی ایک چندی اینٹوں کی ایک منزلہ دیوار تھی۔ جس میں ایک بند کھڑکی تھی جس کے اندر جالی دار اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن پرلی جانب سے جالیوں کے سوراخ پلستر سے بند کیے ہوئے تھے۔

جب میں اکتا کر نیچے اترنے لگا تو دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور جالی کے سوراخ شیشے کے ستاروں کی طرح روشن ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کی پشت کا پلستر توڑ کر صاف کر دیا ہو۔ میں رک گیا اور غور سے ان سوراخوں کی طرف دیکھنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ان میں دھندلے رنگ دار دھبے سے دکھائی دینے لگے۔

دو سوراخوں میں سبز دھبے چمکنے لگے۔ ایک سیاہ دھبہ واضح ہونے لگا اور دو تین سنہری دھبے جھلملانے لگے۔ سنہری دھبوں میں جنبش سی ہوئی۔ ایک دھندلی سی مسکراہٹ اور گھنی مژگاں کا ایک جھرنا سے لگا۔

دفعتاً بڑی کڑیا بھاری آواز میں بھیں بھیں کرنے لگی۔

"اے ہے لڑکی تو پھر وہاں کھڑکی کھول کر بیٹھ گئی، ہزار بار کہا ہے کہ بروقت کتاب لے کر نہ بیٹھ جایا کر۔"

"اوئی اللہ! کہیں بیٹھنے بھی دیں گی آپ" ایک رنگین آواز گونجی۔

اف وہ اوئی اللہ! سارے جہاں کا حسن، رنگینی، لطافت، نزاکت اور زندگی سمٹ کر اس اوئی اللہ میں سما گئی تھی۔

میرا دل بیٹھ گیا۔

کھٹ سے کوئی دروازہ بند ہوا اور جالی کے سوراخوں پر پھر سے ظلمت چھا گئی۔ جیسے اندر سے کسی نے پلستر کر کے انہیں بند کر دیا ہو۔

میں مبہوت کھڑا تھا۔ دور تک جہاں نگاہ کام کرتی تھی، جھنڈوں، منڈیروں اور دیواروں کا ایک اجڑا اجڑا انبار لگا تھا۔ جن میں مندر کا ایک سنہرا کلس شام کی گلابی روشنی میں چمک رہا تھا جس پر چند ایک چیلیں سی خاموشی سے اڑ رہی تھیں۔ پاس ہی ایک مہیب سفید چادر اوڑھے سجدے میں گری ہوئی تھی۔ آسمان پر گلابی بدلیاں یوں چمک رہی تھیں جیسے اس آدی اللہ کی تمام تر رنگینی انہوں نے جذب کر لی۔

پھر وہ دھیمے آہستہ آہستہ مجھ پر مسلط ہوتے گئے۔ میرے ادراک، میرے خیالات، میرے جذبات پر حاوی ہوتے گئے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے رنگین دھیمے ناچتے ہوئے حروف میں ایک جنبش ہوتی اور عبارت میں کچھ سوراخ کھل جاتے اور پھر رنگین، سیاہ اور سنہری دھیمے ناچتے اور گھنے بالوں کا ایک چھتر گرتا اور چمک دار سیاہ کشتی سی ڈولتی۔ حتیٰ کہ میں کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور ان جانے میں کرسی پر جا چڑھتا اور سیڑھیوں کے ٹیالے اندھیرے میں کھڑا انتظار کرتا کہ کب سوراخوں کا پنجرہ کھڑے اور وہ دھیمے نمودار ہوں اور اس سنہرے مندر میں ناقوس بجے آدی اللہ میں کھو جاؤں اور اس آدی اللہ کی رنگینی بادلوں میں منعکس ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ اور گرمیوں میں میرے علاوہ اور بھی ایسے تھے جن کی کتابوں میں سوراخ کھل جاتے تھے۔ اور نگاہوں تلے رنگین دھیمے ناچتے تھے۔ لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں اس بات سے قطعی واقف نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان دھیموں کی حقیقت مجھی تک محدود ہے۔ وہ رنگین امریکہ صرف میری ہی دریافت ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ بھی کیسے ہوتا جب کبھی چھٹی کے دن ہم سب کرسی پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان جالیوں سے دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کوئی نگاہ بھر کر ادھر دیکھتا بھی نہ تھا۔ میں تو خیر اس بات کو خفیہ راز میں رکھنے کے لیے ادھر نہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ میری بات چھوڑ دیجئے۔

اسلم عام طور پر اپنے محبوب رسالہ لائف کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی ناخن ان رنگین گلگلے نما اور گلگلاتے وقت سرسری طور پر ادھر دیکھ بھی لیتا۔ لیکن یہ تو معمولی بات تھی۔ جمیل تو ہمیشہ ادھر بیٹھ کر کے بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ نصیحت کر اپنی کرسی لیتا سے اس مقام پر کیا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ جالیوں میں سے بخوبی نظر آ سکے۔ یہ بات ناقابل توجہ نہ تھی کیوں کہ دلچسپی تو دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے اپنا آپ دکھانے سے نہیں اور خدا بخش تو زیادہ تر اوپر بیٹھتا ہی نہ تھا۔ چند ایک منٹوں کے لیے کرسی پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لوٹ مار شروع کر دیتا۔ تہ بند جھاڑتا۔ بدن کھجاتا اور آپ ہی آپ گنگناتا۔ بہت ہی مصالحے ڈالنے شروع کر دیتے ہیں سمجھ لیجئے گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔

البتہ جب کبھی اس مندر میں آدی اللہ کا ناقوس بجتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اسلم کے ہاتھ سے پرچہ چھوٹ جاتا۔ جمیل کا رنگ نہ جانے کیوں زرد پڑ جاتا۔ آنکھوں میں لمحہ بھر بازی ہونے لگتی۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اور خدا بخش گرمی سے بے حال ہو کر تہ بند جھاڑتا اور صمد کو بیسیوں گالیاں دیتا۔ پھر دفعتاً وہ بھیں بھیں کرنے والی بڑی کی گڑ گڑاہٹ اور دھپ سے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی اور ان جالیوں پر ظلمت چھا جاتی۔ اور پھر ——— پھر مجھے لوگوں کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ رہتا اور میری نگاہ میں مکانوں، منڈیروں اور دیواروں کا وہ انبار کانپتا اور مندر کا کلس چمکتا، چیلیں منڈلاتیں اور بادل رنگ جھلکاتے ——— اور بڑی کی گڑ گڑاہٹ چلی جاتی۔

ان حالات میں کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ان رنگین سنہرے دھیموں کا راز ان پر آشکار ہے اور اگر آشکار بھی تھا تو وہ اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے، میں اس راز کے تحفظ کے خیال سے ان جالیوں میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کیا کرتا تھا لیکن میرا

دل دھک دھک بجتا رہتا اور میری کیفیت ایسی ہوتی جیسے کوئی ہمہ تن گوش ہو پھر جب بھی موقع ملتا میں دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ جاتا اور سیڑھیوں کے اختتام پر سائے میں کھڑا ہو کر سگریٹ سلگا لیتا۔

سائے میں کھڑے ہونے سے میرا مقصد اپنے آپ کو اس نقش چغتائی سے نہیں، بلکہ اس چھنتی ہوئی دھوپ سے چھپانا ہوتا تھا جو جیل کی طرح اس منڈیر کے کس پر چھائی رہتی تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے چوکس رہتی تھی۔ وہ ایک بار میں نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی جسارت بھی کی۔ مگر اس کے نور ابھی دھوپ سے عقبی دروازہ بند ہو جاتا۔ اور جالی کی وہ آنکھیں بے نور ہو کر رہ جاتیں۔ ظاہر ہے کہ مینا یہ پسند نہ کرتی تھی کہ میں روشنی میں کھڑا ہو کر اس منڈیر کے سیمیں نوازوں۔ اس لیے میں سیڑھیوں کے اندھیرے ہی میں کھڑا رہتا اور اسے اپنی دھندلی موجودگی کا احساس دینے کے لیے سگریٹ سلگا لیتا اور سگریٹ سلگتے ہی جالیاں روشن ہو جاتیں اور وہ نیچے سامنے منظر خاص پر آ جاتا۔ اور پھر میں اس تصویر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔ اب تو وہ ٹکڑے بے حد روشن اور رنگین ہو چکے تھے یا میری نظر مشاق ہو چکی تھی۔ بہرحال میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی روز دیدار کی وہ بند کھڑکی کھلے اور مینا چند ساعت کے لیے وہاں آ کھڑی ہو۔ وہ گھنی مژگاں جھکیں، اور آنکھوں کے سیاہ کونوں میں چمک لہرائے۔ بازو ہوں۔ کبھی کبھی انگلیاں بے نیازی سے کائنات پر چھائی ہوں۔ اور وہ پرانی کی گھومتی ہوئی لکھی لکیریں کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیں۔

ایورگرین والوں کو قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ میں کسی حسینی راز سے واقف ہوں یا ان گھومتی قوسی لکیروں کی لپیٹ میں آ گیا ہوں بلکہ وہ تو کہا کرتے تھے: "کالے! تیرا کوئی چانس نہیں۔ یہاں پنجاب کی لڑکی اونچی رنگ اور نقوش پسند نہیں کرتی اور وہ ہنستے۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ لڑکیاں سانولے رنگ کو پسند نہیں کرتیں۔ بیوقوفوں کو معلوم نہ تھا کہ رنگوں کا تضاد سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے۔ کرشن کنہیا کی ہی مثال لیجئے۔ ان کا رنگ سانولا پیش کیا جاتا ہے اور پھر گوپیاں بار بار انہیں سانولے کنہیا کیوں کہتی تھیں۔ لیکن میرے ساتھی ان باتوں کو کیا جانتے تھے بیچارے۔ کرشن جی راج کی بات چھوڑیئے میں نے اپنے کئی ایک دوستوں سے اس بارے میں تحقیق کی تھی۔ مثلاً رفعت حسین کو ہی لے لیجئے۔ کتنا گورا چٹا رنگ ہے اس کا۔ اسارے کا اسارا خاندان ہی کوئی تیس پاؤنڈ سے لت پت ہو رہا ہے لیکن جب اس کے آبا نے ایک گوری چٹی حسینہ سے اس کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے پاس آ کر رو دیا۔ "یار تباہ ہو گیا میں، سفید چٹک رنگ ہے اس کا۔ اتنا چوڑا اور سرخ منہ جیسے چقندر ہو۔" اور بات صرف اس نے ایک کالی لڑکی چھوکری سے محبت کی تھی جو عشق کے درجے تک جا پہنچی تھی۔

لیکن ایورگرین کے ساتھیوں کی یہ غلط فہمی میرے حق میں بڑی مفید تھی۔ لہٰذا میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی بحث نہ کی تھی۔ بحث کرنا تو الگ رہا حالت یہ تھی کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی میرے لیے دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔ جی چاہتا کہ تنہائی میسر ہو۔ اور میں سگریٹ سلگا کر سیڑھیوں میں کھڑا ہو جاؤں ——— اب تو مینا میری موجودگی محسوس کر کے بار بار مسکراتی اور بہانے بہانے ایسی ایسی باتیں کرتی کہ میں دل مسوس کے رہ جاتا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن چنیا سے کھیلتی باتیں کرتی اسے چھیڑتی اور ذرا خاموش نہ ہوتی جب تک وہ آفت کی پرکالہ بڑھیا خدا سے فارغ کرے۔ بھیں بھیں شروع نہ کر دیتی اور وہ بڑھیا، توبہ ہے جب بات کرنے پر آ جاتی تو گیا گھر میں زلزلہ آ جاتا۔ جیسے بڑا بھوائیڈ یو یڈ نہیں کر رہا ہو۔ اسے لڑکی تجھے کسی کا خیال نہیں کسی کا لحاظ نہیں۔ اس پر مینا مسکرا کر مدھم آواز میں کہتی، اوئی اللہ اتنا خیال تو ہے، ہر دم لگا رہتا ہے۔ اور پھر میری طرف معنی خیز انداز سے دیکھتی اور وہ بڑھیا اور بھی بگڑتی تو یہ کتنی باتیں بنانی آ گئی ہیں۔ اور پھر سنا کا

کسی نئے انداز سے چمکتا اور وہ چیل اس کے اردگرد چکر لگاتی اور میرا دل قلابیں اچھلتا، اچھلتا جاتا۔

پھر وہ واقعہ جس نے ہماری محبت کو ہمیشہ کے لیے استوار کر دیا اور اس کی تابانی کو دوام بخش دیا۔

ایک روز جب ہم سب کمرے میں بیٹھے تھے تو ہوا زوروں پر تھی اور جالی کے دروازے سوں سوں کرتے تھے تو نہ جانے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا آیا۔ اور میں نے کفر کھا کر اسے روک لیا۔ وہ رسالے کا ایک ورق تھا۔ میں نے بغیر کسی مقصد کے اس کاغذ کو اس بند کھڑکی کے نیچے دراز کے ابھرے ہوئے حصے پر رکھ کر اس پر ایک اینٹ رکھ دی۔ ایسا کرنے سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا اور نہ ہی مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ چھوٹی سی تفصیل ہمارے رومان میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کر لے گی۔

اگلے روز جب میں کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کاغذ اپنی جگہ سے غائب ہے۔ مگر میں نے اس بات کو قطعی اہمیت نہ دی لیکن جب میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے ہو کر حسب معمول سگریٹ جلایا اور وہ جالی۔ بقدر ذرا ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہی کاغذ تھامے ہوئے بیٹھی تھی اور کاغذ کی طرف اشارے کر کے مسکرا رہی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ وہ بند کھڑکی کھل سکتی ہے۔ کھلتی ہے اور مینا نے اسے کھول کر وہ کاغذ تھاما ہے اور ——— اور ——— کاغذ بھی اسی طریق سے مینا کے پاس پہنچائے جا سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی میں نیچے اتر آیا اور اندر سے کمرہ بند کر کے مینا کو خط لکھنے میں مصروف ہو گیا میرا خیال تھا کہ میں چند ایک سطریں لکھ کر خط ختم کر دوں گا۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا مجھے۔ نہ جانے کہاں سے جذبات اُمڈتے چلے آئے اور میں ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا۔ خط ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے جذبات کی شدت کا احساس ہوا۔ ایک تفریح کھیل ایک دل لگی میرے لیے کس قدر اہمیت حاصل کر چکی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ میں اپنے جذبات کی حقیقت اور شدت سے واقف ہوا۔

سیڑھیوں کے سائے میں کھڑے ہو کر سگریٹ کے سلگتے انگارے کی روشنی میں مینا کو وہ خط دکھایا اور پھر شام کے جھٹپٹے میں اسے اسی اینٹ کے نیچے چھپا دیا جو بند کھڑکی تلے بنے ہوئے دریچے پر رکھی تھی۔ اگلے روز صبح سویرے میں کمرے پر چڑھا۔ اینٹ اٹھائی۔ خط غائب تھا۔ میرے دل میں انبساط کی لہر سی دوڑ گئی۔

میرے لیے وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ رہ رہ کر خیال آتا، کیا مینا جواب دے گی۔ اگر اس نے جواب نہ دیا تو، اگر وہ ناراض ہو گئی تو، اگر اس نے عقبی دروازہ کھولنا بند کر دیا تو۔ سارا دن مجھے اسی قسم کے خیال ستاتے رہے۔ رات بھر نیند نہ آئی اور میں نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی اور پھر صبح سویرے ہی میں لڑکھڑاتے کمرے پر جا پہنچا ——— اینٹ کے نیچے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

کمرے میں واپس پہنچ کر دروازہ بند کر کے میں نے وہ کاغذ کھولا۔ کاغذ پر صرف ایک لائن لکھی ہوئی تھی "اوکی اللہ اگر یہ کسی اور کے ہاتھ پڑ جاتا تو؟"

اس کے بعد اس کے خط آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے اور ایک چھپنے کی خط و کتابت کے بعد تو وہ دبے دبے الفاظ میں اظہار محبت بھی کرنے لگی۔ لیکن ہمارے خطوں میں نہ تو عنوان ہوتا تھا اور نہ ہم ایک دوسرے کا نام لکھا کرتے تھے تاکہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو کسی کو معلوم نہ ہو کہ وہ خط ہے۔

ہم باری باری خط لکھا کرتے تھے۔ ایک روز وہ لکھ کر اینٹ تلے رکھ دیتی اور اگلے روز میں اس کا جواب لکھ کر وہیں چھپا دیتا جسے وہ رات کے وقت کھڑکی کھول کر اٹھا لیتی تھی۔ کیسے پیارے دن تھے۔ ان رنگا رنگ دنوں نے اس جھلی جھلی آنکھ نے اس نظر ریز آدمی اندھے

اور ان اشارات بھرے خطوط نے زندگی کے سادہ ورق کو سنہری بنا دیا تھا۔ یہ کیفیت صرف مینا کے خطوط کا نتیجہ نہ تھی۔ میرے لیے جذبات میرے لیے انوکھے اور نئے معلوم ہوتے جب میں اسے خط لکھتا تو میرے دل سے نئے نئے انوکھے خلوص بھرے جذبات ابھرتے اور میں ان کی سنجیدگی اور خلوص پر حیران ہوتا۔ ایسے جذبات جن کے وجود کا مجھے علم نہ تھا جو نہ جانے دل کی کن گہرائیوں سے ابھرتے تھے ان ہی جذبات کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں اس دور کے تعلق سے جو محض وقت کٹی اور تفریح کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بے نام سنجیدگی اور پاکیزگی پیدا ہوئی۔ نہ جانے کیا وجہ تھی۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ہم دونوں کے تمام تر افکار سنجیدہ ہو چکے تھے۔ جیسی نے تو کل ہی چپ سادھ رکھی تھی۔ اگرچہ وہ طبعی طور پر خاموش تھا اور اس کا بڑے سے بڑا اظہار بھی ایک خاموش مسکراہٹ یا ایک ہلکی سی مسکراہٹ تک محدود ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی سی ہونے لگتی تھی لیکن اب تو وہ بالکل ہی خاموش ہو چکا تھا۔

وہ صبح سویرے بیدار ہوتا اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی تمام فرضیات سے فارغ ہو کر بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپسی کے بعد وہ چپ چاپ میز پر بیٹھ کر مطالعے میں مصروف رہتا۔ علم نے اس کے لیے نئی مصروفیات پیدا کر لی تھیں اور زیادہ تر وقت اسی میں بسر کرتا تھا۔ خدا بخش حسب معمول یا تو صدر کی دوکان پر چلا جاتا اور یا بدھو سے باتیں کرنے میں مشغول رہتا اور اونچی اونچی آواز میں کرتے جھاڑتا اور کہتا میاں بدھو کچھ شرم کرو۔ اور بدھو کی پھوٹ پھوٹ سے کھل جاتی اور پھینٹوں کا فوارہ چلتا۔ جی ہاں جی بابو جی! لیکن بدھو خدا بخش کھجاتے ہوئے جواب دیتا۔ یہ تو پیڑ گننے کا بکھیڑا ہے اور ہم ٹھہرے آم چوسنے والے اور بدھو بے سوچے سمجھے ہنستا اور دور کی گڑیا چیختی اور میری نگاہوں میں سنہرے کلس پر چیلیں منڈلاتیں۔

پھر وہ منحوس دن طلوع ہوا۔

اس روز جب میں کالج سے واپس آ رہا تھا تو گلی میں مینا کے مکان کے صدر دروازے پر وہ بڑھیا برقعہ پہنے کھڑی چلا رہی تھی: لڑکی خدا خیال رکھنا پڑھیا کر باہر نہ جائیے دنیا میں شام تک لوٹ آؤں گی؟

بڑھیا کو باہر جاتے دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ مطلع صاف ہے اور بھاگ کر سیڑھیاں چڑھا اور سیڑھیوں کے دھندلکے میں کھڑا ہونے کے بجائے باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا جہاں کے مسراج روشن تھے اور مینا حسب معمول کرسی پر بیٹھی پیانو سے کھیل رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ حسب معمول گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور میں پہلی مرتبہ دیوی کو سیس نوانے کے لیے جھک گیا۔

کھٹ! عقبی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اور میں چونکا۔ جالیوں پر غفلت طاری تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں حیران کھڑا رہا پھر چپ چاپ نیچے چلا آیا۔

پھر بیٹھے بٹھائے دفعتاً مجھے خیال آیا۔ شاید بڑھیا کے علاوہ گھر میں کوئی بزرگ موجود ہو شاید کوئی مہمان آیا ہوا ہو جس کے سامنے نظر گرانا ہو۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہوئی۔ ایک کو تھے پر گیا۔ لیکن میرے سر پٹ سلانے کے باوجود جالیاں روشن نہ ہوئیں۔ اس روز میں نے ایک مرتبہ کوشش کی لیکن بے سود۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں سے اسے ایک خط لکھوں لیکن اس روز مینا کی باری تھی۔ اگلے روز مجھے اس کا خط ملا تھا۔

نہ جانے اگلی صبح میں نے دینا کا خط اینٹ تلے سے نکال کر مٹھی میں کیوں دبا لیا۔ مجھے ایک نامعلوم سا ڈر محسوس ہو رہا تھا ایک گھٹن سی تھی جو میری رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میں نے بند کمرے میں اسے کھولا۔ خیر از معمول صرف چند ایک فقرے لکھے ہوئے تھے۔

"آپ کا یہ کالا کلوٹا دوست کون ہے۔ خواہ مخواہ مجھے اشارے کر رہا ہے۔ کل اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟ اسے منع کر دیجئے۔"

میری نگاہوں تلے دھند سا چھا گیا اور دل ڈوب گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ کون کالا کلوٹا ہے وہ، سلام تو میں نے کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس گتھی کو سلجھانے کے لیے میں باہر نکل گیا اور دیر تک آوارہ پھرتا رہا۔ حتیٰ کہ میں خود اس میں الجھ کر کھو گیا۔

آہستہ آہستہ میرے معمول تقریب بگڑنے لگے۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ خلوص محبت کے جذبات سے دھڑکتے ہوئے خلوص نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر وہ کالا کلوٹا ——— وہ خوش نصیب گورا کون ہو سکتا ہے۔ کون ہو سکتا ہے وہ۔ کون۔ ضرور وہ کوئی بھٹکا ہوا ہوگا۔ ضرور۔

اس راز کو جاننے کے لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک دن چھپ کر کوٹھے پر بیٹھا رہوں۔ وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تو تھا ہی جو خالی پڑا تھا اور جہاں چھپ کر میں دونوں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔ پھر تین بجے کے قریب چپکے سے کوٹھے پر پہنچ کر میں اس کمرے میں جا بیٹھا۔ [illegible] آفتاب کا انتظار کرنے لگا۔ سات بجے کے قریب نیچے سے آوازیں سنائی دیں۔ کوئی جاگ چکا تھا۔ اور [illegible] گیا۔ کوٹھے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس مقام سے نظر بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ کہ دینا کے کمرے کا بھی دروازہ کھلا ہے اور جالی کے سوراخ روشن ہیں یا نہیں۔

پھر دبے پاؤں کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ سیڑھیوں میں ایک [illegible] سی شکل دکھائی دی۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔ میں کے باوجود [illegible] میں ٹک گیا۔ میں اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔ دیا سلائی کی روشنی میں جیل کی [illegible] مسکراہٹ واضح ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں وہی بے نیازی [illegible] تھی۔ پھر وہ کھڑا ہو کر مسکرانے لگا۔

ناگاہ میری نظر جالیوں کی طرف پڑی۔ ایک سوراخ سے [illegible] ابر نکل رہی تھی اور یوں لہرا رہی تھی جیسے پاس چلا رہی ہو۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیوں گردوپیش پر ایک دھند سا چھا گیا۔ چاروں طرف سے ایک عجیب سے [illegible] اور [illegible] کر دل میں غم کی ایک جھیل پھیلتی گئی۔

"میں ہی وہ کالا کلوٹا ہوں۔" یہ خیال آتے ہی کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ لیکن پھر وہ خط، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور آ بھی جاتا تو کیا ہوتا۔ اب تو زندگی ہی میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ چاروں طرف ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا جس میں نہ تو امید کی کرن تھی اور نہ آرزو کی حرکت۔

اس حالت میں لاہور رہنا بے کار تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند دنوں کے لیے گھر چلا جاؤں۔ لیکن جانے سے پہلے جیل سے

تمام واقعہ بیان کر دوں۔

جمیل سے مختصر طور پر تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد میں نے کہا: جمیل بیٹا تمہاری ہے میری نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ غلط فہمی کی وجہ سے میں نے اسے تم سے چھیننے کی کوشش کی۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے سامنے بیٹا کے تمام خطوط رکھ دیئے۔ جمیل حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بوڑھاپے نے کوئی اور ہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جیسے بندیں بجھی ہو گئی ہوں۔ اور ان کا تار تار ٹوٹتا جا رہا ہو اور ان میں دکھ کی جھلک پیدا ہو گئی ہو۔ دفعتہً ایک بوند اس کے گال پر آ گری اور اس نے منہ موڑ لیا اور میں وہ خطوط وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا اور موٹر کیس اٹھا کر اس کے اڈے کی طرف چل دیا۔

بس جا رہی تھی۔ ویرانے میں درخت سر جھکائے پیچھے سرکتے جا رہے تھے۔ زرد کھیتوں میں پودوں نے سر جھکا رکھے تھے خوشوں کی بڑی ہوئی انگلیاں اشارے کر رہی تھیں۔ جاؤ چلے جاؤ۔ دور۔ اور دور۔ آسمان پر ایک اداس دھند لکا چھایا ہوا تھا۔

گاؤں میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر پڑے پڑے میری نگاہ پتوں کی طرف منعطف ہو جاتی۔ سبز پتوں میں سوراخ سے روشن ہو جاتے، اوپی اللہ، دور کوئی پرندہ چہکتا۔ اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ اور اندر گھر میں جا کر کھانے سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگتا۔ دفعتہً باہر دادی اماں چلائی: لے بے دلکیو۔ ابھی ہنڈیا نہیں چڑھائی تم نے۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ بڑی گرما چیخ رہی ہے۔ پھر نگاہوں کے سامنے زمین دہنے ناچنے لگتے اور میں گھبرا کر باہر نکل آتا۔

ابھی گاؤں کے چاروں ہوئے تھے کہ ایک تار موصول ہوا۔ کھول کر دیکھا تو جمیل کا تار تھا۔ لکھا تھا: "فوراً آؤ ضروری ہے"

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جمیل کو مجھے بلانے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ وہ جائیدادوالا واقعہ تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔ اب کے بارے میں تو اب بات کرنا بھی بے کار تھا۔ وہ بات تو ہری نہ سکتی تھی۔ نہ جانے پھر کیا وجہ تھی۔ بہرحال میں نے سوچا جانا ضرور چاہیئے ورنہ جمیل کیا کہے گا۔ اور جمیل کا قصور بھی تو کوئی نہیں۔ اگر بیٹا جمیل سے محبت کرتی ہے تو اس میں جمیل کا کیا قصور۔

جب میں اڈے پر پہنچا۔ تو گھر میں بدھو کے سوا کوئی نہ تھا۔ بدھو نے میری طرف دیکھا اور وہ بھوت مکھی ہی ہی ہی ہا ہو ہی ہی کرنے لگے: "میں نے پوچھا: "بدھو گھر میں کوئی نہیں؟"

"جی ہاں جی کوئی بھی نہیں" وہ بولا۔

اتفاق سے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ دروازے میں جمیل کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ارے بدھو! جمیل صاحب آ رہے ہیں"

"جی ہاں" بدھو ہنسنے لگا: "جمیل صاحب یہیں ہیں"

"کیوں خیریت تو ہے؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جمیل سے پوچھا۔

"ہاں" جمیل نے کہا: "میں جا رہا ہوں" ساتھ ہی اس نے بدھو کو آواز دی: "بدھو جا کر تانگہ لے آؤ"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"امی نے بلایا ہے!"

"کب آؤ گے؟"

"معلوم نہیں۔ جب اماں اجازت دے گی۔" اور کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"آخر کیا بات ہے جس کے لیے مجھے بلایا ہے؟"

"بہت ضروری بات ہے۔" بے حد ضروری وہ مسکرانے لگا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ساون نہیں بھادوں کا سا عالم تھا۔

"بتاؤ نا؟" پھر میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ذرا ٹھہرو۔" وہ بولا۔ "ذرا چھا لیا تم آ گئے۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے معلوم تھا تم میری بات نہ ٹالو گے۔"

اس کی آواز عجیب سی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو۔ اور اس کی مسکراہٹ میں مجبوری کی واضح جھلک تھی۔

"تانگا آ گیا باجی۔" بدھو چلایا۔

جمیل نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"لیکن وہ بات؟" میں نے بے تابانہ پوچھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے چاروں طرف حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آ جاؤ۔"

تانگے میں بیٹھ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ یہ لو۔ اس میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اور پھر آخری بار مسکرانے کی شدید کوشش کی۔

تانگے کے روانہ ہونے کے بعد میں وہ کی طرف بھاگا۔ اور ایک کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی بند کر کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور جمیل کا وہ مختصر خط پڑھنے لگا۔

"مینا تمہاری ہے، میری نہیں۔ اسے تمہارے جذبات سے عشق ہے شکل و صورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ میں نے تمہارے جانے کے بعد صرف ایک خط اسے لکھا تھا۔ اس کا جواب ملفوف ہے پڑھ لو۔"

میں نے جلدی سے ملفوف خط نکالا۔ لکھا تھا۔

"آپ اس کالے کوئلے کو منع کیوں نہیں کرتے۔ یہ دیکھو آج اس نے مجھے خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ اس کی اتنی ہمت ایسا خط لکھتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی۔ جیسا اس کا رنگ ہے ویسے ہی اس کے خیالات ہیں۔ آپ اسے منع کر دیجئے ورنہ۔"

میں نے پھر سے جمیل کا خط پڑھنا شروع کیا۔

"مینا تمہاری ہے۔ میری نہیں۔ میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے ہمیشہ کے لیے۔ مینا کے سب وہ خطوط جو تم مجھے دے گئے تھے ملفوف ہیں۔ خدا حافظ۔"

"مینا میری ہے"۔ مجھے یقین نہ آتا تھا۔ وہ ایک کالے کلوٹے کی کیسے ہو سکتی ہے! نہیں، وہ میری نہیں۔ ان خیالات کے باوجود میں کرسی پر چڑھتا گیا۔ اور سیڑھیوں کے بالائی حصے کے اندھیرے میں چھپ کر کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ہائیں! مینا کو بیٹھے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ منہ سُتا ہوا، بال پریشان تھے اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی کے انتظار میں تباہ حال ہو۔

نہ جانے شدتِ شوق سے یا آزمانے کے لیے میں سیڑھیوں کے اندھیرے سے نکل کر باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ دفعتاً اس کے چہرے پر غصے اور نفرت کے آثار بجلی کی طرح چمکے اور وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

یہ دیکھ کر میں پھر سے سیڑھیوں کے اندھیرے میں جا کھڑا ہوا۔ اور سوچنے لگا۔ وہ میری نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ میرے اردگرد چھتوں، دیواروں اور مکانوں کا وہی ویرانہ پھیلنے لگا۔ وہی یاس وہی مردنی، کتنا بدنصیب تھا میں! میں نے ہنسی کھیل میں اپنی زندگی تباہ کر لی تھی۔ لیکن اس دنیا میں آخر کون ہے جو تباہ نہیں ہوا۔

جمیل، میں اور اور ــــ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ایک نیا خیال۔ میرے ذہن میں تصویر کا ایک نیا رُخ ابھرنے لگا۔ وہ یہ کہ ہم دونوں سے زیادہ تباہ حال مینا ہے۔ جسے ایک شخص کی شکل و صورت اور دوسرے کے جذبات سے محبت ہے اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں۔

میری نگاہ جال کی طرف منعطف ہو گئی۔ مینا پھر آ کر وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ جنتی دروازے کے پاس اسی طرح تباہ حال پریشان، مژگاں جھکی ہوئی نگاہیں، کھوئی ہوئی جیسے مینا خالی ہو چکی ہو۔ اسے دیکھ کر یہاں کیا کر رہی ہے؟ دفعتہً ربڑ کی گڑیا چیخنے لگی: نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے؟

"اوئی اللہ میں کیا کروں" سندر کا نا قوس یوں بجا جیسے وہ ٹوٹ چکا ہو۔

یہ حادثے

حجاب امتیاز علی

حادثے کا نام سن کر میرا ذہن ہمیشہ انسان کی ناتمام تمناؤں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشنہ تمنائیں دنیا میں حادثات بن کر رونما ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری خفیہ اور بالکل انجان طریقوں سے برسوں کرتا رہتا ہے۔ تب کہیں جا کر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔

اگر آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے تو ذیل کا واقعہ سنئے۔

یہ گزشتہ خزاؤں کا ذکر ہے جب میں ایک اعصابی مرض سے نئی نئی صحت یاب ہوئی تھی اور ہنگاموں سے دور آرام و سکون کی خاطر چند دنوں کے لیے بڑھے ڈاکٹر لگار کے پاس ٹھہرنیل کے چھلکیلے ساحلوں پر آئی ہوئی تھی۔

رات بھیانک اور شدید طوفانی تھی۔ سمندر میں سخت تلاطم آگیا تھا۔ موجیں اٹھ اٹھ کر آسمان کا منہ چوم رہی تھیں اور درخت مارے خوف کے جھک جھک کر مارگریٹ کے سینے سے چھٹ گئے تھے۔

میں افسردہ اور سہمی ہوئی سی تھی۔ ایک اعصابی تکیہ پانی میں گھول کر پی لی تھی اور اپنے سیاہی مائل گوگو میں لیے چپ چاپ آتش دان کے پاس بیٹھی ہوئی ہوا کی سسکیوں کو مجبوراً سن رہی تھی۔

ڈاکٹر لگار اپنی نسوار کی ڈبیا پر چٹکی بجاتے ہوئے حسب معمول مجھے بہلانے کے لیے اپنی طبی تجربات سے معمور زندگی کے واقعات سنا رہا تھا۔

موسم کے سلسلے میں میری افسردگی دیکھ کر کہنے لگا "بیٹی روحی باہر کے طوفان کو بھول جاؤ۔ تھوڑی دیر کی بات ہے، ابھی ختم ہو جائے گا۔ اتنا کہو میری رات نکل آئے گی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہر مریضوں کے حالات ——— بعض مریض ایسے ایسے مرض میں مبتلا تھا کہ جہاں بھی اسے کوئی خاتون نظر آتی اس کی ایک آنکھ خود بخود بند ہو جاتی تھی ———"

"نہیں ———!" میں نے حیران ہو کر کہا "اور دوسری آنکھ ڈاکٹر؟"

"وہ کھلی کی کھلی رہتی"

یہ سن کر میں زور سے ہنس پڑی۔

مگر یکلخت ڈاکٹر لگار کا چہرہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ وہ غور سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا "یہ کیا تھا روحی؟"

میں کنکار بولی "کچھ نہیں۔ سرِ شام ہی سے حواصلیں تیں تیں کرنے لگی تھیں۔ انھیں کی آواز ہو گی۔ طوفانِ نوح کی آمد آمد ہے ڈاکٹر!"
"مگر یہ حواصلوں کی آواز تو نہیں معلوم ہوتی" اس نے پھر کچھ سننے کی کوشش کی۔
"پھر کس کی آواز ہے؟" میں متوحش ہو کر پوچھنے لگی۔
دریچے اور دروازے بند تھے۔ باہر ساحل پر طوفانی ہوائیں خوفناک سیٹیاں بجا رہی تھیں اور پوری کائنات پر جہنم کی سی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔
ڈاکٹر کار دریچے کی طرف گیا۔ اس کے شیشوں میں سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا پھر بولا "کچھ نظر نہیں آتا۔"
میں نے اپنے سیاہی مائل بدن کو اپنے سے چمٹا لیا اور سراسیمہ ہو کر بولی "اُف ——— مجھے ماتھیولیا ہو جائے گا۔ عجیب رات ہے خیریت سے گزرتی معلوم نہیں ہوتی۔ آج سرِ شام ہی آسمان گہرے کاسنی رنگ کا ہو گیا تھا اور میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے گا۔"
"کس قسم کا؟" وہ آگ کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگا۔
میں سوچ کر بولی "کوئی منحوس سا واقعہ ——— مثلاً کوئی جہاز سمندر میں ڈوب جائے گا ——— یا روشنی کا مینار ہواؤں میں گھوم گھوم کر یکلخت پاش پاش ہو جائے گا۔ دنیا میں جتنے بھی خوفناک اور پُراسرار واقعات رونما ہوتے ہیں وہ برسات کی کالی طوفانی راتوں ہی میں ہوتے ہیں۔"
ڈاکٹر کار ہنس پڑا۔ ایک موٹا سا اطالوی سگار ہونٹوں میں دبا کر بولا "تم بڑی وہمی ہو رہی ہو۔"
میں نے کہا "ہزار ہماری تربیت سائنس، عقل اور منطق کی فضاؤں میں ہوئی ہے مگر انسان داخلی طور پر وہی ہے جو آج سے صدیوں پہلے زمانہ جاہلیت میں تھا۔ وہ فطرتاً وحشی اور طلسم پرست ذہنیت کا ہوتا ہے۔ اُف ——— یہ کیا ہے ڈاکٹر! انسانی چیخ؟"
"نہیں روحی۔ طوفان کا شور ہے۔ سنسان ساحلوں پر خزاں کی ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔"
"کاش ایسا ہی ہو۔" میں متفکر ہو کر بولی "کچھ دیر ہوئی مجھے بجلی کی تیز چمک میں یوں معلوم ہوا کہ دُور پل پر کچھ لوگ دہشت انگیز طریق پر اترتے چڑھتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ نہ جانے وہاں کیا حادثہ پیش آیا ہے!"
ڈاکٹر کار کہنے لگا "یہ ممکن ہے کہ نظر کا دھوکا ہو، دریچوں کے شیشوں پر شمعوں کا عکس رقص ہو، وحشی ہوائیں پیڑوں کو اکھیڑ رہی ہیں۔"
"ہاں ممکن ہے نظر کا دھوکا ہو، مگر ——— ہائیں ——— دور یہ ہجوم کا شور کیسا ہے ——— مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ آج کی رات خیریت سے نہیں گزرے گی! یہ چیخ و پکار تو قریب ہوتی جا رہی ہے ———"
اور یکلخت کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور ساتھ ہی لوگوں کے بولنے کرنے اور رونے کی مختلف آوازوں نے طوفانی رات کو اور بھی بھیانک بنا دیا۔
ڈاکٹر کار دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے کے کھلتے ہی باقی اور ہوا کے ایک زبردست تھپیڑے نے مجھے پیچھے کی طرف دھکیل

دیا اور جو کچھ میں نے وہاں دیکھا اسے سامنے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ طوفانی راتوں میں خوفناک آفات نازل ہوا کرتی ہیں۔

چار آدمی ایک لاش کو چارپائی پر ڈالے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان جو بظاہر ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اس کے چہرے پر گہری خراشیں اور کہیں کہیں خون کے داغ تھے۔

ڈاکٹر گار ان لوگوں سے کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد میری طرف آیا اور جلدی جلدی کہنے لگا "موٹر کا ایک حادثہ ہو گیا ہے روجی۔ موٹر پل پر سے وادی میں الٹ گئی تھی۔ ہاں بہت سخت حادثہ ہے۔ یہ لوگ فوری امداد کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ چارپائی کی طرف گیا اور جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

ساتھی نوجوان نے بے ساختگی سے پوچھا "زندہ ہے نا؟"

ڈاکٹر گار معائنہ ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ افسردہ لہجے میں بولا "دوست ہیں آپ کے؟"

"کیا ختم ہو گئے؟" وہ پھر چلایا۔

"ابھی نہیں" ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا "ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ فوری اپریشن کی ضرورت ہے۔ میں انھیں شہر کے ہسپتال میں لے جا رہا ہوں۔ شاید بچ جائیں۔"

"ڈاکٹر ——!" نوجوان نے التجا کی "آپ کو انھیں بچانا ہوگا۔ یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ اگر یہ ختم ہو گئے تو میں خودکشی کر لوں گا۔ مجھے ان سے بے پایاں محبت ہے —— ہائے میں نے اپنے بھائی کو مارا ہے۔ میں اس حادثے کا ذمہ دار ہوں۔ کار میں چلا رہا تھا۔ وہ مجھے منع کرتا رہا مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ ایسی طوفانی رات میں اس کے بارہا منع کرنے کے باوجود میں کار لے کر پل پر چڑھ گیا۔ بارش کی وجہ سے زمین پر کیچڑ ہو رہی تھی۔ وہ روکتا رہا۔ التجائیں کرتا رہا۔ منتیں کر کر کے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی مگر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ کار لے کر آگے کو بڑھتا ہی چلا گیا۔ دراصل میں اسے نصف شب تک منزل پر پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا اس لیے اس کا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ میرے ہاتھوں اس حادثے کا شکار ہو جائے گا۔"

اور یہ کہتے کہتے وہ یکلخت زمین پر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر گار نے اس کی ٹانگ کھول کر پھینک دی۔ اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا "وقت کم ہے۔ مجروح کو فوری اپریشن کی ضرورت ہے۔ یہ آدمی جلدی ہوش میں آ جائے گا۔ اسے تو محض ذہنی دھچکا لگا ہے۔ خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گیا۔ میں مجروح کو لے کر ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ اس کی زندگی کی امید کم ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر گار نے جلدی سے اپنا بارانی کوٹ پہنا اور لوگوں کی مدد سے مجروح کو کار میں ڈلوا کر رات کے اندھیرے اور طوفان کے مسلسل شور میں ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بیہوش مریض کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اپنے سیاہ و سیاہی مائل کو اونی شال میں لپیٹ کر اور اس کے سر پر کنٹوپ کس کر آتشدان کے پاس ایک مخملی نرم کرسی پر بٹھا دیا اور خود ڈاکٹر گار کی ہدایات کے مطابق مریض کے سرہانے بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اسے دوا پلاؤں۔

کچھ دیر بعد مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں ایک کرسی کے سہارے نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر اچانک کراہنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"میں نے اس کی جان لی ہے ——— میں نے اسے مارا ہے ——— میں گناہگار ہوں ۔ میں"

وہ پوری طرح ہوش میں نہ آیا تھا۔ اس کی زبان سے عجیب عجیب نامکمل فقرے نکل رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اسے بیہوش دیکھ کر مدفون جذبات اپنی پرانی قبروں سے سر باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کا چہرہ لاش کی طرح زرد اور اس کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔

میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا "دوا پی لو!"

میری آواز سن کر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا "مہرو؟" اور ناراضگی کے انداز میں سر پھیر لیا۔

میں نے ملائمت سے کہا "لو دوا پی لو"

وہ یکدم پھٹ پڑا "ہائے تمہیں اب تک مجھ سے محبت ہے مہرو! مجھ گناہگار سے! مجھے تنہا چھوڑ دو اور چلی جاؤ!"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں، پھر بولی "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مہرو نہیں ہوں۔ دوا پی لو"

"مہرو نہیں ہو تو اور کون ہو؟ میں تمہارے قابل نہیں پھر کیوں دوا پلا رہی ہو؟ دھوکا دیتی ہو مجھے!"

میں ذرا غصہ سے بولی "مجھے کیا معلوم کہ مہرو کون ہے؟ میں تو تم کو بھی نہیں جانتی۔ تم کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئے اور یہاں لائے گئے تھے۔ مہرو کون ہے؟"

"میری بھاوج ہے!"

"اور تمہیں اس سے دلچسپی ہے؟" میں نے دوا پلاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے بھی مجھ سے دلچسپی تھی" اب اسے ہوش آگیا تھا۔ بات کرتے کرتے رک گیا اور پوچھا "اور میرا بھائی؟ وہ کہاں ہے؟ کیا مر گیا؟"

میں نے کہا "اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فوری آپریشن کے لیے ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ فکر نہ کرو وہ بچ جائے گا۔"

اس نے گردن پھیر لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "نہیں ——— وہ نہیں بچے گا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"

"وہ ابھی زندہ ہے" میں نے اسے تسلی دی۔

"مگر کار پل پر سے الٹ گئی تھی اور وہ ایک کھڈ میں جا گرا تھا۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم نہیں چاہتے کہ وہ زندہ رہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر وہ مر گیا تو میں بھی خودکشی کر لوں گا۔ مجھے اپنے بھائی سے محبت ہے۔ میں تمام عمر اس سے محبت کرتا رہا مگر قسمت کو یہی منظور تھا کہ وہ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔"

"قسمت کو تو نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے تم کو یہی منظور ہے کہ وہ موت کے گھاٹ اترے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے مگر تم بے خیالی میں اس کے متعلق یوں باتیں کر رہے ہو جیسے وہ مر چکا ہے۔ میرے یقین دلانے کے باوجود کہ ابھی وہ زندہ ہے تمہیں اس کی زندگی کا یقین نہیں آتا۔ اس پر بھی تم اپنے بھائی کی محبت کے دعویدار ہو؟"

"کیا تمہیں میری محبت میں شبہ ہے؟" اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"میرا اس سے کیا تعلق؟" میں نے بے پروائی سے کہا "البتہ تمہیں اپنی محبت کے متعلق شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم اس کے متعلق یوں بات نہ کرتے کہ وہ مر چکا ہے۔"

وہ چونک سا پڑا۔ ذرا مدھم لہجے میں بولا "میں بھول گیا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔"

"انسانی حافظہ اپنے چاہنے والوں کے متعلق خوشگوار باتیں سوچنے کا عادی ہوتا ہے" میں نے دبی زبان سے کہا۔

اسے غصہ آ گیا "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا دشمن ہوں؟ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ آج کا واقعہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ میں بچ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ مجھے اپنے بھائی سے بڑی گہری محبت ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے! کسی کو کیا علم کہ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیسی کیسی عظیم قربانیاں کی ہیں اور کبھی اُف تک نہیں کی!"

"جس محبت میں قربانیاں ہوں اور اُف کرنے کی مہلت بھی نہ ملے، ایسی محبت پنپتی نہیں۔ کسی دن اچانک بادلے کٹنے کی طرح سر پڑھا کر اپنے محبوب کو کاٹ کھاتی ہے" میں نے افسردہ ہو کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں اب تک اس بات کا یقین نہیں آیا کہ مجھے اپنے بھائی سے گہری محبت ہے۔ پتھر کا بھی کلیجہ ہو تو پانی بن کر بہہ جائے۔ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ اپنی زندگی، اپنی روح، اپنا بچپن، اپنی جوانی حتیٰ کہ اپنے حسن و عشق کی کل کائنات اس پر قربان کر ڈالی۔ اور پھر بھی دنیا کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتا۔ خدا کے لیے میری داستان سنو اور انصاف کرو کہ میں نے اس سے کیا کیا اور اس نے مجھ سے کیا کیا؟ شاید اس کی اور میری زندگی کی شبِ تاریک کی سحر نہ ہو سکے اس لیے میں اپنی داستان بیان کر کے دل کا بوجھ ہی ہلکا کر لوں گا۔ اس کی جفاؤں اور میری وفاؤں کی داستان طویل ہے۔ اس کی محبت نے میری زبان کو بند اور میرے جذبات کو مفلوج کر دیا تھا اس لیے میں اس کی جفاؤں کا جواب نہ دے سکا۔

میں بولی "مگر میرا خیال ہے کہ محبت عمل اور زندگی کا نام ہے۔ موت کا نام نہیں۔ وہ کسی کو مفلوج کر دے تو پھر وہ محبت نہیں رہتی ——"

اور وہ کہے جا رہا تھا "میری داستان سنو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے کیا کچھ اس کی محبت میں برداشت کیا ہے۔ حد ہو گئی، ایک مرد سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی مسکرا کر بہا سکتا ہے۔ مگر اپنی محبوبہ کو اپنی آغوشِ تمنا سے زبردستی نوچ کر کسی قیمت پر بھی دوسرے مرد کی زینتِ آغوش نہیں بنا سکتا۔ مگر یہ کام میں نے کیا۔ اپنے بڑے بھائی کی محبت کی خاطر اپنی محبت کا گلا گھونٹنا بھی چاہتا تھا کہ اس کا اور اپنا گلا بھی ساتھ ہی گھونٹ لوں مگر نہیں وہ میرا بھائی تھا۔

وہ ہمیشہ سے میرا مدِ مقابل تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک زندگی کے ہر شعبے میں ایک نامعلوم طریق پر اس کا اور میرا مقابلہ ہوتا رہا۔ جیسے زندگی کے اکھاڑے میں دو پہلوان اُترے ہوں۔ ایک کمزور —— ایک طاقتور! مگر اس حلفیہ لڑائی کا ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی علم نہ ہونے پایا۔ وہ وجیہہ اور خوبصورت تھا، میں نحیف اور قبول صورت۔ وہ ذہین اور طنطنہ تھا، میں شرمیلا اور کم گو۔ اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ میرا دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا سوائے میری ماں کے اور وہ بھی اکثر موقعوں پر اپنے بڑے بیٹے ہی کو مجھ پر ترجیح دینے لگ جاتی تھی۔ وہ کھیلوں اور ورزشی نمائشوں میں پیش پیش رہتا تھا، میں خلوت پسند اور مطالعہ کتب کا شوقین تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کردار محفلوں کی جان ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ دوستوں کی آنکھ کا تارا اور رشتہ داروں کا پیارا تھا۔ کئی

دفعہ مجھے حسد پیدا ہوا مگر پھر محبت نے مجھ پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ کئی دفعہ مجھے اس پر غصہ آیا مگر میں نے ضبط کر لیا۔ آخر وہ میرا بھائی ہے، کوئی غیر نہیں۔

یہ تو خیر اوائل عمر اور لڑکپن کا زمانہ تھا۔ پھر جب جوانی کی پُرشور گھٹا ٹوپ بن کر اٹھی اور حسن و عشق کے ساون بھادوں برسانے لگی تو وہ پھر نئے انداز سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

کالج میں تیراکی کا مقابلہ تھا۔ میرے ہزار انکار کرنے پر بھی دوستوں نے اور خود اس نے نہ مانا۔ میرا اور اس کا مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہار ہمیشہ میری ہی قسمت میں تھی چنانچہ میں ہار گیا۔ اور سخت دل شکستہ ہو گیا۔ میرا بھائی مجھے منانے اور تسلی دلاسے دینے لگا۔ باتوں باتوں میں اور مذاق مذاق میں اس نے مجھے پانی میں دھکا دے دیا۔ اتفاق کی بات کہ میں پانی میں سنبھل کر تیر نہ سکا اور غوطے کھانے لگا۔ پانی پھیپھڑوں میں پہنچ گیا اور مجھے نمونیہ ہو گیا۔

تین مہینے میں ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار پڑا رہا۔

اس بیماری کے دوران میں مجھے یوں شبہ ہونے لگا کہ شاید میری زندگی کی شب تاریک میں ایک نورانی سحر جھلملا رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ ایک خوبصورت نرس میری خدمت کے لیے مقرر ہوئی۔ جب وہ دوا پلانے کے لیے مجھ پر جھکتی تو مجھے شبہ ہوتا کہ اس کی آنکھیں محبت کے نور سے جگمگا رہی ہیں۔ بعض وقت مجھے یقین نہ آتا۔ اسے میں واہمہ سمجھتا۔ اپنے دل کو سمجھاتا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔ مگر ایک رات تیز بخار غنودگی میں کر میرے ہوش و حواس پر چھا رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی جھک کر میرے بالوں کو چوم رہی ہے۔ میری سرد اور تاریک زندگی میں تپش محبت کی اس پہلی کرن نے ہلکی ہلکی چاندنی کر دی۔

جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے دوسرے مریضوں سے بھی یہی سنا کہ مہرو نے بڑی جانفشانی سے میری تیمارداری کی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کی محبت کا یقین آ گیا۔ مگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کی محبت کو سمجھ گئے ہیں۔

میں گھنٹوں بستر پر لیٹا ہوا تخلیے بنایا کرتا کہ جونہی طبیعت سنبھلے گی میں مہرو سے اظہار محبت کروں گا۔ کئی دفعہ کوشش کی آج اظہار تمنا کر ہی دوں مگر عین وقت پر نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا تھا کہ شدت جذبات سے زبان گنگ ہو کر رہ جاتی تھی۔ میں داخلی المزاج انسان تھا ——؟

"جس کی محبت اور نفرت دونوں داخلی ہوتی ہیں ——" بڑی دیر کے بعد میں نے کچھ کہا پھر اس کی داستان سننے لگی۔

اس نے میرا فقرہ سنا نہیں، ایک روانی کے عالم میں کہتا رہا "کئی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مہرو اس بات کی منتظر ہے کہ جو آگ دل میں سلگ رہی ہے اس کے شعلے زبان تک نہ پہنچیں۔ ہم ایک دوسرے کی محبت سے واقف ہو جائیں۔ ابھی میں اظہار تمنا کا موقع ڈھونڈھ ہی رہا تھا کہ ایک شام میرا بھائی مجھے دیکھنے آ گیا۔ مہرو جب تک کمرے میں رہی، خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ باہر چلی گئی تو اس نے آہستہ سے کہا "کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ شدت سے میں جس قسم کے حسن کا تصور کرتا رہا ہوں یہ اس کی ہو بہو تصویر ہے۔ افسردہ افسردہ نظریں معصوم سی ادائیں اور باوقار چال!"

میں نے باتوں باتوں میں اس ذکر کو ٹال دیا مگر وہ دوسرے دن پھر آ موجود ہوا اور کہنے لگا "تم نے کبھی اسے نظر بھر کر دیکھا ہے؟ اس میں ایک خاموش سا جادو بھرا ہوا ہے۔ اگر والدین اعتراض نہ کریں تو میں اس سے شادی کر لوں!"

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے! میری زبان بند ہو گئی۔ میری نظریں جھک گئیں۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ تمام رات کروٹیں لیتا اور آہیں بھرتا رہا۔ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اپنے بھائی کو کوستا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے منزل پر پہنچنے کی تیاریاں بھی کرنے لگا اور میں ابھی تک گم کردہ راہی تھا۔

چند ہی دنوں میں مجھے مہرو کے انداز میں نمایاں فرق کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ راتوں کے سناٹے میں میرے سرہانے بیٹھ کر فضاؤں کو معطر اور رنگین نہیں بنایا کرتی تھی۔ اس کے اس رویے نے میرا دل توڑ دیا۔ میں تنہائی میں پہروں لیٹا روتا رہتا تھا۔ کبھی مہرو کو بے وفا سمجھتا۔ کبھی مجھے بھائی پر غصہ آتا۔ کبھی اپنے آپ پر جھنجلا اٹھتا۔

دنوں اور ہفتوں کے بعد مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ خطا میری اپنی تھی۔ اگر میں مہرو سے اظہار تمنا نہ کر دیتا اور اسے پس پشت نہ ڈالتا تو آج یہ حادثہ میری قسمت میں نہ لکھا ہوتا۔ میرا بھائی بے قصور تھا۔ اسے میری محبت کا علم نہ تھا۔ یہ خطا میری تھی۔

پھر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ اب تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میں نے اپنے بھائی کی محبت میں اپنے پر کیسے کیسے ظلم روا رکھے مگر مجھے کبھی اس پر غصہ آنا تو درکنار اس سے شکایت تک پیدا نہیں ہوئی۔" پھر یکلخت وہ چونک پڑا ——— "ہاں مجھے یاد آیا اس ساری طویل زندگی میں صرف ایک موقع ایسا آیا کہ جب مجھے اس پر شدید غصہ آیا مگر وہ بھی لمحہ بھر کے لیے" وہ چپ ہو گیا۔

"وہ کونسا موقع تھا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ مدھم اور افسردہ لہجے میں بولا "بچپن کا زمانہ تھا۔ میں بمشکل پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ وہ اور میں باغ کی اونچی دیوار پر چڑھے ہوئے انگور توڑ رہے تھے۔ جب کبھی میں انگور کا کوئی گچھا توڑتا وہ شوخی سے چھین کر کھا جاتا۔ جب کھا کھا کر تھک گیا تو دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ مجھے نہیں ستائے گا۔ چنانچہ میں نے انگوروں کا ایک بہت بڑا گچھا اپنے لیے توڑا۔ مگر وہ لپک کر میرے پاس پہنچا اور اسے میرے ہاتھ سے چھین کر نیچے وادی میں پھینک دیا اور قہقہے لگانے لگا۔ اس کی اس حرکت پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ میرا سانس پھول گیا۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ اسے بھی اٹھا کر انگوروں کے پاس نیچے پھینک دوں۔ ایک جنون کی سی کیفیت میں میرے ہاتھ اس کے کندھے پر پہنچ گئے اور ایک تشنج کی سی حالت میں میرے پنجے اس کو تاڑنے لگے۔ پھر یکلخت مجھے خیال آیا کہ اگر میں اسے نیچے گرا دوں گا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ——— چکنا چور ہو جائے گی اور وہ ختم ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل میں اپنے بھائی کے لیے رحم و محبت کا ایک دریا ابلنے لگا اور میں اسے دھکا دے کر نیچے گرانے کی بجائے اس سے چمٹ گیا۔ اس بات کو آج بیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔" وہ اپنی داستان ختم کر چکا تھا۔

میں چونک پڑی اور بولی "اور آج بیس سال بعد یہ حادثہ تم سے سرزد ہوا ہے!"

حادثے کا نام سن کر میرا ذہن ہمیشہ انسان کی ناتمام تمناؤں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشنہ تمنائیں دنیا میں حادثات بن کر رونما ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری خفیہ اور بالکل انجانے طریقوں سے برسوں کرتا رہتا ہے۔ تب کہیں جا کر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔ انھیں حادثے نہ سمجھیے۔ یہ ہماری اپنی ڈھکی چھپی تمنائیں ہیں۔

لندن لیٹر

قرۃ العین حیدر

دیباچہ :- معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی وہ قسم ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زنانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ عزیزہ سعیدہ بانو سلمہا اپنی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ آپا بیگم میں خیریت سے ہوں۔ بمبئی سے دلہن بھابی نے جو آم کا اچار میرے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہاں ہندوستانی طعام خانوں میں مرچ اور مسالہ بہت مہنگا ملتا ہے۔ ایک شلنگ کی ایک پڑیا دھنیے کی بھیج دیجئے۔ گرم پانی کے پائپ کے ذریعے میرا کمرہ گرم رہتا ہے (پھر کچھ لینڈ لیڈی کا ذکر خیر ہوتا تھا) یہاں آپا جانی زمین دوز ریل چلتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مفصل بیان) میں نے کل یہاں پلاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا (ہندوستانی اور انگریزی کھانوں کا موازنہ اور آپا بیگم کے لیے انگریزی کھانوں کی چند آسان ترکیبیں) آپ کا کام اب کیسا ہے۔ اگلے خط میں میں برائٹن اور بلیک پول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دور افتادہ بہن "سعیدہ"

جب پیاری سعیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دور نزدیک سے رشتے دار عزیز دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں۔ اور اپنی باقی عمر وہ وطن کے کسی گمنام مدرسے میں ہیڈ مسٹریس یا پھر اسکول انسپکٹریس بن کر گزار دیتی تھیں۔ اور قصہ ختم ہو جاتا تھا۔

حضرات! اب میں لندن لیٹر کی دوسری اقسام کا بیان عرض کروں گی۔ ایک آقا اشرف کا "بی بی سی" سے آدب عرض "تھا کہ کس طرح انگریز ناشی بلیاری کا بھاری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور فتح انشاء اللہ اتحادیوں کی ہوگی۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد سے جو لندن لیٹر المسٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں چھپتا ہے وہ اس طرح ہوتا ہے۔ کل پارس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ایٹی کشنر سے میں ملا ——— اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں آج کل کنیا خوب پھول رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹا کم کر دیا ہے۔ آئندہ اگلے ہفتے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جب کہ "تماشائی" اور "آئینے" کا نامہ نگار خصوصی حسین و جمیل رسالوں کے کالموں میں یوں رقمطراز ہوتا ہے "پچھلے اتوار کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گارڈن پارٹی میں اس حسین نیلی ساری میں ملبوس دیکھا جو انھوں نے مجھے بتایا کہ جینوا میں خریدی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے جنھیں میں نے بریگیڈیر فلاں کی دلکش بیوی کو ایک لطیفہ سناتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل ایسکٹ میں بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برسلز کی ایک گمنام دوکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمرہ دستیاب ہو گیا۔ مس فلاں جو مہاراجہ صاحب فلاں نگر کی بے حد خوش پوش صاحبزادی ہیں۔ کمانڈر صاحب کے اس کیمرہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کر

رہی تھیں۔ ان کو بھی فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے۔ اس مرتبہ SCOT ہیں ——— وغیرہ وغیرہ وغیرہ
اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر مہینے یہی گوسپ ہوتی ہے۔ یہی خبریں ایسی لوگ۔
ان بین الاقوامی طیارہ گاہوں، ان کلبوں اور ریس کورسوں کی رونق دیکھئے۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ روز ادھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ بغداد، بیروت، استانبول، روم، پیرس، جینوا، نیویارک کیا گھما گھمی ہے۔ کیا کانفرنسیں اور گورنمنٹ پارٹیاں ہیں۔ اللہ اکبر۔
آئیے۔ کیوں نہ "لندن لیٹر" کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔
ملاحظہ فرمائیے۔ ہارون الرشید کا عراق جہاں چاروں طرف بیکراں ریگستان ہیں اور جھلسی ہوئی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دور سے نظر آجاتی ہے یا کوئی بدو خچر پر بیٹھا سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ یا کبھی ٹھٹھک کر آسمان کو دیکھ لیتا ہے جس پر اڑن طشتریاں پرواز کر رہے ہیں۔ کیا وقت آن لگا ہے! کیا کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کے نگڑ دادا دادوں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحر ظلمات میں کیا سرپٹ گھوڑے دوڑائے تھے!! مشرق وسطیٰ کے شہروں میں اب آپ کو صرف اطلانٹک پار کے رہنے والے گھومتے نظر آئیں گے۔ بدو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔
اس ریستوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع موجود ہے۔ دیواروں پر کوکا کولا کے اشتہار لگے ہیں۔ ایک آدھ عراقی ماڈیل اونچی ایڑیوں کی سینڈل پہنے سرعت سے گیدی میں سے نکل جاتی ہے۔ کس قدر گرمی ہے۔ اطلانٹک پار والے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے ہیں۔ یہاں نے اعلیٰ یہاں عربوں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچی مٹی کی بستیوں میں جا کر دوائیں تقسیم کرتے ہیں اور اپنے کیمروں سے تصویریں اتارتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے مشرق وسطیٰ کی زمین نے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے۔ جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت جیپ پر جا رہا ہے۔ جس کے نیچے نیچے عرب بدو کا اونٹ بھی ہے (تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا رومانٹک پس منظر ہے) اس کے نگڑ دادا اور چرڈ شیرول کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی ہو جاتے تو انھیں کا ہے کو یہ برے دن دیکھنے پڑتے۔ اب بہرحال یہ انڈیو یلیڈ ممالک ہیں اور یہ مالکیر ہمدردی اور بھائی چارے کا زمانہ ہے۔
اور اس ایئر جنسی پیریڈ میں تثلیث اور توحید گویا خدا کے سارے ماننے والے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔
توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے جس میں مودی ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں۔ (مصری فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے ماڈیل اسم ریتاں اور شرتے دشرتے میں ذرا بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور ماڈیل اسم ریتاں۔ بلکہ ان کے ساتھ خود ہماری اپنی نرگس اور ثریا اور مدھو بالا اپنے اسٹرم لائن ڈ آف دی شولڈر شام کے لباس میں سب ایک لائن اور گارڈز کے ساتھ فخر سے سر اونچا کر کے کھڑی ہو سکتی ہیں) بہرکیف، تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ میرے رسولؐ اور میرے امامؑ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل و صورت کے رہے ہوں گے۔ یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امام مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا۔ میرے اوپر کافی جذباتیت کی موڈ طاری ہو رہی ہے۔ عرب نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا ہے۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی ——— کوکا کولا پیو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی۔
وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ آرکسٹرا نے ریٹرز بجانے شروع کر دیئے ہیں (!) عرب بڑے سے مشہدی رومال سے اپنی پیشانی

صاف کر رہا ہے۔ میرے پیارے بڑے عرب۔ تم جو ایک پوری تاریخ کے، ایک بہت بڑے عظیم تمدن اور روایت کے بہت پیارے نمائندے ہو اور تمہارے ہاتھوں میں یہ مرد پرکار رسالہ ہے اور تمہاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں۔ تمہارے پرکھوں نے تو مولا علیؓ اور جناب عباسؓ اور جعفر طیار کا ساتھ دیا ہوگا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمہارے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کوکو کولا کا گلاس ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو۔ میرے بھائی! میرے پیارے ساربان ——— !!

یہ بیروت ہے۔ یہ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور مثل، کیا شاندار ترک ہے۔ پڑھا اور اور تند اور سانولا ترک سب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔ وہ کوریا سے لوٹ رہا ہے اور وہ بھی یو۔ این کا ایک اہم رکن ہے۔ کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا ——— اس نے ترک بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اُسے سنایا جو میرے ابا کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے اس کے گوش گذار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چاہے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا۔ وہ اطمینان سے صرف یو۔ این۔ او میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور جس نے اس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی نعمت کی خاطر کوریا بھیج رہی ہوں۔ کامران لوٹنا ——— !! بیٹوں کو لڑائیوں پر بھیجنا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوبی اور عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے اس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

ادھر دو برطانوی بیٹھے ہیں۔ ہم خلاں خداں کو سبق سکھا دیں گے۔ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں۔ تذکرہ غالباً تیل کا ہے۔

سڑک پر جنگلے کے سہارے ایک بہت کم سن پنجابی ہندو کا لڑکا کھڑا ہے۔ جانے وہ یہاں کدھر سے آ نکلا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اُردو بھی صحیح نہیں بول سکتا۔ میں نے ساڑھے چار سال کے طویل عرصے کے بعد ڈپو میک کور کے افراد کے علاوہ پہلی بار آج ایک عام ہندو کو دیکھا ہے۔ حق ہمسائیگی ادا کرنے کے لیے میں اس سے بات کرتی ہوں۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی بولتا ہے جو میرے پلے نہیں پڑتی۔ مجھے بے حد تعجب ہوتا ہے جب میں کوشش کر کے زندگی میں پہلی دفعہ پنجابی میں باتیں کرتی ہوں ——— قومی یا ملکی یگانگت کا عجیب و غریب احساس!! ترک اور انگریز اور فرانسیسی دور، جنگلے کی دوسری طرف کھڑے رہ گئے ہیں۔

سبز پہاڑیوں کی ڈھلوان پر پھیلا ہوا اور سمندر کے کنارے کنارے بکھرا ہوا بیروت دھوپ میں جگمگا رہا ہے۔ سمندر، نیلا میدانی تیرتا نیلے میدانی تیرتا اور لبنان، خدا تم دونوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے!! لبنان ——— !! خلیل جبران کے ملک، تم بہت پیارے ملک ہو۔ یہ سب بہت پیارے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو خلیل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کھیتوں تک ڈھلوانوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی سڑک پر سے ٹہلتا میری سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ میری ساری کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ دھوپ میں ان کے سنہری اور چاکلیٹ بال جھلملا رہے ہیں۔ خوبصورت چہروں والی کھیتوں تک لڑکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ تذکرہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فرنچ بول لیتی ہو؟ میں ان سے پوچھتی ہوں۔

فرنچ ویری گڈ۔ انگلیش نو ——— پھر وہ خاموشی سے کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ ان کی راہبہ جو خود بہت کم عمر اور خوبصورت ہے،

سکون سے مسکراتی ہے۔

یہاں دور دور انجیر اور زیتون کے درخت ہیں جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی کھنڈک خاموشی چھپی ہوئی ہیں۔ جن کی سمت جانے والے سایہ دار خوابیدہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی پکارڈ یا جیپ تیزی سے اس ابدی سکون کو منتشر کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

پھر سائپرس ہے۔ سلاتر کی پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں، چٹیل میدان، گیہوں کے کھیت، قہوہ خانے، بحیرہ اسود، باسفورس، استانبول، پریوں کا شہر، روشنیوں، خوشبوؤں، رنگوں کا دارالسلطنت۔ کوئی چیز نئی نہیں، وہی گلیاں ہیں، وہی مسجدیں اور چل اور بازار۔ جب میں بہت پہلے میں ان جگہوں پر آئی تھی اس وقت کی یادوں کو کوشش سے اکٹھا کر کے میں نے اس زمانے سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں ——!!

اجی قبلہ بہت فرق ہے۔ طیارہ گاہیں اور بن گئی ہیں۔ فوجی چھاؤنیاں ٹریکٹرز تک کھیتوں کی زمانی کے لیے منگوائے جا رہے ہیں مذہب کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔

نامق کمال کا ترکی۔ اتاترک کا ترکی

میرے پیارے بابا، سجاد حیدر یلدرم کا ترکی۔

اور اب باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں ابا صوفیہ کے مینار نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں ناچتے ناچتے ٹھٹک گئی ہیں۔

اور اس شفق کے دھندلکے میں مارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

البیس — جرمنی۔

المانیہ! آہ المانیہ!! (واہ المانیہ!!!)

بون — کولون — فرینک فرٹ۔

ان ناموں میں کتنا سحر ہے! اے معزز نالائق۔ لوبے کا جگمگاتا شہر فرینک فرٹ۔

فرالین کیا چاہیے ——؟ ایک ویٹر جھک کر پوچھتا ہے۔

فرالین کے پیارے بھائی فرٹز۔ تم تو ہٹلر یوتھ میں تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہیے۔ بڑا کنفیوژن ہے بھائی بڑا کنفیوژن ہے۔

مجھے یہاں سے آگے جانے دو۔

بلجیم۔ کیا خوبصورتی ہے، کیا نفاست ہے، برسلز۔ برسلز۔ گرجاؤں میں شام کی عبادت کے لیے گھنٹے بج رہے ہیں۔ ان کی گونج شمال کے کہر آلود سمندروں پر پھیلتی جا رہی ہے۔

حضرات میرے پاس وہ کیمرہ نہیں ہے جو کہ میں نے برسٹل میں خریدا ہوتا تو کمانڈر خاں کے ساتھ میں اس کے متعلق تبادلہ خیالات کرتی۔ اول تو مجھے فوٹو گرافی اچھی طرح سے نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اتارتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں۔ کیونکہ میرے پاس وہ ٹورسٹ دوربین نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہٰذا ناظرین، اب میں باہم سجاوٹ، لندن لیٹر بے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔ دیباچہ ختم ہوا۔

۷۸۶

حضرات! اس بوش بابا، دیو زاد پری پیکر عروس البلاد سے ہمارا کتنا صدیوں کا پرانا قلبی و روحانی تعلق ہے۔ وہی آنریبل جان کمپنی کا خیال کیجیے کہ جب مسٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگالے کے لیے یہاں لنگر اٹھاتے تھے۔ یا جب اوکسفرڈ اور کیمبرج کے ہونہار فرزندوں کو سراج الدولہ اور شجاع الدولہ کے پاس ذرا کام سے بھیجا جاتا تھا۔ کیا کیا معرکے ہوئے ہیں، کیا کیا تو پیں دغی ہیں۔ اللہ اکبر چپے چپے سے یہاں کے کیسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ رڈیارڈ کپلنگ اور رلسٹن چرچل کے اوراق ان گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگا لیجیے کہ پچھلے اسی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لیے آتے رہے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر انھوں نے شعلہ بار تقریریں کی ہیں۔ لندن مجلس اور قہوہ خانوں اور اپلک مینٹ میں بیٹھ کر آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ وائٹ ہال کے دروازوں پر پہنچ کر جدوجہد کی ہے۔ ہمارے نیتاؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکر لی ہے اور اب خداوند تعالیٰ کی عنایت دیکھیے کہ ہاں کہ ہم آزاد ہوئے۔ سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ٹرامیٹی۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے کاندھوں سے گویا ایک بار اتر گیا۔ اب ہم یہاں ایک ہلکے پھلکے ضمیر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیتا اب لڑائی لڑنے کے لیے نہیں بلکہ کنگھم پیلس کی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ لیڈی ہمارے کالے رنگ پر اعتراض کرتی ہے تو ہم مطلق اس کا نوٹس نہیں لیتے بلکہ جی بھر کے اس کے کمروں کو گندہ کرتے ہیں، اس کے وال پیپر پر سیاہی کے چھینٹے گراتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اس کے چمچوں سے اکثر نظر بچا کر انگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔

یہ سب اس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ بھلا ہم میں اور مثلاً ——— مثلاً ——— کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار کلمہ گو رہتا ہے۔ کئی مسجدیں ہیں۔ ایک آدھ فرزند کلیسا بھی گھر سے بھاگ کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے ملاح ہیں جو مختلف بندرگاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدور ہیں جو شمال کے سارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔ صرف شہر لندن میں تو سے ہندوستانی اور پاکستانی ریستوران ہیں۔ ہمارے کئی گنت لڑکے اور لڑکیاں یہاں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ پھر ہماری بیگمات ہیں، جب کوئی خاتون زرتار "غرارہ" پہنے سڑک پر سے گزر جاتی ہیں تو واللہ دیکھنے والوں کی طبیعت گلیڈ ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا نا ——— بڑی گھاگھی ہے۔

ہندوستان والوں کا بھی یہی احوال ہے۔ انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں جہاں ہمارے نادر قلمی نسخے، مغل تصویریں اور سارے تہذیبی خزانے محفوظ ہیں، جس کی دیواروں پر سے میرے گورو اہل ہم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ مہارانی جھانسی کی جانشین، نئے بھارت کی سرمنگ بالائیں اپنے دیش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ بلکہ جینتی منائی جاتی ہے۔

جی ہاں۔ یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

سویز کے اُدھر رہنے والوں کی اس نئی دنیا کی جھلک جب انگریز اپنے ملک میں دیکھتا ہے تو اسے بڑا اچنبھا ہوتا ہے۔ ساری دنیا اور ہندوستانی آرٹ کی تعریف کرتے کرتے اب اس کا حلق خشک ہو چلا ہے (میرے پاکستانی پڑھنے والے مجھے معاف فرمائیں جب میں اس ضمن میں 'ہندوستانی آرٹ' کا ذکر کروں گی۔ کیونکہ جب یہ لوگ لفظ پاکستان سے ہی زیادہ واقف نہیں تو پاکستانی آرٹ وغیرہ کا تذکرہ تو بہت دور کی بات ہے) ہندوستانی رقاصوں کے ایک ڈانس پروگرام سے اس ملک کی جنتا پبلسٹی یہاں ایک شام میں ہو جاتی ہے۔ اس کا تدارک یا مقابلہ ہمارے ایک ہزار پمفلٹ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم کتنا ہی ان کے اپنے ریفیوجی پروبلم، اپنے کشمیر کے کیس، اور اپنی ترقی کی اسکیموں کے متعلق بتائیں لیکن پڑھے لکھے طبقے کے ایک مخصوص حصے کے علاوہ ایک عام برطانوی مرد یا عورت کو یہ جاننے کی مطلق خواہش یا پروا نہیں کہ ہمارا اسکتھر ہراج کیا شے ہے۔ یا ہم کتنی چوٹ بلز قائم کرنے والے ہیں۔ جبکہ شیریں و جیغدار کے پیلے یا تمی اور دلیپ کمار کی فلم 'آن' کو دیکھنے کے لیے لندن کا ایک عام شہری گھنٹوں لطیر اسکوائر میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کیو لگائے صبر و اشتیاق سے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن بہرحال، یہ بالکل ایک دوسری بحث ہے۔

لندن کی کلچرل زندگی میں آرٹ کی نمائشوں تھیٹر، اوپرا، بیلے اور کونسرٹس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی رقص کے مظاہرے بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اب غالباً 'آن' کی کامیابی کے بعد سے ہندوستانی فلموں کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی تمی جو پچھلے دنوں یہاں آئی ہوئی تھی۔ اسے یہاں کے پریس نے کافی پبلسٹی دی اور برطانوی اور امریکی پروڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

تمی کے ذکر پر خیال آیا کہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کروں۔

'آن' انتہائی بکواس فلم ہے جس میں تازہ ترین ماڈل کی کیڈی ڈیک کاریں اور تلواریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ماڈیل لڑتے جاتے ہیں اور ان سب لغویات کا اعلیٰ پیمانے پر تکنیکی کلر مظاہرہ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں صرف 'چوتی والوں' کو بہت پسند آ سکتا ہے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے چوتی والے طبقے کی انتہا ہی ساری دنیا میں تقریباً ایک سی ہے۔ ہالی وڈ کی اتنی فحشی تصویریں اسی حالگیر طبقے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ 'آن' کے مقابلے میں "ہم لوگ" یا "دھرتی کے لال" یہاں ایک روز بھی نہ چل پاتی۔ ہندوستان کے متعلق جو تصور یہاں پر صدیوں سے موجود ہے، یعنی مہاراجہ کے ہاتھی گھوڑے اور تلواروں کی ڈھالیاں اور سونے کے محلات وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم میں بخیر و خوبی پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا انائیٹس برج میں کام کرنے والی ٹائپسٹ لڑکی اور سٹی آف لندن کا بنک کلرک خوش خوش گھر لوٹتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے گھیر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ گھر سے یہاں کے ایک بہت بڑے

انگلینڈ میں اور بڑے مشہور فلم کریٹک نے کہا کہ عالمگیر نمائش کے لیے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائریکٹر محبوب کو اطالوی فلم "سائیکل کا چور" دکھنی چاہیے تھی یا اور چار نفیس فلمیں۔ میں نے عرض کی کہ پہلے والی وڈ کے ان سارے ڈائریکٹروں کو بھی "سائیکل کا چور" دکھلائیے جو "تمسہ" اور "عشق کا چور" اور "سلیو گرل" اور "بغداد" جیسی تصویریں بناتے رہے ہیں۔ یا جن حضرات نے "بکم" تیار کی ہے۔ محض مسٹر محبوب کی ذہنی تربیت کے آپ کیوں اتنے خواہاں ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا کھاس ان کا پریس ہے۔ SENSATIONALISM ان کی مرغوب ذہنی غذا ہے صرف بہت زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ٹائمز یا مانچسٹر گارڈین یا نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن پڑھتا ہے۔ اکثریت کے لیے وہ اخبار نکلتے ہیں جن میں قتل، مار پیٹ، اغوا، ڈکیتی اور اسکینڈلز کا ذکر ہوتا ہے۔ ارسطو کیسی اب یہاں آخری سانس لے رہی ہے لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر بے حد اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ فلاں کے بیٹے آنریبل فلاں نے کل رات نے فیئر میں اپنی پارٹی میں شمپین کی اتنی بوتلیں پیرس سے منگوائیں اور اسپین کی خانہ جنگی دنگا فسادوں کو بذریعہ ہوائی جہاز چھ گھنٹے کے لیے میڈرڈ سے بلوایا۔ پارٹی صبح کے پانچ بجے تک جاری رہی۔ یا یہ کہ کاؤنٹس فلاں اتنے ہیٹ کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو سیاست کی بعض بعض تفصیلات سے جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خود یہ طبقہ گھوڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ اور فٹ بال، ٹینس اور کرکٹ کا اس قدر شیدائی ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورت حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈھیلی ان کے لیے بہرحال چین سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔

تحریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک حد تک ضرور موجود ہے۔ پچھلے دنوں یہاں ایک روسی فلم "زوال برلن" دکھلایا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے۔ برطانیہ ایک آزاد ملک ہے، اور ہم اس کے باشندے۔ اس چیز میں یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اور اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں۔ اور روسیوں کو فتح ان کی بے مثال بہادری کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوئی تھی لیکن بہرحال یہ ایک بہت عظیم فلم ہے ——— وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تعارف کے ساتھ امریکہ میں قطعی نہ دکھلایا جا سکے گا۔

آزادی تقریر کا دوسرا مشہور و معروف مرکز ہائیڈ پارک ہے جہاں گھڑی کے ڈبوں پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کے سیاستدان، ایڈیٹرز، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کمیونسٹ پارٹی کا پوسٹر لگائے جرمنی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے۔ ان سے دو قدم ہٹ کر ڈیمی آف کنٹربری کے خلاف چلا چلا کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت خداوند تعالیٰ کو سخت و سست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پر یسوع مسیح کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک نومسلم انگریز اور ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی جوش خروش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔

مقرر اور سامعین کے مابین تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ مجمع ہر ایک کی سنتا ہے اور اسی طرح قہقہے لگاتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

آزادی تقریر محض ہائیڈ پارک تک ہی محدود ہے۔

پچھلے دنوں چند اخبار فروخت کرنے والوں نے طے کیا کہ وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے۔ ٹائمز نے اس پر بڑا زوردار نوٹ لکھا کہ یہ رویہ غلط ہے۔ اگر وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے تو ہم ان کو ٹائمز بھی بیچنے کے لیے نہ دیں گے۔ کیونکہ یہ رویہ جمہوریت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل کو ٹائمز یا کسی اور اخبار کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آزادی تحریر پائندہ باد۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہر نیوز اسٹینڈ پر آپ کو دستیاب نہیں ہو سکتا ——— ایسٹ اینڈ کے چوراہوں پر کوئی غریب لڑکی اسے فروخت کرتی آپ کو مل جائے گی۔

ایسٹ اینڈ ——— ایکیڈلی سے ٹیوب میں بیٹھ کر آپ وائٹ چیپل یا ایلڈگیٹ اسٹیشن پر اتریئے۔ بیس پچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے جہاں بمباری سے تباہ شدہ محلے ہیں اور دھوئیں سے جلے ہوئے مکانات اور تاریک گلیاں۔ جہاں کی سڑکوں پر آپ رات گئے تنہا گذر جائیے تو آپ کی جیب ضرور تلاشی لی جائے گی۔ تاتسیوں نے اپنی بمباری کا نشانہ خاص طور پر اس علاقے کو بنایا تھا جہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گنجان آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کنوفشن نہیں ہے۔ ہر شخص بے حد دوستی کی موڈ میں رہتا ہے۔ افلاس اور گندگی کے معاملے میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہاں ان گنت ہندوستانی، پاکستانی اور لنکا کے مزدور رہتے ہیں۔ برسوں سے رہتے آئے ہیں اور اس آبادی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ ان کے لباس بھی اتنے ہی بدنما اور شکستہ ہیں جتنے ان کے سفید فام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے تیم تاریک ہندوستانی طعام خانے ہیں جہاں اتوار کے روز دن بھر جاز کی موسیقی بجتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیگرو لڑکے اچکتے رہتے ہیں۔ ایک چاء خانے میں ایک روز ہم لوگ گئے۔ اس میں دیوار پر پرانا مسلم لیگ کا کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پر قائد اعظم اور ہماری کیبنٹ کے افراد کی تصویریں تھیں۔ بے رنگ کرسیاں اور بھدی میزیں تھیں۔ ایک کونے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بھات کھانے میں مصروف تھا۔ کاؤنٹر پر سیاہ فام، غالباً سلہٹ کا رہنے والا ویٹر چلایا "ون ٹی، ون رول" ——— عین میں کراچی کی بندر روڈ کا کوئی ریستوران معلوم ہوتا تھا ——— "ڈور چیئر کھو تجر، مے فیئر؟" ——— جی ہاں۔ ان الف لیلوی جگہوں کے علاوہ جن کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی عقل چکر میں آ جاتی ہے اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ چاء خانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان محض ریلے ٹیمز کا مغربی کنارا ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور بیچی کوٹ لین میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹھیلے والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں ہیں۔ مونگ پھلی بیچتی ہوئی بڑھیاں، سیکنڈ ہینڈ مال کے انبار اور وہ یہ فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ وہی رنگ اور ماحول ہے جو اپنے پیارے نخاس کے بازار میں تھا۔ ذرا فرق نہیں۔

پھر یہ گلیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جن کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر، ملبے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت خانے، یہاں سے تو کوئی پکاڈلی یا سن ٹیم بھولے سے بھی نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفلڈ میں، گلاسگو میں، ویلز کی آبادیوں میں، سارے آئرلینڈ میں

اور پھر جیتل عبور کرنے کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سارا پچھم ہے جس پر کہرہ چھایا ہوا ہے۔ کہرہ جو پچھم کے سمندروں سے اٹھتا ہے۔ نیچے نیلا میڈی ٹرینین جگمگا رہا ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم کی بات تیرتی ہے۔ جسمیں کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم جو مارکوئس آف ٹوڈل ڈاؤ کے ساتھ، پندرہ ملک کوٹ سے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

میری پیاری دوست خایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل سلم لینڈ سے کم از کم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں ہمارے ۱۷ ملین تم دیکھو۔ ہماری نئی موسیقی، ہماری کلچر، ہمارا اجتہاد۔ ہمارے سامنے وہی مسائل اور دقتیں ہیں جو تمہیں درپیش ہیں۔ نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکر لے رہی ہے لیکن پھر بھی ہم اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور تم میں، یا ہم اور عربوں میں کیا فرق ہے ——— وہ خاموش ہو گئی۔

——— ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں کے ساتھ مصالحت کر لیں لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا۔ تاکہ مشرق وسطیٰ میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت، سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے ———

وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔ خایا نے پھر کہا۔

اب وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔ خایا روسی نژاد ہے۔ یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبلن سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔ خایا بے حد خوبصورت لڑکی ہے۔ ایک تو یہودی ویسے ہی بہت دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔ اس لیے خایا کو کیمبرج میں عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ خایا یعنی حیات، یعنی حیات، عبرانی میں خایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سیل سے ہر وقت الجھی رہتی ہوں۔ علاوہ ازیں میرے ملک نے خایا کو سرکاری یا اخلاقی طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔ میں خایا کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کتنے ہی گنت عربوں کی جان لی ہو گی۔ یہ سوچ کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اطمینان سے میٹھی پیانو پر چیکو وسکی بجاتی رہتی ہے۔ جب وہ بجا چکتی ہے تو روسی گانے الاپنے شروع کر دیتی ہے۔ روسی اس کی مادری زبان ہے۔ عبرانی مذہبی اور سیاسی، انگریزی، ادبی، اور فرنچ اس کی کلچرل زبان ہے۔ وہ بڑی کنٹرا ایتی برنش عورت ہے۔ فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پٹائی بھی کی۔ سیاسی طور پر وہ اشتراکی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ان سرد مزاج انگریزوں کو وہ بحیثیت مجموعی کافی پراسرار اور پرکشش نظر آتی ہے۔ پائندہ باد خایا یعنی حیات۔

اس وقت خایا ڈاکٹر اٹ ملر سے ایلیٹ کے معاملے میں الجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر اٹ ملر ہمبرگ کا انٹلکچوئیل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ غصے کھاتا ہے اور 'کماری' کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ سنسکرت اور کالی داس کا وہ بہت عالم فاضل ہے۔ سات سال تک وہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑتا رہا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار "جرم و سزا" کو پڑھا۔ اب وہ ہمبرگ میں ادب کا

پروفیسر ہے۔ یروشلم کی اینگلو جرمن جایا کی ہمبرگ کے اس اینگلو جرمن سے بالکل نہیں بنتی۔ کیونکہ جایا کو جرمنوں سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر اسٹاٹ مر کی عالم موجودگی میں وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے ذرا دیکھو تو اس منحوس مہاکوی کا لیڈ اس کے بچے کو۔ یوکرین میں اس نے کتنے ہزاروں دی یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا ——— یوکرین جو میرا وطن ہے۔

یوکرین تمہارا وطن کہاں سے آیا۔ تم اسرائیلی ہو۔ میں اس سے بگڑ کر کہتی ہوں۔

یوکرین میرا وطن بالکل اسی طرح ہے جس طرح صوبہ متحدہ تمہارا وطن ہے۔ حالانکہ تم پاکستانی ہو۔ وہ چڑ کر جواب دیتی ہے۔

——— اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں ——— ! ! روفلڈ دوسرا سگریٹ روشن کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔ روفلڈ برطانوی ہے، قوم کا اینگلو سیکسن۔ اس گروہ کا ایک اور اینگلو جرمن، سارے جدید انگریزی ادب پر وہ بھی ہم سب کی طرح بے تحاشا عاری ہے اور اپنے آپ کو ڈاکٹر لیوس سے زیادہ سمجھدار اقتصادی خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر لیوس سے جو کیمبرج کے بڑے گروہوں میں سے ہیں۔ وہ اکثر الجھتا رہتا ہے۔ تم برصغیر ہند کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار محض مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمہاری بڑی بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسٹاٹ مر کو سیاست کی خرافات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ ٹیگور کے فلسفے کے متعلق کرسٹفرلی سے کچھ فرما رہے ہیں۔ کرسٹفرلی لوئی ٹک سنس کے رفقاء میں سے ہیں اور جدید شاعروں اور نقادوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ٹیگور ٹیگور چلاتے ہیں۔ آپ نے کبھی ابن خلدون کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں غصے سے ان دونوں سے کہتی ہوں ——— مشرق کا سارا ذہن و فلسفہ محض ٹیگور ہی نہیں ہے۔ حضرت علی اور امام غزالی اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی تو مطالعہ کیجئے ——— لیکن بھلا آپ جیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا ——— !

ہم خطرناک پانیوں کی طرف ——— روفلڈ آہستگی سے تیسرا سگریٹ جلا رہا ہے۔

چنانچہ چاروں اور یہ خطرناک پانی ہیں۔ اور ہم سب ایک ناؤ میں سوار ہیں۔

کیم آہستہ آہستہ بہتا جا رہا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے یہ سینکڑوں برس سے یونہی بہتا آیا ہے۔ اس کے دونوں طرف پرتم روز کھلے ہیں اور بے انتہا سرسبز درخت ہیں۔ موسم بہار کے سارے پھول امنڈ رہے ہیں۔ رنگ فوز کی شاخیں پانی کی سطح پر جھکی رہتی ہیں۔ صدیوں سے یہ پھول اور یہ پرانی دیواریں اور یہ پل، یہ اندر گریجویٹ کلیں سنتے آئے ہیں۔ بے حد پرسکون ——— اور بے تحاشا خوبصورت منظر ہے جو کرسمس کارڈوں اور کیلنڈروں پر منتقل ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہوتا ہے چیری کے درخت ہیں اور ان میں چھپے ہوئے کالج اور ٹی گارڈن گرانچسٹر ہے جہاں ریوپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹر گرجا کے قبرستان میں ریوپرٹ بروک کے میموریل پر ایک اکیلی ریچھ مرجھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لانچ یونین جیک لہراتی زناٹے سے سطح پر سے نکل جاتی ہے۔ گڈ اولڈ یونین جیک ——— ! ! کوئی آہستہ سے کہتا ہے ——— ہولی ڈے میکرز اور انڈر گریجویٹس کناروں پر دور دور تک ٹولیوں میں منتشر ویک اینڈ منا رہے ہیں۔ پانی کی لہروں

پرانی گفت PUNTS تیر رہی ہیں۔ ابھی قریب سے جو پنٹ گاڑی ہے اس کے سرے پر کھڑی ہوئی خلاصیوں نے جوش میں آکر زور زور سے کوئی جبرانی لوک گیت شروع کر دیا ہے جو اسرائیل کے کھیتوں میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ ڈاکٹر الف عا آہستہ آہستہ ایک جرمن نغمہ الاپ رہا ہے۔ ڈاکٹر نینسی کارمن دیگر دو رحانی گیت گنگنانے لگتی ہے۔ اس پر غفتل سمفنی شروع ہو جاتی ہے۔

"تم بھی کوئی ہندوستانی، میرا مطلب ہے پاکستانی گانا گاؤ ——" روتلڈ ذرا خفگی سے مجھ سے کہتا ہے۔ نینسی آنکھیں نیم وا کئے اپنے وطن، جنوب کے ——— PLANTATIONS کے گیت گا رہی ہے۔

ڈاکٹر نینسی کارمن۔ یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔ اس کی دادی حبشی سیلو گرل تھی جسے نیو اورلینز میں فروخت کیا گیا تھا۔ اس کا باپ ورجینیا میں پادری ہے۔ نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں اسلئے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے شمال کی کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھا۔ اور امریکی ناول میں نیگرو پادری کے کردار پر مقالہ لکھ کر اس نے کولمبیا سے ڈاکٹریٹ لیا۔ اب وہ جنوب کی بہت بڑی نیگرو یونیورسٹی میں ادبیات کی پروفیسر ہے۔ نینسی بے حد پیاری لڑکی ہے۔ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے اور بات بات پر زور زور سے گھٹنے لگاتی ہے۔

"دیکھو ——— تم لوگ ہمیشہ اپنی مظلومیت پر بسورتے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔ لیکن نینسی کو دیکھو۔ اس کی قوم نے کتنے ظلم سہے ہیں اور یہ کس طرح ہر سے ہنستی اور دوسروں کو ہنساتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کلچر پر دم کے بارے میں تمہاری طرح ہی حساس ہے۔ بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سہے ہیں ——" روتلڈ مجھ سے کہتا ہے۔

نینسی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے ساتھ تین چار امریکن اور ہیں جو سب کے سب کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سب بڑے ذہین پرست ہیں۔ مثلاً یہ ڈکارسٹل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے بلند پایہ نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔ صرف ایزرا پاؤنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ نینسی ان سب کی دوست ہے کیونکہ بہرحال وہ بھی امریکن ہے اور بڑی پکی امریکی ہے۔ لیکن ان سب سے مختلف ہے۔ ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔ نینسی، خدایا یا روتلڈ کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔ امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔ پھر بھی اس سے کتنی گھبراتا اور کتنے دکھ سے وہ دیگر دو رحانی نغمہ الاپ رہی ہے۔

نینسی کارمن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریکفاسٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا "ہلو ٹوپسی ——!!"

نینسی نے اس سے کہا "دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے ٹوپسی کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن آئندہ کسی نیگرو کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔"

"اوہ ——— آئی ایم سوری ڈیر ——" انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خاموشی سے پارج میں مصروف ہو گئی۔

"تم نے دیکھا ——" بعد میں نینسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا "یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرو عورتوں کو ٹوپسی یا نیگرس کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو نا۔ میرا مطلب ہے کہ ——"

"الفانامیں کیا رکھا ہے ——!!؟" روتلڈ نے ایک اور سگریٹ رول کرتے ہوئے کاہلی سے سوال کیا۔

"الفانا ——؟ آپ کسی چینی کو چائنامین کیوں کہتے ہیں اور کیا تم کو پتہ ہے کہ لفظ ایشیاٹک کے پیچھے کتنی حقارت چھپی ہوئی ہے ——؟!" میں نے جواب دیا۔

"اوہو ——!! اسی لیے اب تم لوگ اپنے آپ کو ایشیاٹک کے بجائے ایشین کے نام سے یاد کرتے ہو ——!!" روتلڈ نے کہا۔

"جی ہاں جناب ——" میں غصے سے کود کر دریچے میں جا بیٹھی۔

"اچھا ——اچھا ——ایشین، ایشین، ایشین ——!! ٹھیک ہے؟!" روتلڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہائے ——" میں نے نقل اتارتے ہوئے جواب دیا۔

سورج کنگز کالج کے پیچھے غروب ہوتا جا رہا ہے۔ کورٹ یارڈ پر سائے طویل ہونے لگے ہیں۔ پیٹر ہاؤس۔ کوئنز کالج۔ ہیوٹن سٹی سسکس۔ ان ساری سحر انگیز عمارتوں پر تاریکی چھا رہی ہے۔ تاریکی میں ایسا لگتا ہے۔ ابھی ان صدیوں پرانے گھسے پتھروں والے کوریڈورز میں سے قرون وسطیٰ کے راہب اور اسکالر کالے گاؤن پہنے شمعیں لیے ادھر سے اُدھر گذر جائیں گے۔ ان کمروں میں، ان سیڑھیوں پر اور ان کورٹ یارڈز کے درختوں کے نیچے کرسٹوفر مارلو، رچرڈ بیکن، اولیور کرومویل اور ان کے بعد کیٹس، بائرن اور جانے کس کس نے اپنے طالب علمی کے زمانے بتائے ہیں۔ اس پُراسرار نیم تاریک ماحول میں اب تک ذرا سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

کیم اسی طرح بہتا رہے گا۔

اب ہم اپنے گرینڈ کونسرٹ کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے۔ فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بسی ہے۔ تیز سبز گھاس نم ہے۔ اور پتوں پر سے بارش کے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔ پورب کے کھیتوں اور کنجوں پر بھی یونہی بارش ہوتی ہوگی۔ چلینڈر سے اور کھرنی کے درختوں پر، بکشی کا تالاب اس وقت پانی سے بالکل لبریز ہو گیا ہوگا۔ اور پیلے کنول وہاں تیرتے ہوں گے۔ گومتی کے کاٹھ کے پل پر سے لوگ چولائی اور جھتے کے جھولے اٹھائے ساون الاپتے گزر رہے ہوں گے۔

نوسٹیلجیا ——!!! نیتشی آہستہ سے دہیانت کرتی ہے۔ لان پر ہمارے ساتھی ادھر اُدھر گروہ بنائے گھاس پر بیٹھے پروگرام کے مختلف حصوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ شاہ بلوط کی لکڑی کی دیواروں والے نیم روشن کمرے میں اس اسکٹ کی مشق کی جا رہی ہے جو ہم نے ایلیٹ کے "سویینی ایگنسٹیس" کی پیروڈی میں لکھا ہے۔ ہم ایک ایک جملے اور سین پر قہقہے لگاتے لگاتے دُہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک امریکن لڑکی وائلن پر ویبر بجا رہی ہے۔ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کا اطالوی طالب علم گٹار بجا رہا ہے۔ آتشدان کے اوپر سے لیڈی سڈنی کی روغنی تصویر کاہلی سے جھانک رہی ہے جنھوں نے پندرھویں صدی میں یہ کالج قائم کیا تھا۔

رسل فریزر فرش پر پڑے ہوئے گھنگھروؤں کو بڑے غور اور دھیان سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ نیتشی کا دل پیانو پر تنہائی سے وہ دھن بجانے کی کوشش کر رہی ہے جو میں نے ناچ کی لے کے لیے اسے سکھائی ہے —— رے وا گے بندرا بن میں بانسریا کھوب کھوب بجا دینا —— رے وا گے۔

دھیم تانا دھی ری تانا تانا، دھی ری تا دھیم ——— سب مل کر الاپنے لگتے ہیں۔
ٹیرلک ——— !! رستل تیز چلا کر خوشی سے کہتا ہے۔
ان سفید قوموں کا آرکسٹرا اب ہندوستانی کا گیت بجا رہا ہے۔ یہ دھنیں انھوں نے آج تک نہ سنی تھیں۔ سب کے سب بچوں کی طرح اکسائیٹڈ ہیں۔

اوہ بوائے ——— !! نیتی چلا کر کہتی ہے۔
کیا کلچرل فارمنی پیدا ہوئی ہے واللہ ——— !! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فارسٹر مجھ سے کہتے ہیں ——— میں ہندوستان کو بھلا کس طرح بھول سکتا ہوں ؟ ——— کبھی نہیں ——— !
یس سر ——— میں کہتی ہوں۔
خصوصاً تمہارا لکھنؤ۔
یس سر۔
تمہاری تہذیب۔
یس سر۔
تمہاری ساری جد و جہد۔
یس سر ——— ٹو چیرز فار ڈیو کریسی[1]
فارسٹر کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر، جنوبی انگلستان پر موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیزن اپنے عروج پر ہے۔ ویسٹ اینڈ میں پیٹر اشکوف، ایڈتھ ایوانز اور میری مارش کے کھیل بے پناہ ہجوم اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے فیشن ایجاد کیے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز سے ذرا پرے اور سیزلیگ کی بھوری مہیب عمارت ہے جس میں بوڑھے آئی سی ایس اور نو آبادیات کے سابق گورنروں بھرے چپ چاپ بیٹھے وہسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اٹھا کر گڈ ہولٹ بے پور ریڈیو سنتے یا ڈیرا ڈنڈ چھپر منزل کلب کا تذکرہ کر لیتے ہیں۔ جہاں سنگرہ میں طلسم میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک پارٹی کے دوران میں میں نے ایک بہت بوڑھے انگریز کو نوش کیا جو سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ میں نے پیالی اسے اٹھا کر دی۔

---

[1] فارسٹر کی نئی کتاب کا نام

انڈیا ——— ؟! اس نے دوستی کے انداز میں سوال کیا۔
پاکستان ——— ! میں نے اسی بشاشت سے جواب دیا۔
اوہ ——— ونڈرفل ——— ونڈرفل۔
آپ کبھی برصغیر جا چکے ہیں ——— ! میں نے پوچھا۔
ہاں! جا چکا ہوں ——— جا چکا ہوں ——— اس نے پیالی کانپتے ہاتھوں سے سنبھال کر اٹھائی۔
کسی خاص جگہ ——— ؟
بمبئی!
اچھا ——— کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں۔ یا ایسے ہی ——— ؟ میں نے اخلاقاً مکالمہ جاری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔
نہیں ——— ملازمت کے سلسلے میں نہیں۔
اوہ ——— ! آرمی ——— ؟!
نہیں، آرمی نہیں۔
تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستان؟
ہاں ——— ہاں ——— کئی سال ——— کئی سال۔
کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں ——— میرا مطلب ہے، بمبئی میں ——— ؟
ار ——— میں بمبئی پریذیڈنسی کا گورنر تھا۔
اوہ ———

———

ان انگریزوں کی تنہائی اب قابل رحم ہے۔ ان کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی زوال آچکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈ اور کاؤنٹ جن کے پاس لمبے چوڑے خطابات، طویل و عریض ریاستیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے، اب نوکریاں کر رہے ہیں یا اپنے جواہرات اور بیش قیمت کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی نمائش شروع کر دی ہے جن پر ٹکٹ لگا کر وہ تماشائیوں کو اپنے کتب خانے، اپنے نفیس بیڈروم اور ڈرائنگ روم ایک مستعد گائیڈ کی طرح دکھلاتے پھرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے گھر کے خرچ میں مدد لیتے ہیں۔ موت کے محصول نے ارسٹوکریسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔
انگلستان کے لارڈز اور لیڈیز کا زمانہ ختم ہوا۔

لہٰذا اے مومنو! لازم ہے تم پر کہ عبرت پکڑو اور درد سے کبھی غافل نہ ہو۔ پڑھو درود!

اب آخر میں خاں صاحب سے بھی مل لیجئے جو پچھلے تیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ جوش کے قریبی عزیز ہیں اور غالباً کسی زمانے میرے ابا کے کلاس فیلو تھے جو اپنی ذات سے اجنبی ہیں۔ بی بی سی کے اسٹوڈیوز کے پاکستانی سیکشن میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہتی ہے۔ اتنے طویل عرصے کے ولایت کے قیام کے باوجود ان کا لب و لہجہ اب تک ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا ہے۔ اردو بولتے ہیں تو ہمیشہ لفٹیننٹ کو لیفٹیننٹ اور ویسٹ منسٹر کو ویسٹ مینسٹر کہتے ہیں۔ سینما کو انھوں نے ہمیشہ بائیسکوپ ہی کہا۔ لکھنؤ کے پرانے داستان گویوں کے انداز میں قصے سناتے ہیں۔ بیس سال گزرے، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے یہاں آئے تھے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ وائیڈ پارک میں ملتے کیا معنی کہ آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو ابھی فوراً آزاد کیجئے۔

اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور دل شکستہ ہیں۔ کہ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے لیکن پوسٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم میں آباد نہ ہو سکے اور پھر لندن لوٹ آئے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں۔ کوئی خاندان نہیں ہے، اکیلے رہتے اور اپنے محلے بھر کے گورو اور جگت بچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چودھری محمد علی ردولوی کی حکایتوں میں اور چودھری محمد علی کی حکایتوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اور سر دھننے والے ہمارے پاکستان میں بہت کم ہوں گے۔

موسم گرما بھی گزرتا جا رہا ہے۔ ٹورسٹ ٹریفلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانے کھلا رہے ہیں۔ ٹیٹ گیلری میں پکاسو اور رائل اکیڈمی میں وادیچی کی نمائش ہو رہی ہے۔ پکیڈلی سرکس میں وہاں کی مشہور حرام، سڑک پر چلنے والی، رنگ کیاں حسین کپڑوں میں ملبوس، اونچی ایڑی کے جوتے پہنے گھر ایک اپنے کو نوں کھدروں یا فٹ پاتھ کے کناروں پر کھڑی راہ چلنے والوں خصوصاً غیر ملکیوں کو ہیلو ہینڈسم کہہ کر اپنی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکیڈلی ——— ہاؤ ڈو یو ڈو ——— !! مجھے بڑھتا جا رہا ہے۔ سینما گھروں کی کھڑکیوں کے سامنے کیو لگے ہیں۔ ایک خوبصورت جوان آدمی جس کی ایک ٹانگ اوپر سے کٹی ہوئی ہے، بھیک مانگتا مانگتا کیو کے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے اور قومی انداز کر سلام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پیسے اس کے بکس میں کوئی بھی نہیں ڈالتا۔

"سلام میم صاحب ——— !!" وہ ہمارے سامنے آ کر کہتا ہے۔

میری بہت ہی پیاری دوست فیروز جبیں اس سے پوچھتی ہے "کیا تم کبھی ہندوستان میں رہے ہو؟"

"نہیں ——— میں ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا اس لیے ہندوستان نہ جا سکا ——— !" وہ مسکرا کر کہتا ہے۔

"اچھا ——— !" فیروز اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔ وہ اسی طرح مسکرا کر تھینک یو کہتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

"ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا" فیروز دہراتی ہے، "اور اب ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں کے آگے بھیک مانگتا ہے۔ اور ابھی ایک جنگ اور ہو گی؟!"

سامنے سے اطلاقتک پارہ اے سپاہیوں کا ایک غول گذر جاتا ہے۔
میں اور فیروز سینما کے اندر جاکر لارو تند دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔
لارو تند ——— زندگی کا میری گورو انڈ ——— !!!

تو بھائی فیروز یہ سلسلے ہیں۔ رات کو میں آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر فیروز سے کہتی ہوں۔ یہ بھارا پرانا لطیفہ ہے۔ یونیورسٹی میں ہم جب اکٹھے پڑھتے تھے تو شام کو ہوسٹل کی ڈائننگ ٹیبل پر دن بھر کے سارے ضروری واقعات یونیورسٹی پالیٹکس اور اسکینڈلز ایک سانس میں گوش گذار کرنے کے بعد میں فیروز سے کہتی تھی: تو یہ سلسلے ہیں بھائی صاحب ——— !!

فیروز کھانا پکانے میں مصروف ہے۔ اسٹوڈیو کے چاروں طرف ضخیم کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس نے لکھنؤ سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ اب وہ جرنلزم کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور انڈیا ہاؤس میں کام کرتی ہے۔ فیروز جیسی ہندوستانی لڑکی ہے۔ ہندوستانی طالبعلموں کی تہذیبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتی ہے۔ جدوجہد ہماری روایت ہے اور اس روایت کو ہم کبھی نہ بھولیں گے۔

برادر ——— میں جلاتی ہوں۔
فیروز اور اس کے ہندوستانی ساتھی ذرا گھبرا کر ماں کر چپ ہو جاتے ہیں۔

اور یہ کملا ہے۔ میری بچپن کی رفیق کملا جیسال جس کا ذکر آپ نے اس ناچیز خاکسار کے افسانوں میں اکثر پڑھا ہوگا۔ یہ صاحب ہندوستان کی فارن سروس کی ایک بڑی ذمہ دار رکن ہے، پر اب تک لگتا ہے کہ ابھی ابھی اپنی کلاس کا کوئی پیریڈ گول کر کے کالج سے بھاگی چلی آ رہی ہے۔ اس کا فلیٹ جیلسی میں ہے۔ لہٰذا آرٹ دارٹ کا چکر اس کے یہاں بہت رہتا ہے۔

کینیڈا کا انٹلکچوئل تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کا ماہر ارتی بلیٹن برگ جاتینی رائے کی ایک تصویر کو بے دھیانی سے الٹ پلٹ رہا ہے۔ ارتی آج کل بیک وقت دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینیڈا کی اقتصادی تاریخ ہے اور دوسری کچھ اور اسی قسم کی چیز ہے۔ دونوں کتابیں بڑے پروگریسو نظریے سے لکھی جا رہی ہیں۔ اپنی کم عمری کو چھپانے کے لیے ہر وقت بے حد سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروگریسو ——— ؟ اُفوہ ——— افسوس یہ ہے کہ تم تو پچھم کے زوال پرست انٹلکچوئل بھی نہیں ہو۔ کونیل انٹلکچوئل ہو ——— میں اسے جلانے کے لیے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹلکچوئل ہی سے وحشت ہوتی ہے اور پھر کینیڈا کی مخلوق ——— ؟ اُفوہ۔ یہ کونیل رنگ بھلا کیا کھا کر انٹلکچوئل بنیں گے۔ بھائی جو تمہارے باپ کے چین اسٹورز ہیں، انھیں میں مگن رہو (ارتی جب اپنی بے تحاشا طویل و عریض امریکن کار میں سڑکوں پر سے گذرتا ہے۔ خصوصاً کنگز ویلی سائیڈ کے قصبوں کی پتلی پتلی سڑکوں پر سے، تو راہگیر رک کر کار کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکن کاریں انگلستان میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ انگلش کاریں جو ان کے سامنے بالکل کھلونا ایسی دکھلائی دیتی ہیں، ارتی کی کار کی وجہ سے رک جاتی ہیں کیونکہ اس کی

"اور ٹورنٹو میں اسارا راستہ گھیر لیتی ہے اور اس ماحول میں بے حد غیر ملکی نظر آتی ہے۔ راہگیر حیرت سے امریکن کاروں کو کبھی کبھی چھو کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔
—— واہ امریکہ !!)

اور اپر کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر ترقی پسند نظریہ ——— (جھگڑا جاری رہتا ہے) برطانیہ عظمیٰ کے انقلابات —— یہاں انقلاب تو ایشیا میں آتے ہیں۔ دو سال میں ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ مہینوں اور ہفتوں میں دنیا ادھر سے اُدھر کر دی جاتی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے دو سو سال تک انڈسٹریل ریوولیوشن گھسٹا۔ پھر اسٹیم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کانوں کا سلسلہ رہا۔ بھائی دنیا کی تاریخ تو ایشیا میں بن رہی ہے۔ کیا خیال ہے؟ میں کہتی ہوں۔

کیا میلو ڈرامیٹک پروڈکشن ہے آپ کی —— !! تم کہتا ہے۔

اور کیا کوک اور پیپسی آپ سب کا ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ میں چڑ کر جواب دیتی ہوں۔

ارتی خاموشی سے مسکراتا رہتا ہے۔ دراصل ارتی کو تو ایسٹری یا ہالی وڈ میں ہونا چاہئے تھا۔ اسٹیورٹ گرینجر یا کورنیل وائلڈ میں کو دیکھ پائے تو چلو بھر پانی تلاش کرتا پھرے۔ ارتی روسی نژاد ہے اور صنفِ نازک سے بے انتہا خوبصورت سمجھتی ہے۔

لیکن ارتی واقعی بے حد پروگریسو ہے۔ نہایت سمجھدار اور خاموش قسم کا پروگریسو۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہا ہے ٹھیک لکھ رہا ہے کیا تم لوگوں کو بھی اپنی تواریخ بالکل نئے سرے سے اور نئے زاویے سے نہیں لکھنی چاہئے۔ وہ پوچھتا ہے۔

کوئیل —— !!

ابھی ابھی تم اپنے ایسوسی ایشن کے دفتر سے واپس آیا ہے۔ تم بھی رونلڈ کی طرح انگریز ہے۔ جدید سنگراشی اس کا مشغلہ ہے۔ اور چونکہ وہ بھی چیلسی میں رہتا ہے لہٰذا اسے بھی اپنے آپ کو فنکار سمجھنے پر مجبور کیا جاتا رہتا ہے، حالانکہ وہ مصر ہے کہ وہ بے حد پریکٹیکل آدمی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ "فتے" کرتا ہے۔ اور سارے قدیم ہندو فلسفے اس نے گھول کر پی رکھے ہیں۔ گاندھیان طرزِ زندگی کا سخت قائل۔ دنیا کے سارے پرابلمز کا حل صرف اس نے دریافت کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب کو شخصی CELLS بنانے چاہئیں۔ ان میں رہتے ہوئے اور ان سے آگے بڑھ کر ہم سوسائٹی کی اصلاح کریں گے۔ اور زندگی لامحالہ نہایت سیدھی سادی اور پُرسکون ہو جائے گی۔ اسی شخصی درجۂ معرفت کی آئیڈیلزم کے چکر میں اس کی غیر سیاسی انسانیت پرست ایسوسی ایشن کی طرف سے پچھلے دنوں چند اللہ والے مہاپرش کراچی گئے تھے۔ ان میں فرانسیسی، سوئس، ڈچ اور غالباً انگریز مرد اور عورتیں تھیں۔ یہ لوگ فالو کھیت میں کئی مہینے مہاجرین کے ساتھ رہے۔ دن رات لگ کر انھوں نے مکان تعمیر کیے۔ دن بھر وہ اینٹ اور گارا ڈھوتے تھے اور رات کو چٹائیوں پر پڑ کر سو رہتے تھے۔ کیا روحانی بلندی ہے واللہ —— !! میں تم سے کہتی ہوں۔

مصیبت یہ ہے کہ تم مذہبی بھی نہیں ہے لیکن انقلاب کا قائل نہیں۔ بڑا سخت PACIFIST اس کے خیال میں سوویت یونین اور مغربی ممالک دونوں تباہی کے راستے پر جا رہے ہیں۔ اچھا خاصا ہپی مت کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔ بس ہر ایک کو مکمل شخصی آزادی اور امن حاصل ہونا چاہئے۔ اور سب کو چھوٹی چھوٹی COMMUNITIES میں رہنا چاہئے۔

تم اگر خدا پرست ہوتا تو بڑا عمدہ روسی کیتھولک فادر ثابت ہوتا۔

گڈ اولڈ جم ———

کرشنا سین ریٹائر ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ ہائی کمشنر رہے انڈیا ہاؤس میں انھوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک کمرہ لے رکھا تھا جس میں ایک طرف چاء بنانے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتابوں اور اخباروں کے انبار بکھرے رہتے تھے۔ دن بھر اور رات گئے تک وہ خود چاء بنا بنا کر پیتے جاتے تھے اور لگاتار کام کرتے تھے۔ کام میں مصروف رہنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

اب آپ بنا کچھ کئے کیسے رہ پائیں گے! میں نے ان سے پوچھا۔

میں کچھ نہ کچھ ضرور کیا کروں گا۔!! انھوں نے کہا۔

اب آپ کتابیں لکھا کیجئے۔ میں نے عقلمندی سے ان کو مشورہ دیا۔

غالباً وہ انگلستان میں مستقل رہیں گے جس طرح ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ محمد علی خاں علیگ آبادی کی طرح وہ بھی اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اس وقت تو وہ اوتی کو جسے وہ کینیڈین بیش میں لکھتے ہیں، پراٹھے کھلا رہے ہیں اور وہ سالن میں مرچوں کی زیادتی کی وجہ سے سوں سوں کر رہا ہے۔

اور اب رات ہو رہی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے گھومنے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے بھکاری مصور جو فٹ پاتھ پر رنگین چاک سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دیوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور ہر راہگیر کو دھندلی، پُر امید آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اپنے ٹھکانوں پر جا چکے ہیں۔ فٹ پاتھ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوتا ہے:۔ یہ میں نے جھیل اور چاندنی رات کی تصویر بنائی ہے، لیکن چونکہ چاک سے سارے رنگ اُجاگر نہیں ہو سکتے اور کاغذ یا کینوس کے بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پاتھ کی زمین ہے۔ اس لیے تصویر ایسی نہ بن سکی۔ جیسی میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات گزارنے کے لیے کوئی پلنگ نہیں ہے ——— وغیرہ وغیرہ وغیرہ ———

سڑکیں سنسان ہو چلی ہیں۔ زمین دوز ریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں۔ متوسط طبقے کے باولر ہیٹ اور چھتریوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔

کوئی ٹورسٹ اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا بدمذاق شہر ہے جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں کل پیرس جا رہا ہوں ——— شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جاگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے گئے ہیں۔ باہر خشک ہوا چل رہی ہے۔ کل سردی

ہو گی۔ نیچے سڑک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری بچے کھچے پرچے سمیٹ رہے ہیں جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ ابّو پیروں مر گئی۔ شاہ فاروق کو باہر نکال باہر کیا گیا۔ مصدق روسے لگے۔ روسیوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہیں گے۔ میں اور فیروز اور کملا اور رخیا اور نیلی۔ اور ان کے علاوہ رونلڈ اور الٹ مکہ اور ارانی اور رحیم سب سو جائیں گے۔ کیونکہ یہ آج کا دن پھر ختم ہوا۔

کل کیا ہو گا۔ یہی سوال شکسپیئر میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے۔ دیکھو ———

اب تمہاری خاطر کوئی ڈیسیشن فیصلے کے لیے نہ آئے گا۔

بھاگ بھری

ہاجرہ مسرور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی ——

میڈیکل کالج کے زمانے میں اپنے آپ پر دورہوں کی کیسی کیسی بارش نہ دیکھی تھی۔ اپنے بڑے بڑے پروفیسروں کی لمبی لمبی گاڑیاں دیکھ کر آدمی اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر جب ڈگری لے کر اس بازار میں آئی تو معلوم ہوا کہ گلی کے اندر حقیر سے کمرے پر بورڈ لگا کر بیٹھنے سے وہی دولت واپس آنا مشکل ہے جو بیوہ ماں کے زیورات بک بک کر فیسوں اور کتابوں پر خرچ ہوئی —— آگے چل کر میں نے کیا رُخ اختیار کیا، یہ ایک الگ قصہ ہے جس کا ذکر کرنا اس موقع پر ضروری نہیں۔

ہاں تو ان دنوں جب پہلی بار مجھے دُور دراز کے ایک گاؤں میں زچگی کا ایک کیس کرنے کی دعوت ملی تو میں کافی خوش ہوئی۔ بلا تامل میں نے منہ بنایا اور اپنے بے شمار مریضوں کی پریشانی کا ذکر کیا۔ لیکن جب سیدھے سادے بھولے پیغامبر نے میرا بھاؤ ایک سو بڑھا دیا تو میں فوراً تیار ہو گئی۔ —— دو سو روپے روز کے کم نہیں ہوتے۔ میں حیران رہ گئی کہ شہر کی دوسری چلتی ہوئی ڈاکٹرنیوں سے بچ کر یہ میرے پلے کیسے پڑ گیا۔

میں نے جلدی سے اندر جا کر والدہ سے ذکر کیا لیکن وہ خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان ہو گئیں کہ بھاؤ دُور کی بات ہے، جوان کنواری لڑکی، لاکھ ڈاکٹر ہو پھر بھی —— والدہ کی اس "پھر بھی" سے میں بھی ذرا پریشان ہوئی۔ لیکن پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ دوڑ کر سائیکل پر جائے اور کالج میں کم از کم چھ دن کی چھٹی کی درخواست دے آئے اور ساتھ ہی میں نے گھر کی پرانی ملازمہ ماسی کو سفید شلوار کرتا پہنوا کر بطور نرس ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا —— جب میں واپس اپنے مطب کے اُجڑے کمرے میں گئی تو یہ بات بھی فوراً طے ہو گئی کہ نرس کو دس روپے روز ملیں گے۔

پھر میں نے پوچھا کہ "وہاں ٹرین یا بس کس وقت جائے گی؟"

"گاڑی ساتھ لایا ہوں۔" جواب ملا۔

اور میں یہ سوچ کر پریشان ہوئی کہ دیہات سے شہر تک پہنچتے پہنچتے گاڑی اتنی بے کار ہو گئی ہو گی کہ راستے میں پریشانی اٹھانا پڑے۔

لیکن جب میں اپنے دو محافظوں کے ساتھ والدہ کو دعائیں پڑھتے چھوڑ کر گلی اور گلی سے کر کے سڑک پر آئی تو تازہ بتازہ کھڈی لک دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ ضرور بدل گیا ہو گا —— میں پچھتائی کہ میں نے فیس اور زیادہ کیوں نہ مانگی۔

راستے میں میرے چھوٹے بھائی نے کرید کرید کر کئی بار یہ معلوم کیا کہ ہم ضلع سرگودھا کے ایک جاگیردار کے ہاں جا رہے ہیں۔ جاگیرداری

مصر تھیں کہ ولایت لاہور سے ڈاکٹرنی بچہ جنانے آئے ——— بڑے اسامیوں کی پہلی زچگی تھی۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لاہور سے بالکل مختلف دنیا میں وارد ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی ہماری منزل تھی۔

بڑی سی پھاٹک کے دروازے پر پیلی پڑتی دھوپ میں ایک درجن شکاری کتوں کو شام کا راتب تقسیم ہو رہا تھا، اور دس بارہ آدمی ان کتوں کی زنجیروں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ہماری آمد پر وہ چونکے لیکن پھر کتوں کی زنجیروں پر جھک گئے ——— اسی پیلی دھوپ میں گدے دار کرسی پر، میرے دیسور دیے، روز کے داتا، ملک گل نواز آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے ——— سفید سلک کی تہمد اور نیلی سلک کی قمیص، سر پر بغیر کلاہ کی بھاری پگڑی ——— اور کلائی پر باز ——— باز، ملک کے ہاتھ پر رکھی ہوئی تازہ تازہ ذائقہ کے پر بکھیر بکھیر کر گوشت نوچ رہا تھا ——— یہ وقت باز کے راتب کا بھی تھا۔

کیڈی ملک کے اس مالک کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر پھر بھی اس ماحول سے میں کافی مرعوب ہو گئی۔

"ڈاکٹرنی صاحب بڑی تکلیف اٹھائی آپ نے۔ میں آپ کو خوش کر دوں گا!" ملک نے گہری نظروں اور بھاری آواز سے بیک وقت کہا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ملک صاحب کی صورت اس بادشاہ سے ملتی ہے جس کی تصویر میں نے اسکول کے زمانے کی کسی کتاب میں دیکھی تھی۔ ماتھے تک بیچ در بیچ بڑی سی پگڑی، بڑی گھنی مونچھیں، کرسی پر آلتی پالتی مارے اور ہاتھ پر باز بٹھائے ——— بس مالک کیا مانگتا ہے کہنے کی کسر تھی۔

زنان خانے کا ماحول لباس اور سجاوٹ کی تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا عموماً ہمارے پرانے طائفے کے بڑے گھروں میں ہوتا ہے۔ صحن میں رنگین پیڑھیوں پر کافی سے زیادہ عورتیں رنگین لہنگے اور موٹی ریشمی کنارے والی چادریں لپیٹے منتظر شکلیں بنائے بیٹھی تھیں اور ایک کھمبے سے ڈھکے ہوئے پلنگ پر ایک بوڑھی عورت تکیہ سنبھالے تسبیح ٹٹول رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کی بڑی بوڑھی ہوں گی۔ جھٹلاتا یہی ملک کی والدہ بڑی ملکنی تھیں ——— مجھے امید تھی کہ وہ اٹھ کر میرا استقبال کریں گی۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ میں ٹھٹکتی ہوئی پلنگ کے قریب رک گئی۔

بوڑھی ملکنی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دوشالے کا پلو سرکا کر گردن سے لے کر ناک تک ڈال لیا اور اب میں صرف اس کی تیز آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی جو مجھے سختی سے گھور رہی تھیں۔ مجھے اتنا غصہ آیا، اتنا کہ میں نے جی میں دعا کی کاش ان سب عورتوں کے دو دو زنانے ہونے لگے۔

"صرفی کہاں ہے؟" میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ سب عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے حیرت سے گھورنے لگیں۔

"بیجا کہاں ہے!" اب کے میری ماتی نے انتہائی کرخت زبان میں سوال کیا۔

"اللہ کا نام لو، بیجا یہاں کہاں!" ایک عورت نے دونوں طرف چڑھی ہوئی ناک کی ٹاپس نما کیلیں چمکا کر بڑی ہی کرخت آواز میں جواب دیا ——— سب کی معاندانہ نظریں مجھ پر تھیں۔

میں نے سمجھا میں دیر میں پہنچی ہوں، اسی لیے سب کی نفرت کا نشانہ ہوں ——— شاید بے چاری ختم ہو چکی ——— اور میں

افسوس میں ڈوبی ہوئی دوبارہ ملک کی صوفوں سے ٹھنسی ہوئی بیٹھک میں پہنچ گئی۔

"مجھے افسوس ہے ملک صاحب میں مریضہ کو نہیں دیکھ سکی" اور میں نے دیکھا کہ اس فقرے سے بھائی کے چہرے کا رنگ یوں اُڑ گیا جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ ظاہر ہے بھائی کو تعلیم کے لیے فیس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر ملک صاحب کے پلے ہوئے چہرے پر کوئی ناگواری نہ ہوا۔ "اوہ! ڈاکٹرنی صاحب میں نے ابھی تک والدہ سے ذکر نہیں کیا کہ لاہور سے ڈاکٹرنی بلائی ہے۔" یہ کہہ کر ملک صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"مگر ملک صاحب اب اندر جانے سے کیا فائدہ!" میں نے گردن جھکا کر کہا۔

"ڈاکٹرنی صاحب آپ بُرا نہ مانیں جی، دراصل میری والدہ رسم و رواج کے خلاف جانا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے میں نے ان سے پہلے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

لیکن گھر کے اندر پہنچ کر ملک اور بڑی ملکنی کی جھک جھک شروع ہو گئی۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ کر کے منہ بنا بنا کر اپنے بیٹے سے کہتی ——— بیمار کہاں ہے؟ بیمار ——— ہنہ بیمار!

یہ قصہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ——— بعد میں ملک نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر دھیرے سے بتایا کہ بڑی ملکنی کو آپ کی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ آپ نے پہلے پہل کی زچہ کو بیمار کہہ دیا ——— زچگی آپ جانتی ہیں بڑی مبارک چیز ہے۔ ——— وغیرہ وغیرہ۔

"وہ سامنے محل میں ہے" ملک نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے گویا مقصود پہنچ رہے ہوں۔ اور میں بجائے ہلنے کے کھسیا کر رہ گئی۔

سلیٹ سے ایک دروازے اور بغیر کھڑکی اور روشندان کے پرانے طرز والے کمرے میں ہونے والی زچہ تھی ——— وہاں بھی کافی عورتیں تھیں، اور ایک مٹری ہوئی عورت اس کا پیٹ پکڑے بیٹھی تھی ——— ساتھ کئی عورتیں اس کا سر، ہاتھ، پاؤں دبا رہی تھیں ——— زچہ کا پلنگ ایک تاریک کونے میں تھا اور اس کے علاوہ کئی اور پلنگ بھی کھیسوں سے سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قسم قسم کے خوبصورت برتن، اور آئینوں سے آرائش اس حد تک تھی کہ دیوار بمشکل نظر آتی تھی ——— یہ محل تھا۔

زچہ تیس پینتیس سالہ عورت تھی اور اپنے علاقے کے تمام زیورات سے مزین ——— اگر اس کے درد نہ ہو رہا ہوتا تو کافی اچھی معلوم ہو سکتی تھی۔

میں نے مائی سے مخاطب ہو کر کہا کہ مریضہ کو فوراً اس ٹھنسے اور گھٹے ہوئے کمرے سے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے۔

مائی نے عورتوں کے سامنے تجویز رکھی اور ہڑبڑا سا مچ گیا۔ انگلیاں ناکوں اور دانتوں پر پہنچ گئیں ——— اور اس ہڑبڑ میں بڑی ملکنی ہانپتی ہوئی آ گئیں۔

میری تجویز ایوان کی متفقہ رائے سے مسترد ہو گئی، کیونکہ اس قسم کا کمرہ ہر گھر کا محل کہلاتا ہے اور ضروری ہے کہ گھر کی بہو اس جگہ اپنے بچے کو جنم دے۔

"عورتیں کمرہ خالی کر دیں" یہ میری دوسری تجویز منظور ہو جاتی تب ——— لہٰذا میں نے مائی سے کہا کہ وہ زچہ کے پائنتی کھیس

کی اوٹ کر کے کھڑی ہو جائے تاکہ میں مریضہ کا معائنہ کر سکوں۔

پہلی زچگی تھی۔ مریضہ نے بتایا کہ "بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ دن پورے ہوئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کبھی نو مہینے پورے ہی نہ ہوئے۔ ایک فقیرنی کہتی تھی، ایک جان رہے گی، ماں یا بچہ۔ میم صاحب دونوں کو بچا دیں گی، بڑا انعام دیں گے، خوش کر دیں گے۔" مریضہ درد اور خوف سے سفید ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ سن کر ممنونیت سے مریضہ کے آنسو نکل آئے اور ناک سے رطوبت بہہ آئی۔ رومال سے اس کے آنسو پونچھنے کے بعد ناک پونچھنے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ ہیرے کی بڑی بڑی کیلوں سے دونوں نتھنے ڈھکے ہوئے تھے۔

میں نے دینے کو تسلی دے دی مگر یہ قصہ سن کر خود پریشان سی ہو گئی ——— بچی کی اولاد ذرا مشکل سے ہوتی ہے اور پھر زچہ کو درد بھی بڑے بے ڈھنگے تھے ——— اور بچے کے قلب کی حرکت سست۔ میں نے اللہ میاں سے دعا کی کہ عزت رکھ لینا ——— ورنہ واپسی کے لیے کیڈی لاک تو کیا خاک بنے گی۔

رات آ گئی اور عورتیں بدستور آپس میں بولتی رہیں ——— اور باری باری مریضہ کا جسم دباتی رہیں۔ مائی نے ایک دفعہ چپکے سے کہا کہ میں بھی مریضہ کا پیٹ پکڑ لوں کیونکہ عورتیں کہتی ہیں، یہ ڈاکٹرنی مفت خوری ہے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے ——— میں نے مائی کے حکم کی تعمیل کی۔

جب مریضہ زور سے کراہنے اور ہونٹ کاٹنے لگی تو میں نے سب عورتوں سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن کئی عورتیں لیکن اور پلنگ کے پاس دوائیں رکھ دیں اور سب مل کر زچہ کو اٹھانے لگیں تاکہ وہ اینٹوں پر اکڑوں بیٹھ جائے۔

"بسم اللہ، خیر اللہ" مریضہ ان کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور میں یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے چیخ پڑی۔

"سب چھوڑ دو، بھاگ جاؤ یہاں سے، تم لوگ اسے مار ڈالو گی۔" عورتیں اس مداخلت پر پھر بڑبڑانے لگیں۔ مائی نے مریضہ کو بانہوں سے پکڑ کر لٹا دیا ——— اور مجبوراً بغیر کسی اوٹ کے بچہ سب کے سامنے ایک کمزور سی آواز میں رونے لگا۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا اور باہر سے جتنی عورتیں اندر آ سکتی تھیں آ گئیں باقی دروازے میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس وقت زچہ کی حالت نازک ہے۔ میں نے بلیڈنگ کم کرنے کے لیے اسے انگلشی کمبلوں کے ٹھوکوں کے درمیان دیا۔ سوئی دیکھ کر کئی عورتیں دور سے کراہ اٹھیں۔ زچہ کو غش آ گیا تھا۔

اچانک باہر بندوقوں کے فائر ہونے لگے اور پھر ڈھول نفیریاں بجنے لگیں ——— اس کے بعد رسموں اور شگونوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی بار میری توجہ زچہ و بچہ کی طرف سے ہٹ ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ ساری چیزیں دلچسپ تھیں، مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس گھر کے تمام حاضرین کا رویہ ابھی تک میرے لیے دوستانہ نہیں تھا، حالانکہ میں نے کئی رسموں میں دوسری عورتوں کی دیکھا دیکھی روپے بھی دیے۔ لیکن چونکہ مجھے قدم قدم پر زچہ و بچہ کی زندگی کی خاطر ان سے جھگڑنا بھی پڑتا تھا اس لیے میری دلچسپی بھی اوپر ہی اوپر گئی۔

رات بھر ڈھول بجا، زچہ کو پوری نیند لینا چاہیے تھی کیونکہ اسے بخار تھا مگر وہ خود اس ہنگامے میں اتنی دلچسپی محسوس کر رہی تھی کہ میں بے بس ہو کر سونے کی کوشش کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

صبح جب میں ناشتے کے لیے، ملک صاحب کے بلاوے پر چیک میں گئی تو میرے بھائی نے بتایا کہ باہر بھی رات آتشبازی چھوٹی، اور ملک کے سینکڑوں ہزاروں نے ناچ گا کر صبح کی، اور ملک صاحب کو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں بڑی نذریں ملیں ——— میں اس نذروں والی رسم پر کافی حیران ہوئی۔

لیکن دوسرے دن میری حیرانی شدید خوف میں تبدیل ہو گئی جب کہ وہ واقعہ ہوا۔

ایک تو سردی کا زمانہ اس پر سے سویرے ہی سے بادل آنا شروع ہو گئے ——— میں نہانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے اپنے جسم پر منوں غلاظت چپٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ——— یہ تو میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ اس گھر میں میری سب سے تناتنی ہے اس لیے میں نے نہانے کے لیے گرم پانی کسی سے طلب نہ کیا ——— رات بھر کی جگائی کے بعد بخار کی شدت میں تھوڑی سی نیند لینے کے بعد جب زچہ نے میری طرف کروٹ لی اور اس کی آنکھیں ہیروں کی کیلوں کے ساتھ چمکیں تو میں نے اس سے کہا کہ کیا نہانے کے لیے گرم پانی مل جائے گا۔

"بسم اللہ ضرور نہاؤ جی" اور پھر اس نے مسکرا کر بچے کو گھیرے بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک سے کہا کہ بھاگ بھری سے کہو میم صاحب کے لیے پانی گرم کر دے۔

زچہ کو انجکشن دینے کے بعد میں نے مائی سے کہا کہ سوٹ کیس سے میرے کپڑے نکالے۔

"کپڑے تو جی تمہیں میم صاحب ہم انعام میں دیں گے" زچہ نے میٹھی ادا سے مسکرا کر کہا۔

اور مجھے بہت برا لگا، خدا جانے یہ گنوار ملکنی مجھے کوئی دائی خدمتگار سمجھتی ہے جو بیٹا جننے کی خوشی میں جوڑا دے گی۔

"ہم ڈاکٹر ہیں ملکنی، اپنی مقررہ فیس لیتے ہیں جوڑے نہیں" میں نے غرور سے منہ بنا کر جواب دیا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میم صاحب تم نے ہماری خدمت کی ہے، پھر ہم تو سبھی کو کچھ نہ کچھ دیں گے ——— اللہ نے یہ دن دکھایا ہے"

"اچھا اچھا میری مائی کو دے دینا میں تو ———"

اتنے میں ایک دس بارہ سال کی لڑکی بھدر بھدر بھاگتی اندر آ گئی ——— خوب تندرست، چھپٹی سا رنگ، ماتھے پر سیں گندھی ہوئی بینڈھیوں کی محراب، کانوں میں چاندی کے بندے ——— یہ بھاگ بھری تھی۔

"ہم اسے بھی جوڑا دیں گے، بیٹا جو ہوا ہے" زچہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اور بھاگ بھری مجھے دیکھ کر ایک دم شرمانے لگی۔

"پانی رکھ دیا بھاگ بھری، میم صاحب کو غسلخانے لے جاؤ" زچہ نے اس سے کہا ——— اور میں نہانے چلی گئی۔

نہاتے ہوئے میں جھلا جھلا کر سوچتی رہی کہ کیسے لوگ ہیں، کسی کی پوزیشن تک کو نہیں جانتے ——— جوڑا دے گی مجھے، ہنہہ!

جب میں نہا کر سر پر تولیہ لپیٹے نکلی تو گیلے بال سکھانے کے لیے صحن میں بیٹھ کر آتی جاتی دھوپ میں سستانے لگی۔ بھاگ بھری نے گھر کے کسی کونے سے مجھے دیکھا اور دوڑ کر مٹی کے کنگوروں والی انگیٹھی لا کر میرے پاس رکھ گئی۔ اس وقت بھاگ بھری میرے دل کو بھا گئی۔

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ عورتوں پر عورتیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ اس وقت پھر گانے بجانے کا پروگرام تھا۔
اچانک ملک صاحب کھانستے کھنکارتے زنان خانے کی طرف آئے ——— مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھا، زچہ و بچہ کے بارے میں دو ایک باتیں دریافت کیں اور پھر بڑی ملکنی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ باہر چلے گئے۔
"بھاگ بھریئے! بھاگ بھریئے ملک جی نہائیں گے، تولیہ باہر غسلخانے میں رکھ آ۔" بڑی ملکنی نے حکم دیا۔
اور بھاگ بھری اسی طراری سے بھدر بھدر بھاگتی مردانے غسلخانے کی طرف چلدی۔
گانے بجانے کی تیاریوں کو دیکھ کر میں بور ہونے لگی ——— میں اطمینان سے سوچنا چاہتی تھی ——— میرے خیال میں زچہ کو بھی سکون سے سوچنا چاہیے تھا، لیکن کوئی بس نہ چلا ——— میں نے اس وقت سوچا کہ کسی مغربی مصنف کا قول ہے کہ دیہات صحت بخش قبریں ہیں، مگر میرے اللہ یہ قبریں کتنی پُرشور ہیں، کتنی صحتمند ہیں، کتنی لاشیں ہیں ——— کتنی یکسانیت ہے ——— میں تو ہوں ہی شہر کا کیڑا، مگر شہر جا بلد کر کہہ دوں کہ شہر کے مرکز یا کسی تنگ کوچہ میں لے آؤ تو، مراقبے میں جا کر جان دے دیں ——— میں نہایت تلخی سے سوچتی رہی، سوچتی رہی، مجھے اپنے روز کے دو سو روپوں کا خیال تک نہ آیا ——— اور پھر جیسے موت کے مراقبے میں جھونک کھا گئی۔ درحقیقت مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔
اچانک بھاگ بھری روتی، گھسٹتی میرے پاس سے گزری، اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا ——— دفعتاً وہ ڈگمگائی اور زمین پر گر گئی۔ اس کا نیلا تہمد خون کے دھبوں سے لال ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر اسے اٹھانے لگی ——— کائیں کائیں شروع ہو گئی اور پھر ایک دم باورچی خانے سے ایک عورت روتی ہوئی آ کر مہین سُریلی آواز میں رونے بین کرنے لگی ——— یہ بھاگ بھری کی ماں تھی۔
بھاگ بھری نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔
"مائے! ملک جی! مائے!!" بھاگ بھری نے ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں پھر زور زور سے بین کرنے لگی۔
ظاہر ہے کیا ہو چکا تھا ——— میں ایک کنواری لڑکی بن کر دہشت سے کانپ رہی تھی۔ تمام عورتیں اکٹھی ہو گئیں ——— مائی مائی دوبارہ ٹوہ لینے باہر چلی گئی ——— میں سن سی بیٹھی رہی۔
تھوڑی دیر بعد ذرا سی خاموشی طاری ہو گئی۔ زچہ اب تک آنکھیں پھاڑے باہر کی آوازوں پر کان لگائے پڑی تھی ———

جب مائی باہر سے آئی تو اس نے چپکے چپکے مجھے قصہ مختصر کر کے سنایا کہ بڑی ملکنی بھاگ بھری کی ماں کو روک رہی تھی کہ بچے والے گھر میں رونا مت ڈالو ——— لیکن جب وہ اپنی بچی کی حالت کے بین ہی کرتی گئی تو بڑی ملکنی آپے سے باہر ہو گئیں کہ تیری لڑکی خود ستائی ہوئی ہے، تولیہ رکھ کر وہاں رکی کیوں؟ مرد ہے کیا کرے ——— اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت کی دہائی دینے والی آئی، وہ دن بھول گئی جب تیرا خاوند کھیتوں پر بھوتا اور تو ملک جی کی بیٹھک میں ——— اس پر بھاگ بھری نے رو رو کر اپنی ہم چشموں سے فریاد کی، تو بڑی ملکنی اور بھی جل گئیں کہ دیکھیں کون ہیں مریم بیبیاں، جنھیں تو پکار رہی ہے ——— اس پر

وہ دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی ——— جاگ بھری کی ماں جب رونے سے باز نہ آئی تو بڑی بکی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا، جاتے ہوئے وہ جاگ بھری کو لے جانا چاہتی تھی، مگر جواب ملا "نہیں جائے گی، آج کام بہت ہے حویلی میں ——— سب رشتے ناطے والے جمع ہیں ——— ایسی کون سی موت آ رہی ہے جاگ بھری کو ———"

"اسے بی، لونڈیا خون میں تر بتر ہے، تو بہ میری، کیسے بے وقوف لوگ ہیں، خواہ مخواہ جاگ بھری کی ماں کو اور غصہ دلایا، وہ ایسے غصے میں گئی ہے کہ پولیس لائے گی، دیکھ لینا" مائی نے "ختم شد" کے طور پر ایک زوردار آہ کھینچی اور سوچ میں غرق ہو گئی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے زچہ کی طرف دیکھا، وہ خاموش اور سنجیدہ بنی پڑی تھی۔ اس کے پیٹ میں اس کا منتوں مرادوں کا پہلا بچہ گنڈوں تعویذوں سے گزرا پڑا تھا ———

میں نے سوچا اف انسان کے ساتھ یہ شیطان کیوں لگا ہوا ہے، اب یہ پہلا بچہ دیکھو اور باپ کے لیے جیل کا دروازہ کھلا ہوا ہے ——— خیر چاہے مجھے زچہ پر کتنا ہی رحم کیوں نہ آئے، میں تو یہی گواہی دوں گی ——— بھلے ہی مجھے دو سو روپے روز کے نہ دھول ہوں ———

اس کے بعد باہر صحن میں زور زور سے ڈھول ڈھمکنے لگا اور کسی گیت کے بول گونجنے لگے۔

میں اس موقع پر ڈھول کی آواز سے بول گئی ——— گیت کے بول سن کر اداس میٹھی ہوئی زچہ کو جیسے ہوش آنے لگا، اور اس نے مینڈھیوں سے گتھا ہوا سر آہستہ سے پیچھے پر جھکا دیا اور اسے ہوئے سے چوم کر موہوم طریقے پر مسکرائی ——— ایسی مختاط مسکراہٹ جیسے وہ مکڑی کے جالوں جیسی ہو، اور وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں کوئی تار ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے ایک آہ بھر کر کہا۔ بچے کی قسمت بھی کیسی ہے ———

"نصیبوں والا ہے، جیوے میرا لال" زچہ نے چونک کر جواب دیا ———

میں نے سوچا مجھے بچے کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی، ماں کا دل بڑی سے بڑی مصیبت اور تباہی کی ذمہ داری بھی اپنے بچے پر نہیں ڈالے گا ——— مگر پھر بھی میں نے اپنی قانون دانی سب کی سب اس کے سامنے اگل دی۔

وہ تعجب اور خوف سے آنکھیں پھاڑے میری باتیں سنتی رہی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر مسکرانے اور بچے کو چومنے لگی ———

بخار سے یا نہ جانے کیا سوچ کر زچہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ——— میں خاموش ہو گئی۔

حویلی کی انگنائی میں ڈھول کے ساتھ گیتوں کے بول ابھرتے رہے ———

ایک عورت اندر آئی اور اس نے زچہ پر جھک کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکی ——— وہ چلی گئی۔

میں نے زچہ کا ٹمپریچر لیا بخار اور بھی تیز ہو گیا تھا ——— بچے کو بھی بخار تھا ——— میں اب یہاں سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ میں دوائیں دے کر رخصت ہو جاتی، مگر مجھے اپنے پاؤں میں ایک زنجیر سی بندھی معلوم ہو رہی تھی ——— ظاہر ہے یہ زنجیر کون سی تھی۔

ذرا دیر بعد وہی عورت آئی جو ذرا قبل زچہ سے کھسر پھسر کر گئی تھی ——— اب کی اس کے ساتھ جاگ بھری تھی۔ ——— جاگ بھری کی آنکھوں میں وہ شرم نہیں تھی جو میں نے پہلی بار اس کمرے میں آتے دیکھی تھی ——— وہ کواڑ کا سہارا لیے

چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میم صاحب اس کا بھی علاج کر دو۔" بچہ نے میری طرف لجاجت سے دیکھ کر کہا ——— اور میں اس دیہاتی جاگیردارنی کی عظمت کے سامنے سناٹے میں آ گئی۔

جاگ بھری کی تکلیف کا جو بھی مداوا ممکن تھا، وہ میں نے کیا۔ جاگ بھری اس وقت کتنی بے حس ہو رہی تھی۔

ایک دن اور گذر گیا ——— دودھ اترنے کی وجہ سے بچہ کا بخار بہت زیادہ تیز ہو گیا، وہ بار بار غافل سی ہو جاتی ——— لیکن اسی دن میں واپس چل دی ——— شاید میں بچہ کی حالت دیکھ کر ایک دن اور رک جاتی، لیکن اسی دن جاگ بھری میں میری مائی کا شدید اصرار شامل تھا ———

قصہ یوں ہوا کہ میں صبح صبح اپنے بھائی کے ساتھ قیمتی صوفوں سے سجے ہوئے دیوان خانے میں مرغ اور پراٹھوں کا ناشتہ کر رہی تھی، اور ملک صاحب مجھ سے بچہ کی خیریت پوچھ چکنے کے بعد باہر دھوپ میں اپنے مرغوب پوز میں دھوپ لے رہے تھے، اور ان کے شکاری کتوں کو صبح کا راتب تقسیم ہو رہا تھا ——— قریب ہی کہیں ڈھول نفیری نگاڑے بج رہی تھیں، اور اس لمحے میں نے طے کیا کہ دو ایک دن اور رہنا چاہئے ایسے ہی رہے ہیں۔

اس لمحے کے بعد قریب کے ایک مکان کی اوٹ سے نکل کر جاگ بھری کی ماں آتی نظر پڑی۔ جارجٹ کی دھوپ میں اس کا سیاہ تھوڑا سرخ لمبا کرتہ اور گہری زرد چادر چمک رہی تھی۔ وہ دھیمی چال سے چل رہی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا تھال تھا جو گوٹا لگے سرخ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا ——— اس کے پیچھے اور بھی کئی عورتیں تھیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ سر پر اٹھائے ہوئے تھیں اور مرد بھی تھے، بعض ناچ رہے تھے اور بعض ڈھول نفیریاں بجا رہے تھے ——— جاگ بھری کی ماں کی قیادت میں یہ جلوس بالکل قریب آ گیا، اب پر جھگڑتے ہوئے کتے بھونکنے لگے۔ ڈھول کی دھم دھم اور اچکتے پھاندتے مردوں کی باڈی ہو سے ملک صاحب کے ہاتھ پر بیٹھا ہوا باز ایکدم اڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا ——— اور سب کے بعد اکڑتے بڑتے گھوڑے کی لگام ایک شخص کی طرف اچھال کر تھانیدار ملک صاحب کی طرف بڑھا ———

حویلی کی ڈیوڑھی سے عورتیں سیلاب کی طرح باہر آ گئیں۔ بہت سی ریشمی کپڑوں والیاں دیوان خانے میں بھی گھس پڑیں۔ میرا بھائی گھبرا کر باہر نکل گیا اور میں نے عورتوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے دیکھا کہ جاگ بھری کی ماں نے تھال اتار کر ملک صاحب کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

"بچے کے کپڑے آتے ہیں" کا شور اندر سے باہر تک برپا تھا ——— میں ایکدم اندر مائی کو ڈھونڈنے بھاگی۔ آنگن خالی تھا ——— زچہ خانے میں زچہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور جاگ بھری کی بیڈھیاں اس کے ہاتھ میں تھیں ——— اور اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ درد زہ میں مبتلا ہو ——— مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

"بدیر نے پانی بستر پر گرا دیا۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اس کا چہرہ ایکدم یوں پرسکون اور آسودہ ہو گیا جیسے وہ ابھی ابھی بچہ جن کر فارغ ہوئی ہو ——— جاگ بھری کے دونوں گالوں پر انگلیوں کے سفید نشان ابھرے ہوئے تھے اور بستر پر کہیں پانی کا نام تک نہ تھا۔

میں نے جلدی سے مائی کو ڈھونڈ کر اس سے کھسر پھسر کی، وہ شدت سے میری ہم نوا ہوئی اور ہم فوراً چلنے کو تیار ہو گئے۔
ـــ مجھے ان لمحات میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں اکیلے گھر میں ہوں، ایسے گھر میں جس کی دیواریں گر چکی ہوں۔

گھر پہنچ کر تین دن کے چھ سو روپے والدہ کے ہاتھ پر رکھتے ہی بڑے زور کی بحث شروع ہو گئی، صحیح یا غلط؟ مطلب یہ کہ میں نے فوراً چلے آنے میں حماقت کی یا نہیں۔ والدہ کہتیں بالکل ٹھیک کیا۔ بھائی کہتا خواہ مخواہ گھبرا کر بھاگیں۔
اس سے پہلے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہو، میں یہ بات بتا دوں کہ کرنٹ ٹوپی کے جس جلوس کی قیادت جاگ بھری کی ماں کر رہی تھی، وہ تھانیدار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔

آندھی میں چراغ

ممتاز شیریں

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے پوچھا "کون؟" اور اپنے پتی کی آواز سن کر اس نے چٹخنی کھول دی۔ وہ اندر آگیا اور اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ تھکا تھکا ہوا تھا وہ۔ اس کے پسینے میں تر بالوں کے گچھے سے بن رہے تھے۔ جتنا جلدی اس کے تھکے ہوئے بوجھل، بھاری پاؤں اور پھولا ہوا پیٹ اسے لے جا سکتے تھے، وہ اندر گئی اور گھڑے میں سے پانی نکال کر لے آئی۔ وہ پانی ڈالتی جا رہی تھی اور وہ ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے گرم چہرے پر پانی کی ٹھنڈک اسے ایسی بھلی لگ رہی تھی کہ وہ چلو میں پانی بھر بھر کر منہ پر اچھالنے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس سے اسے فرحت محسوس ہوئی اور وہ محبت اور تشکر کی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے چارپائی پر جا بیٹھا اور وہ اسے کھانا دینے کے لئے تخت بچھانے لگی۔

"رہنے دو نیلا میں کچھ دیر بعد کھاؤں گا۔ یہاں بیٹھو۔ کچھ دیر۔"

"نہیں، پہلے کھاؤ، بعد میں باتیں ہوں گی۔" اس نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ تخت پر بیٹھ گیا۔ کھانا پروس کر وہ پھر رسوئی میں گئی، اچانک اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں ایک تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ انت نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اور جلدی سے ہاتھ دھو کر رسوئی کی طرف بھاگا۔ "کیا ہوا نیلا، نیلا کیا ہوا تمہیں؟" وہ اس پر جھک گیا۔

"نہیں تو، کچھ بھی نہیں، یونہی چکر آ گیا تھا۔ ایسے دنوں چکر آ ہی جایا کرتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔" لیکن انت نے اس کے چہرے کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی تسلی کے لئے وہ کہہ رہی تھی "کوئی بات نہیں تم جا کر کھانا کھاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں نیلا۔" وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔

نیلا کے پھر درد اٹھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا تاکہ انت اس کے چہرے پر کرب کے آثار نہ دیکھ لے۔ لیکن انت نے نیلا کو نہایت احتیاط اور نرمی سے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اور اندر چارپائی پر لٹا دیا۔ پاس کی

کھڑکی کے نیچے کے پٹ بند کر کے اس نے بوسیدہ کمبل نہایت احتیاط اور نرمی سے اُڑھا دیا۔ نیلا نے پھر کہا ..... "اب مجھے آرام ہے۔ تم جاؤ کھانا کھا لو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے نیلا!" وہ نیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چارپائی پر بیٹھ رہا۔ وہ اپنی بیوی کو تکے جا رہا تھا۔ پریشان، دکھ بھری نظروں سے۔ نیلا بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پرستش تھی اور محبت تھی۔

ان کے جسموں میں کوئی کشش نہ تھی۔ انت کا سوکھا ماڑا جسم ایک بوسیدہ سی ڈھیلی ڈھالی قمیص اور دھوتی میں چھپا ہوا تھا۔ اور نیلا کا پیٹ ہمیشہ پھولا رہتا تھا۔ وہ موٹی موٹی میل خورے رنگوں کی ساریاں پہنے رہتی تاکہ چولھے کے پاس کام کرنے سے جو میل پیدا ہوتا ہے وہ دکھائی نہ دے وہ کنگھی چوٹی کئے بغیر دن بھر کام میں مصروف رہتی تھی ——— وہ خوبصورت نہ تھے۔ نوجوانی میں جو کچھ ذرا سی کشش بھی ان میں تھی۔ وہ بھی مفلسی نے چھین لی تھی۔ انت کا سانولا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کے گال اندر دھنس گئے تھے۔ نیلا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی عمر صرف تیئیس سال تھی لیکن وہ ادھیڑ دکھائی دینے لگی تھی۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ یہ کشش ظاہری حسن اور جمالی کشش سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

ماں باپ اور نہ جانے ایک دن ان کا سمبندھ کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ نیلا جانتی تھی پتی کی پرستش کرنی چاہیے اس کی خدمت کرنی چاہیے اور وہ اس کی پرستش کرنے لگی، خدمت کرنے لگی۔ انت جانتا تھا کہ ایک کمزور سی چیز اس کے سپرد کی گئی ہے اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے، اس کا ہر طرح خیال رکھے اس کے لئے کمائے، اسے سہارا دے، اور اسے چاہے۔ یہ کمزور سی چیز جو ساری زندگی اس کا ساتھ دے گی، اس کا گھر سنبھالے گی، اس کے بچوں کی ماں ہو گی، اس طرح ان کے دل مل گئے وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ اور برسوں کی رفاقت نے ان کی محبت کو گہرا کر دیا تھا۔ برسوں کے ساتھ نے اور ان ننھے ننھے بچوں نے ان کے درمیان دلوں کے اس ملاپ کو مضبوط کر دیا تھا ———

بچے جو اب تک باہر کھیل رہے تھے، ناچتے کودتے اندر آ گئے۔ "ماں بھوک لگ رہی ہے، ماں!" اس نے اٹھنا چاہا۔ انت نے اسے زبردستی لٹا دیا۔ "نہیں تم سو جاؤ، میں ان سب کو کھانا دے لوں گا۔" بچوں کو حریص نگاہوں سے کھانے کو تکتے اور بڑے بڑے نوالے بنا کر کھاتے دیکھ کر اور انت کو بے ڈھنگے پن سے پروستے دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ زور سے نہ ہنس سکی۔ اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں پھر اچانک وہی درد اٹھ رہا تھا۔ اس نے منہ موڑ لیا۔ لیکن انت نے اس کی آنکھوں کا کرب دیکھ لیا تھا۔ وہ بچوں کو چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔

"نیلا کیا تکلیف ہے تمہیں؟" اس نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ..... کہ مجھے ..... مجھے درد شروع ہو گئے ہیں" اس نے رک رک کر جواب دیا۔

"نیلا تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تمہیں ....."

"نہیں ابھی آٹھواں مہینہ ہی تو ہے، جانے کیوں ابھی سے ———"

"میں تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔" نیلا نے وہ اپنا بوسیدہ کوٹ پہن کر تانگہ لانے چلا گیا۔ بچوں نے بھی ماں کو پریشان دیکھ کر

جلدی جلدی کھانا کھا لیا اور سب چارپائی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ "تھالا جی اچھا نہیں ماں؟ کیوں چھو لی ہو ماں؟ بکھال ہے؟" "ماں دلدر دور ہے۔" "کہاں؟ میں چوم لوں تو اچھا ہو جائے گا نا؟" اور سب سے چھوٹا بچہ اسے چومنے لگا۔ اس کے پیٹ کو اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کو اس کے پیروں کو اس کے سینے میں مسرت جاگ اٹھی۔ کتنا پیار کرتے ہیں اسے۔ اس نے ننھے کو اٹھا کر خوب چوما اور پھولوں میں لٹا لیا۔ آخر اس نے زندگی میں کیا سکھ پایا تھا۔ جنسی بھوک، مصیبتیں، اور پھر چین آرام نصیب نہیں۔ لیکن بچوں کی یہ محبت شوہر کی یہ رفاقت، یہی تو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔

تانگہ آ گیا تھا۔ انت بچوں کو چمکار کر ہمسائی کے ہاں چھوڑ آیا۔ "دیکھو میں کل صبح نہیں لے جاؤں گا۔ اور تم ایک ننھا سا گڈا دیکھو گے۔ تھا رانتھا جاتی۔ گڈے کا سا۔" اس نے نیلا کو اپنے بازوؤں پر اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ خود تیزی سے اٹھ کر تانگہ میں جا بیٹھی.....

میٹرنٹی وارڈ اس اوپر تھے اور سیڑھیاں بہت اونچائی تک چلی گئی تھیں۔ نیلا کے قدم ڈگمگا گئے۔

"میرا سہارا لو نیلا" انت نے کہا۔ پھر خود ہی اسے اپنے بازو سے تھام کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ چار پانچ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد پھر وہی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی اور اس نے اپنے چہرے کا کرب چھپانے کے لئے اپنا سر انت کے کندھے پر ڈال دیا۔

وہ لیبر وارڈ میں بڑی انتظار کرتی رہی۔ اب درد وقفوں کے وقفے سے درد اٹھ رہا تھا۔ پیٹ میں۔ ریڑھ کی ہڈی کے زیریں حصے میں کولہوں میں اور ہر دفعہ یہ درد شدید تر ہوتا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو زور سے کاٹ لیتی۔ چیخوں اور کراہوں کو روکنے کے لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ انت اس کی چیخوں کو سنے وہ جان لے گا کہ اسے بے انتہا تکلیف ہو رہی ہے اور.....

اور انت بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس پر ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگا پھر بنچ پر آ کر بیٹھ جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورتا پھر خود سے کہنے لگتا۔ "اے اندر سے تو کوئی آواز بھی نہیں آ رہی..... لیبر وارڈ تو ہمیشہ چیخوں سے گونجتا رہتا ہے۔ کہیں..... اتنی کمزور تھی وہ۔ کیا اس سخت آزمائش سے بچ نکلے گی؟" اور ایک ناقابلِ بیان درد نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔ سر جھکا کر اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک چھوٹی سی دعا مانگی پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر نیلا اس دفعہ بچ جائے تو وہ کبھی اسے بچہ نہ ہونے دے گا۔ اس نے پھر دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی..... لیکن نیلا ہمیشہ اپنی صبر سے اس زندگی اور موت کی کشمکش کو طے کر جاتی ہے۔ کسی بچے کے وقت اس نے کبھی اس کی چیخیں نہ سنی تھیں۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ بنچ پر جا بیٹھا اور پھر وہی انتظار، اذیت ناک انتظار۔ جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ ان چند لمحوں کی اذیت میں زندگی بھر کی تکلیفوں کا نچوڑ تھا۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں۔ اب کھلے گا..... اب کھلے گا.....

اور اندر نیلا بے ہوش پڑی تھی۔ بچہ بہت چھوٹا تھا۔ اس لئے جلدی پیدائش ہو گئی۔ اس کے نحیف سینے میں رمق بھر جان باقی تھی۔ آنول کاٹتے ہی وہ بچی لے کر خاموش ہو گیا۔ نیلا کو اب ہوش آ گیا تھا۔ اس نے بچے کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔

اس کی کسی چیز ہوئی تھیں نے یہ جان لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ بھی نہیں پوچھا بچہ ہے یا بچی۔ نرس نے اُسے آہستہ سے بتایا بچہ مر چکا ہے اور اسے تسلی دی "آٹھ مہینے کے بچے کبھی زندہ نہیں رہتے اگر اب نہیں تو بعد میں مر ہی جاتا۔" نیلا نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب نرس نے بچے کو اٹھا کر دکھایا تو ایک نظر دیکھا۔ نازک نقش زرد چہرہ لکڑی کی طرح سوکھا جسم۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر ربڑ کی شیٹ پر ڈھلک گئے۔ اور محبت اور مامتا کی وہ گرم گرم دھار جو نئے سرے سے اُمڈ کر اس کے سینے میں بہہ آئی تھی۔ سرد ہو کر منجمد ہو گئی۔

دروازہ کھلا۔ نرس باہر آئی۔ انت اُٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح نرس کو گھورنے لگا۔ اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اور نرس نے بتایا بچہ مر چکا ہے۔ بچہ کا خیال اسے بالکل نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں یہی خیال پھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ کاش نیلا بچ گئی ہو اور اسی پاگلوں کے سے انداز میں اس نے نرس سے پوچھا "اور میری بیوی؟" نرس نے شاید یہ نہیں سنا۔ وہ کہہ رہی تھی "آٹھ مہینے کے بچے نہیں جیتے۔ اب نہیں تو کبھی نہ کبھی مر ہی جاتا۔ اس کی اتنی فکر نہ کرو۔ ....." اور وہ واقعی پاگل ہو گیا۔ وہ نرس کو جھنجھوڑ کر چیخا "اور میری بیوی؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے میں گھسنے لگا۔ نرس نے اسے ڈانٹا "کہاں جا رہے ہو تم ابھی اندر نہیں جا سکتے۔ کافی لے آؤ اپنی بیوی کے لئے۔" بیوی کے لئے کافی! فرطِ مسرت سے اس کی چیخ نکل گئی پھر اسے گردوپیش کا خیال آیا۔ وہ جلدی باہر نکل آیا اور قریب کے ہوٹل سے کافی لے آیا۔

وہ نڈھال پڑی تھی۔ اس نے کافی اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا "نیلا کیسی ہے طبیعت تمہاری؟"

"اچھی ہوں۔ صرف کمزوری ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس دفعہ کمزوری کی وجہ سے تکلیف زیادہ ہے۔"

دوسری صبح کو بھی نیلا بے حس نڈھال پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلدی کی چھوٹ تھی۔ جیسے اس کے جسم سے سارا خون چوس لیا گیا ہو۔ اس نے اس پر جھک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کتنا سرد تھا وہ ہاتھ۔ اس نے آہستہ سے پکارا "نیلا!" نیلا نے آنکھیں کھولیں اور بمشکل سر موڑا۔ اسی لمحے نرس اور لیڈی ڈاکٹر وارڈ میں آ گئیں۔ وہ نیلا کا ہاتھ چھوڑ کر الگ جا کھڑا ہوا۔ نرس نے نیلا کے انگوٹھے میں سوئی چبھو کر خون نکالا۔ بہت دبانے پر خون کا ایک ننھا سا قطرہ بمشکل نکلا اور اس نے اس قطرے کو کاغذ پر چپکا کر لال دھاریوں والے کاغذ کے ساتھ لگا کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا "کتنا؟" "پندرہ فی صدی" نرس نے جواب دیا۔

"پندرہ فی صدی؟" ڈاکٹر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے انت کو باہر بلایا "تم جانتے ہو تمہاری بیوی کی کیا حالت ہے، اس کے جسم میں قطرہ بھر بھی خون نہیں۔ جانتے ہو اس کے خون میں کتنا ہیموگلوبن ہے۔ پندرہ فی صدی! تم مرد، خود غرض مرد، تم کیا جانو اس پر کیا گذرتی ہے۔ تمہیں اپنی پڑی رہتی ہے ہمیشہ۔ شادی کر لینا اور پھر ہر سال ایک بچہ پیدا کرنا۔ تمہیں کبھی معلوم ہے تم لوگوں کو کچھ اپنی بیوی کا بھی خیال کیا؟ حمل کے دنوں میں اسے دودھ اور پھل دیتے ہوتے۔ ٹانک پلاتے ہوتے۔ لوریکس ٹیکٹ انجکشن دلواتے ہوتے۔ ستر چھتر فیصدی ہیموگلوبن بھی ہو تو اس حالت میں عورتیں ٹانک پیتی ہیں، انجکشن لیتی ہیں زچہ اور خون میں پندرہ فیصدی ہیموگلوبن!" اور پھر اس نے دانت پیس کر کہا "اور تم لوگ صرف یہ خوب جانتے ہو کہ جب وہ موت کے منہ میں پہنچ جائے تو اسے

ہسپتال میں لاکر ٹپک دیا جائے۔" وہ نیلا کو نہیں چاہتا؟ نیلا کا خیال نہیں رکھتا ڈاکٹر کا ہر جملہ ہتھوڑے کی ضرب بن کر اس کے دل پر پڑ رہا تھا..... پھل اور دودھ اور ڈاکٹر۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو کیا وہ ان چیزوں کا ڈھیر نہ لگا دیتا۔ نیلا کے لئے! اور اب نیلا کے جسم میں قطرہ برابر خون نہیں، نیلا موت کے منہ میں ہے..... پھر ڈاکٹر کی آواز کچھ دھیمی پڑ گئی "سنو! اسے بہت سے ڈیکسٹرٹیٹ انجکشن دینے پڑیں گے اور ہر انجکشن کی قیمت اڑھائی سے تین روپے ہے۔ کیا تم ادا کر سکو گے ان کی قیمت؟" اس سے اس کا جی چاہا کہ ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لے اور کہے "میں کسی طرح ادا کر دوں گا ڈاکٹر! بس تم میری بیوی کو بچا لو۔"

اور ہسپتال کا بل چکانے کے لئے اس نے قرض لیا۔ دفتر کو بس میں جانا چھوڑ دیا۔ سینے سگریٹ بھی پینے ترک کر دئے۔ ان چند ٹکوں سے وہ نیلا کے لئے پھل خرید لے جاتا۔ نارنگیاں اور سیب، لیکن چھوٹے سے چھوٹا سیب بھی چار آنے میں آتا تھا..... اور نیلا کو دن میں تین چار بار انجکشن دئے جاتے۔

لیکن وہ برابر نڈھال پڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا جا رہا تھا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اتنے سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ربر کے ماسک سے چڑھائے جاتے، اور گرم پانی کی بوتلیں اس کے پاؤں کے نیچے رکھی رہتیں اور وہ اس کے پلنگ کے قریب بیٹھا گھنٹوں اسے تکا کرتا اور نیلا کی نگاہوں کا کرب اس کی آنکھوں میں منتقل ہو جاتا۔ لیکن وہ اس کرب کو نیلا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا "تم اچھی ہو جاؤ گی۔ نیلا۔ ضرور۔ اور میں تمہیں قینچی ٹانک لا دوں گا۔ اور پھل اور دودھ، تم تندرست ہو جاؤ گی، سچ نیلا میں روپے جمع کر رہا ہوں....." نیلا مسکراہٹ سے اسے تک رہی تھی اور اچانک معلوم ہو جاتا کہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک کبھی کی بجھ گئی ہے۔ اور اس مسکراہٹ صرف اس کی تسلی کے لئے ہے۔ اور اس کا دل خون ہو جاتا۔ جب کبھی وہ بچوں کو لے آتا اور وہ ماں کے پلنگ کے گرد کھڑے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا کرتے تو وہ بچوں کو عجیب سے انداز سے تکتی۔ جیسے خیر پھر ملیں گے کہیں جا رہی ہو۔

اور ایک رات وہ مسلسل کراہتی رہی۔ اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے ان بیسیوں انجکشنوں کا درد کمزوری کی وجہ سے شدید ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلاتی تو درد کے مارے بلبلا اٹھتی۔ اور اس نے نرسوں کی منت کی کہ آج رات اسے یہیں سو جانے کی اجازت مل جائے۔ وہ یہیں کہیں کونے میں پڑا رہے گا۔ لیکن انہوں نے جھڑک کر اسے نکال دیا۔ رات کے نو بجے کے بعد کوئی بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ لیکن نیلا نے دیکھا تھا کہ بازو کے سپیشل وارڈ والی لڑکی کا شوہر رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ تک اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور بھی نرسیں خاموشی سے بند دروازے کا قفل کھول دیتی تھیں اور جب وہ لڑکی بھی اس کے شوہر کو دور تک پہنچا کر خوشی سے جھومتی ہوئی واپس آتی تو نرسیں اسے اندر چھوڑنے کے لئے دروازہ روکے پاس ہی، جو نیلا کے کمرے کے سامنے تھا، کھڑی رہتیں اور ہنس ہنس کر اسے چھیڑتیں "بڑی محبت ہے تم دونوں میں"..... غریبوں کی محبت کو تو کوئی نہیں پہچانتا۔ پہچانے بھی تو پروا نہیں کرتا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کروٹ لی اور درد سے تڑپ کر کراہی۔ وہ رات بھر کراہتی رہی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔ کبھی کبھی چڑچڑاتی ہوئی نرس آ کر اس سے کہتی۔ اتنے زور سے

کراہتی ہے۔ دوسرے مریضوں کی نیند خراب نہیں ہوتی؟" اور وہ اسے نیند کا انجکشن دے کر چلی جاتی اس رات اسے نیند کے کئی انجکشن دیئے گئے۔ لیکن اسے نیند نہ آئی.....

صبح کو وہ بالکل خاموش تھی۔ اب اس میں کراہنے کی بھی سکت نہ تھی۔ انت آیا تو اسے خاموش دیکھ کر سمجھا اب اسے تکلیف نہیں ہے۔ لیکن شام کو لیڈی ڈاکٹر نے نیلا کا معائنہ کر کے مایوسی سے سر ہلایا۔ اور انت کو باہر بلا کر کہا۔ "اب ایک ہی امید ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔

"اس کے جسم میں انسانی خون داخل کرنا چاہیئے۔"

"تو میرے خون کا معائنہ کیجئے۔"

اور اس کے خون کا معائنہ کیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے بہت سے خون کی ضرورت ہے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا خون اس کے جسم میں داخل کیا جائے گا۔ کیا تم اتنا خون دے سکتے ہو؟" ڈاکٹر نے سوچا تھا کہ یہ سوکھا سا انسان! اس کے جسم میں بھی کیا خون ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کے لئے جس کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ شاید خون نہ دے سکے! لیکن انت نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ تم اتنے خون کی پوچھ رہی ہو میری بیوی کو اگر میرا خون بچا سکتا ہے تو تم میرے جسم کا سارا خون چوس سکتی ہو۔"

گرم گرم خون نکالا گیا بائیس سی سی۔ اور انت کا یہ خون جس کی ایک ایک بوند میں محبت کی گرمی تھی، نیلا کے جسم میں منتقل کیا گیا۔ اس کی ساری رگوں میں ہلکی سی گرمی دوڑ گئی۔ اور اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ انت خوشی سے پاگل ہو گیا اس نے نیلا کا ہاتھ، جو اب کچھ گرم سا تھا اپنے ہاتھ میں لے کر کہا..... "نیلا اب تو تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے تمہارے جسم میں انسانی خون داخل کیا جائے تو تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

"انسانی خون؟ لیکن کون دے گا۔ اور میری طرف سے کسی دوسرے کو....."

انت نے ایک نکھری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اب جو انجکشن تمہیں دیا گیا ہے، وہ انسانی خون ہی کا تھا...."

"لیکن، لیکن، کون....." اور پھر وہ جان گئی اور اس نے محبت بھری نگاہوں سے جن میں اب چمک بھی آ گئی تھی، اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر ان نگاہوں میں گلہ پیدا ہوا اور وہ کہنے لگی..... لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے، اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ نیلا پڑتا گیا۔ انت اس پر جھک گیا۔ "نیلا، نیلا" وہ چلایا ——— وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے کان قریب لا کر سنا وہ کہہ رہی تھی "بچے، میرے بچے، میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں" وہ سرپٹ بھاگا اور بچوں کو لے آیا۔ نیلا نے سب بچوں پر باری باری نگاہیں جما کر دیکھا، چھوٹے کو اٹھانا چاہا۔ لیکن اٹھتے ہوئے ہاتھ بے بسی سے گر گئے۔ اس نے بڑی دقت سے کچھ دیر اپنی نظروں کو انت پر جمائے رکھا۔ لبوں پر پھر وہی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ انت پلنگ کی پٹی پر سر پٹک پٹک کر چلانے لگا "نیلا، نیلا" بچے حیرانی سے ماں کو تک رہے تھے وہ چھوٹے بچوں کو سمیٹ کر کرسی پر گر پڑا۔ بڑے بچے بھی باپ کی کرسی کے پاس کھڑے بھیگی آنکھوں سے دیکھتے رہے، موت کا راز ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ نرسیں اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے اس پر سفید چادر ڈال رہی تھیں۔ سفید چادر اور اتنا ہی

سفید چہرہ، کلے بکھرے ہوئے بال۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا گھورتا رہا۔ لیڈی ڈاکٹر بولی "تم اس کی ارتھی کا انتظام کرکے کل صبح اسے لے جا سکتے ہو۔ اس وقت تک نعش نیچے ایک کمرے میں رکھی جائے گی..... اور بل بھی تم کل چکا سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے تمہاری بیوی....." لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا، جیسے اس کے تمام حواس شل ہو گئے تھے۔ لیکن چند اور تیز آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ نعش لے جانے والی نیچی ذات کی عورتیں سٹریچر لئے جا رہی تھیں "جب تک ہمیں پہلے ہی ایک ایک روپیہ نہ دے دیا جائے ہم نہیں لے جائیں گے۔ اور نرس آپس میں باتیں کر رہی تھیں "ہم خود لے جا سکتے تھے۔ لیکن توبہ! اس کا چہرہ کتنا سفید ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے" وہ نیلا کی یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا "شکر ہے میں اونچی ذات کا ہندو نہیں ہوں" وہ نیلا کی طرف بڑھا۔ نرس نے جلدی سے سٹریچر بڑھایا۔ اس نے اپنا ہونٹ کاٹ کر کہا "نہیں اس کی ضرورت نہیں، صرف مجھے وہ نیچے والا کمرہ بتا دو تو مہربانی ہوگی"

اور اس نے اپنے بازوؤں پر نیلا کی نعش کو اٹھا لیا۔ اور وہ نیلا کو لئے اسی زینے پر سے اتر رہا تھا، جن پر سات دن پہلے اسے سہارا دے کر اوپر پہنچایا تھا، اس جسم کو لئے جسے موت نے سخت اور بھاری کر دیا تھا۔ اس جسم کو جو اسے محبوب تھا جو کبھی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ جس نے بارہ سال تک اس کا ساتھ دیا تھا اور اس کے قریب رہا تھا۔ اور اب، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اس کی زندگی سے الگ ہو جائے گا۔ اس جسم کو اس نے کئی بار اسی طرح اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا تھا جب نیلا پھول کی طرح ہلکی تھی جب وہ کمسن لڑکی نئی نئی بیاہی آئی تھی اور اس کی ماں اس سے دن بھر کام لیتی تھی اور جب وہ ماں کی نظریں بچا کر دوسرے کمرے میں ملتے تو وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھماتا اور پلنگ پر ڈال دیتا اور پھر جب وہ بیمار بیمار کمزور رہا کرتی تھی تو وہ اسی طرح اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹایا کرتا تھا۔

اور اب وہ آخری بار اس محبوب جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ نیچے، نیچے اور نیچے۔

دادا

خدیجہ مستور

آدھی رات کا بھیانک سناٹا جیسے سرگوشیوں میں قتل کی سازشیں کر رہا تھا اور دادا پختہ سڑک کے بیچوں بیچ اس اطمینان سے چل رہی تھی کہ لگتا یہ پوری سڑک صرف اس کی خاطر بنائی گئی ہے۔ کہیں قریب ہی سے پہرے دار سپاہیوں کی سیٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عجیب سناٹے میں عجیب سا خوف دہرا اس پھیلتا جا رہا تھا۔ دادا بھیانک سناٹے اور سیٹیوں کی آوازوں سے بالکل بے خبر سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی موٹی سی لاٹھی کے سرے پر لگا ہوا ربڑ سڑک کوٹ رہا تھا اور اس کے بھاری بھاری مردانہ جوتے شور مچا رہے تھے۔ اس کے چہرے سے سخت بیزاری ٹپک رہی تھی۔ وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لیتی اور پھر اپنی چور آنکھوں سے یوں آسمان کی طرف دیکھتی جیسے وہاں بھی کوئی موٹا سا تالہ لٹک رہا ہو۔ وہ جانے کیا کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ پتہ نہیں گالیاں بک رہی تھی یا ورد مانگ رہی تھی ——— گشتی سپاہی اب اس کے قریب آتے جا رہے تھے لیکن وہ اسی سکون سے متوازن قدم ڈالتی چلی جا رہی تھی۔

"کون ہے تو؟" ——— آواز اتنے قریب سے آئی کہ اب اسے کھڑا ہو جانا پڑا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بیزاری اور دکھ تھا۔ شاید وہ کھڑا نہ ہونا چاہتی تھی۔ سپاہی مارے حیرانی کے اسے بھانک بھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اتنی لمبی تڑنگی عورت، ہاتھ میں ڈنڈا، مردانے جوتے، ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتہ، بڑے بڑے پائنچوں کی شلوار اور دوپٹہ غائب ——— دادا ایک لمحے تک چپ چاپ کھڑی تاک بھانک کرنے والے سپاہی کو کچھ اس طرح دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو کہ بھائی۔ آج مجھے خوب چلنے دو، آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج میں زندگی سے اکتا چکی ہوں۔ مجھے چلنے دو ——— سپاہی نے پیچھے مڑ کر زور سے سیٹی بجائی۔ تھوڑی دور پر دوسرے گشتی سپاہیوں کے جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

"کون ہے تو ——— گونگی ہے جو بولتی نہیں" ——— سپاہی زور سے پکارا اور اس کی آواز سناٹے میں دور دور تک پھیل گئی۔

"کیوں سناتا ہے بابا، تو اپنا کام کر" دادا نے آہستہ سے جواب دیا۔ "اپنا کام کرنے کی بچی، بول تو کون ہے" سپاہی اس کی طرف جھپٹا۔

"تیرا باپ ہوں حرام زادے" دادا جیسے چونکی اور اس نے اپنی لاٹھی زمین پر زور سے پٹخی۔ اس کے چہرے پر جیسے ساری

دُنیا کی کرختگی پھنکار بن کر برسنے لگی ——— سپاہی نے پھر کر مرتی سی گالی کی "چل تھانے ——— دو دو بچے لٹوے کر آوارہ گھومتی ہے سالی"

"تھانے لے چلے گا" ——— وہ سپاہی کی طرف پل پڑی ——— "تھانے لے جائے گا تیری ایسی کی تیسی" ———

دادا نے اپنا ڈنڈا سپاہی کی ٹانگ پر جھاڑ دیا اور جب سپاہی نے گھبرا کر اپنی لاٹھی اٹھانی چاہی تو دادا کا لٹھ اس زور سے پڑا کہ سپاہی کا سر پھٹ گیا۔ لاٹھی میں لگا ہوا دوا اس کے دماغ تک بکھیر گیا تھا۔ وہ زیرِ لب جانے کیا بدبدا رہی تھی اور پھیکی پھیکی چاندنی میں بہتا ہوا بھیجا بھیجا خون سیاہ نظر آ رہا تھا۔ دوسرے سپاہی کے قدموں کی چاپ بالکل قریب آ چکی تھی۔

دادا نے یہ کھلا کر خون دیکھا اور پھر جیسے سرپٹ بھاگنے کے لئے اس کے قدم اٹھے۔ ابھی وہ چند ہی قدم بھاگی تھی کہ چھ سپاہیوں نے اس کا ڈنڈا چھین کر ہتھکڑیاں پہنا دیں ——— دو سپاہیوں کو لاش کے پاس چھوڑ کر باقی چار سپاہی اسے لیکر قریب کے حوالات کی طرف چل دیئے ——— سپاہی اپنے مرحوم ساتھی کے متعلق باتیں کر کر کے دادا کو گالیاں دے رہے تھے۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی اور رات سپاہیوں کی طرح جیسے غصے میں پھنکارتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دادا کو تین دن تک حوالات میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق زیادہ کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ کئی بار جیل جا چکی تھی، اس کی ساری ہسٹری موجود تھی۔ بس صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اسے کئی دن تک سزائیں دی گئیں کہ مرحوم سپاہی سے اس کی کون سی دشمنی تھی، اور اس کے عاشق کا کیا پتہ ہے۔ مگر دادا نے لاکھ سمجھایا کہ اب اس کا کوئی عاشق نہیں، وہ اب کسی کو نہیں جانتی، پھر بھی کسی نے اس وقت تک یقین نہ کیا جب تک کہ سپاہی عورتوں نے اس کی اچھی طرح مرمت نہ کر دی۔

چوتھے دن اسے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا گیا جہاں وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اس وقت تک کے لئے بند کر دی گئی جب تک کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

دادا کو جب اس اکیلی کوٹھری میں بند کرنے کے لئے لایا گیا تو وہ ہمیشہ کی طرح ہنس نہ رہی تھی، جیل کی کوٹھری کو بڑا اچھا گھر نہ کہہ رہی تھی، سپاہیوں سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ نہ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ بالکل چپ تھی اور جب اس کی کوٹھری کا آہنی دروازہ بند کر دیا گیا تو وہ مٹی کے اس ملبے سے چبوترے پر چٹائی بچھا کر لیٹ گئی جس کے سرہانے ذرا زیادہ مٹی تھوپ کر تکیہ بنا دیا گیا تھا۔ سارا دن یوں ہی چپ چاپ لیٹے لیٹے گزر گیا، المونیم کے بڑے سے پیالے میں پڑی ہوئی چنے کی پتلی دال اور دو موٹی موٹی روٹیاں اس کی بھوک کو للچاتی رہیں۔ رات آئی تو کھانا اسے زبردستی کھلایا گیا لیکن اس کی اس کیفیت میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ آہنی دروازے کے باہر پہرہ ہو رہا تھا۔ پیلی پیلی لالٹینوں کی چمک اِدھر سے اُدھر گھومتی رہی۔ بارک نمبر ایک، بارک نمبر دو ——— سب اچھا ——— سب اچھا ——— پہرے والیوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دیتی رہیں۔ دادا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی شاید آج اس کی وہ زندگی اسے بری طرح ستانے پر تل گئی تھی جو ایک چھوٹے سے گھرانے میں شروع ہوئی تھی۔ شاید یہ اسی کی یاد تھی جو وہ یوں دم بخود پڑی اندھیرے میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

وہ دن جب اس کا باپ قریب کی کوٹھی میں بیرے کا کام کرتا تھا اور اس کی اماں سارے مہینے پندرہ روپوں کا حساب کر کر کے کڑھا کرتی تھی اور ان دنوں اس کا نام دادا کے بجائے کنیز تھا۔ پندرہ روپے اور چھ جانیں۔ کبھی اسے پیٹ بھر روٹی نصیب نہ ہوتی

اسی لئے وہ جھگڑالو طبیعت کی ہو گئی تھی۔ اپنا پیٹ بھرنے کی غرض سے وہ اپنی چاروں چھوٹی بہنوں کا حصہ چھین کر ذرا بھی شرمندہ نہ ہوتی۔ اماں اس کی دوسری بہنوں کے صبر و شکر کی مثالیں دے کر اسے سمجھاتی لیکن کھانے کے وقت وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں بندروں کی طرح دوسری بہنوں کا حصہ چھینتے ہوئے ساری نصیحتیں بھول جاتی۔ اماں اس کی ان حرکتوں پر دوسری اولادوں کو پیار کرتی، اسے کوستی اور ہر وقت بُرا بھلا کہتی رہتی۔ دوسری بہنوں کو پیار کرتے دیکھ کر وہ روتی اور تھوڑی دیر کے لئے چپ بیٹھ جاتی لیکن پھر جب باورچی خانے میں جاتی تو اچھل پھاند شروع کر دیتی۔ چھینا جھپٹی میں کئی بار چھوٹے بڑے مٹی کے برتن بھی توڑے اور اماں نے اپنا سینہ کوٹتے ہوئے اسے جلانے کی لکڑیوں سے مارا بھی۔ اس کی ان حرکتوں پر آس پاس کی عورتیں اسے نام دھرتیں تو ماں بڑے ارمان سے کہتی کہ بڑی ہو کر سب ٹھیک ہو جائے گی لیکن اس کی عادتیں خراب ہی ہوتی گئیں۔ بارہ تیرہ سال کی ہو کر پڑھنے بیٹھ گئی مگر عادتوں میں رتی برابر فرق نہ آیا اور نہ ہی اس کے ابا کی تنخواہ بڑھی ——— اب وہ اور بھی نئی نئی باتیں سیکھ رہی تھی۔ زیادہ وقت کواڑ کے دروازے میں گردن ڈالے کھڑی رہتی اور جب کوٹھیوں کی عورتیں بن ٹھن کر باہر نکلتیں تو وہ تالیاں پیٹ پیٹ کر ہنسنے لگتی۔

"پلاؤ زردہ کھانے والے اللہ کرے مر جائیں"

"اچھا اچھا کپڑا پہننے والے اللہ کرے مر جائیں" ——— میٹھے چنے اور پکوڑے بیچنے والوں کو خواہ مخواہ بلا لیتی اور جب بغیر کچھ خریدے اندر بھاگتی تو وہ گالیاں دیتے چلے جاتے اور ایک دن تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ اپنے باپ کی مالکن کو گالی دے دی کہ وہ ابا کی تنخواہ کیوں نہیں بڑھاتی۔ اس دن باپ کی نوکری پر بن گئی۔ کواڑ سے نکل جانے کا حکم مل گیا۔ بڑی مشکل سے پاؤں پڑ کر اور تابعدار کی بات کہہ کر نوکری بچائی گئی۔ باپ اسی وقت گھر آیا اور موٹی سی لکڑی لیکر اسے اتنا مارا کہ کئی دن تک کھاٹ سے اٹھ نہ سکی۔ اس واقعے کے بعد دروازے میں ہر وقت تالا پڑنے لگا۔

پندرہ سولہ سال کی ہوئی تو اماں نے اسے ٹھیک کرنے کے لئے شادی طے کر دی۔ شادی کے نام پر صاحب سے بیس روپے قرض مانگے گئے اور دو جا پانی کپڑے کے جوڑے بنا کر اسے مانجھے بٹھا دیا گیا۔ مانجھے کے دنوں میں وہ روٹی کے لئے ذرا بھی نہ لڑی۔ آدھا پیٹ کھا کر بھی اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی۔ اس نے اپنی نئی نویلی شادی شدہ سہیلیوں سے سن رکھا تھا کہ شادی کے بعد روٹی اور اچھے اچھے کپڑوں کے علاوہ میاں کی ایسی محبت ملتی ہے جو اور کوئی نہیں دے سکتا۔

رخصت ہو کر سسرال گئی تو چند سات دن بعد ہی پچھلے دکھ بھول گئی۔ میاں کی بھرپور محبت ملی اور ساس کی ایسی شفقت کہ بہو کو دونوں وقت اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی مگر جب ساس نے گھر نکھٹ آٹ کر اپنا گھر دیکھنا چاہا تو وہ صرف برائے نام گھر کی مالکن تھی۔ حکم بڑے بڑے دانتوں والی ساس کا چلتا۔ اس کے شوہر کی بیس روپے تنخواہ بھی اسی کے ہاتھ آتی ——— وہ اپنا گھر سنبھالنے کے لئے جلد ہی دامادے کو خیرباد کہہ گئی ——— اس کی ساس نے جب یہ دیکھا تو وہ چڑیلوں کی طرح خوفناک ہو گئی۔ نہ تو اس نے بہو کو اس کوٹھری میں قدم دھرنے دیا جہاں مٹی کے تین بڑے بڑے صندوق رکھے تھے، نہ باورچی خانے میں جھانکنے کی اجازت دی اور نہ ہی تنخواہ میں سے ایک دھیلا چھوڑنے دیا اور تو اور ساس نے ان مرغے دار چیزوں سے بھی اسے محروم رکھا جو اس کا شوہر اپنے مالک کے باورچی خانے سے اڑا کر دیا کرتا ——— مارے جلن کے نپی تُلی روٹی دینے لگی چاہے پیٹ بھرے یا نہ بھرے ——— آخر ایک دن اس نے بڑی محبت سے میاں کے کان بھرنا چاہے مگر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے

"اماں کے لئے ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا، میری ماں نے چکی پیس پیس کر مجھے پالا ہے، اس گھر کی ہر چیز انہیں کی ہے"

اس نے بہت چاہا کہ میاں کو اپنا کر ساس کو نظروں سے گرا دے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب شوہر بھی اس سے دور بھاگنے لگا۔ آخر گھر میں ہر وقت کی لڑائیاں ٹھن گئیں وہ ساس کو چھیڑتی، ساس اسے سلاوں گالیاں دیتی، روتی اور چیختی۔ سارے محلے والوں کی ہمدردی جو کبھی اسے چین نہ آتا۔ اب وہ جلن کے مارے اسے اتنی روٹی دیتی کہ اس کے پیٹ کی ایک کروٹ بھی نہ بھرتی۔ وہ زبردستی باورچی خانے میں گھس کر کھاتی اور ساس کی گالیاں بڑی خوفناک ہوتیں۔ اس کا شوہر روز کی کٹ کٹ سے تنگ آکر اسے مارتا اور وہ ساس سے بدلہ چکاتی۔ باپ کی موت کے باوجود وہ اپنے گھر چھوڑ جانے کی دھمکی دیتی اور ساس اس دھمکی سے خوش ہو کر کہتی کہ تو بھلا کیا جائے گی چڑیل۔ اور واقعی اس کی دھمکی صرف دھمکی ہی رہتی۔

پھر کچھ دن کے لئے لڑائیاں رک گئیں کیونکہ اس کی گود بھرنے والی تھی۔ ایک مہینے کھٹیا جھیل کر جب وہ اپنے بچے کو گود میں لے اٹھی تو ساس نے یہ بھی برداشت نہ کیا کہ وہ اس کے اکلوتے بیٹے کے بچے کو گود میں لے کر اپنا حق جتائے اور اس کا بیٹا اولاد کی وجہ سے بیوی کے بس میں آجائے۔ یہ چیز ایسی تھی کہ وہ ایک دم شیرنی ہو گئی۔ ذرا طاقت آئی تو اس نے اپنی ساس کے جھونٹے پکڑ کر اچھی طرح مرمت کر دی اور پھر اسی دن اس کے شوہر اور ساس نے دودھ پیتے بچے کو اس کی گود سے چھین کر گھر سے نکال دیا۔

دوسرا شہر تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں جائے، کس کے پاس پناہ لے۔ بر قعہ میں الجھتی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں اسے اپنے محلے کے تانگے والے کی بیوی مل گئی۔ وہ اکثر اس کے ہاں آیا کرتی اور سڑی گالیوں کے ساتھ سارے محلے کی خبریں سنا جاتی۔ تانگے والی اسے اپنے گھر لے گئی اور بڑی ہمدردی کی مگر اس کے آنسو نہ رکے۔ وہ مہینہ کوٹ کوٹ کر روتی رہی اور انہیں کے تو پہ سے بہتے ہوئے دودھ کے قطرے دکھا دکھا کر فریاد کرتی رہی۔ اسی رات جب تانگے والے نے اپنا گھوڑا کھولا تو اس کے عجیب عجیب سے دوست بے دھڑک گھر میں آکر چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے بند کر کے جوئے اور چرس سے شوق کیا گیا۔ تانگے والی نے بھی زمین پر بیٹھ کر چرس بھری سگرٹ پی اور پھر اسے بھی زبردستی پوری سگرٹ پلا دی۔ چرس کا پہلا پہلا نشہ تھا۔ وہ بالکل چکرا گئی اور کھری کھاٹ پر گر کر ساری رات اپنے بچے، اپنے لال کو آوازیں دیتی رہی۔

دو تین دن کے بعد بھی جب اس کے آنسو نہ تھمے تو تانگے والی نے اسے بتایا کہ اس کے آدمی کا ایک دوست اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ رونے دھونے سے کام نہ چلے گا، عیش کرنا ہو تو اس کے ساتھ بھاگ جائے، ساری زندگی عیش کرانے کا وعدہ کرتا ہے ——— پھر تانگے والی نے بتایا کہ وہ خود بھی بھاگ کر آئی تھی۔ نہ شادی کی نہ بیاہ، مزے سے ٹھاٹ کرتی ہے میاں کی حکومت سے بھی بال بال بچی ہوئی ہے ——— وہ ان باتوں پر راضی نہ ہوئی۔ برابر یہی رٹے گئی کہ اس کی ساس اور شوہر سے میل کرا دو۔ اب وہ سب کچھ برداشت کر لے گی۔ بھوکی مرے گی مگر اف نہ کرے گی۔ اس کا بچہ اس کی گود میں نہ دیا جائے گا تو کبھی ہاتھ نہ پھیلائے گی۔ اگر اس سے کہا جائے گا کہ بچے کو نہ دیکھے تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گی لیکن اس طرف نظر بھی نہ اٹھائے گی۔ صرف اسے اپنے بچے کے قریب رہنے دیا جائے ——— آخر تانگے والا اس کے شوہر کے پاس گیا تاکہ صلح صفائی ہو جائے مگر جب وہ واپس آیا تو ساتھ ہی طلاق نامہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بال نوچتی، بوٹیاں کاٹتی اور چیخ چیخ کر روتی رہی۔ اس کے نئے عاشق نے اسے جی جان سے تسلی دی، تانگے والی نے بڑی شفقت سے گالیاں بک بک کر دم دلاسے دیئے لیکن اس کی سمجھ میں

کچھ بھی نہ آتا۔ وہ ساری ساری رات اپنے بچے کو بلاتی، اس سے باتیں کرتی، پہنچتی اور پھر چرس کے دم لگاتی۔

دو ہفتے اسی طرح گزر گئے آخر ایک دن تانگے والی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ وہ زیادہ دن نہ کھلا سکے گی۔ بچا بھلا چاہنے والا مل گیا ہے اب اپنا گھر بنا لے اور آخر وہ اس شرط پر اپنے عاشق کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی کہ جانے سے پہلے ایک بار اس کا لال دکھا دیا جائے۔

جانے سے پہلے اس کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اور ساس کسی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔ اس خبر کے بعد نہ وہ روئی نہ پیٹی بس اس طرح چپ ہو گئی جیسے پتھر میں تبدیل ہو گئی ہو۔ دوسرے دن اس کا محبت کرنے والا اسے شہر کی بڑی تاریک اور پراسرار گلیوں کے ایک مکان میں لے گیا جہاں اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا ساتھی چوری کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ اس نے کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ وہ ہاتھ کی صفائی سے جو کچھ کماتا اس کی گود میں ڈال دیتا۔ مارے پیار کے بچھا جاتا لیکن وہ اس سے ہنس کر بولنا نہ جانتی ہی تھی۔ بات بات پر گالیاں بکتی، ڈھیر ڈھیر سی چرس پیتی اور سارا دن پلنگ پر پڑی پان توڑا کرتی۔ مگر چور اچکے کو تو بس عورت چاہیئے اور عورت اس غریب کو بڑی مدت کے بعد ملی تھی وہ اسے ایک لفظ نہ کہتا۔ بہت سے دن یوں ہی گزرتے چلے گئے۔

پلنگ پر پڑے پڑے اس نے مٹھے کی ساری وابستگیوں سے طلاق بھی کر لیا لیکن آخر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ زچگی کے وقت اس کی ساس نے مارے جلن کے دائی کو نہیں بلایا تھا اسی لئے یہ خرابی ہوئی۔ کہ اب وہ اولاد پیدا کرنے کے لائق نہیں رہی۔ اس انکشاف کے بعد تو وہ اور بھی عجیب و غریب ہو گئی۔ وہ سارا دن پڑی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر روتی، گالیاں بکتی، چرس پیتی اور پھر اتنا کھاتی اتنا کہ اس کے ہاضمے میں گڑبڑ ہو جاتی۔

ایک سال بعد اس نے اپنے آدمی سے ضد کی کہ اب وہ بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ اس اظہار سے وہ بہت خوش ہوا اور جلد ہی چوری کے موٹے موٹے گر بتا دیئے۔ احتیاطاً تالہ توڑنا بھی سکھا دیا۔ کچھ ہی دن بعد وہ برقع اتار نوکری کی تلاش میں گھر تاڑنے لگی اور اس کے آدمی کو ہاتھ صاف کرنے میں آسانی ہو گئی۔ اب دونوں کے بڑے مزے تھے۔ وہ روتے دھوتے کے بجائے سیر سیر بھر دودھ پی کر خوب ہنستی اور پہلے کی طرح اپنے چاہنے والے سے بے اعتنائی بھی نہ برتتی، ان ہی دنوں اسے جانے کیا سوجھی کہ ایک گھر میں نوکری کر کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے بجائے وہ مالکن کے دودھ پیتے بچے کو لے بھاگی مگر وقت پر وہ بچے کو بے تحاشہ چومتی ہوئی پکڑی گئی۔ اسے اور اس کے آدمی کو پورے سات سات مہینے کی قید بامشقت ہو گئی۔ جیل سے چھوٹ کر وہ دونوں پھر سے اور پراسرار گلیوں میں چھپ کر دوبارہ کام شروع کر دیا مگر اب کی اس کے ساتھی نے اسے اچھی طرح سمجھایا کہ ایسی نادانی کی حرکت پھر کی تو مفت میں مرنا ہو گا۔ سچا دادا بننا ہے تو ساری زندگی پولیس کے ہاتھ نہ آؤ۔ اور جب اس نے دادا کے مطلب پوچھے تو معلوم ہوا کہ بمبئی میں دادا بدمعاش کہتے ہیں اور وہ بمبئی میں کافی عرصے تک داداؤں کے ساتھ رہ چکا ہے۔

دو تین دن بعد ہی اس نے مطالبہ کیا آج سے اس کا نام دادا پکارا جائے۔ اگر کنیز کہا تو وہ اپنا اور اس کا سر پھوڑ لے گی۔ اس کے چاہنے والے نے بہت سمجھایا کہ یہ نام عورتوں کو زیب نہیں دیتا مگر اس نے اپنے عورت ہونے سے ہی انکار

کر دیا ——— یہ نام رکھنے کے بعد اس نے بڑی پھرتی سے گھرنا کے شروع کر دیئے اور ایک بار بغیر سلاخ کے بڑے جنگلے میں سے چوری کر بیٹھی۔ اس دفعہ اسے چھ مہینے کی جیل ہوئی اور اس کا ساتھی بھی مفت میں چھ مہینے کی قید بھگتنے پر مجبور ہو گیا۔ اب کی بار جب جیل سے چھٹ کر دونوں ملے تو دادا کے ڈھنگ نرالے تھے۔ وہ اس قدر عجیب سی ہو گئی تھی کہ اس کا ساتھی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ وہ اب دن دہاڑے لاٹھی لے کر گلیوں میں گھومتی۔ اس کا عاشق اور اس کے دوسرے چور ساتھی اسے سمجھاتے کہ اس طرح گھومی تو سب کو پکڑوا دے گی۔ لیکن اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ یا تو وہ باہر گھومتی یا پھر چرس پی کر بستر پر ڈھیر رہتی۔ بہت سمجھانے کے بعد بھی جب وہ باز نہ آئی تو آخر ایک دن اس کا ساتھی بھی اسے چھوڑ گیا۔ اس دن وہ بڑی دیر تک بھوکی پیاسی پڑی ٹکر ٹکر آسمان تکتی رہی۔ اسی رات اس نے بڑے دھڑکے سے ایک مکان کا تالا توڑا اور پھر چھ مہینے کے لئے جیل پہنچ گئی۔

چھ مہینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تو سارا دن بھوکی پیاسی اس گلی میں چپ چاپ بیٹھی رہی جہاں وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ رہتی تھی۔ جب رات ہونے لگی تو وہ جھٹکی نکلی سی اٹھ کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر چلی گئی جو مدت ہوئی چوری سے توبہ کر چکا تھا۔ اس کے وہاں مانگ کر کھانا کھایا اور پھر چلتے چلاتے ڈیوڑھی میں کھڑی ہوئی لاٹھی چرا کر باہر نکل آئی۔

رات کا اندھیرا بھیانک ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ پختہ سڑک پر لاٹھی بجاتی، جانے کیا سوچتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ ٹرکنے والے گشتی سپاہی کے سامنے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو، بھائی آج مجھے خوب چلنے دو ——— آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج مجھے زندگی بہت اداس لگ رہی ہے، مجھے چلنے دو ———

جیل کی ایک رات اور ایک دن اسی خاموشی میں گزر گیا۔ دوسرے دن جب وہ اپنے کے جنگلے سے بلیوں کی طرح باہر جھانکنے لگی تو اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی ایک ذرا سی پرچھائیں بھی نہ تھی۔ جب اس کی کوٹھڑی کے سامنے سے پہرے دار گزرتی تو وہ اسے پکارنے لگتی۔

"او تے، کوئی بات وات کر، مشین کی طرح چلے جاتی ہے" پہرے دار اسے گھورتی آگے چلی جاتی اور دادا اس پہرے دار سے گالی دے کر ہنستی۔

کیونکہ دادا اس بار اکیلی کوٹھڑی میں بند کی گئی تھی اس لئے اسے چرس کی سخت تکلیف تھی۔ اس سے پہلے جب جیل میں آتی تو چرس کی کوئی کمی نہ ہوتی۔ نشہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا دماغی توازن ساتھ نہ دے رہا تھا جسم اس بری طرح ٹوٹتا کہ وہ دوسرے ہی دن بیمار پڑ گئی۔ جیل کی ڈاکٹرنی نے اسے دیکھا اور پھر ایسی کڑوی دوائیں پینے کو دی گئیں کہ اس نے شیشی توڑ ڈالی اور کوٹھڑی میں ایسی ایسی اچکی پھاندی کہ ڈاکٹرنی اسے دیکھتے ہوئے گھبرانے لگی ——— آخر دادا نے ایک دن کھانا بانٹنے والی نمبردار سے خوشامد کی۔

"کہیں سے چرس مل جائے گی میری جان"

"نہیں آ ——— نمبردار نے رحم کھا کر اسے دو بیڑیاں پکڑا دیں۔

"اگر تم چرس لا دو تو میں تم کو دو روپے انعام دوں گی" دادا نے ان دو روپوں کی لالچ دی جو وہ تلاشیوں کے باوجود صاف بچا لائی تھی۔

"نا بابا، میں کہیں سے نہیں لا سکتی۔ اگر کسی افسر کو پتہ چل جائے تو میری معافی کٹ جائے گی۔ مجھے جلدی سے گھر جانا ہے، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں" نمبردار قیدی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد دادا نے پھر کبھی چرس کی ضد نہ کی بلکہ اب وہ جیل کے دوسرے کام کرنے والیوں کو ستانے لگی تھی۔ اور جب ہر طرف سے "نہیں ملے گی" جواب ملتا تو دادا کی گالیاں بڑی خوفناک ہو جاتیں۔

ایک مہینے بعد آج دادا عدالت میں اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے گئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے عدالت کی ساری کارروائی سنتی رہی لیکن جب اسے عمر قید کا فیصلہ سنایا گیا تو وہ ہتھکڑیاں بجا بجا کر چیخنے لگی۔

"ہمیں نہیں چاہیئے چودہ سال کی سزا، اگر ہم اس کے بعد بھی جیتے رہے تو کیا جج صاحب ہمیں اپنے گھر ڈال لیں گے" سپاہی عورتیں اسے کھینچ کر لے جانے لگیں تو وہ زور زور سے گالیاں بکنے لگی۔

"او حرام زادے، او کتے، بس چودہ سال کی قید دیتا ہے" سپاہی عورتوں نے اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھا دیا لیکن وہ راستے بھر گالیاں بکتی رہی۔

جب وہ جیل پہنچی تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ اب اسے جیل کے کپڑے اور کمبل دے کر بارک نمبر دو میں چھوڑ دیا گیا۔ جس وقت وہ بارک میں داخل ہوئی تو ساری قیدی عورتیں مشقت کرنے گئی ہوئی تھیں۔ ان کے سیاہ کمبلوں میں لپٹے ہوئے بستر اور المونیم کے بڑے بڑے کٹورے لائن سے رکھے ہوئے تھے۔ دادا نے کپڑے تبدیل کر کے بارک میں تیزی سے ٹہلنا شروع کر دیا وہ اب بھی زیر لب گالیاں بک رہی تھی۔ اور چرس کی شدت سے بگڑا ہوا چہرہ اس وقت بڑا ہی کریہہ لگ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسی طرح ٹہلتی رہی اور جب مشقتی واپس آ کر کھانے کے سلسلے میں دھما چوکڑی مچانے لگیں تو وہ غصے میں جیسے پھنکارنے لگی۔

"اے حرام زادیو چپ رہو، ورنہ ایک خون کر کے چودہ سال اور بڑھا لوں گی"

"بڑی آئی لاٹ صاحب کی بچی" ایک عورت نے تڑاق سے جواب دیا۔ دادا نے آستینیں چڑھا لیں اور دوسری عورتوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا۔ اس کے بعد بھی سونے سونے دادا کی کئی عورتوں سے ٹھنی۔ رات بھر پہرہ ہوتا رہا اور دادا اپنے بستر پر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔

صبح جب ناشتے میں ٹھنڈے چنے بٹنے لگے تو ہشاش بشاش لائن میں سب سے آگے کھڑی تھی۔

"ہمیں اور دو، اتنے چنوں میں تو پیٹ کی ایک کوٹھری بھی نہ بھرے گی" ——— چنے بانٹنے والی نے شاید اس کے بلند قہقہے جسم پر رحم کھا کر تھوڑے چنے اور دے دیئے۔

"ہمیں بھی دو نمبردار بہن" دادا کے پیچھے والی عورت بڑی التجا سے منمنائی۔

"حرام زادیوں کو عیش سوجھتا تھا تو اپنے گھر بیٹھتیں چپ سے" چنے بانٹنے والی نے اپنی بالٹی اٹھالی۔

"گالیاں دیں تا کسی کو بھی تو سر توڑ دوں گی" دادا نے غصے سے کہا اور پھر چنوں کی بالٹی کی طرف جھپٹی۔ چنے تو خیر وہ

لے نہ سکی ہاں مقابلہ کرنے کے سلسلے میں اسے سب عورتوں کے سامنے چھ بید لگائے گئے۔ اس کے بعد سب کو کام کے لئے لے جایا گیا۔ مار کھانے کا دادا پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سب عورتیں جو رات دادا سے لڑتی رہی تھیں اب اس کے پاس کھسر پھسر کر باتیں کر رہی تھیں۔

" بہن تمھارے سر کو فساد جرم ہے؟" قیدیوں کے کپڑے سیتے ہوئے ایک عورت نے پوچھا۔

" بہن ——— دادا نے تھک کر عورت کی نقل کی ——— خبردار جو مجھے بہن کہا ——— میرا نام دادا ہے دادا۔ عورت کی ذات پر لعنت ہے ——— جانتی ہو دادا کسے کہتے ہیں ——— بدمعاش کو ——— میں عورت نہیں بدمعاش ہوں ——— قتل کر کے آئے ہیں ہم ——— دادا نے اونچی آواز سے اعلان کیا۔ ساری عورتیں اسے حیرت سے دیکھنے لگیں۔

" کہیں چرس ہوگی میری جان" دادا نے اس عورت کی طرف سرک کر سرگوشی کی جو کل رات بے تحاشہ بیڑیاں پیتی رہی تھی۔

" شبراتن پاس ہو شاید" اس نے چپکے سے اس عورت کی طرف اشارہ کر دیا جس کی خاطر دادا نے صبح ہی صبح چھ ڈنڈے کھائے تھے۔

" کہیں چرس ہوگی؟" دادا چرس نہ ملنے سے سخت پریشان تھی۔ مانگے تانگے کی بیڑی تو بھوسے کی طرح بدمزہ لگتی۔

" پیسے ہوں گے" شبراتن نے سرگوشی کی اور کھٹا کھٹ ڈبیا بنانے لگی۔

" ہاں" دادا نے اپنے شلوکے کے اندر سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور شبراتن نے اپنی شلوار کے نیفے سے ایک چرس بھری سگرٹ نکال کر اس کی طرف سرکا دی۔

ایک روپے کی ایک سگرٹ!

" ہاں جی" ——— شبراتن نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ دادا کے تیور بگڑ گئے۔

" اچھا تو پھر ایک روپیہ اور لے" ——— دادا نے شبراتن کے جھونٹے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ عورتوں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ دادا نے اپنا روپیہ تو چھین لیا مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ معاملہ کیا تھا۔ نمبرداروں نے بڑی مشکل سے انھیں الگ کیا۔ دادا کی بارک کی عورتیں جلد ہی اس سے نالاں ہو گئیں۔ جس سے دیکھو لڑی پڑتی ہے۔ کئی بار اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت ہوئی کہ اسے کسی دوسری بارک میں بھجوا دیا جائے۔ لیکن عورتوں کی شکایت سنتا کون۔ سب عورتیں روز ہی آپس میں لڑا جھگڑا کرتیں، دادا کو بھی انھیں میں سے ایک سمجھا گیا۔ بس سزا کے طور پر اس کی مشقت میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا گیا۔ دادا کی حالت میں بھلا کیا فرق پڑتا۔ بڑی سے بڑی مشقت چکی بجانے میں کر ڈالتی۔ آخر بارک کی ساری عورتوں نے اپنی جان چھڑانے کے لئے دادا سے بات کرنی چھوڑ دی۔ اسے پھر بھی پروا نہ ہوئی۔ وہ خود ہی انھیں چھیڑ چھیڑ کر بولتی اور شبراتن کی چرس مفت میں پیا کرتی۔ شبراتن لاکھ کہتی کہ اب نہیں ہے ——— لیکن وہ کب مانتی۔ سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی دھمکی دے کر وہ پوری پوری سگرٹ اڑا جایا کرتی۔ شبراتن کا دوست جس کی خاطر وہ ایک سال کی قید بھگتنے آئی تھی جانے کن ذرائع سے اسے ڈھیر ڈھیر سی چرس بھجوا دیا کرتا اور وہ دوسری عورتوں کو اس کی لت لگا کر ٹھاٹ سے ان کے ہاتھ دگنے داموں پر بیچا کرتی۔

گو یہ مفت میں پینے والی دادا سب عورتوں کے لئے تو لعنت تھی ہی مگر شبراتن کے لئے آسمانی بلا سے کم نہ تھی جب دوسری عورتوں سے ملاقات کے لئے ان کے عزیز آتے اور چوری چھپے روپے دے جاتے تو شبراتن بڑی بے بسی سے پوچھتی۔

"دادا تیرا کوئی نہیں ہے، کوئی یار دوست بھی نہیں تیرا؟"

"تو جو ہے۔ پلائے گی نا" دادا اس کے نیفے کی طرف ہاتھ بڑھاتی اور وہ بدک کر الگ کھڑی ہو جاتی۔

مفت کی چرس کے علاوہ دادا عورتوں کی ان کھانے پینے کی چیزوں میں بھی زبردستی حصہ بٹاتی جو ان کے عزیز ملاقات کے وقت دے جایا کرتے۔ اس سلسلے میں خوب لڑائی ہوتی جب دادا کو یوں لڑ جھگڑ کر چیز نہ ملتی تو وہ راتوں کو بڑی ہوشیاری سے عورتوں کی گٹھڑیاں کھول کر ان کی چیزیں چرا لیتی اور پھر ان عورتوں کو بھی چپکے چپکے بانٹتی جن کے پاس کوئی آنے والا نہ تھا۔

کھانے کی چیزوں کو غائب دیکھ کر عورتیں سینہ کوٹ کوٹ کر روتیں اور دادا سے لڑتیں، اس کی شکایتیں کرتیں مگر کیا مجال جو دادا کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ کئی بار اسے مارنے اور زیادہ مشقت لینے کی سزائیں دی جا چکی تھیں۔ اتنا کھانے اور ادھم کرنے کے باوجود جب جیل کی ڈاکٹر عورتوں کو دیکھنے آتی تو دادا بڑی مکاری سے لیٹ کر کراہنے لگتی۔

"بہت کمزوری ہو گئی ہے ڈاکٹرنی صاحب، روٹی کی ایک کور بھی نہیں کھائی جاتی، دودھ بندھوا دیجئے" عورتیں فوراً دادا کی کاٹ کرتیں۔

"ڈاکٹرنی صاحب یہ تو دوسروں کا بھی چرا کر کھا جاتی ہے، کیا مجال جو روٹی کی ایک کور بھی بچے اس سے" ڈاکٹر مسکراتی اور دادا کو دیکھے بغیر ہی چلی جاتی۔ دوسری بے حد کمزور عورتوں کا کبھی کبھی دودھ بندھوا دیا جاتا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد دادا شکایت کرنے والی عورتوں کو بڑی بڑی گالیاں دیتی۔ آخر ایک ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے دادا کے لئے ایک ہفتے کا دودھ بندھوا دیا۔ اس دن اس نے عورتوں کو بڑی فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

"اور کرو شکایتیں، ہم تو آرام سے دودھ پئیں گے" وہ عورتوں کو جلانے کے لئے خوب زور زور سے ہنسی۔

ویسے تو دادا کی عام طور سے یہی حالت رہتی کہ اس سے لڑ، اس سے جھگڑ کسی کی کوئی چیز چرا لی تو کسی کے جھونٹے پکڑ کر مار پیٹ شروع کر دی۔ لیکن کسی کسی دن وہ بالکل چپ ہو بیٹھتی وہ بھی اس طرح کہ اگر کوئی اسے ایک گالی دے جائے تو اُف نہ کرے۔ کبھی کبھی منہ چھپا کر چپکے چپکے روتی بھی اور پھر آنسو پونچھ کر شبراتن کو دھمکیاں دے کر ڈھیر سی چرس پیتی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، دادا کی بارک سے کئی عورتیں رہا ہوئیں، کئی داخل ہوئیں۔ مگر اب شبراتن کے علاوہ نئی پرانی سبھی عورتیں اس سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ دراصل دادا ان سے کھانے پینے کے سلسلے میں تو لڑتی لیکن اگر جیل کی طرف سے عورتوں کو سختی کے طور پر کوئی سزا دی جاتی تو وہ ان کی حمایت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک بار سپرنٹنڈنٹ سے اس بات پر لڑ بیٹھی کہ اس نے ایک عورت کو گستاخی کرنے کے سلسلے میں چاروں کے لئے تنہائی کی قید دے دی تھی۔ اور سب عورتوں کے سامنے اس کی اچھی طرح مرمت کرائی تھی۔ حمایت کرنے کے سلسلے میں دادا کے دس بید لگائے گئے اور کچھ عرصے کے لئے جیل کی ساری رعایتیں چھین لی گئیں ——— عورتیں اب اس سے اپنا دکھ درد بھی کہنے لگی تھیں اور راتوں کو جب وہ اپنے گھروں اور بچوں کی یاد میں بلک بلک کر روتیں تو دادا بڑی شفقت سے گالیاں دے دے انہیں چپ کراتی، ان کے آنسو پونچھتی اور خود بھی رنجیدہ ہو کر چپ بیٹھ جاتی۔

آج شام دادا کی بارک میں ایک بڑی کسی دھان پان سی عورت لائی گئی جس کی گود میں مشکل سے دو مہینے کا بچہ ہوگا۔ عورت آتے ہی زمین پر بیٹھ گئی اور بچے کے منہ میں دودھ ٹھونس کر زار زار رونے لگی۔ عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے، اس کے سر کون سا جرم ہے ——— عورت نے دیر تک کسی بات کا جواب نہ دیا بس روئے چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور چپ کرانے میں لگی ہوئی تھیں۔ بس ایک دادا تھی جو بالکل الگ تھلگ بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔ بچے والی عورت جب روتے روتے تھک کر چپ ہو گئی تو دادا اس کے قریب سرک آئی۔

"داہو جرم کر کے روتی ہو، ایسا ہی چڑیا جیسا دل تھا تو اپنے گھر بیٹھتیں ٹھکانے سے۔"

"میں نے کون سا جرم کیا ہے" ——— عورت پھر پھڑک کر رونے لگی ——— "میرے سر زبردستی جرم لگایا ہے۔"

"زبردستی کیسے؟" دادا نے ذرا اشتیاق سے پوچھا۔

"میرا میاں شادی کے ایک سال بعد دوسری عورت کر لایا ——— بچے والی عورت اپنا قصہ سنانے لگی ——— میں بہت روئی دھوئی مگر پھر صبر کر لیا کہ اپنے بچے کو باپ سے محروم نہ کروں گھر میں نوکرانیوں کی طرح رہنے لگی۔ اس پر بھی میرے میاں کو صبر نہ آیا اور زرکتا کہ میرا اور اپنی سوت کا بستر جو دگا باکر ——— مجھے پر پتھر رکھ کر یہ کام بھی کر دیتی" ——— عورت آہ بھر کر آنسو پونچھنے لگی ——— اس کے بعد بھی سوت کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی اور ایک دن وہ لیٹ کر چیخنے لگی کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ سارا محلہ جمع ہو گیا ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو معلوم ہوا کہ ذرا زیادہ افیون کھا لی ہے۔ اس کے بعد پولیس آ گئی اور سوت نے پولیس کو بیان دیا کہ میں نے اسے زہر دیا ہے۔ گھر کی اور میری تلاشی لی گئی تو افیون میرے دوپٹے کے پلو میں بندھی ملی ——— مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میری سوت نے پلو میں کب باندھ دی تھی ——— پولیس مجھے حوالات لے گئی اور پھر وہاں سے جیل لے آئی۔ ایک مہینے سے دوسری بارک میں ہوں۔ میرا باپ مقدمہ جیت رہا تھا مگر جانے کیسے ہار گیا اور آج میں عدالت سے سزا سنگر آ رہی ہوں۔ چھ مہینے کی سزا دی تھی پر اس بچے کی وجہ سے آدھی معاف ہو گئی۔ شریف عورت ہوں اب باہر نکل کر کیا منہ دکھاؤں گی۔ میرے ابا کی عزت خاک میں مل گئی" ——— عورت پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

"ہوں، مگر جیا تو اپنے خصم کے گھر نوکروں کی طرح کیوں رہی، ایک ہی دن میں گھر سے باہر نکل کر دوسرا یار کر لیتی تو آج یہ حالت ہوتی تیری" ——— دادا نے جوش سے کہا۔ اور پھر سوتے ہوئے بچے کی ٹانگ کھینچ کر بلکاری ——— "لے چلی آ رہی ہے اس گھٹنے کے پلے کو، وہیں پھینک آتی منہ پر کرے پال ——— لا ذرا مجھے دے اسے گود میں" ——— دادا نے بڑی شفقت سے بچے کو گود میں لے لیا ——— "اوئے تو بڑی" ——— اس نے آدھی جلی سگرٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

"بھئی نہیں پیتی، اور دیکھو جی میرے بچے کو تم اب کچھ نہ کہنا، میں اسی کی خاطر زندہ ہوں ورنہ کب کے کود کر جان دے دیتی۔"

"میرا بچہ، بڑی آئی بچے والی لے اسے" دادا نے بچے کو چوہے کی طرح اٹھا کر ماں کی گود میں دھر دیا اور پھر دیر تک پیچھے پیچھے گالیاں بکتی رہی۔

اس رات دادا کروٹ بدل بدل کر بچے کو دیکھتی اور جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ ورنہ اس کا تو یہ حال تھا کہ ساری رات کمبل کی جوؤں کے کاٹنے کی پروا کئے بغیر ٹھاٹ سے خراٹے لیتی رہتی۔

دادا نے اچانک پھر وہی روپ بدل لیا تھا جیسے وہ ابھی ابھی جیل میں آئی ہے۔ جب دیکھو ہر ایک سے لڑی پڑتی ہے۔ ہر ایک کو ڈکھ دے رہی ہے اور سڑی سڑی گالیاں بک رہی ہے۔ بچے والی عورت سے تو اسے جیسے دشمنی ہو گئی تھی۔ زبردستی اس کے بچے کو گود میں لیتی اور پھر ذرا ہی دیر بعد اسے ماں کی گود میں پٹخ دیتی۔

"میرا بچہ، بڑی آئی بچے والی" دادا بڑبڑاتی اور عورت اسے حیرانی سے دیکھ کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور پھر ایسے دکھ سے روتی کہ ساری عورتیں دادا کو برا بھلا کہنے لگتیں۔ رات جب بچہ سوتے سوتے جاگ کر روتا تو دادا خواہ مخواہ بھڑکنے لگتی۔

"چپ کرا اس کتے کے پلے کو، لے کے آ گئی، نیند کے لئے ترس گئے۔"

"دیکھ دادا تو خواہ مخواہ لڑتی ہے، بچے کس کے نہیں روتے" کوئی عورت دادا کو سمجھانا چاہتی۔

"روئیں مگر ہماری نیند کیوں خراب کریں، ذرا لاڈو اپنے بچے کی آواز داب کر رکھے نا۔"

"تمہاری آواز نہ داب دوں" بچے کی ماں غصے سے کانپ کر جواب دیتی اور پھر بڑی بے بسی سے رونے لگتی ——— "ہائے ہائے میری اماں" ——— دادا چپ تو ہو جاتی مگر اب اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں جبکہ ساری عورتیں مزے سے سوئی ہوتیں تو دادا کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتی۔

ایک دن بچے کو ہلکا سا بخار ہو گیا۔ ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا اور دادا نے بڑی شفقت اور منتوں سے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ ڈاکٹر دیکھنے آئی تو اس نے پہلا حکم یہ دیا کہ بچہ ماں کی گود میں دیا جائے اور وہی اس کا حال بتائے۔ دادا نے بچے کو دے دیا مگر اس کے تیور بگڑنے لگے۔ ماں رو رو کر بچے کا حال بتانے لگی۔

"ڈاکٹرنی صاحبہ، میرا بچہ بہت بیمار ہے، رات بھر ہوش نہیں رہا، آنکھ نہیں کھولی میرے لال نے، آگ کی طرح پنڈا پھنکتا رہا ہے۔"

"کوئی بخار وخار نہیں ڈاکٹرنی صاحبہ" ——— دادا نفرت سے بولنے لگی ——— "ساری رات گلا پھاڑ پھاڑ کر رویا ہے، کہتی ہے کہ آنکھ نہیں کھولی" ——— ڈاکٹر دادا کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے بچے کو غور سے دیکھنے لگی پھر نسخہ لکھ کر فوراً اپنے سامنے بچے کو دوا پلوائی۔

آج بچے والی عورت کا باپ اس سے ملنے آیا تو بچے کے لئے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور نئی قمیصیں دے گیا تھا اس لئے وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"میرے ابا کہتے تھے کہ فوراً اس آدمی سے طلاق لے لیں گے اور پھر میرے چچا زاد بھائی سے شادی کریں گے میری" ——— عورت خوش ہو کر بتانے لگی ——— "میرا چچا زاد بھائی مجھ سے بہت پہلے سے محبت کرتا تھا، میرے غم میں اس نے اپنی شادی نہ کی اور تو اور وہ میرے بچے کو بھی بہت چاہتا ہے، جب میرے گھر آتا تو اسے سینے سے لگا لیتا۔" اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔

"اچھا تو تیرا یار بھی ہے" ——— دادا زبردستی بیچ میں بول اٹھی ——— "اسے بیماری داری چاہئے زیادہ باتیں نہ بنا۔"

"نہ رہے بیماری میرا بچہ تو ہے اس کے سہارے زندگی گزار دوں گی۔ تو کیوں بولتی ہے میرے بیچ میں؟" عورت بدمزہ سی ہو کر

چپ ہو گئی۔

کل صبح بچے والی عورت کے رہا ہونے کا دن تھا۔ آج دادا بچے کو زبردستی گود میں لینے کے سلسلے میں کتنی ہی بار اس سے لڑ چکی تھی۔ لیکن عورت نے ایک بار بھی دادا کو ہاتھ نہ لگانے دیا اور نہ اس کی لڑائی کا جواب دیا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ مارے خوشی کے رات اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ وہ لوریاں گا گا کر اپنے بچے کو پیار کر رہی تھی اور دادا کے چہرے پر جیسے ساری دنیا کی لعنت برس رہی تھی۔

"چپ ہو کر سو جا لعنت پڑی" دادا بار بار چیختی مگر عورت دادا کی پروا کئے بغیر آدھی رات سے پہلے نہ سوئی۔

جب عورت گہری نیند سو گئی۔ بارک میں سناٹا چھا گیا تو دادا اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چوروں جیسی آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ بہت بلندی پر لگا ہوا مدھم سا بجلی کا قمقمہ جیسے دادا کو گھور رہا تھا ——— بارک نمبر ایک بارک نمبر دو ——— سب اچھا ہے ——— سب اچھا ہے ——— باہر پہرے والیوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دے رہی تھیں۔ دادا آہستہ سے بچے والی عورت کے بستر کے قریب رینگ گئی۔

صبح تڑکے جب دادا کے اوپر سے کمبل سرکایا گیا تو بارک میں کہرام مچ گیا۔ جیل کی افسر جمع ہو گئیں اور بچے کی ماں سینہ پیٹ پیٹ کر چیخ رہی تھی۔ اپنے منہ پر تھپڑ مار رہی تھی اور کھڑے قد سے بار بار زمین پر گر رہی تھی ——— دادا کے گلے میں اس کی قمیص کس کر بندھی ہوئی تھی اور اس کے ننگے سینے پر لٹکے ہوئے بچے کے منہ میں اس کی خشک چھاتی تھی۔ دادا اور بچے، دونوں کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں اور دونوں کے جسم سرد ہو کر اکڑ چکے تھے۔

کالی تتری

کالی تتری چرھی وِچ بولے
تے اُڈ دی نوں باج پئے گیا

بلونت سنگھ

بڑے مزے میں مولا نے چلم میں قبا کو اور اس کے اُوپر سلگتے ہوئے اُپلے کے دو ٹکڑے جما دیئے اور پھر ارے سردی کے دانت کٹکٹانا ہوا چارپائی پر چڑھ، ٹانگوں پر دُھسّہ ڈال کر لیٹ گیا۔

روٹی کھانے کے بعد اسے حقے کی سخت طلب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے آنکھیں موند کر دو چار کش ہی لئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ یہ دستک اسے بڑی ناگوار گزری۔ اس نے کرخت لہجہ میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

جواب میں پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

پیر وا اٹھا ——— چھوٹا سا گاؤں تھا۔ عین اس کے سرے پر مولا کا کچا مکان تھا۔ جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور ایک بیوہ بہن سمیت رہتا تھا۔ گاؤں میں گھستے وقت چونکہ اس کا مکان سامنے پڑتا تھا۔ اس لئے راہ گیر اسی سے کسی کے مکان کا پتہ یا کسی اگلے گاؤں کا راستہ دریافت کرنے کے لئے دروازہ آن کھٹکھٹاتے تھے۔ لیکن اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی اور پھر سردیوں کے موسم میں تو سرِ شام ہی گاؤں پر خاموشی کا تسلط ہو جاتا تھا۔ نہ جانے بے وقت کون آن دھمکا تھا جب مولا کو یقین ہو گیا کہ اسے اٹھنا پڑے گا تو اس نے حقے کی نے ایک جانب کو ہٹائی اور دُھسّے کو سنبھالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

نوٹ:۔ اس کہانی کا پس منظر وہ سنہرا سلگتا پنجاب ہے جس میں ہندو، مسلم اور سکھ ڈاکو مل جل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانوں میں نقب لگایا کرتے تھے۔

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تاریکی میں میلے قد کا ایک شخص کھڑا ہے۔ پگڑی اس کے سر پر موٹے رسّے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سرے سے اس نے اپنے چہرے کا، آنکھوں کے سوا، نچلا حصّہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا۔ بھنویں موٹی گھنی اور ملی ہوئی تھیں۔ آنکھیں تیز اور متجسس۔ اس کی ناک کی جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ . . . . . .

مولا بدکلامی کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک لہجے میں پوچھا :۔

" تم کون ہو؟"

اجنبی نے گھور کر اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر ضعف سے بولا۔

" میں بھلبوڑی گاؤں سے آ رہا ہوں "

" بھلبوڑی؟ وہ تو یہاں سے بیس کوس کی دوری پر ہے لیکن تم یوں بات کرتے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آ رہے ہو . . . "

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

" میں ڈاچی پر آیا ہوں "

مولا کو اس کے بولنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پرواہی سے کہا " خیر مجھے اس سے کیا غرض ہے سوال تو یہ ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

" مجھے بگا سنگھ بھلبوڑی والے نے بھیجا ہے "

یہ سنکر مولا چوکنا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نواڑ کا بازو تھام لیا اور جلدی سے دھیمی آواز میں بولا۔

" . . . . . تو یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر چلے آؤ نا "

اجنبی یک جست اندر آ گیا وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ مولا نے ڈیوڑھی میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں سب سے پیچھے والے کمرے میں لحافوں میں گھسی پڑی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا۔ اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا۔

" میں نے دروازہ بند کر دیا ہے تاکہ ہماری باتوں کی آوازیں اندر تک نہ پہنچیں "

اجنبی کچھ نہیں بولا۔ مولا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھیکی چاندنی میں دور جوہڑ کا پانی پگھلے ہوئے سیسے کی نکلی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ پیڑ اور دور دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر مولا نے اپنے دانتوں میں اٹکی ہوئی حقے کی نے کو ہونٹوں میں دبوچ کر بڑے اطمینان سے گڑگڑ کی صدا بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا نواڑ ڈیوڑھی کے اندر بنی ہوئی کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

- بھوک لگی ہو تو بتاؤ کھانے وانے کا کچھ بندوبست کروں ؟
- نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ قریب کے گاؤں سے ..... بس اب کام ہو جانا چاہیئے ؟
- کیوں اتنی جلدی بھی کیا ہے ؟
- مجھے پھر دن لوٹنا ہوگا ؟
- کیوں ؟
- جگے نے یہی کہا تھا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں کسی نے دیکھ لیا تو سک ہوگا۔ کھاہ کھاہ ؟
- ڈاچی کہاں ہے ؟
- ڈاچی ساتھ والے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں ؟
- اور بندوکھ ؟ (بندوق) ؟
- بندوکھ میرے پاس ہے ؟
مولا کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔
اس پر اجنبی نے قدرے جھک کر بکھیس کے نیچے سے دونالی بندوق دکھائی جس کی دونوں نالیاں الگ کر کے اس نے بٹ BUTT سمیت انگرکھے میں لپیٹ رکھی تھیں اور پھر ان پر ایک رسی کس کر باندھ دی تھی۔
اب مولا سمجھا۔ سر ہلا کر بولا۔
- اچھا توڑ کر باندھ رکھی ہے ؟
- ہاں ویسے چھپ تو نہیں سکتی نا ؟
- ٹھیک ؟
- اب جلدی کرو ؟
- اور کارتوس ؟
اجنبی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر کہنے لگا۔
- دیکھو میں پل پل تیار ہو کر آیا ہوں ..... بس اب مجھے نوکے پر لے چلو ؟
- اچھی بات ؟ یہ کہہ کر مولا نے جھلے کے دو تین خوب گہرے گہرے کش لئے پھر دھتے کر بدن پر خوب اچھی طرح لپیٹا اور مسکرا کر بولا۔
- اُستاد تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا ؟ کسی سے پوچھا تھا ؟
- میں ایسا کچا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھتا پھروں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ جگے نے مکان کا ٹھیک ٹھیک پتہ اور تمہارا حلیہ بتا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہوگا ؟
- ہاں ہاں کیوں نہیں" مولا ہنس کر بولا "جگو اس کام کو کسی معمولی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا ـــــ اچھا تو میں

چلا ——— ابھی دو تین اور آدمیوں کو بھی بلاتا ہے۔"

"بلا لاؤ..... پر میں ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"بے شک بے شک جرورت بھی کیا ہے۔"

یہ کہہ کر مولا چلنے لگا تو اجنبی بولا "حقہ پیتے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"حقہ گڑگڑاتے چلو گے شک نہیں ہوگا دیکھنے والوں کو۔"

"یہ تو واقعی کھری بات کہی تم نے۔"

مولا نے حقہ اٹھایا، نے والوں میں دبائی اور چلم سے بندھی ہوئی چھلا جھلاتا اور تھپڑ مارتا ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

اجنبی نے اس کے رخصت ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سرکنڈوں کا بنا ہوا بانسٹ بھرا ہوا مونڈا گھسیٹ کر سلگتے ہوئے انگاروں سے بھری ہوئی مٹی کی انگیٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بیٹھ گیا۔

مولا کیچڑوں کی طرح بل کھاتی ہوئی سنسان اور تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے کھڑا ہو کر آوازیں دینے لگا: "سداگرا، اوئے سداگرا!!"

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ہانک لگائی۔

"اوئے سداگرا! سداگرا ہوئے!"

پھر وہ اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی تو وہ اجنبی کو دعائیں دینے لگا جس نے کہ حقہ اس کے ہمراہ بھجوا دیا تھا۔

مکان کا دروازہ کھلا اندر سے گھنے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان باہر نکلا اس نے پہلے تو مولا کی جانب خوابناک آنکھوں سے دیکھا لیکن جب پہچانا تو اس کی آنکھیں پورے طور سے کھل گئیں۔

مولا نے زرد زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "واہیں مُنے مُنے کر میرے گلے بھی بیٹھ گیا کہاں گھسا پڑا اخلاق کے مورے ہے؟"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

سداگر نے پوچھا "ہاں بے بتا؟"

جواب میں مولا چپ چاپ حقہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اس نے شرارت اور پُراسرار انداز سے ابرو اوپر اٹھا کر ایک آنکھ میں علامت ماری جیسے ڈھیلا کھینچ کر مار دیا ہو۔

سداگر سمجھ گیا۔

"چلو" مولا نے کہا۔

"ٹھہرو میں اوڑھنے کے لئے تو کچھ لے آؤں اندر سے؟"

وہ بھاگا بھاگا اندر گیا اور کالے رنگ کی ایک لوئی بدن پر لپیٹتا ہوا فوراً واپس آ گیا۔

دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کہیں کوئی بھولی ماری کتیا دانت دکھاتی ہوئی دکان کے ایک تختے سے نکل کر دوسرے تختے تلے دبک جاتی۔ یا گارے کے بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں تلے چھچھوندریں جان بچاتی پھرتی تھیں۔

دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں بڑھتے چلے گئے۔ انھوں نے میلا سنگھ کو اس کے مکان سے اور لبھو کو دیشیوں کے طویلے سے بلا کر اپنے ہمراہ لیا اور واپس مولا کے مکان پر پہنچ گئے۔

اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب پگڑی کے شملے میں چھپا ہوا تھا۔ سدا گر، لبھو اور میلا سنگھ ابھی نوجوان تھے ان کاموں میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اجنبی کا نقاب کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ اور جن کے مانند گھنی بھنویں تلے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے نوخیز جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔

اجنبی نے جلدی سے ان کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کھیس میں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا کہ اب دیر کس بات کی ہے۔

اس کا ہاتھ بھی کالا تھا اس پر موٹے موٹے بال اُگے ہوئے تھے۔

مولا نے جواب دیا:۔

"دیر کسی بھی بات کی نہیں"

"تو اب چلیں؟"

"ضرور"

مولا نے آگے قدم بڑھایا اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اٹھ رہے تھے اور اس کی پتلیاں دم بھر کو بھی ایک جگہ نہیں رکتی تھیں۔ تیتر کے دانوں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں۔

دور سے کبھی کبھار پہرے دار کے دفعتہً چلا اٹھنے کی آوازیں سنائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا اٹھا ہو۔ اس آواز اور اپنے درمیان کافی فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پون میل کی قدری پر واقع پیراں والے رہٹ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ مولا کے اشارے پر سدا گر نے رہٹ کے قریب والے باڑے میں گھس کر ایک مریل بیل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے ہانکتے ہوئے ذرا پرے لے گئے اور گاؤں کے ایک بڑے سود خور کے کھیت میں اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ خود ببول کے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے جا کھڑے ہوئے۔

پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

اجنبی سکھ نے پھرتی سے اپنی بغل میں سے بندوق کا انجر پنجر نکالا۔ نالیوں کو ریٹھ سے کڑک کیا اور نیچے کی جانب چوبی کھپچی جمائی اور تھیلی کی ایک ہی ضرب سے اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے دونوں نالیوں میں ٹھوس گولیوں BULLETS والے کارتوس بھرے۔ اور ایک نظر بیل کی جانب دیکھا جو سرد ہوا میں کان پھڑپھڑاتا اور پلکی اور کمزور دُم کو نقاہت سے ہلاتا گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ پھر اس نے شست باندھ کر لمبی دہائی۔ گولی کھاتے ہی بیل بغیر کسی جد و جہد کے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھی لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پر دوسری گولی بھی اس کی گردن پر چپکا دی۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور بھی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا۔

"اچھا اب مجھے چلنا چاہیئے۔ صبح سے پہلے واپس پہنچنا ضروری ہے۔"

مولا نے ہاتھ بڑھا کر کہا "اچھی بات۔"

اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا:۔

"ساب سلامت!"

"ساب سلامت۔"

اجنبی نے پھر اپنی بندوق کو توڑ تاڑ کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا۔ اور پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا قدرے پھیکی چاندنی میں غائب ہو گیا۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے اور دیکھا کہ وہ قطعاً مر چکا ہے۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے اور گاؤں کے قریب پہنچ کر انھوں نے دفعتہً پکڑو پکڑو کا شور بلند کیا۔ لوگوں کو ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انھیں پتہ چلا کہ بچارے مولا کا بیل گولی سے مار دیا گیا ہے۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ گانٹھتا رہا اور جب اس کا گلا بیٹھ گیا تو سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ چھ کوس پرے تھانے میں اس امر کی رپٹ درج کروا کر گاؤں لوٹ آیا۔

(۲)

"پیر واٹھہ" گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ "ماہنہ" دور دور تک مشہور تھا۔ ارد گرد دیہات میں ان کی اسامیاں موجود تھیں۔ اب ماہنوں کا دبدبہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ پیر کے نتھے اور ارد گرد کے دیگر گاؤں کے بدمعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں پھنسا کر انھیں کھوکھلا بنا دیا تھا۔ اور ادھر ان کے لئے مولا نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

سرخیوں کا سورج کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے تھانے سے ایک لمبا تڑنگا مسلمان تھانیدار

گھوڑے پر بیٹھا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لے کر پیر کے ٹھیٹھ میں آن دھمکا۔

گاؤں کے باہر ایک بڑے اور زرد گ پیپل کے پیڑ تلے پہنچ کر تھانیدار گھوڑے پر سے اترا۔ سنہرے کلاہ پر لپٹی ہوئی اس کی خاکی رنگ کی کلف لگی پگڑی کے لہراتے ہوئے شملے دور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چناں چہ گاؤں بھر کے چرواہوں، جنگیوں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھستے ہی اس کے پیچھے ہو لئے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنائے کھڑے تھے۔

پیپل کے نیچے بلا کی گرد تھی جس میں سوکھے پتے اور بھوسے کے تنکے ملے ہوئے تھے۔

گھوڑے کی لگام سکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھما کر تھانیدار نے دونوں طرف سے وردی کو کھینچ کر اپنے سڈول بدن پر جمایا۔ اس کا اونچا قد کلاہ دار پگڑی کے باعث اور بھی اونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دمکتی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی اور اس کی ناک جڑ ہی سے ایک دم اوپر کو اٹھی تھی۔ اپنی شاندار اونچی ناک کی وجہ سے وہ بڑا باوقار اور بارعب انسان نظر آتا تھا۔ ابھی نوجوانی کی ناتجربے کاری اس کے چہرے سے جھلکتی تھی لیکن وہ ذہین ضرور تھا۔ اس کی سبز رنگ کی پتلیوں کی وجہ سے وہ بقول دیہاتیوں کے انگریز کا جان پڑتا تھا۔

پہلے اس نے کھلی ہوا میں ٹہل ٹہل کر دو تین گہرے سانس لئے اور پھر جیب ٹٹول کر ایک خاکی رنگ کا کاغذ باہر نکالا اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثنا میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ادھر سکھ سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیپل کی جڑ سے باندھ دی۔

کہیں سے نمبردار کو خبر ملی تو وہ بچارا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جب وہاں پہنچا تو سانس یہ کہ دم پھولا ہوا، اور پگڑی ٹانگوں میں [illegible]

تھانیدار نے ٹانگیں اکڑا اکڑا کر نظر اوپر اٹھائی اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بچارا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تھانیدار نے تحکمانہ انداز سے کہا "میں تمہیں کو بلا رہا ہوں"

"جی مجھکو؟" اس آدمی نے اپنے سینے پر انگلی جماتے ہوئے پوچھا اور اثبات میں جواب پانے پر اس نے مضحکہ خیز انداز سے آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھانیدار کی جانب بڑھا۔

"تم مولا کا گھر جانتے ہو؟"

"آؤ جی..... اوؤ....."

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔"

وہ آدمی سرپٹ بھاگا۔ لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لئے پہلے ہی سے تمبکو اڑاتا چلا آ رہا تھا۔

تھانیدار سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے دور ہی سے حقہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے خلوص سے جھک کر خوشی سلام کیا۔ اور پھر آگے بڑھا۔

"مولیاں والیو! میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقہ تازہ کرنے میں دیر ہو گئی۔"

یہ کہہ کر مولا نے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقے کی نے اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

نمبردار آتے ہی چارپائی کا انتظام کرنے کے لئے الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر تھانیدار ایک گھمدر پر بیٹھنے لگا تو مولا نے بڑھ کر اپنا کھیس بچھا دیا اس پر۔ اور پھر للکار کر کہا "اوئے میاں دیو! اٹھ کے میرے گھر سے چارپائی اور بستر لے آؤ۔"

اس کی بات سنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانیدار نے پہلے تو چپ چاپ حقے کے خوب گہرے گہرے کش لئے اور پھر مولا کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا "سنا اوئے بھوتنی پلتر! بات کیا ہے آج چوروں کے گھر مور پڑ گئے؟"

"توبہ! میری توبہ!" کہتے کہتے مولا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا "جبر جبتو! اچھی تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بدنام برا۔"

"ہاں خوب یاد آیا" تھانیدار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اوئے عجیب سنیہا! جا جرا رام لعل مانھے کے ادھر لڑکے کو تو بلا کے لیا۔"

پہلے ہی سے سہمے ہوئے سدا گر نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دئے اور مسکین آواز میں بولا "کہاں صاب! بڑا ازنقہ ہو گیا ہے جی۔ بچارے مولا کی تاں کمر ہی ٹوٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔"

مولا نے ٹھنڈی سانس بھر کر حقہ نیچے کو لٹکا دیا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام لعل سفید دھوتی اور اس پر سفید کرتہ پہنے آ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم نازک بیس سالہ لڑکا ہیرا لعل بھی تھا جو پتلون پہنے تھا۔

تھانیدار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا، باپ پچاس اور ہیرا عمر کا سنجیدہ انسان تھا لیکن تھانیدار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بو آئی۔ تاہم اس نے کافی تحمل سے پوچھا۔

"ابے لونڈے اپنا نام بتائیو۔"

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آ گئی برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا۔

"YOU SHOULD NOT BE SO RUDE!"

تھانیدار کو انگریزی بس واجبی آتی تھی۔ اس لئے وہ تھکا نہ لہجے میں بولا "دیکھ اوئے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا..... جو کہنا ہو سو اپنی بولی میں کہو۔ تاکہ سب لوگ تمہارا بیان سمجھ سکیں۔"

نوجوان ذرا تیز مزاج تھا بولا "آپ افسر ہیں آپ کو ذرا تمیز سے بات کرنی چاہیئے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر تھانیدار نے سر اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے

سے سپاہی کو قریب بلایا اور مونٹ کاٹ کر بولا "عجیب سینما! ایسی منڈے کو تھوڑی تمیز دکھاؤ"

عجیب سنگھ کے دو تین جھانپڑ کھا کر نوجوان کھسک گئے۔ اس کے تھنوں میں سے ہنسی بہنے لگا۔ تھانیدار نے اس کے چکنے بالوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا "بیٹا! میں تمہارے ایسے شریف بدمعاشوں کو سیدھے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں" پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے "دیکھو جی ایک غریب کسان کا بیل گولی سے اڑا دیا اور اوپر سے دھونس جماتے ہیں۔ قانون ہمارے ہاتھ میں ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے"

حاضرین میں سے بیشتر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھانیدار نعرہ کر بولا "اوئے مولیا!"

"جی موتیاں والیو!"

مولا بغل ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ تھانیدار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

"بیل کہاں پر مرا پڑا ہے"

"شہنشاہ جی وہ تو ماتھوں کے کھیت ہی میں پڑا ہے۔ بچارا قسمت کا مارا باڑے میں سے نکل ان کے کھیتوں میں جا نکلا۔ بس اٹھا کے گولی داغ دی انھوں نے۔ بھلا دو ڈنڈے مار کر نکال دیتے سالے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا" یہ کہتے کہتے مولا نے رونی صورت بنا لی۔

ماتھا یہ الزام سنکر سٹپٹا گیا۔ لیکن بیٹے کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس لئے چپ ہو رہا۔

"ہم مرا ہوا بیل موقعہ پر دیکھیں گے"

"چلو موتیاں والیو!"

اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولا، سدا گر، بھو وغیرہ۔ ان کے پیچھے ماتھے۔ اور سب کے آخر میں ناک سڑ سڑاتے نیچے اور دیں ہلاتے ہوئے گئے۔

یہ لشکر کھیت پر پہنچا تو مولا نے ماتھوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سردی سے اکڑا ہوا بیل کھیت میں ٹانگیں پسارے پڑا ہے ..... مولا نے احتیاطاً ایک ڈنڈے کو وہاں بٹھا دیا تھا تاکہ گدھ اور کتے مردار کے قریب نہ آئیں۔

خاں صاحب (تھانیدار) نے بیل کی اگلی ٹانگوں کے پیچھے اور گردن میں لگی ہوئی گولیوں کے نشانات کو غور سے دیکھا۔ گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا۔ پھر گاؤں واپس آکر پیپل کی چھاؤں تلے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے ..... اس وقت ان کے لئے مکھن اور لسی کا کٹورا طیار تھا۔

مکھن کا گولا نگل کر اور اوپر سے لسی چڑھا کر خاں صاحب نے چھیں چھاڑ رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "ہاں بے مولا! اب بتا سارا قصہ۔ تیرا بیان لکھا جائے گا اب"

مولا نے کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے پچھلی رات کو وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ وہ لونڈا جو وہاں مویشیوں کی رکھوالی کے لئے مقرر تھا وہاں موجود بھی تھا یا نہیں۔ کیونکہ اس کمبخت کا ایک چمار سے یارانہ تھا۔ موقعہ پا کر راتوں کو ادھر بھی کھسک جایا کرتا تھا۔

"تم اکیلے تھے یا اور بھی کوئی ساتھ تھا؟"

"نہیں جی کیلا تھے، میرے نال سدا گر، میلو اور تجھو بھی تھے۔"

"یہ کب سے تمہارے ساتھ تھے؟"

"بادشاہو یہ تو ہر روز میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ کھانے وانے سے فرصت پا کر کبھی یہ میرے پاس آجاتے ہیں اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں گپ اڑانے کے لئے۔"

"اچھا اچھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر شہنشاہو! ابھی ہم باڑے سے دور ہی تھے کہ دھائیں دھائیں دو بار بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تو جی ڈر کے مارے کھیتوں میں چھپ گئے....."

"اچھا تو تم ڈر گئے؟" خان صاحب نے پوچھا کیونکہ مشکل ہی سے مولا ان آدمیوں میں سے دکھائی دیتا جنھیں ڈر کبھی چھوتا بھی نہیں۔

"آہو جی ہم ڈر گئے۔"

"اچھا پھر؟"

"اتنے میں یہ نکا ماہنہ گاؤں کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ پہلے ہم سمجھے کسی ڈاکو نے اس پر گولی چلائی ہے پر جی اس کے اپنے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر ہم گھبرا گئے.....؟"

"ہوں....." خان صاحب نے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں "پھر؟"

"پھر جی ہم باڑے کی طرف بڑھے راستے میں انھیں کے کھیت پڑتے ہیں۔ وہاں ہمیں سفید سفید چیز دکھائی دی۔ ہم ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ میرا بیل مرا پڑا ہے۔ میں نے سر پیٹ لیا۔ اور نزدیک سے دیکھا تو گولیوں کے نشان دکھائی دیئے۔"

تھانیدار صاحب نے مولا سے متعدد سوالات کئے پھر میلو، سدا گر اور تجھو کی جرح کی گئی۔

"اچھا تو سدا گر! تم نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ وہ رام لعل کا بیٹا ہیرا لال ہی تھا؟"

"ہاؤ جی۔"

اس طرح سے سب نے الگ الگ اس امر کی تصدیق کی۔ اب خان صاحب پھر ہیرا لعل کی طرف متوجہ ہوئے۔

"دیکھ ہیرا! سچ سچ بتا دو کہ آخر بات کیا ہے۔ ورنہ یاد رکھو میں مجرموں کا سخت دشمن ہوں۔ تمہارے پیچھے دو کانوں میں سر کر دونگا تمہارا....."

اب تو ہیرا لعل تاؤ میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی پہلی مار ہی سے اس کی ناک جل رہی تھی، اور ہونٹوں پر سوجن آگئی تھی۔ اس نے مدھم آواز میں کہا "یہ الزام بے بنیاد ہے میں تو کھانا کھا کر گھر سے باہر تک نہیں نکلا۔"

خان صاحب نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر کہا "لالہ! تمہارا لونڈا ذرا سخت وانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا کام بھی بھولے بھٹکوں کو راستے پر لانا ہے۔ سمجھا لو اپنے بیٹے کو ورنہ ایک بار میں نے ہاتھ اٹھا دیا تو یاد رکھو پہچان نہیں پاؤ گے کہ

اس کا سر کدھر کو تھا اور منہ کدھر کو۔"

رام لال مقدمے بازی سے تنگ آچکا تھا ہاتھ جوڑ کر بولا "خان صاحب! ابھی لڑکا ہی تو ہے شاید..... میں بیل کی قیمت دینے کو طیار ہوں۔"

"بیل کی قیمت؟" مولا نے چلا کر کہا "غریب کے بیل کی جان ایسی سستی نہیں ہوتی کہ جب جی چاہا مار دیا اور کچھ پیسے کی مٹھی جھانے لگے۔"

خان صاحب بولے "چپ رہو جی تم۔ بکواس بند کرو۔"

"نہیں بادشاہو! میری کیا مجال ہے۔" مولا ہاتھ جوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا لالہ اپنی بندوق تو منگواؤ ذرا۔"

بندوق حاضر کی گئی۔

ہیرا بولا "دیکھئے بندوق کی نالی میں گرد لگا کر میں نے الگ رکھ چھوڑی تھی۔"

خان صاحب نے ہیرا کی طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے "سب سمجھتا ہوں یہ گرد تو آج ہی کی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

تھوڑی دیر تک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انھوں نے سپاہی سے کہا۔

"عبدالرحمٰن! کاغذ لاؤ تو بندوق کی رسید لکھ دوں۔"

اس کے بعد سب کے بیانات مکمل کئے گئے۔ اور پھر تھانیدار نے کہا "بندوق تھانے میں داخل ہوگی۔ بیٹا! ہیرا چلو تھانے۔ پھر دیکھو میں ہیرا کا بٹیرا کیسے بناتا ہوں۔"

رام لعل بیٹے کے لئے سخت پریشان تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"خان صاحب! دیکھئے میں بیل کی قیمت اور جرمانہ دینے کو طیار ہوں۔"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں..... معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری جیب میں روپے اچھل رہے ہیں لالہ!"

رام لعل نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟"

"یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہوگا۔"

یہ کہہ کر خان صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لعل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے نے جوش میں آ کر گستاخی کی ہے۔ اس لئے اس کی خیر نہیں۔ کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"خان صاحب ایک بات عرض کروں؟"

خان صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

"بات یہ ہے کہ مولا کے بیل کو گولی میں نے ماری تھی۔"

خان صاحب نے ہنس کر گھوڑے کی ایڑی دی اور بولے "لالہ! لڑکے کو بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو۔ ذرا گواہوں

سے تو پوچھو۔ ہم تو قانون کے بندے ہیں۔"

جب تھانیدار صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بندوق بھی اپنے ساتھ لے گئے تو مولا نے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بھاری آواز میں بولا "یا مولا!" اس کے بعد سدا گر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "دیکھ بے سدا گر! تو گھوڑی پر سوار ہو کر سیدھا بھنبوڑی چلا جا اور بگا سنگھ سے کہدے کہ دھابلیں دھابلیں بولنے والی چڑیا پنجرے میں بند ہو گئی ہے۔"

(۳)

ابھی سورج ڈھل ہی رہا تھا کہ دفعتہً اس قدر زور کی آندھی اٹھی کہ زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ زمین کا سینہ پھٹ گیا ہے اور گرد کے بادل در بادل فلک بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ارد گرد کا یہ سمندر خس و خاشاک کو اڑاتا، اڑاتا چلا آ رہا ہے ——— سورج دفعتہً روپوش ہو گیا۔ ہر چہار جانب دھندلاہٹ اور پھر تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور گرد سے آسمان میں آنے والی آندھی کی خبر دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں خلط ملط ہو گئے۔

کلڑی کے بنے ہوئے بھاری بھرکم کھڑکیوں والے رہٹ کے اوپر چھائے ہوئے چھلاوہ کے پیڑوں کے جھنڈ میں سے کپورا سنگھ ٹھٹے والا ایک آتشیں نر نقشی والی سرتاپا مضبوط گھوڑی پر سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پیر کے تھلہ کی جانب دیکھا اور پھر دور دور تک بچھے ہوئے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن اس کی نظر دور تک نہیں جا سکی۔ کیونکہ آندھی دم بدم بڑھتی آ رہی تھی۔ کھیتوں کی فصلیں گرد آلود ہوا کی آمد آمد سے ایک بڑے تالاب کے میلے گدلے پانی کی طرح لہریں لیتے دکھائی دے رہی تھیں۔

کپورا سنگھ ٹھٹے والا جسے عام طور سے کالا تیتر کہتے تھے، اپنے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی بہن کو ملنے کے لئے گیا صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پر رکھتی ہے، وہ چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیورات اور اس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ بہت جسیم انسان تھا، کالا بھجنگ۔ حرامی پن نس نس میں رچا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حس اور جذبات کند ہو چکے تھے۔

ابھی وہ دور دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھیتوں میں چند سائے دکھائی دیئے جو پرچھائیوں کی طرح اس کی جانب آئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرد پہلے تو سبک دھول کی چادریں لہلہائیں پھر بھاری گرد و غبار اوپر کو اٹھنے لگی اور جو ہر کے پانی کی سرسراتے ہوئے سانپوں کی طرح ننھی ننھی لہریں بل کھا کھا کر کروٹیں لینے لگیں۔ ملوے، کرتے و

دیگر گھر بوچڑ، پیپل اور دھریک کے پیڑوں میں پناہ گزین ہو گئیں۔

کھیت کھیت چلتے ہوئے وہ آدمی جب قریب پہنچے تو کپورے نے انھیں پہچان لیا۔ آگے آگے مولا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے سداگر، بھو، اور میلا سنگھ۔

انھیں دیکھتے ہی کپورا کرخت لہجے میں بولا۔

"تم لوگ کہاں تھے؟"

"یہیں تو تھے" سداگر نے ہنس کر جواب دیا۔

کپورے کو سداگر کی ہنسی پسند نہیں آئی۔ اس نے اس کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ خود بہت کم ہنستا تھا۔ ظاہر تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سداگر کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا جھانپڑ دے گا۔ لیکن پھر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور مولا سے مخاطب ہوا۔

"مولا!"

"ہوں"

"سب ٹھیک؟"

"ہم تو سب ٹھیک ہی ہیں ..... طیاری تو تمھاری ہونی چاہیئے"

اسے مولا کی حاضر جوابی بھی پسند نہیں آئی۔ لیکن اس وقت غصے کا موقعہ نہیں تھا اور کچھ نہیں تو ڈاکے کا معاملہ چوپٹ ہو جانے کا ڈر تھا۔ تاہم اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہماری طیاری سے تمھارا مطلب؟ تم تو اپنی کہو"

"ہمارا کام تو کبھی کا ہو چکا۔ گاؤں میں ایک بندوق تھی سو اب تھانے میں ہے"

"کسی طرف سے کوئی بات نکلی تو نہیں"

"نہیں"

"کوئی افواہ۔ شک و شبہ"

"کچھ نہیں"

کپورے کی گھوڑی شاید آندھی میں کسی قسم کی بُو پا کر بے چین ہو ہو کر بدکتی اور بے چینی سے زمین پر سُم جھاڑتی تھی۔ لیکن وہ اس پر خوب جم کر بیٹھا تھا۔

تاریکی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ کپورے کی لمبے کتے تاروں کی طرح سخت داڑھی کے بال لہرانے لگے کھیتوں سے بھاگ کر لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ چور خوش تھے آج پروردگار بھی ان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ انھیں کئی ساتھیوں کا انتظار تھا جو دور دور یعنی چٹیالے تک سے آنے والے تھے۔ کپورے نے سوچا کہ اگر آندھی کی یہی کیفیت رہی تو انھیں اپنی کارروائی جلد شروع کرنی ہوگی۔

کپورا بولا "اچھا اب میں چلتا ہوں"

"ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے"

"آ گئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں میرا وقت خراب ہوا"

"ہم تمہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیئے"

"رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا"

"پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے۔ پھر ہم کھیتوں میں چلے گئے"

"کیوں؟"

"ہم نے سوچا کہ کہیں رہٹ پر کوئی ہمیں ساتھ ساتھ دیکھ نہ لے"

"یہ اچھی حرکت کی تم نے۔ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو خود پھنسو گے اور ہمیں بھی پھنساؤ گے۔ اگر مجھے کوئی اس جگہ دیکھ لیتا تو؟"

مولا بولا "اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم اپنی جگہ سے تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن آندھی کی وجہ سے تم دکھائی نہیں دیئے ..... بھئی آگے کو خیال رکھیں گے۔ ایسی غلطی نہیں ہوگی"

اس پر کپورا خوش ہو گیا۔ بولا۔

"دیکھو ہم آگے پیچھے اسی جگہ رکیں گے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہمیں خبر کر دینا"

"اچھی بات"

"مولا! تمہارا گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے"

"تو پھر ذرا نظر رکھنا۔ تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم ہمیں ایک شخص ہمیں یہاں آن ملے گا"

"لیکن آندھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا جور رہے۔ تھوڑی دیر میں ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دے گا۔ تم لوگ اتنی دور سے کیسے دکھائی دے سکتے ہو"

کپورے نے قدرے تامل کیا۔ پھر بولا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اب کریں کیا؟"

"تم یہ بتاؤ کہ سب کرے کر کب تک لوٹ آئیں گے؟"

کپورے نے قدرے غور کرنے کے بعد جواب دیا "بھئی چٹیلے اور جنید تک سے جوان آ رہے ہیں۔ اگر سب بچ گئے تو ہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آئیں گے"

"اچھی بات"

"اور کیا۔ اب رات بھیگنے کا انتظار تو کریں گے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا جائے گا کہ دن طبیعت کھنس ہو جائے گی"

"ٹھیک ہے"

"لو بھئی اب میں چلا"

یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑی کو ایڑ دی اور بگولے کی سی تیزی کے ساتھ دم بدم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

(۴)

ایک گھنٹہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ پیر کے ٹھٹھے پر ایسی گہری تاریکی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کپورا اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈنیوں پر سوار اندھا دھند چلے آ رہے تھے۔ تیز و تند ہوا گویا ان کے کپڑے نوچ کر ان کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور مونچھیں گرد سے اٹ گئی تھیں آنکھوں کی پلکیں ایک دوسری میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر کپورا ان کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ کبھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔

ان میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی ملے جلے لوگ شامل تھے۔ ان کے پاس دو بچی رائفلیں تھیں، جن کی نالیوں کے دہانے انھوں نے کپڑے کی ڈاٹوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ جانے پائے۔ لاری کے اسٹرنگ کی نالی والی ایک بندوق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کرپانوں، چھریوں، لاٹھیوں اور صفا جنگوں سے مسلح تھے۔

اس وقت دور سے پیر کا ٹھٹھہ مرے ہوئے بھینسے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں سے ہٹ کر سنت وتار سنگھ جی کی ٹوٹی ہوئی سمادھ کی اونچی دیواریں الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیو کے مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ بوسیدہ دیوار کے قریب سڑتے ہوئے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر سبز رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی اور دیوار کی دراڑوں سے جنگلی بیلیں لٹک آئی تھیں اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو چوما کرتی تھیں۔

مولا نے سداگر کو حسب وعدہ موقعہ پر بھیج دیا تھا۔ سداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو دھسے میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تاریکی میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا البتہ کانوں میں گھوڑوں کے سموں کی ٹاپ اور سانڈنیوں کے بلبلانے کی آوازیں آئیں تو اس نے چوکنا ہو کر گردن اوپر اٹھائی لیکن ڈاکو چشم زدن میں اس کے سر پر تھے۔ اس تاریکی میں چھروں کی دھیمی چمک اور بھی زیادہ خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔

آندھی کے شور میں آواز گونجی۔

"کون؟"

"سداگر" سداگر نے جلدی سے جواب دیا مبادا جواب دینے میں تاخیر ہو اور اس کا سر چھوی کے ایک ہی وار سے کٹ کر الگ جا گرے۔

"سداگر کون؟"

اب سداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے چلا کر بولا "اوئے ہیں ..... ہیں سداگر ٹھٹھے والا۔ کپورا کتھے اے؟"

عین وقت پر کپورے کی گھوڑی چل کر آگے بڑھی۔ "سداگر"
"ہاؤ کپورا"
"ارے اپنا ہی منڈا ہے" کپورے نے ساتھیوں سے کہا۔ پھر سداگر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔
"مولا بھی ہے"
"نہیں ——— وہ گھر پر ہے"
"ہاں سب ٹھیک ہے"
"سب ٹھیک ٹھاک ہے"
اس اثنا میں گرد آلود ہوا فراٹے بھرتی رہی۔ گھوڑے اور ساز ٹھنیاں بے چینی سے رقصاں تھیں۔
فوراً ڈاکوؤں نے چندے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ اور پھر کپورا سداگر سے بولا۔
"سداگر بچو اب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔"
سداگر کچھ کہے بغیر اٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔
کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا "سداگر! طویلہ تو کھالی ہے نا"
"ہاؤ بالکل کھالی ہے"
"ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو"
"ارے نہیں"
رہٹ پر پہنچ کر وہ گھوڑوں اور ساز ٹھنیوں سے نیچے اترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کر کے سداگر کو رکھوالی کے لئے مقرر کیا اور خود سارے ساز و سامان سمیت گاؤں کی طرف بڑھے۔
مولا کے مکان کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے دروازے میں اینٹیں پھنسا کر تختوں کو ایک جگہ جما دیا تھا۔ اور وہ خود بھوکے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ بیلا سنگھ الگ بیٹھا داڑھی کریدر ہا تھا۔
انھوں نے دروازے میں سے ڈاکوؤں کے گروہ کو پہچان لیا جب وہ قریب آ گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں سب کے سب بڑے مضبوط اور تڑیچھے تنگے آدمی شامل تھے۔
مولا تہبند جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا "ساب سلامت!"
"ساب سلامت اے جی" دبی دبی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔
مولا بڑھ کر دہلیز تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔ انھوں نے پگڑیوں کے شملے گھما کر چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوا آنکھوں کے ان کے چہروں کا اور کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے۔ ان کے جسم سرسوں کے تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بو بھی پھیل رہی تھی۔

مولا نے گری ہوئی لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آج تاں اللہ دا بڑا چھل ہے جی۔"

"ہاؤ۔"

مولا نے کپورے کی ننگی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آ بھا! پانی کا تجی پی لو سارے۔"

کپورے نے جٹا جھاڑ ناریل کے مانند اپنے سر کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی! بکت گھٹ لے۔ پانی کا تجی کی بات چھڈ۔"

مولا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"جارو! سواری بنا آگئے او؟"

"نہیں گھوڑے ڈاچیاں طبیلے میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"پر بھا! گھوڑے کچھ تجیک رکھو۔ بھاگتے وقت جرورت پڑے گی ..... اور پھر کپورا! تمھیں کسی نے پچھان لیا تو آپھت آجائے گی۔ تو اپنی گھوڑی بہت تجیک رکھنا ....."

کپورے کو مولا کی بات پسند آئی اس نے جھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ اور وہ "ہاؤ" کہہ کر طویلے کی جانب روانہ ہو گیا۔

کپورے نے مولا سے کہا۔

"مولیا! اب دیر مت کرو۔ بس چلو ایسا موقعہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"بوت اچھا۔"

مولا نے پھونک مار کر دیا بجھا یا تو اس کی لمبی لمبی مونچھیں پھڑکیں۔

اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔ گوبر کے ڈھیروں، جوہڑ اور اور ٹیلوں کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔

آندھی کی وجہ سے بے پناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقعہ پر گتے بھی تنوروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ نے دبی سی بھوں کی آواز نکالی بھی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل طیار تھے۔ ہر اہم موڑ پر کپورا ایک آدمی کھڑا کر دیتا۔

مولا کی ابھی تک بگا سنگھ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگا کم گو انسان تھا۔ مولا اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بگے کے دوش بدوش چلا جا رہا تھا۔ بگا تاڑ کی طرح لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں وحشی جانور کی آنکھوں کی سی چمک اور تجسس تھا۔ وہی ان سب کا سردار تھا۔

ڈاکو طویل کنکھجورے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔

بگے نے مولا سے دریافت کیا۔

"مکان ہے کہاں؟"

"گاؤں کے بیچوں بیچ"

یہ سنکر بگے کے ابرو پر بل پڑ گیا۔ بگو نے دبی زبان میں کہا۔

"اگر لوگ باگ جاگ پڑے تو اس تاریکی اور آندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لئے بہت احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"

مولا نے قدرے بے پرواہی سے کہا۔

"ارے بھائی، تم لوگوں کے سامنے کون ٹکا رہ سکے گا۔ چاہے سو آدمیوں سے بھی مقابلہ کیوں نہ ہو جائے۔"

بگے پر مولا کی اس بڑکا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک گرگ جہاندیدہ تھا۔ اس وقت سوال مقابلہ کر سکنے یا نہ کر سکنے کا نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی بچ کر نکلنا چاہیئے ورنہ ایک آدھ بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آجائے گی۔ اس قدر آندھی، تاریکی اور شور میں یہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا جانا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولا کو محسوس ہوتا تھا۔

معاً بگو ایک دم رک گیا اور اس کے پیچھے پیچھے سب ڈاکو رک گئے۔

تاریکی میں سامنے سے انہیں ایک تاریک تر سایہ دکھائی دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی جلد جلد قدم اٹھاتا بڑھا چلا آرہا ہے۔

وہ سب چشم زدن میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ آدمی بدن پر کالی چادر لپیٹے تیزی سے بڑھتا آرہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

ڈاکو دم سادھے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھجا بڑھا ہوا تھا اس لئے وہ مکمل تاریکی میں کھڑے تھے۔ یوں سامنے سے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض بگو کی تجسس آنکھوں نے ہی اجنبی کو آتے دیکھ پایا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی اور کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس غریب کو اس امر کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ وہ چھپا چھپا ڈاکوؤں کی چھریوں کے سائے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چیخ کی آواز نکل جاتی تو اس کا سر تن سے جدا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی وہ اس مخبر سے آدمی کے سائے کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطار سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ وہ اس وقت خون خرابہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چیخ نکل جاتی۔ اور اس چیخ کو سن کر گاؤں میں شور مچ جاتا تو انہیں خالی ہاتھ واپس بھاگنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ اونچے چبوترے والے بڑے کنویں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی اونچی اونچی چرخیاں سر جھکائے غمناک انداز میں کھڑی ہیں۔ اور ان چرخیوں کے قدموں میں ناہموار پیندوں والے ہے کے ڈولچے ہوا کے زور سے ہل ہل کر ڈنگا ڈنگ کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چبوترے کے قریب کھڑے شہتوتوں کے پیڑ گویا

انھیں خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب فوراً پیڑوں کے جھنڈ کے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں مشورہ کر لیں۔

کپورے نے چھوٹے چھوٹے سب کی تعداد معلوم کی مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

"اس جگہ کم سے کم تین جوان کھڑے رہنے چاہئیں"

"وہ کیوں" ان میں سے ایک نے جو لمبا چوڑا تھا، اعتراض کیا۔

کپورے کو اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے ابرو پر گھرے بل ڈال کر اس کی جانب دیکھا اور پھر گہری سانس لیکر اس نے اپنے غصے کو دبایا اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

"اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے۔ جو مکانوں کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے بھاگ نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے"

"ارے آپاں نوں پتا نہیں اے۔ آپاں نال کو مقابلہ کر سکتا ہے" نوجوان نے بازو ہوا میں لہرا کے بے پرواہی سے بلند آواز میں کہا۔

اب تو کپورے کا جی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر نوجوان بھی بپھرنے لگا نوجوان منہ زور اور جوشیلا ہی سہی لیکن کپورے کے مقابلے میں کھڑا ہونا تو سراسر حماقت تھی اس کی۔

شاید ان کے دو دو ہاتھ ہو بھی جاتے لیکن بگے نے نوجوان کو آنکھ دکھائی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بگا کپورے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"ادھر جو تنگ گلی تم دیکھ رہے ہو اسی کے اندر ہمیں جانا ہے۔ وہ مکانات جن پر ہماری نظر ہے قلعے کے مانند ہیں ہر آفت سے بچے ہوئے ہیں۔ اول تو وہاں پہنچنے کا کسی ڈاکو کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری یہ پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کہیں گھر گئے۔ تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سب کے سب صحیح سلامت نکل جائیں ..... صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے خطرے کے موقعہ پر ہمارا ایک آدمی فوراً گلی کے اندر آ کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اول تو ہمیں مقابلہ کرنا ہی نہ پڑے۔ لیکن ایسا ہو بھی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو"

بگے نے اثبات میں سر ہلایا۔

کپورے نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ آدمی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا نقصان بھی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اس ہلڑ بازی آدھی اور اندھیرے میں ہم اپنے ساتھیوں کی گنتی بھی نہیں کر پائیں گے"

بگا کو حرف بحرف اس سے اتفاق تھا۔

چنانچہ تین آدمی وہاں پر چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ گلی میں پہنچ کر انھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا کا زور کم تھا البتہ قیامت کا شور کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔

دفعتہً بگا ایک دم رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے قدم رک گئے۔ اور وہ اپنی نقوتنیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سن سکیں۔

بگے نے ساہنسی کی طرف دیکھ کر پوچھا:

"بانس نہیں لائے؟"

"ارے وہ تو بھول گئے۔"

"واہ اوئے بھئو..... تو کیا اب..... کے سہارے چڑھو گے چھت پر؟"

"بانس کون دور ہے۔ مولا کے گھر ہی سے تو لانا ہے۔ جبکہ جا رہے ہو بھاگ کے جا اور مولا کی ڈیوڑھی کے اندر جس کے کونے میں ایک لمبا بانس دھرا ہوگا..... بس اٹھا کر پھر دن بانس آنا....."

بگے نے تھوتھنی گھمائی اور ناک کی سیدھ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل دیا۔

وہ سب پھر آگے بڑھے۔ کچھ دور جا کر گلی بائیں ہاتھ کو گھوم گئی تھی۔ موڑ سے چند قدم آگے داہنے ہاتھ کو ایک اونچا مکان تھا جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں بڑے بڑے خشک جھاڑ، اور مختلف (کپس کی چھڑیاں) کے انبار گلے مکان کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ جب کسی گنگا کے بچے جلتے ہوتے تو وہ چھینٹ کر انہی میں آن کر پناہ لیتی۔ ایک کونے میں بھڑ بھڑ جلنے کا جو لگا تھا جس میں اس وقت رب بھری تھی۔

وہاں رک کر انھوں نے اس مکان کے کھلواڑے کا جائزہ لیا جس کے اندر انہیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔ چھت سے بجلی چمک چمک کر آنکھیں دکھا رہی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں سیاہ دامن لہراتی بے پناہ دل کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پھیلنے لگیں۔ آندھی کے زور میں کمی تو نہ آئی تھی البتہ ہوا میں پہلی سی گرد باقی نہ رہی تھی۔

کھوڑے کے اشارے پر وہ پھر رک گئے۔ ان کی داڑھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا:

"سب لوگ یہیں پر رکیں میں بگے کو لے کر مکانوں کو اگلی طرف سے دیکھ دوں ہوا؟"

وہ دونوں چند ہی قدم پر پہنچ کر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ساہنسی نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ اس پر بانس کی مدد سے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ان میں ایک بولا۔

"بھئو! مکان جھرا اونچا معلوم ہوتا ہے؟"

"ہاں ——— ہے تو!"

"اگر تم بانس کے زور سے پھلانگ کر اس پر نہ چڑھ سکے تو ادھر ادھر سے اوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا بھی دکھائی نہیں دیتا..... پھر تو آگے والے دروازے سے جانا پڑے گا۔"

ساہنسی چپ چاپ دانتوں سے مونچھ کا ایک سرا چباتا رہا۔ پھر یوں بولا جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو۔

"میں آگے بڑھ کر دیوار کے نیچے سے ٹھیک اندازہ لگا سکتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ کر چھٹی کے ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے بعد بگا اور کپورا بھی واپس آ گئے۔ بگا بولا۔

"پہلے تو کپورے کی بہن پر ہاتھ صاف کرنا ہوگا۔ اس کے بعد پڑوس کے چند گھر بھی اچھے ہیں ان پر بھی جلدی سے ہاتھ پھیر دیا جائے..... اپنا ساہنسی یار کدھر گیا؟"

"وہ دیوار کی طرف گیا ہے آتا ہی ہوگا۔ اندھیرے میں اسے بھی کچھ سوجھ نہیں رہا۔"

چند ثانیوں کے بعد ساہنسی آ گیا۔

اسے دیکھتے ہی بگے نے کہا۔

"مکان تو اونچا ہے بھئی"

"ہاں بھا" ساہنسی نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی۔ اور پھر قدرے بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔ شاید اس کے ہاتھ بانس پکڑنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔

"پھر؟" بگے نے سوال کیا۔

ساہنسی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"

بگے کو اس کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا لیکن سردست اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی تو نہ تھا۔

اتنے میں لمبو ہاتھ میں لمبا بانس لئے یوں وارد ہوا جیسے بڑے مورچے کو کندھے پر لادے لا رہا ہو۔ ساہنسی نے بڑھ کر بانس تھام لیا۔ پہلے اسے لچکا لچکا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب نظر دوڑائی۔ مٹیالے آسمان پر کالے بادل گدلے دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

اب ساہنسی نے اپنی کمر کے گرد مبارستہ لپیٹا اور زمین پر ہاتھ مار کر دو ڈھیلے کمربند میں ٹھونس لئے اور سرگھما کر دھیمی آواز میں ساتھیوں سے کہا۔

"اچھا اب میں کوشش کرتا ہوں۔ چھت پر صحیح و سلامت پہنچ گیا تو یہ دو ڈھیلے تمہاری طرف پھینکوں گا"

بعد ازاں اس نے لمبے بانس کو سنبھالا، اسے دونوں ہاتھوں میں تولا اور پھر دو چار بار پاؤں کے پنجوں پر ناچ کر تیزی سے بھاگ نکلا..... معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔

سب نے سر پر پھر پھڑاتے ہوئے چمگادڑ کی طرح ہوا میں اٹھتے دیکھا۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پر پہنچ گیا ہے۔

اگر بجلی چمک جاتی تو اسے دیکھ ہی لیتے۔ ورنہ ..... تڑاق سے دو ڈھیلے ان کے قریب گرے ایک تو میلو کی ٹانگ پر لگا۔

"او کے میاں دیا" وہ ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن چوٹ بالکل معمولی تھی ڈھیلا کچی مٹی کا تھا۔

اب بگے نے چند آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند اچھے لڑاکا جوان رہتے ہیں جو جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چپ چاپ اور پھرتی سے اپنا آپ سیدھا کر کے نواور دو گیارہ ہو جانا ہے۔ سمجھے؟"

"ہاؤ بھئو" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپورے نے میلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جوانوں کو لے کے مکان کے دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ ادھر چلے گئے تو کپورا بگے کو ساتھ لے پچھواڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم رکے بھی نہ تھے کہ چھت پر سے رسہ لمبے ناگ کی طرح پھنپھناتا اور لہراتا ہوا نیچے کو جھولنے لگا۔

باری باری دونوں رسے کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی منڈیر بمشکل چار چھ انگل اونچی ہو گی۔ تیز و تند آندھی کے زور میں انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور وہ چشم زدن میں اڑ کر گاؤں کے باہر جا گریں گے۔ اس لئے وہ جھکے جھکے صحن سے آنے والی سیڑھی پر بنی ہوئی مٹی کی جانب بڑھے۔ یہ اور خوشی کی بات تھی کہ مٹی کا دروازہ ابھی کھلا تھا ورنہ انہیں کود پھاند کر نیچے جانا پڑتا۔ اس سے بظاہر ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپورے کے ہاتھ میں رائفل تھی، بگے کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھری اور سانسی حسب معمول ملبا سا چھرا تھامے تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو پگڑیوں کے شملوں میں چھپایا۔ صرف آنکھوں اور ابروؤں کو ننگا چھوڑ دیا۔ اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے۔

وہ کافی نیچے جا چکے تھے کہ دفعتہً موڑ سے مٹمٹاتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لالٹین یا چراغ لئے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا آ رہا ہے ..... وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ کچھ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ چراغ کے پیچھے دو زنانہ پاؤں دکھائی دیئے اور ان کی آنکھیں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی آنکھوں سے ملیں جو چراغ کو اپنے دونوں ہاتھ کے حلقے میں لئے ہوئے تھی تاکہ وہ بجھ نہ جائے۔

انہیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ فق پڑ گیا۔ اس نے بڑی زبان باہر نکال کر حلق سے ایک دلدوز چیخ نکالنے کی کوشش کی لیکن مارے خوف کے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

بگے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ انہوں نے اس کے منہ میں اسی کی چنڈری کو ٹھونس ٹھانس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دیوار کے کونے میں ڈال دیا۔

صحن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیوڑھی ہے۔ اور دوسری جانب مکان کا پسار معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے

نکل کر لڑکی آئی تھی اس کا کنڈا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا تاکہ ہوا کی تیزی کے باعث دروازہ نہ کھلے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور گھر والوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بگا اور ساہنسی دروازے کے دونوں جانب اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ اور کپورا باقی ساتھیوں کیلئے گلی کا دروازہ کھولنے کو ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ ڈیوڑھی میں مویشی بندھے تھے۔ ایک بیل تو اسے اتنا پسند آیا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے بھی وہ اپنے ہمراہ لیتا جائے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ناممکن تھا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس نے گلی میں جھانکا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے بیل ہانکنے کے انداز میں ہٹو ہٹو کر کے دو تین آوازیں نکالیں تو متعدد سائے اس کی جانب بڑھے جیسے کالی دیواروں نے انہیں جنم دے دیا ہو۔

کپورے نے ایک جوان کو بندوق سمیت گھر کے پچھواڑے مچھی کے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لئے بھیجا اور باقی لوگوں کو اندر لے آیا۔

دو گھڑی بعد وہ سب لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ بگو نے چھری بڑھائی اور دروازے کے کنڈے میں اڑس کر ٹھوکا جو دیا تو کنڈا بڑی آواز سے کھل کر گرا اور تڑاتڑ بجنے لگا۔ دروازے کے دونوں تختے زور زور سے پٹکھا جھلنے لگے۔

گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی لوٹی کا دروازہ بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر آنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دروازے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بگو اور ساہنسی کو نہیں دیکھ پایا۔ جب اس نے لڑکی کو صحن میں نہ پا کر گردن گھمائی تو بگو اور ساہنسی کی صورتیں دکھائی دیں اس نے گھبرا کر پوچھا:-

"آپ کون ہیں؟"

اسی اثنا میں باقی آدمی بھی ڈیوڑھی میں گھس آئے اور دروازہ بند ہو گیا۔ ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کپورے نے اس کی گدی پر اُلٹے ہاتھ کا ایسا دھپ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہو گیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ لالٹین کی روشنی میں ان کے ہتھیار جگمگا اٹھے۔ جان کے خوف سے گھر کے کسی فرد نے شور نہیں مچایا۔ ان کا بھی وہی علاج کیا گیا جو پہلی لڑکی کا کیا گیا تھا۔

کپورا ذرا چھپا چھپا ہی رہا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ وہ بگو کو اندر والے کمروں میں لے گیا اور ان کی پونجی کی طرف اشارہ کیا۔ دم کے دم میں سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے۔ بگو نے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد جانچ لی اور پھر وہ دو حصوں میں بٹ کر پڑوس کے مکانوں کی جانب بڑھے جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

اتنے میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کے قدم رک گئے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ پھر دھڑا دھڑ دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ آندھی کے شور میں مردوں کے للکارنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔

موقعہ کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس زخیز نشانہ باز جوان کی کپورے نے بندوق سمیت مکان کے پچھواڑے ڈیوٹی لگائی تھی، اس نے ہر طرح آہٹ

میں یہ گولیاں چلا دی نہیں۔ ہوا یہ کہ آندھی کے زور سے مچھٹی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آگئے اور لڑکتے ہوئے اس کی جانب بڑھے اور اس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر بے دریغ گولیاں چلا دیں۔

اسی اثناء میں گاؤں کے مختلف حصوں سے خطرے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ چرکھڑیوں والے کنوئیں کی جانب سے "ایلی ایلی" کی آوازیں آنے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھی انھیں خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔

اب انھوں نے میلو کو آگے لگایا اور سرپٹ بھاگے۔

چرکھڑیوں والے کنوئیں تک پہنچے تو وہاں اندھا دھند لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ گاؤں کے منچلے بھی جلدی میں جیسا ہتھیار ملا لے کر مقابلے پر آن ڈٹے تھے۔ لیکن تاریکی اور آندھی نے انھیں کچھ کرنے نہ دیا۔

ادھر بھاگ کے مدحاتے ہوئے ساتھی گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے ادھر ادھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں کپورے کو اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی وہ فوراً اچھل کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی منہ زور گھوڑی کو ایڑ دے گا تو وہ گاؤں کے ہجوم کو کاٹی کی طرح چیرتی ہوئی نکل جائیگی۔ لیکن عین اس وقت بجلی چمکی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور آندھی کے بھیانک شور میں کالا تتر کالا تتر کی وحشیانہ آوازیں گھل مل گئیں۔

ایڑ دیئے جانے پر گھوڑی ہٹ کر جو اچھلی تو گاؤں کے ایک منچلے جوان نے اس کی لگام پر جھپٹا مارا۔ اس پر گھوڑی ہنہنا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، کان پھڑپھڑائے اور ایال لہرائی..... سوار نے ہونٹ کاٹ کر پیٹ کی آنتیں اوجھڑتی ہوئی انھیں پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے مگرمچھ کی طرح بل کھا کر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور لمحہ بھر میں زمین اس کے گاڑھے خون سے سرخ ہو گئی.....

پھر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

ریلوے جنکشن

قدرت اللہ شہاب

"کتنی چھٹی پر آئے ہو؟" نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی جلک سلیک کے پوچھا۔

"پندرہ دن کی" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ چلو اس بار تمہیں لاہور کی زہین و زرمال گاڑیاں دکھائیں گے" نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

"میں سیر کروں گا" وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقانہ انداز سے کہتا ہے "تم کہانیاں لکھنا"

یہ واقعہ عمل ہم دونوں کے حسب منشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان میں ہم کمال بے حیائی کے ساتھ ایک ایسی میز پر جا ڈٹے۔ جہاں پہلے سے دو ایک ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو آرٹسٹ، کچھ ادیب اور چند گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ ایک صاحب کولڈ ڈرنک نوش جاں فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ڈرنک اس گرم چائے سے مختلف ہے۔ جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص وجود کی زیادہ ہے۔ اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت جو پروہیبیشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے۔ اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لیے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ روحانی، جسمانی، ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر کھوکھلی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تن دہی سے تشخیص ہو رہے ہیں۔ نسخوں پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ میز پر کھٹے پڑتے ہیں۔ کرسیاں گھسٹتے اٹھتے بیٹھتے ہیں ——— لیکن اس وقت قوم کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے والی ہے۔ جس میں کولڈ ڈرنک بڑی احتیاط سے مخلوط ہے۔ کولڈ ڈرنک والے صاحب پیالی منہ سے لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ اور اپنے اردگرد اف دوہن سیاستوں کے طوفان بدتمیزی کے باوجود بڑی بے تعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈ ڈرنک صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں، آج دوسرے پروگرام ہیں" نثار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاص زور دیتا ہے۔

"ہوں!" کوثری صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں۔ "نثار، تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر ہیں یہ؟"

نثار قہقہہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے "میونسپل کمشنر نہیں، بھائی، یہ ہونہار ڈپٹی کمشنر ہے۔ ڈپٹی کمشنر!"

کوثری صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے "ٹھیک ہے" وہ بڑے مربیانہ انداز سے فرماتے ہیں "اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ساتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں "ہونہار، تم بے فکر رہو۔ میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ۔"

"یہ کچھ لاہور کی زمین و زمان کا تماشا بھی دیکھنا چاہتا ہے۔" نثار مؤدبانہ گزارش کرتا ہے "یہ ان پر کہانیاں لکھے گا۔"

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟" کوثری صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ "کہاں لکھتے ہو؟"

میں نجابت سے منٹو، کرشن، سویرا، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ کے نام لیتا ہوں۔

"یہ رسالے کہاں سے چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے۔" کوثری صاحب کی نظریں میری ادبی پوزیشن گرجاتی ہے۔ وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشفقانہ انداز میں مجھے رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شعر، فاؤنٹین پین یا چکاری میں لکھا کروں۔ کوثری کا آخری پیارا حق میں انقلابی کردہ ان رسالوں پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں تو نثار، اور کوثری صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی متانت سے اپنے مخصوص لطیفہ کا پرچار کرتا ہے: "دیکھو! اخبار کے عقب میں چھپنے والی جو اگر ڈی ہوتی ہے ..... چوبجی والی میں کالا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں ..... مہوگا رنگ والی جو اسی سال میٹرک میں پاس ہوئی ہے ..... گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو نرس میکنیشن کی طرح لگتی ہے ..... ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے ....."

لیکن نثار اور کوثری صاحب تانگے والے کے پرچیدے سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔

"تم سالے باسی کڑھی کا ابال ہو۔" کوثری صاحب خفا ہوتے ہیں۔ "تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں۔" تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے۔ "ارے کیا ہے صاحب ذرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے کالے خاں پٹھان نے پورے سات سو روپے دیئے تھے۔ تمہاری خاطر دو سو میں منا لوں گا۔ بچوں!"

آلو بخارا کے نام پر نثار اور کوثری صاحب کی رال بھی ٹپکنے لگی۔ لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر ان کے چہرے لٹک جاتے ہیں وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھورتے ہیں۔ خاص طور پر کوثری صاحب کے انداز بڑی شدت سے اظہار رہے ہیں، کہ ہونہار دیکھو! میں تمہیں اپنی خدمت کا سنہری موقعہ دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آئے تو ڈپٹی کمشنر نہیں بگھیارے ہو ..... لیکن میرے انداز میں کہ انہیں نرمی بہ ترکی جواب دیتے ہیں، اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کوچہ وار کے بعد موضوع سخن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سنگین اور رنگین گالیاں سناتا ہے۔ فنکار اپنے بگڑی دوستوں کی تعریف کرتا ہے۔ جو ضرورت کے وقت اس پر کئی کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور کولڈی صاحب پاکستان کے جملہ افسروں کی کھینگی، نالائقی اور بدیانتی پر بھی کھل کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈی اپنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند اور اعلیٰ گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نوٹنکی کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے تو کولڈی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے ڈگمگا رہے ہوتے ہیں اور وہ اس کوشش میں چل کر بڑی خوش سلیقگی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں "شوپاہی جی شلام۔ جیتے رہو"

سپاہی نتھنے پھیلا کر کولڈی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے۔ "اچھا! آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے صاحب پرمٹ کہاں ہے؟"

کولڈی صاحب فتح مند ٹرخ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ تاہم وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہوں اور نوٹنکی کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بش شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر باکی روپے کانوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ تانگہ اور کولڈی صاحب کی گرمی گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان بات کا مسئلہ زیر غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف کو چل کھڑے ہوتے ہیں۔

نوٹنکی کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں تانگہ، کولڈی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس کوشش میں میں ہیرا منڈی کی بے شمار ٹیڑھی میڑھی گلیوں کے تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر سرگشت کرتے ہوئے شائقین، قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال، دروازوں اور دریچوں میں گڑیوں کی طرح سجی ہوئی عورتیں ——— اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود یہ ساری مخلوق الف ننگی ہے۔ اور ان کے جسم اور ان کی زبان ایک ہی آواز سر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی باورچی خانوں کا اجتماعی زہر گلیوں اور سڑکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے دور دور کا خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گدیں لگائے بیٹھی ہیں۔ بلا ایک پھر سے اڑ جائیں گی۔ اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے زخم دے دیں گی ——— لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر چھاپک سے ہتھوڑا ایک بڑا سا غلغلہ آ گرتا ہے۔ جو ایک آدھ موٹی سی عورت دروازے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھٹا کھٹ کر کے مجھے ٹھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے۔ اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے۔ جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمد" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفن ہے۔ ایک طرف نماز میں، بیڑی کی چند خالی اور شکستہ ڈبیاں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لیے ایک پرانا

عام ہے۔ جس کا پانی باسی لعاب دہن کی طرح کثیف ہے۔ اور پڑے زوروں سے بھک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے جو تیز رفتاری سے چلتا چلتا اچانک پٹڑی سے اتر گیا ہو!

ہیرا منڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد آپہنچتا ہوں اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں۔ اور ان کے ڈرائیور ادھر ادھر بیٹھے بے دلی سے اونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفاء کی سواریاں ہیں۔ جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آویزیم شبی یا اقبال کے مزار پر ہدیۂ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے بے اختیار ہیرا منڈی کے ضاں خانوں میں جا گرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا تو وہ مسکرا کر قدر کی ایک نئی نذیر معلوم کر سکتا تھا!

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی اونگھتی ہوئی عمارت ہے جس کے دروازے پر پاکستان کا جھنڈا سلامی سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا جالی روشن ہے۔ جو اب کچھ عرصہ ہوا کہ چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بجلی کے نئے جب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار رہنا چاہیئے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے۔ تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوتی اور ڈرتے ہوئے ہیرا منڈی کے اگر دگرد دل بھولے بھٹکے راہیوں کے لیے ضرور کا کام دینے کے لیے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے۔ میں اچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی محنت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لیے ہیرا منڈی آ گئے تھے اور اب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں

کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے۔ ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے: لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے!

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریئے کی تائید کرتا ہے اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات یا تبادلۂ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی وجہ سے داتا کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور گولڈی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ مسکراتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آ کر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر ادھر ہو جاؤں۔ لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ گولڈی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور داتا کے دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین دوز مال گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گی ——— لاہور ناظم ڈیسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں ہر مزنگ ہر گلی ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ بتیاں کے نشان ٹمٹماتے ہیں۔ لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹڑی سے اتر جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر کالی سیاہی سے اللہ اور رسول کا نام لکھ کر اسے مسجد کے نام پر لگا لیا جاتا ہے.....

چارہ گر

تسنیم سلیم چھتاری

کنور صاحب جب کبھی اپنے تینوں بچوں کو ایک جگہ دیکھتے تو یہ بات کہے بغیر ان کا جی نہیں مانتا تھا کہ "بیگم ولایت کی آب و ہوا کا بھی اتنا اثر ہوا۔ جو بچے ہندوستان کی پیداوار ہیں، ذرا ان کا بھی رنگ روپ دیکھو اور اپنی منیرہ کو دیکھو ——— تشریف لائیں تو ان میں اور شکل پائی خالص.....؟"

بیگم پر ان باتوں کا ردعمل مختلف حالات میں مختلف طور پر ہوتا۔ کبھی ہنسی خوشی میں ہوتیں تو کہتیں: "واہ جی! تم نے میری بچی کی صورت دیکھی ہے، اس کا نصیبہ تو نہیں دیکھا۔ تمھیں کیا خبر اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے..... اللہ نے چاہا تو اس بیٹی پر فخر کرو گے..... کبھی مذاق کا موڈ ہوا تو کہہ دیا کہ "فوج میری بچی کیا ان موئی فرنگنوں پر جاتی ——— بلا سے ولایت میں ہوئی تو کیا ہے۔ بالکل اپنے باپ پر گئی ہے..... آئینہ دیکھو اور اسے دیکھو۔

اور جو کبھی جل جاتیں تو بگڑ کر کہہ دیتیں کہ "کیسی بھی سہی..... میرے لئے تو سب ہی برابر ہیں..... کوئی بے درد دکھ کے تو ہوتا نہیں..... جو قسمت میں لکھا ہے آگے آئے گا۔ تم کیوں کیڑے ڈالتے ہو.....؟"

ویسے ایمان کی بات یہ ہے کہ منیرہ سب سے اچھی بچی تھی، اور سب سے بڑھ کر ماں باپ کو پیاری بھی۔ کیسی سمجھدار اور چپ چاپ بچی تھی۔ کہ برسوں کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ گم سم عادات اور مزاج لے کر نہیں آئی بلکہ بڑے بھائی نے زبردستی ہر دم کے طعنے دے کر اسے یہ احساس کمتری پیدا کرایا ہے..... کنور رانی کی گود میں وہ مرجھائی ہوئی کلی کی طرح پڑی رہتی اور جب ان کے ملنے جلنے والیاں آتیں تو کھسک کر اپنی آیا کے گھٹنے سے جا لگتی۔ ناصر اور وسیمہ اسے مڑ مڑ کے دیکھ کر دیکھ کر چڑاتے "بھائی جان ملاحظہ ہو..... صورت چڑیلوں کی اور مزاج پریوں کے..... اور وہ بے چاری دل کی بھڑاس نکالنے کو بھی ادھر ادھر منہ چھپاتی پھرتی۔ حالانکہ خدا نہ کرے اندھی کانی نہیں تھی۔ بس رنگ سانولا تھا اور نقشہ بھی اوروں سے جدا..... سارے کپڑوں میں اچھی خاصی لگتی اور گرے مصالحے کے کپڑوں کو تو اس نے کبھی بچپن ہی سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے پرائے سبھی کو یہ کہتے سنا کہ "منیرہ کی شکل سارے گھر سے علیحدہ ہے..... منیرہ کنور صاحب کی بیٹی نہیں لگتی" اور وسیمہ؟ وہ تو ہو بہو اپنی ماں پر تھی۔ کنور رانی آج بھی تیس پینتیس سال کی ہو کر اور تین بچوں کی ماں بن کر بھی ایسی معلوم ہوتیں کہ چینی کی بنی ہوئی مورتی ہیں۔ جسے گذرتا زمانہ ہاتھ نہیں لگا سکتا ——— ویسی ہی جوان، شگفتہ اور پرکشش ——— جیسی وہ ڈولے سے

آتی تھیں، اور کنور صاحب کے گھر والوں نے دُلہن کا گھر نکلتے آتے کہا تھا کہ چاند سورج کی جوڑی مل گئی ہے!

کنور صاحب خود ہزاروں میں ایک تھے ..... اب تو جسم کچھ بہت بھاری ہو گیا اور رنگت بھی ماند پڑ گئی تھی ورنہ دونوں میاں بیوی میں گھنٹوں یہی مقابلہ ہوتا کہ رنگت کس کی زیادہ اچھی ہے اور نقشہ کس کا زیادہ پیارا ہے ..... پھر تو ظاہر ہے بچے کس پر ہوتے، پہلے تو ماں باپ کا یہیں سے کرائے، پھر ماں کا فوٹو ہی کے دستیاب ہوئیں ..... دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے کہ اب ہماری جوانی دائم ہو گئی ——— جب ہم بڑے ہوں گے تو یہ دونوں جوان ہو کر ہماری امنگوں کو سہارا لیں گے۔ دیکھئے ناں دونوں بچوں کے حسن کی تعریف کرتے تو ماں باپ پھولے نہ سماتے کیوں کہ یہ تعریف بالواسطہ انھیں کی تھی۔

جب نامراد آٹھ نو سال کے ہو گئے تو کنور صاحب نے ان کو نینی تال لے جا کر شیروڈ اسکول میں داخل کرا دیا اور بیگم صاحبہ کے اصرار پر وہیں کرزن میں پانچ چھ سال کی وسیع بھی پہنچا دی گئی۔ گھر سے بچے گئے تو ماں باپ کا دل بہلانے لگا ..... کنور صاحب تو جب سے ان کے والد کا انتقال ہوا، ہر سال ولایت کی سیر کا ارادہ کیا کرتے تھے۔ اور ادھر کچھ دن سے کنور رانی کو شکایت تھی کہ یہاں کی لیڈی ڈاکٹریں سب اوندھے سیدھے مرض تشخیص کر کے دنیا بھر کے علاج بتائیں مگر اصل مرض کو کوئی نہ پہچانتی تھی۔ اور ادھر کنور صاحب دیکھ رہے تھے کہ ان کی چہکتی بلبل کچھ بچوں کی جدائی سے اور کچھ اس انجانے موذی مرض میں پھنس کر بالکل نڈھال ہوتی جا رہی ہے۔ انھوں نے فوراً ہی بیوی کو لے کر ولایت کا رخ کیا ..... سیر کی سیر اور علاج کا علاج ..... دوران سفر میں کنور رانی صاحبہ کی طبیعت اور بھی مکدر ہوتی اور لندن پہنچ کر کنور صاحب کو پہلی ملاقات ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر سے کرنی پڑی جس سے کنور صاحب نے بہت ہی غمگین لہجے میں کہا: "ہندوستان کے بعض ڈاکٹروں کو یہ بھی شبہ ہے کہ ان کے پیٹ میں پتھری ہو گئی ہے ..... بعض تو بتاتے ہیں اور بعض زنانہ امراض میں سے کوئی مرض .....

لیڈی ڈاکٹر نے مکمل معائنہ کرنے کے بعد کنور صاحب کی آخری بات کو تسلیم کر لیا: "ٹھیک کہتے ہیں ..... بالکل زنانہ مرض ہے۔"

کنور رانی اور کنور صاحب دونوں ہی اچھل پڑے: "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ——— میرا مطلب ہی نہیں بلکہ واقعہ بھی یہی ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ اب تک آپ کو اس سلسلے میں لاعلمی کیوں ہے۔ جب کہ بچہ بالکل نارمل ہے۔ اور کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ صرف مسز میں خون کی کمی ہے اور وٹامن ڈی کی ضرورت ہے .....

کنور رانی کو خود بھی کبھی ایسا ہی شبہ ہوتا مگر ان کو نوکبخت دائیوں اور ڈاکٹرنیوں نے بہلا دیا تھا۔ اب اس لیڈی ڈاکٹر کی صاف صاف بات سن کر انھیں اطمینان ہو گیا۔ البتہ کنور صاحب کی پریشانی کسی طرح رفع نہ ہوتی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان کے سارے ڈاکٹر کیا گھاس کھودتے ہیں جو بچے کا ضمیمہ بنا لیتے ہیں۔ اور آپریشن کی رائے دیتے ہیں ..... خیر یہ بات کہاں تک معتبر رہتی۔ کوئی میری ہسپتال کی ایک سفید رنگ اور سفید لباس والی حور نے انھیں بیٹی کی خوش خبری سنائی۔ اور انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ تیسری اولاد تھی اور کسی تیسرے پر ہی گئی تھی! جب کنور صاحب کمرے میں آئے اور سفید بازوؤں میں، سفید چادر سے لپٹی ہوئی گڑیا دیکھی تو چونک پڑے ..... شاید انگریز نرس کی گود میں بھی سانولی لگ رہی ہے ..... انھوں نے احتیاط

سے اس نازک بوجھ کو سنبھالا اور کنور رانی کی گود میں شاد رہا۔ کنور رانی تو آج اس گوری نرس سے بھی زیادہ سفید ہو رہی تھیں۔ اور بچی ایسی لگی جیسے چاند میں داغ لگ گیا ہو..... کنور صاحب کا منہ اتر گیا..... وہ تو اگھور ناک کے حساب سے بھی اس ماں کی گود میں نہیں بھتی تھی!

اوّل اوّل تو میاں بیوی اس بات کو آپس میں کہتے بھی کچھ جھجک محسوس کرتے کہ بچی کی شکل اچھی نہیں ہے ——— پھر رفتہ رفتہ میاں نے دبے دبے لہجے میں اظہارِ خیال کیا اور بیوی نے ترچھے سے دل سے مانا کہ ہاں اوروں سے کچھ دبتی ہوئی ہے۔

بچی تین ماہ کی ہو گئی تو دونوں گھر پلٹے، پہلے تو ولایت میں ہی کنور رانی جہاں گئیں اور جس سے ملیں، دیکھنے والوں کی نظر نے ان سے اپنے تعجب کا اظہار کیا کہ یہ بچی کیا واقعی آپ دونوں کی اولاد ہے؟ اور ایک آدھ کم بخت تو اس شبہ کا اظہار بھی کر دیتا کہ شاید یہ بچی ترس کھا کر کسی یتیم خانے سے گود لی ہو گی! اگر ولایت کے یتیم خانوں میں اس صورت شکل کا بچہ کہاں!؟ تو پھر کیا آپ یہ چھوٹا سا بچہ بھی ہندوستان سے ہی ساتھ لائی ہیں۔ کنور رانی کو ایسی باتیں مارے ڈال رہی تھیں..... یہ بچی اپنی پیدائش سے قبل بھی مرض کبھی گئی تھی اور پیدائش کے بعد بھی روگ بن گئی۔ کبھی کبھی ماں باپ اسے چمکارتے تو وہ فوراً ہی مسکرا دیتی، پھر دونوں یہ بھول جاتے کہ انھیں بچی کے حسین نہ ہونے کا غم ہے۔ اس کا اخلاق ہی اس کا حسن تھا۔ یہ ہر دم مسکراتی بچی کبھی بھول کر بھی منہ کسورنا نہیں جانتی تھی۔ بھوکی ہے تو اور پیٹ بھرا ہے تو، بس جہاں ماں باپ نے گود میں لیا اور اس کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ کھیلی ———

کنور صاحب کے ولایت سے لوٹنے کی خبر ہندوستان پہنچی تو جو دوست احباب ان کو بوقتِ رخصت خیر خوشی سے واپسی کی اور کنور رانی کو صحت یابی کی دعائیں دیتے، بمبئی تک پہنچے تھے، وہ اب زندہ سلامت بمعیت لوٹنے کی مبارک باد دینے بھی جمع ہو گئے۔ انھیں میں کنور رانی کی ماں ماتا کی ماری دہلی سے چل کر بمبئی آ گئیں اور خود کنور صاحب کی ایک بہن جو اپنے خاوند کے ساتھ پونا میں رہتی تھیں، بھائی کو خوش آمدید کہنے بمبئی پہنچ گئیں۔

کنور رانی چار بھائی بہنوں میں ایک تھیں اور کئی لڑکوں میں ان کے بھائی محمود میاں سب سے بڑے تھے۔ ماں کو دونوں بچوں سے والہانہ عشق تھا اور پروانہ وار نثار تھیں۔ انھیں اپنے بچوں کے حسن و لیاقت پر بھی بڑا ناز تھا ——— کہتی تھیں کہ میں یوسفؑ کے خاندان سے ہوں..... میری اولاد کو دیکھو..... شامت اعمال کہ محمود میاں کی دلہن کسی بے ایمان شاطر کی باتوں میں پھنس کر آ گئیں تو وہ بس یوں ہی آدمی کا بچہ تھی! ظاہر ہے کہ محمود میاں کے ہرسال ہونے والے بچے کسی عمران خود کو یوسفؑ کا وارث کہلانے کے اہل نہ ہوتے اور دادی کو اس کا بڑا ہی صدمہ تھا۔ یہی چوٹ کھا کر انھوں نے اپنی لاڈلی زبیدہ کے لئے کنور صاحب جیسا خوبصورت دولہا ڈھونڈا اور سچ ہی ناصر اور رسیمہ نے اپنی نانی کا جی بھی خوش کر دیا تھا۔

جب ولایت سے یہ مژدہ جانفزا لے کر دہلی تار پہنچا کہ اللہ پاک نے کنور رانی کو بیٹی سے نوازا ہے تو راتوں کو سجدے میں پڑ کر بیٹی کی سلامتی مانگنے والی ماں شادیٔ مرگ سے بال بال بچی۔ دو چار دن تو انھیں مٹھائی بانٹنے اور زچہ گیریاں گانے سے فرصت نہ ہوئی۔ پھر ذرا سکون ملا تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، محمود میاں کی دلہن کے پیچھے پڑ گئیں، جو خبر سے آج کل اپنے نویں بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ ایمان کی بات ہے کہ بچہ صورت کا برا نہ تھا مگر دادی کی خاندانی روایات کو تو بہر حال تھیں پہنچتی تھی اور انھیں اپنی

بدصورت بہو کو چڑانے کا اس سے بہتر موقع کہاں ملتا۔ "اوئی یہ بھی کوئی بچہ ہے" وہ اپنے پوتے کو کہتیں۔ "ہمارے تو ایسے بچے کبھی نہ ہوئے ..... یہ تو اللہ قسم بشیر خانساماں کے لونڈے کی شکل کا ہے ..... میرے بچے تو بچپن میں بالکل ایسے لگتے کہ جیسے دوکان میں ربڑ کے جوتے سجے رکھے ہوں! میرے ایک لونڈے پر میم ڈاکٹرنی ایسی ریجھی کہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی۔ کہتی تھی کہ مجھے انعام اکرام نہیں چاہیئے۔ میں تو بچہ لوں گی۔ خیر میں بچہ تو کیا دیتی مگر اس گھوڑی کی نظر ایسی پڑی کہ وہ لڑکا میرے چھلے نہانے ہی چیٹ پٹ ہو گیا ..... اب خدا نظر بد سے بچائے۔ تم زبیدہ کے بچے دیکھ لو ..... حور کے بچے ہیں! اللہ پاک نظر کی جان کو رکھے۔ ذرا جوان ہو جائے تو جنوں نے یوسف کو نہ دیکھا ہو، وہ اسے دیکھ لیں اور روئیں۔ اس کی تو دسوں انگلیاں دس چراغ ہیں ..... میں تو آنکھ بھر کے اسے نہیں دیکھتی اب اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں کا ایک اور نمونہ بھیجا ہے۔ میں تو کہتی ہوں جس گھر میں زبیدہ کی لڑکیاں جائیں گی، اس گھر میں آدھی رات بھی اجالا رہے گا۔"

یہی کچھ کہتی اور بہو کا جی جلاتی۔ وہ خوش خوش نواسی کے استقبال کو گئی تھیں۔ اور جوں ہی کنوانی نے زمین پر قدم رکھا، بڑی بی نے لپک کر اونی شال میں لپٹی ہوئی بچی کو گود میں لے لیا اور مارے خوشی کے ان کی یہ ہمت نہ پڑی کہ سوئی ہوئی نواسی کا منہ کھول کر دیکھ لیں اور نہ یہ دل چاہا کہ اور کسی کو پہلے اس کی صورت دیکھنے دیں۔ حد ہے کہ جب کنور صاحب کی بہن جمیلہ نے بھتیجی کو لینا چاہا تو کنورانی کی ماں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اونی لڑکی پہلے بھائی سے تو اچھی طرح مل لو ..... سو رہی ہے۔ بے کل ہو گی ..... ہوٹل جا کے دیکھ لینا۔"

راستے بھر وہ ٹیکسی میں بچی کو گھڑی بنائے، چھاتی سے لگائے بیٹھی رہیں اور اس نے بھی چوں نہ کی۔ تاج محل پہنچ کر جب بڑی بی سب سے نظر بچائے دیوار کی طرف منہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں تو پھر انھوں نے الحمد، درود شریف اور سورۂ کہف پڑھ کر لپٹا ہوا بنڈل کھولا ——— پہلے آنکھ بند کر کے دم کیا اور پھر منہ پر نظر ڈالی، دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں ——— پھر کچھ گھر کی بچی کو آواز دی! جہاز میں اور بھی تو بہت سے ولیں ولیں کے بچے سوار تھے اور ساحل پر اترتے وقت کچھ ایسا شور و غوغا اور افراتفری مچی کہ نہ کسی کو اپنا ہوش رہا اور نہ اپنے بچوں کا! بڑی بی نے اپنی بچی کو پکارا اور سہمے ہوئے انداز سے بچی کو دیکھ کر پوچھا: "زبیدہ! کیا یہی ہے تیری لونڈیا؟" اور کوئی یہ سوال کرتا تو کنورانی بگڑ جاتیں۔ مگر ماں کی بدحواسی پر ان کو ہنسی آ گئی اور دانتوں میں انگلی دے کر بولی۔ "خدا را آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ اب میں کیا کروں امی ..... یہ کوئی میرے ہاتھ کی بات تھی ..... کنورانی کی ماں نے اپنے دل کو بالجبر اس حقیقت کے ماننے پر آمادہ کیا اور سرد آہ بھر کر بولیں: "یہ تو بالکل محمود کے بچوں پر گئی ہے!"

اب پھوپھی کی باری آئی اور انھوں نے بچی کو دیکھا تو بڑے سے ایک سو ایک روپے کے نوٹ نکالے اور زہر خند کے ساتھ مسکرائیں! حیرت تو ان کو بھی ہوئی۔ مگر اس سے بڑھ کر تو خوشی تھی کہ اللہ نے آج اسے بھی طنز کرنے کا موقع عطا فرمایا .....

جمیلہ بیگم کئی سال سے بھاوج کے ایک نفرتے کی چبھن سینے میں چھپائے بیٹھی تھیں اور بدلے کا انتظار تھا ..... یہ جب کی بات ہے کہ وہ تیرہ و سال کی تھی اور بہن برسوں جدھیاں کی ملازمت سے بھائی کے پاس آئی تھی ..... چاند سی بھتیجی کو دیکھا تو پھسل پڑیں اور بھائی کے مر جوگئیں کہ میں تو اسے ساجد سے لوں گی۔ ساجد ان کا پانچ چھ برس کا بیٹا تھا اور ماں کو بہت لاڈلا

تھا۔ ساتھ آیا تھا اور ——— چھوٹے بچے کی طرح ہر دم ماں سے چپٹا رہتا تھا ..... وہ سنجیدگی سے کہنے لگیں تو کنور صاحب نے کہا: "آپا ابھی ان بچوں کا آپ نے دیکھا کیا ہے۔ ذرا اس قابل تو ہونے دیں۔ یہ پڑھ لکھ لیں، جوان ہو جائیں تو آپ کی مرضی ہے وہ جیسے کرے جائے گا .....

مگر جمیلہ بی کو تو ساس بننے کا ارمان لئے ڈاتا تھا۔ کہنے لگیں: "یوں نہیں پکا معاملہ کروں گی ..... میں سات اشرفی سے لڑکی کا ہاتھ روک کر شیرینی بانٹے دیتی ہوں۔"

اب کنور رانی کو بولے بغیر چارہ نہ تھا ..... آخر وسیم ان کے پیٹ سے ہوتی تھی۔ ان کو بھی ہاں نا کا حق تھا۔ ساجد کی صورت شکل تو بے عیب تھی مگر اس کی حرکتیں کنور رانی کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں ..... ماں کے جابے جا پیار نے اس کو بڑا ضدی اور چڑچڑا بنا دیا تھا اور یہ بات ان کے منہ سے نکل ہی گئی کہ "بہن پکا معاملہ کس طرح کریں ..... یہ کوئی گڑیا گڈے کا کھیل تو نہیں ..... پہلے آپ اپنے لاڈلے کے ڈھنگ تو سنبھال لیجئے ..... وہ تو اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور میری بچی کا جسم ہی نہیں دل بھی بہت نازک ہے .....!"

کنور صاحب بھی اس جواب پر سٹپٹا گئے اور جمیلہ بیگم کے تو جیسے کسی نے منہ پر جوتا کھینچ مارا ہو ..... انھیں بھاوج سے اس جواب کی توقع نہ تھی ..... پھر کبھی وہ بھول کر رشتے کی بات زبان پر نہیں لائیں۔

آج کئی برس بعد بھتیجی کی شکل دیکھ کر ان کا دل خوش ہو گیا کہ اللہ نے دلہن بھابی کے غرور کا بدلہ دیا۔ بچی کے ہاتھ کے روپے گن کر انھوں نے بھاوج کے آگے رکھے اور مسکرا کر بولیں: "اللہ نظر بد سے بچائے ..... یہ سب سے بڑھ کر ہے!"

بے چارے کنور صاحب کھلے دل کے آدمی، بہن کے طنز کو کیا سمجھتے! وہ بچی کی پیدائش کے دلچسپ واقعات سنانے لگے: "تیرا پاشکل تو جیسی ہے سو ہے، مگر اس کی پیدائش کسی معجزے سے کم نہیں! اللہ کی شان ہے کہ اس نے کس طرح پریشانی کو خوشی سے بدل دیا۔ جب لیڈی ڈاکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو میرا دل کسی طرح باور نہ کرتا تھا۔ مجھے تو آخر تک شبہ ہی رہا۔ جب اپنی آنکھوں سے بچی کو جا کے ہسپتال میں دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ ....." جمیلہ بیگم مسکرائیں: "تو بچی کو دیکھ کر آپ کو اعتبار آ گیا بلکہ اور شبہ بڑھ گیا؟ بھئی ہسپتال کا معاملہ تھا اور لاکھوں عورتیں اسی غرض سے آتی ہوں گی ..... کیا پتہ کسی نرس کی غلطی سے ——— بہن کی بات ختم ہونے سے قبل ہی کنور صاحب بے زور و رفتہ لگایا اور کنور رانی نند کی اس چوٹ پر تلملا کر صوفے سے اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں امی کی والدہ پلنگ پر کچھ حیران و پشیمان سی بیٹھی تھیں ..... بے چاری بڑی بی! امی کا خیال تھا کہ بچی کو بمبئی سے دہلی لے جائیں گی اور دو ایک ماہ اپنے پاس رکھیں گی۔ کالے کوسوں سے خیر کے ساتھ بھری گود لے کر بیٹھی ہے۔ سیدھی لکھنؤ کس طرح جانے دیں گی ..... ابھی تو بچی کا عقیقہ بھی نہ ہوا تھا ..... اور اب وہ بچی کو دیکھ کر اور سب کچھ بھول کر دوسری فکر میں پڑ گئیں ..... محمود کی دلہن کیا کہے گی!! اس کے تو سکھے دھانوں پانی پڑ جائے گا ..... جیسی بھی باتیں بنائے کم ہے ..... بھئی کمبخت کو کیا پڑی تھی کہ بلا دیکھے بھالے اتنی شیخی کر گئی ..... اللہ قسم! ایمان کی پوچھو تو زبیدہ کی لڑکی سے تو محمود کا جوڑا ہی کچھ کھلے رنگ کا ہے .....!!

معصوم تیرہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر نئی صورت کو دیکھتی اور شاید ان چہروں پر لکھے ہوئے جذبات بھی سمجھ رہی تھی جو اس

نے منہ بسور کر رونا شروع کیا..... پھر یہ احساس کمتری اور غیر شعوری جھجک اس کی قسمت بن گئی!

یہ بات کچھ بڑوں پر ہی منحصر نہ تھی کہ انھوں نے بچوں کی صورت میں عیب ثواب نکلے ہوں۔ حد ہے کہ جاڑوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور کنور صاحب نینی تال جا کے ناصر اور وسیمہ کو لائے تو دونوں بچوں کو پورا یقین کرا تی نے مذاق میں ہماری بہن کو چھپا کر کسی اور کا بچہ دکھایا ہے..... ناصر وثوق کے ساتھ کہے کہ میں ایسا بے وقوف ہوں جو اپنی بہن کو نہ پہچانوں..... یہ تو جانے کس کی لڑکی ہے!! اور وسیمہ بڑی معصومیت سے ماں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھنے لگی: امی کیا لندن کی ڈاکٹرنی اپنے بیگ میں اسی بچی کو ڈال کر لائی تھی!؟

جوں جوں منیرہ ہوش سنبھالتی گئی، دیکھنے والوں کی نظریں پہچانتی رہیں..... بہن بھائی سال بھر میں ایک بار تین ماہ کی چھٹیوں میں آتے اور جب دونوں کو اپنے کھیل سے فرصت ملتی تو چھوٹی بہن کو چڑانے لگتے..... ایک دفعہ تو ناصر اور وسیمہ نے مل کر چار پانچ برس کی جان کا گھنٹوں خون کیا کہ تجھے تو امی نے پانچ سیر گیہوں کے بدلے ایک چماری سے خریدا ہے۔" اور روتے روتے غریب کی دونوں آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ ماں قسمیں کھاتی، بڑے بچوں کو ڈانٹتی مگر اس کی آنکھوں کے آنسو کس طرح نہ تھمتے تھے۔ یہ بات اس کے جی کو لگ گئی اور پھر وہ کبھی کھلے دل سے نہ ہنسی..... جب ناصر اور وسیمہ اسکول چلے جاتے تو گھر ایسا سونا ہو جاتا جیسے منیرہ کا تو وجود ہی نہیں۔ وہ تو ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہتی یا پھر کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی آپا سے پریوں اور شاہزادوں کی کہانیاں سنتی رہتی۔ شاید یہی وہ دنیا تھی جہاں پہنچ کر اس کا ذہن و دماغ کچھ دیر کو آزاد ہو جاتا تھا۔

وہ بڑی سعادت مند اور سمجھ دار تھی۔ باپ کی سگرٹوں کا ڈبہ اور ماں کا پاندان بڑے سلیقے سے اٹھاتی اور ان کے سارے حکم بلا چون و چرا مانتی..... دونوں کا دل چاہتا کہ وہ اور بچوں کی طرح کھیلے اور شور مچائے، چیزیں توڑے، کھلونوں کی فرمائش کرے..... مگر منیرہ تو جیسے خود کو اس اعزاز کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ اس کی زبان ہی نہیں کھلتی تھی۔

کنور صاحب نے اس کا سبب اس کی تنہائی سمجھ کر یہ علاج سوچا کہ اسے بھی وسیمہ کے ساتھ اسکول بھیج دیا جائے۔ منیرہ جانے لگی تو کنور انی نے وسیمہ کو اپنی جان کی قسمیں دیں اور خدا کا واسطہ دیا کہ اس بے چاری کو اسکول میں تنگ مت کرنا۔ وسیمہ اب بہت نادان نہ تھی۔ اور جو بہن نہ گڑیاں چھینے نہ کھلونے پرائے اس سے بلا وجہ دشمنی بھی کیا ہوتی۔ اس نے ماں سے پیار وعدہ کر لیا اور پیار سے منیرہ کو لے گئی۔ ایک بے چاری وسیمہ کیا کر لیتی..... منیرہ کو اپنے بچپن کی سب سے بڑی ذہنی شکست اس وقت ہوئی جب وسیمہ کی سہیلیوں نے منیرہ کو دیکھ کر کہا۔ چل چھوٹی، یہ تیری بہن نہیں ہے۔ جانے کس کی بچی پکڑ لائی ہے!" اور اس تکلیف دہ "خوش آمدید" کے بعد جب وہ غریب سینکڑوں لڑکیوں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھتی ہے تو وسیمہ کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ لازمی تقریبات کے علاوہ کبھی کسی سے گھل مل نہیں پاتی۔

پہلے سال ہی اسکول کی طرف سے جو کنور صاحب کو منیرہ کی رپورٹ گئی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے، وہ بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور وسیمہ کی طرح منیرہ سے اسکول والوں کو کام میں لاپرواہی کی شکایت نہ تھی۔

اسکول کی زندگی منیرہ کو شور و شغب کا شوقین نہ کر سکی ——— ہاں وہ طبیعتاً پرسکون ضرور تھی..... اسکول میں

سبھی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ہندوستانی اور انگریز کے علاوہ چینی، جاپانی اور برمی لڑکیاں بھی تھیں۔ دو بچیاں حبشی ماں باپ کا سرمایۂ حیات تھیں۔ ..... اور اگر منیرہ کو خاص طور پر وسیمہ کی بہن بنا کے نہ دیکھا جائے تو ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے اس کی دل شکنی کا امکان ہو۔ وہ سیدھے سبھاؤ کی صلح جو لڑکی تھی جو آشنائیوں میں بہت مقبول ہو گئی۔

اسکول سے بچوں کی رپورٹ آتی ..... ناصر کی رفتار درمیانہ تھی۔ ایک مرتبہ فیل ہوئے تو دوسری مرتبہ ساری کلاس میں اوّل آئے۔ ان دنوں بہنوں میں جہاں وسیمہ کی بے شمار شکایتیں ہوتیں، وہیں منیرہ کی کسی بات میں ذرا بھی فی نہ نکلتی۔ وسیمہ کو پڑھائی کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ وہ کھیل کود میں اچھی تھی اور جو یہ بھی گن نہ ہوتا تو شاید اسکول میں نہ رہ پاتی۔ اور منیرہ پر اگر کبھی کسی ٹیچر کو اعتراض ہوتا تو اس میں زندگی کی جولانی نہیں ..... اگر پڑھائی کے علاوہ اس نے اپنے شوق سے کسی چیز میں حصہ لیا بھی تو وہ محض گانے کی کلاس تھی۔ وہ پیانو بھی سیکھتی تھی اور آواز کے لحاظ سے سارے اسکول کی چیدہ لڑکیوں میں ایک تھی یہاں تک کہ اتوار کے دن گرجا میں حمد گانے والی لڑکیوں کے گروہ میں اس کو بھی شامل کر لیا گیا۔

دن گزرتے رہے۔

ماں کا حسین عکس وسیمہ اب کنور رانی کی پُرسکون نیندوں میں خلل انداز ہونے لگی۔ سولہ، سترہ برس کی عمر ایسی تو نہیں ہوتی کہ شادی کے سوا چارہ نہ ہو، مگر یہ اب کنور رانی کو اچھا نہ لگتا کہ ان کی بانکی فٹ چھاتی لمبی صاحبزادی بلاؤز اور اسکرٹ پہن کر تتلی بنی پھرتی رہے ..... خود وسیمہ کو اس لباس سے چڑ تھی۔ یوں تو وہ اسکول کی حد سے باہر ہمیشہ ہی شلوار قمیص پہنتی مگر جس زمانے میں گرمیاں گزارنے ماں باپ دونوں نینی تال جاتے اور سنیچر کی شام کو بچوں سے ملنے اسکول پہنچتے تو وسیمہ کا حلیہ دیکھ کر ماں کا دل کملانے لگتا ..... کہاں تو ان کے گھرانے میں جوان بیٹیاں باپ کے آگے سر سے دوپٹہ نہیں گراتی تھیں اور کہاں یہ کہ وسیمہ کے لباس میں دوپٹہ کا دخل ایک طرف، گھٹنوں تک ٹانگیں بھی اپنی بے مائگی کا شہرہ کرتی تھیں۔ لہٰذا کچھ تو ماں کی مرضی بھی باقی نہ تھی اور کچھ وسیمہ خود بھی کونونٹ کی پابندیوں سے عاجز آ گئی تھی ..... غرضیکہ یہ ہوا کہ وہ جونیئر کیمبرج میں فیل ہو گئی۔ کنور صاحب نے لاکھ سمجھایا مگر وہ اب اسکول جانے پر آمادہ نہ تھی اور گھر پر تیاری کر کے وہیں لکھنؤ سے دسویں کا امتحان دینا چاہتی تھی ..... منیرہ کو اس مرتبہ تنہا ہی جانا پڑا۔

وسیمہ گھر آ گئی تو ساتھ ہی شادی کے پیغامات بھی برسنے لگے۔ وہ کنور رانی کے ساتھ نانی کے ہاں دہلی گئی تو محمود ماموں کے دو بیٹے بیک وقت اس سے شادی پر تیار ہو گئے ——— چوں کہ دونوں نے اشارے کنایوں میں پہلے ہی اپنی چاہت جتا دی تھی۔ لہٰذا ایک بھی قابلِ قبول نہ قرار پا سکا ..... خود کنور رانی کی ماں نے آ کر وسیمہ کے حق میں محمود ماموں کی دُلہن کبھی اچھی ساس ثابت نہیں ہوں گی۔ وہ اپنی لڑکیوں کی بدصورتی کے سبب ہمیشہ وسیمہ کے حسن سے جلتی رہی تھیں اور اپنی ساس بن کر دل کی بھڑاس نکالیں گی۔ مجبوراً کنور رانی کو بھتیجوں کا خیال ترک کرنا پڑا ..... اب رہے خود کنور صاحب کے بھانجے اور جمیلہ بی کے دو لڑکے ساجد میاں، تو انھوں نے ایسی حماقت کی کہ کنور رانی نے وسیمہ کو ان سے نہ بیاہنے کی بالکل قسم کھا لی۔

بی اے کے امتحان سے نپٹ کر وہ ماموں کے بلاوے پر لکھنؤ آئے ..... یہ وہی زمانہ تھا کہ وسیمہ بی میٹرک کی تیاریوں

میں مصروف تھیں اور دونوں نے برسہا برس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا ساجد میاں بے چارے پہلی نظر کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے بھی آگا دیکھا نہ پیچھا اور وہیں مروانہ کمرے میں بیٹھ کر اپنی شادی کا پیام وسیمہ کے نام تمام دیکھے ہوئے فلموں، پڑھے ہوئے ناولوں اور سنے ہوئے واقعات کے خلاصے سمیت لکھ بھیجا ..... مزید یہ لکھا کہ تم بالغ اور تعلیم یافتہ ہو۔ اس میں صرف تمہاری رضا درکار ہے۔ ماں باپ کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔

شامتِ اعمال کہ یہ شاہکار بھائے بیٹی کے ماں کے ہاتھ پڑا اور کنور رانی کی ایڑی کی آگ چوٹی تک پہنچی۔

ظاہر ہے کہ بذریعہ دیل تو ساجد اور بذریعہ ڈاک ان کا پیام شادی دونوں جمیلہ بیگم کی خدمت عالیہ میں اس تیور کے ساتھ پہنچے کہ جو آئندہ ایسا ہوا تو .....!!

وسیمہ نے میٹرک پاس کیا اور وہیں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا ..... ناصر سینئر کیمبرج کر کے آئے تو کیمبرج گریجویٹ کی ایسی لگن لگی کہ اس مرض کا علاج پاسپورٹ کے علاوہ کچھ نہ ہو سکا ..... فلک بوس چوٹیوں اور اتھاہ گہرائیوں والے بحرِ نیل کے سینٹ میری کو نوشتہ میں منیرہ چپ چاپ پڑھتی رہی!

ناصر میاں کیمبرج کے دلچسپ قصے لمبے لمبے خطوں میں لکھتے، وسیمہ کے نیلے رنگ کی ہوک میں (جس میں گہری نیلی جارجٹ کے پردے تھے) میں دور کالج جانے اور نیلی نیل سے منیرہ کی بابت آنے والی شاندار رپورٹیں کنور رانی سینت سینت کر رکھ لیتیں، وہ سال اور بیت گئے .....

یہ اس رات کی بات ہے جب وسیمہ ایف۔ اے پاس کرنے کی خوشی میں اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ ایک انگلش فلم دیکھ کر لوٹ رہی تھیں اور سڑک پر خاصہ ہجوم تھا ..... شکور ڈرائیور اپنی طویل و عریض ہوک کو بڑے سلیقے سے بچا بچا کر درمیان سے نکال رہا تھا۔ دفعتہً آگے چلتے ہوئے رکشا والے نے آس پاس کی سواریوں سے بے پروا ہو کر رکشا ہوک کے سامنے کر دی کہ اگر شکور لمحے بھر کو بریک نہ لگائے تو اللہ اعلم کیا ہو تا ——— ایک تو اتنی تیزی سے بریک لگانے کے سبب موٹر نے پیچھے کو جھٹکا کھایا، دوسرے برابر کی رفتار سے آتی ہوئی پیچھے والی جیپ اپنی پوری طاقت سے بریک کے ساتھ ٹکرا گئی .....

جب تینوں لڑکیوں کی چیخیں بند تھیں تو وسیمہ نے شکور کو یہ کہتے سنا کہ "صاحب آپ نے تو ہمارا مڈگارڈ ہی توڑ ڈالا ....."

وسیمہ کو اس موٹر سے بہت پیار تھا۔ نیلی نیل سے آ کر اس نے اس موٹر کو اپنی پسند سے خریدا تھا ..... اور کالج کی چار دیواری میں داخل ہونے والی یہ سب سے حسین کار تھی ..... مڈگارڈ پچکنے کی بات نے اسے بری طرح مشتعل کر دیا اور لپک کر وہ موٹر سے کود پڑی ..... جیپ کی ایئر فرنٹ سیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ "اور جناب آپ کی حماقت سے جو میری گاڑی کے ہیڈ لیمپ کا جوڑا ہو گیا وہ ....."

وسیمہ نے بگڑ کر انگریزی میں بڑی تیزی سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کا سر کیوں نہ گیا۔ ہوش سنبھال کر ڈرائیو نہیں کرتے ..... ایسی عمدہ موٹر کا ناس کر دیا۔"

موٹر ٹکرانے کا حادثہ اس نوجوان کو بالکل بدحواس نہ کر سکا تھا مگر اس ایٹم بم نے اسے سچ مچ دہلا دیا ..... اس نے کسی قدر ہکلا کر انگریزی میں جواب دیا "مجھے افسوس ہے محترمہ ..... تاہم میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر میری خطا کیا تھی؟"

وسیمہ نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔ خوب..... تو گویا آپ نے اندھا دھند گاڑی لڑا کے ہمارا مڈگارڈ نہیں توڑا؟ اب کون ہے اس نقصان کا ذمہ دار؟ آپ تو نہیں ہیں؟

وہ کچھ دیر خاموش وسیمہ کو دیکھتا رہا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چمکی: "اور میرا بھی تو بہت نقصان ہو گیا ہے۔ آپ بتائیں، اس کی ذمہ داری لیں گی آپ؟" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وسیمہ کی پلکیں جھک گئیں۔ سڑک پر تماشائی جمع ہو گئے تھے۔ پیچھے سواریاں رک رہی تھیں اور وہ اسٹیرنگ وہیل پر ٹھوڑی رکھ کر اسے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔ وسیمہ چڑ گئی..... "وہ اب ڈرنے کے بجائے دلیری پر آمادہ تھا: "کہاں ہے آپ کا ڈرائیونگ لائسنس؟ دکھائیے مجھ کو!! میں کل ہی آپ کی رپورٹ کروں گی۔ بڑے ڈرائیور بنتے ہیں!!" پاؤں پٹختی وسیمہ جوک میں بیٹھی تو شکور نے گاڑی بڑھائی.....

ولایت سے ناصر کا خط آیا تھا اور وہ کنور رانی کو پڑھ کر سنا رہی تھی تو کنور صاحب ہاتھ میں ایک کاغذ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور وسیمہ سے پوچھا: "بیٹی۔ تم نے ظفر میاں سے ان کا ڈرائیونگ لائسنس مانگا تھا؟"

وسیمہ اچھل پڑی: "جی کس سے؟"

"ظفر میاں سے..... خان بہادر ریاض احمد خاں کا بڑا لڑکا ہے نا؟ وہ یہ لائسنس لایا ہے..... کہتا ہے کہ آپ کی صاحبزادی دیکھنا چاہتی ہیں..... تم نے مانگا ہوگا....."

وسیمہ کو ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ "ابا میں تو اسے جانتی بھی نہیں..... رات البتہ ایک قصہ ہوا تھا! شکور نے آپ کو اطلاع کر دی ہوگی....."

"ہم لوگ سینما سے آ رہے تھے تو ایک جیپ گاڑی ہماری موٹر سے ٹکرا گئی..... مجھے کیا پتہ کون چلا رہا ہے..... میں نے کہا اپنا لائسنس دکھاؤ ورنہ میں رپورٹ کروں گی! کنور صاحب ہنسنے لگے..... "لاحول ولا قوۃ"..... وہ بے چارہ بہت ہی پریشان معلوم ہوتا ہے..... تم نے بھی حد کر دی، ان کے والد سے تو میرے بڑے تعلقات ہیں..... بلکہ تم تو ان کی گھر والیوں سے بھی کئی بار ملی ہو۔ پچھلے سال الیکشن میں خان بہادر نے میری بڑی مدد کی تھی..... وہ غریب لڑکا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ اسے یہ لائسنس واپس کر دو..... اور کہہ دینا کہ تم نے اسے پہچانا نہیں تھا۔"

کنور صاحب بیوی کے پاس بیٹھ کر ناصر کا خط پڑھنے لگے۔ اور وسیمہ ظفر کا ڈرائیونگ لائسنس ہاتھ میں لئے کچھ جھجکتی ہوئی، شرمندہ سی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ ظفر اسے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور مسکرا کر بڑے ادب سے سلام کیا..... وسیمہ نے بغیر سلام کا جواب دیئے، کاغذ میز پر ڈال دیا اور رک رک کر بولی: "معاف کیجئے گا رات میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔"

ظفر مسکراتا رہا: "اور اب؟ اب تو پہچان لیا آپ نے مجھے؟"

وسیمہ پلٹ کر چل دی تو ظفر نے کہا: "سنئے گا..... میں نے دیکھا ہے کہ آپ کا ڈرائیور تو موٹر کا مڈگارڈ درست کرا لایا مگر میرے نقصان کی تلافی کس طرح ہوگی.....؟ غریب آدمی ہوں!" وسیمہ کے ہونٹ مسکراہٹ نہ روک پائے وہ جلدی سے بھاگ آئی: "کیسا شریر لڑکا ہے، توبہ!"

اس کے دو چار دن بعد ہی خان بہادر ریاض احمد خاں کے یہاں سے کنور صاحب کو بھی کنور رانی اور وسیمہ کے دعوت

کا رقعہ آیا۔ کنور رانی اپنے میاں کے حلقۂ احباب میں ولایت کی واپسی کے بعد سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ خان بہادر کے یہاں پردے کی پابندی تھی۔ کھانا ایک ہی جگہ کھایا گیا ——— اس دوران میں ظفر نے وسیمہ سے کوئی بات نہ کی۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی رفیع جو انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا، ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

کھانے کے بعد وسیمہ نشست گاہ میں رکھے ہوئے ایک سنگِ مرمر کے مجسمے دیکھ رہی تھی۔ جب ظفر خاصدان لیکر آیا تو وسیمہ کے چہرے پر سُرخ رنگ نکھرنے لگا!

وسیمہ نے شکریہ کہہ کر پان لے لیا تو ظفر نے آہستہ سے کہا۔ آپ نے میرے لئے بھی کچھ سوچا ——— یا میں خود ہی کنور صاحب سے عرض کروں؟

"جی؟" وسیمہ نے گھبرا کر اس کا منہ دیکھا۔

وسیمہ کی وحشت پر وہ زور سے ہنس پڑا: "میری گاڑی کی ابھی تک مرمت نہیں ہو پائی..... میں تو اس دن سے لاچار ہو رہا ہوں۔"

"کسی قابل انجینئر کو دکھایئے۔" وسیمہ نے شوخی سے کہا۔ ایکا ایکی برابر کے کمرے سے آتے ہوئے رفیع نے کہا: "میں ہوں قابل انجینئر!" اور بات کا رُخ پلٹ گیا۔

دوسرے دن کنور رانی نے وسیمہ کو بتایا کہ خان بہادر نے تمہارا رشتہ ظفر کے لئے مانگا ہے..... تمہاری کیا مرضی ہے؟

وسیمہ کی مرضی کنور رانی کو معلوم تھی ——— اور جب یہ بات طے ہو گئی تو وسیمہ نے ظفر سے پردہ شروع کر دیا۔ ظفر اکثر ان کے یہاں آتا اور ایک دن تو اس نے باقاعدہ پرچہ لکھ کر بذریعہ ڈاک وسیمہ کو بھیجا کہ جس دن سے آپ نے میری گاڑی کا ہینڈل پمپ توڑا ہے، میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ میں بطور انتقام آپ کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دوں..... میری مدد کیجئے!

وسیمہ کی شادی میں ایک ہی ہفتہ باقی تھا کہ منیرہ سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر لکھنؤ آ گئی۔ اس نے ظفر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وسیمہ نے اُسے ظفر کی دو تین تصویریں دکھائیں جو غالباً ظفر کے ہی اشارے پر رفیع اس کو دے گیا تھا..... منیرہ نے ایک فوٹو کو غور سے دیکھ کر کہا: "ایمان سے آپا یہ تو بڑی خوبصورت ہیں۔ مونچھیں البتہ کچھ زیادہ نوکیلی ہیں..... آپ ذرا کم کرا دیجئے گا..... چہرے سے بہت خوش مزاج لگتے ہیں۔"

وسیمہ نے اس تنقید کا لطف لیتے ہوئے کہا: "اوئی ان کی مونچھیں کاٹنا کچھ آسان نہیں ہے..... بہت تیز ہیں۔ اب تو دیکھنا تیرا ناطقہ ہی بند نہ کر دیں تو شرط ہے۔"

منیرہ کے دل میں خوشی کی لہریں اُٹھنے لگیں..... ہنس کھ دولہا بھائی کا تصور بڑا ہی دلچسپ تھا..... اس نے آج تک کسی سے مذاق نہ کیا تھا۔ ناصر نے اس کو چھیڑ چھیڑ کر بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس نے بھائی جان سے کچھ زیادہ بے تکلف نہ ہوتی تھی..... اور کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس سے وہ بھی ہنسی مذاق کرتی..... کچھ تو اس کی طبیعت ہی سب سے الگ تھلگ تھی۔

پھر اس پر کولونٹ کی زندگی جس میں یوں بھی ہنسی کی آواز ہمیشہ بے جان اور مجبوس معلوم ہوتی ہے ..... منیرہ کا دل ابھی سے ہلنے کو چاہنے لگا ..... اس نے نصور ہی میں اپنے ناخن کاٹنے کی قینچی اٹھا کر دولہا بھائی کی مونچھوں کا صفایا کر دیا ..... اور پھر ان کے دونوں کانوں کی لو بھی کتر ڈالیں! اس نے سوچا کہ دولہا بھائی کو پان میں مستی ضرور کھلاؤں گی۔ اور ان کے بالوں میں انشان بھی ضرور لگاؤں گی۔ جو کئی دن تک چمکتی رہے!

دل میں ان گنت ارمان لے کر وہ بہن کا جہیز سجانے لگی ..... بہن کو گھر جاتے دیکھ کر منیرہ کے دل میں اس کیلئے اتھاہ محبت آبل پڑی تھی ..... وہ ہر تھوڑی دیر بعد کسی ضروری کام کو چھوڑ کر وسیمہ کے کمرے میں دوڑی جاتی اور کبھی اس کا اُبٹن سے مہکتا چہرہ دیکھ کر مسکرانے لگتی اور کبھی اس کے زرد دوپٹے کے دامن میں منہ چھپا کر رو دیتی۔

بارات آگئی ..... منیرہ نے ہتھیلی کی چھت پر سے دولہا کو دیکھا اور خوشی کے مارے اس کا دل آنچل کے حلق میں آنے لگا ..... وہ دوڑی ہوئی وسیمہ کے کمرے میں گئی ..... وہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے موقع نکال کے وسیمہ کے کان میں کہا ..... آپا دولہا بھائی بڑے خوبصورت ہیں اور بہت شاندار لگ رہے ہیں ..... پھر وہ بھاگ کر گئی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دولہا کو سب کے ساتھ مل کر جھانکنے لگی۔

شادی کے ہنگامے میں وسیمہ کی تیز طرار سہیلیوں نے منیرہ کو ذرا بھی دولہا سے بات کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ وہ سب کی سب نت نئے مذاق کر رہی تھیں اور ایک لمحے کو بیکار نہ ہوتی تھیں۔ کوئی اس سے عجیب و غریب سوال کرتی تو کوئی اس کی صورت کو "چڑی کا غلام" بتاتی ..... ایک دفعہ بڑی ہمت سے وہ ان میں مرچیں ڈال کر لائی بھی تو بدقسمتی سے ظفر تک نہ پہنچ سکا اور پہلے ہی رپٹ چھیں کر کھا گیا!

وسیمہ رخصت ہونے لگی تو بہت روئی اور منیرہ کا تو یہ حال تھا کہ اس کی ہچکیاں کسی طرح قابو میں نہ آتی تھیں۔ اس نے آواز روکنے کے لئے دانتوں سے اپنی انگلی لہولہان کر لی مگر آنسو تھے کہ امڈے ہی آتے تھے۔

منیرہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی وسیمہ کے ساتھ اس کی سسرال چلی جائے۔ مگر یہاں کے بکھیڑے بھی اس کو سمیٹنے تھے۔ زیور، کپڑا سارے گھر میں یوں ہی پھیلا پڑا تھا۔ کنور رانی نے اس کو روکا کہ اس وقت تو رہنے دو۔ کل صبح تم ہی جا کر وسیمہ کو سسرال سے لانا۔ ناصر بے چارہ تو سمندر پار پڑا ہے اور بہن کو لینے کون جائے گا .....

وسیمہ کے جانے سے سارا گھر سونا ہو گیا تھا اور بے چاری منیرہ نے کروٹیں بدل کر یہ اونگھتی رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو منیرہ کی بے تابی ناقابل برداشت تھی۔ وسیمہ کے لئے بہت سی مٹھائیاں اور کپڑے، دولہا بھائی کے لئے مستی پڑی ہوئی پانوں کی گلوریاں اور انشان لے کر وہ خان بہادر ریاض احمد کی شاندار کوٹھی میں پہنچ گئی!

ظفر کی بہن اس کو ساتھ لے کر وسیمہ کے پاس گئی۔ وسیمہ زیور اور پھولوں سے لدی ہوئی کارچوبی کے سبز کپڑوں میں ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ ظفر ابھی تک اٹھ کر منتظر دوستوں کے پاس نہ جا سکا تھا اور وہیں قالین پر بیٹھا ہوا خاصدان میں سے چھالیا کے سفید دانے چن چن کر کھائے جا رہا تھا۔

منیرہ کو دیکھ کر وسیمہ اٹھی تو اس کی پازیب کا ایک ایک گھونگرو بول اٹھا اور جب وہ دونوں گلے ملیں تو ظفر کی

موجودگی نظر انداز کر کے ایک دوسرے کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے منہ چومنے لگیں.....

کچھ دیر بعد دونوں کو ظفر کا خیال ہوا تو وسیمہ جھینپ کر بیٹھ گئی اور منیرہ نے اُسے سلام کیا۔ اس سے قبل کہ ظفر کچھ کہے، رفیع آگیا اور منیرہ کو دیکھ کر چیخا "بھابی صاحبہ کون ہیں یہ؟ ذرا مجھے اس کا نام تو بتائیے..... میں انھیں خوب پہچانتا ہوں۔ انھی حضرت نے پرسوں شام مجھے مرچوں والا پان کھلا دیا تھا.....

وسیمہ نے حیرت سے کہا "ارے تم منیرہ کو نہیں جانتے؟ میری بہن کو!" ظفر اور رفیع دونوں نے گھبرا کر منیرہ کو دیکھا۔ وہ بیچاری شرما کر سمٹی جا رہی تھی..... رفیع نے کہا "جی؟ آپ کی بہن؟" وسیمہ بولی "ہاں بھئی میری بہن منیرہ۔ تم نے بارہا اس کا ذکر مجھ سے سنا ہے..... ابھی تک صورت نہیں دیکھی تھی؟" رفیع سر کھجا کر بولا "جی میں نے شادی کے دوران میں انھیں دیکھا تو کئی بار۔ مگر یہ خیال نہیں تھا کہ یہی منیرہ ہیں..... یہ تو قطعی آپ کی بہن نہیں لگتیں....."

"ارے کیوں؟" رفیع کی چھوٹی بہن نے بھولے پن سے پوچھا۔

"ایں!" رفیع گھبرا گیا، اس بات کی تشریح اس سے ممکن نہ تھی!

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ "کیوں؟" بس نہیں لگتیں..... تم بھی تو میری بہن نہیں لگتی ہو"

سب ہنسنے لگے، منیرہ کے چہرے پر بدل بدل کے سُرخ اور زرد رنگ آ رہے تھے..... اس نے بھی سب کے ساتھ ہنسنا چاہا مگر وہ نہ ہنس سکی..... اُسے ڈر ہوا کہ اس کوشش میں اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں گے۔ رفیع جس کیلئے کا جواب نہ دے سکا، اس کے سبب سے وہ اچھی طرح واقف تھی..... اپنا کرب ناک چہرہ چھپانے کی اس نے جھک کر وسیمہ کی ساڑھی پر ٹنکا ہوا ایک ستارہ نوچ لیا اور غیر ارادی طور پر اسے دانتوں سے چبا لیا..... اس کے باشعور جذبات پر یہ پہلی ضرب تھی! لکھنؤ آ کر منیرہ کی زندگی میں ایک ہیجان آمیز تبدیلی ہوئی تھی۔ یہاں کا ماحول "سینٹ میری کونونٹ" سے بالکل جدا تھا۔ یہاں اس کا لباس، اس کا کمرہ اور اس کا رہن سہن سب اس کی اپنی مرضی پر تھا..... کلب اور سینما گھر تھے۔ شاندار بیوک اور ہوا رسٹرکیں تھیں! پھر ناصر اور وسیمہ کے نہ ہونے سے وہی سارے گھر کی روح رواں اور سارے مہمانوں کی میزبان تھی ممکن تھا کہ یہ ساری تبدیلیاں اور مصروفیتیں اس کی فطرت کو بھی ایک نیا جنم دیتیں..... اس کا نوجوان پندار اس کے شکست خوردہ بچپن کو بھلا دیتا..... مگر..... خان بہادر ریاض احمد خاں کی کوٹھی کے اس خوبصورت قالینوں اور قمقموں سے سجے ہوئے کمرے میں ایک نوجوان نے، شاید نادانستہ طور پر اُسے پرکھ کر کھوٹا کہہ دیا اور بے سوچے سمجھے اس شاخ کو توڑ ڈالا جس پر ممکن تھا کہ اس کا آشیانہ بن جاتا۔

جب شام کو وسیمہ اور ظفر کو لے کر وہ اپنے ہاں واپس آئی تو سستی پڑے پانوں کی گلوریاں اسی طرح سے بیگ میں پڑی مرجھا رہی تھیں اور افشاں کی ڈبیا بھی کس مپرسی کی حالت میں ایک طرف پڑی تھی..... اس کی ہمت، اس کی شرارت اور اس کی امنگیں ایک ہی جھٹکے سے بکھر گئیں..... آج وہ پہلے سے زیادہ بے بس ہو گئی تھی.....

ایک سال اور چلا گیا بہت سے نئے پھول کھلے اور پرانے گھاؤ بھر گئے..... وسیمہ ماں بن گئی اور ناصر نے فائنل میں ناکامی کا غم بھلانے کے لئے وہیں ایک آئرش لڑکی سے سول میرج کر کے، ماں باپ سے روپیہ اور معافی کی

درخواست کی..... کنور صاحب تازہ الیکشن میں جیت گئے اور کنور رانی کے سر پر بہت سے کالے بالوں نے سفید روپ دھار لیا ——— مگر منیرہ..... اس کی آج اور کل میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ ماں کے لئے پان بناتی اور باپ کو اخبار پڑھ کر سناتی رہی۔ ہاں اس نے ایک پیانو خریدا اور سنسان راتوں میں بجانے لگی ——— اور پھر سال کے آخر میں دسمبر کی ایک برفیلی رات کو جب وہ دیر تک کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باغ کی طرف دیکھتی رہی تو اُسے ٹھنڈ معلوم ہوئی اور جب وہ پلنگ پر لیٹی تو کھانسی کے ساتھ سینے میں درد محسوس کیا۔

خدا جانے کتنی راتیں ایسی آئی اور گئی ہوں گی جب وہ یوں ہی بے کیف ہو کے کھڑکی میں کھڑی رہی اور اُسے سردی کا احساس ہوتا رہا..... جب وہ تنہائی پر لیٹی اوس میں بھیگتی رہی اور اس کا رواں رواں کانپتا رہا۔ مگر یہ رات..... ہونی شدنی تھی۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں پر ٹھنڈ کا اثر ہوا اور نمونیہ کی زد میں آ کر زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑ گئی۔

موت کی نمائندہ وہ شدت کی ٹیس تھی جو ہر سانس کے ساتھ بجلی کی طرح سینے میں کوند رہی تھی۔ اور اللہ کے بھروسہ پر زندگی کے لئے کوشاں بڑھے ڈاکٹر حفیظ تھے جو پلنگ کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور گھنٹوں کے حساب سے اس کے تپتے ہوئے بازوؤں میں پنسلین کی سوئیاں پیوست کئے جا رہے تھے۔

چوبیس گھنٹے اسی طرح گزرے..... کنور صاحب دبے پاؤں کھڑکی تک آ کر اندر جھانکتے اور کرب ناک حالت میں پھر ٹہلنے لگتے۔ کنور رانی حتی الوسع سارے صدقے، خیرات اور منتیں کر کے اب خدا کے سامنے سربسجدہ تھیں۔ وسیمہ اپنے نوزائیدہ بچے کو بھول کر دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، منیرہ کی پٹی سے لگی فرش پر بیٹھی تھی۔ اور بہن کی ہر آہ پر اس کی رگوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی تھی..... ظفر کی جیب طے طے بھر دواؤں کی ضرورت پر یہاں سے وہاں دوڑ رہی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کے چہرے سے تذبذب کے آثار کسی طرح نہ بدلتے تھے۔

چوبیس گھنٹے ہو گئے تو بوڑھا ڈاکٹر اپنی جگہ دوسرے ڈاکٹر کے سپرد کر کے باہر نکلا اور کنور صاحب سے کسی قدر مسکراتے ہوئے بولا: "کنور صاحب میں بیٹی کی صحت یابی کی نہیں بلکہ اس کی نئی زندگی کی مبارک باد دے رہا ہوں..... آپ خوش نصیب ہیں۔"

موت ٹل گئی اور زندگی پھیلنے لگی۔ کنور صاحب آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ کنور رانی نے سجدے سے اٹھ کر شکرانہ ادا کیا۔ وسیمہ کو اپنے بھوک سے بلکتے بچے کا خیال آیا اور ظفر نے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر سگرٹ سلگائی۔

منیرہ کی بے ہوشی اب ٹوٹ چکی تھی اور وہ بستر آرام سے سو رہی تھی ———

ڈاکٹر حفیظ چوبیس گھنٹے جس جاں طلب مریضہ کو کھٹکتے رہے اور جسے وہ اب صبح، شام آ کر دیکھتے تھے، وہ لڑکی انہیں ایک معمہ سی لگتی تھی۔ ڈاکٹر کو حیرت تھی کہ منیرہ نے اپنی بیماری میں ذرا بھی تشویش کا اظہار نہیں کیا..... جب اُسے ہوش آیا، وہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی..... جب ڈاکٹر نے اُسے صحت یابی کا مژدہ سنایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر بھی نہیں آئی..... اس نے ایک دفعہ بھی کڑوی دوا پر منہ نہیں بنایا۔ ایک بار بھی ڈاکٹر سے نہیں پوچھا کہ یہ بازو چھلنی کرنے والے انجکشنوں کی انتہا کب ہو گی ——— اور ایک دن جب کمرے میں ان کے اور منیرہ

کے علاوہ کوئی نہ تھا ..... ڈاکٹر صاحب اپنی حیرت کا اظہار کر ہی بیٹھے۔ انھوں نے کہا "منیرہ، تمھیں نہیں معلوم کہ تم کس خطرناک حالت میں ایک دن ایک رات پڑی رہیں۔ تمھارے گھر والے کیسے پریشان تھے ..... اور میں ..... یہاں اسی کرسی پر بیٹھا ہوا ..... تمھیں تک رہا تھا ..... مجھے نہیں معلوم کہ دن کب نکلا اور رات کب آئی ..... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اس مرض کو سہار لوگی ..... مگر تم ..... ایسا لگتا ہے کہ تمھیں اپنی صحت پر نہ حیرت ہوئی نہ مسرت ..... کیا تمھیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے؟ میں کیا ہے جس سے پیار ہو ..... میرا مطلب اپنی زندگی سے ہے۔"

منیرہ نے سر اٹھا کر ٹھہر بھر ڈاکٹر کا چہرہ غور سے دیکھا ..... پھر آنکھیں جھکا لیں اور آہستہ سے کہا: "ڈاکٹر صاحب زندگی بڑے ڈاکٹر نے چونک کر انجیکشن پھر لگانے تعجب سے اس نوجوان لڑکی کو دیکھا ..... جسے آرام دہ گھر اور شفیق ماں باپ نصیب تھے جس نے اچھی تعلیم پائی تھی اور جس کے آگے طویل زندگی کی ان گنت سیڑھیاں چڑھنے کو تھیں ..... زندگی میں کیا ہے جو تمھاری زندگی میں نہیں؟"

منیرہ کے لئے اس بات کا جواب دینا کچھ بہت آسان نہ تھا۔ اس نے چھت میں آویزاں بجلی کے قمقمے کو دیکھا اور پھر گردن نیچی کر کے کشمیری غالیچے کے پھول شمار کرنے لگی۔

ڈاکٹر نے منیرہ کے چہرے پر جذبات کی کشمکش دیکھی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے کو پیار سے تھپکا: "منیرہ میں مختلف بیماریوں کا علاج کرتا ہوں ..... بہت سے زخم بہت سے ناسور میرے ہاتھوں اچھے ہو گئے۔ بہت سے مریضوں کو درد اور تکلیف کی حالت میں میرے ہاتھوں سکون پہنچا ..... مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر کے علاوہ میری انسانیت کی بھی کوئی وقعت ہے یا نہیں ..... مگر تم سمجھ سکتی ہو ..... اور تم ہی بتا سکو گی کہ کیا میں تمھاری مدد کرنے کا اہل ہوں یا نہیں ..... تم اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو ....."

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کے نیچے منیرہ کے شانے میں کپکپاہٹ محسوس کی اور دیکھتے ہی دیکھتے منیرہ کے زرد رخساروں پر آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی ..... "ڈاکٹر۔ بے مقصد زندگی کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے ..... آپ کی زندگی کا نصب العین بہت بلند ہے، آپ ایک بے مصرف زندگی کی بے کیفی کا اندازہ نہیں لگا سکتے ....."

ڈاکٹر حفیظ کے بوڑھے چہرے پر مطمئن مسکراہٹ جھلکی۔ "بس یہی بات ہے؟ تم نے اپنی خوش نصیبی کا بھی احساس کیا کہ تمھیں اپنی زندگی کی قدر ہے اور اس کی تضیع پر تمھیں رنج ہوتا ہے۔ تم کچھ کرنا چاہتی ہو اور اپنی بے کاری پر طرزدہ ہو ..... جب تمھیں اپنا مرض معلوم ہے تو علاج کیوں نہیں کرتیں اس کی دوا بھی تمھارے پاس ہے۔"

منیرہ نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور چہرے پر امید و بیم کی لہریں لپکیں۔ ڈاکٹر نے کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر نظر جما لیں جیسے نیلے آسمان پر منیرہ کا مستقبل لکھا ہوا ہو اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے: "تم ایک نوجوان عورت ہو ..... ایک اچھی بیٹی کے فرائض ادا کرتی ہو اور اب ..... جب کہ غالباً تمھارے مطالعات بڑھ رہے ہیں تو تم ایک کامیاب بیوی اور قابل فرماں بن سکتی ہو۔ تم اپنا گھر اپنے ہاتھوں سنوارو گی اور یقیناً وہی شخص تمھارا ساتھی ہوگا جسے تمھارے دل نے پکارا ہو ..... اور ....."

منیرہ کے چہرے پر زرد دھبے کھنڈنے لگیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا: "بس ڈاکٹر ....."

ڈاکٹر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا: "اور اگر تمہارے علاوہ تم اس سے بھی بڑھ کر ہیں، تمہاری ہمت اس سے بھی زیادہ ہے، تم اپنی ذمہ داریاں لامحدود چاہتی ہو..... تو تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنتیں..... لیڈی ڈاکٹر....."

"لیڈی ڈاکٹر؟" منیرہ کے منہ سے چیخ کی طرح نکلا۔

"ہاں" ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا: "بشرطیکہ تم اپنی زندگی سے اپنا اور اپنوں کا حق نکال لو..... تمہارے دن اور تمہاری راتیں پھر آرام دہ گھر اور خوش باش گھر والوں کی نہیں بلکہ روتے بلکتے مریضوں اور بیماروں کی ہوں گی..... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اپنے فرائض کا احساس رہا تو تمہاری زندگی کا ہر لمحہ انمول ہو جائے گا....."

شدت جذبات سے اس کا سانس چڑھنے لگا: "مجھے ایسی ہی زندگی کی تمنا ہے ڈاکٹر..... میں اپنی زندگی میں اپنا کوئی حق نہیں چاہتی....." پھر وفعتہً وہ چونکی: "مگر ڈاکٹر میں نے تو کبھی بھی سائنس نہیں لی..... میں نے تو صرف کیمسٹری میں آرٹ اور ہسٹری لی تھی....."

ڈاکٹر حفیظ ہنسنے لگے: "تم نے جو کچھ نہیں سیکھا، وہ اب سیکھ لوگی..... پانچ سات برس ابھی تمہارے لئے اہم نہیں اور منیرہ ایک سمجھدار ڈاکٹر سے ایک خدمت شعار نرس کسی طرح کم نہیں ہوتی..... تم بڑی اچھی نرس بن سکتی ہو۔ اگر تم چاہو تو میڈیکل کالج میں پڑھنے کے علاوہ شام کو چھ بجے سے آٹھ بجے تک میرے نرسنگ ہوم میں آیا کرو۔ ایک گھنٹے تک اسٹاف نرس کی مدد کرنا اور ایک گھنٹے تک میری کلاس میں لیکچر لینا..... تمہیں اس سے بڑی مدد ملے گی..... بولو تیار ہو؟"

"بالکل تیار ہوں" منیرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "اگر میں ڈاکٹر نہ بن سکی تو کم از کم آپ کے نرسنگ ہوم کی نرس تو بن جاؤں گی۔"

اور منیرہ ڈاکٹر حفیظ کے نرسنگ ہوم کی نرس بن گئی! وہ لیڈی ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ اس نے کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ اور کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے کچھ نہیں پا سکے گی۔ تو اسے یوں دوسروں کے لئے وقف کرنا ہوگا..... اسے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں مل سکا مگر ڈاکٹر حفیظ کے نرسنگ ہوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ منیرہ نے ہلکے نیلے رنگ کی "ہوک" سے گہرے نیلی جارجٹ کے پردے نوچ پھینکے اور لشکور ڈرائیور سے موٹر چلانا سیکھنے لگی..... وہ روز صبح کو نرسنگ ہوم میں اسٹاف نرس کے ساتھ زخمیوں اور مریضوں کی تیمارداری کرتی اور شام کو ڈاکٹر حفیظ کے لیکچر سنتی..... کنور رانی کو اس بات پر ناگواری بھی تھی اور پریشانی بھی..... ان کی بے حد خواہش تھی کہ جلد سے جلد منیرہ کی شادی سے فارغ ہو جائیں اور کسی طرح اپنے اس نامعلوم خوف سے نجات پالیں جو منیرہ کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں پیدا ہوا تھا اور جس کا واحد حل منیرہ کی شادی تھا..... وہ اس پر بھی آمادہ نہیں کہ اگر ان کے بھائی محمود میاں اپنے اس بیٹے کا رشتہ بھیجیں جو منیرہ سے چند ماہ بڑا تھا، تو فوراً ہی منظور کر لیں گی۔ اور اگر منظفر کا چھوٹا بھائی رفیع جواب انجنیئر ہو گیا تھا، جھوٹے کو بھی رشتہ چاہے تو قاضی کا بھی انتظار نہ کریں گی۔ مگر ——— محمود میاں کی دلہن نے چھوٹے بیٹے کا رشتہ بھی اپنے میکے میں طے کر لیا تھا۔ اور رفیع آج کل کسی انگلو انڈین سیسنہ کے فراق میں ویرانے ہو رہے تھے! کنور رانی بک جھک کے خاموش ہو گئیں اور منیرہ اطمینان سے موٹر ڈرائیو کر کے نرسنگ ہوم جانے لگی.....

کنور صاحب بھی بچوں کی طرف سے عجیب قسمت لائے تھے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی ہاتھ سے نکلا سمجھئے۔ ناصر میاں آخر کار گریجویٹ ہونے کا ارادہ ترک کر کے ہندوستان آ گئے تھے اور مسز ایڈنا ناصر بھی ہمراہ تھیں! وہ بیوی کو لے کر لکھنؤ آئے اور ممکن تھا کہ اکلوتی بہو کو ساس سسر گھر کی رونق سمجھتے۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ مسز ایڈنا ناصر ہندوستانی لباس پہننے کی نسبت اپنے عاشق زار کو تڑپتا چھوڑ کر ولایت لوٹ جانا بہتر سمجھتی تھی۔ اور کنور رانی سے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ عورتوں اور دوستوں میں ایسی بہو ساتھ لے کر نکلیں جو وسیمہ کی دو سالہ بیٹی نعیمہ کی طرح ایک مختصر نیکر اور اڑنگا قمیص ہی اپنے لئے کافی سمجھتی ہو۔ اور کپڑے میں کفایت کے لئے نہ صرف دوپٹہ اور پاجامے سے نالاں ہو جائے بلکہ اکثر و بیشتر ایسے فراک پہنے جو نہ صرف آستینوں بلکہ شانوں سے بھی عاری ہوں۔ کنور رانی تو ڈوبی جا رہی تھیں اور خدا نے بڑا فضل کیا کہ ناصر میاں کو دہلی میں فوراً ہی اچھی خاصی ملازمت مل گئی اور وہ دونوں کو لے کر چلے گئے ورنہ اور رنگ میں بھنگ پڑتی۔

وسیمہ کی طرف سے یوں تو ماں باپ کو اطمینان تھا کہ وہ اپنے گھر خوش ہے میاں قدر دان ہے مگر وسیمہ کی صحت نے گھر والوں کے دل ڈبا دیئے تھے۔ وہ شروع سے دھان پان سی کمزور لڑکی تھی اور آئے دن کے زچہ خانوں سے اس کا حلیہ اور بگڑ گیا تھا۔ ہر سال وسیمہ کا مہینہ ایسا تھا کہ کسی کی آئی مل جائے مگر وسیمہ کا پتہ نہ ملے ..... ایک کی زبان نہیں کھلی۔ دوسرے نے پاؤں اٹھانا نہیں سیکھا اور ظہیر خیر سے گود میں آ گیا۔ بے چاری لڑکی انیمیا میں مبتلا تھی اور اکثر اختلاج قلب کی شکایت رہتی۔ ..... بیٹی کی یہ کیفیت دیکھ کر کنور رانی کو نواسہ نواسی بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ اب رہی منیرہ تو اگر وہ شریف گھر کی لڑکیوں کی طرح دو بول پڑھ کر اپنا گھر بساتی تو شاید ماں باپ کے سر سے کوئی بار ٹل جاتا۔ مگر اس نے تو ڈھنگ ہی دوسرا اپنا لیا تھا۔ اس کا ارادہ شادی بیاہ کا نہیں تھا ——— کنور رانی اکیلے میں میاں سے کہتیں کہ میری زندگی تو اول ہی عذاب تھی مگر اس کنواری بیٹی کو اس طرح بے بار و مددگار چھوڑ مری تو قبر میں بھی چین نہ ملے گا۔ خدا کے لئے منیرہ کو سمجھاؤ کہ یہ شریف بیٹیوں کا طریق نہیں، ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جن بچوں کو چھینک بھی آئی تو ہم نے بیسیوں حکیم ڈاکٹر جمع کر دیئے، اب وہی بچے دوسروں کی اچھی بری بیماریوں میں ہاتھ ڈالیں۔ دنیا بھر کا ناک تھوک صاف کریں اور پھنسی پھوڑوں کو چھوئیں۔ کیا ہماری مرضی اولاد کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی؟

کنور صاحب منیرہ کے لئے کوئی اور راستہ سمجھتے تو اس کو بھی سمجھاتے۔ اس راستے پر آ کر منیرہ یہ بھول گئی تھی کہ کبھی اس نے خود کو پابند بھی محسوس کیا تھا ——— حالانکہ اس کی منزل کوئی نہ تھی مگر سفر کی گہما گہمی میں اس نے پیچھے دیکھنا اور آگے سوچنا چھوڑ دیا۔ جرمن ڈیزائن کے مطلق گھر میں چپ چاپ رہنے والی لڑکی اب ڈاکٹر حفیظ کے بیماروں اور کراہوں سے بھرے ہوئے نرسنگ ہوم میں ہمیشہ مسکراتی رہتی۔ یہاں وہ کنور صاحب کی بیٹی اور وسیمہ کی بہن نہیں تھی۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ننھیال کی طرف سے سو پشت پیچھے ان کا خاندان پرسفٹ سے جا ملتا تھا اور گھر والے شاکی تھے کہ اس نے خود کو اس وراثت کا اہل کیوں نہیں قرار دیا ——— مگر ——— یہاں اس کی اپنی ذاتی شخصیت تھی ..... ذاتی وقار تھا اور اس کی اپنی معصوم اور مہربان مسکراہٹ تھی .....

منیرہ کی وہ جوانی بھی اپنی تھی جو نینی تال کے اونچے پہاڑوں میں جنم لے کر گھر کی محبوس فضا میں اونگھتی رہی اور اب اس نئے ماحول میں چونک کر منیرہ کے گرد لپٹ گئی تھی۔

پر بہار چہرہ میں جس کی کو آپ نے نظر انداز کر دیا ہوگا وہ ضروری نہیں کہ گریبان کے کاج میں سج کر بھی آپ کو بے رنگ و معلوم ہو..... سفید لباس میں پُر وقار انداز اور مہربان مسکراہٹ کے ساتھ قدم رکھتی ہوئی منیرہ خدا جانے کتنوں کے دکھ محض اپنی آمد سے مٹا دیتی تھی۔ چھوٹے بچوں میں وہ خاص طور سے مقبول تھی۔ پریشان مائیں اپنے بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھنے کے لئے منیرہ کی ڈیوٹی کا انتظار کرتیں اور بہت سے مریض کڑوی دواؤں کو اس کی میٹھی تسلی کے ساتھ خوشی سے پی جاتے.....

اب منیرہ کو اپنے خواہ مخواہ دنیا میں آنے کا رنج نہ تھا اور نہ عمر کے بے مصرف گزرنے کا غم! ڈاکٹر حنیف نے اس کے بیمار جسم کے ساتھ ہی اس کے ماؤف دماغ کا بھی مداوا ڈھونڈ لیا تھا..... اور یہ جب کی بات تھی کہ دل کا معاملہ زیر بحث نہ آنے پایا تھا..... وہ بیچارہ تو سہما ہوا کسی کونے میں پڑا ڈرتا تھا..... اس میں دھڑکنے اور گنگنانے کی سکت کہاں تھی.....

..... نہ منیرہ نے کبھی یہ سوچنے کی جرأت کی کہ اس کی دنیا اتنی پُراسرار اور رنگین بھی ہو سکتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ بات کبھی بھی دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر دماغ کی رسائیوں میں نہ گونجتی۔ اگر تقدیر کا ہاتھ اتنا جابر نہ ہوتا اور انجانی مشیت ایسے کھیل کی شائق نہ ہوتی.....

وہ ایک خنک رات تھی جب اندھیرا چھاتے ہی کمرے کے بادل ادھر ادھر بھٹکنے لگے تھے اور سڑکوں پر ٹمٹمانے والے قمقموں کی زرد روشنی دودھیا لپیٹ میں اور زیادہ پھیکی اور محدود ہو گئی تھی ——— منیرہ نرسنگ ہوم سے گھر آ رہی تھی.....

..... پیچھے کی سیٹ پر شکر، آنگھ رہا تھا اور وہ خود گاڑی چلا رہی تھی..... یہ وہی ہلکے نیلے رنگ کی بیوک تھی جس کے گہرے نیلے پردے منیرہ نے اتار ڈالے تھے اور جسے گذشتہ دو سال سے وہ ڈرائیو کر کے اپنے گھر سے نرسنگ ہوم جایا کرتی تھی..... یہ وہی بیوک تھی جسے آج سے سات آٹھ سال پہلے کنور صاحب نے وسیمہ کی پسند پر خریدا تھا۔ اور ایک رات سینما سے واپسی پر مڈگارڈ توڑنے کے جرم میں ظفر کو وسیمہ کے حضور جواب دہ ہونا پڑا تھا..... اسی موڑ نے ایک خنک اور دھندلی رات میں منیرہ کی راہ میں بھی کسی کو لا ڈالا!

آج رات جب منیرہ روتے سسکتے مریضوں کے بجائے ایک ہنستی گاتی محفل سے لوٹ رہی تھی تو اس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ ویران اور پژمردہ تھا۔ آج جب کہ وہ ایک اسٹاف نرس جولیا کی شادی میں شرکت کر کے آ رہی تھی، تو لپکتی موٹر سے ٹکرا کر آنے والے سرد ہوا کے جھونکے اس کی رگوں میں نشتر چبھو رہے تھے اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر شیشے چڑھا دے۔

پچھلے دو سال سے جب شام کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے وہ تھکی ہاری گھر لوٹتی تھی اس کے دل میں ایک خود اعتمادی اور عزت نفس کا احساس ہوتا۔ اسے اپنے وجود پر پیار آتا کہ آج اس نے کتنے روتے چہروں کے آنسو پونچھے کتنے رستے زخموں پر مرہم لگائے اور کتنی شکر گذار نظریں اپنے چہرے پر مرکوز دیکھیں..... اس کے بعد اسے یہ سوچنے بھی شرم آتی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے..... یا ہو سکتا ہے..... مگر اس رات!!.....

ڈاکٹر حنیف نے جولیا کو رخصتی دعوت دی تھی۔ وہ شادی کر کے اپنے خاوند کے ساتھ جا رہی ہے..... یہ وہی نرس تھی جسے دو سال پہلے ڈاکٹر نے منیرہ کا ہاتھ تھمایا تھا۔ اور کہا تھا "جولیا۔ یہ لڑکی زندگی کی جولیا ہے" اور جولیا منیرہ کا ہاتھ پکڑ

کے دو سال تک اوروں کے غم میں اس کے لئے مسکراہٹ چلتی رہی اور منیرہ کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اور جولیا اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ اس شاہراہ کے کانٹے چلتے چلتے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گی اور آخری دم ان کے دل کو یہ سکون ہوگا کہ انھوں نے ان گنت تلوے چھلنی ہونے سے بچائے ..... مگر جولیا کی راہیں مختلف نکلیں ..... اس کی منزل اور تھی اور ساتھی بھی اور مل گیا!

ڈاکٹر حنیف نے نرسنگ ہوم میں جولیا کو الوداعی دعوت دی ..... منیرہ بھی موجود تھی، سب ہنس بول رہے تھے۔ گا رہے تھے اور منیرہ کے دل میں یہ احساس چٹکیاں لے رہا تھا کہ زندگی طویل ہے اور راہیں ان گنت ہیں ..... ساتھی بھی مل جاتے ہیں اور بعض تڑپ تڑپ کر تنہا بھی مر جاتے ہیں ..... زندگی مسکراہٹ بھی ہے اور آنسو بھی ..... جس کے نصیب میں جو بھی آ جائے!!

پھر اس کے نصیب نے ایک خلا ..... بے کیفی اور تنہائی کا ہنم اس کے سامنے کھول دیا اور اس ہنستی بولتی محفل سے لوٹتے ہوئے اس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ ویران تھا اور یخ بستہ انگلیاں اسٹیرنگ وہیل پر بے جان شکنجے کی طرح کسی تھک کر منیرہ کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ یہ دو چار میل کا رستہ جو روز پلک جھپکتے گزر جاتا تھا، آج پلکوں کو جھپکائے دیتا تھا۔ تاہم وہ شکور کی طرح اونگھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں اور اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھوں کی گرفت بھی مضبوط تھی ——— پھر کیا ہوا ..... منیرہ کو معلوم نہیں ..... سڑک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ موٹر کی سرچ لائٹ کے ساتھ دوڑتی ہوئی نگاہوں نے کسی متنفس کو نہیں دیکھا اور پھر بھی ..... سیمنٹ کی چکنی سڑک پر پھسلتی ہوئی چرک نے جھٹکا کھایا اور فضا میں ایک دلدوز انسانی چیخ گونجی!!

"کیا ہوا؟" شکور اپنی غنودگی سے چونکا۔

منیرہ نے پوری طاقت سے بریک مارتے ہوئے کہا: "اللہ جانے۔"

لرزتے ہاتھوں سے بمشکل پٹ کھولا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے دوڑی جہاں چند گز کے فاصلے پر انسانی کراہٹ سنائی دے رہی تھی ——— کپکپاتے ہوئے سیاہ دھبے پر جھک کر منیرہ نے فرطِ خوف سے، دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ لیمپ پوسٹ کی کپکپاتی روشنی میں اس نے ایک زرد چہرے کے علاوہ سڑک پر بل کھاتی ہوئی خون کی پتلی سی دھار بھی دیکھی۔

"یا اللہ یہ کیا ہو گیا!" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

شکور نے جھک کر اسے ٹٹولا: "بی بی۔ یہ تو مر گیا بے چارہ!"

تڑپ کر منیرہ سڑک پر دوزانو ہو گئی اور کانپتے ہاتھوں سے اس کی کلائیاں تھامیں ..... اس کے بعد زندگی اور موت میں اس کے دل کی دھڑکنیں ڈھونڈنا چاہیں ..... وہ یکبارگی چیخا: "اوہ ..... ہائے ہائے ..... چھوڑ دو!"

منیرہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی "اسے لے چلو شکور..... جلدی کرو۔"

شکور لپک کر گیا اور موٹر کو پیچھے سرکا لایا..... منیرہ کے جسم میں سر سے پیر تک سنسنی دوڑ رہی تھی اور دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا..... شکور کی مدد سے اس نے زخمی کو اٹھانا چاہا تو وہ پھر چیخا "ہائے چھوڑ دو، خدا کے لئے..... مجھے مت چھوؤ" منیرہ کے ہاتھ سے وہ چھٹتے چھٹتے بچا۔ بدقت دونوں نے اسے پیچھے کی سیٹ پر ڈالا اور منیرہ بھی اس کے ساتھ ہی پچھلے حصے میں پائیدان پر بیٹھ گئی۔ اس نے شکور سے کہا "واپس چلو نرسنگ ہوم!"

شکور نے گاڑی گھمائی اور منیرہ نے اندر کی روشنی کھول کر اسے دیکھا..... ڈرتے ڈرتے دیکھا..... وہ ہوش میں تھا اور کوٹ کی لمبی آستین میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے "آپ اچھے ہو جائیں گے" منیرہ نے اس کی دردناک نظروں کی زد سے بچتے ہوئے کہا، وہ بولا نہیں۔ کراہتا رہا اور منیرہ کو دیکھتا رہا، منیرہ نے پھر کہا "مجھے بڑا افسوس ہے..... مگر آپ اچھے ہو جائیں گے۔ آپ بہت جلدی اچھے ہو جائیں گے..... میں آپ کو ہسپتال لئے چلتی ہوں۔"

"ہسپتال؟" وہ کراہتا رہا۔ پوری شدت کے ساتھ!

"ہاں ہسپتال..... کیوں آپ کہیں اور جانا چاہتے ہیں؟"

"میں! میں کہاں جاؤں گا..... میرا کون ہے....." منیرہ کو ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں منیرہ کو چکر سا آ رہا تھا..... دل اچھل اچھل کر حلق میں اٹکتا رہا اور نبضیں کلائیاں پھوڑے دے رہی تھیں..... وہ سچ مچ رو دیا تھا..... اس کی بند پلکوں سے آنسوؤں کی باڑھ نہ رک سکی اور منیرہ کا دل چاہا کہ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

"یہ میں نے کیا غضب کر دیا" اس نے اپنی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے دل سے پوچھا اور پھر دفعتہً شکور کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی "نرسنگ ہوم جانا بے کار ہے شکور۔ ڈاکٹر صاحب جا چکے ہیں..... گھر چلو..... پھر جا کے ڈاکٹر صاحب کو بلا لانا" شکور نے موٹر کو دوبارہ موڑا اور منیرہ نے پلٹ کر اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹا۔ وہ اب بے ہوش ہو چکا تھا..... آستین سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور زرد رخساروں پر آنسوؤں کی بوندیں کانپ رہی تھیں..... منیرہ رونے لگی۔

منیرہ اپنے ساتھ ایسی خاصی قیامت گھر لے آئی تھی۔ اس کی ماں پریشان بھی تھیں اور ناخوش بھی..... وہ ہمیشہ منیرہ کو موٹر چلانے سے منع کرتی تھیں اور کنور صاحب اپنا پائپ سلگا کر برآمدے میں چپ چاپ ٹہل رہے تھے۔

ڈاکٹر حفیظ دوڑے ہوئے آئے۔ منیرہ نے قینچی لے کر ویز اور کوٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اتار ڈالا تھا اور اپنے بے ہوش مہمان کے سرہانے جھکی ہوئی اس کا کچلا ہوا بازو دیکھ دیکھ کر اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ موٹر کا پہیہ سیدھے ہاتھ کی ہڈی کا چورا کر گیا تھا.....

ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی کہا "بھئی منیرہ بیٹی۔ تم نے تو سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ بھلا کہیں تم نے یہ بھی سنا ہے کہ نرسیں....." منیرہ کی رونی شکل دیکھ کر ڈاکٹر حفیظ نے مذاق کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مریض کا معائنہ کرنے لگے۔ شکر

کو صرف کہنی پر سے ہڈی ٹوٹی ہے اور باقی محض گوشت پھٹ گیا ہے۔ ہم جب آپریشن کر کے ہڈی جوڑ دیں گے..... فی الحال زخم صاف کر کے خون روک دیا جائے..... کیوں منیرہ؟"

"جی ہاں..... مگر یہ بے ہوش کیوں ہو گیا ہے ڈاکٹر؟" منیرہ نے بنیر ارادہ کئے سوال کر ڈالا۔

ڈاکٹر حفیظ نے تعجب سے منیرہ کو دیکھا۔ شاید دو ماہ بعد آپ کو جنرل ہسپتال جا کر زرسنگ کا امتحان دینا ہے منیرہ بیٹی! حیرت ہے کہ مر نہیں گیا..... بڑا جانباز ہے جس نے تمہاری لیم شمیم مورٹر کا مقابلہ کیا اور محض ایک بازو پر بیتی..... اگر کہیں آپ کا پستول اس کی گردن سے گزر جاتا؟"

ڈاکٹر حفیظ کے مذاق کا منیرہ ذرا بھی لطف نہ لے سکی۔ بس ہی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے پھر پوچھا: "یہ اچھا ہو جائے گا نا؟"

ڈاکٹر حفیظ نے کہا: "اپنے دل سے پوچھو..... تم نے کیسے کیسے زخمیوں کی تیمارداری کی ہے۔"

منیرہ کا دل آج پہلی بار اس کے اختیار میں نہ تھا..... نہ وہ اس شدت سے کبھی دھڑکا تھا اور نہ منیرہ نے دماغ کو دل سے آج کی طرح ہار مانتے پایا تھا..... وہ خاموشی سے ڈاکٹر حفیظ کے ساتھ اس بے ہوش زخمی کی مرہم پٹی کراتی رہی اور بار بار امنڈ آنے والے آنسوؤں کو دوپٹہ میں جذب کرتی گئی..... خون بند ہو گیا مگر بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا اور مریض کا جوان اور بھرا ہوا چہرہ لاش کی طرح سفید نظر آ رہا تھا..... منیرہ نے ڈاکٹر کی نظر بچا کے دو تین مرتبہ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹایا..... ڈاکٹر کی نظر بچا کے..... جانے کیوں۔ حالانکہ زرسنگ ہوم میں اس نے بہت سے مجروحوں اور زخمیوں کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھایا تھا..... مگر آج اسے یہی بات محض فرض سے کچھ مختلف لگ رہی تھی۔

جب تک نیاز کو ہوش نہیں آیا، ڈاکٹر حفیظ وہیں کمرے میں بیٹھے منیرہ سے باتیں کرتے رہے۔ ایک دفعہ انہوں نے منیرہ سے کہا: "مجھے خوب یاد ہے کہ آج کی طرح تمہارا اس دن بھی ہراساں اور مدحواس نہ تھیں جب تمہیں تو نیہ ہو گیا تھا..."

منیرہ بولی: "ڈاکٹر صاحب جان دینا جان لینے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے..... اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرا ضمیر عمر بھر مجھے ملامت کرتا رہے گا..... میں کبھی آپ کے زرسنگ ہوم میں قدم نہ رکھوں گی۔"

ڈاکٹر حفیظ نے بڑا عظیم الشان قہقہہ لگایا..... نیاز نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اضطراب آمیز تعجب سے ڈاکٹر حفیظ اور منیرہ کو دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کرسی پلنگ کے نزدیک کھینچ کر اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور بولے: "میں ڈاکٹر ہوں..... یہ لڑکی نرس ہے..... اور ابھی یہ لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اگر تم اچھے نہ ہوئے تو عمر بھر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہے گا اور وہ پھر کبھی میرے زرسنگ ہوم میں کام نہیں کرے گی، لہٰذا میں تم سے اپیل کروں گا کہ جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔"

نیاز نے گردن گھما کے سرہانے کھڑی ہوئی منیرہ کو دیکھا جو سٹپٹا کے اپنا ہونٹ چبا رہی تھی۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے؟" نیاز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"تمہیں خود تو کچھ نہیں ہوا" جو لیلا کی شادی میں شرکت کر کے ڈاکٹر کا مزاج بہت شگفتہ ہو گیا تھا۔ بولے "البتہ ایک اناڑی ڈرائیور نے تمہارا بازو چھل دیا ہے ..... تم ٹھیک ہو جاؤ تو پھر اس لڑکی پر مقدمہ ضرور چلانا ——"

نیاز نے دوبارہ گردن پھیر کر منیرہ کو دیکھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے منیرہ کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

وہ چپ چاپ بڑے غور اور تعجب سے منیرہ کو دیکھ رہا تھا ——

ڈاکٹر حفیظ مصنوعی غصے کے ساتھ کرسی سے اٹھے "ارے ارے لڑکی تو رو کر دھمکاتی ہے کہ بیچارہ نرکاتیہ تک نہ کرے" انھوں نے منیرہ کا سر پکڑ کر ہلایا، نیاز کو ایک خواب آور انجکشن پلا دیا اور جاتے وقت منیرہ سے پوچھا "کسی نرس کو بھیجوں؟"

منیرہ نے کہا "کیا میں نرس نہیں ہوں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر صاحب بولے "تو پھر یاد رکھو، نرس کا کام آنسو بہانا نہیں بلکہ رونے والے کو مسکرانے کا موقع دینا ہے"

نیاز کا ٹمپریچر دیکھ کر اسے سونے کی ہدایت کرتے ہوئے ڈاکٹر حفیظ صبح آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے ..... نیاز فوراً سو گیا ..... جب تک سوتا رہا ——— منیرہ پلنگ کے برابر کرسی پر بیٹھی، آنکھیں پھاڑے اس کا مضمحل چہرہ تکتی رہی ....

اور وقت گزرتا گیا۔

منیرہ کی زندگی میں یہ رات بڑی عجیب اور سحر آمیز تھی۔ یوں تو اسے کچھ دن ہوئے نرسوں کی کمی کے سبب ڈاکٹر حفیظ کی خواہش پر ان کے نرسنگ ہوم میں رات کی ڈیوٹی بھی لینی پڑی تھی اور اس نے کئی راتیں طویل و بعض وارڈ میں گھوم کر گزاری تھیں ..... اور ان دنوں وہ اپنی ساتھی نرس سے کہتی رہی کہ "بھئی اللہ کیسے جاگ لیتی ہو تم لوگ؟" اور ہر تھوڑی دیر بعد اپنا تھرماس کھول کر ایک پیالہ تلخ کافی کا پی لیتی تھی اور اس ڈر سے کرسی پر نہ بیٹھتی تھی کہ بیٹھتے ہی نیند نہ آ جائے ....

آج رات جب کہ وہ بالکل تنہا تھی، نرسنگ ہوم کے ماحول کی طرح یہاں کوئی آواز، چیخ اور کراہٹ کی نہ تھی! اس کا مریض کمپر کے اثر سے سو رہا تھا، یا بہت سا خون بہہ جانے کے باعث غافل تھا ..... وہ بہرحال منیرہ کے پلنگ پر آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ اس کا زخمی بازو پٹیوں سے جکڑا ہوا پہلو میں پڑا تھا اور دوسرے ہاتھ کو اس نے سینے پر اس طرح رکھا تھا کہ منیرہ کرسی پر نیم دراز ہو کے محض ہاتھ کی خفیف جنبش سے اس کے سانس کی آمد و رفت شمار کر رہی تھی ....

کنور رانی سونے کو چلی گئی تھیں ..... کنور صاحب نے بمشکل ان کو بھیجا تھا ..... انھوں نے کہا ..... منیرہ سے غلطی ہوئی ہے، اسے خمیازہ بھگتنا چاہیے ..... اور بہرحال وہ نرسنگ سیکھتی ہے، کسی بھی مریض کی دیکھ بھال اس کا فرض ہے۔ کنور رانی چلی گئیں تو کنور صاحب منیرہ کو سمجھاتے رہے کہ موٹر چلاتے وقت ڈرائیور کے فرائض کیا ہوتے ہیں اور کن امور کا خیال اشد ضروری ہے ..... منیرہ سنتی رہی ..... پھر کنور صاحب بھی یہ کہہ کر چلے گئے کہ "ضرورت ہو تو مجھے فوراً جگا لینا ....."

منیرہ نے آمد کر اس بدقسمت اور کوٹے کو دیکھا جو بہت عمدہ اور قیمتی تھا۔ اور جس کے چند گھنٹے قبل وہ بڑی بے دردی سے چیتھڑے کر چکی تھی ..... خون آلود آستین اس نے سیلابچی میں ڈال دی اور باقی حصے کی تلاشی لینے لگی ....

ایک جیب میں سے چاندی کا سگریٹ کیس اور لائٹر ملا ..... دوسری جیب میں پارکر قلم، رومال اور دھوپ کا چشمہ تھا جس کا ایک شیشہ اس حادثے کی نذر ہو چکا تھا۔ اندر کی جیب میں چمڑے کا پرس تھا جس میں چند نوٹ تھے۔ کچھ ریزگاری تھی۔ ایک اس کا اپنا فوٹو تھا اور ایک رسید تھی جس پر اس کا نام لکھا تھا "نیاز احمد خاں"۔

"نیاز احمد" منیرہ نے آہستہ سے کہا اور اس کی جیبوں سے نکلا ہوا سامان پلنگ کے سرہانے میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر یوں ہی خواہ مخواہ کمرے میں ٹہلتی رہی۔ پھر کرسی کھسکا کر پلنگ سے ملا دی۔ بانتی سے اپنی رضائی اٹھا کر کمبل کے اوپر آہستہ سے پھیلائی اور سبز رنگ کے بلب والا لیمپ روشن کر کے بجلی گل کر دی ..... کمرے میں سکون ریز سبز روشنی پھیل گئی۔

دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر منیرہ نے اس کی پیشانی کو چھوا ..... جسم سرد تھا ..... چلو خدا کا شکر ہے کہ بخار نہیں ہوا ورنہ نیمونیا کا ڈر تھا ..... ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ جگا کر پانی دینا تو غلط ہے ..... ڈاکٹر نے تو اٹھا کر دوا پلانے کو بھی منع کر دیا ہے ..... اس لئے بول ہی رہنے دو ..... چہرہ اور گردن کو سردی تو نہیں لگ رہی ہو گی ..... کہیں یکلخت ٹھنڈا اور نہ ہو جائے۔ منیرہ نے اپنی گردن سے شال اتار کر بڑی احتیاط سے اس کا سر گردن اور شانے ڈھک دیئے۔ الماری سے گرم چادر نکال کر اپنے گرد لپیٹی اور کرسی پر نیم دراز ہو کر اس کو دیکھنے لگی ..... کون ہے یہ؟ کون ہے بے چارہ؟ کون ہے یہ نوجوان ..... میرے راستے میں کیسے آ گیا .....؟

علی الصبح نیاز نے آنکھ کھولی ..... زخمی بازو اٹھانا چاہا اور چیخ مار دی ..... منیرہ اسے بیدار ہوتے دیکھ کر گلاس میں اس کے لئے دوا انڈیل رہی تھی ——— دوڑ کر آئی ..... کیا بات ہے؟

مجھے کیا ہو گیا ہے ..... میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا ..... ہائے ہائے!! وہ چھوٹے بچوں کی طرح مچل رہا تھا ——— منیرہ گھبرا گئی ..... یہ تجربہ اس کے لئے نیا نہ تھا۔ اکثر مریض شور مچا کر سارا وارڈ سر پر اٹھا لیتے تھے۔ تاہم اس سوال کا جواب دینا منیرہ کے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ غالباً رات ڈاکٹر نے جو کچھ اسے بتایا وہ بھول گیا تھا ..... تم کون ہو؟ اس نے منیرہ سے پوچھا۔

"نرس!" منیرہ نے آہستہ سے کہا اور بائیں شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے کی کوشش سے باز رکھنا چاہا۔

"نرس!" پھر اس نے منیرہ کو جانی پہچانی نظروں سے دیکھا اور لیٹ کر معصومیت سے پوچھا "میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا؟"

"موٹر سے کچل گیا ....." منیرہ نے بصد مشکل ہونٹوں پر زبان پھیر کر یہ الفاظ کہے "گھبرائیے نہیں آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"ہائے موٹر سے کچل گیا!" وہ دوبارہ شور مچانے پر آمادہ تھا "کیسے کچل گیا، کس کی موٹر سے کچل گیا؟"

"میری موٹر سے ....." منیرہ نے مجرمانہ انداز سے سر جھکا کر کہا۔ "مجھے معاف کر دیجئے ..... میں بہت شرمندہ ہوں۔"

اور ضبط کے باوجود پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے جنہیں وہ چھپا نہ سکی۔

"ارے آپ تو روتی ہیں ..... خدا کے لئے آنسو پونچھئے ..... آپ تو کہتی ہیں کہ میں اچھا ہو جاؤں گا" وہ ڈر کر اپنا دکھ بھول گیا۔ منیرہ نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کو سہارا دیا اور دوسرے ہاتھ سے دوا کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا .....

وہ اپنی کرسی نے بڑا منہ بنا لیا: "پانی لاؤں کلی کے لئے؟ الائچی کھائیں گے آپ؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "سگریٹ ہوں گا"

"سگریٹ!" منیرہ بوکھلائی ..... "سگ روم میں تو ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر مریضوں کو سگریٹ پینا ممنوع تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو آنے دیجئے۔ ان سے پوچھ لوں"

"میری معالج تو آپ ہیں" اس نے خفگی سے کہا "میں آپ سے پوچھتا ہوں"

منیرہ خاموشی سے اٹھی ..... میز سے سگریٹ کیس اٹھا کر کھولا اور ایک سگریٹ نکال کر اس کے لبوں میں پکڑا دی پھر لائٹر کھولا اور سگریٹ روشن کیا ..... اب وہ سر جھکائے کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ سگریٹ پیتے ہوئے غور سے اس کا چہرہ تک رہا تھا ———

ڈاکٹر حفیظ اپنے ساتھ اپنا کمپاؤنڈر اور ایک نرس بھی لائے ..... آتے ہی انھوں نے منیرہ سے رات کی کیفیت پوچھی اور کہا کہ اب میں آپریشن کروں گا تم جاؤ سو جاؤ ....."

منیرہ نے اجازت چاہی کہ کیا وہ آپریشن کے دوران اسی کمرے میں ٹھہر سکتی ہے؟ ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد آپریشن شروع ہوا ..... کمپاؤنڈر نے اسے بے ہوش کیا اور ڈاکٹر حفیظ نے جراحی کی ..... دوسری نرس ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور منیرہ کئی گز کے فاصلے پر آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی اور دل کہہ رہا تھا "اللہ میری لاج رکھ لیجیو"

جب آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر حفیظ میز کے پاس سے ہٹے اور نرس پٹیاں باندھنے لگی تو منیرہ نے ڈاکٹر حفیظ کے ہاتھ دھلواتے ہوئے تشویشناک لہجے میں پوچھا "ڈاکٹر صاحب یہ ہڈی ٹھیک ہو جائے گی؟"

ڈاکٹر نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا "مجھے یقین ہے کہ میں ایک کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر ہوں ..... کیا تمہیں شک ہے؟"

منیرہ جھینپ گئی "میں یوں ہی بدحواس ہوں ڈاکٹر صاحب"

ڈاکٹر حفیظ اس کا ہاتھ پکڑ کر کنور رانی کے کمرے کی طرف لے گئے "کنور رانی صاحبہ ..... منیرہ کو نیند کی ضرورت ہے ..... اسے اپنے کمرے میں سونے دیجئے ..... یہ ناشتہ کر کے سو جائے اور جب تک میں شام کو واپس نہ آجاؤں، اسے آپ مریض کے پاس نہ جانے دیں"

پھر انھوں نے منیرہ کو بتایا کہ مریض کے ہوش میں آنے تک کمپاؤنڈر یہاں رہے گا اور پھر شام تک نرس بھی ٹھہرے گی"

کنور رانی کے حکم سے منیرہ نے بلا خواہش چائے اماں اور پلنگ پر لیٹ گئی ——— نیند کسی طرح نہ آتی تھی اور کنور رانی برآمدے میں بیٹھی مغلانی کو اپنے غراروں کا صحیح ناپ بتا رہی تھیں ..... کمرے سے نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ تھک کر سو گئی ——— کئی گھنٹے بعد آنکھ کھلی، کھانے کا وقت گذر چکا تھا۔ مگر کنور رانی خوان سجائے بیٹھی تھیں، منیرہ کو کھانا پڑا پھر اس نے ایک اماں سے کہا میرے کمرے میں جو نرس ہے، اس کو بلا لاؤ" نرس آئی تو چھوٹتے ہی منیرہ سے نیاز کی شکایت کرنے لگی۔

"بڑا جنگلی پلا ہے۔ اچھے تو کھانے کو دوڑتا ہے۔ جب سے ہوش آیا ہے اودھم مچا رہا ہے ..... کہتا ہے "رات والی نرس کہاں گئی؟"

"ایں ..... ؟" منیرہ نے بدلی بے اعتنائی سے پھر پوچھا۔

"ہاں بھئی اور کیا ..... میرے ہاتھ سے تو دوا بھی نہیں پیتا۔"

اب منیرہ کا دل چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اُسے دوا تو پلائے مگر ڈاکٹر کے آنے میں دیر تھی۔ نرس واپس چلی گئی اور منیرہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ڈاکٹر کی راہ تکنے لگی۔

ڈاکٹر حفیظ بلاشبہ کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ شام کو جب وہ منیرہ کے ساتھ نیاز کے پاس پہنچے تو نیاز نے مسکرا کر درد میں کمی کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر حفیظ نے کہا کہ پندرہ دن میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اور منیرہ کو اجازت دی کہ وہ پندرہ دن تک نرسنگ ہوم کے بجائے گھر پر ڈیوٹی دے .....

نیاز نے پھر شور نہیں مچایا۔ رات کو اس کے پاس کسی نرس کی ضرورت نہیں تھی۔ کنور صاحب کا ایک نوکر رات کو اس کے کمرے میں سو جاتا اور منیرہ یہ ہدایت کر کے برابر کے کمرے میں سونے چلی جاتی کہ یہ جاگیں تو مجھے بھی اٹھا لینا ..... وہ اللہ کا بندہ نوکر تو گھوڑے بیچ کر سوتا تھا مگر منیرہ کو اکثر رات میں نیند نہ آتی اور وہ بار بار آ کے نیاز کو جھانک لیتی تھی۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لے رہا ہے ..... منیرہ ڈریسنگ گون پہن کر آئی "کہیے کیا حال ہے؟"

"آپ کی عنایت ہے" وہ مسکرایا۔

"جاگ کیوں گئے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"پہلے آپ بتائیے ..... آپ کیسے جاگیں؟" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میری بات چھوڑیئے ..... میں تو آپ کی نرس ہوں" منیرہ گھبرائی۔

"اور میں کیا آپ ہی کا زخمی نہیں ہوں؟" اس نے شرارت سے پوچھا ——— منیرہ سے وہاں ٹھہرنے نہ بنی .....

وہ چیختا ہی رہا "سگریٹ چاہیئے ..... ایک سگریٹ چاہیئے" منیرہ وہاں سے بھاگ آئی۔ وہ سونہ سکی اور صبح تک پلنگ پر مٹھی بھینچے سے انگلیاں چٹخاتی رہی۔ نیاز کی آنکھوں میں کیا ہے ..... باتوں میں کیا ہے ..... دل میں کیا ہے .....؟؟؟

نیاز کا سیدھا ہاتھ تو خیر بے کار ہی تھا، مگر وہ اپنا دوسرا ہاتھ دانستہ استعمال میں نہ لاتا اور بڑے اطمینان سے منیرہ پر حکم چلاتا رہتا "منیرہ! ذرا سگریٹ دینا" اُسے سگریٹ پینے کا ہوکا تھا ..... منیرہ سگریٹ لاتی تو وہ ہاتھ بڑھانے کے بجائے منہ پھاڑ دیتا ..... ہر دو منٹ بعد اس کی سگریٹ بجھ جاتی اور منیرہ کو لاتے لاتے کر دوڑنا پڑتا۔

دن میں دس مرتبہ وہ اپنے بال سنوارنے کی فرمائش کرتا ..... منیرہ سرہانے کھڑے ہو کر اس کے بال سنوارتی۔

"مانگ ٹیڑھی ہے" وہ اعتراض کرتا ..... منیرہ کو دوبارہ مانگ بنانی پڑتی ..... "ارے! آج تیل تو ڈالا ہی نہیں" آخر کار اُسے یہ بھی یاد آ جاتا اور منیرہ سہ بارہ اس کے بالوں میں اُلجھ جاتی۔ منہ دھلاتی تو آنکھوں میں صابن گھس جاتا ..... پانی پیتا تو آدھا گلاس اس کے گریبان میں اُلٹ جاتا ..... وہ خوب اوندھی سیدھی حرکتیں کرتا اور روز رات کو شب بخیر سے پہلے کہتا۔

"میری باتوں سے آپ کو غصہ تو نہیں آتا؟"

منیرہ سوچتی "کیا مجھے کبھی غصہ بھی آسکتا ہے؟"

وسیمہ کو بچوں سے فرصت ہوتی تو وہ میکے آتی، منیرہ نے کہا "آیئے آپا نیاز سے آپ کا تعارف کرا دوں"

وہ دونوں نیاز کے پاس پہنچیں تو منیرہ نے کہا "نیاز صاحب میری آپا سے ملئے ..... میں نے آپ سے ان کا ذکر تو کیا تھا"

نیاز نے کہا "اچھا، یہی ہیں وسیمہ آپا" پھر وسیمہ سے کہنے لگا "معاف کیجئے آپا۔ مجھے تو اعتبار نہیں آتا کہ آپ منیرہ کی بہن ہیں"

"کیوں؟" منیرہ بری طرح چونکی! اور وسیمہ نے پوچھا "کیوں؟"

"بھئی دیکھئے نا منیرہ صحت مند ہے اور آپ کس قدر کمزور ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی حاذق طبیبہ کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی آپ نے کچھ فیض حاصل نہیں کیا....."

وسیمہ ہنسنے لگی اور منیرہ جھینپ گئی۔ وسیمہ نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ منیرہ ہماری بھی دیکھ بھال اسی جانفشانی سے کرے جیسی آپ کی ہوتی ہے ——"

نیاز نے ہنس کر کہا "اس میں شک بھی کیا ہے۔ میرا مرض بھی تو انہیں کا پیدا کردہ ہے!!"

منیرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، گردن جھک گئی اور حلق خشک ہونے لگا۔ نیاز کے پاس سے واپس آئیں تو وسیمہ بولی۔

"تمہارے نیاز صاحب آدمی تو دلچسپ معلوم ہوتے ہیں"

"کافی باتونی ہیں" منیرہ اور کہتی بھی کیا۔

"تم نے بھی کمال کیا" وسیمہ کہنے لگی "اگر خدا نہ کرے کہیں کچھ اور ہو جاتا"

اور پھر وسیمہ کو اپنا ایک پرانا قصہ یاد آ گیا۔ شوخی سے منیرہ کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی "بھئی، ہماری بہو بیگم کی بڑی مبارک ہے انہیں تو معلوم ہے ظفر سے میرا تعارف بھی اسی کی بدولت ہوا....."

منیرہ نے گھبرا کر بہن کی طرف دیکھا "جی کیا مطلب .....؟" اور جھنجھلا کر وسیمہ کی ساری کا پلہ کھینچا۔ "واہ..... خواہ مخواہ.....؟" اور منیرہ کا اپنا دل ناچ ناچ کر اس کے کانوں میں کہہ رہا تھا "بڑی مبارک گاڑی ہے..... ظفر وسیمہ سے ٹکرا گیا تھا اور تم نے نیاز کو زخمی کر دیا..... بڑی مبارک بات ہے....."

اس حادثے کی بدولت منیرہ نے بہت سی نئی چیزیں پائیں اور بہت سی پرانی باتیں بھول گئی..... تنہائی میں سوچنا بھی آ گیا۔ رو رات کو جب نیاز کا آخری سگریٹ سلگا کر اور دن بھر دق کرنے پر اس کی معذرت منظور کر کے سونے کے ارادے سے جاتی تو نیند کا دور دور پتہ نہ ہوتا..... وہ عجیب و غریب باتیں سوچا کرتی..... بچپن کے سنے ہوئے قصے اور پڑھی ہوئی کہانیاں اس کے تصور میں رینگتیں..... ان شاہزادیوں کے قصے جن سے جل کر کوئی جادوگرنی ان کے دماغ میں جادو کی کیل ٹھونک دیتی ہے اور وہ کوئی پرندہ بن کر برسہا برس تک جنگل جنگل ہی بھٹکتی رہتی ہیں —— آخر کار تقدیر پلٹتی ہے۔ ایک شاہزادہ آ کر انہیں جادو کے اثر سے چھڑاتا ہے اور اپنے بندھن میں باندھ کر ساتھ لے جاتا ہے۔

اور اس شہزادے کی باتیں جو شکار کو گیا تھا اور زخمی ہرن کی تلاش میں اس کنویں تک پہنچ گیا جہاں ایک دیو نے کسی بدقسمت شاہزادی کو بند کر رکھا تھا..... شاہزادہ جان پر کھیل کر شاہزادی کو نکالتا ہے اور بڑی شان و شوکت سے دارالسلطنت میں لے جاتا ہے ——

منیرہ کے ہونٹوں پر ننھے منے گیت بھی تھرکتے رہتے تھے۔ اُسے ان پندرہ دنوں میں بال سنوارنے کا سلیقہ اور لباس میں رنگوں کا تناسب بھی آ گیا تھا..... مگر..... پندرہ دن گزر گئے۔ اور نیاز کہہ رہا تھا: "آج ڈاکٹر نے پٹی کھول دی تو کل چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟" منیرہ نے اس کے بال بکھرے چھوڑ دیئے اور سرہانے سے گھوم کر سامنے آ گئی: "کہاں چلے جاؤ گے؟"

"ہوٹل میں..... جہاں سے میرا سامان آپ نے منگوایا تھا۔"

"ہوٹل جانا چاہتے ہو؟ یہاں تکلیف ہے کوئی؟"

"تکلیف!؟ ان پندرہ دن کی راحت، البتہ تکلیف دہ یاد بن جائے گی۔"

"تو پھر جانے کا خیال کیوں آیا؟" منیرہ نے آہستگی سے پوچھا۔

"ارے بھئی ڈاکٹر نے پٹی کھول دی تو پھر جانا ہی پڑے گا۔"

منیرہ خفا ہو گئی: "جناب یہ سرکاری شفاخانہ نہیں۔ مجھ غریب کا گھر ہے..... اور جب تک آپ اپنے گھر جانے کے قابل نہ ہو جائیں آپ یہاں سے نہیں ہل سکتے..... ہاں جب آپ میں اتنی طاقت آ جائے کہ آپ گھر جا سکیں تو چلے جائیے گا..... گھر جانے سے آپ کو میں نہیں روک سکوں گی....."

گھر..... میرا کوئی گھر نہیں ہے..... اگر ہے بھی میرے باپ کا گھر ضرور ہے..... وہ لوگ اول ہی میری باتوں سے ناخوش تھے، اب میری دیوانگی سے اور نالاں ہو جائیں گے....."

"دیوانگی!" منیرہ نے تعجب سے دہرایا: "دیوانگی؟"

"ہاں منیرہ"..... میں نے آج تک کسی کو دھوکہ نہیں دیا..... اور میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں..... یہاں سے جا کر میرے بال ہمیشہ ہی الجھے رہا کریں گے..... میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں گا..... اور میں بالکل دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

اور اس نے شاید مستقبل کی دیوانگی ثابت کرنے کے لئے سگریٹ کو خاکستر دان میں مسل دیا اور سر کو جھٹک کر بال ماتھے پر بکھیر لئے..... منیرہ کی آنکھوں میں حیرت، مسرت اور درد کی ملی جلی کیفیات تھیں..... وہ نیاز کو دیکھتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال سمیٹ ڈالے..... وہ ضدی بچوں کی طرح پلنگ پر پھیل گیا اور ایڑیاں رگڑنے لگا: "میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا..... میں پٹی نہیں کھلواؤں گا..... تم نے مجھے اپنے پاس سے علیحدہ کیا تو میں دوبارہ تمہاری موٹر کے سامنے آ کر جان دے دوں گا....."

ڈاکٹر جنید نے آ کر پٹیاں کھول لیں..... ہڈی جڑ چکی تھی۔ مگر ابھی زخم بھرنے باقی تھے..... ڈاکٹر نے کہا کہ ابھی علاج جاری رہے گا۔ اور کنور صاحب نے نیاز سے خواہش کی کہ جب تک ڈاکٹر صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ وہ بدستور صابق ہو گیا

ہے، وہ یہاں سے نہ جائے۔

جب شام کو منیرہ نے پلنگ کے پاس میز پر اس کا کھانا رکھا تو اس نے یہ کہہ کر کھانے سے معذوری کی کہ اُلٹے ہاتھ سے نہیں کھایا جاتا، حالانکہ جب سے اُسے کھانے کی اجازت ملی تھی، وہ برابر اُلٹے ہاتھ سے کھانے کی مشق کرتا رہا تھا۔

"مجبوری ہے" منیرہ نے سرد آہ بھری۔ پھر تو آپ کو بھوکا رہنا پڑیگا"

"ہونہہ" وہ غرایا۔ آپ جب میری چارہ گر ہیں تو ..... ؟

"جی اب نہیں! پٹی کھل گئی آپ کی ....."

"اچھا یہ بات ہے" اس نے خفگی سے منہ پھلایا "اب تو آپ ذرا پھر اپنی موٹر لے کر نکلئے ..... پھر دوستاں سلامت ....."

"نا بابا!" منیرہ نے کان پکڑتے ہوئے کہا "میں باز آئی موٹر چلانے سے ..... سب مجھے الزام دھرتے ہیں اور میں آج تک نہیں سمجھ پائی کہ یہ ہوا کیسے ..... آخر آپ تھے کہاں ..... سامنے تو ہرگز نہیں تھے؟"

نیاز ہنسنے لگا ..... ایمان کی پوچھو تو خطا میری تھی ..... تمہارا واقعی اس میں قصور نہیں ..... میں نے خدا جانے کیوں دفعتہً سڑک پار کرنا چاہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے موٹر کی آواز سنی اور سڑک پر روشنی پڑتی دیکھی ..... میں لیمپ پوسٹ کے اس طرف کھڑا غالباً سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا ..... بس ایک ساتھ میں نے سوچا کہ موٹر گذرنے سے قبل سڑک کے دوسری طرف پہنچ جاؤں ....."

"یہ آپ کو سوجھی کیا؟" منیرہ نے حیرت سے کہا۔

"بس حماقت کہو ..... ہوش میں تو تھا نہیں ..... اس قدر پی لی تھی کہ ہوش پہنچا دو بھر ہو رہا تھا ——"

"جی؟" منیرہ نے سہم کر کہا "آپ نے ..... آپ نے ..... شراب ..... پی لی تھی!"

"ہاں" نیاز نے دیکھا کہ منیرہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی ..... پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا ..... پھر کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا سر پکڑ لیا۔

"منیرہ! منیرہ!" نیاز کا چہرہ سفید ہو گیا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں" منیرہ نے مایوسی سے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی نگاہوں میں کرب تھا۔

"نہیں نہیں" میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو گئی ہو ..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو رہی ہے ..... نہیں نہیں منیرہ خدا کے لئے ..... مجھ سے نفرت نہ کرو، مجھ سے خفا نہ ہو جانا ..... میں تمہاری خفگی برداشت نہیں کر سکوں گا ..... میں جان دے دونگا ——" اس نے کانپتا ہوا سیدھا بازو اٹھایا اور منیرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کمزور اور زخمی ہاتھ میں انگاروں کی تپش تھی، منیرہ پھر گھبرا کے کھڑی ہو گئی —— نیاز نے عاجزی سے کہا "میرے خون آلودہ جسم سے تمہیں گھن نہیں آئی۔ مگر میری واقعہ فطرت نے تمہیں متنفر کر دیا ..... میں سچ کہتا ہوں منیرہ، میرے ہر مرض کا علاج تمہارے پاس ہے ..... تم چاہو گی تو میں بہت اچھا انسان بن جاؤں گا ..... تم یہی کہو

جسے کسی کی محبت نصیب نہ ہو، وہ اپنے ہوش میں رہے تو کیا کرے۔

منیرہ جھجک گئی اور رکابی میں کھانا اتارنے لگی..... نیاز چھوٹے بچوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر اس کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا!

منیرہ کو نیاز کے ساتھ جو خلوص تھا، وہ تیمارداری سے کچھ سوا ہی تھا۔ یہ بات زیادہ دن تک گھر والوں سے نہ چھپ سکی..... دفعتہً کنور صاحب نے نیاز سے اس کے گھر اور گھر والوں کا پتہ پوچھنا شروع کر دیا اور کنور بانی سے کچھ ایسی بات چیت ہونے لگی: "خاندان اچھا ہے.... اکلوتا بیٹا ہے۔ شہری جائداد ہے.... پڑھا لکھا ہے.... صورت اچھی ہے، عمر زیادہ نہیں، نوکر ہو جائے گا۔"

ایسی بہت سی باتیں برآمدے کی چق، کمرے کے پردوں اور کواڑوں کی درازوں کے علاوہ دیمہ کی زبانی بھی منیرہ کو معلوم ہوتی رہیں اور وہ راتوں کی تاریکی میں اجالوں کے خواب دیکھتی رہی ——— اپنے زخمی ہاتھ سے نیاز چاہتا تو منیرہ کی گردن توڑ دیتا۔ مگر ابھی تک نہ اس سے لائٹر جلا کر سگریٹ سلگائی جاتی اور نہ اپنے بال سنورتے.... منیرہ کو یہ سارے کام اپنے ہاتھوں سرانجام دینے پڑتے تھے۔

ایک روز جب وہ نیاز کے لئے چائے بنا رہی تھی تو اس نے کہا: "کل سے اپنا کام کیجئے گا۔ مجھے زرنگ ہوم جانا ہے۔"

"خیریت؟" وہ چونکا۔

"جناب مجھے مہینہ بھر کے بعد زرنگ کا امتحان دینا ہے.... خیر اب تو میں کیا خاک پاس ہوں گی ——— ایک مہینہ جھک مارا ہے۔"

"اچھا جی! جھک مارا ہے آپ نے..... اور مجھے جو مار ڈالا تو..... اس کا کچھ بھی تذکرہ نہیں ———"

منیرہ گھبرائی: "ارے بھئی بخشو..... میں امتحان کی کہہ رہی تھی....."

"گولی مارو امتحان کو....." وہ گنگنایا۔

"ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں"

منیرہ اٹھ کر چل دی۔

"سنو منیرہ..... کیا سچ مچ کل سے زرنگ ہوم چلی جاؤ گی؟"

"اور کیا..... جانا ہی پڑے گا..... ڈاکٹر حفیظ کا قطعی حکم ہے، وہاں زرنگ ہوم میں ایک چھوٹی سی لڑکی "رقیہ" ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ میرے لئے بہت روتی ہے..... کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔"

"اور میں بے چارہ چھٹا سانڈ کا جو یہاں روؤں گا تو....." وہ اٹھلایا: "میں بھی تو کھانا پینا چھوڑ دوں گا۔"

"جھوٹ بات!" منیرہ جھینپی۔

"ارے لڑکی میں جھوٹ نہیں بولتا..... تمہاری بے اعتبار طبیعت کی قسم ـــــ تمہارے زرنگ ہوم کے راجوں کو اور زمیں جگت لیں گی مگر میری دوا تمہارے اور صرف تمہارے ہاتھ ہے"

ایک دن نیاز نے منیرہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں آگرے جا کر اپنے والدین کو لیے آتا ہوں..... وہ میری دیوانگیوں کے سبب ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہے مگر اب میں اچھا لڑکا بن کر دکھاؤں گا۔ شرط یہی ہے کہ وہ تمہارے حصول میں میری مدد کریں....."

کنور صاحب اور کنور رانی بھی اسی قسم کا اقدام چاہتے تھے۔ جو نیاز کے والدین کی طرف سے ہو۔

بند کمرے میں پڑے پڑے نیاز کو بہت دن ہو گئے تھے، ڈاکٹر کی ہدایت پر منیرہ اسے لے کر موٹر میں سیر کرنے چلی.....

"پہلی بات نیاز نے یہ کہی کہ اب آپ کو قطعی حق نہیں ہے کہ میرے علاوہ کسی کو مشق ستم کے لئے تجویز کریں۔ اگر دل چاہے تو مجھے حکم دیجئے گا میں لیٹ جاؤں گا سڑک پر....."

"بکواس بند کرو" منیرہ نے گاڑی اسٹارٹ کی..... "عجائب خانہ دیکھو گے"

"اک نیا سفر رہا ہے ترے دو نین میں" اس کی آواز بالکل بے سری تھی۔

"خدا کے واسطے نیاز سڑک والے کیا کہیں گے"

"تیرا دیوانہ رہوں، سب سے بیگانہ رہوں" اسے عجیب و غریب گانے یاد تھے۔

دونوں نے عجائب خانے کے ایک ایک گیلری اور ایک ایک پنجرے کو دیکھا..... بندروں کو چنے کھلائے..... مچھلیوں کو مرمرے ڈالے..... شتر مرغ پر کنکر پھینکے۔ اور لکڑیاں ڈال کر بھالوؤں کو نہلایا..... منیرہ نے اپنی عمر میں پہلی بار شرارتیں کیں اور اپنی حرکتوں کا لطف اٹھایا۔ اور جی بھر کے ہنسی.....

واپسی میں جب وہ الہ آباد سے گزرے تو ایک موٹر پر رفیع سے مقابلہ ہوا..... وہ موٹر سائیکل پر آ رہا تھا..... منیرہ کو اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور تعجب سے نیاز کو دیکھا۔ موٹر آگے نکل گئی تو نیاز نے پوچھا: "منیرہ تم اس لڑکے کو جانتی ہو؟"

"ہاں بھئی یہ تو آپا کا دلدار رفیع ہے"

"اوہو! اس سے تو میں بھی مل چکا ہوں"

"کہاں....." منیرہ نے پوچھا۔

"کیفے میں ـــــ اسی رات کا قصہ ہے جب تم نے میرا مزاج درست کیا تھا..... کیفے میں یہ بھی تھا..... ہم سب نے مل کر فلیش کھیلا اور..... اس نے بھی بہت شراب پی تھی..... بلکہ اسی کم بخت کی وجہ سے میں بہت پی گیا....."

منیرہ کا چہرہ بے رونق ہونے لگا..... نیاز نے محسوس کر لیا۔

"منیرہ ..... منیرہ خدارا اب اُسے بھول جاؤ ..... تمہارے پاس آکر تو مجھے ایک دن بھی شراب کا دھیان نہیں آیا ..... مجھ سے اس زمانے کا حساب نہ لو جب تم میری زندگی میں نہ تھیں ..... اور اب ..... میں اپنی پہلی اور آخری محبت کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تم اسے حرام کہہ دوگی تو یہ مجھ پر حرام ہو جائے گی ..... منیرہ !!؟؟"

منیرہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی .....

اسی دن شام کو جب نیاز تھک کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا اور منیرہ ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر سکڑی ہوئی بیٹھی تھی، تاکہ وسیمہ کو ماں باپ سے یہ کہتے ہوئے سن لے کہ نیاز اپنے گھر والوں کو بلانے کے لئے کل آگرے جانا چاہتا ہے ..... تو باہر رفیع کی موٹر سائیکل پھٹ پھٹائی ..... وہ مہینوں بعد یہاں آیا تھا .....

اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس نے منیرہ سے پوچھا: "آج دوپہر جو حضرت تمہارے ساتھ موٹر میں تھے کیا یہی ہیں جنہیں سنا ہے تمہاری موٹر سے چوٹ آگئی تھی؟"

"ہاں یہی ہیں" وسیمہ نے بتایا۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟" کنور صاحب نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔

رفیع مسکرایا۔ "میں ان سے اتنا واقف نہیں کہ ان کی بابت کوئی رائے قائم کر لوں ..... میں نے اس سے قبل ایک ہی مرتبہ ان کو دیکھا ـــ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ یہ عقل سے خارج تھے؟"

"کیوں؟ کیوں؟ کنور صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے" کیا مطلب؟"

"واقعہ یوں ہے" رفیع مزے لے کر سنانے لگا: "میں ایک دوست کے ساتھ کیفے میں چائے پینے گیا تھا ..... وہاں کئی لفنگوں کے ساتھ ایک میز پر یہ صاحب بھی جوا کھیل رہے تھے ..... اور انہوں نے اس قدر شراب پی لی تھی کہ گانا گاتے تھے، گالیاں بکتے تھے اور سب سے لڑنے پر آمادہ تھے ـــ"

ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا!

گھبرائی آواز میں کچھ دیر بعد وسیمہ نے کہا: "یہ کہتے ہو رفیع؟"

"ارے بھابی مجھے جھوٹ بول کر کیا نفع ہوگا!؟"

پھر طویل خاموشی!

لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتی منیرہ اٹھی اور دروازے کی طرف چلی: "کہاں جا رہی ہو منیرہ؟" کنور رانی نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "بیٹھ جاؤ"

منیرہ واپس آکر دھم سے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد کنور صاحب اٹھے اور کھنکار کے بولے: "وسیمہ نیاز سے کہہ دو کہ وہ کل اپنے گھر چلا جائے ـــ یا یہاں بھی چلے ..... مگر اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے ..... یہی ہمارا جواب ہے"

کنور رانی نے پھر منیرہ کو نیاز کے کمرے کی طرف نہیں جانے دیا۔ نیاز رات بھر اس کا منتظر رہا اور وہ رات بھر

وسیمہ کے گلے سے لپٹی ہوئی سُبک سُبک کر کہتی رہی۔ "آپا خدا کے واسطے میری مدد کرو..... آپا اور امی سے کہہ دو کہ میری قسمت پر بھروسہ کریں ——— میں اُسے سنبھال لوں گی..... اُس کا دل بُرا نہیں ہے..... میں جانتی ہوں وہ مجھے دھوکہ نہیں دیگا..... آپا اور امی سے کہہ دو کہ مجھے میری تقدیر کے حوالے کر دیں....."

صبح ہو گئی..... پُرانا سورج نئی تمازت کے ساتھ نکلا اور شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول مرجھا گئے.....

وسیمہ نے کنور رانی سے کچھ کہنا چاہا تو وہ شیرے کی طرح بکھر گئیں: "وسیمہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ..... تو بھی ماشاءاللہ بیٹی والی ہے..... آنکھوں دیکھے مکھی کون نگلتا ہے..... کیا میں نے بیس بائیس سال تک اسی لئے منیرہ کو پالا تھا کہ اپنے ہاتھوں بھاڑ میں جھونک دوں ——— کیا میرے نصیب میں یہی تھا کہ اکلوتا بیٹا تو فرنگن کرے اور بیٹی جان بوجھ کر جواری شرابی کے پلّے بندھ جائے؟"

وسیمہ باجی کے پاس گئی تو انھوں نے جواب دیا: "بٹیا تم خود ابھی جذباتی لڑکی ہو..... اس معاملے کو ہمارے زاویۂ نظر سے دیکھو! یوں سمجھو کہ جب تمہارا کمسن بچہ آگ کے لپکتے ہوئے شعلے کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس وقت تم اس کے دل کا خلوص کرتی ہو یا اپنے دماغ پر چلتی ہو..... منیرہ سے کچھ عقل سے کام لے....."

نیاز جا رہا ہے..... نیاز چلا گیا..... اس نے پردے کے پاس منیرہ کا لرزتا جسم دیکھا..... وہ رُکا نہیں..... وہ کچھ کہہ بھی نہ سکا..... اس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا مگر رُوح کچلی ہوئی تھی اور اس کا کوئی چارہ گر نہ تھا ——— کوئی دردمند نہ تھا۔

جب ڈاکٹر حفیظ آئے تو ابھی تک منیرہ اپنے اس پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی جس پر ایک رات اس نے بے ہوش نیاز کو لا کر ڈالا تھا..... ڈاکٹر صاحب نے اُسے ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور زندہ ہوتی آواز میں کہا: "میں نے سُن لیا ہے منیرہ..... وہ چلا گیا ہے..... اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے..... تمہارے ساتھ بھی..... ہم اس فیصلے کو تسلیم نہیں کریں گے..... میں اُسے ڈھونڈ لاؤں گا....."

"نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب وہ اب کبھی نہیں آئے گا..... آپ اُسے کبھی بھی نہیں ڈھونڈ سکتے ——— آپ کی کوئی پکار اس کے کانوں میں نہیں جائے گی۔"

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش کھڑے ہوئے منیرہ کو تکتے رہے، پھر انھیں ایک دم کچھ یاد آ گیا: "منیرہ بیٹی تمہیں تو وہ پکار ضرور سنائی دے گی جو تمہارے لئے ہے..... تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری زندگی تمہاری اپنی نہیں ہوگی..... تمہارا کام اپنے غم میں آنسو بہانا نہیں ہے اوروں کے دُکھ دھونا ہے..... زرسنگ ہوم میں تمہاری ضرورت ہے، وہ اپاہج بچی وقیہ جسے تم دو سال سے پال رہی تھیں، تمہارے بغیر رو رو کر اپنا خون کرتی ہے۔ وہ پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھاتی۔ دو ماہ میں اس کا وزن بہت زیادہ گھٹ گیا ہے..... تمہیں اس پر رحم نہیں آتا؟"

ڈاکٹر حفیظ منیرہ کو اپنے ساتھ زرسنگ ہوم لے آئے۔ اُسے بازو کا سہارا دیتے ہوئے وہ لمبے برآمدوں میں سے گزرے۔ چاروں طرف منیرہ کی جانی پہچانی نرسیں کھڑی تھیں، وہی نرسیں جو منیرہ کو آتے دیکھ کر ہمیشہ مسکراتی تھیں..... آج ان کے چہرے اس طرح

خاموش اور اداس تھے کہ جس طرح انھوں نے ابھی زندہ کے عالم میں کسی مریض کو دیکھا ہو.....

وہ بغیر کہیں رکے طویل وارڈز میں مریضوں کے دو رویہ بستروں کی قطاروں کے بیچ میں سے گزرتے رہے اور ڈسپنسری، آپریشن تھیٹر اور مردہ گھر سب پیچھے رہ گئے..... یہ نرسنگ ہوم کا آخری حصہ ہے "نرسری" ڈاکٹر صاحب نے بیاد سے اس کا شانہ تھپکا ہمیں آفس جا رہا ہوں منیرہ..... تم اپنا فرض بخوبی پہچانتی ہو"

ڈاکٹر جنتا چلے گئے ——— وہ آہستہ آہستہ نرسری میں داخل ہوئی..... کچھ بچے کھیل رہے تھے..... کچھ رو رہے تھے..... رقیہ اپنے پلنگ پر خاموش بیٹھی تھی..... منیرہ کو دیکھ کر اس نے خوشی سے چیخ ماری اور ہاتھ پھیلا دیئے..... منیرہ بے تابانہ اس کی طرف دوڑی اور اس کے ننھے بازوؤں میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

بالآخر ننھی رقیہ نے ایک ننھی سی بات پوچھی: آپا۔ آپ اتنے دن کہاں رہیں؟

بھیّا دیوج

ابوالفضل صدیقی

گوبردھن سنگھ کبھی جوان تھے۔ مگر ان کے ماتھی کی مضبوط رسیوں کا سایہ مدتیں ہوئیں ان کے حال سے کٹ گیا تھا۔ اور وہ خالی جوان ہی جوان رہ گئے تھے۔ اور سنا کرتے تھے کہ بڑھی گنگا کی ترائی سے بڑی گنگا کی کشتی تک دس کوس لمبے چوڑے دنگل میں ان کے باپ دادا پردادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور نورے کی جھنکار بیس بیس کوس تک جاتی تھی۔ اور پھر یہ بھی سنا ہے کہ بڑے بڑے محال پٹیاں، دھانیاں، تان کاریں ان کے دادا کی زندگی ہی میں مہاجن کے قرضے میں نیلام ہو گئے اور لاکھوں کی جائداد کوڑیوں میں سود بیاج میں نکل گئی۔ اور پھر یہ بھی سنتے چلے آرہے تھے کہ ان کے دادا نے دنگل کی شادی میں مہاجن سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا تھا جس کے سود در سود کے چکر میں باپ کے وقت تک پہنچتے پہنچتے ایک لاکھ کی مالیتی جائداد برابر ہو گئی۔ اور گوبردھن سنگھ نے دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ یہ بھی سنا ہی تھا کہ بس جوڑی آبائی سیر خود کاشت کے سینکڑوں دیگر ذرائع تھے جو زمینداری نگل جانے کے بعد ساقط الملکیت کے ضمن میں آگئے تھے۔ بنیے، زمیندار کی بقایا لگان کی نالشوں میں بے دخل ہو گئے۔ جن کے ساتھ آدھے آدھے گھوڑے گھوڑیاں، بڑے بڑے بیل، دودھار گائیں بھینسیں سب کے سب باپ کے اخیر زمانہ میں ہی اپنے ہاتھوں چل کر گھر خالی کر گئے۔ اور گھر کے اندر جانور کے نام گوبردھن سنگھ کے ہاتھ جو بے کا بچہ بھی وراثت میں نہ آیا اور رہے سہے بے مرمت ٹوٹی مکان نے آبائی قرضہ کا اخیر حصہ چکانے میں نیلام ہو کر گوبردھن سنگھ کو نکال باہر کیا۔ اور اب وہ ایک جھونپڑے میں رہتے تھے جو کسی زمانہ میں ان کے دادا کے مویشی خانہ کا ایک گوشہ اتارو اور بے کار حصہ تھا۔ جس کے اندر تانون نے انہیں مکان نیلام ہونے کے بعد زندگی بھر حق رہائش دیا تھا۔ اور عنفوان شباب سے لے کر آج چالیس کے پیٹے میں آ گئے اور اسی چھپر میں بس رہے تھے۔ اور انہیں اپنے حال کے متعلق صرف اتنا یاد تھا۔ کہ وہ ایک مزدور ہیں۔

اور مزدور ہو کر بھی اور سب کچھ بھول جانے کے گوبردھن سنگھ کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کھرے جوان ہیں: "دلی والے جنہوں نے محمد غوری کو بھی میدان جنگ میں چند کو نیست و نابود کیا۔ آہا! دول ملکھان سے ہیر پالے، پھر دہلی کھنڈی جوان! حافظ جی رحمت خاں کے سہرے باندھا جن کے بل پر روہیلے فرنگی اور شاہ اودھ ایک ٹکاری اٹھے دلی پر چڑھ دوڑے"

اور اس سنی سنائی کو محفوظ کیے تھا کہ گوبردھن سنگھ اب تو بیس سال سے اسی دنگل میں تیرے میرے کھیتوں کے اندر روزانہ روز کی مزدوری کر رہے تھے۔ جہاں اب سے چالیس سال پیشتر ان کے باپ دادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور ان کے بیہاور پرکھے پورب

کر منہ کر دیتے تو پرانی دم سادھ جاتی اور تکبیم کو نگاہ اٹھا دیتے تو چہرہ سے آدھیاں لٹ کر نکل جاتیں۔ اور ان کے زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے دو چار بڈھے اب بھی دیہات میں باقی تھے جو گوبردھن سنگھ کو کھیت کھیت دو دو آنہ کی مزدوری کرتے دیکھ کر اس کے ماضی کے حالات بتاتے اور اپنی اولاد کو عبرت دلاتے۔

باپ کی زمینداری، سیر خود کاشت، اثاث البیت، دولت سب کچھ باپ کی زندگی ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ ایک بہن تھی۔ جس کو وہ اچھے گھر بیاہ گئے تھے۔

اور انہوں نے اپنی شکرائت کے بھاری بھرم سے گوبردھن سنگھ کو بھی اچھے گھر بیاہا تھا۔ اور گوبردھن سنگھ کے سسرال والوں نے بہتیرا چاہا کہ وہ گھر جمائی بن کر رہیں۔ مگر انہیں پرانی مثل یاد تھی کہ "ساس گھر جمائی سوئی" اور نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوا اور جلد ہی کیا بیاہ کے بعد گونے دوسرے کی صورت ہی نہ آئی اور بھلا ایسے گھر میں کوئی کھاتے پیتے گھرانے کی راجپوتنی کیسے گزر کر سکتی تھی۔ کروں بھی، اور اصرار بھی کرتے تو گوبردھن سنگھ کس برتے پر۔ ان کے پاس کیا تھا۔ ایک کھرپی، اور وہ بھی تو کے دھوتی کے پیٹی میں کھرپی لگا کر تھے۔ خیر کھرپی اور زمین کا بھی ازلی رشتہ چلا آتا ہے۔ مگر راجپوت اور زمین کا بھی ازلی رشتہ ہے اور جب ساری دھرتی پر کہیں کوئی شہر بھر زمین کے مالک نہ تھے تو گوبردھن سنگھ کاہے کے راجپوت تھے۔ آپ اپنے منہ میاں مٹھو بنا کریں تو دنیا انہیں راجپوت کیسے تسلیم کرتی۔ جتنے کو سنگھ جو دنگ نے تسلیم نہ کیا۔

اور گوبردھن سنگھ چوہان گوتر میں نہ تھے۔ تو دو دو چار چار کوس چاروں طرف دیہات میں کسی دیہل کا مورونی کاشت کار کے کھیت پر مزدوری کرتے اور مزدور چماروں اور لودھوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں کام پر بیٹھے دکھائی دیتے۔ مگر یہاں بھی اپنی شکرائت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ چماروں اور لودھوں سے ٹوٹا ہوا کام کر کے دکھاتے۔ اور مالک کو ان کو ٹوکنے کی بجائے الٹی تعریف کرنی پڑتی اور بار بار حکم چلانا جاتا۔ یہاں پر انہیں ایمان داری کا خیال کم رہتا بلکہ وہ اپنی شکرائت کی دھاک کو ڈرتے کہ کہیں ان کے پیٹھ پیچھے مالک نہ کہہ کر چلو ٹھاکر ہیں۔ بے چارہ کا وقت بگڑ گیا ہے جو کچھ کریں، کریں۔ اور مزا خیال ان کے دماغ میں یہ آیا کہ میرے ساتھی مزدور سب چمار لودھے نیچ قوم کے ہیں اور اگر یہ مجھ سے زیادہ یا میرے برابر بھی کام کر دکھائیں تو میری شکرائت کا ہے کی ہوئی۔

اور شام کو دو آنہ پا کر گوبردھن سنگھ کتنے مطمئن کس قدر خوش نظر آتے! شاید ان کے دادا اپنے شریف طریقہ اپنی پوری تنخواہ لگان کر کے اتنے خوش نظر نہ آتے ہوں گے۔ اور ان کی بہن جگا اپنے شوہر سے فصل کے فصل ہزاروں روپیہ کی پوٹ ہاتھ میں لے کر اتنی مطمئن نہ ہوتی ہوگی۔

اور جگا کا شوہر ایک متوسط خوشحال زمیندار تھا۔ جس کے یہاں سبھی کچھ تھا۔ اور سالے کی حالت سے کچھ واقف بھی تھا۔ اور اس کی پچھلی خاندانی روایات تو آج تک زبان زد خاص و عام تھیں۔ ہمیشہ شکایت کیا کرتا کہ دو آ پڑے بھائی نے کبھی ہمارا ہاتھ نہ بٹایا۔ اگر فصل کی طیاری کے ہی وقت آ کر سیر کے کھیتوں پر پندرہ دن کھڑے ہو جایا کریں تو سال بھر میں مزدوروں کی چوری سے ہم کو اتنا کی رہا کرے کہ دو آتین برس میں نہ کھا پائیں۔ اور جگا کو بھی کبھی بھائی کی حالت اور پچھلی روایات کا اندازہ کر کے اپنا عیش اور دولت بے کیف معلوم ہوتی۔ شوہر کے بار بار اصرار پر ایک مرتبہ جگا نے گوبردھن سنگھ سے اپنے یہاں مستقل طور پر چلے آنے کی تحریک بھی کی۔ خیر ہنسی کی بات تو ہمیشہ گوبردھن سنگھ نے ہنس کر ٹالی مگر جگا کی تحریک پر بڑی لال پیلی آنکھیں دکھائیں۔ "ہوں نادان لونڈیا! اپنے باپ دادا کی ناک اپنے ہاتھ سے کاٹتی ہے

شرم نہیں آتی تجھ کو: بہن گھر بھائی سوکتا: پرائے پرکھے کہ مرے ہیں، تو کیا تیرا بھائی کتا ہو جائے۔ مجھے تو ڈوب مرنا اچھا ہے۔ بہن کے در پہ جا کے رہنے سے؟

مگر جب کبھی جگا کی ساس نندیں طعنہ دیتیں کہ بڑی ٹھکرائن بنتی ہو اور بھیا سے ٹکے کی مزدوری کرتے پھرتے ہیں۔ تو جگا لاڈ کو جواب دیتی، مزدوری ہی تو کرتے ہیں بھیک تو نہیں مانگتے، ڈکیتی تو نہیں مارتے اور تمہارے دروازہ پر کس دن مزدوری کرنے آئے ہیں۔ اور یہ کہہ کر جگا اپنے آپ کو فتح مند محسوس کرتی جیسے اس کے بھائی کی حیثیت اس کے شوہر سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔

(۲)

اور اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر اوپر کی لکڑیوں کی ٹٹی چڑھا کر منہ اندھیرے کا نکلا گوبردھن سنگھ سرِ شام چلتا اور اپنی دونوں وقت کی روٹی خود پکاتا، اور صبح کو رات کی رکھی ہوئی باندھ کر ساتھ لے جاتا۔ اور سب مزدوروں کی روٹی ان کی عورتیں دوپہر کو پکا کر لاتیں اور اپنی رات کی پکی ہوئی روٹی کی پوٹلی کھول کر دوپہر کے وقت میں گوبردھن سنگھ کھاتا۔ دوپہر سے پہلے کام والا بھنے ہوئے چنے کا چبینا تقسیم کرتا جو دو آنے سیر کے علاوہ مزدوری ہی کا جزو ہوتا۔ گرمیوں میں رات کا پکا ہوا کھانا دوپہر تک خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے جاڑوں جاڑوں تو گوبردھن سنگھ باسی کھانا کھا لیتے اور گرمیوں کے موسم میں اسی چبینے پر اکتفا کر کے دن کاٹ دیتے۔ تمام دن گوبردھن سنگھ کا جھونپڑا سنسان پڑا رہتا۔ شام کو کبھی کبھی تمی جو رہے، زانی تیلی، جاتی مراد، بے رام لڑکے آ بیٹھتے الاؤ کے گرد کبھی رات تک گپ ہوتی۔ چلموں کا دور چلتا۔ اور اپنی تنہائی پن اور افلاس کے اعتبار سے گوبردھن سنگھ کا جھونپڑا بستی بھر میں اپنی نوعیت کا ایک تھا۔ مگر سال میں ایک دن ایسا بھی آتا۔ جس روز ان کا تاریک ویران جھونپڑا چمک کر اچھا اٹھتا اور صنفِ نازک کے بھیج کی جل ترنگ گونجتی سنائی دیتی جب بھیا دوج پر جگا کنگنا کھولنے اور مٹھائی سے منہ بھرنے سال کے سال آتی، اور بھیا دوج کا محبت اور خلوص سے پُر تیوہار بھی روز بہن بھائی کے تلک لگاتی ہے، منہ مٹھائی سے بھرتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے اوپر سال بھر میں آنے والی سب بلائیں ساری مصیبتیں کل بیماریاں اپنے لیے مانگتی ہے۔ اور پھر اپنی فرد تندرستی اپنے بھائی کو مل جانے کی دعا مانگتی ہے اور یہ ساری دعائیں شیریں گیت کی آوازوں میں مانگی جاتی ہیں۔ بھائی بہن کو اپنی حیثیت کے مطابق دان دیتا ہے۔ مٹھائی کے بدلے میں مٹھائی یا اس کی قیمت دیتا ہے۔ کپڑے دیتا ہے اور آنے جانے کا کرایہ دیتا ہے اور دو تین روز ٹھہرا کر دعوت کرتا ہے۔

بھیا دوج کے دن بالعموم بیواں گھر چھوڑ چھوڑ کر میکے چلی جاتی ہیں اور گھر گھر بیویوں کے بجائے بہنوں کا انتظام ہوتا ہے اور ہر بیوی آج کے دن بیوی نہیں ہوتی صرف بہن ہوتی ہے۔

جگا کا گاؤں راشور نگر جو ان گڑھ سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور ریلوے اسٹیشن سے کوس بھر کے فاصلہ پر آباد تھا۔ بھیا دوج کے دن صبح تڑکے کی گاڑی سے جگا روانہ ہوتی، راشور نگر سے اسٹیشن تک رتھ میں کوس بھر کا فاصلہ طے کرتی۔ اور پھر سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیتی۔ ایک مستعد کارندہ اور ایک مستعد بیری اور ایک کہار تین آدمی ساتھ ہوتے۔ ریلوے اسٹیشن سے جو ان گڑھ تین کوس تھا۔ کارندہ تو حسبِ معمول ہدایات کے مطابق اسی ٹرین سے شہر چلا جاتا اور جگا بیری اور کہار کو اسٹیشن پر ہی چھوڑتی اور ایک ٹھٹیا سی سواری باندھتی اور پیدل جو ان گڑھ روانہ ہو جاتی اور تین کوس کا فاصلہ پیدل اس لیے طے کرتی کہ سفر میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم بندھا بندھا سا ہوتا راستہ میں جو ان گڑھ کے لوگ آتے جاتے اور اور کھیتوں پر کام کرتے ملتے۔ جنہیں وہ مخصوص بہن اور بیٹی والے انداز

میں سلام کرتی چلتی۔

جگا چھوٹی سی مٹھائی کی پوٹلی ہاتھ میں لٹکائے بھیا کے گھر پہنچتی، اور آتا گوردھن سنگھ اس وقت کے لیے مردوں کا رکھا ہوا مخصوص جوڑا نکالتے۔ کالی کنار کی دھوتی روپہلی لگا کر خوب ٹخنے چڑھا کر اور کس کر باندھتے اوپر سے اچکن سفید چھڑیں پہنتے اور سر پر بڑا سا پگ باندھتے، راجپوتی انداز میں خوب مونچھیں چڑھا کر بیٹھتے، ترچھے ترچھے، بھاری بھرکم بنے، اگرچہ ان کی تیوری اور بہروپ میں راجپوتی انداز ہوتے مگر تیوروں میں آزاد مزدور والے دم خم جھانکتے، اور عجیب شان استغنا نظر آتی۔ بہن کو دیکھ کر کھل اٹھتے اور جگا رواج کے مطابق ٹھاٹ ٹھاتی اور منہ میں مٹھائی کی ڈلی دیتی اور پھر اس کی بلائیں لے کر ساری بلاؤں اور مصیبتیں اپنی جانب آجانے کی پرارتھنا کرتی۔ جس کی شان اپنی عمر دندستی اپنے بھائی کو مل جانے پر ٹوٹتی۔

پھر بڑے مخصوص انداز میں گوردھن سنگھ اٹھتے، اپنی کٹھار کی کھڑکی کھول کر اندر گھس جاتے۔ کبھی میدہ آٹا نکالتے، جیسے بھری کٹھار میں سے ایک وقت کے قابل نکال رہے ہیں۔ اور جگا بڑے اہتمام سے پوری کچوریاں، آلو طیار کرتی۔ اور ان کے سامنے پروستی اور انہیں کھلانے کے بعد خود کھاتی اور رخصت ہونے لگتی، رخصت کے وقت دادھو نگر کے اسٹیشن سے چوان گوجھ کے اسٹیشن تک کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بتاتی اور کہتی کہ میں اکیلی آئی ہوں، ہری مٹھائی بتاتی ہر کا ٹکٹ کا چندن سیندور، پھر رقم تین چار روپیہ ہوتی، پھر جسم پر موٹی دو ڈیڑھ روپیہ والی ساڑھی اٹھتے ہوتی اور ویسی ہی ساڑھی کے دام مانگتی اور سب حساب پانچ چھ روپیہ کا بنتا اور گوردھن سنگھ یہ رقم ہاتھ پر رکھتے جیسے پاکر جگا ایسی خوش ہوتی جیسے اس کے بھائی نے ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ افلاس کے ہاتھ کا بکتا ہوا مان دولت کے ہاتھوں میں پہنچ کر ہیرے کی طرح چمکتا اور اس لیے دین کے وقت تمام رسمی تجاویز عارفانہ برتتے جاتے۔

اور سہ پہر کے بعد جگا اسٹیشن پہنچتی، اتنی دیر میں اس کا معتبر کارندہ شہر سے پٹ چلا ہوا تار شیمیں بڑھیا ساڑھی بھری کہار کے ہوتے اور اپنے باریک اچھے کپڑے، اور مٹھائی کا ٹوکرا لیے ہوئے جگا اپنی موٹی ساڑھی اتار کر نئی ساڑھی پہنتی۔ کارندہ بھری کہار اپنے اپنے کپڑے پہنتے اور تھی تھی مسرت اپنی ساس نندیں دیکھتیں، شہر دیکھنا کتنے دور کی چیز ہوتی ہے۔ گوردھن سنگھ اور بلدیو بھی ساڑھی دیکھ کر شوہر بول پڑتا۔

"وقت پر اسے آن والے ٹھاکر ہیں۔ پھر ذرا گرہن کرتے دیتے وقت رئیس بن جاتے ہیں: "جو دیکھو تو یہ ساڑھی اور اس کی ساس تم دیتی، پرانا جہان گھر ہے۔ بات پر ٹھنے والے جہان" اور کوئی تند کہتی "اور مٹھائی تو دیکھو، پھر بھی تو کرا بھری"

ہوں ہیں تو میں کہتا ہوں، دیکھو تو اماں ٹھکرانت ان کی بھی ہے دانت پر سیل نہیں اور بہن کے لیے یہ ٹھاٹ سامان، بھری کہار سب کی بہنا دی کرتے ہیں: "لٹی بھی کو تھی کنار کی دھوتی اور بڑھیا کی قیمت دی ہے۔ ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں: باہر جو پال کے چھپر تو دیکھو"

اور جگا بڑے ہیں سے نکال کر دو روپے کے سکے کے اکیاون روپیہ رکھتی "اور اکیاون روپیہ"

"ہفت والے لوگ ہیں، جائداد سیر دھن سب ختم ہو گیا پر ان دھی ہے"

ہری چھوکری چھوکر رقم کیا جانو ہم جانتے ہیں ان چوانوں کو۔ ہفت کے لوگ ہیں اور بنا دینا سمت کے اتنا بات ہے۔

اور گربدھن کے پاس تو باپ دادا کے زمانہ کا دبا دبایا پڑا ہے۔ یہ روپیہ نہ دیکھو۔ گڑے ہوئے کھودے ہیں۔ جی دار تھا کہ بچھ ہے جان جائے آن نہ جائے۔ کوئی بڑا بکھڑا بیت ادھیس تھا کہ اس سے الجھ اور کیا کرے گا۔ ساس بہتی اور جنکا خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی۔ جیسے یہ سب کچھ جی اس کے بھائی نے دیا ہے۔ یوں تو ساس نندوں کا گھر تھا۔ مگر جنکا جیسے اس سامان سے سال بھر تک سب گھر پر حاوی ہو جاتی۔ جیسے برابر کے تھا کر گھر کی بیٹی۔

(۳)

اور بھیا دیوج کا ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ساڑھے دس مہینے کے چیدہ دونے سے پس انداز کیے ہوئے پانچ روپیہ کے تانبے کے پیسے گربدھن سنگھ کے پاس تھے اور ڈیڑھ ماہ میں انہیں دو ڈھائی روپیہ اور جمع کرنے تھے۔ وہ تمام دن مزدوری کرتے اور شام کو کسی کسان کے یہاں سے موٹھ کے گٹھے اٹھا لاتے اور آدھی رات تک اپنے اکیلے مکان میں پانی لگا لگا کر انہیں کوٹتے۔ کہیں سے پرانے سن کے پرلے سے آتے اور انہیں توڑ توڑ کر سن علیحدہ کرتے اور جاٹ کر باندھ بیٹھتے اور دوسرے تیسرے دن باندھوں کے وزن کے برابر مکا ساتھی مل جاتا اور اس طرح رات کے چار گھنٹے کے کام میں چار چھ پیسہ روز کے سر ہو جاتے اور اس طرح انہیں بھیا دیوج کے پُرخرچ دن کے اخراجات کی فراہمی میں محنت کرتے پندرہ دن لگے تھے اور اب وہ مطمئن تھے کہ اخیر ماہ میں فاقے کر کے پس انداز کرنا پڑے گا۔ ویسے سال بھر میں بارہ مہینے ہر دن تو مزدوری ملتی ہی نہ تھی لیکن اور مزدوروں کی طرح جس دن مزدوری نہ ملتی وہ گھر پر بیٹھتے۔ گھر پر سے کہ جوری بری دوب پر چل پڑتے اور شام تک دو آنے کی نہیں تو باقی چھ پیسہ کی گھاس چھیل کر نکال ہی لیتے اور جب بارش کی وجہ سے کچھ بھی نہ کر سکتے تو اطمینان کے ساتھ فاقہ کر لیتے۔ مگر بھیا دیوج کے فرض کو پورا کرتے رہتے۔ ان کا دائرہ بہت چھوٹا تھا۔ مگر دائرہ کے اندر رہنے کا سلیقہ بہت وسیع، روز کا کنواں کھودتے اور روز کا پانی پیتے۔ انہیں زندگی کے پچیس سال کٹے تھے۔ ان پچیس سال میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا تھا۔ کسی زمین سے ان کا تعلق باقی نہ تھا اور ان کے باپ دادا کا جانشین بننا زمیندار انہیں جانتا بھی نہ تھا۔ مگر وہ اسے خوب جانتے تھے۔ کیونکہ انہی کے ترکہ میں ان کی آبائی زمینداری نیلام ہو کر اسے پہنچی تھی۔ جیسے اس کے بھاری کھلوں اور موٹی قوند کے اندر سود در سود کی دھونکنی سے تھکاوٹ کی روح پھونک گئی تھی۔ جیسے گنو کا ماس کھا کھا کر اس کے اوپر یہ گوشت چڑھا ہے۔ اور ایک دو آنہ یومیہ کمانے والے مزدور کی نگاہیں اس پر انہیں جذبات کے ساتھ پڑتیں۔ اور سلقہ کا جاہل تو ان لوگوں سے واقف تھا۔ جن کے پاس آٹ چٹ اور لین دین کے کچھ مادی سامان تھے۔ اور گربدھن سنگھ کے پاس نہ دام تھا اور نہ خار سے اُجلا تھا۔ البتہ اس کا بھیا دیوج کا حیرت ان جیسے اسے معلوم کتنے سامانوں پر بھاری تھا۔ جو اس کی بہن کا زندہ اور ملازمہ کی سازش سے گھر جا کر دکھایا گیا تھی۔

اور آج جب گربدھن سنگھ یہ سوچ کر گھر سے نکلے کہ زمیندار بھیجنا ہے۔ روزانہ کی موٹھ اور سن کی کٹائی میں تو بڑی محنت بھی پڑتی ہے اور بہت تھوڑا ہاتھ آتا ہے۔ اگر بات کا کام بھیجنا پل جائے تو جنتری بھر کے اندر بھیا دیوج کے حق کے قابل رقم جمع ہو جائے۔ بلا دریافت مال کے بیچ کی جو دو بیگھے کے گھر میں گئے ران اور ہی رنگ دیکھا۔ جی جو دو بیگھے ایک بنجر قصاب کے ساتھ کھڑے تھے اور جی جو دو بیگھے کی اور گھر کے دروازہ کے قریب زمین پر سے بسری پڑی تھی۔ اور بنجر قصاب دستی پکڑ پکڑ کر کھلی رہا تھا۔ اور پیچھے سے جی جو دو بیگھے چیخ چیخ کر کے اشارے کرتے تھے۔ مگر اور کسی صورت زمین نہ چھوڑتی تھی اور زیادہ چیخ کھانے

پر گردن جھکا کر گویا جانے سے انکار کرتی تھی۔

گوبردھن سنگھ پہلی ہی نظر میں سمجھ گئے، اور آہستہ سے جمی جولاہے کے کان کے قریب منہ لا کر بولے "کیوں چاچا ایسی اچھی گھر کی بچھیا کیوں کٹائے دیت ہو؟"

جمی جولاہے محجوب سے ہو گئے اور گردن جھکا کر زیرلب بولے "بیٹا اپنے بس کٹائے دیت ہوں، ذاتی زمیندار کا لگان ٹوٹ رہا۔ بیدخلی رعیت کا نوٹس دیا ہے۔"

"تو پھر کٹائے سے کیا فائدہ، ذاتی سے کہو کہ لے لیں اپنے مطالبہ میں" گوبردھن سنگھ نے کہا۔

ارے بیٹا بہتیری کہی، مشتاما بچھیا ہے۔ کل سے پہلے بڑی سنگھڑ گائے ہے گی۔ پر ابھی مانو، کہت ہے کہ ہم کیا کریں گے۔ ہمیں گائے نہیں چاہئے ہمارا لگان دو۔ ہمیں گاؤں کا ماڈل بنانا ہے کہ جمیندار (زمیندار) کا

"تو کٹنے میں کٹائے دیت ہے چاچا" گوبردھن سنگھ نے رقت کے ساتھ کہا۔

اور اس سے زیادہ رقت کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر جمی جولاہے بولے "ہاں دیتا ہوں بیٹا" اور ایک مسلمان کی آنکھوں میں اپنی گائے کٹنے پر مجبوری کے آنسو دیکھ کر ٹھاکر کے خون میں جوش آگیا اور گوبردھن سنگھ بولے "پھر تم کہی نا سے اس پٹے رزیدار سے کہ کسائی (قصائی) لیتے گو۔"

ہاں بیٹا سب کچھ کہی پر اس نے وہی اپنے مطلب کی کہی کہ تم جانو۔ مت دیو کسائی کو پاؤ دودھ کھاؤ ہمارو مطلب اہمیں تو

گوبردھن سنگھ دانت کٹکٹا کر بولے "بیٹا سالا۔ دلیش بنت ہے درویش بنتا ہے، اور غداری کرتا ہے، کسائی ہے کسائی بھگوان نے حکومت زمینداری دے دی اس کے ہاتھ میں! اسے فلک تیری لیلا!" اور بڑبڑاتے ہوئے گوبردھن سنگھ نے چلنے کا اندازہ بتایا۔ ایک نظر ڈالی تو اور سر (بچھیا) کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ مجبور نگاہوں کی شناسائی میں جتنی آنکھوں سے جا ملیں، اور ساتھ ہی حلق سے آواز اور سرنے گائے سے زیادہ کچھ آدمی سے ملتی جلتی نکالی اور آنکھوں کی وہی سبھی باتیں سب کچھ اس کی آواز میں لہو دی۔ اور آواز پر جیسے ایک ذہنی ترنگ کے ساتھ گوبردھن سنگھ نے اچھل کر پھر اور سر کی جانب دیکھا، اور انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ گائے کی معصوم خوبصورت ہرنی جیسی آنکھوں کی کرنٹ راجپوت کی بہادر آنکھوں سے مل گئیں اور جیسے دو تانبوں کی لہریں ایک دوسرے سے سلسلہ ملانے لگیں۔ جیسے ان کے شعور میں ہزاروں سال پرانی کہانی دوہرا دی۔ وہ بے خود ہو گئے۔ اور ان کے جذبات کا ریشہ ماضی و مستقبل دونوں سے منقطع ہو گیا اور جیسے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے اور بنا ایک نظر آگے اٹھائے سارے دس مہینہ کا جنم دیوج کا اندیشہ قصائی کے حوالہ کیا اور رسی اٹھا کر پکڑ لی اور اور تو جیسے خفا بیٹھی تھی۔ گوبردھن سنگھ کے رسی پکڑتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور یا تو جمی جولاہے کے گھر کے دروازے پر دین کا گڑی اچھلی ہوئی تھی یا گوبردھن سنگھ کی کھیتی ان کے گھر کی جانب دلکی بھرتی چلی جا رہی تھی اور ان کے گھر جا کھڑی ہوئی۔

گوبردھن سنگھ کے بے آب و گیاہ زندگی کے میدان میں کبھی صنف نازک داخل نہ ہوئی تھی۔ بچپن کی ماں کی آغوش فراموش کر چکے تھے۔ جوانی بیوی کی خوشبو سے آشنا نہ ہوئی تھی، سال کے سال بس صبح کے ستارے کی طرح چمک کر سال بھر کے لیے غائب ہو جاتی اور ایک سرد سا گوبردھن سنگھ کی آنکھوں میں چھوڑ جاتی جس کے سہارے ان کے اندر جمائی اور اس کی جھلک ٹوٹ جیا دیوج تک باقی رہتی اور جیا دیوج کی تیاری میں انہیں سال کے بارھوں مہینے کا ہرون گذرتا، اور وہ پر مستقل سرد سا رہتا۔ آج کی زندگی میں گائے داخل

ہوئی تھی۔ اور گائے بھی زچہ جان۔ دوسرا اور پھر شیاما! ایک دانہ۔ بے داغ چکنا جوا سیاہ رنگ۔ دو نتھنے پر ایسی چمک جیسے گھی جمے ہوئے ہے۔ رحمۃ اللہ قدرتی پرورش اور نوجوانی کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ کھرے سے کر سینگ تک ہر چیز پر ایسی سی اچھلتی ہوئی۔ ایک ایک بار زندگی کے سوتے ابلتے ہوئے گائے تھی کہ بندرابن سے خاص کنہیا جی کے لکھے کی نکلی ہوئی دیوی۔ دودھ گھی کی نہروں کا خزانہ اپنے اندر چھپائے ہوئے اور بڑے بڑے پھوڑے رقبوں کی کاشت کے جانور کا گھر بنی ہوئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد یہ نشہ خمار بن گیا اور آج سے چالیس روز بعد بھیا دیوی کا دن ان کے سامنے کھڑا تھا اور جوں جوں دن گذرے شیاما انہیں شرابی سی نظر آنے لگی۔ ان کی ساری روایات سات پشت کی ساکھ ہڑپ کرتی معلوم ہوئی۔ اور اور گائے سے تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوا کرتی ہیں۔ اور آج شیاما تو ان کے لیے گرم دودھ بن گئی تھی۔ اور بھیا دیوی کا ایک ایک دن کم ہو رہا تھا۔ دور دور فراہمی زر کی شکلیں نظر نہ آتی تھیں۔ گوبردھن سنگھ کی رات کی نیندیں اڑیں، دن کا سکون گیا۔ لائیں تو کہاں سے لائیں اور لائیں بھی تو کس بوتے پر اور کس سے۔ اور اس طرح بیس روز گذر گئے، اور بیس دن ہی کی پرورش میں شیاما بگ پر آ گئی اور کھلی رہی۔ کسی خوش نصیب کے تھان پر شیاما اور گابھن ہوتی ہے کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا مگر گوبردھن سنگھ پھوٹے شیاما کے مالک نکلے ہی کھل رہے تھے۔ تقدیر دیکھئے جتنی ہوتا ہے اسے خالی کر کر کے خالی سے کھلا رہے تھے۔ زمیندار نے بے کار بچھیا خیال کر کے لگان میں لینی پسند نہ کی تھی۔ اور گوبردھن سنگھ کے تھان پر بیس دن میں ہی گابھن کھل گئی۔ گرم ——— کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک؟ ——— دودھ دے گی گھی دے گی پھر دے دے گی۔ مگر جب تک گوبردھن سنگھ کی پچیس سال کی بنی بنائی کرکری ہو چکی ہوگی۔ بھیا دیوی پر ان کی بہن آئے گی اور وہ خالی ہاتھ ہوں گے اور ان کا دم گھٹنے لگتا۔ رات گذر کر کنوار آ لگے گی۔ تو ہری ہری بکی دوب پھر چر کر شیاما جیسے ایک دم پہاڑ کی پہاڑ گائے بن گئی۔ بڑا پیٹ، بھرے ہوئے مٹکا سے تھن، اور بدن میں جیتی اور تن دیتی، چال میں نشہ سا اور کبھی کبھی گوبردھن سنگھ کا بھی گائے کو دیکھ کر سوچتے کیسا باپ بچا کیسی اچھی شیاما گئو اور گابھن، اصلی کی چھری سے کٹتے کٹتے بچی۔ مگر اتنے بڑے پیٹ کے احساس سے بھی وہ اپنے دل کو نہ سمجھا سکے۔ وہ تو بھیا دیوی کا تیور سانپ کی طرح لہراتا، بڑھ رہا تھا اور جس تیز شیاما دن دگنی رات چوگنی ہوتی اتنے ہی گوبردھن سنگھ گھٹتے اور گھلے اور ایک شام گوبردھن سنگھ جنگل سے ہانکر شیاما کو لا رہے تھے بستی کے قریب حلقہ کا ساہوکار گاؤں سے واپس جا رہا تھا۔ گوبردھن سنگھ کی گائے کو دیکھ کر ساہوکار نے اپنا رتھ روک لیا۔ سلاموں کے تبادلے کے بعد ساہوکار نے کہا: "ٹھاکر بڑی اچھی شیاما پالی ہے؟"

"ہاں ساہوجی پالی کیا ہے، سر پڑ گئی ہے۔ جتنی ہوتا ہے کہ لگان کے لیے پالی روپیا کی ضرورت تھی۔ سودا کا نے دیت تھے میرے پاس پانچ روپیہ کاؤ کی دھرو۔ (کسی کی بات) کے رکھے تھے میں نے اٹھائے کے دے دیئے۔ تو اب تو جیسے لا میں اٹک گئی ہے۔ ہوں پانچ روپیہ دے کے پچاس کا مال بھی تو کے مار لیا، ابھی اور بعد پھر شیاما کسی نقد بیوپاری کے ہاتھ لگتی ہے۔ گھر بھر دیئے کی گھڑا دھے کا بھی سے اوپر نکل گئی۔ بس اب لے دن چار مہینے بعد؟"

اور "چار مہینے" کا لفظ گوبردھن سنگھ کو چار لوک سنائی دیا، آہستہ سے بڑبڑائے "پھر ساہوجی چار مہینے کے لیے لیں گے۔ جس کی دھرو ہے وہ تو آج مانگتا ہے۔ میرے لیے تو اس کی کھرچاری مصیبت بن گئی۔"

ارے ٹھاکر کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ تو دودھ دھار گائے ہے۔ مثل میں کہی جاتی ہے پھر شیاما۔ اس کا دودھ امرت، اس کا گھی آبحیات بنا کے ہے شیاما کا گھی دودھ، بوتل میں دوں۔ کتنے چھپیں پھر صاف بات ہے جب کہ پورے بیاں کا گھی دودھ میں کھاؤں گا۔ اور بھاؤ آج

سلے کر دوں گا۔ بولو کتنے روپے؟"

"گر ساہو جی مشکل تو یہ ہے کہ گائے کس نے دیکھی؟"

"اسے ہم نے دیکھی اور یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور برسے کتنے۔ روپیا دوں؟"

اور اب انکار کرنا دودھ بھری تھالی میں لات مارنا تھا۔ سات روپے گوبردھن سنگھ کے حلق سے اٹکتی ہوئی آواز نکلی اور ساہوکار نے دس روپے جیب سے نکالے اور کہا: "یہ لو ٹھاکر، پھر تمہیں ہماری شرح معلوم ہے۔ اوسطی روپیہ ماہوار سود چلے گا۔ اور بھاؤ بازار پر سیر پو اور سیر اوزن پر چڑھے گا۔ اور گلو کا معاملہ ہے میں زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا۔ اس کو کھا پلنا بھی ہی پڑے گا۔"

مثل مشہور ہے بھوکے کا کیا بھاؤ، شرح سود اور گھی دودھ زخ کو گوبردھن سنگھ اچھی طرح سنا بھی نہیں، رہن میں بیٹھتے ہی بیٹھتے بہی کھاتہ کھول کر ساہوکار نے اندراج کیا۔ اور روپیہ انٹی میں لگا کر خوش خوش گوبردھن سنگھ گھر آئے۔ شیاما اپنی بوکت ساتھ لائی تھی۔ اور اس روز گوبردھن سنگھ چین کی نیند سو رہے۔

(۴)

اور بھیا دوج کا معمول (روز میں دن آ چکا) جب آسمان برسات بھر کا دھلا دھلا شفاف نکھرا ہوتا ہے۔ جب صبح شام خوشگوار خنکی ہوتی ہے اور دوپہر کو گلابی سنہری حرارت ہوتی ہے۔ جب شریف کی فصلیں کنوار کے سورج کی تیز کرنیں پکا چکتی ہیں اور سردی کا جمود ابھی طاری نہیں ہوا ہوتا۔ دیوالی کی تاریک ترین اماوس کی رات کے بعد پہلی دوج پر یہ پرخلوص تہوار منایا جاتا ہے اور جنکا بھیشٹ کی صبح میکے پہنچیں اور گھر میں گھستے ہی پہلی نگاہ میں مکان پر شیاما دیکھی۔ اور دیکھ کر ایسی باغ باغ ہوئیں کہ شوہر کے دروازہ پر بھی ناگن جھومتے دیکھ کر یہ خوشی نہ ہوئی تھی۔ حسب معمول رسم ادا ہوئی۔ بہن نے ٹیکا کیا۔ گیت گایا۔ پارتھنا کی اور پکوان پکایا بھائی کو پرسا اور خود کھایا۔ ان لیا اور سب وقت بار بار شیاما کا تیور خوش خوش ہو ہو کر کرتی رہیں۔

اور دوسری بھیا دوج پر جنکا پہنچیں تو خوشی کے مارے پھولی نہ سمائیں۔ ایک فربہ دھوبی پچھڑا اور شیاما کا دودھ سے بھرا ہوا مٹکا سا "دین" لگتا ہوا۔ شیاما تھی کہ نعمت کی پوٹ اور ابھی مرتبہ بھیا دوج سے زیادہ کھائے پیئے کا سامان ہوا۔ دان میں کچھ گوبردھن سنگھ نے بڑھایا چاہا مگر جنکا نہایت خوشی سے ٹال گئی اور مقررہ رقم آگے بڑھنے دی اور جنکا بھیا کے دروازہ پر ایک گائے ایک بچھڑا دیکھ کر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئی۔ بڑی ایک کے ساتھ گیت گایا اور سسرال پہنچ کر بڑی تفصیل اور خوشی کے ساتھ شیاما اور اس کے بچھڑے اور دودھ کا تذکرہ ساس اور شوہر سے کیا۔ "اب تو بھیا کے مکان پر شیاما بندھی ہے۔ بڑی دودھاری۔ گھر میں دودھ گھی کی ریل پیل ہے۔ خوب زور کی دعوت کھائی ہوگی؟"

"طبیعت ابھی ہے خوب دان پن کرتے ہیں پھر کیوں نہیں ملے گا۔" ساس بولی: "شیاما گائے بندھی ہے؟"

"اچھا شیاما ہے۔ بھیا کے مکان پر!" شوہر نے کہا۔ "شیاما کے کیا کہنے کسی تقدیر والے کو ملتی ہے۔ دودھ گھی مٹھا ہر چیز امرت کی بوند۔"

"اور پھر جھاگ دان ایسی کہ گھر بھر دے۔" ساس نے کہا۔

اور اگلی بھیا دوج پر جب جنکا پہنچیں تو دو بچھڑے دیکھے۔ "میرے بھیا کا گھر بھر جائے گا۔ بڑھا جانا پڑے گا۔ اب تو خوش ہو کر

کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ جگانے بھائی کے چہرہ پر اطمینان اور فراغت کی چمک دیکھی جسم پر کپڑے بھی قدرے بہتر تھے۔ بڑی مطمئن آئی اور بڑے شوق کے ساتھ سسرال پہنچ کر دیر تک تذکرہ کرتی رہی۔

اور شیاما کو گوردھن سنگھ کے مکان پر تیسرا سال تھا بھیا کی بیوہ کی بھلائی میں سال ہوتی ہے۔ کنوار کے دسہرے پر ساہوکار ہر تین سال پرانا حساب چکاتی کرتے ہیں اور اس دسہرہ پر حساب لازمی تھا۔ اور ساہوجی کے بھی کھاتہ میں تو دودھ کی بوند بوند گھی کا قطرہ قطرہ لکھا جاتا تھا۔ اور ہر قیمت ہر اشعارے کے بھاؤ پر سیر کے اوپر آدھ سیر اور بھی ساتھ درج تھی۔ اور ہر بھیا دیوج کے مزع کا پیسہ پیسہ مع شرح سود ماہ بماہ درج تھا۔ ویسے تو حساب کتاب بالکل صاف تھا مگر ساہوجی کو تفصیل کے ساتھ سمجھانا پڑا۔ تین سال بھر چکے تھے۔ صفائی لازمی تھی۔ پہلی بھیا دیوج پر صرف گائیں اور سرکاری کی کھات تھی۔ دوسری پر ایک بچھڑا بھی اسی دن میں آیا اور تیسری پر دوسرا بچھڑا بھی لوٹ پاٹ میں پٹ گیا۔ گاؤں کے پنچ بھی ہوتے بہتیرا تخمینہ بڑھایا۔ پھر سوں کی قیمت بڑھا چڑھا کر لگائی۔ مگر حساب بھی مزع کے میزان میں دونوں بچھڑے ساہوجی کی جانب گئے اور آدھی گائے۔ اور آئندہ اس شرط پر گائے گوردھن سنگھ کے حوالہ کی گئی کہ بعد ایک چہارم گھی دودھ ان کا اور بچھڑے آدھے آدھے، اور نصف گائے ملکیت میں لو، اور پچھلے سے دام دام چکاتی ہو کر گوردھن سنگھ گائے لے کر پٹ آئے اور تیسرے سال تو عام طور پر گائیں سال مردہ جاتی ہیں اور ایک سال پھل نہیں دیا کرتیں۔ اور اس مرتبہ شیاما خالی معلوم ہو رہی تھی اور دسہرے کے بعد دیوالی اور دیوالی کے بعد بھیا دیوج کا تہوار ہوتا ہے۔ مگر گوردھن سنگھ مطمئن تھے۔ کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ ساہوجی سے لے کر حسب معمول بھیا دیوج کا مزع پورا کر دیں گے۔ اور جب دیوالی سے پیشتر وہ ساہوجی کے پاس گئے تو ساہوجی نے صاف انکار کر دیا۔ پہلے تو آدھی گائے اور وہ بھی سوکھی کا بیٹا پر وہ اپنی رقم چھنا چاہتے۔

اور خلاف امید انکار گوردھن سنگھ کو توپ کے گولے کی طرح لگا۔ کتنی ہوتی جنگ کی طرح وہ اٹھا، چلا گیا۔ اور بھیا دیوج کے تو آج سے ساتھ ہی دن باقی تھے۔ اگر سات دن میں وہ سات جنم لے کر سات مرتبہ کہتا تو بھی سات روپیہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر پھر ساہوکار کے پاس پہنچا۔ اور کہا: ساہوجی تو پھر آدھی گائے آپ کی رہی اور آدھی میری۔ اس کی قیمت تخمینہ کر لے لیں اور آدھی بھی میری ہاتھ دھرو اور گائے تم لے لو۔

"واہ مٹھا کر جی واہ! یعنی کیا ہم سوکھی گائیں پالتے پھرتے ہیں، تم پالو۔ اس کے بچے بڑھاؤ۔ گھی دودھ کرو۔"

"مگر میرا کام بغیر سات آٹھ روپیہ کے نہیں بن سکتا۔ آج کے دن بھیا دیوج ہے، اور جنگا آتی ہوں گی؟"

"لیکن مٹھا کر وہ کچھ ہو۔ بھیا دیوج یا دیوالی سوکھی گائے اور آدھی، اور آدھی، روپیہ بھینے کے سوا اور بڑے بھاؤ پر سات روپیہ کیسے پٹ جائیں گے۔ بلکہ چادر ہوئے اتنے پاؤں پھیلائے آدمی۔"

"تو پھر مجھے تو اپنے حصہ کی گائے رکھنا نہیں ہے اب؟"

"نہیں پالنا ہے تو بیچ دو جہاں کے اور ہمارے آدھے دام ہمارے ہاتھ دھرو۔"

"مگر آج کل اسے لے گا کون۔ پہلے تو گا بھی نہیں ہے اور گا بھی بھی تو دودھ پیائے گی پھر سات مہینے بعد؟"

"کوئی نہ لے گا تو پالو۔ روزگار کرو۔ چار پیسہ ہمیں بھی کمائے کے دیو گے آپ بھی مشابہ نہ کھا پڑو گے۔"

"تو پھر اس بھیا دیوج کا تو مزع پورا کر دیو۔"

"گنجائش نہیں ہے ٹھاکر! اور تمہارا بس نہ چلے تو ختم کر دو بیچ ڈالو، مگر ہم دیں گے نہیں!"

"تو کوئی گاؤں والا کسان تو ایسے میں لے گا نہیں اضافی کا سے گا" گوبردھن سنگھ نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"کچھ ہو تم جانو، ہم کب کہتے ہیں کہ تم خالی گھاٹے ہی، نہیں تو بیچنے ہو؟"

اور گوبردھن سنگھ تاؤ میں بھرے چلے آئے۔

(۵)

بھیا دیوج کے مقدمے اور پرسوں تہوار میں دو دن باقی تھے اور گوبردھن سنگھ کی جیب خالی تھی۔ اس کا دل سینے میں دھک دھک کر رہا تھا، اور اس کا دم گھٹنے لگتا، اور جب اس کی بہن دو دن بعد آنے کی تو خالی ہاتھ جائے گی۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اور پھر اس کے پاس تو اس کے ایک وقت کے کھانے کے قابل بھی نہ تھی اور آگ بھی نہیں اور بھیا دیوج کی مٹھائی کی ٹوکری کے لیے وہ برگز منہ نہ کھولے گا۔ اس کے سینے میں کبوتر سے پھڑپھڑا اٹھے۔

عمر بھر کا ٹھکانا ہوا تھا کہ اپنے جھونپڑے کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سر پر رکھے، جیسے پوری ایک سلطنت کا مالک، جس کا بہت خیل ہو رہا ہو۔ اور اس کے جوانا مارے کی صدیوں کی بنی ہوئی ساکھ اور عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تمام ماحول کو پہنا۔ برسات کے مرنے لگے جھونپڑے کا مجبور پیڑ اس کے اندر ایک چارپائی پر کچھ چیتھڑے گڑے پڑے ایک جانب کچھ اوندھے پڑے مٹی بیچنے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اور اندر کنکار کی لکڑی کا دروازہ۔ ہجوم بھاری پٹار خالی۔ باہر سے ایسی بھنی چیزی جیسے نہ معلوم اس میں کتنی جنس بھری ہے اور کھلے کھلے جذبات سے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ اور سامنے ٹیا مالکری دم مار رہی تھی۔ اور گوبردھن سنگھ سو گیا۔ اور ماہوت جاگ اٹھا۔ اور بھلی کی لہر سی اس کے دماغ سے چل کر رگ رگ جھنجھناتی ہلی چلی گئی۔ اور جیسے وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے اور کرشنے کان کے تیر کی طرح مہاجن کا منہ چڑاتے بھی جو وہ بے کے گھر میں بیٹھے۔ بھی جو لاہے الاؤ کے پاس تنہا بیٹھے ہوئے تھے جاتے ہی گوبردھن سنگھ بے دھڑک بولے "چاچا ہماری گائے بیچ دو؟"

اس بیٹا تمہاری گائے! وہ تو آج کی تھنٹھ ہے کون لیتے گو؟

"جو کوئی لیتے" انہوں نے قدرے آزادی سے کہا۔

"نا بیٹا، کون پوچھے، کوئی کسان تو لیتے گا نہیں؟"

"پھر جو کوئی لیتے"

اور بھی جو لاہے نے غائر نگاہ سے ان کا چہرہ دیکھا اور مضبوط ارادے والے ماہوت کے انداز میں بات کر رہے تھے اور پھر بولے "تم ساہوجی کو کیوں نہ لگائے دو۔ آدھے دام تم لے لیو؟"

ساہوجی تا ہیں لیت کہتے ہیں پاؤ اور نہیں تو جہاں چاہے بیچ ڈالو ہماری اوجھا ہیں دے دو۔"

"ہوں تم پاؤ" بھی جو لاہے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جو دار چھتار ہے۔ اب کے تیسرے سال دو پھر شے اور پوری گائے انہیں ہضم ہو جائے۔ اور نہیں برس بھی دو دو نفع میں کھائیں ——— سالا مہاجن ہے مہاجن!" اور بھی جو لاہے کو تنہا کے ساتھ لگاؤ تھا۔ پھر شے زمانے دانت کٹکٹا کر کہا "کسائی ہے رقصائی کسائی، دیکھو تو۔ بے ایمان گو کشائے دیت ہے شودر کے دل میں؟"

"اور پرسوں بھیا دیوج ہے تم جانت ہو؟"

"میں سمجھ گیا بیٹا۔ پھر تم اچھی طرح سمجھ بوجھ لیو۔"

اور مجبور تھا کہ بچہ کی گردن ندامت شرم اور روایات کے بار سے جھک گئی۔ اس کے شیرے جسم پر دوباہ کا پرشین آگیا۔

شام کو قصبہ سے جی جو لا ہے بقر قصاب کو جا دے۔ بقر قصاب نے اوپر سے نیچے تک بالوں میں ہاتھ پھیر کر شیاما کو پڑتالا، پھر سر اٹھا کر دیکھا۔ آگے سے بغور معائنہ کیا۔ پیچھے جھک جھک کر دیکھا۔ پھر آہستہ سے دم کھینچی اور چھوڑ دیا۔ "دو من مال ہے۔ دو من مال ہے۔ دیجئی اسیت ——— بس دو من!"

اور خاکر کے کان میں جس کے تیس سال کے گھی دودھ کی آواز کا وزن ساہوجی کے بہی کھاتے سے حساب ہو گیا تھا۔ آج اسی کے گوشت کا تخمینہ کیا جا رہا تھا۔ جی ہوا ہے نے سودا چکایا اور چودہ روپیہ پیزان لگی۔ شیاما کی رسی بقر قصاب نے پکڑی اور چودہ روپیہ گوبر دھن سنگھ کو پکڑا دئے۔ گوبر دھن سنگھ نے روپیہ ہاتھ میں لیے جیسے کھونے کا ٹاٹ لیا۔ بغیر گنے ہی جو تو ہے کی جانب بڑھائے اور رکتی ہوئی آواز میں بولے "چاچا تم سات روپیا اس مہاجن کو دے آؤ اور سات اپنے پاس دھر لیو کل دوپہر جلکا آئیں تو پہنچا دیجیو۔"

"تو پھر تمہیں دھر لیو نا، جی نے کہا ——— اور گوبر دھن سنگھ کو ایسا سانپ چڑا جیسے کہہ رہے ہیں "ایک من گوشت تم لے بیچا ہے اس کے سات روپیہ بھی تم اپنے پاس رکھو؟"

"نا بیٹا چاچا تمہیں دھر لیو اپنے پاس اور سات اسے دے آؤ مہاجن کو" گوبر دھن سنگھ نے جلتے ہوئے کہا اور جیسے ایک من گوشت کا بوجھ سر پر دھرے گھر کی جانب چلتے۔ انہیں خوب یاد تھا۔ کہ بچپن میں کہانیوں میں [illegible] سے جب دوسری مرتبہ [illegible] حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گایوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا تھا۔ اور بڑھتے چلے آئے تھے اور ان کے آگے ہونے کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹتے رہے تھے اور محمد غوری کی فوج بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گایوں کی دھان کی آڑ میں دلی فتح کر لی تھی اور چوہان گایوں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے تھے اور بغیر لڑے دلی فتح ہو گئی تھی۔

اور اس کی خوار گائے کی حفاظت کے لیے بنی ہے۔ اور آج اپنے ہاتھوں وہ گائے کو چھری تلے دے کر آ رہا ہے۔ وہ اپنے سنسان گھر میں پہنچا۔ شیاما کے تھان پر گوبر بکھرا پڑا تھا۔ اور سانی کی ناند میں چارے کے پس خوردہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور اس نے ایک گہری سانس لی اور زمین پر گٹھڑی بن بیٹھ گیا.....

اور بھیا دیوج کے دن حسب معمول جلکا اسٹیشن پر آئی، اور کارندہ ہر سال دادا مقررہ سامان خریدنے شہر چلا گیا۔ گاڑی شام کو جایا کرتی تھی۔ اور جلکا ہمیشہ اسٹیشن پر کارندہ کو منتظر ملتی تھی۔ مگر آج واپس نہ پہنچی تو جو بھری کہاروں موجود تھے۔ ان کے حوالے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکرا کیا اور کہہ دیا کہ گھر کہہ دینا کہ بھوجی اور مٹھی جی کو بھیا نے منتظر لیا ہے اور وہ کل آئیں گے۔

صبح ہی جلکا بھائی کے دروازہ کے قریب پہنچی تو کچھ عجیب اور کچھ آوازیں سن کر ماتھا ٹھنکا جب آگے بڑھی تو جیسے سناٹی ہائیں۔

"اچھے خاصے تھے کل دن مندے؟"

"ارے ہمارے پاس بیٹھے چلم پیت رہے"

اور کل دن مندے سات روپیہ بھیا دیوج کے بیرے پاس دھر دو رات دھرے۔

اور اتنے میں شور ہوا کہ آئے گئیں۔ آئے گئیں، جگا آئے گئیں۔ اور جگا چیرتی پھاڑتی اندر پہنچی تو گوردھن سنگھ کے جنازہ پر جا کھڑی ہوئی۔ نظری طور پر سہن کی چیخ نکل گئی۔ تمام جسم پیٹ کر پھینک دیا۔ سبب موت پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اور انجون کی کاشت تو تمام گاؤں میں عام تھی۔ اور سال دو سال پیچھے ایک دو تھے ایسے ہو ہی جاتے تھے مگر سبب کا پتہ نہ تھا۔ جب جگا دونے پیٹنے سے ذرا ہوش میں آئی اور اس نے وہ مخصوص گیت ہیں کے بھر میں گایا جو بھیا دیوی پر گایا کرتی تھی۔ اور جی جو ہے نے گوردھن سنگھ کی امانت اتنی سے نکال کر دے دی لہرا لہرا کے گوردھن کے جنازہ پر کھڑے ہو کر ٹیکا کیا اور پھر مٹھائی کی ڈلی بند ہونٹوں کی جانب بڑھا کر بین کیے مگر گوردھن سنگھ تو آج کی بھیا دیوی کے دان کا راز اپنے بند ہونٹوں میں چھپائے اس قدر خاموش تھے کہ ہونٹ بھی نہ کھولے۔

اور جب لاوارثی جنازہ گھٹی بنا کر اور کفن پہنا کر جگا نے گاؤں کے بچوں کے حوالے کیا تو دروازہ پر شیاما کو بیٹھا کھڑا تھا جو آہستہ آہستہ جی جو لا ہے سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے پاس نہیں کی۔ گانے کا بین کی۔ سانے کو دو روپیہ دیتا رہا نہیں مانا۔ آج کی دوا بھی ماری گئی ——— اور جگا شیاما کو پہچان کر قریب آ گئی۔ اور سب حال معلوم کر کے بھیا دیوی کے دان والے سات روپیہ اور ساہوکار والے سات روپیہ علیحدہ علیحدہ نکال کر حوالے کیے اور کاغذ سے آہستہ سے ایک جانب لے جا کر کہا۔

مٹی جی اب کی مرتبہ بھیا دیوی کے دان میں بھیا نے شیاما گئے دان کی ہے سمجھ گئے۔

پرواز کے زخم

کشمیری لال ذاکر

میں ابھی ابھی اس کے گھر سے لوٹ کر آیا ہوں اور اپنے کمرے میں بیٹھا سگرٹ پی رہا ہوں۔ پردوں کے کاریں کمرے کا ماحول کچھ ملگجی سا ہے اور اس میں سگرٹ کے دھوئیں کی مخنی سی لکیریں عجیب جنگلی بیل سے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ سامنے تپائی پر رکھی ایش ٹرے میں ایک آدھ جلا سگرٹ ابھی تک سلگ رہا ہے۔ میں سگرٹ کو مسل کر اس کی ہستی نہیں مٹاتا، اسے زندہ رہنے دیتا ہوں اور اس کے آخری حصے پر میرے ہونٹوں کے نشان سوئے رہتے ہیں اور اس میں سے ہلکا سا لرزتا ہوا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ میں اسے سلگنے دیتا ہوں جب تک وہ خود نہیں بجھ جاتا۔

مجھے ایک دم بجھ جانے سے سلگ سلگ کر تڑپ تڑپ کر دھک دھک کر دھیرے سے بجھنا پسند ہے۔ اس طرح ارتقاء کی سب منزلیں طے ہوتی ہیں۔ درمیانی منزلیں طے کیے بغیر آخری منزل پر پہنچ جانا تو ایسے ہے جیسے کوئی پرندہ پہاڑ کی چوٹی سے اڑ کر ایک دم آسمان کی بلندی کو چھو لینا چاہے اور اگر اس کے پنکھ ٹوٹ جائیں تو اسے زمین کی پستیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسا ہی کچھ تاثر میرے ذہن میں ابھرا ہے آج نیناں کو دیکھ کر۔

نیناں کو میں ۱۹۴۷ء سے جانتا ہوں جب بٹوارے کے بعد میں اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اب بی۔ اے کر چکی ہے۔

ان دنوں وہ سبز سبز پتیوں میں چھپی ہوئی کلی تھی اب پودے کے تنے اوپر کھلا ہوا پھول ہے۔

غالباً نومبر کا مہینہ تھا۔ ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ شروع تھے۔ میں دن بھر کرکٹ کھیل کر اور آخر میں پٹ کر گھر لوٹا تھا۔ ہار کا تلخ احساس ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا اور جسم میں تھکن کے کارن درد ہونے لگا تھا۔ میں گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر کے دن بھر کے کھیل کے متعلق سوچنے لگا۔

"بھائی جان کھیل آئے میچ؟" شاردا مجھے بھائی جان ہی کہہ کر پکارتی ہے۔ بھیا نہیں کہتی، اسے یہ انداز پسند ہے۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ شاردا میرے سرہانے بیٹھ گئی۔

"ہار گئے؟" اس نے مجھ سے اس انداز سے پوچھا جیسے اسے پہلے ہی یقین ہو کہ میں ہار جاؤں گا۔ آخر وہ میری بہن ہے۔ وہ جانتی ہے اس کا بھائی کسی بھی کھیل میں کبھی نہیں جیتا۔

"ہاں!"

"تو شرط قائم ہے۔" شاردا نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی پتلی پتلی انگلیوں کی مہربان ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا دی۔ میں جب ہارتا ہوں وہ مسکراتی ہے اور اس کی اس معصوم اور بے لوث مسکراہٹ سے شکست کی چبھن ایکدم مٹ جاتی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چائے تیار رکھی ہے میرے کمرے میں۔ وہیں چلئے۔ میری ایک سہیلی بھی ہے، اس سے ملئے۔" شاردا نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔"

"کونسا میری بیوی میں جا رہے ہیں آپ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ "کسی وقت تو حد کر دیتے ہیں آپ۔ یوں چاہے دن بھر آئینہ بھی نہ دیکھیں لیکن ——"

"چلو بھئی۔" میں نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گی۔

کمرے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر قدم رکھا اور اس کے پیچھے میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں چونکی جیسے کوئی ہرنی اپنے قریب آہٹ پا کر ڈر جائے۔

"نیناں۔"

"بھائی جان۔"

نیناں نے لمحہ بھر کے لیے پلکیں اوپر اٹھائیں جیسے جھیل کے گہرے نرمل پانی پر بھور کا ہلکا سا نیم اندھیرا، اپنی بھرپور جاذبیت سے چھا گیا ہو اور پھر فوراً ہی اس نے پلکیں جھکا لیں جیسے کوئی صبح کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہو اور جھیل کا پانی ساکن ہو گیا ہو اور اس کی سطح پر رات کے سائے لہرانے لگے ہوں۔

کمرے میں دو کرسیاں تھیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ شاردا کا پلنگ تھا جس پر سفید سلک کی چادر بچھی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی میں نے کرسی لے لی۔ میں اور نیناں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تپائی تھی۔

"نیناں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہے بھائی جان۔" شاردا پیالیوں میں چائے کا پانی ڈال رہی تھی۔

"تو آپ ہماری برادری کی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی!" نیناں کی پلکوں میں خفیف سی لرزش ہوئی وہ ذرا سا اوپر اٹھیں جیسے جھیل کے پانی پر دونوں وقت گھل مل رہے ہوں۔ صبح شام کے بازوؤں میں پھیل کر مسکرا رہی ہو۔

"عجب بھی اس وادی میں کوئی قدم رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"یہ بے چاری قدم کہاں رکھ رہی ہے۔" شاردا نے میری بات ٹوک دی۔

"راستے پر چل پڑنا ہی قافلے میں شامل ہو جانا ہے پگلی۔ کسی نہ کسی موڑ پر تو دوسرے مسافر مل ہی جاتے ہیں۔ جیسے آج میں مل گیا ہوں۔"

میری بات سن کر نیناں کی آنکھیں ایک بار پوری طرح کھل گئیں جیسے ساگوان کے گھنے جنگلوں میں سوئی شبنم کے سینے پر کھلی دو دیپ جلنے لگی ہو اور اپنی نرم نرم کرنوں سے اسے گدگدانے لگی ہو اور ساری نوخیزیدگی، سارا کسل، ساری نیند بھوٹنے لگی ہو اور پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ تمام جنگل پر اندھیرا چھانے لگا اور دھوپ مٹنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھنا اندھیرا بھر گیا۔ نیناں کی آنکھوں میں بے پناہ غم جھلک اٹھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چائے کی پیالیوں پر گاڑ دیں۔ شاردا پیالیوں میں دودھ ڈال رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی گفتگو چل رہی تھی۔

"بھائی جان آپ یہ پیالی لے لیں۔" اس نے نیناں کے آگے پڑی ہوئی پیالی میری طرف سرکا دی اور میری پیالی اس کے آگے کر دی۔

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نیناں کو بالائی پسند نہیں۔ یہ تو چائے میں دودھ چھان کر ڈالتی ہے۔" اس کی پیالی میں بالائی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

"اچھا!"

"ہاں!" گھر میں اس کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔" شاردا نے کہا۔

"بڑا آرسٹوکریٹک نظریہ ہے۔" میں نے اپنی پیالی میں چمچہ گھمانا شروع کر دیا۔ شاردا نیناں کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔

"چائے میں شکر بھی خود نہیں گھولتی کم بخت، ہر کام اسے کیا کرایا چاہئے۔" شاردا نے پیار سے اس کے گال کو چھو لیا اور نیناں ایک دم جیسے جاگ گئی ہو۔

"سو رہی تھیں آپ؟" میں ہنسا۔

"جی نہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے موتی دانت چمک اٹھے۔ پر اس مسکراہٹ میں ایک کسک سی تھی، جیسے درد کی ایک ہلکی سی لہر اس کی نسوں میں پھیل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر زردی سی ابھر آئی تھی اور آنکھوں کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا جیسے وہ کسی وادی میں کھڑی کوئی پہاڑ کی چوٹی ہو جس کی ایک طرف تو سورج کے ڈھلنے سے چمک اٹھے، دوسری طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔

کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے اپنی نارمل حالت پر آ گیا۔

"کون سے مضمون لے رکھے ہیں آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"سائنس اور فل میتھیمیٹکس۔"

"بڑا مشکل کمبینیشن ہے، ڈاکٹری کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"خیال تو ہے!"

"آپ بھی تو ڈاکٹر ہی بننا چاہتے تھے نا بھائی جان؟"

"ہاں!"

"اور بن گئے افسانہ نگار، شاید سبھی لکھنے والے پہلے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔" شاردا بڑے خلوص سے مجھ پر چوٹ کر رہی تھی۔

صبر سے خیال میں ڈاکٹر ایک بہترین ادیب بن سکتا ہے۔ انسانی جسم اور ذہن کی ایک ساتھ واقفیت تو انسان کو زندگی کا مکمل نباض بنا دیتی ہے۔ ادیب بھی ایک طرح کا ڈاکٹر ہے جو تھکے ہوئے بیمار ذہنوں کو تازگی اور صحت دیتا ہے، شکستہ اور ناامید لوگوں تک کو زندہ رہنے کا

پیغام پہنچاتا ہے؟

نیناں نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ کی شکل واضح اور مکمل نہ تھی اور وہ اس لیے خاموش تھی اور بولتی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی نراہٹ چھا گئی۔ ایک لطیف سی آسودگی۔

"تم ڈاکٹر ہو گی یا لیکھک؟" شاردا نے اس سے پوچھا۔

"جو زندگی بنا دے گی۔" یہ شاید پہلا مکمل جواب تھا جو نیناں نے دیا تھا۔

اتنی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے بند صندوق کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس ادھ کھلی کلی کی پنکھڑیوں کے اردگرد بھی شاید کانٹوں کا گھیرا ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ پھول کھل کر بھی شاخ پر ہی سوکھ جاتے ہیں۔

اس کے ذہن کی پیچیدہ ملی جلی سی کیفیت تھی جیسے دھوپ اور چھاؤں اپرواز اور شکستگی، تصویر کا اسکیچ ہو مگر مکمل تصویر نہ ہو۔

اور تصویر مکمل ہونے میں خاصا وقت لگا۔ بہت دنوں تک تو میرے سامنے وہ اسکیچ ہی چڑھا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

نیناں کے پتا یہاں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں اکثر قتل کے مقدمے ہی لیتے ہیں۔ سول کیسز سے انھیں کم دلچسپی ہے۔ قتل کا مقدمہ ہارجانا سول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے، کچھ اس طرح کا خیال ہے انھیں وکالت کے بارے میں۔ کوئی دو ہزار کے قریب ان کی پریکٹس ہے۔ یہ ضلع کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سا وقت لڑائی جھگڑوں میں ہی بتاتے ہیں۔ پانچ ہزار موجودہ موجودات میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے خاص بھگت ہیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر اجمیر جانے والی سڑک کے کنارے ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ جگہ انھوں نے کسی مقدمے میں ہی حاصل کی ہے، ورنہ اتنے وسیع احاطے میں تو بک محل بن سکتا ہے لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی ہے اور جو رات اور مزدور اس پر کام کرتے رہے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ ورنہ جنھوں نے پوری محنت سے کر کام کرنا ہو وہ اس بے دردی سے نہیں کرتے پہلی بار جب صبح کو سیر جاتے ہوئے میں ان کی کوٹھی کے قریب سے گذرا تو وکیل صاحب کا بورڈ پڑھ کر رک گیا۔ تو یہ تھا نیناں کا گھر جو چھاتہ صاحب اصل لگ رہا تھا۔ مختصر کوٹھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی سی گھڑسال میں سائیسوں کے کچھ کوارٹر ہوں اور کوٹھی کے آگے کھلا احاطہ جیسے گھڑسال کو سدھانے کے کام آتا ہو۔ کچھ آدمی پتلی پتلی سی رضائیاں اوڑھے پھاٹک سے باہر نکل رہے تھے۔ شاید یہ وہی میو لوگ تھے جن کے سامنے وکیل صاحب کی پریکٹس چل رہی تھی۔ وہ صبح صبح رفع حاجت کے لیے باہر جا رہے تھے۔ رات انھوں نے یہیں گذاری تھی۔ شاید آج ان کی عدالت میں پیشی ہو۔ میں آگے قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ کوٹھی سے ایک صاحب باہر نکلے۔ خوب بڑھی ہوئی توند، سر بالکل منڈا ہوا اور گھٹنوں کے ذرا نیچے تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ میرا ذہن یہ گوارا نہ کر سکا کہ میں انھیں وکیل صاحب کہوں۔ وہ تھے وکیل صاحب ہی جن سے میرا اس دن تعارف ہوا جب میں اور شاردا نیناں کے ہاں چائے پر گئے تھے۔

"تمہاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شاردا؟" میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نیناں کے پتا پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں۔" شاردا نے جواب دیا۔

"اتنا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک ریفیوجی کیمپ کھل سکتا ہے!"

"آپ ہمیشہ اُلٹی باتیں ہی سوچیں گے۔"

"اگر ذاتی جائداد کو اس بُری طرح ہی استعمال میں لانا ہو تو اسے قومی ملکیت قرار دے دینا چاہیئے!" میں نے ہاتھ پر رومال رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بندھی ہوئی گوبر میں لت پت بھینسوں نے اچھا خاصہ گھمسان مچا رکھا تھا۔

اس وقت نیناں اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے احاطے میں دھول کے بادل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نمستے بھائی صاحب!" اور پھر اس نے شاردا کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دھول میرے سوٹ پر جم رہی تھی۔ کم بخت کو آج ہی ڈرائی کلین کرا کے پہنا تھا۔

نیناں ہمیں ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں سے گذارتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ ہال کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم ہے اور اس میں شام کا سائرن اجالا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک دری بھی تھی اور دیواریں بہت اونچی اور خالی تھیں ان پر کہیں کوئی پرانا کیلنڈر بھی نہ تھا۔ جس چھوٹے سے کمرے میں ہم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔

"یہ نیناں کا کمرہ ہے بھائی جان!" شاردا نے مجھے مخاطب کیا۔

"کمرہ نہیں یہ میری پناہ گاہ ہے۔" نیناں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ روز پہلے جو ہرنی میری آہٹ پا کر چونکی تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں کوئی گہرا گھاؤ تھا۔

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نخلستان ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور میرا گھر ایک صحرا۔ جب بگولوں کا طوفان اٹھتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے یہی سہارا میرے کام آتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار کے سہارے اس کا پلنگ تھا اور اس کے ساتھ ہی تپائی تھی جس پر ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کتابوں کی بڑی سی الماری رکھی تھی جس کے باہر چھوٹا سا قفل لگا تھا۔ شمالی دیوار کے ساتھ ایک آرام کرسی تھی جہاں بیٹھ کر الماری کی ایک ایک کتاب پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو پچھلے کھلے احاطے کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی پر ہلکے آسمانی رنگ کا پردہ تھا جو شاید اٹھایا کم ہی جاتا تھا۔ جنوبی دیوار میں کمرے کا دروازہ تھا جس میں پردے کی جگہ چق پڑی تھی۔ فرش پر ایک نفیس کارپٹ تھا اور ایک کونے میں پیتل کے گملے میں نرگس کے پھول تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کتابوں کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شاردا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاردا میری عادتوں سے واقف ہے، بیکار میں نہیں ٹوکا کرتی۔ اس وقت ٹوکتی ہے جب اس کے خیال میں میں حد سے گزر جاؤں۔ الماری کے ایک خانے میں کتابوں کی قطار کے اوپر فریم میں لگی نیناں کی تصویر رکھی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کتابیں دیکھی جا رہی ہیں یا تصویر؟" شاردا بولی۔

"کتابیں بھی اچھی ہیں اور تصویر بھی۔" میں نے جواب دیا اور کتابوں کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

ہندی ساہتیہ کی نمائندہ کتابیں موجود تھیں۔ انگلش اور فرنچ لٹریچر کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں تھیں اور اردو ادب، نظم اور نثر دونوں کی تخلیقات موجود تھیں۔ کتابوں کو دیکھ چکنے کے بعد پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا ماحول تناخشک اور غیر ادبی ہو ذہنی طور پر اتنی اچھی طرح کیسے نکھر سکتی ہے۔ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی الجھن میں پھنس گیا اتنے میں نیناں کمرے میں داخل ہو گئی۔

"چائے آرہی ہے، اسے آپ میری کتابیں دیکھ رہے ہیں!"

"ہاں بغیر تمہاری اجازت کے" میں نے جواب دیا۔

"جن لوگوں میں میرا جیون گزر رہا ہے وہ اجازت لینے کے قائل نہیں۔ وہ تو میرے خط تک اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ یہ رویہ غلط ہے۔"

اس کی آنکھوں میں پھر ایک دم ایک درد سا لہرا گیا۔ کتنی بیزار تھی اپنے ماحول سے وہ۔ اس نے الماری کی چابی مجھے دی اور میں الماری کھول کر کتابیں دیکھنے لگا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا:

"نعیماں یہ سب کتابیں تم نے خریدی ہیں؟"

"جی نہیں۔ بہت سی کتابیں میرے بھائی صاحب بھیجتے رہتے ہیں۔"

"کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں۔" شاردا نے پوچھا۔

"کئی برسوں سے الہ آباد میں وکالت کر رہے ہیں بہت دنوں وہ اس ماحول میں گھٹتے رہے اور آخر اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہیں رہتے ہیں کہیں سال ڈیڑھ سال میں وہ ایک دن کے لیے یہاں آتے ہیں۔"

"کبھی آئیں تو مجھے ملانا۔" شاردا نے کہا۔

"ہو سکے تو مجھے بھی۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو جلن ہوتی ہے شاردا کو دیکھ کر جسے آپ جیسا بھائی ملا ہے اور جو زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گزار سکتی ہے۔"

"شاردا تو مجھے ہر وقت کوستی ہے۔"

"بہنیں کوسا نہیں کرتیں دعائیں دیا کرتی ہیں بھائی صاحب! اور جب ان کے پاس دعائیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ آنسو بھینٹ بھی کر دیتی ہیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی نمی ابھر آئی تھی۔ یہ نمی گواہ تھی اس محبت اور عقیدت کی جو اسے اپنے بھائی سے تھی۔

اس کا بھائی بھی اس دھول بھرے احاطے میں گھسٹتا رہا اور جب ان بگولوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہار گیا تو بھاگ گیا۔ اس نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ پیا اور پھر کہنے لگی:

"میرا کمرہ بھی انہی کا ہے۔ جاتے ہوئے مجھے ٹرے گئے تھے جب یہاں آتے ہیں تو اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ رات دن ہم دونوں یہاں اسی کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دنیا بھی ہے۔ دنیا سے اس طرح کٹ جانے میں کتنا آنند ہے؟"

شاردا کے ہونٹوں سے ایک طویل آہ نکل گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے دھند بھری گھاٹیوں میں سورج کا پہلا اجالا چمکنے لگے۔

شاردا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کھلے اور پُراسرار انداز میں اس نے کبھی باتیں نہ کی تھیں۔

"ٹھہریئے میں آپ کو بھائی صاحب کی تصویر دکھاتی ہوں۔"

وہ کرسی سے اٹھی اور الماری میں کتابوں کے اوپر رکھی اپنی تصویر کو اٹھا لائی۔ اس کے فریم کو کھول کر اس نے اپنی تصویر کے نیچے سے ایک تصویر نکالی۔

"دیکھئے یہ ہے ان کی تصویر۔" اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک خوبصورت نوجوان تکیے کے نقوش کھلا تھا اور گہری آنکھیں۔ ایسی ہی آنکھیں نیناں کی تھیں۔ آنکھوں کی یہ گہرائی ہی ان دونوں میں مشترک تھی۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر وہ دونوں کھڑے تھے۔ نیناں اور اس کا بھائی۔ میں نے تصویر شاردا کی طرف بڑھائی اور پھر نیناں کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیاں کتنی پُراسرار تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے نیناں نے اپنی تصویر کے پیچھے اپنے بھائی کی تصویر رکھ کر غیر ارادی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے بھائی کی شخصیت ہی اس کی ڈھارس کا باعث ہے۔

اتنے میں چق اٹھا کر کوئی داخل ہوا۔

"نمستے پتا جی!" شاردا کرسی سے اٹھی۔ وہ انہیں جانتی تھی۔

"نمستے!" مجھے بھی کرسی سے اٹھنا پڑا۔

نیناں شاید اس اچانک ملنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ اٹھنے لگی تو چائے کی پیالی تپائی سے فرش پر گر گئی۔

"تم بھی اتنی ہی بے احتیاط ہو بیٹی!" انھوں نے شاردا کو مخاطب کیا اور پھر مجھے کچھ کہے سنے بغیر چق اٹھا کر باہر نکل گئے۔

"نیناں ذرا بات سنو!" ان کی آواز آئی اور نیناں خاموشی سے باہر نکل گئی۔

کچھ لمحوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد کی اتنی گہری دھند بھر گئی تھی کہ وہ اچھی طرح کھل بھی نہ رہی تھیں۔

کچھ لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ اس کے بھائی نے اپنی تمام محبت اور اخلاص کے ساتھ نیناں پر بے حد ظلم کیا تھا۔ اس نے اپنے ماحول سے انتقام لینے کے لیے اپنی بہن کو چنا تھا۔

اس نے اس کے گرد تخیل، تصور اور ادب کا طلسمی جال بن دیا تھا اور وہ محو ہو کر اونگھ رہی تھی۔ اب وہ ناول کے کرداروں کی طرح جیتی تھی۔ نظموں کی تشبیہوں کی طرح حرکت کرتی تھی اور کہانیوں کے ہیرو کی طرح اپنے جیون کے خاکے بناتی تھی۔ عملی طور پر وہ اپاہج بنتی جا رہی تھی۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے کے پُراسرار ماحول میں رہ کر بھول جاتی تھی کہ اس کے باہر ایک اُجاڑ اور سنسان دنیا ہے۔ اس کے گھر کا ماحول نہایت کھردرا اور اکھڑ ہے۔ وہ کونے میں اُگے نرگس کے پھولوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی کہ اس کے جیون کے گرد تیز کانٹوں کی ایک اونچی باڑ ہے اور اس نے جب بھی اڑنے کی کوشش کی وہ نکیلے کانٹے اُگے ہوئے بھالوں کی طرح اس کا راستہ روک لیں گے۔ اس سب کا ذمہ دار اس کا بھائی تھا جس کی تصویر کو اس نے اپنی تصویر کے پیچھے رکھ کر اپنی شخصیت کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر ڈالا تھا۔

میرا سوچ کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔

"معاف کیجئے گا بھائی صاحب!" نیناں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھی اور میں یہ نہ سمجھا تھا کہ وہ کس قصور کی معافی مانگ رہی تھی اور کس بات کا افسوس تھا۔

"کس لیے؟" میں نے پوچھا اور ایک بار اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا جو بُری طرح کپکپا رہے تھے۔

"آپ بھی نہیں سمجھے!" اور اس کی آنکھوں میں سلگتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے اور آنسوؤں کی اس روشنی میں سب کچھ نظر آگیا۔ میں نے سب کچھ جان لیا۔ شاردا نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے پلو سے اس کے آنسو پونچھے میری نگاہ کو چندھیانے والی روشنی مدھم ہو گئی۔

"بے بس ہو کر جینا سب سے بڑا پاپ ہے شاردا!" اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک بار کتابوں سے بھری ہوئی بڑی سی الماری کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک دن یہ الماری اپنے پورے وزن کے ساتھ نیناں کے اوپر گر پڑے گی اور اسے سدا کے لیے اپاہج کر ڈالے گی۔

جب میں اور شاردا اس کے گھر سے واپس آئے تو ہم دونوں اداس تھے۔ بہت دیر خاموش چلتے رہے جیسے دونوں کے دلوں پر بہت بڑا بوجھ پڑا ہو۔

اس کے بعد میں کبھی نیناں کے گھر نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی بلایا بھی نہیں۔

شاردا اکیلی ہی جاتی تھی۔ خود وہ ہفتے میں ایک آدھ بار بھائی کے گھر آجایا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی کہانی بھی لے آتی۔ کہانی سناتے سناتے وہ اس میں اس قدر کھو جاتی کہ کئی دفعہ اسے ہماری موجودگی کا بھی احساس نہ رہتا۔ میں جب کبھی میر کے تیئے جاتا تو اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے محسوس کرتا جیسے صحرا کے بگولے اس گھر کی چھتوں سے اُٹھ کر اسیں جھلس ڈالتے ہوں۔ اس کے پتا کبھی کبھار دکھائی پڑ جاتے لیکن وہ مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لمحہ بھر کی ملاقات پہچاننے کے لیے کافی بھی نہ تھی۔ میری واقفیت نیناں سے بڑھ کر اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ سکی۔ البتہ نیناں کو میں زیادہ سے زیادہ پہچانتا گیا۔ اس کی شخصیت اپنی ساری جزئیات کے ساتھ میری سمجھ میں آنے لگی۔

اس کی اکثر کہانیوں میں ایک ادھورے پن کا سا احساس ہوتا تھا جیسے وہ کہانی کو انگلی پکڑے ہوئے کسی بازار میں سے گزر رہی ہو اور بھیڑ کے ریلے میں اچانک اس کا ہاتھ چھوٹ گیا ہو اور کہانی کہیں گم ہو گئی ہو اور وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اسے نہ پا سکی ہو اور اس کے انداز میں ایک جھلاہٹ، افسردگی اور شکستگی سی بھر گئی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے کہانی کو لکھتے لکھتے وہ اسے اچانک کسی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک عجیب سی حسرت اور تشنہ لبی رہ جاتی تھی اس کی کہانیوں میں اس کے کردار عام زندگی کے کردار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کا انتخاب دھرتی سے نہیں آکاش سے کرتی تھی۔ آدرش اس کے سامنے سب سے پہلی چیز تھی۔ وہ تخیل کے پنکھوں پر اُڑتے ہوئے دھرتی سے بہت دور فضا میں پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی اس لیے اس کی کہانیوں کے کردار اپنے بھرپور خلوص کے ساتھ بھی بے جان ہوتے تھے۔ ان میں حرکت آمیز زندگی نہ ہوتی تھی۔ ایک ٹھہراؤ اور منجمد قسم کی کیفیت تھی۔ گرمی اور حلت پھرت نہ تھی۔ ایک بے دلی اور اکتاہٹ سی تھی۔ میں نے اسے کئی بار کہا بھی کہ فن کار کو اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنے اردگرد کے ماحول کو گہری نظروں سے ٹٹولنا چاہیے۔ جو کردار اسے وہاں سے ملیں گے وہ زیادہ جاندار اور زندگی آمیز ہوں گے۔ پر یوں نظر آتا تھا جیسے وہ مجبوری ہو گئی تھی۔ اس کا ایک زاویۂ نگاہ بن چکا تھا اور اس کا بھائی اس سے سینکڑوں میل دور رہتے ہوئے بھی اس زاویۂ نگاہ کو پختہ کیے جاتا تھا۔ کاش اس کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہوتا جو اسے اپنے ماحول کے کھردرے پن سے بچنے کے لیے تخیل کی بھول بھلیاں

میں بھٹکنے کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پر کھڑا کر دیتا جہاں ہواؤں کے تیز تیز ریلے اس سے ٹکراتے اور ٹیڑھی میڑھی مخدوش پگڈنڈیاں اسے اپنی حفاظت خود کرنے پر مجبور کرتیں۔

پر ایسا نہ ہوا اور وہ اپنی ہی راہ پر چلتی رہی اور اس کی کہانیوں میں حسرت اور افسردگی بڑھتی گئی اور اس کی آنکھوں کی گہرائیاں زیادہ پُراسرار اور خاموش ہوتی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں معصومیت کی جگہ زہر خند نمایاں ہونے لگا وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئی تھی جہاں اسے محبت اور خلوص کی شمع کی ضرورت تھی۔ ایک بھائی کی نہیں ایک محبوب کی محبت۔ ایک ایسے شخص کی محبت جس کی آغوش میں اس کی شخصیت کا برفیلا پہلو پگھل جائے، اس کے ہونٹوں کے یاقوت دہک سکیں اور رخساروں کے پھول چہک اٹھیں اور اس کے ماحول میں ایسی کوئی ہستی نہ تھی۔ اس کے گھر کے باہر ایک اونچی دیوار تھی جسے کوئی نہ پھلانگ سکتا تھا۔ اس کا تخیل اسے جن جزیروں میں لے جانا چاہتا تھا وہ بہت دور تھے اور ان کے اردگرد بہت گہرا پانی تھا جس میں اترنا اس کے بس میں نہ تھا۔

جزیرے زیادہ خوبصورت ہوتے گئے۔
ان کے گرد پھیلا ہوا پانی زیادہ گہرا ہوتا گیا۔
اس کی الماری میں کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔
اور اس کا تخیل کہکشاں کی تلاش کرتا رہا۔

ایک دن شاردا نے مجھے بتایا کہ نیناں کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے اور پھر اچانک اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تمام دن اپنے کمرے میں پڑی جانے کیا کرتی رہتی ہے۔

نیناں کے پتا شادی بیاہ کے معاملے میں حد سے زیادہ کٹر تھے۔ وہ راجپوت تھے اور راجپوتوں کے بھی ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی کی ڈولی اٹھ جائے تو پھر سسرال کی حویلی سے اس کی ارتھی ہی نکلنی چاہئے۔ جیتے جی واپس آنا اس کے ماں باپ کی توہین ہے۔ نیناں کا بھائی اس سے متفق نہ تھا اور اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ وہاں شکست کھا کر ان کی خودداری زخمی ہو گئی تھی اور اب پورے جوش کے ساتھ وہ اس نئے محاذ پر ڈٹ گئے تھے۔ نیناں کی شادی انھوں نے آگرہ کے ایک گاؤں میں طے کی تھی۔ لڑکا فوج میں حوالدار تھا اور اب ری ٹیئر ہو کر واپس آ گیا تھا۔ ان کی بہت کافی زمین تھی اور وہ اس کا اکیلا مالک تھا۔ اس کا باپ بوڑھا تھا اور سن چودہ کی جنگ میں اپنا ایک بازو گنوا چکا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی پرانی حویلی تھی۔ نیناں کا گھر تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا تھا۔ حویلی کے گرد ایک بہت اونچی فصیل تھی۔ کسی زمانے میں وہ ایک قلعہ تھا، بعد میں وہ ایک حویلی میں منتقل ہو گیا۔ ان کے پاس دس بھینسیں تھیں، اگرچہ دو بھینسوں سے بھی کام چل سکتا تھا۔ آدھا گاؤں جو ان کے مزارعوں پر مشتمل تھا ان کے گھر سے چھا چھ لیجاتا تھا۔ بیلوں کی کئی جوڑیاں تھیں اور دو بچھیاں تھیں اتنی خوبصورت کہ گائیں بھی ان کے آگے ہیچ ہوں۔

نیناں کے پتا نے اپنے لڑکے سے اس معاملے میں کوئی مشورہ نہ کیا تھا۔ نیناں نے جو حالات اسے ماں سے معلوم ہو سکے اپنے بھائی کو لکھ دیئے۔ اس کے بھائی نے جب پتا کے فیصلے کی مخالفت کی تو وکیل صاحب نے اسے ایسے الفاظ لکھے کہ اس نے ان سے سدا کے لیے تعلقات توڑ لیے۔ اس نے نیناں کو عین منجدھار میں چھوڑ دیا جس بہاؤ پر اسے اب تک ناز تھا وہ اس سے چھین گیا وہ

ماں باپ کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکی اور اس کڑے قلعے کے حاروں سے نکلنے کے لیے اپنی پناہ گاہ میں دبک گئی اور یوں بے حس ہو گئی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کی شادی کرسمس کے دنوں میں ہوئی۔ میں ان دنوں ایک کمشنل ٹور کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان گیا ہوا تھا۔ جب میں واپس آیا تو وہ سسرال جا چکی تھی۔ شاردا نے مجھے بتایا کہ جس روز نیناں کی برات آئی اسے کئی بار دورے پڑے اور اب سسرال میں اسے ایسے ہی دورے پڑتے تھے۔

"بیاہ کے دن اس نے کئی بار آپ کا پوچھا؟"

"کیوں؟"

"کہتی تھی میرا بھائی بیاہ میں شریک نہیں ہوا۔ تمہارے بھائی جان ہوتے تو مجھے ضرور ڈھارس ملتی۔"

"کاش میں یہاں ہوتا!" میں نے کہا۔

دو روز سے نیناں سسرال سے آئی ہوئی ہے۔ اس کا خاوند بھی ساتھ ہے۔ میں اسے شادی پر کچھ بھی بھینٹ نہیں کر سکا۔ شاردا کا خیال تھا کہ مجھے ضرور کوئی تحفہ دینا چاہیے۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے خیال آیا، مرتع چغتائی، اس کی الماری میں نہیں۔ یہ کتاب اس کے بھائی نے اسے بھینٹ نہیں کی، میں ہی کر دوں۔ میں نے اپنی کتابوں میں سے اسے نکالا۔ یہ کتاب مجھے بے حد عزیز تھی اسے کبھی کبھار ہی الماری سے نکال کر پڑھتا تھا۔ سوچا یہی نیناں کو دے دوں وہ ضرور پسند کرے گی۔ میں اور شاردا، مرتع چغتائی، لے کر اس کے گھر گئے۔ میں باہر کھڑا رہا اس کے ساتھ اندر نہیں گیا۔

اس نے نیناں کو میرے آنے کی اطلاع دی پر وہ اس روز کی طرح جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا اپنے دھول بھرے احاطے میں گرد اڑاتی ہوئی نہیں آئی۔ دور برآمدے میں کھڑی رہی اور شاردا ہی مجھے لینے آئی۔

آج وہ ہمیں اپنے کمرے میں نہیں لے گئی۔ اس پڑے سے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھایا جو ڈرائنگ روم سے زیادہ ایک کورٹ روم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب گہرائیوں کی جگہ وحشت بھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے حس ہو گیا تھا اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر سختی سے جم گئے تھے جیسے مدتوں سے ان پر مسکراہٹ نہ کھلی ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں نیناں سے نہیں مل رہا، ایک مجرم کو دیکھ رہا ہوں جو کچہری میں اپنے کسی ناکردہ جرم کی سزا کا فیصلہ سننے کٹہرے میں کھڑا ہو۔ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں۔

"بہت دنوں میں آئے آپ بھائی صاحب!" اس کی آواز میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی شکایت، نہ اُلاہنا، نہ پیار۔ خالی آواز تھی۔ بے جذبے سے محروم۔

"میں یہاں نہیں تھا نیناں۔ تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔" میری بات سن کر اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کسی دیوانے کو کسی راہ چلتے ہوئے نے چھیڑ دیا ہو۔ اس نے کہا کچھ نہیں خاموش رہی۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں ان گنت شعلوں کی تپش تھی۔

"میں ہی لائی ہوں جناب کو۔ نہیں تو یہ آج بھی نہ آتے۔" شاردا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ فضا پر چھائی سنجیدگی چھٹ جائے، پر گھٹا بہت گھنی تھی چھٹی نہیں بلکہ اور نیچے جھک گئی۔

"بھائی صاحب میں نے اپنا کمرہ بند کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اور اپنی تمام کتابوں کو پھاڑ کر جلا دیا ہے۔" اس نے میرے سوال کی طرف دھیان ہی نہ دیا اور اپنی بات کہتی گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں نے پوچھا مگر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

"اپنے ماحول سے انتقام لینے کا میرے پاس یہی ایک طریقہ تھا۔ میں دلیپ سنگھ نہیں تھی کہ یہاں سے بھاگ جاتی۔"

دلیپ سنگھ اس کے بھائی کا نام تھا۔ وہ دلیپ سنگھ کی بہادری کا اعتراف کر رہی تھی یا اس کی بزدلی پر طنز، میں نہ سمجھ پایا۔

اور اس وقت پچیس چھبیس برس کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ نیناں اسی طرح بیٹھی رہی جیسے اسے اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

"نمستے جیجا جی!" شاردا اپنی جگہ سے اٹھی۔

"میرے بھائی جان۔"

اس نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر صوفے کی طرف لپکا جہاں نیناں بیٹھی تھی۔

وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہی تھا کہ نیناں کی آنکھیں اس پر گڑ گئیں جیسے مجرم پوری توجہ سے اپنے فیصلے کی عبارت سن رہا ہو۔ اس کی نظریں نیچے جھک گئیں اور پھر اس نے آنکھیں تیزی سے جھپکنی شروع کر دیں اور اس کا سر ایک دم صوفے کی پشت پر لڑھک گیا۔ اسے پھر غشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کنور چھپال سنگھ، اس کا خاوند گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا اور چند ہی لمحوں میں نیناں کی ماں پانی کا گلاس لئے آئی۔ نیناں بڑبڑا رہی تھی:

"بھائی صاحب میں نے انتقام لے لیا ہے ـــ میں نے انتقام....."

ماں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ شاردا نے اٹھ کر اسے سہارا دیا اور کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے پھانسی کے تختے پر کھڑی ہو اور پھانسی کا رسہ اس کی نظروں کے سامنے جھول رہا ہو۔ شاردا صوفے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسے اپنے بازو میں لے رہی تھی۔ ماں خالی گلاس لے کر چلی گئی۔ میں نے اپنی جھولی میں پڑے مرقع چغتائی کو ٹٹولا۔ وہ وہیں تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا لیکن نیناں کے کمرے میں اب ایک بھی کتاب باقی نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کتابوں کی اتنی بڑی الماری نیناں کے اوپر گر گئی تھی اور نیناں سدا کے لیے اپاہج ہو گئی تھی اور اس کی تصویر کا فریم ٹوٹ گیا تھا اور اس کی تصویر کی جگہ اب دلیپ سنگھ کی تصویر تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"تو اب چلیں شاردا؟"

شاردا نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنی کتاب تو صیغہ کر دو۔

لیکن میں نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مرقع چغتائی میری بغل میں تھا۔ نیناں اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بولی تک نہیں۔

چپ چاپ کھڑی ہو گئی اور پھر ہمارے ساتھ برآمدے میں آ گئی اور وہاں ایک دم رُک گئی۔ شارداؔ اور میں احاطے میں دھول اڑاتے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے میں نے نیناں کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں جانے کس شے پر گڑ چکی تھیں۔

میں شارداؔ کو بازو سے پکڑ کر جلدی جلدی سڑک پر لے آیا۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں نے "مرقع چغتائی" نیناں کو بھینٹ کیوں نہیں کیا۔ پر مجھے اس کی عادت کا پتہ ہے وہ پوچھے گی ضرور۔

میں نے جانے کتنے ہی سگرٹ پھونک ڈالے ہیں۔ میرے اردگرد دھواں پھیلا ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شارداؔ نے مجھ سے یہ بات پوچھ لی تو کیا جواب دوں گا؟

مائی پھاتاں

میرزا ادیب

اس دن سارا شہر شیخ خیرالدین مرحوم کا پہلا جنم دن منا رہا تھا!

یہ دن منانے کے لئے کئی ہفتوں سے بڑی شد و مد کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں چنانچہ اخبارات کے خاص نمبر شائع ہو رہے تھے، رسائل و جرائد میں مرحوم کی تصاویر چھاپی جا رہی تھیں اور اتوار کی شام کو کارپوریشن کے میئر کی زیر صدارت ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان عام جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں شہر کی کئی مشہور و ممتاز ہستیاں مرحوم و مغفور کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈال رہی تھیں۔ اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی اس کے علاوہ اخبارات و رسائل میں چھپے ہوئے مضامین کے مطالعے کے بعد میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں ایک تقریر کیا کم سے کم دس بیس چوٹی تقریریں تیار کر سکتا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ جو کچھ لکھوں وہ مرحوم کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو سے متعلق ہو اور اس کے لئے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیرالدین مرحوم کے احسانات عام لوگوں پر۔ مواد آنکھوں کے سامنے بکھرا پڑا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں سے تھے آبائی وراثت میں آپ کو کافی جائداد ملی تھی اس کے علاوہ اپنی ذاتی کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا مگر دیکھنے والی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت کو کہاں کہاں خرچ کیا اور مرحوم کے نزدیک اپنے سرمائے کا حقیقی مصرف کیا تھا۔ شیخ صاحب بے نواؤں کا آسرا اور یتیموں کا ملجا تھے۔ ساری عمر خلق خدا کی خدمت کرتے رہے آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ استاد ذوق کا ایک شعر ہے ۔۔

"نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا"

اور مرحوم اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔ آج خیرالدین ہسپتال کا نام کون نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں روزانہ بیسیوں مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور اکثر مریضوں کو دوا بالکل مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف یہ ہسپتال ہی نہیں اپنی جیب خاص سے ایک معقول رقم صرف کر کے ایک یتیم خانہ بھی تعمیر کروا دیا تھا اور آج بھی اس یتیم خانے میں قوم کے کئی بے نوا اور بے آسرا بچے پرورش پا رہے

ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا ———"

" باؤجی! ایک خط لکھ دو گے؟"

میرا قلم چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر سامنے دیکھتا ہوں مہراں گوالن اپنے میلے ہاتھوں میں خالی لفافہ پکڑے دہلیز پر کھڑی ہے۔

" خط لکھ دو نا!" "پھر سہ" نہیں ہے؟"

جانتا ہوں کہ اگر اس وقت تمام خیالات کو سمیٹ نہ لیا تو پھر عبارت کا ربط و تسلسل ٹوٹ جائے گا اور لکھنے میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے مگر کیا کیا جائے انکار کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مہراں گزشتہ دس سال سے بغیر پانی ملائے دودھ مہیا کر رہی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ انکار احسان مندی کے خلاف ہوگا چنانچہ میں سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کے لئے کہتا ہوں۔ مہراں اندر آتی ہے اور فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی ہے ———

" باؤجی تکلیف تو ہوگی۔ میری بہن کو لکھنا ہے جو راولپنڈی میں رہتی ہے۔ تحصیل ———"

" بھئی پہلے بتاؤ لکھنا کیا ہے۔ پتہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کاغذ لے لوں۔ ہاں اب بولو۔"

" بس یہ لکھنا ہے، جمعرات کی شام کو مائی پھاتاں مر گئی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ " فاطمہ کو مائی پھاتاں کے مرنے کا بڑا دکھ ہوگا۔ مائی پھاتاں کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جب فاطمہ کنواری تھی تو ایک دفعہ اس کا پاؤں ذرا جل گیا تھا۔ پھاتاں سارا دن گھومتی رہی اور اللہ جانے کہاں سے مرہم لے کر آئی۔ اس دن اللہ ماری ہڑتال تھی سارے شہر میں۔"

" مائی پھاتاں وہی تھی نا ——— دھوبن؟" میں پوچھتا ہوں۔

" گلی کے آخری مکان میں تو رہتی تھی۔ آپ کے کپڑے دھوتی ہوگی۔ سارے محلے کے کپڑے دھوتی تھی وہ تو۔"

" یہی بات ہے پرسوں اس گھر کے سامنے چند آدمی بیٹھے تھے ——— تو مائی پھاتاں مر گئی ہے۔"

" کیا کہوں کتنی ہمت والی تھی وہ کام کر کے تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی تو یہ عورت تھی کہ لوہے کی بنائی ہوئی مشین" مہراں تعریف لہجے میں کہتی ہے۔

" اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑاکا تھی ہر وقت لڑتی رہتی تھی محلے کے لوگ اس سے پناہ مانگتے تھے" میں پھاتاں کی وہ خصوصیت بتاتا ہوں جس کا شہرہ عام ہے اور جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔

" لڑتی تو وہ ضرور تھی اور شور بھی بہت مچاتی تھی پر اپنے خصم سے لڑتی تھی۔ لوگوں نے اللہ جانے بدنام بھی کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو کس قسم کی عورت تھی وہ تھی ——— بڑی اچھی۔ ہائے آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ کیوں باتیں کروں۔"

میں تقریر والے کاغذ پر نظر ڈالتا ہوں ——— "بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا

——— "اگلا فقرہ سوچنے کے لئے میں پیشانی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر، آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہوں۔

"دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جنھوں نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہوں، مظلوموں کو سہارا دیا ہو اور جو بیکسوں کا آسرا بنے ہوں۔ شیخ صاحب کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ گرے ہوؤں کے سچے دوست تھے" ——— میرے ذہن میں پورا فقرہ الفاظ کی مناسب ترتیب کے ساتھ آجاتا ہے۔ میں قلم ڈھونڈنے کے لئے ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ مہرآں مسز مسز میری طرف دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہے، نہ جانے کیا سوچ رہی ہے۔ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس کی خاموش نگاہیں ایک التجا لئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک خاص آرزو کی جھلک ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی دو چار باتیں سن لوں، زیادہ سے زیادہ دو منٹ صرف ہوں گے اس کے بعد شیخ مرحوم کے چند واقعات لکھ کر تقریر مکمل کر دوں گا ——— اور میں کہتا ہوں۔

"تو وہ لڑکا نہیں تھی ——— تمھاری مائی پھاتاں"

"ضرور تھی ——— میں کہتی ہوں، ہاں تھی۔ اللہ تجھے میرے مراد کے میاں کو جب میں اس کے گھر میں آئی اس سے بیاہ کر کے تو وہ کہنے لگا۔ دیکھو مہرآں! اس پھاتاں سے پرے پرے رہنا۔ کسی دن لڑ پڑی تم سے تو تمھارے سر کا ایک بال بھی نہیں چھوڑے گی۔ میں نے کہا۔ میں بھی کسی سے دبنے والی نہیں ہوں مجھ سے لڑے گی تو منہ کی کھائے گی ——— یہ بات تو میں نے کہہ دی پر پھاتاں سے ملتے ہوئے مجھے سچ مچ ڈر لگتا تھا۔ اس نے کئی بار بلانا چاہا مگر میں ٹال گئی ہی رہی۔ ابھی میرے میاں کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ پھاتاں کی اپنے خصم مولا بخش سے ایسی لڑائی ہوئی ——— ایسی لڑائی ہوئی کہ کیا کہوں۔ پھاتاں نے تو سر پر آسمان اٹھا لیا اس دن میں نے عہد کر لیا کہ اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔ پتہ ہے لڑائی کی وجہ کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پھاتاں نے کہیں سے سن لیا تھا کہ مولا بخش کا کسی مراثن سے یارانہ ہو گیا ہے۔ اور وہ اس کے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ پھاتاں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی یہ سنکر مراثن کو وہ بے نقط سنائیں کہ توبہ ہی بھلی ——— آدمی رات تک اس نے محلے والوں کو سونے نہ دیا ——— پر آپ کا وقت بڑا قیمتی ہوگا۔ میں کیا پھاتاں کی کہانی لے بیٹھی ہوں" مہرآں بولتے بولتے یک لخت بے چین ہو جاتی ہے۔

"نہیں تم پھاتاں کی لڑائیوں کا حال ضرور سناؤ" میں بخوشی کہتا ہوں۔

"تیسرے دن پھر لڑائی ہوئی۔ مولا بخش نے کہہ دیا کہ وہ مراثن کے گھر ضرور جایا کرے گا۔ میں پھاتاں تو بھوکی شیرنی بن گئی۔ اس دن اس کا چچا بھی آگیا اور اس نے غصے میں آکر مولا بخش کی بانہہ کی ہڈی توڑ ڈالی۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن کا قصہ ہے کہ میں کسی گاہک کو دودھ دے رہی تھی اتنے میں دیکھتی ہوں کہ پھاتاں چھوٹا سا گلاس ہاتھ میں لئے میرے پاس کھڑی ہے۔

"بہو تھوڑا سا تیل دے دو" پھاتاں نے کہا۔

میں نے اسے تیل دے دیا۔ خیال تھا تیل لے کر چلی جائے گی پر وہ تو وہیں نامار کر وہیں بیٹھ گئی اور لگی باتیں سنانے۔ پہلے تو وہ کہنے لگی مولا بخش کو بڑی تکلیف ہے بیچارا ساری رات تڑپتا رہا ہے اور میں دو راتوں سے بالکل نہیں سو سکی پھر

وہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگی ——— اُس دن مجھے پتہ لگا کہ پھاتاں دل کی بُری نہیں ——— باؤجی وہ کیسے بُری ہو سکتی تھی اس کا خصم ایک مراثی سے یارانہ کر رہا تھا پھر بھی جب وہ زخمی ہوتا ہے تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی ٹوٹی ساس کی تو وہ اس دل سے خدمت کر رہی ہے جس دن اس کا بیاہ ہوا تھا۔ میرا شک شبہ جاتا رہا اور میں اس کے گھر آنے جانے لگی ——— بیماری میں مولا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مراثی کے گھر کبھی نہیں جائے گا مگر جیسے ہی وہ ٹھیک ہوا وہ پھاتاں کی سونے کی چوڑیاں چرا کر فوراً ادھر بھاگا اور مراثی کو وہ چوڑیاں دے آیا۔ پھاتاں کے رشتہ داروں نے کہا کہ وہ مولا بخش کو چھوڑ دے پر وہ اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ میکے چلی گئی اور ایک مہینے کے بعد پھر آ گئی ——— اللہ جانے اُسے کیوں اپنے بیٹے پر رحم کا خیال رہتا تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو پتہ ہے کیا کرتی کبھی ادھر کا رُخ نہ کرتی سچ کہتی ہوں، اچھا تو ایک دن کا ذکر ہے میں کوٹھڑی میں بیٹھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک عورت آئی۔ کوئلے کی طرح کالا سیاہ رنگ، قد ساری انار کی طرح سُرخ، آنکھیں اور گلے میں موتیوں کی مالا۔ میں نے کہا یا الٰہی کون ہے اور کیوں یہاں آئی ہے وہ عورت کولہے مٹکاتی ہوئی آئی اور میرے پاس موڑھے پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا بہن تو کدھر سے آئی ہے اور کیا کام ہے۔ اس پر وہ بولی میرا نام واراں ہے۔ مصری شاہ میں رہتی ہوں۔ ذرا مولا بخش کو بلا دو۔

میں بولی "ہائے تُو تو وہی ہے مراثن ہے نا ——— نہ بابا میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔ اگر پھاتاں نے سُن لیا کہ تو یہاں ہے تو وہ اللہ جانے کیا کرے۔ بڑی سخت عورت ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے۔

یہ سُن کر وہ بولی "بہن! اب میں کہاں جاؤں۔ گھر والوں نے مجھے نکال دیا ہے کہتے ہیں تو "واگدا" ہو گئی ہے۔ مولا بخش کو ذرا بلاؤ نا۔ اس سے پوچھوں اب واگدا کر کے مجھے کس کے حوالے کرتا ہے بدمعاش کہیں کا"۔

میں نے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ پر میں اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی۔ تو نے پھاتاں کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں تک پیس ڈالے گی ہاں اللہ جانے بڑی سخت عورت ہے چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری خیریت ہے"۔

وہ بولی "میں تو ضرور اس سے ملوں گی۔ کئی دن سے وہاں نہیں گیا۔ اللہ جانے کسی کی آئے کیوں آیا تھا میرے گھر۔ اگر بہن! تو مولا بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاتی ہوں ———"

باؤجی! وہ تو پھاتاں کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پر جب میں نے خوب ڈرایا تو کہنے لگی اچھا، لینڈی چلی جاتی ہوں وہاں میرا ماموں رہتا ہے۔ اور وہ باہر نکل گئی ——— گلی میں اندھیرا تھا میں اسے جاتے ہوئے دیکھ نہ سکی۔ سمجھ لیا اب تو اس قدر ڈر گئی ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔

صبح میں پھاتاں کے گھر گئی تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا ہی عجیب تھا۔ پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی اور وہ ——— بھلا کون ——— وہ مراثی، پھاتاں کی سوکن ——— مونڈھے پر بیٹھی وہی کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا رہی تھی میں حیران رہ گئی۔ پھاتاں کہنے لگی "تمہاری اجنبی ہو یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "نہیں ——— جھوٹ موٹ کہہ دیا نا۔

کہنے لگی "یہ وہی لڑکی ہے داراں مراثن"

"تو یہ یہاں ———"

"ہاں بہو! کہتی ہے مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔ میرا کوئی آسرا نہیں اور میں "داگدار" ہو گئی ہوں۔ میں نے کہا اچھا تجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے تو آجا یہاں اللہ جو ہمیں روکھی سوکھی دیتا ہے تو بھی کھا لیا کر" اور داراں پھاتاں کے گھر میں رہنے لگی۔

پھاتاں کے رشتہ داروں کو جب پتہ لگا کہ داراں مراثن اس کے گھر میں آگئی ہے تو وہ یوں تلملا اٹھے جیسے بھیڑوں کے چھتے کو کسی نے چھیڑ دیا ہو۔ سب نے کہا اسے فوراً گھر سے نکال دو مگر پھاتاں بولی میں اسے سہارا دے چکی ہوں اب تو اسے نہیں نکالوں گی۔ کہاں کہاں ماری پھرے گی یہاں سے جا کر ——— باؤ جی! کیا کہوں پھاتاں کے رشتہ داروں نے بہت سختی کی۔ پھاتاں کے چچا نے تو یہاں تک کہہ دیا اگر یہ مراثن یہاں رہے گی تو میں کبھی تمہارے گھر میں نہیں آؤں گا ——— پھاتاں نے سب کچھ سنا پر اس اڑیل بندی نے داراں کو گھر سے جانے کے لئے بالکل نہ کہا۔

پھاتاں پہلے کی طرح ہی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ داراں زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی اس کا پیٹ گانا بجانا تھا بھلا وہ استری کر سکتی تھی یا چٹی جھونک سکتی تھی ——— اچھا تو دن گذرنے لگے۔ پھاتاں کے سب ملنے والوں نے اس کا "بیاہی کاٹ" کر دیا۔ باپ نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر داراں کہنے لگی "بہن اب زیادہ نہیں ——— میں چلی جاتی ہوں اور وہ جانے لگی۔ پھاتاں نے اس کی چوٹی پکڑ لی اور گھسیٹ کر اسے اندر لے آئی ——— اس کے بعد داراں نے جانے کا نام نہ لیا۔

پانچ چھ مہینے کے بعد داراں کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ بڑی کمزور بچی تھی میں تو اسے دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ بچے گی نہیں پر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بچی سنبھل گئی اور ماں کی حالت خراب ہو گئی۔ پھاتاں نے اس پر کافی رقم صرف کر دی "لیڈی ڈاکٹر" کو بلایا۔ مگر وہ بچا نہ سکی۔ اس وقت عیشاں (عائشہ) دو اڑھائی مہینے کی تھی!

ماں مر گئی تو بچی کی کون پرورش کرے۔ داراں نے مرتے وقت بچی پھاتاں کے حوالے کی تھی پس پھاتاں نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور اپنی بچی جان کر پالنے لگی۔ اللہ جانے پھاتاں کو بچی سے کیوں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ وہ اسے گود سے اتارنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی!

مہراں کو پھر اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی لفافے کو دیکھنے لگتی ہے جسے وہ ساتھ لائی تھی اور جو اب چارپائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑا تھا۔

"یہ بچی زندہ رہی ——— ؟" میں سوال کرتا ہوں۔

مہراں کے گھٹنے پھر ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ جلدی سے کہتی ہے۔

"جی ہاں زندہ رہی پر پھاتاں کے لئے تو ایک مصیبت بن گئی۔ تم پوچھو گے کس طرح ——— وہ اس طرح کہ جب تک مراثن زندہ رہی لوگ پھاتاں سے کہتے رہے یہ فاحشہ عورت ہے اسے فوراً گھر سے نکال دو اور جب وہ مر گئی تو وہ بولے۔ یہ بچی

اللہ جانے مولا بخش کی ہے بھی یا نہیں اسے اس کی نانی کے گھر بھجوا دو۔ سنا یا دو جی مطلب یہ کہ بچی کے بارے میں ان کو شک شبہ تھا۔ تو ایک دن بھاتاں کے گھر برادری کے سب لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے۔ دیکھو بھاتاں ہم اب تک تمہارا منہ دیکھتے رہے ہیں اب خیریت اسی میں ہے کہ اسے اس کی نانی کے یہاں بھجوا دو۔ اسی وقت ورنہ ہم سے بڑا کوئی نہ ہوگا ——— اس وقت بھاتاں نے پتہ ہے کیا کیا۔ وہ سینہ تان کر بولی۔ میں اس معصوم (معصوم) کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"اگر تم نہیں چھوڑو گی تو ہم تمہارا "بیاہ کاٹ" کر دیں گے" انھوں نے کہا۔

"جو دل میں آئے کرو۔ میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں اب مرت ہی اسے مجھ سے جدا کریگی۔"

مہراں کے لب و لہجہ میں جوش پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح بول رہی ہے جیسے سٹیج پر بھاتاں کا پارٹ کر رہی ہے۔

"تو برادری نے بھاتاں کا بائیکاٹ کر دیا ہوگا۔"

"جی ہاں ——— مولا بخش بھی بیوی کے خلاف ہو گیا۔ بھاتاں کے دونوں لڑکے پہلے ہی مراثن کے بہت خلاف تھے وہ ماموں کے گھر چلے گئے تھے وہیں کام کاج کرتے تھے ——— میں نے جب دیکھا کہ بھاتاں اپنی ضد سے بڑا نقصان اٹھا رہی ہے تو ایک دن اس سے بولی "بھاتاں! اس بچی کو بیچ ہی دو۔ کیا فائدہ اسے گھر میں رکھنے کا۔ سب لوگ تمہارے خلاف ہو گئے ہیں۔"

بے شکر وہ کہنے لگی۔

"نہیں بہو ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر رکھوں گی کیوں بھیجوں اسے۔ لوگ خلاف ہو گئے ہیں تو ہو جائیں جب کسی کو سہارا دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں۔"

میں نے کہا "تمہارے اپنے لڑکے بھی تو خلاف ہو گئے ہیں؟"

بھاتاں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ سی گئیں۔

لوگ کہتے ہیں لڑکا ماں باپ کا بازو بنتا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی مار ان پر۔ اچھا جو چاہیں کریں میں ان سے ڈر نہیں جاؤں گی اللہ ہمت دے سب کام کر لیا کروں گی۔"

اور بھاتاں سب کام کرنے لگی۔ عیشاں بڑی ہونے لگی ——— بھاتاں نے رات دن محنت کر کے اس کا جہیز بنایا اپنی ساری پونجی اس پر صرف کر دی۔ جب عیشاں کا بیاہ ہوا تو بھاتاں بڑی خوش تھی کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے پر بادی! اگر اللہ میاں کو یہ بات منظور نہیں تھی۔ عیشاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی۔ وہاں کسی نے عیشاں کے سسر کو بتا دیا کہ عیشاں ایک مراثن کی بیٹی ہے۔ بس پھر کیا تھا سسرال والوں نے عیشاں کو مار پیٹ کر بھاتاں کے گھر بھجوا دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ ادھر عیشاں طلاق لے کر گھر آئی اور مولا بخش خون تھوکنے لگا۔ بھاتاں پر دوہرا صدمہ پڑا۔ کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا پر بھاتاں نے ہمت نہ ہاری۔ لولی ساس کی بھی برابر خدمت کرتی رہی خصم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے کپڑے بھی دھوتی رہی ——— تایجی بھاتاں کا رشتے میں بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ بھاتاں نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ یہ

لڑکا کام کاج میں مدد دینے لگا اور جب پھاتاں نے دیکھا کہ تاجی ٹھیک ہو گیا ہے تو اس کی شادی عیشاں سے کر دی۔ خدا خدا کر کے پھاتاں کے سر سے یہ بوجھ بھی اترا ——— اب سنو مولا بخش دو سال تک بیمار رہا اور پھر مر گیا! دو چار دن بعد پھاتاں کی لولی ساس بھی چل بسی ——— پھاتاں کی شادی کے بعد پورے تیس برس زندہ رہی تھی یہ ——— پورے تیس برس اتنے سال پھاتاں نے اس کی خدمت کی تھی ——— ایک رات پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی کہ استری سے اللہ جانے کس طرح کوئلے نکل کر اس کے کپڑوں پر آ گرے اور بیچاری کے گھٹنے جل گئے اور وہ صبح تک بے ہوش پڑی رہی۔ صبح عیشاں نے نیچے اتر کر دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ ہم سب نے مل کر اسے چارپائی پر لٹایا اور حکیم کو بلایا اور وہ ہوش میں آ گئی پر اب وہ پہلی جیسی نہیں تھی چارپائی سے تو اٹھ ہی نہیں سکتی تھی بے چاری۔ منگل کی رات کا ذکر ہے پھاتاں نیچے سو رہی تھی اور عیشاں، تاجی اور ان کا بچہ اوپر چھت پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو بچہ رونے لگا۔ اللہ جانے کیا تکلیف تھی اسے۔ عیشاں کی جوانی کی نیند بالکل بے خبر سوتی رہی۔ پھاتاں سے نہ رہا گیا پہلے تو اس نے آوازیں دیں پھر بھی بچہ روتا رہا تو اوپر آ گئی۔ اللہ جانے کس طرح اوپر آ گئی اور آ کر اس نے بچہ گود میں اٹھا لیا اور عیشاں کو جگا دیا۔ عیشاں بڑی ناراض (ناراض) ہوئی۔

"اماں تیری صلاح مرنے کی ہے۔"

اور یہ بات سچی ہی نکلی۔ پھاتاں کو ہوا لگ گئی اور وہ جمعرات کی شام کو مر گئی ——— پچاس سال لوگوں کی خدمت کرنے کے بعد مر ہی گئی۔"

مہراں کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور وہ دوپٹے کے پلو سے ناک پونچھتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

میں سوچنے لگتا ہوں، مائی پھاتاں مر گئی ہے۔ وہ مائی پھاتاں جس نے تیس سال تک لولی ساس کی خدمت کی، جس نے اس وقت اپنی سوکن کو پناہ دی جس وقت اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ بے آسرا ہو چکی تھی جس نے ایسے وقت میں سوکن کی بچی کو چھاتی سے لگایا جس وقت وہ ماں کے دودھ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی تھی۔ جس نے دو سال تک بیمار شوہر کی تیمارداری کی ——— جو پچاس سال تک میرے محلے میں رہی اور جس کے بارے میں چند منٹ پہلے میں صرف یہی جانتا تھا کہ وہ ایک دھوبن ہے اور بڑی لڑاکا ہے ———

مہراں آبدیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔

"تو لکھ دو باؤ جی!"

میں کاغذ نکالتا ہوں اور لکھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ مہراں آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے انہیں دباتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈی نم آلود ہو جاتی ہے۔ مہراں انگوٹھے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اس نمی کو خشک کرتی ہے اور ایک لمبی آہ بھر کر پوچھتی ہے۔

"لکھ لیا ہے خط؟"

"ہاں۔ پتہ بولو۔"

میں خط مکمل کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رک جاتی ہے۔

"آج شہر میں جھنڈیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں؟" مہرآں پوچھتی ہے۔

"تمہیں معلوم نہیں آج شیخ خیر الدین مرحوم کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔"

اچھا۔ شیخ خیر دین ——— میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ پھاتاں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔

مہرآں چلی جاتی ہے۔ میں تقریر مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر جھکتا ہوں ——— مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا ——— میری آنکھوں کے سامنے پھاتاں کا بوڑھا چہرہ ابھرنے لگتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس چہرے پر صدیوں کی محنت، صدیوں کی بے لوث خدمت کا غبار چھایا ہوا ہے ——— اس غبار میں اس کی خاموش نظریں مجھ سے ایک سوال پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن میں مہرآں کے الفاظ گونج رہے تھے ——— "خیر دین بہت بڑے آدمی تھے پھاتاں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔"

گٹاری کے انڈے

دیوندر ستیارتھی

منہ میں کوئی کیڑا یا کوئی تنکا لٹکائے گٹاری اپنے گھونسلے میں گھس جاتی۔ گھونسلے کا دروازہ ایک معمولی سوراخ ہی تو تھا۔ اوپر کی منزل میں۔ نکڑ والے حویلی خانہ کی چھت پر جہاں ٹین کی چادر کا سرا کاریگر نے باہر کو بڑھا رکھا تھا۔ بس وہیں اس ٹین کے نیچے دیوار کے آخری سرے میں یہ سوراخ تھا جو گٹاری کے گھونسلے کا دروازہ تھا۔ نیچے رسوئی کے دروازے پر کھڑے کھڑے بدھ سنگھ گٹاری کو اپنے گھونسلے میں داخل ہوتے دیکھتا اور سوچتا کہ ماں کی محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے اور دنیا کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب گٹاری کی ماں آیا پر نمائش ڈپٹ کرتی کہ آج اس نے گٹاری کو وقت پر کھانا کیوں نہیں کھلایا، بدھ سنگھ کی نگاہ میں گٹاری کی شخصیت ابھر کر اونچی اٹھ جاتی۔ جب کوئی خوفناک بات ہوتی گٹاری کا جوڑا رسوئی کے بغلی والے پیڑ پر بیٹھ کر ایسی ایسی آوازیں نکالتا کہ بدھ سنگھ بڑی چوکسی سے ادھر اُدھر دیکھتا۔ وہ کہتا: "گٹاری سے بڑا انسان کا دوسرا دوست نہیں ہو سکتا۔ سانپ کو دیکھ کر سب سے پہلے گٹاری ہی شور کرتی ہے۔"

اس مکان میں ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھار سانپ نظر آ جاتا تھا۔ گٹاری کی چیخ پکار ہی سانپ کی موجودگی کا پتہ دیتی۔ اس وقت بدھ سنگھ ہاتھ میں لٹھ اٹھائے سانپ کی تلاش میں نکل پڑتا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا، چبوترے کے نیچے تین چار سانپ مارچکا تھا۔

بدھ سنگھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ بات کرتے وقت یوں سامنے آ جاتا جیسے ہاری کے سامنے جھوما اسامنے والے شخص کا جائزہ لیتا اور پھر نپے تلے انداز میں اپنا فلسفہ بگھارنے لگتا ——— "ہاتھوں سے دی ہوئی گالیاں انسان کو منہ سے کھرنی پڑتی ہیں ہمارے گورو مہاراج کا کہنا ہے۔ کہ سوچ کر بولو۔ سوچ کر کام کرو۔" گھر والے اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اپنے کام کے علاوہ وہ دوسروں کا کام بھی بخوشی کر دیتا۔ فرش پر بکھری کتابوں کو ٹھیک کر دیتا۔ سانپ کا ذکر آتے ہی تو وہ غصہ میں آ جاتا۔ کہتا "میں اس پر جھپٹ پڑوں گا، ایک ہی ٹکڑے سے اس کی سری توڑ دوں گا۔" اس کی آواز میں اتنی گرجدار تھی کہ اس کی بات پر یقین کرنا پڑتا۔ ضروری اور غیر ضروری بات میں وہ بہت فرق نہیں کر سکتا تھا۔ وہی گرم جوشی، وہی ہلچل پیدا کرنے والی آواز۔ جب وہ بات کرتا تو اس کے ابھرے ہوئے گالوں کی ہڈیاں ابھرتی نظر آتیں۔ اس وقت اوپر کھڑکی کے دروازے پر بیٹھا گٹاری کا جوڑا ایسی ہی آوازیں بولنے لگتا۔ بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری اس کی داد دے رہی ہے۔

کوئی بدھ سنگھ سے بات کرے ذکرے کبھی کبھی وہ رسوئی کے برآمدے میں اونچی آواز میں خود ہی باتیں کرتا رہتا۔ ابھی گھر کی کسی بات پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ ابھی ریڈیو پر سنی ہوئی کسی خبر کو لے کر ناک مرچ لگایا جا رہا ہے بات کرتے وقت وہ ہونٹوں بند زبان پھیرنے لگتا۔ اسے اس بات کا سب سے بڑا اطمینان تھا کہ گھر میں اس کا اعتبار ہے اور وہ اپنا کام ایمان داری سے کرتا ہے۔ جتنے جہان آتے ان کے ساتھ بدھ سنگھ کا سلوک ہمیشہ خوش گوار رہتا، بچوں سے اسے بے حد محبت تھی۔ گلی کی ماں اس پر اس لیے بھی خوش تھی کہ گلی کا جتنا خیال وہ رکھتا ہے، اتنا بھی نہیں رکھتی۔ چنار کی ٹہنی پر بیٹھ کر گلہری اپنی زبان میں کچھ بکنے لگتی تو بدھ سنگھ پاس کھڑے ہو کر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ گلہری کہہ رہی ہے ——— بدھ سنگھ! میں جانتی ہوں کہ تم اکیلے تین آدمیوں کا کام کرتے ہو، وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بڑی معصومیت سے وہ گلہری کی طرف دیکھتا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— میں تو تمہارا بھی اتنا ہی نوکر ہوں، گلہری، جتنا گلی کی ماں کا!

بچی کے تار پر لٹکتا ہوا کوا بھی بدھ سنگھ کو جانتا ہے۔ کم سے کم بدھ سنگھ کا یہی خیال تھا۔ کوے کی کائیں کائیں سے بدھ سنگھ کو پتہ چل جاتا کہ کوا بھوک سے چلا رہا ہے یا خوشی کا مارا بھرا رہا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوا غصہ میں ہوتا۔ اس وقت چنار کے پیڑ پر بیٹھی گلہری چیخ کر بدھ سنگھ سے شکایت کرتی۔ بدھ سنگھ فوراً سمجھ جاتا کہ کوے کو اڑا دو۔ کیونکہ بدھ سنگھ کو معلوم تھا۔ کہ گلہری اور کوے کا پرانا بیر چلا آتا ہے اور کوے کی موجودگی میں گلہری کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ اس کا گھونسلہ سلامت ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کوے اور گلہری کا بیر ختم کیوں نہیں ہو سکتا۔ کوے اور گلہری کی غیر موجودگی میں وہ اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اسی موضوع پر سوچنے لگتا۔ اور پھر جیسے کچن کی دیواروں کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں کہنے لگتا۔ گلہری تو بہت معصوم چیز ہے۔ وہ بے چاری تو کوے کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کوا ہی اس کے بچوں کا دشمن ہے۔ کم بخت کو کسی کا گھونسلہ اجاڑنے میں نہ جانے کیا ملتا ہے! اپنے آپ کو گلہری کی خدمت کے قابل بنانے کے لیے وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ ساتھ ہی اس کی یہ خواہش نہ تھی کہ گلہری اس کا شکریہ ادا کرے۔ کوے پر اسے غصہ آنے لگتا۔ شیطان کو گلہری پر ذرا رحم نہیں آتا۔ آخر گلہری اس کا کیا بگاڑتی ہے!

صبح کو جاگنے پر بدھ سنگھ کی نگاہ گلہری کے گھونسلے پر پڑتی۔ گلہری کو گھونسلے کے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی دل چسپی تھی گلی کو مسکراتے اور مچل مچل کر باغیچہ کی روش پر اچھلتے کودتے دیکھنا۔ گلی کی ماں کے منہ سے ایک آدھ تعریف کا بول سن لینا یا پھر کسی مہمان کے منہ سے زمانے کے حالات پر بلا سوچا سمجھا تبصرہ سن کر اس کے بارے میں رائے قائم کرنا۔ لیکن اس سے آگے اگر اس کی کوئی دل چسپی تھی تو وہ تھا گلہری کا گھونسلہ۔ جب بھی گلہری انڈے دیتی بدھ سنگھ سوچتا کہ گلہری کی نئی نسل شروع ہونے والی ہے انڈوں سے بچے نکلنے کا اسے بے حد انتظار رہتا۔ ان دنوں وہ خاص طور پر گلہری کے گھونسلے کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا۔ اس کی نگاہ سیدھی گلہری کے گھونسلے پر پہنچتی۔ حالانکہ زمین پر کھڑے کھڑے یہ ناممکن تھا کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں نکڑ والے غسلخانہ کی چھت پر زمین کی چادر کے بڑھتے ہوئے سرے کے نیچے دیوار کے آخری سرے کے کوئی سوراخ کے اندر کی دنیا کے بارے میں کوئی بات دریافت کی جائے۔ لڑکی پر بیٹھی گلہری کی آواز میں چہل اور لوری کی آمیزش دیکھ کر بدھ سنگھ اندازہ لگا لیتا کہ گلہری کے انڈوں سے بچے نکل آئے ہیں

گلہری انسان کی سب سے بڑی دوست ہے! ——— یہ بدھ سنگھ کا تکیہ کلام تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ کوا ایسے بات کرتے وقت وہ عورت کو گلہری سے تشبیہ دیتا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کا صحیح تصور بدھ سنگھ کے ذہن کو کبھی نہ گدگداتا۔ اسی لیے تو اس

نے کبھی بھول کر بھی بیاہ کی بات نہ سوچی تھی۔ اُس کے ہاتھ کام کرتے کرتے بہت کھردرے ہو گئے تھے۔ بیوی ہوتی تو کبھی اس کے ہاتھوں پر تیل ہی چپڑ دیا کرتی۔ لیکن اُس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ بیاہ کے جھگڑے میں نہ پڑے گا۔ بیوی کی غیر موجودگی کا تصور اُسے کبھی تنگ نہ کرتا۔ آیا کے چوڑے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اکثر سوچتا کہ بُھلیا اپنے بیٹوں کی سعادت مندی حاصل نہ کر سکی۔ ورنہ اس عمر میں اُسے آیا کا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے ایسے باپ بھی دیکھے تھے۔ جن کے بیٹے اُن پر جھوٹ کے دکھیوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ ایسی مائیں بھی دیکھی تھیں جن کے بیٹے بیویوں کے غلام ہو کر اپنی ماؤں کو ایسی جلی کٹی سناتے تھے کہ سننے والے کو منہ میں انگلی دبا کر رہ جانا پڑتا تھا۔ ایسے بیٹے پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ بس یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اکیلا رہے گا۔ دم کا دم، نہ دھوکا نہ غم ——— یہی اُس کا فلسفہ تھا پھر بھی لاری کے لیے اُس کی محبت اُمڈی پڑتی تھی۔

بُدھ سنگھ کا چہرہ کبھی اداس نہ ہوتا۔ اُس کی آواز میں کبھی تکان کا گمان نہ ہوتا۔ یہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ دوسرے لوگوں سے کتنا مختلف ہے، ایک طرح سے وہ چڑیں گھنٹے کا نوکر تھا۔ نوکری میں ناغے کا تو سوال ہی نہ اٹھ سکتا تھا۔ گگی کی ماں کو کبھی اُس پر جرمانہ کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ بلکہ وہ تو اس بات کے انتظار میں رہتی کہ کبھی تو بُدھ سنگھ بھی چھٹی مانگے۔ کبھی تو چھٹی بھی منانی چاہیے۔ گگی کی ماں اُس سے کہا کرتی "جینے میں ایک بھی چھٹی نہ منائے تو انسان کی زندگی میں گھن لگ جائے!" لیکن بُدھ سنگھ تھا کہ اُسے گھن کا ڈر نہ تھا۔

گگی کی ماں کی ساس بھی تو اسی کوٹھی میں رہتی تھی۔ صحیح معنوں میں بُدھ سنگھ گگی کی ماں کی ساس کا نوکر تھا۔ جنہیں ہر کوئی احترام سے بھابو جی کہہ کر پکارتا۔ بھابو جی پر تو بُدھ سنگھ جان دیتا تھا۔ جب بھابو جی کبھی بیمار پڑتیں تو بُدھ سنگھ آدھی رات کو اُٹھ اُٹھ کر پوچھتا "بھابو جی! کچھ چاہیے تو نہیں؟" بھابو جی اُسے بیٹے سے بڑھ کر سمجھتی تھیں۔ اس لیے کبھی بُدھ سنگھ کسی بات سے جھنجھلا کر تھوڑا ناراض بھی ہو جاتا تو بھابو جی بُرا نہ مانتیں۔ اُن کا خیال تھا کہ بُدھ سنگھ دل کا سچا ہے۔ اُس کی بات چیت کا کھردرا پن بھابو جی کو ذرا بھی تو نہ اکھرتا۔ کیونکہ بُدھ سنگھ نے اپنے منہ سے یہ بھی تو نہ کہا تھا کہ اس کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ گگی کی ماں بُدھ سنگھ پر اس لیے بھی خوش تھی کہ جہاں وہ بھابو جی کا پورا خیال رکھتا ہے وہاں ضرورت پڑنے پر خاص خاص مہمانوں کے آنے پر وہ سب چیزیں تیار کر دیتا ہے۔ جن پر کشمیری رسوئیے کا ہاتھ ٹھیک نہیں چلتا۔

بھابو جی ذرا پرانے خیالات کی تھیں۔ اس لیے وہ گگی کی ماں کے کچن سے الگ اپنی رسوئی بنواتی تھیں۔ بُدھ سنگھ ان کا رسوئیا بھی تھا۔ اور پرائیویٹ اسسٹنٹ بھی۔ کیونکہ وہ ہر کام میں بُدھ سنگھ کی صلاح لیتیں۔ گگی کی ماں کے بارے میں اُن کی رائے بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر کوئی اُن کی سگی بیٹی بھی ہوتی تو شاید اُن کی اتنی سیوا نہ کرتی۔ بھابو جی بھابو جی کہتے گگی کی ماں کی زبان سوکھتی تھی۔ بھابو جی کو سب سے بڑی حیرت تو اس بات پر تھی کہ گگی کی ماں کا جنم اس قوم میں ہوا جس کی اس دیس پر حکومت رہی۔ لیکن کس طرح اُن کے بیٹے کے ساتھ انگلینڈ سے یہاں آنے پر اس نے اپنی طبیعت کو اس دیس کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ کس طرح وہ یہاں کے موسم میں رچ بس گئی تھی۔ یہ بات سمجھ بہت بڑی تھی۔ اس دیس میں آنے کے بعد بھابو جی کے بہو بیٹے کو کچھ کم کش مکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ بھابو جی نے اپنی بہو کے ماتھے پر تیوری دیکھی ہو۔ خیر اب تو اُن کی زندگی ایک ڈھب پر آ گئی تھی۔ گگی کی ماں ڈالروں کے لالچ میں پروفیسر تھی۔ اور گگی کے پتا جی پھر سے وہ میگزین نکالنے جا رہے تھے۔ جس کے ذریعے انہوں نے انگلینڈ سے لوٹنے پر اس دیس کی بہت بڑی خدمات سرانجام دی تھیں اور جسے اقتصادی وجوہات کے باعث بند کر دینا پڑا تھا۔ بُدھ سنگھ پر گگی کے پتا جی بھی بہت خوش تھے اور بھابو جی کے کمرے میں بیٹھ کر وہ اکثر کہا کرتے "دیکھ بُدھ سنگھ! تیری بڑی بڑی ذمہ داری ہے کہ بھابو جی کا سارا کام تیرے

ذرا سے رکھا ہے: اور بھابی جی کہتیں: بیٹا! جیسے تم میرے بیٹے ہو ویسا ہی بدھ سنگھ بیٹا ہے۔ میری بس ایک ہی اچھا ہے کہ بدھ سنگھ بیاہ کرا لے۔ اس کی بھی ایک بیٹی ہو گئی جیسی! گھی کے بنا جی کہتے: واہ بھابی جی۔ ڈگری کرا کر بدھ سنگھ کی ڈھائی ہزار کی۔ اتنا تو بے چارے نے جوڑا بھی نہ ہوگا۔ بدھ سنگھ یہ سنتا تو کچن کی طرف چلا جاتا۔ اور اس وقت اگر کنواری لڑکی سے دل اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ کنواری پوچھ رہی ہے "تم کب بیاہ کراؤ گے، بدھ سنگھ؟" وہ کچن سے باغیچے کی طرف چلا جاتا۔ جیسے بیاہ کی بات کو ان سنا کرنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی جدوجہد کر سکتا ہو۔

وہ کئی بار رات کو دبے پاؤں بھابی جی کے کمرے میں جاتا اور سوتے میں اس کا گمبھیر چہرہ دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوتی۔ دبے پاؤں وہ اس کمرے سے چلا آتا۔ بھابی جی کا مذہب وہاں تک اس کی آنکھوں میں تیرتا رہتا۔ ان کی گہری بھوری اور بھدی آواز جیسے اس وقت اس کے کانوں میں بجا کرتی۔ یہی ہو۔ اسے خیال آتا کہ سوتے سے ایک لمحے کے لیے جاگ کر بھابی جی اس سے یہی کہیں گی: بدھ سنگھ! اب تو تمہیں بیاہ کر لینے میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ وہ جواب کے لیے تیار رہتا: نہیں بھابی جی! یہ نہیں ہو سکتا۔ جس نے ہمیشہ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا ہو وہ بیاہ کر لے، میں تو آزاد ہوں!

کچن کے برآمدے میں کھڑے کھڑے کبھی کبھی بدھ سنگھ اپنے دل سے باتیں کرتے کرتے اونچی آواز میں کہنے لگتا: کنواری رہنا اچھا ہے۔ ایک ساتھ، اور اندازے میں کہتا کہ میں دن ان اندازوں کو بیتا ہوتا ہے۔ آدھے دن کنواری سیتی ہے، آدھے دن کنوارا رہتا ہے۔ لیکن عورت اور مرد کبھی اپنے کام انٹ شنٹ کر نہیں کرتے۔ اسی لیے تو بیاہ مصیبت ہی جاتا ہے۔ نہیں بھابی جی نہیں۔ بدھ سنگھ بیاہ نہیں کرائے گا۔ بدھ سنگھ اتنا بدھو نہیں ہے کہ اپنے پیروں میں ایک انجیر ڈال لے۔ بھابی جی! پھر بدھ سنگھ آپ کی سیوا بھی نہیں کرے گا۔ بدھ سنگھ اسے بیاہ کرنے کو نہ کہنا بھابی جی!

کنواری کی زد پہنچ بدھ سنگھ کو بہت پیاری لگتی تھی۔ کنواری کے پیر بھی تو زرد تھے۔ ان کے بارے میں بدھ سنگھ مزے لے لے کر وہ قصہ چھیڑتا: کنواری کے پیر اچھے نہیں ہیں۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے جب کنواری کے پیر اچھے ہوتے تھے۔ وہ مور کے سامنے ناچنے لگی۔ مور نے خوش ہو کر کہا: مانگ لے کنواری جو تیری اچھا ہو۔ کنواری نے مور سے کہا: تم میرے ساتھ اپنے پیر بدل دو۔ مور نے سوچا کہ کچھ دیا ہے تو پکا کرنا چاہیے۔ بس جی مور نے اپنے پیر کنواری کو دے دیئے اور کنواری کے پیر لے لیے۔ آج تک مور کو اس بات کا افسوس ہے یہ سودا بے ضرورت کا رہا۔ کنواری تو مور کے پیر لے کر پہلے سے کہیں زیادہ سندر ہو گئی اور مور اب تک روتا ہے۔ جب بھی روتا ہے اپنے پیروں کو دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے۔ میں اتنا سندر ہوں لیکن میرے پیر کتنے بھدے ہیں! اور اگر اسے اوپر لڑکی پر بیٹھی ہوئی کنواری نظر آ جاتی تو وہ پکار کر کہتا: تو بڑی چالاک تھی۔ تو نے مور کے پیر اڑا لیے بات بات میں۔ واہ وری میری چھبیلی کنواری! واہ وری چھبیلی! کنواری کے پاس سوا پاؤں بھورے نہ ہوتے تو زرد چھکا اور زرد پیر اتنے خوب صورت نہ تھے۔ یہ سوچ کر بدھ سنگھ مٹکتی ہوئی کنواری کی طرف دیکھتا رہتا۔

بھابی جی اکثر بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنتیں اور سمجھتیں: اس طرح تو تیرا دماغ پھر جائے گا بدھ سنگھ! تو اپنے آپ سے باتیں نہ کیا کر۔ لیکن بدھ سنگھ کہتا: میرے گورو مہاراج کا کہنا ہے بھابی جی، کہ اچھا جیسا ایسے ہی ہے جیسے کھیرے کا کھانا۔ جیسے کھیرے کو ایک سرے سے تھوڑا سا کاٹ کر اور اس ٹکڑے کو باقی کھیرے پر اسی جگہ جہاں سے وہ کاٹا گیا ہے گھسا کر کھیرے کا کڑوا پانی نکال دیا جاتا

ہے۔ ایسے ہی آدمی کو ایکانت میں اپنے من سے باتیں کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے جینے کا لڑوا پانی اور تمام ذہر نکالا جا سکتا ہے۔ بھابھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ بدھ سنگھ یہ نہ سمجھ سکا کہ بھابھی کیوں ہنس رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بھابھی اور سے بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنتیں: "گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ کئی باتوں میں انسانوں سے پرندے اچھے ہیں۔ اور کئی باتوں میں پرندوں میں بھی وہی بیماری پھیلی ہوئی ہے جو انسانوں میں۔ اب کوئی کوؤں سے پوچھے کہ وہ گٹاریوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوؤں اور گٹاریوں کی دوستی ہو جائے۔ یہ دوستی کیسے ہو۔ اس کا اپائے تو گورو مہاراج کے پاس ضرور ہوگا؟"

گلی کی ماں چائے کی میز پر اپنے خاوند سے بحث میں الجھ کر گرم ہو جاتی یا جب ایسے موقعوں پر گلی کے پتا جی کسی بات پر جھنجھلا اٹھتے تو بدھ سنگھ بھابھی سے بات کرتے ہوئے کہتا: "گورو مہاراج کا کہنا ہے بھابھی کہ کھانے کو کہیں میں پانی کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا چاہے کہیں میں من بھر کھانڈ ڈال دیں۔" بھابھی کہتیں: "تو کہنا کیا چاہتا ہے بدھ سنگھ؟" وہ بات کو ٹالتے ہوئے کہتا: "بھابھی، میں پوچھتا ہوں۔ کیا گٹاری اور گٹار میں بھی ان بن دستی ہوگی؟" بھابھی ہنس کر کہتیں: "تو پاگل ہو جائے گا، بدھ سنگھ! جب دیکھو گٹاری کی بات۔ گٹاری تیرے دماغ پر بیٹھ گئی ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس کے جواب میں اتنی بدھی ہانکتے ہوئے وہ کہتا: "بھابھی، سانپ کے بچے کبھی انسان کے دوست نہیں ہو سکتے چاہے انہیں من بھر دودھ پلایا جائے۔" بھابھی حیرت سے بدھ سنگھ کی طرف دیکھتیں۔ بدھ سنگھ کی آواز سیٹی کی طرح گونجتی۔ بھابھی سوچتیں کہ بدھ سنگھ میں ایک ہی کمی رہ گئی۔ وہ پڑھا لکھا ہوتا تو بڑے بڑوں کے کان کترتا۔

جب سے بھابھی نے چار پانچ مرتبہ بدھ سنگھ کو گٹاری کا ذکر کرنے سے روک دیا تھا وہ ان کے سامنے گٹاری کا ذکر کرتے جھجکنے لگا تھا۔ وہ اوپر کھڑکی پر بیٹھی بری گٹاری سے پکار کر کہنا چاہتا کہ اب اسے کہیں دوسری جگہ گھونسلا بنا لینا چاہیئے۔ جب کوئی کسی کو دیکھنا چاہے تو اس شخص کو چاہیئے کہ اس گھر سے الگ ہو جائے۔ بس گٹاری کو بھی اپنا گھونسلا بدل لینا چاہیئے۔

لیکن گٹاری اپنا گھونسلا بدلنے کو تیار نہ ہوتی۔ گٹاری کی آواز اسے پیاری نہ لگتی۔ بدھ سنگھ اس کے لیے بھی اپنے دل کو سمجھاتا۔ جب بھابھی ناراض ہوتی ہیں تو انہیں ناراض کرنے سے کیا حاصل۔ گٹاری کی آواز میں کون سے ذرے رکھے ہیں؟ آخر کسی پرندے کی آواز انسان کے دماغ پر کیوں چھا جائے؟ ویسے تو انسان اور پرندے بھائی بھائی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی سورج چمکتا ہے۔ لیکن بھابھی کی بات بھی ٹھیک ہے۔ ہر وقت ایک ہی بات کے پیچھے پڑے رہنے سے انسان پاگل ہو کر موت دیتا ہے۔ ہر وقت گٹاری کی غمگین آواز کو دماغ پر دستک دینے کی اجازت کیوں دی جائے؟ انسان کا دماغ جتنا جلا رہتا ہے اتنا ہی فائدہ مند ہے۔ بدھ سنگھ نے فیصلہ کر لیا کہ بھابھی کے بچنے کے مطابق چلے اور اپنے دماغ کو ہر خطرے سے بچا کر رکھے۔

اب گٹاری اوپر کھڑکی پر بیٹھی رہتی۔ بدھ سنگھ مچل کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ گٹاری کی آواز سے اب اسے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت بھی کم کر رہا تھا کیونکہ بھابھی کی صاف اور واضح رائے یہی تھی کہ ایسا کرتے رہنے سے بدھ سنگھ پاگل ہو جائے گا۔ وہ پاگل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صبح کی چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے گلی کی ماں کھڑکی پر بیٹھی گٹاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گلی سے کہتی: "وہ دیکھ گٹاری۔ تیری گٹاری گلی گٹاری کے پیچھے بھاگتی اور اسے پکڑنے کی کوشش کرتی۔ گٹاری ہاتھ نہ آتی۔ لیکن وہ بار بار چائے کی میز کے قریب آ کر بیٹھتی

اور اپنی مخصوص آواز میں بولتی۔ گی کی ماں خوش ہو کر گی کو گدگداتی۔ گی دوبارہ گاڑی کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتی۔ بچی کو اپنی کوشش میں ناکامیاب پا کر گی کی ماں کہتی: "بدھ سنگھ، گی کی مدد کرو۔"

بدھ سنگھ زور سے ہنستا۔ لیکن وہ آگے بڑھ کر گی کی مدد نہ کرتا۔ گی گاڑی کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اچھلتی کودتی۔ گاڑی ہاتھ نہ آتی۔ بدھ سنگھ کچن کی طرف چلا جاتا۔ گی کی ماں آ کر جا کر کہتی: "گی کی مدد کرو کیا؟"

"ہم کیا مدد کر سکتا، بی بی جی؟" وہ ہنس کر کہتی۔

ایک دن گی کے پتا جی نے بدھ سنگھ سے کہا: "دیکھو بدھ سنگھ! ایک بار گاڑی کو پکڑ کر گی کے ہاتھ میں تھما دو، پھر چاہے گی جتنی دیر چلاتی رہے۔ گی بہت للچاتی ہے۔ وہ ایک دو منٹ تک گاڑی کو چھو چھو کر دیکھ لے گی۔ پھر وہ خود ہی لے گی۔ گاڑی کو چھوڑ دو بدھ سنگھ۔"

بدھ سنگھ مالک کا حکم نہ ٹال سکا۔ وہ گاڑی کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن گاڑی اس کے ہاتھ نہ آئی۔ گی کے پتا جی ہنس ہنس کر اسے بڑھاوا دیتے رہے: "پکڑو پکڑو وہ گئی گاڑی۔"

گی کی ماں کو یہ کھیل پسند نہ آیا۔ وہ خفا ہو کر بولی: "رہنے دو، بدھ سنگھ! یہ ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں؟" گی کے پتا جی بولے۔

"اس میں بجٹ کی تو جگہ نہیں۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ بجٹ کی جگہ ہے؟"

"گاڑی کو تنگ کرنے سے کیا حاصل؟"

"تنگ کون کرتا ہے؟"

"تو یہ کیا ہے؟"

"یہ تو دوستی کی جا رہی ہے۔"

بدھ سنگھ میرے پاس آیا تھا۔ وہ حکم کے انتظار میں کھڑا رہا۔ گی اٹھ کر گھاس پر لیٹ گئی تھی اور رو رہی تھی۔ گی کے پتا جی نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا۔ بولے: "گاڑی ہاتھ نہیں آتی تو نہ سہی۔ بدھ سنگھ! ایک کام کرو۔ بانس کا لمبا زینہ لگا کر گاڑی کے گھونسلے میں جھانک کر دیکھو۔ اگر گاڑی کے انڈوں سے بچے نکل آئے ہوں تو گاڑی کا بچہ نکال دو اور ایک منٹ کے لیے اسے گی کے ہاتھ پر رکھ دو۔ وہ اتنے سے خوش ہو جائے گی۔ پھر تم گاڑی کے بچے کو واپس گھونسلے میں رکھ آنا۔"

بدھ سنگھ لپک کر بانس کا زینہ اٹھا لایا اور اسے اوپر کی منزل کے کونے والے غسل خانہ کی دیوار سے لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ گی کی ماں نے چلا کر کہا: "پہلے میرے پاس آؤ، بدھ سنگھ!"

بدھ سنگھ زینے سے اتر کر گی کی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

گی کی ماں نے آواز دی: "آیا!"

آیا دوڑ کر آئی۔ گی کی ماں نے کہا: "گی کو اندر لے جاؤ۔"

گلی نے پتاجی کی گود سے آیا کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں بھابھی باہر آئیں۔ شور سن کر وہ گھبرا گئی تھیں۔ بولیں "کیا جھگڑا ہے؟"

"جھگڑا کچھ نہیں بھابھی!" گلی کی ماں نے اپنے خیال کی تائید چاہتے ہوئے کہا: "بدھ سنگھ گٹاری کا بچہ لینے جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں گٹاری ناراض ہو جائے گی۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، گٹاری کا بچہ اٹھانے سے گٹاری تو ناراض ہو گی ہی۔" بھابھی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

بدھ سنگھ خاموش کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کا حکم مانے۔ بھابھی اور گلی کی ماں کا یا گلی کے پتاجی کا۔ اس نے تو گٹاری کا ذکر اس لیے چھیڑ رکھا تھا اور تین چار روز سے اوپر کھڑکی میں بیٹھی گٹاری کی طرف دیکھنے تک کی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ پاگل کو رعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ سیدھی اور ستھری زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ وہ کسی طرح کی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ عورت کے لیے اس کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی تو یہ گٹاری کدھر کی جادوگرنی تھی۔ بھابھی نے پہلے بتا دیا ہوتا تو وہ گٹاری سے آشنائی نہ بڑھاتا۔ خیر اب تو اسے گٹاری کی آواز میں کسی طرح کی ننگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب گٹاری کی صورت اس کے تصور کو سہلانے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اس کے پٹھوں کو چھو تک نہ سکتی تھی۔ اور بھی تو پرندے تھے، بلبل تھی، مینا تھی۔ گڑ تھا اور وہ پہاڑی پرندہ بھی تھا جو پہاڑ کے شروع میں پہاڑوں کی طرف جانے سے پہلے سری نگر کے باغوں میں چہکنے کے لیے آ جاتا تھا۔ جس کی جسم ہست بھی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اور بھی بہت سے پرندے تھے ایک گٹاری ہی تو نہ تھی۔

کچھ لمحوں کے لیے چائے کی میز پر خاموشی رہی۔ گلی کے پتاجی نے ٹوک کر کہا: "بدھ سنگھ! تم یہ کام نہیں کر سکتے تو مجھے دوسرا انتظام کرنا ہو گا۔"

"جی صاحب!" بدھ سنگھ چونک کر زینے کی طرف بڑھا۔

گلی کی ماں خاموش تھی۔ بھابھی بھی کچھ نہ بولیں۔ بدھ سنگھ زینے پر چڑھ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے واپس آ کر کہا۔ "جی صاحب! میں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ میرا پہلے بھی یہی خیال تھا۔ گٹاری کو انڈے دیئے ہیں دن ہی ہوئے ہیں۔ ابھی پانچ دن اور لگیں گے، پھر جا کر انڈوں سے دو ننھے منے بچے باہر نکلیں گے۔"

"اچھا تو پندرہ دن اور انتظار کر لیتے ہیں۔" گلی کے پتاجی نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "ہماری گلی اچھی لڑکی ہے۔ وہ گٹاری کے بچے سے ضرور دوستی کرے گی۔"

بھابھی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ گلی کی ماں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ گلی کے پتاجی نے ان کی طرف دیکھا، اور ہنس کر کہا: "ہم زبردستی کرنے کے قائل نہیں۔ پانچ دن بعد گٹاری کے انڈوں سے دو بچے باہر نکلیں گے۔ جب وہ دس روز کے ہو جائیں گے ہم گٹاری کے بچے سے گلی کی ملاقات کرائیں گے۔"

"بہت اچھی بات ہے!" بھابھی نے ہنکار لگائی۔

"مجھے بھی اعتراض نہیں ہے۔" گلی کی ماں نے کالج میں پڑھنے والی کسی لڑکی کی درخواست قبول کرنے کے انداز میں کہا۔

گلی اپنے پتاجی کی گود سے اتر کر آیا کی طرف بھاگ گئی۔

بدھ سنگھ نے پرانی عادت سے بے قابو ہو کر کہا: جی صاحب! میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ گاڑی ہمیشہ دو ہی انڈے دیتی ہے۔ سال میں ایک بار۔ پورے پچیس دن وہ اپنے انڈے سیتی ہے۔ آدھا وقت گاڑی سیتی ہے اور آدھا وقت گاڑ۔ یہ نہیں کہ اکیلی گاڑی پر ہی سارا بوجھ ڈال دیا جائے!"

"ہاں ہاں، بدھ سنگھ! تمہارا حساب کبھی غلط نہیں ہو سکتا!" گلی کے پنساری نے مذاق کرتے ہوئے کہا: "اس جھگڑے میں چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اب یہ چائے نہیں لیتی ہے، پھر سے لاؤ۔ ایک دم گرم!"

دوبارہ چائے آئی تو گلی کی ماں بولی: "گاڑی نے کتنی اونچی جگہ گھونسلا بنایا ہے!"

"اب ذرا گاڑی کو بیچ میں نہ لاؤ!" گلی کے پنساری بولے: "ورنہ چائے پھر ٹھنڈی ہو جائے گی!"

گلی کی ماں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ تیار کر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں تھمایا۔ پھر اس نے اپنا کپ ہونٹوں سے لگانے کے بعد سنجیدگی سے کہا: "جس کمرے میں میں لڑکیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی ہوں وہاں روشن دان میں گاڑی نے اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ پچھلے سال، ایک دن میں لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی۔ اچانک اوپر سے دونوں انڈے ایک لڑکی کے سر پر گرے اور ٹوٹ گئے۔ ظاہر ہے بے چاری لڑکی کا چہرہ خراب ہو گیا۔ سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ میری طبیعت پر بہت زبردست دھچکا لگا۔ میں اس دن پیریڈ نہ لے سکی۔ اس لڑکی نے غسل خانہ میں جا کر اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا، اور باقی لڑکیاں سنجیدہ ہو کر پڑھنے کے لیے تیار تھیں۔ لیکن میرے دل پر جیسے ہاتھوڑے سے چوٹ پڑ رہی تھی!"

"تم بہت حساس ہو، یہ مجھے معلوم ہے!"

"وہ واقعہ مجھے اب تک غمگین بنائے ہوئے ہے!"

"اب تو یہ خطرہ بات ہے کہ ایک برس پہلے کے واقعہ پر آنسو بہائے جائیں!"

"انڈے گر کر ٹوٹ گئے تو گاڑی کا جوڑا کمرے میں دیوانہ وار منڈلاتے رہا تھا۔ ان کی چیخ و پکار کئی دن تک سنائی دیتی رہی تھی جیسے ان کے انڈے توڑنے کا گناہ ہم سے سرزد ہوا ہو!"

"اب اس غم کو بھلا دینا ہی ٹھیک ہو گا!"

"اس غم کا دھندلا سا ہوتا ہے میرے دماغ میں۔ اس وقت بھی بے چین ہو جاتی ہوں!"

"یہ تو وہی بات ہوئی جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ——— سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!"

کچھ لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ بدھ سنگھ جاپانی کے پلنگ کے قریب کھڑا ہی ہی سی نگاہوں سے چائے کے میز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ گلی کی ماں کو دلاسے کے لیے کہہ سکتا کہ پچھلے غم بھول جاؤ، آنے والے غم کی فکر کرو۔ وہ حیران تھا کہ جاپانی کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب انسان بھی اپنی زندگی کا مالک نہیں رہا، پرندے اپنی زندگی کے مالک بننے کی اہلیت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی ہے تو ایک نہ ایک غم لگا رہے گا۔ ایک نہ ایک ظلم، ایک نہ ایک ناانصافی۔ زندگی پیریڈ کی میں نہیں ہے زیادہ گہرا تجربہ زندگی ایک سڑک ہے جس پر پیدل چلنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ گورو مہاراج نے کہا ہے، زندگی کا مطلب ہے جلنی کا نام گاڑی، اور گورو مہاراج کا یہ بھی تو کہنا ہے ——— سرو دکھ کا گھر ہے سب پرتی۔ انسان نے کوئی چیز کم کر دی ہے وہ چیز ہے انسانیت۔ گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ انسانیت بہت زیادہ ویرلم نہیں رہ سکتی۔ انسان صداقت کو جھٹلا رہا ہے، انصاف کو آواز دے رہا ہے۔ صداقت کسی دوسرے کی جیب کا سکہ نہیں ہے

انصاف کسی پہیلی کا نام نہیں ہے۔ صداقت کے بنا انسان سانس نہیں لے سکتا۔ انصاف کے بنا علم اور ریت کھوٹ کی جڑ نہیں اکھڑ سکتی ..... اور اسے محسوس ہوا کہ گلی کی ماں معمولی عورت نہیں ہے۔ جسے گاری کے برس بھر پہلے کے درد و غم کا تصور آج بھی غم گین بنائے ہوئے ہے۔

ایک ایک کر کے تین دن گزر گئے۔ گلی کے پتا جی ہر روز صبح کی چائے پر بدھ سنگھ کو یاد دلاتے کہ زینہ لگا کر گاری کے گھونسلے پر جھانک کر دیکھے کہ انڈوں سے بچے نکل آئے یا نہیں۔

"جی صاحب! میرا حساب غلط نہیں ہو سکتا ہے۔ گورو مہاراج کا پرتاپ ہے۔" بدھ سنگھ جواب دیتا۔ "بھگوان نے چاہا تو پانچویں دن گاری کے انڈوں سے بچے باہر آ جائیں گے۔ اور پھر دس روز کی کوئی شرط نہیں دو تین دن بعد بھی گاری کے بچوں سے گلی کی دوستی کرائی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے" گلی کے پتا جی کہہ اٹھتے۔

گلی کی ماں خاموش رہتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بھاؤ جی سے تائید چاہتے ہوئے کہتی: "میں کہتی ہوں کہ یہ خیال چھوڑ دیا جائے ایسی کیا مصیبت پڑی ہے کہ اتنی اونچائی سے گاری کے بچے نکال کر گلی کو دکھائے جائیں۔ تھوڑا وقت بیتنے پر گاری کے بچے خود بخود اڑ کر چلنے کی عمر کے قریب پہنچ کر نیچے اتر آئیں گے۔"

"اب یوں روڑا مت اٹکاؤ ڈارلنگ!" گلی کے پتا جی نے گردن گھماتے ہوئے کہا: "بدھ سنگھ گاری کے انڈوں سے بچے نکلنے کے بعد ان کا پورا خیال رکھا کرے گا۔ اپنے کام کے ساتھ وہ یہ کام بھی اسے کرنا ہوگا۔ آخر گاری نے ہمارے گھر میں گھونسلہ بنایا ہے تو ہم اسے یونہی نہیں سمجھتے۔ اس میں بھی وہی زندگی پلتی ہے جو ہمارے اندر سانس لیتی ہے۔ کیوں بدھ کچھ جھوٹ ہے؟"

پانچواں اور چھٹا دن بھی گزر گیا۔ یعنی بیس اور پانچ پچیسواں اور چھ اور بیس چھبیسواں دن۔ ابھی تک گاری کے انڈے اسی طرح پڑے تھے۔ ستائیسویں دن بدھ سنگھ نے کسی قدر شرمندہ ہو کر کہا: "گورو مہاراج کا کہنا جھوٹ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن انسان کا حساب غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن گورو مہاراج کی دعا رہ جائے گی اگر آج گاری کے انڈوں سے بچے نکل آئیں۔"

گلی کی ماں کا رنگ جل گئی۔ گلی کے پتا جی کسی طوفانی سے گفتگو کر رہے تھے۔ بدھ سنگھ دوڑتا دوڑتا آیا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھا۔ بولا

"جی صاحب! ابھی ابھی سانپ ادھر سے نکل کر گیا ہے؟"

گاری کا جوڑا رسوئی کے بغلی والے پیڑ پر بیٹھا چیخ و پکار کر رہا تھا: "ان پرندوں پر کیا مصیبت آ گئی؟" طوفانی نے جھنجھلا کر کہا "یہ کیا نخرے ہیں؟ کتنے روز تک ہیں وہ لوگ جو پرندوں کی بولی میں خوشی کی تھپکی ڈھونڈا کرتے ہیں؟"

"یوں شاعروں پر نشتر زنی تو نہ کیجئے" گلی کے پتا جی ہنس کر بولے: "زندگی کا نغمہ خالی ایک سُر سے نہیں بنتا۔ غم و الم بھی زندگی کی ساز داری کے واضح اور ضروری سروں کو ترتیب دیتے ہیں۔ کچھ سُر مسرت آگیں ہوتے ہیں تو کچھ غم انگیز۔ کچھ سُر جانی پہچانی آواز کی داغ بیل ڈالتے ہیں تو کچھ سُر اجنبی کی طرح دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ مستقبل کے چہرے سے نقاب اٹھانے والے سُر ہمیشہ دوشالہ پوشی پہنے رہتے ہیں۔ صبح و استقبال کے سُر زندگی کے بارے میں فرمائش پوری کرنے والے سُر شخصیت پر طنز کسنے والے سُر ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاری کی ابتدا پرندوں کی بولیوں کی نقل اتارنے کی جستجو سے ہوئی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس کے بارے میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔" ملاقاتی نے ہنس کر کہا۔

گاڑیوں کا جو ہونا چاہا تھا۔ جیسے اُن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ بدھ سنگھ پرے سے لٹھ اٹھا کے آیا۔ بولا: "گاڑیوں کا بدلا میں نے لے لیا۔ آخر گورو مہاراج کے آشیرباد سے میں نے سانپ کی سری توڑ ڈالی ہے۔ گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ جب سانپ مرتے مرتے کہتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہے بھگوان مجھے ایسے انسان کی شکل دکھا جو مجھ پر ہاتھ اٹھائے تو میری سری ضرور توڑ ڈالے تاکہ مجھے زخمی ہو کر ادھر ادھر نہ بھٹکنا پڑے۔ سری ٹوٹنے سے مرنے پر سانپ دوسرے جنم میں انسان بنتا ہے۔"

"اسی لیے شاید کچھ انسان سانپوں کے بھائی ہوتے ہیں۔" ملاقاتی نے طنز کی۔

"یہ سانپ گاڑیوں کے گھونسلے میں گھس کر ان کے انڈے کھا گیا۔" بدھ سنگھ بولا۔ "گاڑیاں چلاتی رہ گئیں، چلنے وہ بھی نہ سکا۔"

گھی کی ماں کالی سے آئی تو گاڑیوں کی بے بسی کی کہانی سن کر اضطراب سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔ گاڑیوں کے دو انڈے پچھلے سال ریلوے کے کالی میں انگریزی کے پیڑ میں روشن دان سے گر کر ٹوٹ گئے تھے، وہ انڈے یہ تھے جنہیں آج سانپ کھا گیا تھا۔ "ہمارے گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ گاڑی پہلے عورت ہوتی تھی۔" بدھ سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا: "گاڑی کی مصیبت اب بھی کچھ کم نہیں۔ وہ لاکھ گردن جھکا کے، لاکھ چلنے کا جتن کرے، زندگی کا قدم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس پر بھی گاڑی انڈے دینے سے باز نہیں آتی۔"

زینو

ابو سعید قریشی

اس کا جھونپڑا وادی کے دہانے پر واقع تھا، جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا، صرف اس کی باتیں سنی تھیں۔ رات کو جب وادی دودھیا دھند کی لپیٹ میں چھپ جاتی تو اس کا باپ حقہ سلگا کر بیٹھ جاتا اور چراغ کی لو پر نظریں گاڑے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اس کی دھوئیں میں لپٹی باتیں سن کر احساس ہوتا کہ شاید اس کا حقہ باتیں کر رہا ہے۔

"تیری ماں وادی کی سب سے حسین دوشیزہ تھی۔ بالکل تجھ جیسی۔ میں اسے یہیں بیاہ کر لایا تھا، اسی جھونپڑے میں۔ شہد کی مکھیاں اسے کبھی ڈنک نہیں مارتی تھیں۔ بالکل تیری طرح۔ اور اس کے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی برکت تھی۔ تیری اس گوری گائے کی ماں جو گوالوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیا کرتی تھی، بکری ہی تو بن جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا گنگناتی تھی اس کے کان میں۔ جب چاہو دودھ لو ——— مرغیاں تھیں تو وہ جیسے کڑک بیٹھنا ہی نہیں آتا۔ ٹوکری بھری رہتی تھی انڈوں سے اور جتنے انڈے بٹھاؤ اتنے ہی چوزے نکلتے تھے ——— تیری چنبیلیاں بھی تو ویسی ہی ہیں ——— اور انگور، سیب، اخروٹ، خوبانی کا تو یہ حال تھا کہ منڈی میں بیچ کر بھی بانٹنے کو بچ رہتا تھا ..... وہ جب کشیدہ لے کر بیٹھتی تھی تو تتلیاں بھول پڑتی تھیں کہ سچ مچ کے پھول ہیں ——— تیرے ہاتھوں میں بھی وہی بات ہے ——— مگر سوچتا ہوں کہ جب ان ہاتھوں میں مہندی لگے گی، بیاہ ہوگا تیرا اور تو چلی جائیگی کسی اور کے گھر، جس طرح تیری ماں اس گھر میں آئی تھی، تو تیرے باپ کا کیا بنے گا؟"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ابا!"

"تو نہیں جائیگی پگلی کہ ایک کا گھر سونا ہو کر ہی دوسرے کا گھر آباد ہوتا ہے، اور تیرے بیاہ کی تیاریاں تو تیری ماں نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی شروع کر دی تھیں ——— مجھے تو لڑکی چاہیے ——— سات لڑکیاں چاہئیں ——— تین سسرال میں ہوں تو چار میکے میں ——— وہ ادھر آئیں تو یہ اُدھر چلی جائیں اور ان کے بچے دن بھر گھر میں کھیلتے شور مچاتے پھریں۔"

"مجھ کو بھی ایک ننھا لا دو گے ابا؟" زینو اپنے باپ کی بات کاٹتی۔ "بڈھے چناروں کے جھنڈ تلے جہانیاں کے ننھے جیسا! رونا تو آتا ہی نہیں اس کو اتنا پیار ہے کہ بس۔" اور وہ اپنے باپ کی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی "لا دو گے

نا، با ؟ ———

" مناؤں تجھے ! ——— جبھی تو کہتا ہوں کہ کاش تیری چھ بہنیں اور ہوتیں، یا پھر بھائی ہوتے ——— تو تو بس پگلی ہو گئی ہے لڑکی۔ اتنی بڑی ہو گئی پر عقل نہ آئی۔ اب میں کیسے سمجھاؤں تجھے۔ کاش تیری ماں ....."

ایسے میں کہیں دور سے چنگ کی آواز آتی یا چکور کا نغمہ گونجتا۔ شاہ بلوط کی شاخوں میں ٹڈا اپنی سارنگی بجانے لگتا اور زینو بھول جاتی کہ ابھی ابھی اس نے اپنے باپ کی فرمائش کی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھتی اور دروازہ کھول کر رات کے منظر کا جزو بن جاتی۔ وہ دھیما چاندنی میں چکوروں کے پرا دھورے خوابوں کا پیرہن پہن لیتے۔ ادھر کہیں دیوار کے پردوں کے پیچھے سے چنگ کی جھن جھن اور دیکھنے ناچوں کی گت بن جاتی ——— پن چکی کی گھر گھر، آبشار کا شور، زعفران کے کھیتوں کی مہک اور سبزے کے پراسرار اندھیرے میں جگنوؤں کی جگمگاہٹ جیسے جہانیاں کا منتا آنکھیں جھپکتا تھا ——— زینو اس تصویر کو بت بنے دیکھتی۔ یہاں تک کہ چمڑوں کے پروں میں ہوا لگنے لگی اور زینو کے بالوں کی لٹیں اس کے گالوں پر لہرانے لگتیں۔

" پگلی ہو گئی ہے یہ لڑکی !" اس کا باپ تھکے کالیا کش لگاتے ہوئے اسے آواز دیتا " بند کر دے اب دروازہ، ورنہ ہوا لگ جائے گی، اور تو تو اب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں تیری تیمارداری بھی نہیں کر سکتا "

زینو اپنی کالی کالی التجا بھری آنکھوں سے جو نیند کے باعث اور بھی کالی نظر آتی تھیں، اپنے باپ کی طرف دیکھتی، جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے یہاں سے نہ ہٹاؤ۔

" بالکل اپنی ماں پر ——— بڈھے کا سر اپنے بار بار دوہرائے ہوئے جملے کی پھر تائید کرتا " بات بہت بیت گئی زینو۔ اب سو جا بیٹی !"

زینو کے ہونٹوں پر وہی پراسرار مسکراہٹ ظاہر ہوتی جو اس کی ماں کے ہونٹوں پر نظر آیا کرتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ بہانہ یہ چکور، یہ چنگ اور چمڑوں کا نغمہ نیند میں مجھے کہاں ملے گا ؟ ——— مگر اس کا باپ چپکے سے اٹھتا اور اسے شانوں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیتا۔ اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتا اور اسے لحاف اوڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہتا۔ کاش آج اس کی ماں زندہ ہوتی۔

وہ جانتا تھا کہ زینو حسین ہے۔ وہ ابھی انگڑائی ہی جوتی تھی جب اس کے لئے پیغام آنے شروع ہو گئے تھے، لیکن اس نے ہر سوالی کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا ..... کتنے ہی آئے اور کتنے ہی یہ جواب لے کر چلے گئے۔ چنانچہ زینو جنگلوں میں ہوا کی طرح آزاد، کوہستان کی کنواری چوٹی کی طرح ناقابلِ رسا تھی، جس تک پہنچنے کی آرزو میں کتنے جوگی، کتنے گڈریے آہیں بھر کر رہ گئے تھے ——— سفیدے کے ستونوں، چناروں کے چھاؤں، قوسِ قزح کی قناتوں، جھیلوں، آبشاروں، چشموں اور ندی نالوں کی طرح وہ بھی وادی کی تصویر کا ایک ضروری جزو تھی ———

کبھی ایک روز کلیوں، پھولوں، بھونروں اور تتلیوں کے موسم میں جب وادی سر کٹے ہوئے ساز کی طرح اپنا ازلی نغمہ الاپ رہی تھی یکایک یوں محسوس ہوا جیسے تار کھنچ گئے ہوں اور ان پر کسی نے اٹا سیدھا کر دیا ہو۔ زینو اس روز پہاڑ کے دامن میں خودرو گلاب کے گھنے گوندھ رہی تھی اس آواز سے وہ چونک پڑی۔ کوئی چنگ تو نہیں گھس گیا تھا ؟ ——— نہیں، یہ پن چکی نہیں

تھی! پتھروں پر پریوں کے آبشار کا شور بھی نہیں تھا! وہی کے منگلوں میں بلبل کی آواز بھی نہیں تھی! چرخے کی گھوں گھوں بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔

اس نے افق پر نگاہ دوڑائی اور دور آسمان پر سیاہی کا دھبہ نظر آیا۔ سیاہی کا یہ جھیل برابر نشان قریب آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خوفناک آواز بڑھتی گئی۔ پہاڑوں کے پتھر لرزنے لگے۔ زیتو خوف سے بت بنی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا بلا ہے؟ ایک مرتبہ اسے ٹڈی دل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اتنی بڑی بڑی ٹڈیاں جن کے پر اس کے جھونپڑے کی چھت سے بھی بڑے تھے، وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ نہیں یہ ٹڈیاں نہیں ہو سکتی تھیں! ایک بڈھے سیاح نے جو وادی سے گزرتے وقت ان کے یہاں ٹھہرا تھا، حبشیوں کے وطن کا حال سناتے وقت بتایا تھا کہ وہاں اتنے بڑے بڑے گدھ ہوتے ہیں کہ غزالوں کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لے جاتے ہیں ——— اس تصور سے وہ سہم گئی اور سورج مکھی کے پودوں میں ایک پتھر سے لپٹ گئی ——— اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بچپن میں جب وہ کوئی خوفناک کہانی سنتی تھی تو لحاف سے منہ ڈھانپ کر اپنے باپ سے لپٹ جایا کرتی تھی اور اس کا خوف دور ہو جاتا تھا۔

"زیتو! گدھوں کے شور کو چیرتی ہوئی اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی "تم کہاں ہو زیتو؟"

لیکن زیتو کی آواز حلق میں سوکھ گئی۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا مگر سورج مکھی کی کیاریوں میں جہاں وہ چھپی ہوئی تھی گدھوں کے پروں کے سائے تیر رہے تھے ——— پتھر کے گرد اس کی باہوں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا۔

اپنی آواز کا جواب نہ پا کر زیتو کے باپ نے اپنی بیٹی کی ہرنی کے بچے کو جسے پھولوں کی کیاریوں کو بچانے کے لئے کبھی کبھی باندھ دیا جاتا تھا، کھول دیا۔ آہو بھاگا اور اس کے گھنگھروؤں کی آواز پر زیتو کا باپ سورج مکھی کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔

"زیتو ——— زیتو بیٹی! یہ تیری باہوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ——— ڈر گئی پگلی ——— اٹھ، وہ چلے گئے۔"

گدھ اب وادی کی دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجاتے، خوشی لگاتے، جیسے شکار کا جائزہ لے رہے ہوں۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ابا کہ یہ گدھ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے" زیتو کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"ڈرو مت میری بیٹی۔ کوئی ہوا انہیں ادھر لے آئی ہے۔ اس سے پہلے بھی ہوا ٹڈی دل کو لائی تھی اور ہم نے ٹڈیوں کو مار بھگایا تھا۔ ٹڈیاں تیرے دادا کے کھیت میں اتری تھیں مگر اس نے اپنے کھیتوں میں آگ لگا کر دوسرے کھیتوں کو بچا لیا تھا۔"

اس نے اپنا قصہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ کھڈوں، غاروں، وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ایک نو قسم کا شور ہوا۔ چاروں طرف سے کسان اور گڈریے ڈھول پیٹتے، شور مچاتے اس جانب بڑھے جہاں گدھ منڈلا رہے تھے۔

"دیکھا تو نے؟" زیتو کے باپ نے کہا "اس وادی کے لوگ تیرے دادا کا احسان نہیں بھول سکتے۔ تیرے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، کبھی تالا نہیں ڈالا تو نے۔ لیکن ہمارا بھی ایک تکیہ بھی کم ہوا؟"

زیتو نے سر ہلایا کہ نہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔

"تیرے باغ سے سیب کا ایک دانہ یا انگور کا ایک خوشہ بھی کسی نے توڑا؟"

"نہیں ابا" زیتو کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔

"تیری غزالہ، تیری مرغیاں اور بطخیں۔۔۔۔۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں، کبھی کسی کا کتا بھی ان پر بھونکا؟"

"کبھی نہیں!" زیبو نے جواب دیا۔

"پھر تو جو اندھیرے سویرے جنگلوں میں یا چشموں کے کنارے گھومتی رہتی ہے، کبھی کسی نے تجھے اکیلا پا کر جھوٹ موٹ ہی سے ڈرایا ہو؟؟؟"

"قطعاً نہیں" زیبو نے کہا۔

"یہ سب تیرے دادا کی بدولت ہے۔ یہاں کے لوگوں پر اس کے اتنے احسان ہیں، اور تو دیکھے گی کہ یہ ان گدھوں کی سی طرح اڑا دیں گے جس طرح تیرے دادا کے وقت میں ڈٹی ول کی شرح آدمی یہاں سے اٹھ گئی تھی ———"

"اور میرے بچپن کی بات ہے جب برف کا طوفان آیا تھا اور ہماری جھیل تک جم گئی تھی۔ ہم برف پگھلا کر پانی پیتے تھے۔ طوفان تھا تو پہاڑوں سے ریچھوں کی یلغار ہوئی۔ سفید بھوکے برفانی ریچھوں کو جب پہاڑوں پر کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا تو وادی پر ٹوٹ پڑے تھے اور پھر وہ جنگ شروع ہوئی تھی جس کی یاد سے میرا جسم آج بھی کانپ جاتا ہے۔ آدمیوں اور درندوں کی چیخوں سے پرندے اپنے آشیانوں کو چھوڑ کر دیوانہ وار اڑ رہے تھے اور چٹانوں سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ تیرے دادا نے ریچھوں کے راستے میں جگہ جگہ الاؤ روشن کروا دیئے تھے اور ہاتھوں میں مشعلیں، لالٹیاں اور کلہاڑیاں لئے لوگ دست بدست ریچھوں سے لڑ رہے تھے ——— انہیں ایک عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ایک ریچھ کہیں پیچھے سے ہوتا ہوا ایک جھونپڑے میں، گھس آیا تھا جو اس درخت سے صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا جس کی شاخوں میں چھپا ہوا میں یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا جیسے اگلے وقتوں کے بادشاہ جھروکوں میں بیٹھے آدمیوں اور درندوں کو آپس میں لڑا دیا کرتے تھے ———"

"مگر اس ریچھ کا کیا ہوا ابا؟" زیبو نے اپنے باپ کی بات کاٹی۔ اسے معلوم تھا اگر بادشاہوں کا قصہ چھڑ گیا تو ریچھ کی کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

"ہاں تو وہ ریچھ جھونپڑے میں گھس گیا اور ایک عورت کو لے بھاگا ——— بڑا موذی جانور ہے یہ ریچھ۔"

"موذی کیا ہوتا ہے ابا؟" زیبو نے پوچھا۔

"تلوے چاٹ لیتا ہے عورتوں کے ——— میرا مطلب ہے، اب میں تجھے کیسے بتاؤں بیٹی۔ بہت بے شرم ہوتا ہے یہ۔ سمجھ لو۔ آدمی کی طرح۔ میں کیسے بتاؤں تجھے! کاش تیری ماں زندہ ہوتی اس وقت!" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ زیبو جانتی تھی کہ جب وہ اس طرح سانس لیتا ہے تو بعض اوقات ایسی چپ سادھتا ہے کہ پہروں بیت جاتے ہیں۔ مگر یہاں ریچھ کی کہانی ادھوری رہی جا رہی تھی۔

"تو ریچھ اس عورت کو اٹھا کر لے گیا، اور اس کے بعد کیا ہوا ابا؟"

"ہاں ——— مرجینا نام تھا اس کا۔ اس کی چیخ مجھے اپنے گرد کنڈلی کی طرح لپٹتی ہوئی محسوس ہوئی، اور اگر میں نے درخت کی شاخوں کو نہ تھام لیا ہوتا تو زمین پر آ رہتا۔ خیر مرجینا کی چیخ سن کر ایک آدمی جس کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی اور دوسرے میں درانتی، اڑتے ہوئے انگارے کی طرح لپکا اور اپنی درانتی ریچھ کے پیٹ میں گھونپ دی ——— یہ شخص تیرا دادا تھا بیٹی ——— زخمی ریچھ مرجینا کو چھوڑ کر تیرے دادا پر جھپٹا ——— تیرے دادا کو ورزش کا بہت شوق تھا اور یہ اس کی جوانی کا زمانہ تھا۔ بڑے

بڑے تیراکوں کا ہماری جھیل کے آدھ ہی میں سانس ٹوٹ جاتا تھا لیکن تیرے دادا نے اسے کئی بار پار کیا ہوگا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس پر ضرور خواجہ خضر کا سایہ ہے ورنہ یہ جھیل تو ایک سانس میں نہنگ سے بھی پار نہیں ہو سکتی ——"

"تو یہ کچھوے مرجینا کو چھوڑ دیا اور دادا ابا پر چھپٹا" زینو نے کہا۔

"ہاں تو تیرا دادا جانتا تھا کہ زخمی ریچھ سے بچنا محال ہوتا ہے اور جب آدمی زندگی اور موت کا فرق مٹا دے تو بعض اوقات موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس نے ریچھ کو بانہوں میں لپیٹ کر بھینچنا جو شروع کیا تو درندے کی آنکھیں اُبل پڑیں منہ کھل گیا، بازو ڈھیلے پڑ گئے، حتیٰ کہ وہ بے جان ہو کر گر پڑا۔ بعد میں وہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ جنگ میں پہلوان ہی آخری وار ہوتا ہے۔ اگر میں اس وقت سوچتا رہ جاتا تو میرا وہی حشر ہوتا جو ریچھ کا ہوا تھا۔"

دفعتہً گدھوں کا ایک اور غول سیٹیاں بجاتا ہوا گزرا۔

"اور یہ نجس پرندے!" زینو کے باپ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "میرا گویا زینو . . . میرا گویا!"

لیکن زینو جس کا خوف پھر عود کر آیا تھا، اپنے باپ کے گرد عشق پیچاں کی بیل کی طرح لپٹ گئی ——— اس کا دل اس کبوتری کی طرح دھک دھک کر رہا تھا جس کے سر پر باز منڈلا رہا ہو۔

"ادھر ہٹ کر کھڑی ہو جا بیٹی! یہ غلیظ پرندے شاید یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی جوانی میں جنگلی سوروں کے سر کچل چکا ہوں۔"

اور وہ پتھر اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار ہوا میں پھینکنے لگا لیکن گدھ بدستور سیٹیاں بجاتے گزرتے چلے گئے اور بوڑھے کے پتھر اس کے گرد یوں گرتے رہے جیسے سرد بوندیں اولے۔

"جانے دو بابا! تم تھک جاؤ گے! یہ موذی بہت اونچے اڑ رہے ہیں" زینو نے اپنے باپ کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا!" بڈھے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا "شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ ——— ورنہ ——— لیکن میں ان ان ان ٹڈیوں سے ہار نہیں مان سکتا۔ آدمی کو جنات سے لڑنا چاہیے!"

اس کے منہ سے جنات کا لفظ نکلا ہی تھا کہ ایک بگولا بلند ہوا اور سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ غبار کم ہوا تو زینو اور اس کا باپ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک دیو کھڑا ہے۔ دیو نے زینو کے باپ کو جھک کر سلام کیا اور اس کی جانب گیندے کا ہار پھینکتے ہوئے بولا:

"تمہیں مبارک ہو بڑے میاں! تمہاری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا!"

زینو کے باپ نے گیندے کے ہار کو، جو کمند کی طرح سیدھا اس کی گردن میں آ کے گرا تھا، توڑ کر دیو کے منہ پر دے مارا۔

"لے جاؤ اپنے یہ مرگی کے پھول، اور میری زعفران کی کیاریوں سے اس طرف ہو کر بات کرو۔ تمہارے سانس کے نفس سے ان کی خوشبو جاتی رہے گی۔"

لے بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ گیندے کے پھولوں سے مرگی ہو جاتی ہے۔ (مصنف)

دیو کی اکیلی آنکھ جو اس کے ماتھے کے درمیان تھی، سلگنے لگی۔ اس کے بال سہی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور دانت غرّانے کے انداز میں نمودار ہوئے۔ لیکن وہ اپنا غصہ پی گیا اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا،

"تیری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا ہے بڑے میاں۔ ہمارے بادشاہ نے اسے اپنے حرم کے لئے منتخب فرمایا ہے۔"

"میں نہ کہتا تھا بیٹی کہ تو جو ہر وقت پھولوں کے گہنے گجرے پہنے پھرتی ہے اور باندھے سو رہے چھتوں کے کنارے گھومتی ہے، اچھا نہیں۔ پر تیری ماں ہوتی تو سمجھاتی نا تجھے اس کا مطلب کہ کنواری بچیوں کو خوشبو سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔" زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "اور سب سے بڑا ظلم تو نے یہ کیا کہ وہ تعویذ اتار دیا جو تیری ماں نے تیرے بازو سے باندھا تھا۔ لیکن رو نہیں بیٹی۔ میرے جیتے جی ....."

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ آسمان سے نوبت و ناقوس کی آواز آئی ——— شہ جنات کا پیامی منہ کے بل گر پڑا اور ایک تحت زمین پا آرا۔

"ہم میں اتنی تاب نہیں تھی بڑے میاں کہ ہم تمہارے جواب کا انتظار کرتے اس لئے ہم خود چلے آئے۔"

"تم؟" زینو کے باپ نے کہا۔

"ہاں! تمہاری بیٹی کے حسن کا شہرہ ہم نے اپنے دربار میں سنا تھا اور ایک روز جب تم لوگ اپنا غلہ تقسیم کر رہے تھے، ہمارا بھی ادھر سے گذر ہوا اور ہم نے دیکھا کہ نیلم ندی کے پانیوں میں ایک سفید شعلہ تیر رہا ہے ——— تیری بیٹی کا جسم کی چاندی ———"

"چپ ہو جا بے غیرت عفریت!" زینو کا باپ غصے سے کانپ اٹھا۔

"اپنی بیٹی کی تعریف بھی نہیں سن سکتے بڑے میاں ——— بہت پیار ہے تمہیں اس سے! تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ شہ جنات کے پہلو میں بیٹھے گی اور دنیا کی کوئی نعمت اس کے لئے ناقابلِ رسا نہیں ہوگی۔"

"لیکن وہ تمہارے لئے ضرور ناقابلِ رسا ہے۔" زینو کے باپ نے کہا۔ "تم ناری ہو۔"

"تم نے اپنے اطباء سے نہیں سنا کہ تم میں بھی آگ موجود ہے ——— تم اگر ٹھنڈے ہو جاؤ تو مر جاؤ۔"

"کل تو تم یہ کہو گے کہ نور اور نار دونوں میں روشنی ہے اس لئے ہم نوری ہیں۔"

"تمہیں منطق میں ضرور ید طولیٰ حاصل ہے بڑے میاں۔ لیکن شاید تم طاقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ——— سو دلائل کی ایک دلیل۔"

"مگر طاقت سے تم روح کو زیر نہیں کر سکتے، اور جسم بغیر روح کے بالکل ویسا ہی ہے جیسے ——— جیسے ———" اس نے رکتے ہوئے مناسب تشبیہہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے یہ وادی بغیر ہمارے ——— سو تیری طاقت کی مجھے اتنی بھی پروا نہیں جتنی اس پتھر کی ——— لیکن تیری بدتمیزی، جسارت اور دھمکی کے باوجود میں تیری درخواست پر غور کرنے کو تیار ہوں، مگر ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" جن نے جواب دیا۔

"ریشِ سلیمانی کی قسم کھا!"

"کھائی ——— مگر اب مزید انتظار نہ کرا۔ آتشِ شوق نے مجھے پہلے ہی دیوانہ کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تجھے بھسم کر دوں۔"

"ترس ——— میرے خاندان کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی بغیر اپنی رضامندی کے شادی نہیں کرتی۔"

"خوب! تو کیا میں تیری بیٹی سے پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ ملکۂ جنات رضامند کرے گی؟ ——— اے حبیبہ! تیری ایک ہاں پر دنیا کی نعمتیں تیرے قدموں میں ہوں گی۔" اور اس نے موتیوں کی ست لڑی مالا اتار کر زینو کے قدموں میں پھینک دی۔ "کوہ قاف کی جھیلوں کا یہ تحفہ تیرے پاؤں کی دھول پر نثار ہے۔"

"کیا تیرے موتی میری جھیل میں کنول کے پتوں پر اوس کے قطروں سے زیادہ حسین ہیں؟" زینو نے موتیوں کی مالا کی طرف بے التفاتی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"او جاہل لڑکی یہ ان سیپیوں کی سوغات ہے جنھیں قاف کی کنواری پریاں، مینہ کی پہلی بوندوں کی تلاش میں صدیوں اپنی جھیلوں میں لئے پھری ہیں۔"

"مجھے تیرا ہار نہیں چاہیئے۔" زینو نے کہا۔ "کیا تو نے اپنے تاج کے نیچے اپنا سینگ نہیں دیکھا؟"

عفریت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سر کی طرف گیا۔ وادی کے لوگوں نے جو گدھوں کو مارنے کے لئے اپنے گھروں سے آئے تھے اور زینو کے جھونپڑے کے گرد جمع ہو گئے تھے، ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ شہ جنات نے چیخ ماری اور اس کے خدام "پناہ! پناہ!" پکارتے ہوئے اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

"کیا مجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟" زینو کے باپ نے دریافت کیا۔ "میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا تیرا ہم سے ملاپ نہیں ہو سکتا۔"

"چپ ہو جا بڈھے!" عفریت گرجا۔ "تجھے اور تیری گستاخ بیٹی، دونوں کو اس بدتمیزی اور ناشکری کی سزا دی جائے گی۔"

"تو قسم کھا چکا ہے ——— سلیمان کے عذاب سے ڈر!"

"اسے شطرنج ہی سے فرصت نہیں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکے۔ اس کا مجھے کوئی کھٹکا نہیں۔"

"تو اپنے ضمیر سے بھی نہیں ڈرتا؟"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس قدر توہم پرست واقع ہوا ہے۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اس قدر مکار اور وعدہ شکن ہے تو میں ان فضول باتوں میں کبھی اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔"

"تمھاری زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔"

"تجھ پر انگشتِ سلیمانی کا قہر ٹوٹے گا۔"

"اس کا طلسم اپنی طاقت کھو چکا ہے۔"

"تو پھر میں تیرا مقابلہ کروں گا" زیتو کے باپ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"کہاں جنات کو نہیں دیکھا تو نے ——— یہ دیو، یہ گدھ، یہ چیتے ..... یہ سب میرے غلام ہیں" عفریت نے کہا۔

"اور ان کو بھی دیکھ لو" زیتو کے باپ نے وادی کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا "یہ میرے بھائی ہیں، اور ان پہاڑوں کے اُدھر میرے اور بھی بھائی ہیں ——— تیرا مقابلہ کیا جائے گا"

عفریت چنگھاڑا اور زیتو کی طرف بڑھا۔

اور پھر آدمیوں اور عفریتوں کے درمیان وہ جنگ شروع ہوئی جس کا شور سن کر اڑوس پڑوس کی وادیوں سے زیتو کے باپ کے دوسرے بھائی بھی اپنی آبائی تلواریں لے کر آپہنچے جو ایک مدت سے ان کے صندوقوں میں بند تھیں۔

لوگ لاٹھیاں، کلہاڑے، درانتیاں، چھرے اور پھاوڑے لے کر عفریتوں کے لشکر پر پل پڑے اور یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ شہ جنات گھبرا گیا۔ گلہ بانوں، کسانوں اور ملاحوں نے اس کا تخت توڑ ڈالا۔ اس کے ساتھی دُم دبا کر بھاگ گئے اور وہ خود ایک گدھ کی دُم سے لٹک کر بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

لیکن عفریت کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر بعد وادی کے دہانے کی طرف ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ پھٹ گیا اور آسمان کا ایک ایسا ٹکڑا آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا جسے وادی کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زمین لرزنے لگی اور جیسے اس کے پیٹ میں بادل لڑھک رہے تھے، بھلا کہاں کہ ہمیں تھیں وادی کے نشیب و فراز سے کسی کی گونج اٹھی۔ بھیڑوں کی چھڑیاں رمبھیڑوں کے کیوتر، چٹانوں کی ابابیلیں بے تابانہ ہوا میں اڑنے لگیں فضا میں شہد کی مکھیوں کے پر پھڑپھڑائے، جیسے ان کے چھتے پر کسی نے پتھر پھینک دیا تھا۔ بھیڑ بکریاں ممیائیں، زیتو کی گائے بلبلا اٹھی، اس کی مرغیوں نے گویا بلا دیکھ لیا۔ جھیل کی جانب سے ڈری ہوئی مرغابیاں جھنڈ قطار کھڑی نظر آئیں۔ خرگوش اپنے بھٹ چھوڑ کر نکل آئے اور دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، درختوں کی شاخوں میں گلہریاں چک چک پر چھتے لگیں کہ یہ کیسی گڑگڑاہٹ ہے جس نے سبھی درختوں کے تنوں میں بھی آرام نہیں لینے دیا۔ تنوں کے پرخچے بن کر پتھروں کے کھوروں میں گر پڑے اور پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ سیب، ناشپاتی اور شفتالو کی شاخوں سے کچے پھل آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے اور جھیل کے شفاف پانیوں کی سنہری مچھلیاں کناروں پر تڑپتی دکھائی دیں۔

"بھونچال!" زیتو کے باپ نے کہا۔ لیکن پہاڑ کا وہ شگاف بند کیوں ہوا جا رہا تھا۔

"اژدہے!" کسی نے کہا۔

"چیتے!" کوئی پکارا۔

"چیتوں کی آنکھوں والے اژدہے!"

"اژدہوں کے جسم والے چیتے!"

"گینڈے!"

"گینڈے اور ہاتھی!"

"چار چار سونڈوں والے ہاتھی؟"

"آگ نکلتی ہے سونڈوں سے؟"

"سؤر؟"

"لمبے لمبے دانتوں والے جنگلی سؤر؟"

"طلسمات؟"

"طلسمات!؟"

"طلسمات!!؟"

"ٹوٹ جائے گا یہ طلسم!" زیتو کا باپ پکارا۔ "اپنی زمین کی مٹی اپنے ہاتھوں سے مل لو، نامور ہو جاؤ گے تم اس سحر سے یہ فسوں تمھاری جیت کا امتحان ہے۔"

زیتو کا باپ اور اس کے ساتھی نعرے لگاتے ایک بار پھر صحرا کر حدود پر ٹوٹ پڑے۔ اژدہے آگ اگلنے لگے۔ ان کے نتھنوں سے دھوئیں کے بادل امڈ رہے تھے۔ سؤروں کے دانتوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں اور ان کے ہونٹوں سے لاوا ابل نکلا۔ زیتو کے باپ کے ساتھی کٹ رہے تھے، مر رہے تھے۔ لیکن ان کا ہر قدم آگے ہی کو بڑھتا تھا۔ ان کی دلیرانہ نے دیوں کی کمر دوہری کر دی اور جنات کی فوج پھر اسی شگاف کی طرف پسپا ہوتی نظر آئی جدھر سے وہ داخل ہوئی تھی۔ مگر عین ایسے میں جب کہ ان کی شکست یقینی ہو چکی تھی، آسمان یکایک تاریک ہو گیا۔ سورج گدھوں کے پروں کے پیچھے چھپ گیا۔

"ابا!" زیتو پکار اٹھی۔ "یہ گدھ نہیں ہیں جنھوں نے سندباد کے جہاز کو پتھراؤ سے غرق کر دیا تھا۔"

رخوں کے پرے وادی کے مختلف علاقوں پر پھیل گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گذرتے زمین سے شعلے بھڑک اٹھتے اور لوگ آگ کے بیچ، آگ کے بیچ، پکارتے ہوئے اپنے گھروں کی آگ بجھانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن زیتو کے باپ کے ساتھیوں میں بھی ایسے لوگ موجود رہے جن کے سینوں میں زیتو کے دادا کے احسانات سلگ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے جلتے ہوئے جھونپڑوں سے منہ موڑ لیا اور ناموس کے نعرے لگاتے ہوئے پھر صحرا کی طرف بڑھے۔

گدھوں میں رخوں کے پرے یکایک کہیں غائب ہو گئے اور اس جانب سے جہاں پہاڑ بیٹھا تھا، ساون کے بادلوں کی طرح کالی کوئلوں کا جھنڈ آتا دکھائی دیا۔ ان کی چونچوں میں کچھ چمک رہا تھا۔ جب وہ زیتو کے باپ کے لشکر کے اوپر پہنچیں تو انھوں نے اپنی چونچیں کھول دیں اور لشکر پر انگاروں کی بارش ہونے لگی ——— لوگ اشرفیاں لوٹنے کے لئے لپکے اور آپس میں الجھ گئے۔

زیتو اور اس کا باپ اکیلے رہ گئے اور جنات نے انھیں اپنے نرغے میں جکڑ لیا۔

فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"اب بتاؤ؟" آسمان سے شہ جنات کی آواز سنائی دی۔ "لیکن ہماری پیشکش بدستور موجود ہے۔ سیلانی اگر اب بھی ہماری ہو جائے تو جنات اقلیم کی ملکہ کہلائے گی؟"

"چپ ہو جا مردود!" زیتو کے باپ منہ سے کف جاری ہو گیا۔ لیکن اس کے بازو جکڑے ہوئے تھے۔ تو اس کا بدن اپنی

جھیل کے کنارے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کانپنے لگا۔

"لیکن تو بڈھا ہو گیا ہے شاید، اور اپنی برائی بھلائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تیری بیٹی سے بات کریں گے ——— کوئی ہے؟" شہ جنات نے تالی بجائی: "وہ تاج کہاں ہے؟ ہماری ملکہ کا تاج ہے، جسے ہمارے دربار کی کنواری پریوں نے ہماری ملکہ کے لئے تیار کیا ہے ——— دیکھ لڑکی! ادھر دیکھ! اس ہیرے کو دیکھ، ملکہ سبا کے تاج میں بھی ایسا نگینہ نہیں ملے گا تجھے ——— اور یہ نیلم دیکھ رہی ہے تو! ساتویں آسمان کی نیلاہٹ اس کے آگے ماند ہے اور یہ زمرد! روئے ارض کا سبزہ اس سے اپنا رنگ ادھار مانگتا ہے۔ یہ جل پریوں کا تحفہ ہے تیرے تاج کے لئے ——— اور تو نے کہانیوں میں لعل بدخشاں کا نام سنا ہوگا! ان لعلوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بدخشاں کے سوداگر اپنا ایمان نیلام کرتے ہیں، اس میں اس آگ کی سرخی بند ہے جسے ہماری ہمجاریں کبھی بجھنے نہیں دیتیں۔ خواجہ سگ پرست کو اگر ان لعلوں کی آب کا حال معلوم ہو جائے تو اپنے کتے کا پٹہ اتار کر اپنے گلے میں ڈال لے ——— لیکن تیری ایک داں پر یہ تاج تیرا ہے۔"

"تیرا تاج میری وادی کے خودرو گلاب کے تاج سے بہتر ہے؟ اور تیرے زیورات جن کا تو مجھے لالچ دے رہا ہے ان بگولوں سے اچھے ہیں جو یاسمین کی شاخیں میرے لئے ہر روز گوندھتی ہیں؟" زینو نے پوچھا۔

"سن لیا تو نے؟" زینو کے باپ نے کہا: "اور اب کہ وہ آخری بار نہ کہہ چکی ہے، اگر تیری آگ میں غیرت کی کوئی بھی موئی چنگاری بھی موجود ہے تو تیرا راستہ وہ ہے جدھر سے تو آیا ہے ——— رہے ہم اور ہمارے جلے ہوئے جھونپڑے، کھیتوں، کھلیانوں میں ہمارے مرنے، اور ہمارے ہاتھوں میں مچلتے ہوئے پھول اور کلیاں ——— سو ہم سمجھیں گے کہ یہ ہماری شامت اعمال تھی ——— جا ——— اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

"جذباتی بڈھا!" حضرت نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ملعون ناری!" زینو کا باپ بھڑک اٹھا: "تو ہمارے جذبات کو کیا سمجھ سکتی ہے ——— ہماری ہمراہی، ہمارے یتیم، ہماری بے آبرو کلیاں ..... اور سب سے بڑھ کر ہماری عزت جو تیری شیطانی فوج کے ہاتھوں برباد ہوئی ——— تجھے ان جذبات کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ ہوس کار حضرت! جادو ہو یہاں سے، ورنہ ایک ایک لاش بھڑک اٹھے گی اور پھر تجھے تجھ ناری کو بھی اس حدت سے پناہ نہ ملے گی۔ سمندروں کا پانی، ساونوں کی گھٹائیں، پہاڑوں کی برف اور کرۂ مہر کی ہوائیں بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکیں گی ——— جا ——— جہنم کی مخلوق دور ہو جا یہاں سے!"

"کپڑا ٹھونس دو اس بدلگام بڈھے کے منہ میں اور اس کی مغرور بیٹی کو اندھے غار میں ڈال دو! ایک ٹھہرو، باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم رحم و کرم کے جذبات سے عاری تھے۔"

اور بھولے بھٹکے سیاحوں کا بیان ہے کہ زینو کی وادی میں اب زعفران کے کھیتوں سے لاشوں کا تعفن پھوٹتا ہے، تاکناؤں کی رگیں سوکھ گئی ہیں، آتش بیجاں کو امربیل کھا گئی ہے، تھور کے کانٹوں نے نرگس کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں، چشموں کا پانی پہاڑوں کے سینے میں جذب ہو گیا ہے، جھیلوں میں سنہری مچھلیوں کے بجائے جونکیں رینگتی ہیں، کنول کے پھول بچے دلوں کی طرح

سیاہ پوش ہیں، سیب کی شاخوں سے پتھر لٹکتے ہیں، جگنو اپنی چمک بھول چکے ہیں، کوہ بیجیں کے مرتع زرتیں پر کوے کا گمان گذرتا ہے اور کوہ گراں خواب کی برفوں کے نیچے نیلم کی رگیں کوئلہ بن گئی ہیں، شہد کی مکھیاں زنبوروں کی طرح ڈستی ہیں اور ان کے چھتوں میں تتلیوں کا بسیرا ہے، گاؤں کے تھنوں سے آبچھڑ چکے ہیں ..... اور ان فضاؤں میں جہاں کبھی تتلیوں کے پر جھگا تے تھے اب چمگادڑ مردہ چہروں کی بو پھیلاتے ہیں ..... گڈریوں کے چنگ گنگ ہیں اور بن چکی سے کلی کے سنہرے آٹے کی بجائے شعلے لپکتے ہیں

اور

اندھے غار کی گہرائیوں سے کبھی کبھی مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! کی آواز آتی ہے اور غار کے باہر ایک بڑھا جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے، پاؤں میں زنجیریں ہیں اور ہاتھ سلوں کے نیچے دبے ہیں، اپنا سر پتھروں سے پیٹتا ہے، لیکن اس سے لہو کا ایک قطرہ نہیں نکلتا ——— خیال ہے کہ بے بسی کے احساس نے اس کا سارا خون خشک کر دیا ہے۔

جونکیں

مہندر ناتھ

آشا جب بستر سے اٹھی تو اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ نہ جانے یہ درد کی لہریں کہاں سے آ گئی تھیں جو اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی تھیں۔ کئی دنوں سے اسے صرف ایک ہی خیال ستا رہا تھا کہ آنند اسے لینے کیوں نہیں آیا۔ وہ آیا تھا۔ یا نہیں گھر کا ماحول اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بالکل بے بس سی محسوس کر رہی تھی۔ گھر میں سب کی نگاہیں اشارہ تھیں کہ اس کی زندگی کی ضروریات آشا ہی پوری کر رہی تھی۔ اگر آشا نے اپنی زندگی کے ساتھ ہوتی نہ دیکھی ہوتی تو یہ رہا کتنے کب کا مر کھپ گیا ہوتا۔ لیکن آشا کی ممتا کی وجہ سے یہ کنبہ آج تک دو وقت کا کھانا کھا رہا تھا۔ بڑے بھائی نے شادی کر کے الگ مکان لے لیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے پان کی دوکان کھول لی تھی اور ساتھ ہی شادی کر لی تھی۔ اور اس کی زندگی پان کی دوکان اور ایک عدد بیوی اور ایک عدد بدصورت بچے کے گرد طواف کر رہی تھی۔ بڑی بہن ایک آوارہ مزاج عورت تھی جس نے اپنی ساری زندگی آوارگی اور عیاشی کے سپرد کر دی تھی۔ اس نے بھی اپنی منزل تلاش کر لی تھی۔ اس بڑھاپے میں جو اس کے گرد منڈلا رہا تھا۔ جب شباب کا سلا سلا سا نشہ پگھل جاتا ہے۔ اور جسم میں جھریاں سی آ جاتی ہیں۔ جب کنپٹیوں کے آس پاس بال سفید ہونے لگتے ہیں جب ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت اپنی جگہ چھوڑنے لگتا ہے۔ تو کچھ لوگ بڑھاپا آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ موت کی دستک آہستہ آہستہ سنائی دیتی ہے۔ اس مرحلے پر بھگوان نے بہن کی دعائیں قبول کر لیں۔ پرماتما نے اس کے گناہ معاف کر دیے۔ اور پرماتما نے اسے ایک شخص کے قریب دھکیل کر دیا جو اسے دو وقت کھانا، ایک عدد کھولی اور ساتھ ہی آنے والی زندگی دے رہا تھا جس میں بھوک اور پیاس اپنے ڈراؤنے چہرے کھولے ڈرا رہی تھی۔ ان سب ہیبت ناک چیزوں کو ایک لمحے کے لیے دور پھینک دیا تھا۔

لیکن آشا ابھی تک اکیلی تھی۔ اس نے گھر کے ہر فرد کے لیے سب کچھ کیا تھا اپنے جسم کی بازی تک لگا دی تھی۔ اپنی آشاؤں اور تمناؤں کا خون کیا تھا۔ اپنے جسم اور جوانی کو بیچا تھا۔ لیکن نتیجہ ایک ایک کر کے سب لوگ اس سے الگ ہوتے گئے۔ ہر شخص اپنے خول کے گرد گھوم رہا تھا اور آشا آج زندگی کی دہلیز پر بالکل اکیلی کھڑی تھی۔

وہ بستر سے اٹھی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ صبح کے وقت اسے اپنی صورت کبھی اچھی نہ لگی۔ نہایت دبلا سا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گوشے۔ چہرے کی رنگت زرد۔ بالوں کی نرمی اور ان کی چمک آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے کپڑے جو آج سے چھ مہینے پہلے اسے چھلس کر آ جاتے تھے۔ آج بہت ہی کھلے کھلے سے تھے۔ ہر چھ مہینوں کے بعد وہ اپنے کپڑوں کو دوبارہ سیتی۔ کبھی کاٹتی، کبھی بڑھاتی کبھی کمر کے قریب اپنی قمیص کے گھیرے کو کم کرتی۔ کبھی بلاؤز کو دوبارہ سیتی اور سینے کے پھیلاؤ کو دوبارہ دیتی۔ یہ تبدیلیاں جو اس کے جسم میں

ہو رہی تھیں اس کے متعلق آشا کو احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو دیکھ کر جھنجھلا اٹھتی۔

اس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ جب وہ پہلی بار ایک دلہن کی طرح اس شہر میں آئی تھی۔ ناچتی گاتی، لہراتی بل کھاتی ہوئی اس شہر میں وارد ہوئی تھی۔ ہر شخص نے اس کے قد، سب جسم، اس کی متبسم آنکھوں، اس کی چلتی کمر، اس کے کولھوں اور اس کے لمبے قد کی تعریف کی تھی جس شخص نے اسے دیکھا ایک لمحے کے لیے وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک مسکراہٹ لیے ہوئے تھیلی پر دل، چیک بک جیب میں ڈالے ہوئے متقبل میں امیدوں اور تمناؤں کا چراغ روشن کیے ہوئے اپنی جان فنا بنانے کے لیے بے قرار نظر آتا۔ اس کی اداس راتوں میں گرمی پیدا کرنے کے لیے اس کی روح میں بے قراری کے لمحات کو اضافہ کرنے کے لیے ہر ملنے والا بڑی گرم جوشی سے ملتا۔

لیکن آشا کی روح ان لوگوں سے سیراب نہ ہوئی۔ ہر آنے والے مرد میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی۔ اگر وہ پیسے تھے تو صورت شکل کریہہ منظر تھی۔ اگر صورت اچھی تھی تو بینک بیلنس نہ اور۔ اگر آنے والا قبول صورت اور بینک بیلنس کی نمائش کرتا تھا تو بڑھاپا سر سے پاؤں تک لے کر آتا تھا۔ اور اگر اسے تینوں چیزیں میسر تھیں تو سیرت نہایت ہی پراگندہ، باتیں کرتے آ جاتے، ذوق جمال نہ اور جمالیاتی حس صفریات کرنے کے بعد معلوم ہوتا شاید چیزیں بکری کا گاہک آیا تھا۔

آشا نے ان تمام مردوں کو دیکھا۔ اپنی تنہائی، عزت اور گھر میں ان بکتے ہوئے انسانوں کو دیکھا جو اس کی روح کی دہلیز پر سسک رہے تھے، رو رہے تھے ——— کہ یہ سب لوگ اس سے عمر میں بڑے تھے۔ بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں نہ کر پاتے تھے کیوں حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دو وقت کے کھانے کے لیے تکتے رہتے۔ یاس بھری نگاہیں لیے ہوئے، ڈرے ڈرے سہمے ہوئے کمرے میں پڑے رہتے۔ جیسے آشا ہی ان کی زندگی کا مرکز تھی۔ جیسے ہی ان کا پانچ سالہ پلان تھی۔ کہ تم کچھ کرو، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم سب بیکار ہیں ——— ہماری طاقت گھٹ گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ ہم کچھ نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہیں۔

ان سسکتی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر آشا کے دل میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا۔ یہ نگاہیں جو ہر بار، ہر مرتبہ، ہر سیکنڈ اسے اپنی زندگی بیچنے کے لیے مجبور کرتی رہتیں۔

اور شاید آشا نے سوچ لیا تھا کہ بھگوان نے اسے تمام لوگوں کو پالنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ شاید ان تمام کو پیدا کر کے اس نے اپنا کام ختم کر دیا تھا۔ اب آشا کی باری تھی کہ ان سب کی کشتی کو منزل مقصود پر لے جائے۔ ایک ناخدا کی طرح ———

اور آشا نے ان دس سالوں میں یہی کچھ کیا۔ انہیں کی طرف دیکھ کر، انہیں کی مفلسی اور عسرت کا اندازہ کر کے۔ انہیں کی بھوک سے متاثر ہو کر انہیں کے مستقبل کو بنانے کے لیے اس نے اپنی جوانی کا نیلام کر دیا۔ لیکن یہ نیلام بڑا سوچ سمجھ کر کیا۔ ٹک ٹک کر، دیکھ دیکھ کر، سنبھل سنبھل کر کیا۔ یہ لمحات جو بیچ میں آتے رہے اُن لمحات نے اس کی روح کو بھی پراگندہ نہ کیا۔ کیونکہ اس کی اپنی روح اس نیلام میں شامل نہ تھی اس کی اپنی منزل یہ نہ تھی۔ اسے خود روپیوں سے محبت نہ تھی۔ اسے یوں زندہ رہنا مقصود تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اپنے کنبے کے لیے کیا۔ ان دس سال میں چار پانچ عشق بھی کیے۔ ایک دو سوچ سمجھ کر ایک دو مجبوریوں کے تحت، کچھ بھائیوں کو دیکھ کر۔ کچھ ماں کی طرف نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ یہ کاروان اپنے تھکانے لگنے لگا۔ اور پھر وہ اپنی زندگی شروع کر چکی۔ لیکن یہ کاروان تو بڑھتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کے ہاں ایک لڑکی ہو گئی تھی۔ بڑے بھائی کے ہاں پانچ بچے تھے۔ دو بچے آشا کے پاس پل رہے تھے اور تین بچوں کے بوجھ کو خود بڑا بھائی سنبھال رہا تھا سب سے زیادہ رنج تو اسے اس بات کا تھا کہ کوئی شخص اس کی عزت نہ کرتا۔ اس کی ماں بھی تو یہی کہتی تو رنڈی ہے، رنڈی!

اسے یہ لفظ کہتے ہوئے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ جس کا کھائیں اسی کو گالیاں دیں۔ اے ماں میں تیری جائی ہوں، تیرے ہی خون کی بوند ہوں۔ تیری رگیں اور نسیں میری دل و جگر ہیں۔ میں تم سے الگ تو نہیں، اے بھائی۔ اے میری بھاجو۔ شرم نہیں آتی تم مجھے دیکھ کر ہنستی کیوں ہو۔ اپنے من ہی من میں خوش کیوں ہوتی ہو۔ کب تم نے میرا خون نہیں پیا۔ یہ گھر میں کھسر پھسر یہ تضحیک آمیز ہنسی جب بھی آنند آتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو سنوارنے لگتی ہوں، اپنے بال دھوتی ہوں۔ انہیں سلجھاتی ہوں، اپنے لبوں پر لپ سٹک لگاتی ہوں۔ اور اس کے انتظار میں ایک خوبصورت نیلی ساڑھی پہنتی ہوں۔ یہی ساڑھی تو انہیں پسند ہے۔ تو تم جل بھن کر خاک ہو جاتی ہو محلے والوں سے جا کر کہتی ہو "اسے جی وہ آج آنے والے ہیں" ہاں تم بھی خوش نہیں ہوتیں جس دن سے وہ آتا ہے یا اسے آتا ہوتا ہے تم کیوں مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کرتی ہو۔ نہیں تو معلوم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ میں کیا کرتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تم میری کمائی پر زندہ ہو۔ مجھے تو آنند سے محبت ہے۔ میں آج کل دن رات اس کا انتظار کرتی ہوں۔ دن رات اس کی مالا جپتی ہوں اس کا نام لے کر زندہ ہوں۔ جب اس کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ماں دیکھو تو۔ مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو پہلی سی نہیں۔ چہرے پر وہ شگفتگی نہیں رہی۔ وہ رونق نہیں ہے۔ آواز میں وہ نغمگی نہیں۔ دن بدن ڈھلی ہوتی جا رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر بھی تمہیں رحم نہیں آتا۔ شاید میں رحم و ترحم کے قابل ہی نہیں۔ میں تو رنڈی ہوں ماں۔ جو رنڈی کی کمائی کھاتے ہیں انہیں کس نام سے پکارا جائے۔ چھوڑو اشا۔ ماں کو مت گالی دو۔ ان بھائیوں کو مت کوسو۔ ناسمجھ ہیں نا۔

آج آسمان بڑا خوبصورت تھا دھوپ میں ایک نشہ سا تھا۔ سامنے کے مکان پر کبوتروں کا ایک جوڑا۔ ایک دوسرے سے پیار کر رہا تھا۔ نیم کے درخت اس خنک ہوا میں جھوم رہے تھے۔ دور ایک جہاز سفر کے لیے اپنے پر تول رہا تھا۔ آج آنند کا خط آنا چاہیے۔ کیا وہ آج ضرور آئے گا۔ وہ آ جائے گا تو وہ اپنے دل کی ساری کدورت کو اس کے سامنے رکھ دے گی۔ وہ ہر چیز کو میری ہر شکایت کو، میری ہر اشکا کو بڑے غور سے سنتا ہے اور عادت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کم بخت بہت دور رہتا ہے۔ تین مہینے کے بعد صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اپنا تبادلہ یہاں کیوں نہیں کرا لیتا۔ اتنی دور رہنے سے کیا فائدہ۔ خط بھی نہیں لکھتا۔ جب آتا ہے تو محض ایک تار بھیج دے گا۔ اور میں اس کے انتظار میں تڑپتی رہتی ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ جس دن وہ یہاں آنے والا ہوتا ہے گھر میں ہنگامہ ضرور ہوگا۔

اسی دن تو میں خوش ہوتی ہوں۔ وہ دن تو میرا ہوتا ہے۔ باقی سب ان کے ہوتے ہیں۔ باقی سب شاہی رانیں ان کی ہوتی ہیں۔ ان سے کوئی کیا کہے گا اے گھر والو۔ کیا تم مجھے ایک سہانی صبح نہ دو گے۔ کیا میری زندگی کی ایک اہم رات تمہاری نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ اتنے ہی خودغرض ہو تو گھر سے نکل جاؤ۔ آنند بھی کہتا ہے کہ اب ان کو گھر میں کیوں رکھا ہے تم نے۔ تم نے ان سب کو نوکری کے قابل بنا دیا۔ شادیاں تک کرا دیں۔ لیکن پھر بھی یہ سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر۔ آخر کب تک۔

لیکن آنند کو کیا بتاؤں کہ یہ جونکیں ہیں آنند۔ جونکیں۔ جو خون کو خون پینے کی عادت ہوتی ہے نا۔ وہ ساری عمر کسی نہ کسی کا خون پیتی ہیں۔ اور مجھے خون دینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب تک کوئی مجھے گالی نہیں دیتا مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک ماں مجھے

نہ ہی نہیں کہہ سکتی مجھے نیند نہیں آتی۔ جب تک بھائی یہ نہیں کہہ لیتے کہ تم کیا کچھ کر سکتی تھیں اور ہمارے لیے کچھ نہ کر سکیں مجھے راحت نصیب نہیں ہوتی۔ میری قربانیوں کا یہی صلہ ہے نا؟ اور کیا کر لیتی۔ آنند۔ اب تو آ جاؤ۔ آنند۔ یہ صبح بڑی پیاری ہے آسمان بے حد نیلا ہے۔ دھوپ میں ہنس کے پروں کی نرمی اور گرمی ہے مجھے اتنا نہ ترساؤ۔

دن کے بارہ بج گئے۔ اور ثنا کیہ آیا۔ اور ساتھ میں ایک تار۔ آشا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تار کھولا۔ لکھا تھا۔ شام کو آ رہا ہوں۔ تمہارا آنند؟

آشا خوشی اور حیرت سے جھوم گئی اور تار کو چوم لیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے کی چارپائی پر اس کی ماں لیٹی ہوئی تھی سوئی میں اس کی بھابی کھانا پکا رہی تھی۔ صوفے پر بھائیوں کے بچے لیٹے ہوئے تھے۔ ادھر نیچے فرش پر اس کا بھائی خراٹے لے رہا تھا۔ سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ ہائے وہ آئیں گے تو کیا کہیں گے گھر کو سجا کر بھی نہیں رکھا کیا شریفوں کے گھر ایسے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ہر طرف افتقار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ کوچ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آشا نے ہر چیز کو سلیقے سے رکھنا شروع کیا۔ صوفہ اپنی جگہ پر رکھا۔ جھاڑو سے اسے صاف کیا۔ اور پھر ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ تصویروں کو کپڑے سے صاف کیا۔ اپنی جوانی کی تصویر کو۔ ہائے آشا تو کتنی خوب صورت تھی۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تصویر صاف کرتے ہوئے ایک تصویر نیچے گر پڑی۔ اور پلنگ پر سوئی ہوئی ماں جاگ اٹھی "کیا شور مچا رکھا ہے۔ آشا تم نے۔ سونے بھی نہیں دیتی۔ یہ سونے کا وقت ہے ماں۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ" وہ چلائی۔

"بڑھیا ہوں، نیند زیادہ آتی ہے نا۔ جب تم بڑھیا ہو جاؤ گی تو ساتھ پاؤں نہ ہلا سکو گی۔ دن بھر سوئی رہو گی"

فرش پر بھائی نے انگڑائی لی۔ اور وہ چلایا "رات پالی کر کے آیا ہوں۔ لیکن اس گھر میں سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور اس نے پھر کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیا وہ اپنی ماں کو بتا دے کہ آنند آج شام کو یہاں آنے والا ہے۔ اگر اس نے بتایا۔ تو وہ رونا شروع کر دے گی۔ پہلے تو گھر کو صاف کرے۔ چیزوں کو سجائے۔ فرش کو دھوئے۔ موری کو تیزاب سے صاف کرے۔ تاکہ گندگی کا احساس نہ رہے۔ کپڑوں کو اچھی طرح ٹانگ دے۔ جالے صاف کرے۔ برتن سجا کر رکھ دے۔ یہ سب کچھ کرے۔ اکیلی۔ ہاں اکیلی۔ اس کام میں تمہارا کوئی ساتھ نہ دے گا۔

اس نے اپنی چھوٹی بھابی کو ایک کونے میں بلایا۔ دیکھو بازار جا کر ایک مرغ لے آؤ۔ دو سیر قریہ دو دن کے چاول اسے ماں پالیٹ کی مچھلی۔ وہ مچھلی بڑی خوشی سے کھاتے ہیں۔ کچھ پلاؤ۔ بنا لے۔ ایک آدھ میٹھی چیز۔ میری پیاری بھابی۔ اس کے بھائی کے لائے گاؤں کو چھپاتے ہوئے کہا۔ سر پر چڑھ رکھو۔ اری بچوں کو تو نہلا دے۔ اچھے سے کپڑے پہنا۔ اور تنقوسے کہہ کہ وہ اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے۔ شام کو وہ ..... وہ شرما گئی۔ بھاسی گئی اور دوپٹے کو چھلکتے ہوئے چھو کر سر پر رکھ لیا۔ بڑی سہاگن بنی پھرتی ہے۔ بھابی۔ سب کچھ سمجھ گئی اور رسوئی کی طرف گئی اور بڑبڑانے لگی "بے شرم کہیں کی۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آج وہ آ رہے ہیں دنڈی کہیں کی شادی نہیں کر لیتی۔ کتنے مرد کھا چکی ہے۔ ابھی تک جی نہیں بھرا۔ مجھے بھر میں تک کنوارا رکھا ہے ہمارا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے

ہیں۔ کل ہی گلی کا مشٹنڈا میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں بھی ..... ہائے رام۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا اور یہ کہتے کہتے دال میں نمک ڈالتی گئی۔

اوری دال میں نمک ڈالے جاتی ہے۔ زرا ہاتھ کو روک تو سہی" ماں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "تو رہ جاتی تو اچھا تھا۔ روٹی گشتی کہیں کی مری جاتی ہے۔ وہ کیا کر۔ اور تم لوگ کھا کھا کر بیل ہوتے جا رہے ہو۔ اتنی نمکین دال کون کھائے گا" وہ چلا کر بولی بھابی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے زور سے ڈھکن چولہے پر رکھا اور پاؤں سے تھالی کو ہٹایا۔ اور قریب کھڑے ہوئے ایک بچے کو ایک تھپڑ رسید کیا اور کہنے لگی "کس کس کا کھانا پکاؤں یہاں آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا کہ شام کے کھانے کی فرمائش بھی سے ہونے لگی۔"

"شام کو کون تیرا مہمان آ رہا ہے۔ کیا کہیں کی حرام خور"

"آشا سے پوچھو۔ مجھے کیا معلوم۔ مچھلی۔ گوشت۔ کباب۔ میٹھا سب کچھ پکانا پڑے گا"

"کون آ رہا ہے۔ روٹی چھوڑ" وہ بستر سے اٹھ کر بولی۔

آشا دوڑتی ہوئی ماں کے قریب آئی "کوئی نہیں۔ وہ آ رہے ہیں کیوں چلا رہی ہو ماں"

"اوری تیرا مردہ نکلے تو کہیں کی نہ رہے ..... وہ کون؟"

"ماں تو جانتی نہیں۔ وہ۔ ماں۔ وہ"

"تیری جوانی کو آگ لگے۔ تیری ماں مر جائے"

"نام کیوں نہیں لیتی۔ کون ہے تیرا صنم؟"

"ماں۔ وہ۔ آنند!"

"اچھا آنند آ رہا ہے" ماں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "موا۔ مشٹنڈا۔ سانڈ۔ منہ اٹھائے چلا آوے۔ جیسے یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔ نہ دن دیکھے نہ رات۔ بس مرنے کھانے چلا آوے"

"ماں۔ وہ تو تین مہینے کے بعد آ رہا ہے۔ ہر روز کہاں آتا ہے"

آشا نے شرما کے مرنے کہا۔

"تو گھر میں رکھ لے بار کر۔ ہمیں یہاں کیوں رکھا ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھر سے نکال دے۔ ان بچوں کو کسی دھرم شالہ میں بھیج دے۔ اس گھر کو آگ لگا دے اور رکھ لے اپنے یار کو۔ میں تمہیں کیا کہتی ہوں۔ میری بات کوئی مانتا ہے۔ اوری وہ دیتا کیا ہے؟ جو تو اس پر مرتی ہے۔ جان چھڑکتی ہے۔ کتنی بار کہا۔ کہیں شادی کر لے اور میری جان چھوڑ۔ میں تو چند دنوں کی مہمان ہوں۔ اس مال دار بیٹے سے تو کیا شادی کرنے والی تھی۔ ہمیں ایک مکان لے کر دے رہا تھا اور دس ہزار روپیہ دیتا تھا۔ لیکن تو کب مانتے والی۔ گھر بھی اچھا خاصا تھا۔ اور تم سب چین سے رہتے۔ تیرے بھائیوں کی قسمت کھل جاتی۔ تیرے چھوٹے بھائی کی دوکان چھوٹ جاتی۔ کوئی اچھا سا دھندا کر لیتا۔ دن رات پان بیچتا رہتا ہے۔ ابھی تک موا سویا پڑا ہے۔ اتنی اچھی صورت پائی تھی تم نے۔ تم سے اوپر والی روندی سی اچھی۔ جس نے برقعہ اوڑھ کر پٹھان کے ساتھ شادی تو کر لی۔ مٹی میں روندی اپنی جوانی تم نے۔ تم سے تمہاری بڑی بہن اچھی۔ جس نے دھندا تو بند کر دیا اور بڑھاپے میں ایک

زبان کے ساتھ شادی کر کے گھر بسا لیا تھا۔ لیکن تو ساری عمر کنواری رہے گی۔ ساری عمر بغیر خصم کے رہے گی۔ کیسے کٹے گی پہاڑ سی جوانی جب میں مر جاؤں گی۔ تب تو میری باتیں یاد کرے گی۔ اب نہیں۔ اری یہ بھابیاں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ تمہیں کھا جائیں گی تمہارے بھائی ایک پیسہ نہیں دیں گے تمہیں۔ میری بات یاد رکھ۔ اے مٹھو کی ماں۔ جا بازار سے مچھلی اور مرغ خرید لا۔ دال تو میں بگھارتی ہوں میں۔ اب گھر میں مہمان آئے گا کچھ تو کھلانا پڑے گا۔ اسے مرے سنڈے، شلغم، انڈے کر۔ ماں بستر سے گالیاں دیتی ہوئی اٹھی اور بھائی کو پانچ کا نوٹ دیا۔ "لے بازار سے جا کر ذرا لے آ۔ یہ دونوں کھائیں گے۔ جب جا کر ان کا جی بہلے گا۔ گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں رگھو کی سکول کی فیس نہیں دی۔ چار مہینے کا کرایہ تک تو دیا نہیں لیکن آج مرغ ضرور آئے گا۔ اری کھڑی کھڑی کیا تک رہی ہے باہر جا کر مرتی کیوں نہیں۔ ریڑھی چھوڑ گشتی کہیں کی۔ جاتی کیوں نہیں حرام خور۔"

یوں اکثر ہوتا تھا۔ یہ تو آشا کے لیے روزمرہ کی بات تھی۔ یہ گالیاں، یہ غصہ، چہرے پر کرب فریب کی لکیریں۔ ان سب سے آشا تھی۔ آشا ان گالیوں کو سننے کی عادی ہو چکی تھی اور ماں کو ان گالیوں کو سنانے کی عادت تھی۔ گھر کے ماحول میں یہ تلخی، یہ تندی یہ گھبراہٹ، یہ وحشت، یہ زمانہ سازی یہ بہانہ بازی یہ سب کچھ اس گھر میں ازل سے ہو رہا تھا۔ گھر کے تمام فرد اسی چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ آشا نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن نکلنا آسان نہ تھا۔ اسی لیے آشا نے ان گالیوں کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ جیسے گندگی اس کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اس پر اگندگی کا مداوا اس کے پاس نہ تھا۔ اس سے لگا کر وہ زندگی کے کچھ لمحات اپنی خوشی کے لیے رکھنا چاہتی تھی۔ آشا چاہتی تھی۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کو ان کی خوشی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح گھر کے باقی افراد

بغیر کسی تنقید کے اس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ اور اسے خوشی کے ان حال لمحات عطا کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں گے۔ لیکن یہاں فراخ دلی کہاں۔ یہاں تو گھٹن اور سڑاند تھی۔ یہاں تو خود غرضی تھی۔ صرف اپنے آپ کو خوش رکھنے کی تمنا تھی۔

جبھی تو آشا پر ان گالیوں کا خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہی۔ چھوٹے بھائی کو صوفے پر لٹا کر فرش کو دھویا۔ ردی بھائی کمرے کی ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ خود نہائی۔ بالوں کو دھو کے میں سکھایا ——— نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں کاجل۔ لبوں پر لپ اسٹک اور بالوں میں تیل اور سینٹ۔ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں۔ اور گلے میں رولڈ گولڈ کا ہار پہن لیا۔ اور پھر آنگن کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ گھر کا ہر فرد کن انکھیوں سے آشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھابیاں کھسر پھسر کر رہی تھیں وہ تو بنا ہی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک خاوند تھا۔ ہاں صرف ایک۔ ماتھے پر ایک بیچکا۔ مانگ میں صرف ایک ہی ہاتھ کا سیندور۔ نگاہوں میں ایک ہی چمک تھی۔ ایک ہی کی صورت تھی۔ ایک ہی مرد سے آشنائی تھی۔ ایک ہی کا انتظار تھا۔

آشا کے سلسلے میں کتنے آئے اور چلے گئے۔ کتنی بار مانگ بھری گئی اور پھر اجڑی۔ کتنی بار وہ ہنسی اور پھر روئی۔ کتنی بار یہ گھر بنا اور اجڑا۔ کتنے آدمی آئے اور چلے گئے اور آشا نے قسمیں کھائیں کہ اب وہ کسی اور سے محبت نہ کرے گی۔ لیکن چھ مہینے یا سال کے بعد پھر وہی چکر۔ ہر شخص نے اس گھر کی بدلتی ہوئی زندگی کو دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار گالیوں کی بوچھاڑ آشا کو سننا پڑیں۔ یہ جانتے ہوئے اس گھر کے افراد خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگر قابل ہوتے تو کب کے یہاں سے چلے جاتے لیکن کہاں جاتے کون سنبھالتا انہیں سنبھالنے والی صرف آشا تھی اور گالیاں کھانے والی بھی آشا!

بھابیوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکتی۔ سالی خود عیش کرتی ہے اور ہم صرف ایک مرد پر قناعت کریں۔ یہ مرد کتنے بھدے گندے اور نامرد تھے۔ خود کچھ نہ کماتے تھے۔ بہن کی کمائی پر زندہ تھے۔ اجڈ۔ گنوار۔ چپ رہنے والے ماں اور بہن کی گالیاں سننے والے، بازاروں میں بہت ہوتی تو ایک گھر نہ جانے۔ ان کے ذہنوں میں کئی بار بغاوت نے جنم لیا۔ لیکن کہاں جائیں ——— کون اپنائے گا انہیں۔ اب تو اسی گھر میں زندگی کاٹنی پڑے گی۔ یہیں سے جنازہ نکلے گا۔ لیکن آشا عیش کرتی ہے۔ مرچھ بیٹھنے کے بعد نیا مرد۔ کبھی گورا چٹا۔ کبھی گول مٹول کبھی سوٹ پہن کر آتا ہے۔ کبھی ہیٹ لگا کر، کبھی کار میں بیٹھ کر۔ کبھی ٹیکسی میں۔ کبھی سینما لے جاتا ہے کبھی کپڑے خرید کر دے جاتا ہے۔ یہ مرد عیش کرتی ہے اور ہم۔ بس صرف ایک مرد۔ کالے کلوٹے، ڈبلے پتلے، جاہل سوکھے، مرجھے محض نامرد۔ اسی لیے انہیں اچھا نہ لگتا تھا۔ کسی کا اس گھر میں آنا۔ ان کروں کو صاف کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ کمرے تو ازل سے گندے ہیں اس صفائی سے کیا فائدہ جس میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ محض کام کرنے جاؤ اور دو وقت کھانا کھاؤ اور جاہل مردوں کو اپنا پتی سمجھو۔ جبھی تو ناک سکوڑے سہمی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج مہمان نہیں آنے والا تھا۔ بلکہ ان کی جاگی ہوئی خواہشوں اور امنگوں کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

ہر صبح کے بعد شام آتی ہے۔ جب آفتاب اپنی تمام رعنائی سمندر میں غرق کر دے گا۔ اور آسمان پر شفق پھیل جائے گی۔ تو کچھ عرصے کے بعد بادلوں کے کنارے ارغوانی ہو جائیں گے تو ایک نیا چاند ابھر آئے گا۔ جبھی یہ کمرے سجائے گئے ہیں آشا ایک دلہن بن کر بیٹھتی ہے۔ نابکار رنڈی۔ مردوں کو کھانے والی، گھر کی عزت بیچنے والی، بے غیرت۔ خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے والی

کاش آنند نہ آئے۔ دن بھر بھابیاں یہی سوچتیں۔ یہ کھانا پکا پکایا رہ جائے گا۔ یہ صفائی، یہ رکھ رکھاؤ، یہ اجلا اجلا سا فرش۔ یہ بناؤ سنگار۔ یہ مسکراہٹ اس رنڈی کی دھری کی دھری رہ جائے۔ یہ روئے اور زور زور سے روئے۔ اپنے بال نوچے۔ دیوار میں سے ٹکریں مارے۔ اس کی ماں روئے۔ اس کے بدصورت بھائی روئیں۔ یہ کپڑے پھاڑ کر بازار میں ننگی ناچے۔ یہ پاگل ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ خوش ہوں گی اور ہنومان کے مندر میں جا کر پرساد چڑھائیں گی۔

یوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ آشا کے دل میں انتظار کی گھڑیاں۔ سارے گھر کا جو بن لیے ہوئے جھک رہی تھیں۔ اب آنند کی گاڑی اس اسٹیشن پر ہوگی۔ اب بڑی دال کے قریب۔ اب گھلنے لگا ہوں۔ اب اندھیری۔

منا مستقل اب آتا ہی ہوگا۔ کھڑکی میں نہ بیٹھ۔ تیز باد چلے گی۔ ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔

باورچی خانے سے ڈیرہ دون کے چاولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ پلاؤ تیار ہو رہا تھا۔ چپاتیاں پک رہی تھیں۔ مرغی ایک ایک کر کے گھر سے جا رہے تھے۔ جب وہ آتا ہے تو مردوں کو گھر سے جانا پڑتا ہے۔ صرف ماں رہ جاتی ہے۔ بھابیاں ایک کونے میں دبک جاتی ہیں۔ ایک کمرے میں۔ جس کے ایک کونے سے ہنسی، مذاق، مسکراہٹیں، کبھی کبھی دبی دبی سی سسکیاں، کبھی آہیں، بے قراری، دھرے، قہقہے، کھڑکھڑاہٹ اور کبھی کبھار مار پیٹ، کسی کا بالوں کا کھینچا جانا۔ آشا کا دوڑ کر کے رہ جانا، ہائے کیا کرتے ہو۔ آہستہ سے بال کھینچو۔ یہ سب کچھ بھابیاں دیکھتیں، سنتیں اور اپنے مردوں کو گالیاں دے کر رہ جاتیں اور جب کبھی وہ آنے والا ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے دعا کرتیں۔ کاش وہ آج نہ آئے۔ آج وہ نہ آئے۔ اے سائیں بابا۔ اے بھگوان ۔ اے دو جہاں کے مالک، اے بانسری والے کاش وہ آج نہ آئے۔

وقت گزر رہا تھا۔ وقت گزر جائے گا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ گھروں میں پنکھے کھل رہے تھے آسمان

پرستاروں کی کہکشاں لرز رہی تھیں۔ چاند نظروں سے اوجھل تھا۔ کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی اور آشا کسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں بستر پر دراز تھی۔ ہر شخص کسی کی آہٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹیکسی آئے گی۔ کوئی اترے گا اور آشا کی مرحومہ کا وارث اس دنیا میں وارد ہوگا۔ ہر سانس میں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ آشا تو خوش تھی اسے کسی کا خیال نہ تھا۔ یہ لمحات اس کے اپنے تھے خود کے تخلیق کردہ تھے۔ دنیا کے ہر شخص نے اس سے بے رخی برتی تھی ماں سے لے کر بھائیوں تک، دوستوں سے لے کر دشمنوں تک آشا کا اپنا کچھ نہ تھا۔ جس کو وہ سینے سے لگا کر زندگی کے باقی دن کاٹ دیتی۔ جبھی تو اس نے ان لمحات کو پا لگدگی کے ہوتے ہوئے اپنی زندگی کو سولی پر چڑھا کر موت سے تلوے کر اپنے گوشت کو بیچ کر اپنا شباب کر نیلام کر کے خون کے تالاب میں نہا کر خوشی کے چند لمحات اپنے لیے تخلیق کر لیے تھے۔ یہ سوچ کر دنیا تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتی رہے گی۔

اسی سوچ بچار میں انتظار کا وقت کٹتا گیا۔ شام کی تاریکی نے اندھیری رات کی چادر اوڑھ لی۔ ستاروں کی جگمگاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ مغرب سے مخمور ہوائیں جاگیں۔ اور سارے آسمان پر ایک کہکشاں لرزنے لگی۔ چاند نے اپنی دلفریب مسکراہٹ سے سارے آسمان کو منور کر دیا۔ ہائے یہ چاندنی، یہ تاروں بھری رات، یہ چنبیلی کے پھولوں کی مہک، یہ تاریکی کے دھندلکے، یہ لہریں اور یہ دبی دبی سی تھکن۔ اور آنند۔ تو کب آئے گا۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ کھانے کی سوندھی سوندھی خوشبو آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اس کی بھابیاں خوش ہو رہی تھیں اور آشا کے دل میں درد کی ٹیسوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ہاں۔ آج کوئی آگ نہیں بھرے گا آج اس کی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار نہیں آئے گی۔ آنے والا کبھی بھی آسکتا ہے جس نے آنا ہے وہ ضرور آئے گا۔

وقت بیت رہا ہے، بیت جائے گا۔ لیکن ان لمحات کی کون قدر کرے گا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی رہی، جامد و ساکت، ساتھ مکان کے ایک ٹیکسی رکی۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے مرگ کی طرح۔ یہ سہرو سکون کا دیوتا تھا۔ صدیوں سے اس کی روح بے قرار اور پیاسی تھی۔

نہیں۔ نہیں۔ یہ خوشی، مسرت اور نور کا سیلاب تھا۔ ٹیکسی وہیں رک گئی۔ ادھر نہیں آئی۔ پھر سیڑھیوں پر آہٹ آئی۔ ایک قدم پھر دوسرا قدم۔ تیسرا قدم۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آشا کے ہوں پر سانس آکر رک سا گیا۔

"آ گیا مسٹنڈا۔ سالم مرغ کھانے والا۔ آگ لگے اس کے پیٹ کو۔ ماں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ تو مر جاتی تو اچھا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے تیری رنڈاپت تو دیکھتی۔

بھابیوں نے قہر آلود نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

"آ گیا۔ ملک الموت ان کی خوشیوں کو خاک کرنے والا۔ ان کی راحتوں کا جنازہ نکالنے والا۔ بھیڑیا۔ آ گیا"

آشا نے سوچا۔ وہی ہوں گے۔ وہی ہو سکتے ہیں۔ میرا آنند۔ میری راحتوں اور خوشیوں کا رکھوالا، اے جان بہار۔

اس وقت معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جھکڑوں بہاریں مور قصاں ہیں۔ دروازہ کھلا۔ سامنے تار والا کھڑا تھا۔ ایک خاکی وردی پہنے ہوئے، موت نگاہوں کے سامنے ناچنے لگی۔ اس نے لفافہ کھولا۔ شاید کوئی منحوس پیغام ہو۔ . . . . . یہ کیسی خزاں تھی۔ جس نے بہاروں کی ساری رنگینی لوٹ لی تھی۔

"کھا تھا"

آج نہیں ——— پھر کسی دن آؤں گا۔

"آنٹی"

نام پڑھتے ہی آشا کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی طاری ہو گیا۔

آشا تار کو اپنی انگلیوں میں بھینچتی ہوئی پلنگ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابیاں خوش تھیں۔ ماں کے چہرے پر ایک فاتح سا برس رہا تھا۔

آخری سہارا

شکیلہ اختر

اور وہ تنہا ہیں جیسے اس کی روح کی گہرائیوں میں اُتری چلی جاتی تھیں۔ وہ گھبرا جاتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور جنوری کی سردی میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے چمک اُٹھتے ——— اُفق کے پہاڑوں تلے اس کی روح پس چلی تھی اور اب اتنی بڑی وسیع دنیا میں اس کا کوئی بھی اپنا نہ رہا تھا۔ کسی کے لیے اب اس کے دل میں فکر نہ تھی اور کوئی دل اس کے لیے مضطرب نہ تھا۔ سارا اضطراب سارا درد، اور سارا غم ایسے بھیانک طور پر اس کی زندگی پر آیا اور آ کر چھا گیا کہ اب یاس و حسرت کی کوئی انتہا باقی نہ رہ گئی تھی ——— اور اس کے بعد یہ دو مہینے روزِ محشر سے بھی زیادہ طویل ہو کر اس کی سسکتی ہوئی روح پر سے آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ گذری ہوئی زندگی کے نقوش اس کی نگاہوں سے بہت حد تک مٹ چکے تھے۔ مگر اس کے دل و دماغ اور آنکھوں میں بھیانک موت کا امنڈتا ہوا سیلاب ابھی تک چھایا تھا ——— خوف ناک موت کی گرج ——— بے بس زندگی کی آخری کشمکش، اور اس کی سسکیاں اور ہچکیاں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں ——— وہ ایک قیامت سے ہو کر گذری تھی ——— اسرافیل کے صور سے بھی کہیں زیادہ شور مچا۔ خون کی ندیاں بہیں۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ نیزوں کے جوم میں چیخیں گھٹتی گئیں۔ اور گنڈاسے، بھالے اور برچھیوں میں پھنسی ہوئی زندگی تھمتی چلی گئی۔ وہ کئی بچی کھچی جوان عورتوں کے ساتھ زندوں اور مُردوں کو روندتی ہوئی بھاگتی رہی مگر کنوئیں کی منڈیر پر آ کر سب کے پاؤں ایک لمحہ کے لیے ساکت ہو گئے۔ جیسے حیات نے ان کے قدموں کو تھام لیا تھا۔ خون کے بہتے ہوئے پرناوں میں سے گذرتے ہوئے ان کے پاؤں بھی دل سرخ ہو رہے تھے۔ اپنے عزیزوں، چہیتوں اور پیاروں کا گرم گرم خون، جو اب ان کے کپڑوں اور پیروں میں امرود کی جیلی کی طرح جمتا جا رہا تھا ——— جیسے کاروں کی آوازیں ان سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ قیامت کا شور مچ رہا تھا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں ——— کنوئیں کی منڈیر پر آ کر وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لیے ٹھٹک گئی تھیں ——— مگر ان کے بیٹے، ان کی مائیں ان کے باپ اور ان کے سامنے رشتہ دار، عزیز اور عزیز تر لوگ بیدردی سے مارے جا رہے تھے۔ ٹھیر ٹھیر کر شور بڑھتا جا رہا تھا اور چیخیں بلند ہو ہو کر تھمتی جا رہی تھیں۔ وہ خوں سے نڈھال ہو گئیں، اب ان کے دلوں سے اضطراب مٹ چکا تھا اور وہ بڑے اشتغال سے کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گئیں ——— اور اس کے بعد اس کو کچھ بھی یاد نہ رہا ——— سردی سے ان کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اور وہ اسی آواز سے جاگ اٹھی تھی ——— کچھ عورتیں اور لڑکیاں اسی کی طرح کنوئیں کے اندر اس کی بھیگی ہوئی دیوار سے اڑی ہوئی ٹھنڈ سے لپکا رہی تھیں۔ ان کے قدموں کے نیچے کنوئیں کا پانی سیاہ لگ رہا تھا۔ اور اس پر کئی پھولی ہوئی لاشیں ایک ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مل کر پھر سے دیکھا ——— وہ ابھی تک زندہ تھی!

وہ بے تاب ہو کر کنوئیں کے اندر سانس لیتی ہوئی صورتوں کو حریصانہ نظروں سے دیکھنے لگی ——— "اماں، آپا، بھائی اور جانے سے بھائی بہن!" مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ بھرا بھرا گھر سا گھر؟ کیا ہو گیا؟ — وہ سب کے سب اس کو اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ اور اب وہ کنوئیں کے اندر چھپاتی ہوئی دیوار سے اڑی ہوئی سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سبھی آہستہ آہستہ سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ ایک کی گود میں تین سال کا بچہ تھا۔ اس کا سارا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اور وہ بار بار اسی طرح کپکپاتے ہوئے رٹ رہا تھا: "اماں گھر چلو۔ گھر چلو اماں!" ماں بار بار اپنے گیلے آنچل سے اس کو لپیٹ لیتی: "چپ، رو مت بیٹا۔ چپ، رو مت بیٹا" کی آواز سن کر بچہ کنوئیں کے اندر تھرتھر تھا: "ہم کو جالا لگ رہا ہے اماں گھر چلو۔ گھر چلو اماں!" بچہ جیسے ہی چپ ہوا تھا کہ کنوئیں کے اندر پتھر کی ایک بڑی سی سل آ کر پانی میں گری۔ ایک کیف چیخ بلند ہوئی۔ کنوئیں کا پانی زور سے اچھلا۔ پھولی ہوئی لاشیں ڈوبنے ابھرنے لگیں — خوف و دہشت سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنی آنکھ کھولی تو بچہ خون سے نڑاپور اپنی ماں کی گود سے چمٹا ہوا تھا۔ اور اس کا بھیجا پانی پر تیر رہا تھا۔ بس اس نے اتنا ہی دیکھا۔ اور اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے پلنگ پر پٹیوں سے جکڑی ہوئی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی گردن، پیٹھ اور ہاتھوں پر برچھے کے گہرے زخم لگے تھے۔ جو جسم میں پھنسے ہوئے چوبے کی طرح اس کو بھی دشمنوں نے کنوئیں کے اندر برچھوں اور بھالوں سے گھونپ گھونپ کر زخمی کر دیا تھا۔ دوسرے دن مٹری والوں نے کنوئیں میں سے لاشوں کے ساتھ اس کو بھی نکال۔ ڈیڑھ مہینہ وہ اسپتال میں پڑی رہی۔ ادھر بے زخم کے ساتھ اس کو نمونیہ بھی ہو گیا تھا اور اب وہ اسپتال سے اس ریلیف کیمپ میں پہنچا دی گئی تھی۔ کپڑوں اور کمبلوں سے لدی ہوئی ٹرکیں کئی بار یہاں آ کر خالی ہوتی رہیں۔ مگر ہمیشہ ملنے والوں کا بڑا مجمع رہتا۔ ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ۔ جنہیں نہ صدائیں، اور ٹوٹ کھسوٹ کو دیکھ کر اس کو بڑی کراہیت لگتی رہی تھی۔ اور وہ ایسے موقعہ پر ہمیشہ وہاں سے کترا کر نکل جاتی۔ جب وہ اسپتال میں تھی تو کئی رضاکار بہنیں نئے لئے ہوئی مریضوں کو ان کے پلنگوں کے پاس لے جا کر ایک ایک جوڑا کپڑا دیا تھا۔ اس کو بھی ایک جوڑا کپڑا ملا۔ پہلے پہل ان کپڑوں کو لیتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اور اسی دن اس کو اپنے عزیزوں کی موت پر رشک آیا جو شہید ہو کر جنت میں آرام سے تھے اور اچھے اچھے کپڑے دوسروں کو دینے والی بہنیں کے ہاتھوں میں پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا کانپ رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کے پاس دو جوڑے کپڑے تھے۔ ایک اس کے اپنے گھر کا آخری جوڑا اور دوسرا جو اسپتال میں ملا تھا ——— بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔ تھوڑی دیر میں سوتے ہوئے اس کو اپنا گھر یاد آ جاتا۔ سجا سجایا بنا گھر ——— زم اور شفاف سے بستر، میز، کرسیاں، کتابوں سے بھری ہوئی شیشے کی اونچی اونچی الماریاں ——— اماں کا محبت سے دمکتا ہوا چہرہ، ابا جان کی شفیق نگاہیں، بھائی جان، بھابی جان اور چھوٹے چھوٹے پیارے بھائی بہن ——— جاڑے کی راتوں میں جب بڑی بھی اماں جوروں اور بھوتوں کے قصے ان بچوں کو سناتے تھیں تو وہ اپنی رضائیوں میں خوف سے لپٹے دبک جاتے تھے۔ اور اب کتنی بے دردی سے وہ سب کے سب ذبح کر کے جلا دیئے گئے اور زندہ جلا جلا کر ذبح کیے گئے تھے۔ اس کی آنکھیں روتے روتے اب تھک گئی تھیں۔ اور اکثر جب اس کا جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر روئے تو اس کی آنکھوں سے بہت مشکل سے چند آنسو بہ جاتے، اور اس کے بعد سب سے زیادہ اس کو اپنے آپ پر افسوس آنے لگتا تھا ——— اس کے سب پیارے جیسے اپنے گھر میں تھے۔ اسی طرح ایک ساتھ جنت میں بھی خوش ہوں گے۔ مگر وہ کتنی بدنصیب تھی۔ اس کو اپنے آپ پر غصہ آ جاتا۔ وہ کنوئیں کی طرف بھاگ کر اب تک کیوں نہ مر رہی تھی؟ پہلے پہلے بہت سے لوگوں کے ساتھ اکبر کی مزدوری میں کرے کا ایک کونہ اس کو بھی مل گیا تھا۔ یہ

عمارت ایک اسکول کی تھی۔ جس میں دو ہزار سے کچھ زیادہ ہی لٹے ہوئے پناہ گزین ٹھیرائے گئے تھے۔ اس ٹوٹتی ہوئی زندگی میں وہ یہ بھولتی جا رہی تھی کہ کبھی اس کا نام یاسمین بھی تھا ——— یاسمین ..... چنبیلی کا ایک نازک سا پھول۔ اور اب شہر ناز، عبید الغزوین کی طرح ایک وہ بھی تھی ——— نیچے کھڑی ہوئی ٹرک کے گرد جیسے میلہ سا لگ رہا تھا۔ کپڑا، صابن اور تیل لینے کی پھر وہی چیخ و پکار مچ رہی تھی ——— اور بے چارے ریلیف ورکر گھبرائے گھبرائے اور چڑچڑاتے ہوئے سے ان کی ضرورتوں کی چیزیں انہیں دے رہے تھے ——— کئی بار وہ یہی تماشا دیکھ چکی تھی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ وہ برآمدے کے کٹہرے پر جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ آج دوسری ٹرک آئی تھی اس پر دوسرے لوگ تھے اور کئی عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔ جن کے چہرے صاف ستھرے اور شاداب تھے۔ وہ نئے فیشنوں کے بھڑکیلے ساڑھی بنائے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے صاف دھلے ہوئے تھے۔ ٹرک کے اندر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر اس کو بڑا اچھا لگا بہت دنوں کے بعد اس نے اچھی صورتوں کو دیکھا تھا۔ وہ ٹرک کے اندر آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔ ان کو دیکھتے دیکھتے اچانک یاسمین کی روح میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس کے کپڑے گندے تھے۔ اس کے بال میلے اور الجھے ہوئے تھے۔ اس کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اتنے دنوں بعد آج اس کو اپنی حالت پر رونا آ گیا ——— اب تک وہ اپنے خیالوں سے بے خیال بے ہوش پڑی تھی ——— وہ کٹہرے پر اور بھی جھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بے اختیار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے ——— چادر کے کمرہ میں دروازے کے پاس ——— وہ تمہارا ——— تمہارا ہی بستر ہے نا؟ ——— وہ اپنے اتنے قریب کی آواز سن کر چونک اٹھی ——— جی ——— جی ہاں ..... وہ میرا ہی بستر ہے؟ اس کی روتی ہوئی سرخ آنکھیں شرمندگی سے جھک گئیں۔ اس کے رخساروں پر تیزی سے آنسو بہنے لگے ..... اور اس کی آواز لڑکھڑانے لگی ——— وہ حیرت زدہ اس کو تکنے لگا ——— اس کی اداس اور تھکی ہوئی آنکھوں میں رحم، ہمدردی اور محبت بھر گئی۔ اس کے بازو پر کئی کمبل دھرے تھے۔ مگر وہ چپ تھا۔ جیسے اس کے لبوں پر مہر لگ گئی ہو ——— یاسمین زور زور سے سسکنے لگی۔

"تم ..... تم ——— کیوں رو رہی ہو ——— ؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے" ——— ؟ اس نے بڑی مدھم سی آواز میں پوچھا ———

"آپ نے ——— آپ نے مجھ سے میرا ——— بستر پوچھا تھا نا؟" ——— اسی پر مجھ کو اپنا گھر یاد آ گیا" وہ اسی طرح ہچکیاں لیتی ہوئی بولی ———

"کیا ——— تمہارے ساتھ تمہارا اپنا کوئی نہیں؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں ——— سب کے سب ایک ایک کر کے مارے جا چکے ہیں" ——— اس کی بھیگی ہوئی معصوم نگاہیں اوپر اٹھیں ——— اور اس کی مایوس آنکھوں میں غم کے چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر وہ لرز اٹھا۔ اس کی زبان کتنی شیریں اور صاف تھی۔ وہ غمگین لہجے اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ اس کا چہرہ اور بھی اداس ہو گیا۔ وہ اسی ریلیف کے کاموں کے لیے بہت دور سے آیا تھا ——— لاہور سے ——— بہار کی الم ناکیوں پر ہزاروں دل تڑپ اٹھے تھے ——— بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد اور کشمیر نے بھی ان دکھوں اور غموں کو اپنا ہی دکھ سمجھا تھا۔ اور بہت سے لوگ اس درد و غم میں شریک ہونے کو دوڑ پڑے۔ کپڑے اور دوائیں اور زندگی کی سادی ضرورتوں کے سامان لے کر مارے بچھڑوں کی مدد کرنے آ گئے تھے ——— وہ دو ہفتے سے ریلیف کا کام کر رہا تھا۔ مگر اس کا دل کبھی بھی اتنا دکھا تھا میلے کپڑے، الجھے ہوئے بال اور اتنی پریشان حالی میں بھی یاسمین کا حسن دمک رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں زندگی کے نشتر بھرے

ہوئے تھے۔ اور پھولے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹیں دم توڑ رہی تھیں ——— اس کے کانوں میں ابھی تک سونے کی اور بیک پڑی ہوئی تھی اور داہنے ہاتھ کی چھنگلی میں انگریزی ڈیزائن کی ایک سادہ سی انگوٹھی بھی تھی۔

اتنے دنوں کے بعد آج پہلے پہل اس کی نگاہوں میں یاسمین نے اپنے لیے ہمدردی اور پاکیزہ خلوص کا جذبہ دیکھا ——— اس کا دل بھر آیا۔ دنیا میں اب اس کا اپنا کوئی بھی نہ تھا۔ پھر وہ نگاہیں اس کی روح کی گہرائیوں میں کیوں اُترتی چلی جا رہی تھیں ——— ؟ لیکن وہ یاسمین سے کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا ——— اس کے قدم بڑی افسردگی سے اُٹھ رہے تھے۔ جیسے اس کے دل کا سارا بوجھ انہی قدموں پر آ گیا ہو ——— وہ اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ سفید رنگ کے پینٹ اور اسی رنگ کے کوٹ میں اس کا دراز قد اور بھی نمایاں لگ رہا تھا ——— ابھی ——— ابھی وہ اس کو کتنے قریب سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی تھکی تھکی آنکھیں، اس کے اداس سے لب، اور اس کا مرجھایا ہوا چہرہ۔ اس کی وہ غمگین نگاہیں ابھی اس سے کتنی قریب تھیں۔ ابھی وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی اس طرح جا چکے۔ اس کے اتنا قریب آ کے گا! ——— غیر ارادی طور پر اس کی نظر اپنی انگوٹھی پر چلی گئی تھی ——— اسی انگوٹھی نے کیسا کیسا اختلاف اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا اور وہ بے تابی سے آنے والے دنوں کی منتظر تھی۔ اس کی شادی کو صرف پندرہ دن باقی رہ گئے تھے۔ گھر میں شادی کی تیاری ہو رہی تھی کہ پھر موت سائے رینگنے لگے۔ اور پھر ایک قیامت ان پر سے گزر گئی جہاں وہ بیاہ کر جا رہی تھی۔ وہ بستی بھی جلا کر خاکستر کی جا چکی ہے اور اتنے بڑے گاؤں میں سے صرف ایک چودہ برس کا لڑکا دھان کے کھیت میں چھپ کر بچ سکا تھا۔ کاروان کا کارواں جا چکا تھا اور ایک وہی بدنصیب تھی کہ بھٹک کر رہ گئی تھی ——— ایک ایک اس کی روح میں ایک ابال سا اٹھا۔ کیسے کیسے تصور اس کے دل و دماغ میں جاگتے بستے تھے ——— اس کی آنکھیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ اس کے بال بھی خون میں تھرتھرے جانے سے قبل ایسے ہی چمکیلے ہوں گے نا؟ ——— اور اس کے لب؟ ——— وہ ہمیشہ اس کے لبوں کو سوچتے ہوئے شرما جاتی تھی۔ اس وقت بھی پہلے کی طرح اس کے لبوں کو یاد کرتے ہوئے وہ ٹھٹک گئی ——— اور اس کے لب؟ موت کی خاموشی سے پہلے بھی وہ ایسے ہی اداس ہوں گے ——— اچانک اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کسی لطیف درد کو کہیں اپنے مستقبل کے اسی روشن آفتاب کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں اسی کی تھیں وہ انہی لبوں کو یاد کر کر کے شرماتی رہی تھی۔ اس کی تھکی تھکی نگاہوں میں محبت تھی، رحم تھا اور ہمدردی تھی۔ بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے۔

رات بھر ٹھنڈی زمین اور بھی سخت ہو کر اس کی پیٹھ میں گڑتی رہی۔ وہ ذرا بھی نہ سو سکی۔ دوسرے دن نہ جانے کیوں، اس کی آنکھوں میں انتظار جاگتا تھا۔ اُنہی غم ناک یادوں سے وہ ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ بھیانک موت، ارلہ و زنجیریں اور خون کی بہتی ہوئی ندیاں۔ اور اسی خوف پر دو جیلے سے اس کی زندگی گھوم رہی تھی چکرا رہی تھی۔ اس نے اتنے دنوں سے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ دنیا اس قیامت کے بعد ویسے ہی تھی یا کوئی دوسری دنیا بن گئی تھی۔ اور کل پہلی بار جیسے اس کی بے ہوش نگاہیں ہوش میں آئی تھیں۔ اچانک اس کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اس نے اسے بس ایک فطرتی ہی سمجھا ہوگا نا؟ ——— اس بے چارے کو کیا خبر کہ اپنے بیچ ہوئے خوب صورت کردں میں وہ گھنٹوں ایسی ہی آنکھوں، ایسے ہی لبوں اور ایسی ہی محبت سے بھری ہوئی نگاہوں کا کبھی تصور کرتی رہی تھی جب وہ یاسمین تھی ——— چنبیلی کا نازک سا پھول ——— اور اب! اب وہ کون تھی! اس کا اپنا دل بھی اپنے کو یقین کرنے کو نہ چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ اپنی انگلی میں سے انگوٹھی اتار کر پھینک دے۔ وہ پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ دنیا میں اب اس کا کوئی بھی نہ تھا ..... پھر یہ کس کی تمنائیں اب اس کے دل میں جاگ رہی تھیں؟ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ——— اور پھر ——— اسی محور پر اس کی زندگی گردش کرنے

گئی۔ اس کے پیروں میں چھتا ہوا چپل تھا اور اپنی میلی سی پھٹی ہوئی ساری کے آنچل میں وہ سمٹ گئی۔ اس کو اپنے سے شدید ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ بڑے پیار سے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دیکھتی رہی۔ کاش یہ زندہ نہ رہتیں۔ موت! مگر وہ یک دم کانپ گئی۔ کنوئیں کے اندر پھٹی ہوئی وہ نیں اس کو یاد آگئیں۔ اور پھر کنوئیں کی سردی اس کی ہڈیوں تک اتر گئی۔ وہ کٹہرے پر جھکی آسمان کو تکنے لگی۔ اس کو آسمان کا نیلا رنگ بہت اچھا لگا۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کو اپنے دل کے اندر ایک نئی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہاں ——— اس کے دل کے اندر ہی تو ——— اس کا جسم تو ابھی کمسن وہ ہی تھا۔ گندے تعفن میں پھٹی ہوئی ایک سڑی ہوئی لاش ہی تو تھی وہ ——— برآمدے میں ہر روز کی طرح بے ہنگم سا شور ہو رہا تھا۔ کئی بچے رو رہے تھے۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا ——— اور جیسے اس کی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ وہ اپنی اداس قدموں سے اس کی طرف بڑھ آرہا تھا۔

——— رطیف کیمپ کے سیکرٹری سے کہہ کر آپ کے لیے کچھ کپڑے اور ایک بستر لایا ہوں ——— آپ کا نام کیا ہے؟ ———

وہ اپنی کاپی پر کچھ لکھتے ہوئے رکے۔ ایک حساس سی خاموشی تھوڑی دیر کے لیے وہاں پر چھا گئی۔ یاسمین نے اپنی پھٹی ہوئی چپل کو اوپر اٹھایا۔

——— "یاسمین" ———

"کیا؟"

"یاسمین؟" ——— اس کی آنکھوں میں حسرت سی بھر گئی ——— "اور آپ کا مکان کہاں تھا؟" ——— قلم کی موجوں میں یاسمین کی روح ہچکولے کھانے لگی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ——— "تباہ ہو گیا" ——— کاغذ پر چلتے چلتے اس کا قلم رک گیا ——— "تباہ ہو؟" ——— وہاں تو کوئی بھی نہیں بچا۔ پھر آپ کیسے زندہ رہ گئیں؟"

ایک بے بس سی آہ اس کے لبوں پر تھرتھرا کر رہ گئی ——— "بہت ٹھوکروں سے ..... ! کنوئیں میں کود کر ——— مگر دیکھئے نا کنوئیں کے اندر بھی ہندوؤں نے برچھیوں اور بھالوں سے گھونپ گھونپ کر مجھے زخمی کر دیا تھا ——— وہ اپنے ہاتھوں میں زخموں کے داغ دکھاتی بولی: "یہ سپٹک ہو گئے تھے۔ تقریباً مہینہ ہسپتال میں رہی اور اس کے بعد یہاں بھیج دی گئی۔ مگر یہاں سے ہسپتال اچھا تھا۔" وہ بڑے بھولے پن سے بولی۔

"ہماری باری بھی تباہ تو دیکھنے گئی تھی ——— وہاں سارے مکان جلے ہوئے ہیں۔ مسجدوں میں ابھی تک خون کی قبیں جمی ہوئی ہیں ——— اسی جگہ ٹوٹی ہوئی بہت سی چوڑیاں تھیں، اور بے چاری عورتوں کے سر کے بال، لمبے لمبے بال بھی ——— میں نے سنا ہے۔ کہ چاروں کے مقابلے کے بعد جب مسلمانوں کے پاس ایک بھی کارتوس نہ رہا، اور بھوکے پیاسے بے چارے مسلمان جس جس جگہ کے جتھوں سے مقابلہ کرتے کرتے تھک گئے تو آخری بار مایوسی میں وہ اس خیال سے مسجدوں میں جمع ہو گئے تھے کہ شاید ہم خدا کے گھر میں مار دیے جائیں ——— مگر وہ یہاں بھی نہ بچے۔ ہندو اور پولیس والوں نے بلوائیوں کے ساتھ مل کر سارے مسلمانوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور دشمنوں نے قتل کرنے سے پہلے بے چاری عورتوں کے بالوں پر اپنی کرپانوں کی تیزی آزمائی تھی ——— اوہ ——— دنیا کی کوئی تاریخ اتنی بزدل اور بھیانک خون ریزی پیش نہیں کر سکتی۔ ہٹلر نے بھی اتنے بھیانک خواب کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک ہلکی سی نمی آگئی تھی ——— مگر یاسمین چپ چاپ اس کو تکتی رہی۔ جیسے اس کا سارا اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ وہاں تالاب کے

پاس ایک بہت اونچا سا سفید مکان بھی آپ نے دیکھا تھا ——— ؟

"مکانوں کی صحیح صورت تو اب وہاں کوئی بھی نہیں۔"

"اور وہ وہاں کے کنوئیں؟ آپ نے کچھ اور آدمیوں کو ان میں سے نہیں نکالا؟" وہ اپنے گھر کی باتیں اتنی محبت سے پوچھ رہی تھی جیسے اپنے سسرال میں وہ میکے کی ایک ایک باتیں چھیڑ چھیڑ کر بڑے پیار اور محبت سے دریافت کر رہی ہو۔

"دشمنوں نے سارے کنوئیں برابر کر کے زندوں اور مُردوں کا مدفن بنا دیا ہے۔" آپ کسمت سے بچ گئیں۔"

دم بھر کے لیے ایک تلخی بھری اُجڑی سی ہنسی یاسمین کے لبوں پر آئی: "آپ پنجاب سے آ رہے ہیں نا؟"

"یہ آپ نے کیسے جانا!" اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔

"یہی آپ کے لہجے اور باتوں سے۔ ابھی آپ نے جو کسمت کہا تھا نا؟ میں یہ پہلے ہی سے جانتی تھی کہ آپ لوگ 'ف' نہیں بول سکتے۔" وہ ایک معصوم بچے کی طرح بولی۔

وہ ہنس پڑا: "تو آپ یہی غور کر رہی تھیں؟"

"اور یہ بھی تو کہ آپ ہم بدنصیبوں کے لیے کتنی دور سے آئے ہیں ——— خلوص اور محبت سے یاسمین کی آنکھیں جھک گئیں وہ ایکدم چپ ہو گئی۔ جیسے اس کو اپنا خیال آ گیا ہو۔ وہ ایک اونچے گھرانے کی شریف کنواری لڑکی تھی۔ جس کے تخیل میں بھی کوئی غیر مرد نہیں آ سکتا تھا۔ اور اب، وہ کتنی بے حجابی سے اس سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ بے تاری کی لہریں اس کی روح میں کوند اٹھیں۔ اب وہ یاسمین نہ تھی۔ سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے درمیان رہنے والی کوئی دوسری بن چکی تھی۔ غم کے بار سے اب اس کا جی تھک کر بے تار ہو گیا تھا۔ مسلسل دو مہینوں سے وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں سوگوار تھی۔ مگر اب اچانک اس کی زخمی زندگی ایک نئی کروٹ لینا چاہ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے غموں سے گریز کر رہی ہو۔ اب تک جو نگاہیں اور لب و رخسار اس کے تخیل میں چھائے رہے تھے۔ ان ہی کی یاد میں اب وہ اس کی آنکھوں میں کشش سی پا رہی تھی جو اس کے غم اور دکھوں میں شریک ہونے کو اتنی دور سے آیا تھا۔

"تمہارا کی مسجد سے ہم لوگوں نے مظلوم شہیدوں کی یادگار، خون سے تر اور کپڑوں کے کچھ ٹکڑے، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، اور کٹے ہوئے تھوڑے سے بال رکھ لیے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھیں گے۔ معصوم شہیدوں کی آخری یادگار!"

"تو پھر ——— میری چوڑی ——— اور میرے سر کے بال بھی ہوتے آپ کے پاس؟" ——— میں کیوں بھاگی تھی بچنے کو ——— وہ بے اختیار بول اٹھی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ وہ دوسرے کمرے سے ملا کر کھڑا تھا۔ اس کی معصوم نگاہیں یاسمین کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اسی وقت یاسمین نے اس کو دیکھا وہ کتنا دل کش نظر آ رہا تھا۔

وہ زمانہ کسی نہ کسی بہانے وہ اس کے پاس ضرور آتا۔ یاسمین کی نگاہوں نے جب سے اس کو دیکھا تھا جیسے اک گونہ سکون اس کو مل گیا تھا۔ وہ ایک دم بے بہانا تھی۔ کسی کا دل اس کے لیے پریشان تھا۔ اس کی جگہ اب بدل دی گئی تھی۔ کیبن میں ایک صاف ستھری جگہ دیتے ہوئے اس نے کہا تھا ——— "آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں پنجاب" ——— تو وہ ہنس پڑی تھی۔ ایک لمحہ دل دوز سی ہنسی اور اسی ہنسی کے ساتھ اس کا دل کانپ اٹھا تھا ——— "کسی کے ساتھ چلے جانا، کتنی بری سی بات تھی؟" مگر پھر بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایسی زد رہے۔ کیمپ کے اندر اتنے شور اور ہنگاموں سے اس کی طبیعت پریشان ہو جاتی تھی ——— اور ایک عجیب سی خلش انتظار بن کر

اس کی روح پر چھا جاتی۔ جب کبھی اس کے آنے میں دیر ہونے لگتی تو وہ اس طرح بے کل ہو جاتی۔ جیسے اس کی زندگی بھر کا سرمایہ ہمیشہ کے لیے لٹ رہا ہو ——— کبھی ادھر دیکھتی۔ کبھی اُدھر تکتی۔ اچھی اچھی نگاہوں سے ہر طرف اُسے ڈھونڈتی۔ بہانے کر کر کے نیچے جھانکتی ——— مگر اب بھی وہ اتنی بُری نہ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ خراب چلی جاتی ——— اس کے دل و دماغ میں عجیب عجیب سے جذبات اُٹھتے۔ اور اس کی روح میں بغاوت کا ایک طوفان سا اُٹھنے لگتا ——— وہ خدا ——— اور اس کی دنیا دونوں سے باغی ہو جانا چاہتی تھی ——— اتنی مختصر سی زندگی میں اس نے کیا کیا تھا؟ جس کی وہ سزاوار تھی؟ اپنی بے کسی کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنے عزیزوں پر غصہ آ جاتا۔ جو اس کے خیال میں شہید ہو کر آرام سے جنت میں بیٹھے تھے ——— اور اکیلی وہ بے چاری حوادثِ زندگی کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی طوفانی تھپیڑے اسے زندگی اور موت کے درمیان بھیانک ہچکولے دے رہے تھے ——— کاش وہ ڈوب ہی جاتی ——— موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور تاریک دلدل میں سے احمد کے ہاتھوں نے اسے نکالا تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھتی۔ تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ احمد کے ہاتھوں کو تھام لے۔ ہنستے وقت احمد کی آنکھوں کا ہلکا بھورا رنگ کتنا چمک اٹھتا تھا۔ اس کے بوٹوں کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا جیسے ہر گھڑی ان پر گرد کی ہلکی اضافی جھلک رہتا ہے۔ اور اس کے لب پر اُگی ہوئی ہلکی سیاہی مائل ترشیدہ سے کٹی ہوئی وہ کانٹوں کی باڑ ——— یاسمین کو سب سے زیادہ پسند تھی۔ جیسے تو رنڈسے کی مٹی کسی گلاب کی حفاظت کر رہی ہو ——— اور کبھی کبھی تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ وہ قریب سے اس گلاب کی خوشبو سونگھ لے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ شرما جاتی۔ اس کی بھابی نے ایسی بہت سی باتیں اس سے سرگوشی میں کہی تھیں۔ اور جن نگاہوں کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ اب وہ اچانک احمد کی آنکھوں میں جھلک رہی تھیں۔ اس کے رخسار دیکھنے میں ریشم کی طرح نرم لگتے تھے جن کو دیکھتے ہی اس کو اپنا وہ ساتھ کا تکیہ یاد آ جاتا جسے اپنے رخساروں کے نیچے رکھ کر سوتے ہوئے اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔

اوپر گیلری میں چھوٹے چھوٹے ڈسکوں پر بیٹھے ہوئے جب وہ نیچے دیکھتے تو نیچے ہال میں اتنے کھلے ہوئے پناہ گزینوں کو دیکھ کر بعض دفعہ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ بھی انسان ہیں۔ سارے لوگ اس دلیف ورکر کو جانتے تھے اور اس نے سب سے یہ کہہ دیا تھا کہ یاسمین اس سفر میں عورتوں اور بچوں کی انچارج بنائی جانے والی ہے۔ اسی لیے وہ یاسمین کو اس کے کام سمجھایا کرتا ہے۔ اور سچ ہی اس نے یاسمین کو یہاں کا انچارج بنا دیا تھا ——— احمد کے ساتھ کئی بار ریلیف ورکر خاتون اور خود عورتوں کی لیڈر مسز احسان یاسمین سے ملنے اور اس کے حالات پوچھنے کو آ چکی تھیں۔ ان سبھوں نے یاسمین کو کسی پرائیویٹ مکان میں لے جانا چاہا۔ مگر وہ نہیں گئی۔ اس کو اس گندے کیمپ کے ایک ایک حصے سے محبت ہو گئی تھی۔ یہاں ہر جگہ اس کی محبت کے نقوش اُبھر گئے تھے۔ اور وہ ان سہاروں کو چھوڑ کر کہاں چلی جاتی؟ ———

احمد نے ایک دن یاسمین سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ اس کو کبھی نہ بھولے گا۔ بہار کی سب سے گہری یاد اسی کی تھی اور دوسرے بھی بہار کی گزری ہوئی گھڑیاں اس کو ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ اس کا جی بھی کچھ کہنے کو چاہتا رہا۔ مگر اس کے لب جیسے ساکت ہو گئے تھے دوسرے دن وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ مگر سارا دن گزر گیا۔ اور وہ نہ آیا ——— رات کو اچانک وہ ایک غریب صورت سا آدمی کیمپ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

"میں واپس جا رہا ہوں یاسمین دیکھو یہ تمہارا پتا ہے۔ میری ماں کو دل کے دورے پڑ رہے ہیں۔ اور اتنی دُور وہ ہو رہی ہے وہ مجھے بلا رہی ہیں۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی ——— "ہر روز تمہیں سردی لگتی ہے نا؟ اپنا کمبل تمہارے لیے لیتا آیا ہوں" ——— اس کے الفاظ

ٹکڑائے جا رہے تھے ——— اپنے کاموں کا چارج دینا تھا اس میں سارا دن گذر گیا۔ کہیں تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟" وہ بڑے پیار سے بولا: "تمہیں یاد ہوگا۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ اگر اپنے عزیزوں کے ساتھ تم بھی شہید ہو جاتیں تو تمہاری چوڑیوں کے ٹکڑے اور تمہارے بالوں کی لٹ بھی یادگار کے طور پر میرے پاس ہوتے نا؟ ——— تو اپنی صرف ایک چوڑی اور اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر مجھے دے دو ——— یقین کرو میں اس کو اپنی زندگی کا سب سے گراں قیمت سرمایہ سمجھ کر اپنے پاس رکھوں گا۔"

یاسمین حیرت زدہ اس کی طرف تکتی رہی۔ وہ جا رہا ہے؟ ہمیشہ کے لیے؟ پھر کبھی نہ آنے کو؟ جیسے اس کا دل اس بات کو یقین کرنا نہ چاہتا ہو ——— درد و غم کی ساری انتہا یکبارگی اس کی روح میں تڑپ اٹھی ——— بڑی حسرت اور بے چارگی کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ سے ایک چوڑی نکال کر اس کو دے دی۔ اور احمد نے خود ہی اس کے منتشر بالوں کی لٹوں میں سے ایک لٹ بلیڈ سے کاٹ لی ——— دونوں ایک دوسرے سے اپنی نگاہیں چھپا رہے تھے۔ اس نے کمبل یاسمین کی گود میں ڈال دیا۔ اور بے اختیار اس کے ہاتھوں کو تھام کر وہ وہاں پر جھک گیا۔ لطیف کانٹوں کی باڑ اس کے ہاتھ پر سرسراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور اس کی روح میں ایک ساتھ ہزاروں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ کنوئیں کے اندر کی سردی جیسے اس کی ہڈیوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی اور کنوئیں کا تنگ و تاریک دہانہ اور بھی زیادہ تنگ ہو کر اس کو پیستا جا رہا تھا ——— آخری بار ——— بے سہارا اور ہمیشہ کے لیے مایوس ہو کر یاسمین نے اس کے ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیا۔ بہت زور سے پکڑ لیا ——— بہت زور سے ——— یاسمین کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کو اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے تکتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کے ٹھنڈے ہاتھوں پر جھک گیا: "خدا حافظ یاسمین۔ مجھ کو کبھی بھولو گی تو نہیں؟"

مگر یاسمین پھر بھی چپ رہی۔ وہ اس کو جاتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکی۔ وہ اپنے سے ڈر رہی تھی۔ اگر وہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھ لیتی تو پھر اس کی چیخیں بے اختیار ہو جاتیں ———

اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا ——— وہ برآمدے میں نکل کر کٹہرے سے لگی ستاروں سے جھلملاتے ہوئے آسمان کو بے بسی سے تکنے لگی ——— "اماں میری اماں! میری بھابی۔ پیارے ابا۔ زرین۔ فرحت۔ ننھا پرویز ——— تم سب کے سب کہاں ہو ——— ؟" اتنے دنوں کے بعد اچانک اس کا سارا غم تازہ ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے زخموں کے سارے ٹانکے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے ہوں ——— اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ ڈوبتے ڈوبتے اس نے ایک تنکے کا سہارا لیا تھا ——— مگر تنکا۔ صرف ایک تنکا ہی تھا نا؟ اس کو اپنا گھر یاد آیا۔ جہاں وہ اب تک کتنی معصوم اور خوشیوں کی زندگی گذارتی رہی تھی۔ اماں کی جنت بھابی کی شوخیاں اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کے معصوم سے پیار ——— اس کا اکیلا کمرہ، اور تکیے کے رنگین جالے۔ وہ چونک پڑی اس کو پھر احمد کی آنکھیں، اس کی حسرت بھری نگاہیں، اس کے ریشم جیسے رخسار، خوب صورت چمکتے ہوئے بال اور پھر اس کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹیں یاد آگئیں: "کل، اب اسے کس کا انتظار رہے گا ——— ؟" اب وہ ہلکی شربتی رنگ کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو کبھی نہ دیکھ سکے گی؟ گھٹتی ہوئی ہچکیوں کے ساتھ وہ افسردہ لٹی ہوئی گیلری میں واپس آ کر اپنے زمین کے بستر پر لیٹ رہی۔ اس نے احمد کے دیئے ہوئے کمبل کو کھولا۔ اور اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا۔ کمبل میں سے احمد کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہی خوشبو جو یاسمین اس کے چلے جانے کے بعد فضاؤں میں سے سونگھتی رہی تھی۔ احساس غم سے ایک بار اس کا سارا جسم کانپا۔ اور وہ پھٹے

ہوئے کمبل سے اور بھی زیادہ لپٹ گئی۔ اتنی بڑی وسیع دنیا میں صرف یہی ایک کمبل ہی تو اب اس کا آخری سہارا رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے نکلتی ہوئی چیخ کو مشکل سے روکا ——— "میرے محبوب۔ میرے احمد" وہ کمبل کو چوم کر اس سے دیوانہ وار لپٹتی ہوئی سسک سسک کر رونے لگی۔ اور اسی وقت رات کے سنسان اندھیروں میں پنجاب میل تیزی سے بہار کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی ؛

زرد گلاب

کونسی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا، قافلۂ سخت جاں

(اقبال)

اے حمید

شروع نومبر کی ایک ابر آلود شام،

قصبہ ہری تاگ میں بارش ہو رہی ہے۔ ہلکی ہلکی، سرد، ویران اور اداس بارش میں قصبے کی اونچی نیچی تنگ و تاریک پتھریلی گلیاں سنسان دکھائی دے رہی ہیں۔ ان گلیوں کے کونوں پر جلنے والے بُرادہ لیمپ کچھ بجھ گئے ہیں اور کچھ جلتے ہوئے ٹھٹھرتی ہوا میں کانپ رہے ہیں۔ بڑے بازار کی تمام دکانیں بند ہیں۔ اور اُن کے جھکے ہوئے زنگ آلود سائبان جگہ جگہ سے ٹپک رہے ہیں۔ منڈی کا صحن بارش اور کیچڑ میں دلدل بنا ہوا ہے۔ صحن کے اردگرد چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں کہیں دن بھر کے تھکے ماندے مزدور پھٹے ہوئے کمبل اوڑھے سو رہے ہیں اور کہیں گیس کی روشنی میں زرد چہروں والے بیوپاری تجوریوں کے سامنے کھاتہ کھولے حساب کتاب میں مصروف ہیں۔ نچی چھت والی پرانی خدام گردش میں ایک خستہ حال گھوڑی، دو بیل اور ایک بھینس بندھی ہے۔ ان کے پاس ہی اُدھیڑ عمر کا چوکیدار آگ جلائے بیٹھا سرخ کٹالی میں آٹا گوندھ رہا ہے۔ تیز ہوا میں چھپر کی سرخ چھپیاں صرف کڑواہٹ دے رہی ہیں۔ چوکیدار کی ناک سردی میں ٹھٹھر رہی ہے۔ اور اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ صحن والے نیم کے پیڑ تلے ایک ریڑھا اپنے دونوں بازو اُوپر اٹھائے نومبر کی بارش میں بھیگ رہا ہے۔ بستی کے جنوب میں صفدر عمد کی یادگار اُجڑی ہوئی، پرانی خستہ حال حویلیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ کچھ حویلیاں ڈھے چکی ہیں اور ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو باقی بچی ہیں ان کے گھٹے ہوئے بدبودار تاریک دیوان خانوں میں ضلع رہتک اور ریاست الور کے مہاجرین آباد ہیں۔ حویلیوں کی سیلی سیلی کمزور چھتیں جگہ جگہ سے ٹپک رہی ہیں اور ضلع رہتک اور ریاست الور کے مہاجرین اپنی گدڑیاں اٹھائے کبھی یہاں بیٹھ رہے ہیں اور کبھی وہاں اُٹھ رہے ہیں۔ ان کے کالے کالے بچے روٹی کی پھٹی ہوئی صدیوں میں زور زور سے رو رہے ہیں اور ان کی زرد آنکھوں والی مائیں انھیں مار پیٹ رہی ہیں۔ اور ان کے دُبلے پتلے ٹانگوں والے خاوند انھیں گالیاں دے رہے ہیں اور بکریاں۔

تیار ہی ہیں اور کہیں کانسی کی لوٹیا لڑھک کر نیچے گر پڑی ہے اور کہیں گرم گرم نمدے میں سوئی ننھی رو کلیا پر بھی بارش کا پانی ٹپکنے لگا ہے۔ اور وہ روتی ہوئی ماں کو پکار رہی ہے۔ اور کونے میں بیٹھا ہوا ایک ہڈیوں کا ڈھیر ڈاونٹ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے اور بڑے اطمینان سے جگالی کر رہا ہے۔

ان حویلیوں سے پرے جوار کے کھیتوں کے پار، نہر کے سنسان پل پر بستیاں بھاتی ٹھنڈی ہوا شیشم کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کو جھولا جھلا رہی ہیں۔ نہر لبالب بھری ہوئی ہے اور اس کا گیروے رنگ کا پانی کناروں سے اچھل کر باہر آ رہا ہے، آسمان گہرے سرمئی بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ نہر کی پرلی جانب ٹوٹی پھوٹی پرانی چار دیواری کے اندر آم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں مغل دربار کی کوئی گمنام کنیز دفن ہے۔ بارہ دری میں چاروں طرف سے مینہ کی پھوار اندر آ رہی ہے۔ آم کی ٹھٹکی ہوئی ٹہنیاں بارہ دری کے ستونوں سے اپنا آپ جھاڑ رہی ہیں۔ قبر کے پتھروں پر کائی جم رہی ہے۔ اور کہیں گھاس اگ آئی ہے ابھی ابھی بجلی چمکی تھی۔ اور اس کی نیلی روشنی میں ہری ناگ کے قصباتی سٹیشن کو جانے والی کیچڑ سے بھری ہوئی دلدلی سڑک دور تک روشن ہو گئی تھی۔ یہاں سے سٹیشن سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ ہری ناگ سٹیشن کے اکھڑے اکھڑے فرش والے چپٹے پلیٹ فارم پر دن میں صرف دو ریل گاڑیاں رکتی ہیں۔ یہاں کا سٹیشن ماسٹر ٹکٹ چیک بھی کرتا ہے اور بانٹتا بھی ہے۔ وہ صرف گاڑی کے وقت پلیٹ فارم پر نیلی ٹوپی پہنے موجود ہوتا ہے۔ باقی سارا وقت وہ اپنے کوارٹر میں بیوی کی ران پر سر رکھے فلمی گانوں کے پلاٹ پڑھتا رہتا ہے۔ اور مدھوبالا کو یاد کرتے ہوئے اپنی بیوی کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔ اور پلیٹ فارم کے دھندلے لیمپ تمام رات ٹمٹماتے رہتے ہیں۔

قصبہ ہری ناگ بڑی پرانی بستی ہے۔ کہتے ہیں مغل شہنشاہوں کا شاہی قافلہ کشمیر جاتے ہوئے یہیں سے گذرا کرتا تھا۔ جموں کی طرف جانے والی اس پرانی سڑک کے آثار آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہری ناگ کے مشرق میں پرانے کھال پر جھکا ہوا اونچی چھت والا بوسیدہ پل، ذرا آگے جا کر نانک شاہی اینٹوں والا پرانا کنواں اور آدھا گرا ہوا مینار، اور دور تک سڑک کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی دیوار، اور ادھر اُدھر کھیتوں میں پھیلے ہوئے اگلے وقتوں کے محرابی کھنڈرات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کبھی یہاں سے بھی وہ رنگ اور خوشبو اڑاتے قافلے گزرا کرتے تھے جن میں شہزادے آسام کے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے اور لمبی آنکھوں اور پتلے ہونٹوں والی شہزادیوں کے ابریشمی محمل پھٹے ہوئے سیاہ پاؤں والے حبشیوں نے اٹھا رکھے ہوتے تھے۔ آج اس سڑک پر سوائے کھنڈرات اور ویران حویلیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس سڑک سے ہٹ کر یہ شاہی قافلے اسی طرح رواں دواں ہیں۔ شہزادے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار گلاب کے پھولوں کو بار بار سونگھ رہے ہیں۔ اور سیاہ فام ننگے حبشی برستی چاکیوں میں نازک اندام شہزادیوں کے محمل اٹھائے پتھریلی شاہراہوں پر دوڑے چلے جا رہے ہیں، ہانپتے چلے جا رہے ہیں۔ صرف سڑکیں بدلی ہیں۔ صرف راستے تبدیل ہوئے ہیں۔ باقی وہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ ہر روز ایک انارکلی زندہ دفن کی جاتی ہے اور ہر رات شاہی محلوں میں جشن ہوتا ہے، اور ہر صبح ایک مسیح سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

بادلوں میں دھیمی دھیمی گرج پیدا ہوئی ہے۔

بارش کچھ تیز ہو گئی ہے۔ جموں کی پہاڑیوں کے دامن میں ہونے کی وجہ سے ہری ناگ میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور سردی بھی بہت پہلے آ جاتی ہے۔ حالانکہ یہاں کوئی پہاڑ نہیں۔ صرف میدان ہیں۔ بے رنگ چپٹے میدان اور کھیت، کچی سڑکیں،

ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیاں اور گندے پرسکون سبز جوہڑوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بوسیدہ چھجوں والے مکان، کائی زدہ گنبدوں اور مینارون والی دو ایک پرانی مسجدیں، قصبے سے باہر ٹیلے کے پاس نہر کنارے کی پہلی گلی، چھوٹی سی منڈی، ایک بازار، کچھ اونچی نیچی پتھریلی گلیاں، چند ایک مزار گرے ہوئے بھٹے والا چونگی کا دفتر، پرانے بنچوں اور دو ایک لگی میز کرسی والا تھانہ اور نعل ساز کی دکان اور پرانی بارہ دری کے پاس پرانی طرز کا چاء خانہ اور دو حوض، بارش، سردی اور بس۔ قصبہ ہری ناگ میں گھومتے ہوئے آدمی کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انیسویں صدی کے کسی مضافی گاؤں میں آگیا ہے۔ یہاں کشمیریوں کے کئی ایک گھرانے آباد ہیں۔ یہ لوگ کہیں پندرھویں سولھویں صدی میں کشمیر کی وادیوں سے ہجرت کر کے قصبہ ہری ناگ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور تب سے اسی جگہ ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ لوگ رفوگری، شال بافی، زردوزی، شالوں کی رنگائی اور پشمینے کی خرید و فروخت کا دھندا کرتے تھے اور سال میں چھ ماہ گھر سے باہر بنگال، بنارس اور لکھنؤ میں گزارتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا۔ چنانچہ کسی نے کوئی پکی الاٹ کروالی۔ کسی نے ڈپو کھول لیا۔ کسی نے شہر میں کٹ پیس کی دکان کھول لی اور کوئی محض پرانے دنوں کی یاد میں آہیں بھرنے کے لیے گھر میں بیٹھ گیا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی روایات اور وضعداری ہاتھ سے نہ چھوڑی تھی۔ ان کے گھروں میں آج بھی رات کو چاول اُبلتے تھے اور صبح کو نمکین چائے پکتی تھی۔ اور چولہے میں سارا دن آگ جلتی رہتی تھی۔ تہواروں پر اُسی طرح پکوان پکتے تھے۔ اور سردیوں میں ہر تیسرے روز شب دیگ چڑھتی تھی اور رش مالو کا دن منایا جاتا تھا۔ ان کے گھروں میں آنے والے مہمان کے سامنے آج بھی سبز چاء کا سماوار، باقرخانیاں اور شیرمال اسی طرح رکھا جاتا اور میزبان عورتیں مہمان کو بار بار کہتیں۔ ہائے اپنی کھاؤ نا! یہ بھی لو، وہ بھی ذرا چکھو نا!

مگر یہ باتیں بیشتر کشمیری گھرانوں میں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر سے لڑھکے ہوئے پتھر کی طرح ہر ٹھوکر کے ساتھ روایات کی کرچیں ہوا میں اڑتی جا رہی تھیں۔ اس کے باوجود کچھ گھرانے ان روایات کو بحال رکھنا ہی فرض سمجھتے تھے، اور وہ ہر قیمت پر اپنی وضعداری نبھائے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ صرف اپنے کلچر کے لیے زندہ ہیں اور اپنے کلچر کے لیے مر جائیں گے۔ ان ہی میں ایک گھرانہ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی کا بھی تھا۔ اس خاندان کو ہائی کورٹی اس لیے کہتے تھے کہ میر غلام حسن شاہ کا پردادا کلکتہ ہائی کورٹ کا سب جج رہ چکا تھا۔ وہ اپنے سوداگر باپ کے ساتھ بنگال کاروبار سیکھنے گیا تھا۔ کہ اس نے قانون پڑھنا شروع کر دیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی اور اپنی طبع زاد ذہانت اور خداداد صلاحیت کے باعث ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلا لیکن بیرسٹری سے آگے نہ پہنچ سکا۔ اب یہ خاندان پشمینے کی سوداگری چھوڑ قانون پڑھنے لگا۔ میر غلام حسن شاہ کے والد وکالت میں بری طرح ناکام رہے اور آپ نے پھر وہی پرانا دھندا شروع کر دیا۔ میر غلام حسن کلکتہ میں پڑھا کرتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد آپ نے ایل۔ ایل۔ بی کیا اور باپ کی طرح آپ بھی وکالت میں ناکام رہے لیکن ناکامی کے بعد آپ نے کاروبار میں پھنسنا گوارا نہ کیا اور آئی سی ایس کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ نے اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور آپ کو لیگل ریمیمبرینس میں ایک شایانِ شان عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کا پورا عرصہ کلکتہ، کان پور، الہ آباد، لکھنؤ اور مدراس میں گزارا اور ریٹائر ہو کر قصبہ ہری ناگ پہنچے ہی تھے کہ ملک میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور ایک سال بعد فسادات شروع ہو گئے اور پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب پنشن کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پرویڈنٹ فنڈ کا جھگڑا چار سال تک چلتا رہا۔ ادھر پرانے خاندان کے رکھ رکھاؤ میں فرق آگیا تھا۔ دونوں بڑی لڑکیاں سعیدہ اور زبیدہ

بی۔ اے کرنے کے بعد گھر آن بیٹھی تھیں۔ چھوٹی لڑکی رضیہ کو ایف۔ اے کے دوسرے سال میں ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر باپ کے دو جوان بیٹے فوت ہو گئے تھے۔ اور وہ جوان بیٹوں کی شادی کی فکر میں تھا۔ بنک میں جو جمع پونجی تھی ختم ہو رہی تھی۔ تھیسے کی میونسپلٹی کی خالی خولی صدارت ملی ہوئی تھی۔ کپڑے کے ایک کارخانے میں معمولی سا حصہ بھی تھا۔ لیکن شہرت نہ ملنے سے کارخانہ ایک دن چلتا تھا اور تین دن بند رہتا تھا۔ اور کچھ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹ ویسے بھی لوگوں کو اپنی آن بان دکھانا چاہتے تھے۔ پریوینٹ فنڈ کا روپیہ دور کی بات تھی۔ آپ نے اپنی بیگم کو پرانا قدیمی مکان گروی رکھنے کا مشورہ دیا۔ پرانی طرز کی نجیب الطرفین کشمیری عورت نے مکان گروی رکھنے سے منع کیا۔ لیکن میر صاحب مانتی نہ ہوئے۔ مکان گروی رکھ کر کاغذات پر دستخط کر کے آپ گھر لوٹے ہی تھے کہ پریوینڈنٹ فنڈ کے پاکستان پہنچنے کی چٹھی آ گئی۔ بیگم نے کہا۔

مکان چھڑا لائیے، میر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

ضرور چھڑا لائیں گے۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا،

لیکن رات نے کچھ ایسے خواب دکھلائے کہ مکان چھڑانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ چنانچہ نومبر کے بھیگے ہوئے ٹھٹھرتے وہ دن تھے جب میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹ کے قصبہ بیری ناگ والے پرانے حویلی نما گھر میں زبیدہ اور سعیدہ کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ——— اور آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور بوندیں پڑ رہی تھیں۔

یہ پرانا حویلی نما مکان آبادی سے ہٹ کر واقع تھا۔

اس کے سامنے سے چھوٹی سی ندی گذرتی تھی اور عقب میں زنگ آلود دیواروں پر عشق پیچاں اور گلاب کی جنگلی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور لیموں کا ایک پرانا باغ تھا۔ مکان کے صدر دروازے کی دہلیز گھاس میں چھپ گئی تھی اور دوسری منزل کے تمام کمرے بند تھے۔ ان پر اسرار بند کمروں میں دیواروں اور روشندانوں پر گرد کی تہیں جم رہی تھیں۔ قد آدم آئینوں پر جالی دار پردے لٹک رہے تھے۔ الماریوں صدی کا کرم خوردہ فرنیچر بھورے رنگ کی موٹی چادروں میں ڈھکا ہوا تھا۔

کونوں میں ڈھیر لکڑی کے بوجھل صندوق اور علم سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر جالا لٹک رہا تھا۔ لمبے چوڑے گرد آلود پلنگوں پر خاندان کے بڑے بوڑھوں کی تصاویر اوندھے منہ پڑی تھیں اور ان کے نیچے ٹڈیوں نے انڈے دے رکھے تھے۔

اندھیری راتوں کو جب تیز زمستانی ہوا کے جھونکے روشن دانوں اور بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے اندر داخل ہوتے تو دیواروں پر گرے ہوئے پردے آہستہ سے پھڑپھڑاتے اور محسوس ہوتا گویا ان ویران کمروں میں صدیوں پارینہ کی گم شدہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہ کمرے مدتوں سے بند پڑے تھے اور ان میں کبھی کوئی داخل نہ ہوا تھا۔ وقت کا سیلاب ان گمنام قبروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ پہلی منزل کی اونچی چھتوں بھدی دیواروں اور موٹے گرم قالینوں سے ڈھکے ہوئے فرشوں والے کمروں میں زندگی اور صفائی اور روشنی تھی۔ یہ کمرے صاف ستھرے، قیمتی اور بوجھل سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں دروازوں پر گہرے قرمزی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ اور ان کے پٹ کھلتے وقت کوئی آواز نہ دیتے تھے۔ وہ یوں نرمی سے کھل جاتے جیسے آنے والے کو خاموشی سے اندر داخل ہونے کا مشورہ دے رہے ہوں۔ یہاں کی فضا میں خواب ایسی پر اسرار تن آسانی رچی ہوئی تھی اور ان کمروں میں

داخل ہو کر آدمی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ برفباری کی رات میں گرم گرم خوشبودار قہوے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ ٹھٹھرتی یخ بستہ تیز ہواؤں میں سے گزر رہا ہو اور کسی نے اسے نیم گرم ٹی کوزی میں چھپا لیا ہو۔ جیسے وہ سماوار میں داخل ہو گیا ہو۔ اس پرانے حویلی نما مکان کا ہر کمرہ سماوار کی طرح پُرسکون، نیم گرم اور معتدل تھا۔ اور ایسی فضا میں پرورش پانے سے گھر کے ہر فرد میں جذبات کا اعتدال اور آہنگ پایا جاتا تھا۔ یہاں کبھی کوئی آپس میں رشتہ داریوں کے موضوع پر نہیں جھگڑا تھا۔ یہاں کبھی کسی نے غصہ میں مُرغ ہو کر دوسرے پر کفگیر یا جلتی ہوئی لکڑی سے حملہ نہیں کیا تھا۔ یہاں کبھی کسی بچے کے ایک دم تیز تیز رو پڑنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہاں کے مکین سرِ شام کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے اور لیمپ بجھا دیئے جاتے تھے۔ صرف مکان کی پشت پر باورچی خانے کا لیمپ جل رہا ہوتا تھا۔ جہاں بوڑھی خادمہ اپنی بیٹی لاڈلی کی مدد سے برتن صاف کر رہی ہوتی تھی۔ پچھلے جب بستی کی طرف سے مرغوں کے اذانیں دینے کی صدائیں آتیں تو اس حویلی نما مکان کے ویران آنگن سے کوئی مُرغ جواب میں اذان نہ دیتا۔ بند کھڑکیوں کے اندر اور باہر ٹوٹتی رات کے آخری سائے چپ چاپ مدھم ہوتے رہتے اور لیموں کے باغ میں پیڑوں کی ٹہنیوں پر سے شبنم ٹپکتی رہتی اور پھر باورچی خانے کی چھت سے نکلتے ہوئے لیمپ کو دیا سلائی دکھائی جاتی۔ تیل کے لیمپ کی دھیمی دھیمی نرم روشنی میں خادمہ کی بیٹی لاڈلی آگ جلاتی۔ چائے کے لیے پانی رکھتی اور الماری میں سے چینی کے برتنوں کو نکال کر صاف کرنا شروع کر دیتی۔ بستی کی مسجدوں کے میناروں پر دن کی روشنی کا پھیکا اُجالا جھلکتا تو بوڑھی خادمہ سعیدہ میر، زبیدہ میر اور رضیہ میر کے کمروں میں جا کر انھیں بڑی نرمی اور پیار سے باری باری جگاتی۔

"اُٹھیے آپی۔ صبح ہو گئی،"

سب سے آخر میں وہ گھر کی مالکہ بڑی آپو کی خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹاتی۔

"آپو جی اذان ہو گئی،"

چالیس پینتالیس سال کی ادھیڑ عمر، سرخ و سپید مالکہ بڑے وقار سے اپنا مہارانیوں ایسا بوجھل جسم لیے ریشمی، نرم اور گرم لحاف میں سے باہر نکلتیں۔ غسل خانے میں وضو کے لیے پانی گرم ہوتا۔ وضو کرنے کے بعد وہ نماز پڑھتیں اور نماز کے بعد وہی مصلے جاتی۔ ان کے سیاہ و سپید بال پیشانی تک سفید شال میں ڈھکے ہوتے اور ان کے لب بند ہوتے اور جسم بے معلوم انداز میں جھول رہا ہوتا۔ اتنی دیر میں میر غلام حسن شاہ بھی نماز سے فارغ ہو جاتے اور لمبا گرم کوٹ پہن، سُرخ ترکی ٹوپی سر پر رکھ، چھڑی ہاتھ میں لے سیر کے لیے باہر نکل جاتے۔

سب سے بڑی بہن زبیدہ نماز سے فارغ ہو کر اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتی۔ لیکن سعیدہ بار بار جگانے پر بھی نہ اُٹھتی، اس کے سرخ و سپید خواب آلود چہرے پر بالوں کی لٹ بکھری ہوتی اور وہ ایک ٹانگ لحاف سے باہر نکالے ریشمی تکیے کو پیٹ کے ساتھ بھینچے ایک آدھ بار کچھ بڑبڑاتی اور ٹانگ لحاف کے اندر لے جا کر پھر سو جاتی۔

جب بادل نخواستہ اُسے اٹھنا ہی پڑتا تو وہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھ جاتی اور لحاف میں سے گرم شال کھینچتے ہوئے بار بار جمائیاں لینے لگتی۔ وہاں سے اٹھ کر لڑکھڑاتے، بے ربط قدم اُٹھاتی سنگار دان کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی اور آئینے پر جھک کر چہرے پر پھیلے ہوئے مہاسوں اور کیلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیتی۔ وہ ہر رات بے شمار کریمیں لگا کر سوتی تھی اور ہر صبح گالوں پر کوئی

نہ کوئی نیا کیل نکلا ہوتا تھا۔ اسے اپنے اچھے بھلے چہرے کی اس بدنمائی کا شدید احساس تھا اور وہ بہت کم آئینے کے سامنے ہوا کرتی تھی۔

بوڑھی خادمہ جب رضیہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر آہستہ سے جھک کر سرگوشی ایسی آواز میں کہتی۔

'چھوٹی بی بی! اٹھو بیٹی.....'

تو رضیہ اپنی نیند بھری بھیگی بھیگی سیاہ آنکھیں کھول دیتی۔ جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ اور وہ سوچتی کیا وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ کبھی کبھی خادمہ کے جگانے پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ جب سے پیدا ہوئی ہو تب سے جاگ رہی ہو اور کبھی نہ سوئی ہو۔ بوڑھی خادمہ لمحات اچھی طرح تمہ کرتے ہوئے کہتی۔

'میری بچی رضیہ تو سوتی ہی نہیں'

لیکن رضیہ ضرور سوتی تھی۔ دن کے وقت سوتی تھی۔ جاگتے ہوئے، باتیں کرتے، کھاتے، سوچتے، چلتے پھرتے، کتاب پڑھتے اور کھلی کھڑکی میں سے باہر باغ میں دیکھتے ہوئے سوتی تھی۔ ہمیشہ سوئی رہتی تھی۔ اُسے کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ کبھی جاگی بھی ہو۔ بچپن ہی سے اس کا جسم کمزور، دُبلا اور نازک تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہمیشہ بیمار رہی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی کڑوی دوائیاں پیتی رہی تھی۔ مسلسل بخار میں مبتلا رہنے سے اسے موت سے ڈر آنے لگا تھا اور زندگی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ خواب کے عالم میں رہنے لگی تھی۔ وہ قدرتی طور پر تنہائی پسند تھی اور اسکول میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے بہت کم ملتی تھی۔ اُسے ہر سہیلی صحت مند خوبصورت اپنے سے زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتی تھی اور وہ کسی سے گھل مل نہ سکی تھی۔ اس نے خیال ہی خیال میں اپنی چند ایک سہیلیاں بنا رکھی تھیں جن سے وہ تنہائی میں باتیں کیا کرتی۔ اسکول سے گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ کھڑکی کے پاس کورس کی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی اور خواب دیکھنے شروع کر دیتی۔ پھر ایکا ایکی وہ چونک کر خیال ہو جانے کے ڈر سے کتاب پڑھنے لگتی۔ رات کو ان کی پرانی خادمہ اسے باورچی خانے میں لیمپ کی دھیمی روشنی میں پریوں اور بھوتوں کی کہانیاں سنایا کرتی۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتے ہی رضیہ کو کہانی کی پریوں کا خیال بھول جاتا اور وہ بھوتوں کے خوفناک تصور سے ڈرنے لگتی اور جلدی سے لحاف منہ کے اوپر کر لیتی۔ پھر اُسے اپنے پرانے حویلی نما مکان کے گرد آلود ویران کمروں کا خیال آتا اور وہ دیکھتی کہ ان کمروں میں ایسی بدصورت چہروں والی کبڑی عورتیں چکر لگا رہی ہیں جن کے چہروں پر مکڑیوں نے جالے بن رکھے ہیں اور اس کا جسم خوف سے ٹھنڈا ہو جاتا۔ وہ بھاگ کر اپنی خیالی سہیلیوں کے پاس پہنچ جاتی اور ان کی باتوں میں خود کو بھلا دیتی۔ بچپن ہی سے رضیہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی۔ دن بھر وہ اسکول اور گھر میں خود فراموشی کے عالم میں وقت گذارتی۔ وہ بات کرتے کرتے فقرہ بھول جاتی اور غسل خانے میں ٹونٹی کھول کر نہانا بھول جاتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کی یہ تمام ذہنی الجھنیں ترقی کرتی گئیں اور گھر کی خاموش، جامد اور پُراسرار فضا نے ان اُلجھنوں کی زیادہ سے زیادہ پرورش کی۔ اب وہ کالج میں آ گئی اور یہاں بھی بہت دیر تک تنہائی اس کے ساتھ آئی۔ پڑھائی ختم کر کے وہ سیدھا ہوسٹل کے کمرے میں آ جاتی اور دروازہ بند کر کے کتابوں میں کھو جاتی۔ اس کا ادب کا مطالعہ ہر وقت کتابیں پڑھتے رہنے سے کافی وسیع ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اُسے ایڈگر ایلن پو بہت پسند تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس کی کتابوں سے خوف کھانے لگی اور اُسے پو کے نام کے ساتھ ہی اُس کالی بلی کا خیال آ جاتا جس کی لاش آتشدان میں دفن ہو۔ پہلے پہل اُسے ناولوں کی انگریزی پڑھتے ہوئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ پر دوسری سطر پر اسے ڈکشنری کھولنا پڑتی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ کتابوں نے اُسے بڑی تسکین دی تھی۔ جہاں اُس نے

بڑی محنت سے اور سیدھ انگریزی پر کافی عبور حاصل کر لیا اور ایف اے میں ہی وہ ایم اے کی لڑکیوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے انگریزی ادب کے وکٹورین عہد کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ ان ناولوں کی پُرسکون، پُراعتماد اور گھریلو تہی آسان نضا نے گویا رضیہ کے کھوئے ذہن پر ٹھنڈا پھاہا رکھ دیا۔

یہاں سے گزر کر اس نے تاریخ کی طرف رُخ کیا۔ تاریخ میں اس نے قبل از تاریخ کے دَور کو چھوڑ کر مصر اور ہند سے مطالعہ شروع کیا اور یونان اور روم سے ہوتی ہسپانیہ میں آ کر رُک گئی۔ غرناطہ کے آخری مُور شہنشاہ کے زوال کے ساتھ ہی اس نے تاریخ کی کتاب بند کر دی اور اپنے آپ کو قدیم ایتھنز، مصر، روم اور غرناطہ کا شہری سمجھنا شروع کر دیا۔ یورپ کی پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی میں اُسے سوائے درباری سازشوں اور خانہ جنگیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اُسے قدیم یورپ کے کسی شہر میں زیتون کے سایوں میں بیٹھ کر ادب اور فلسفہ اور موسیقی پر گفتگو کرنے والے رومی اور یونانی فلسفی دکھائی نہ دیے۔ روسی ادب میں سے اس نے تورگنیف اور چیخوف کو چن لیا۔ ٹالسٹائی کی متضاد باتیں اور عظیم اظہار بیان اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ گورکی اسے خشک لگا اور دستوفسکی کی دو کتابیں پڑھنے کے بعد اُسے اس خوفناک مصنف سے ڈر آنے لگا۔ اس کی کتابیں رضیہ کے ذہن میں اُن تمام الجھنوں کو بیدار کر دیتیں جنھیں اس نے قدیم یونانی کھنڈروں کے عظیم الشان ستونوں میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک عرصہ تک وہ جبراً ان سے بھی متاثر رہی۔ لیکن پھر اس سے اُکتا گئی۔ اُس کے ذہن کو سب سے زیادہ تسکین فرانسیسی ادب نے دی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک دم درختوں کی گھنی گھنی، گہری گہری، سوئی سوئی چھاؤں میں کسی ساکن پانی والے پُراسرار چشمے کے کنارے آ نکلی ہو اور ہر طرف نیلے پھول اور بھیگی بھیگی پُراسرار دھند پھیلی ہوئی ہو۔ اپنے تک کے اُسے تمام ایسے ادیب پسند تھے جن کی کہانیوں اور ناولوں میں پُراسرار دھند اور درختوں کی خواب آلود چھاؤں موجود تھی۔ مذہب پر اس نے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا عقیدہ متزلزل ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے فوراً کتاب پھینکی اور موم بتی جلا کر خدا سے دُعا مانگنا شروع کر دی کہ وہ اسے گمراہ ہونے سے بچائے رکھے۔ مذہب میں بھی اُسے ایک خاص قسم کی کلاسیکی رومانیت سے پیار تھا۔ نماز پڑھنے کی بجائے وہ پیغمبروں کو نیلی نیلی دھند میں ہاتھ اٹھائے پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر عبادت کی تلقین کرتے دیکھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ تصور ہی تصور میں ان مقدس نورانی چہرے والوں کو فرشتوں کے جھرمٹ میں سنہری ستاروں کے درمیان دیکھتی اور اس کے ہونٹ وفورِ جذبات سے کانپنے لگتے۔

پلنگ پر نیم دراز کتاب پڑھتے پڑھتے جب رضیہ تھک جاتی تو اپنی روز کی ڈائری لکھنا شروع کر دیتی۔ وہ بڑی گرمجوشی سے سارے دن کی بے رنگ کارروائی درج کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ڈائری کبھی کوئی نہ پڑھے گا۔ بلکہ وہ بیشتر خود بھی کبھی نہ پڑھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر رات اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ اور اب تک وہ کئی کاپیاں سیاہ کر چکی تھی۔ رات کا کھانا دوسری لڑکیوں کے ساتھ خاموشی سے کھانے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آتی اور سونے سے پہلے بستر پر دوزانو ہو کر بیٹھ جاتی اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ رضیہ کو اُس چھپی ہوئی مہربان ہستی سے بڑی محبت تھی جو ہمیشہ بانہیں پھیلا کر اپنی پُراعتماد محبت کی آغوش میں لے لیتی تھی اور جو اس کی ہر خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے عجیب عجیب قسم کے شکوک و

شبہات گھیر لیتے۔ کتابوں میں پڑھی ہوئی سنگدل، بے رحم باتیں کتابوں سے نکل کر نیزوں اور برچھیوں سے اس کے عقیدہ کی دلہن پر حملہ آور ہوتیں اور وہ سہم کر سکڑ جاتی اور غیر شعوری طور پر قرآن کی کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ پلک جھپکنے میں ہر طرف روشنی اور گہرا امن طاری ہے اور کتابوں سے نکلی ہوئی بے رحم فوج کے خونخوار سپاہی غائب ہو چکے ہیں۔ دعا مانگنے کے بعد وہ پہلے معدہ صاف کرنے والی دوائی پیتی۔ پانچ منٹ بعد سارے دن کی خواب آور گولی پانی سے نگلتی اور بتی بجھا کر نیند کی راہ دیکھنے لگتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب نیند نہ آتی تو وہ ایک گولی اور نگل لیتی۔

کالج چھوڑنے کے بعد رضیہ اپنے قصبہ والے قدیم مکان میں آ گئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو باقی دنیا سے الگ کر کے تاریخ ادب، فلسفہ اور موسیقی کی ضخیم کتابوں کی چار دیواری میں بند کر لیا تھا۔ اُسے اپنے پرانے مکان اور اپنی بارعب، شفیق آنکھوں والی ماں اور باپ سے محبت تھی۔ اُسے سعیدہ اور زبیدہ سے بھی پیار تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں سے بہت کم بولتی تھی اور اپنے ہی خیالات میں گم رہتی تھی۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ اُن اجنبی جزیروں کے تصورات میں گم ہوتی جہاں اُس کے خیال میں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اُسے اپنی دوسری بہنوں کی طرح نہ تو اچھے اچھے کھانوں کا شوق تھا اور نہ قسم قسم کے بیش قیمت کپڑے پہننے کی ہوس تھی۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ پڑھنا اور خواب دیکھنا، پھر پڑھنا اور پھر خواب دیکھنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوفوکلیس کے کسی المیہ ڈرامے کا کوئی کردار ہے جو اپنے کرم خوردہ مستوے سے باہر آ گیا ہے اور پھر وہاں جانے کو بے قرار ہے۔

رات زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ بارش بدستور ہو رہی ہے۔ آسمان اور زمین کو ایک تاریک بادل نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بھیگی ہوئی سرد کی تیز ہوا اُسی طرح چل رہی ہے۔ قصبے کی گلیاں سنسان ہیں اور مکانوں کے پرنالوں سے بارش کا پانی مسلسل شور کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ پرانے حویلی نما مکان کی پہلی منزل کے تمام لیمپ بجھ چکے ہیں۔ باورچی خانے کی کھڑکی بند ہے۔ اور روشندان پر اندھیرا ہے۔ صرف رضیہ کے کمرے کا لیمپ جل رہا ہے۔ اور اُس کے روشندان میں سے ہلکی بارش کا عکس باہر بارش ٹپکتے ہوئے لیموں کے پرانے درختوں پر پڑ رہا ہے۔ کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ اندر کی طرف گہرے قرمزی رنگ کا بھاری پردہ گرا ہے اور اس کے ساتھ ہی رضیہ سیاہ آبنوسی میز پر جھکی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اُس کا لباس ہلکے زرد اور فاختائی رنگ کا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی ہلکا زردی مائل سفید ہے۔ جسم دُبلا اور کھلی کتاب کی ایک طرف سمٹی ہوئی انگلیاں نازک اور لمبی لمبی ہیں۔ لمبے سیاہ بال دوپٹے میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دوپٹہ کچھ اس طرح اوڑھا گیا ہے کہ کشادہ پیشانی کا نصف حصہ بھی چھپ گیا ہے۔ کانوں میں سنہری رنگ کی دو چھوٹی چھوٹی بالیاں ہیں۔ بڑی بڑی سوگوار آنکھیں کتاب پر جھکی ہوئی ہیں اور مختصر، باریک، سیدھی کشمیری ناک کے ملائم بہاؤ میں ایک عجیب قسم کا کلاسیکی اسلوب ہے۔ دُبلے چہرے پر زرد گلاب کی افسردگی اور پت جھڑ کی دھوپ کی ملول چمک ہے۔ یہ چہرہ ایک ایسی ویران جھیل سے مشابہ ہے۔ جس کی سطح پر کہیں کہیں زرد پتے بکھرے ہوئے ہوں، اور جس کی تہہ میں گھنی جھاڑیوں کی اُلجھی ہوئی پیچیدہ ٹہنیاں صاف دکھائی دے رہی ہوں۔ میز کی ایک جانب کتابوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی ہے اور کچھ کاپیاں پڑی ہیں اور دوسری جانب اخروٹ کی

لکڑی کے بنے ہوئے چنار کے ایک چوڑے پتے میں سلائیڈوں کی کچھ گولیاں رکھی ہیں۔ کانسی کے ایک لمبوترے گلدان میں گلاب کی بیل کے دو تین پھول مرجھا رہے ہیں۔ پاس ہی تپائی پر چھوٹی چھوٹی سینی قینچیوں والی چینی کی ایک خوبصورت چادانی اور اُسی طرز کا ایک پیالہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا پرے گہرے سرخ قالین پر سعیدہ اور زبیدہ دونوں بہنیں بیٹھی لالی کے ساتھ مل کر اپنے سروسی جوڑوں پر سجاوٹی ستارے ٹانک رہی ہیں۔ بھرے بھرے جسم والی گوری چٹی سعیدہ پاس رکھی پلیٹ میں سے مرتبہ لگے بسکٹ کھا رہی ہے۔ کام بھی کر رہی ہے۔ اور باتیں بھی کر رہی ہے۔ زبیدہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور صرف ہوں ہاں میں سعیدہ کی باتوں کا جواب دے رہی ہے۔

"بھئی باجی یہ کیا ہوا؟ تم کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟"

زبیدہ ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے آہستہ سے کہہ رہی ہے۔

"رضیہ پڑھ رہی ہے۔"

اور سعیدہ بڑبڑانے لگتی ہے۔

"وہ تو ہر وقت پڑھتی رہتی ہے۔"

اور کالی کالی بلی ایسی آنکھوں والی لالی دبے دبے ہنس رہی ہے۔ رضیہ کے گول کندھوں پر سے سرمئی رنگ کی گرم شال نیچے کھسک آئی ہے۔ وہ اُسے اوپر کھینچ رہی ہے اور سعیدہ نچلے ہونٹ پر سے مرتبہ چونچتے ہوئے کہتی ہے۔

"رضیہ! بھئی ذرا ہمارا ہاتھ بھی بٹاؤ نا؟"

رضیہ اپنی بڑی بہن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ زبیدہ جلدی سے بول اٹھتی ہے۔

سعیدہ تم چپ بھی رہو گی یا نہیں؟

سعیدہ فوراً کہتی ہے "نہیں"۔

اور بسکٹ چبانے لگتی ہے اور باہر بجلی ایک بار پھر چمکتی ہے اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دیتی ہے اور رضیہ O' SHANGHNESSY کی یہ سطریں پڑھ رہی ہوتی ہے۔

WE ARE THE MUSIC-MAKERS
AND WE ARE THE DREAMERS OF DREAMS,
WANDERING BY LONE SEA-BREAKERS,
AND SITTING BY DESOLATE STREAMS.
WORLD-LOSERS AND WORLD FORSAKERS.

زبیدہ اور سعیدہ کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں شادیاں ایک ہی روز ہوئیں اور لاہور سے دونوں کی باراتیں ایک ہی وقت میں آئیں۔ قصبے کے سٹیشن سے باقی کوٹھیوں کے حویلی نما پرانے مکان تک کچی سڑک پر کاروں کی قطار بند ہو گئی۔ میر غلام حسن شاہ باقی کوٹھی نے بھی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ اور یوں ثابت کر دیا کہ باقی کوٹھیوں کا خاندان لاہور کے کسی بڑے کشمیری خاندان

سے پیچھے نہیں ہے۔ دونوں بہنوں کو جہیز میں اس قدر سامان ملا کہ اُسے بیک کرتے ہوئے طرحدار سٹیشن ماسٹر کو تین بار ٹیسل بنانا پڑی اور قصبے کے گھروں میں کئی روز تک اس کے چرچے رہے۔ اُسی رات بوسیدہ حویلیوں کی گھٹی ہوئی چھت کے نیچے ضلع رہتک کے پناہ گیر گوالے کے پہلو میں لیٹی ہوئی اُس کی بیوی نے اپنے خاوند سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"گھوارے! ہماری شادی ایسی نائیں ہوئی ہے؟"

اور گھوارے نے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔

"گھانس چر گئی ہے کیا؟"

قدیم کشمیری روایات کے مطابق دُلہنوں کو پو پھٹنے سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔ رات بھر صدیوں بوڑھے طلسمی ایسے مکان کی پہلی منزل میں دبی دبی ڈھولک دھمکتی رہی۔ لیمپوں، موم بتیوں اور شمعدانوں کی بھرپور چمکیلی روشنی میں کراچی، پشاور، لاہور اور پنڈی سے آئی ہوئی رشتہ دار عورتوں، بھڑکیلے کپڑوں والی بچیوں اور بے باک چہروں اور مفید مسموں والی جوان لڑکیوں نے بند کمروں میں کشمیری، پشتو، پنجابی اور فلمی گیت گائے اور جی بھر کر شور مچایا۔ رقص کیا۔ باتیں کیں اور کھایا اور پھر ٹانگیں پسار کر سو گئیں اور خراٹے بھرنے لگیں۔ جب رات ڈھل رہی تھی۔ اور ستاروں کا نور ٹھٹھرتی رات کی تنہائیوں میں زرد غبار بن کر اُڑا جا رہا تھا تو سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت نے کانپتے ہونٹوں سے ڈھولک کی بے ربط تال پر ایک پرانا کشمیری گیت گایا۔ جس میں بچپن کے گزشتہ دنوں کا سوگ منایا گیا تھا اور جب وہ اس بند پر پہنچی تو اس کی عمر رسیدہ پلکوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہم تو جنگل میں زعفران چننے نکلی تھیں،
کہ راستہ بھول گئیں،
ہمارے سروں پر سفید برف ہے
اور برف میں پھول دفن ہیں،
سارے پھول دفن ہیں،

یہ بوڑھی عورت دوسری عورتوں کے ساتھ آتشدان کے پاس قالین پر بیٹھی تھی۔ گیت ختم ہو گیا۔ کسی عورت نے کوئی بات نہ کی۔ سب چپ ہو گئیں اور پرانی یادوں میں کھو گئیں۔ دو جوان لڑکیاں ریشمی کسل اوڑھے قالین پر ایک دوسری سے لپٹی سو رہی تھیں۔ کونے والے پلنگ پر سر ٹیکے پڑے۔ آنکھیں بند کئے رضیہ نے اس بوڑھی عورت کا پورا گیت سنا تھا جو جنگل میں زعفران چننے نکلی تھی اور راستہ بھول گئی تھی۔ اس گیت نے رضیہ پر بڑا اثر کیا تھا۔ اس کی گرم پلکوں میں بھی آنسوؤں کی نمی کپکپانے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر اس بوڑھی عورت کے پاس جا کر بیٹھ جائے اور اُس کا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے پوچھے، بڑی آپا! مجھے بھی اس جنگل کی راہ بتاؤ جہاں زعفران اُگتی ہے۔ اور جہاں پہنچ کر کنواریاں گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ لیکن وہ گرم لحاف میں چپ چاپ لیٹی رہی اور زرد گیت کی زعفرانی مہک نے اُسے اپنے خشک پتوں میں سمیٹ لیا۔ ساتھ والے کمرے میں اس کی دو بڑی بہنیں دلہنیں بنی بیٹھی تھیں اور اُسے ان کی سہیلیوں کی ہنسی، قہقہوں اور باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اکیلا بیٹھی رضیہ کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوا۔ کیا ایک روز اُسے بھی اسی طرح دلہن بنا کر سجایا جائے گا اور وہ بھی کسی اجنبی کے ساتھ روانہ کر دی جائے گی؟ رضیہ کو یقین

نہیں آ رہا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب وہ اپنی ساری انفرادیت کو کتابوں کے پرانے جزدانوں میں بند کر کے رکھ دے گی۔ اور کسی دوسرے کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دے گی۔ اُس نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی اتنی سنجیدگی سے غور نہ کیا تھا۔ وہ چونکی سی ہو گئی۔ یہ شادی تو اس کی موت ہو گی۔ لیکن اس گھر میں رہتے ہوئے وہ اس موت سے نہیں بچ سکے گی۔ پھر کیا ہو؟ کیا وہ چپ چاپ مر جائے؟ رضیہ کے جسم میں شادی کے خیال سے ناامیدی کے باوجود ایک کیف آور کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے سوچا کہیں اس کے اندر عورت مر تو نہیں گئی! لیکن اسے یقین تھا کہ یہ عورت زندہ ہے۔ کبھی کبھی غسل خانے میں نہاتے ہوئے وہ اپنے دُبلے لیکن سڈول اور کنوارے بدن کے خم و پیچ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط میں بڑا بہاؤ اور سڈول تھا۔ گول شانوں پر سے نیچے کو پھسلتی ہوئی قوسیں کمر پر آ کر مل گئی تھیں اور یہاں سے پھر دو نصف دائرے کولہوں پر سے اُبھرتے ہوئے پنڈلیوں تک چلے گئے تھے۔ وہ اپنے جسم پر یونانی شہزادیوں کی طرح بڑے وقار سے آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی اور جب اس کا ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی کچے اناروں ایسی چھاتیوں پر پہنچتا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل جاتی اور وہ کانپنے لگتی اور جیسے کچے انار بھی اپنی نازک ٹہنیوں پر کانپنے لگتے۔ اس لمحے رضیہ کا دل گہری، غیر فانی اور لطیف مسرت سے لبریز ہو جاتا اور اُسے یقین ہو جاتا کہ ابھی اس کے اندر وہ سنتے زندہ ہے، جس کے مر جانے سے اس کا سارا علم، سارا آرٹ اور سارا فلسفہ راکھ کی بجھی ہوئی ڈھیری بن کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے جسم کے معبد میں اس آگ کو ہمیشہ جلائے رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اس آگ میں اپنی کتابوں کا ایک ورق جلتے دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ کسی وقت رات کو لیمپ کی روشنی میں پڑھتے ہوئے یوں لگتا جیسے کوئی بڑا ہی خوبصورت چمکیلی آنکھوں والا بچہ کرسی کا سہارا لیے کھڑا ہے۔ اور اپنے ننھے ہاتھ سے اس کی شال کھینچ رہا ہے۔ وہ چونک کر دائیں بائیں دیکھتی اور وہ خوبصورت بچہ غائب ہو جاتا، لیکن ایسے لمحات بہت کم آتے تھے۔ اسے ہر کتاب سے اپنے بچوں ایسی محبت تھی اور قدیم یونان کا ہیرو لعزیز جرنیل اس کا محبوب تھا۔ جس کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر اس نے فرات کی وادی کو کئی بار عبور کیا تھا اور بابل کے شاہی مندروں میں دیوتاؤں کے قدموں پر اپنے خون کے چھینٹے پھینکے تھے اور حبشی غلاموں کے کندھوں پر رکھی ہوئی زرفشاں عماری میں بیٹھ کر نینوا کے زندگی خیز بازاروں کی سیر کی تھی۔ چنانچہ آج بھی اپنی شادی اور بچوں کے تصور سے اُسے ہنسی آ گئی۔ فلاٹیر کی طرح اس نے بھی آرٹ کے ساتھ بیاہ رچا رکھا تھا اور جس کی شادی ہو چکی ہو، اُسے شادی کی کیا ضرورت! رضیہ نے آنکھیں کھول کر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ آتشدان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی اور بوڑھی عورتیں سماوار میں سے نمکین چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھیں۔

شادی بیاہ کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور پرانے گھر کو ایک بار پھر پُراسرار خاموشی اور سرد تنہائیوں نے گھیر لیا۔ رضیہ ایک بار پھر اپنے خیالی اجنبی جزیروں میں نکل گئی۔ لیکن اب اس مکان کی مسلسل متانت اور خاموشیوں میں فرق آ گیا تھا۔ زبیدہ کا خاوند ہر ہفتہ کی شام کو اپنی کار میں بیٹھ کر قصبے میں آ دھمکتا اور ہفتہ کی رات اور اتوار کا پورا دن اپنی بیگم کے ساتھ وہیں بسر کرتا۔ رضیہ کی تنہائی مجروح ہو رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کم سخن اور گھر بیٹھ کر کھاؤ کی پابند زبیدہ کا موٹا، بھدا ہٹا کٹا خاوند لاہور کے بڑے ہسپتال میں نائب سرجن تھا اور سوائے اپنے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی بلند آواز میں بات کرتا، وحشیوں کی طرح کھاتا اور کھاتے کھاتے پاگلوں کی مانند پورے جبڑے کھول کر قہقہے لگاتا اور آنکھیں پونچھتا ہوا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ اس کے

سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سیاہ گھنگھریالے بالوں کا ایک جنگل اُگا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا۔ اُس کے گھٹے ہوئے مانتے اور بھدی ناک پر ہر وقت پسینہ آیا رہتا۔ جسے وہ بائیں ہاتھ سے پونچھ کر دوسری طرف پھینک دیا کرتا۔ محفل میں بیٹھے اُسے صرف اپنا خیال ہوتا۔ چنانچہ کئی بار اُس نے بڑی آپا اور میر صاحب کی موجودگی میں ہی اپنے یورپ کے قیام کی شراب اور آوارہ عورتوں کے قصے سنانے شروع کر دیئے اور زبیدہ نے ہر بار انتہائی دور اندیشی سے باتوں ہی باتوں میں موضوع بدل دیا۔

رضیہ کو زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند انتہائی ناپسند تھا۔ لیکن وہ اپنی بڑی بہن کی خاطر اس کی ہر بات تحمل سے سنتی اور خندہ پیشانی سے اُس کا جواب دیتی

بات بات پر بھڑک اُٹھنے والی مزاج کی گرم اور طبیعت کی تیز سعیدہ کا خاوند لاہور کے ایک مشہور کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ وہ لمبے چوڑے مگر پتلے دُبلے جسم کا ایک شرمیلا نوجوان تھا۔ جو بہت کم بات کرتا تھا اور بات کرتے ہوئے کنواری لڑکیوں کی طرح شرما جاتا تھا۔ جب وہ چپ ہوتا تو معلوم ہوتا اس کے سینے میں جذبات کا ایک سمندر سو رہا ہے۔ لیکن جب بات کرتا تو اس کا لہجہ اس قدر پُر محبت اور پُر خلوص ہوتا کہ محسوس ہوتا اس کے دل میں سوائے اس بات کے اور کچھ نہیں تھا۔ رضیہ نے اُسے قہقہہ لگا کر ہنستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کسی وقت وہ صرف پتلے ہونٹ کھول کر مسکرا دیتا تھا اور یہ مسکراہٹ آبشار کی طرح اس کے چہرے سے گر کر ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گندمی چہرے کے نقوش باریک تھے اور ان میں دل کو گرم رکھنے والی بڑی نیک سی اُداسی رچی ہوئی تھی۔ اس اداسی میں چٹانوں سے ٹکراتی سمندری موجوں کا ہیبت ناک شور بھی تھا اور پُر سکون جھیل کی تہہ میں سوئے ہوئے زرد پتھر کی آسودگی بھی تھی۔ اس کے جسم کا سب سے زیادہ پُر کشش حصہ اس کی آنکھیں تھیں۔ شربتی رنگ کی دو پُر مردہ سی آنکھیں، جن میں ہر وقت کسی شے کا خمار سلگتا رہتا تھا۔ وہ ان آنکھوں کو ذرا سکیڑ کر باتیں کرنے کا عادی تھا اور رضیہ کو ہر بار بات کرتے ہوئے اپنے چہرے پر طلوع ہوتے سورج کی پہلی نیم گرم کرنوں کی حدت محسوس ہوتی۔ اُس کے پاس بیٹھ کر باتیں سنتے ہوئے رضیہ کو محسوس ہوتا جیسے گوگول اس کے سامنے بیٹھا اپنی کتاب "ڈیڈ سولز" کا کوئی حصہ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ رضیہ کا دل کانوں کے پاس آ کر دھڑک رہا ہوتا اور وہ افسردہ آنکھوں والے پروفیسر کی دھیمی پُر سکون آواز میں ڈوب جاتی۔ لیکن اسے بہت کم تعلیم والے پرانے مکان میں آنے کا اتفاق ہوتا۔ پھیلے میں دو ایک بار کسی شام اچانک اس کی چھوٹی سی سواری کار پرانے مکان کے بڑے دروازے میں داخل ہو کر لیموں کے پیڑ کے نیچے رک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی رضیہ کا دل دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی سے بھاگ کر نیچے آتی اور سعیدہ سے لپٹ کر ملتی اور دیکھتی کہ پروفیسر زرد سوٹ میں ملبوس اس کی طرف شرمیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا ہے۔ رضیہ کو یوں لگتا گویا خزاں کے پتوں پر کہانیاں لکھنے والا بیخوف اپنے دیہاتی مکان سے اُٹھ کر اُسے ملنے آیا ہو۔ جیسے اس کے خوابی جزیرے کا سفیر اس کے سامنے کھڑا ہو۔ اور جیسے اُس کے شیلف میں رکھی ہوئی ساری کتابوں میں زندگی کا گرم خون دوڑ گیا ہو اور وہ زرد سوٹ پہن کر اُسے ملنے آئی ہو۔ وہ اُسے آداب کرتی اور پروفیسر اُس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

"اچھی ہو بے بی!"

رضیہ صرف شرما کر نظریں جھکا لیتی۔ پروفیسر کی دونوں کنپٹیوں پر پیچھے کو گئی ہوئی سفید بالوں کی لٹوں کا خیال کر کے رضیہ کو

محسوس ہوتا کہ وہ محض بے بی ہے۔ ناسمجھ بچی ہے۔ اور اتنا کچھ پڑھنے اور سوچنے کے باوجود اُس کا ذہن ابھی نابالغ ہے، غیر پختہ ہے۔ رضیہ کی امی اور ابا ان کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کرتے اور صدیوں کے افسردہ مکان میں خوشی اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ شادی کے بعد سعیدہ کا رنگ زیادہ نکھر گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت میں شوخی اور شگفتگی زیادہ آ گئی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے خاوند سے ایکدم بگڑ جاتی۔ لیکن وہ کچھ اس طرح مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا کہ سعیدہ ایکدم ٹھنڈی پڑ جاتی۔

شام کی چائے پر وفیسر ہمیشہ رضیہ کے کمرے میں پیتا۔ کبھی سعیدہ اور اس کی بڑی آپی بھی اس کے ساتھ ہوتیں اور کبھی وہ دونوں بالکل تنہا ہوتے۔ ایسے لمحوں میں رضیہ بے حد خوش ہوتی اور پروفیسر کے لیے بڑے اشتیاق سے چائے بناتی۔ پروفیسر سگریٹ سلگا کر سلگاتا اور پرانے پردوں اور تالیوں والے بھرپور دیہاتی کمرے میں تھری نسز کی مہک اور بچ ایکو کی خوشبو سے بھنگیر ہو جاتی اور لیمپ کی ملائم روشنی میں پروفیسر کے چہرے پر کسی انجانی گہری مسرت کی چمک سی پھیل جاتی۔ رضیہ سلی قمیصوں والی پیالی ہاتھ میں لیے ہمہ تن گوش ہو جاتی اور پروفیسر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتا۔ باتیں ——— پرانے اور نئے ادب کی باتیں۔ ٹالسٹائی کے 'وار اینڈ پیس' کی باتیں، پشکن کے 'دی ٹیلی فیٹر' کی باتیں، ہنری ایبسن کے 'جوزل' اور 'رولاں کے' یاں کرستوف' اور گوگول کی رومانی کہانیوں اور روسی کی مثنوی اور آرنلڈ کی نظم 'لائٹ آف ایشیا' کی باتیں..... اور پھر کنول کے پھول ایسی کنواری دیوداسی نے دنیا پر ایک گیت گایا۔

SO SIGH WE, PASSING OVER THE SILVER STRINGS,
WE ARE THE VOICES OF THE WANDRING WINDS:
WANDER THOU, TOO, O PRINCE, THEY REST TO FIND;
LEAVE LOVE FOR LOVE OF LOVERS, FOR WOE'S SAKE
QUIT STATE FOR SORROW, AND DELIVERANCE MAKE.

رضیہ پر عجیب خود فراموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو کنول کے پھول ایسی کنواری دیوداسی کے روپ میں دیکھتی۔ اُس کی سیاہ زلفیں سانپ کی طرح اس کے ننگے خوشبودار شانوں پر بکھری ہوئی ہیں اور ماتھے پر چندن کی لو کانپ رہی ہے اور انگلیوں پر حنا کی سُرخی ہے۔ اور وہ گوتم کی مرمریں خواب گاہ میں قالین پر بیٹھی وچتر دنیا پر ہندی شہزادے کو جدائی کا پیغام سنا رہی ہے۔ پروفیسر کے گہرے پُرسکون اور اداس چہرے پر وہ گوتم کے عظیم غم کا عکس دیکھتی اور پیالی بڑے آہستگی سے میز پر رکھ کر وہ ایک گہرا سانس لیتی اور اپنا خوبصورت چینائی والا سر کرسی کی پشت سے لگا دیتی۔ پروفیسر خاموش ہو جاتا اور بجھا ہوا سگریٹ سلگانے لگتا۔

اور جب سردی کی روشن دھوپ چاروں طرف پھیل جاتی اور گلاب کی بیلوں میں چڑیاں شور مچا رہی ہوتیں تو وہ دونوں مکان کے عقبی باغ میں لیموں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر چائے پیتے۔ رضیہ لیموں کی سفید کلیاں چن کر لاتی اور انہیں سعیدہ کے بالوں میں سجاتی

شروع کر دیتی اور پروفیسر سگریٹ پیتے ہوئے ان دونوں کو بہار کی روشنی میں مسرور دیکھ کر خوشی کے شدید احساس میں ڈوب جاتا۔ کسی وقت پروفیسر گلاب کی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا پکڑ لاتا۔ سب مل کر اس کے جسم پر سرخ اور چوکھٹے پر سنہرا رنگ بھرتے۔ اسے دلہن کی طرح سجا کر ہتھیلی کھول دیتے۔ چڑیا کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا ہوتا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ یونہی دم سادھے پڑی رہتی۔ جیسے مر گئی ہو۔ پھر ننھی سی آنکھ کے کونے سے بڑی مکاری سے دیکھتی اور میدان صاف پا کر پھر سے اڑ جاتی اور سعیدہ، رضیہ اور پروفیسر تالیاں بجاتے ہوئے اسے رخصت کرتے۔ ایسے روشن اور خوشیوں بھرے دن بڑی جلدی گزر جاتے۔ سعیدہ اور اس کا خاوند واپس شہر چلے جاتے اور رضیہ پھر اپنے ویران کمرے کی تنہائیوں میں کتابوں کے زرد اوراق کھول کر بیٹھ جاتی۔ پھر بھیگی ہوئی کسی سرد رات کو جب باہر گھر کے اندھیرے میں ہوا گلاب اور لیموں کی شاخوں میں محبت کا سحر پھونک رہی ہوتی، لحاف میں لپٹی ہوئی رضیہ کا انگ انگ دکھنے لگتا اور اس کے سینے میں سوئی ہوئی، دبی ہوئی، کھوئی ہوئی عورت ناگن کی طرح پھن اٹھا کے پہلے جھونکے پر ایک لمبی پھنکار کے ساتھ بیدار ہو جاتی اور رضیہ کی گرم چھاتیوں پر سے پھسلتی ہوئی نیچے اترتی اور غسل خانے میں جا کر آئینے کے سامنے برہنہ ہو جاتی اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھٹے ہوئے، پکے ہوئے، دہکے ہوئے، سخت اور کھردرے جسم پر پھیرنے لگتی۔ پھر آندھی اور بارش کا ایک مہیب طوفان اٹھتا ——— دریاؤں میں جھاگ اڑاتے، غصیلے، کف آلود سیلاب امڈ آتے اور ان کی بپھرتی ہوئی موجیں چٹانی پتھروں کے سنگین بند اڑا کر لے جاتیں اور کھلی جڑوں والے تن آور، تنومند درخت اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگتے، اور رضیہ ایک چیخ مار کر جاگ اٹھتی اور دیکھتی کہ طوفان گزر چکا ہے۔ اور پانی کی پرسکون سطح پر درختوں کی ٹہنیاں اور کشتیوں کے تختے تیر رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر خوف، دہشت اور اذیت کے نشان ہوتے۔ جیسے رات بھر کوئی اسے وحشیوں کی طرح چابکوں سے مارتا رہا ہو۔ اس سے پہلے اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اسے ایسے کرب انگیز خواب نہ آئے تھے۔ اب ایسا کیوں ہونے لگا تھا، رضیہ بستر پر ہی خدا کے حضور میں گر پڑتی اور روتی ہوئی آنکھوں اور سسکتے ہونٹوں سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی اور گڑگڑا کر ان کی معافی مانگتی۔ پھر دن نکل آتا اور وہ نہا دھو کر بڑے مطمئن چہرے کے ساتھ بوڑھی خادمہ کے ساتھ مل کر اپنی آپو کے لیے پانی گرم کرتی۔ اپنے ابا جی کے کپڑے نکالتی۔ ان کے لیے دلیا خود پکاتی اور ان کاموں سے اسے اس قدر تسکین ہوتی کہ وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ اس کا ذہن بادلوں سے یوں چھٹ کر صاف ہو جاتا جیسے وہ کسی غریب کسان کی بیٹی ہو۔

مگر رات نئے خیالوں کا پُراسرار اندھیرا اور نئی امنگوں کے سرخ پھول لے کر آتی اور رضیہ کو اندھیرے میں اپنے گورے بدن پر جا بجا خون کے سرخ دھبے ہی دھبے دکھائی دیتے۔ وہ ریشمی کمبل پرے پھینک کر اٹھتی۔ روشندانوں میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں سنگار دان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم پر خوشبو چھڑکتی۔ میز پر بیٹھ کر لیمپ جلاتی، اور سنہرے حاشیے والا پیڈ نکال کر اپنے محبوب کے نام دہکتی ہوئی آتشیں محبت میں ڈوبے ہوئے طویل خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ کئی خطوط پھاڑنے کے بعد وہ ایک خط کو بڑے پیار سے لفافے میں بند کرتی۔ لفافے پر اپنے محبوب کا نام لکھ کر اسے چومتی۔ اس کے بعد اسے دراز میں بند کرتی اور لیمپ بجھا کر سو جاتی۔

صبح اٹھ کر جب وہ بے خیالی میں دراز کھولتی تو بند لفافے پر لکھا ہوا کسی مرد کا نام دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ لفافہ کھول کر

جب خط پڑھتی تو شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آتا کہ وہ خط اُسی نے لکھا ہو۔ وہ جلدی سے اس خط کو لفافے سمیت پھاڑ کر آتشدان میں پھینک کر جلا ڈالتی ——

گرمیوں کی چھٹیوں میں سعیدہ اپنے خاوند کے ساتھ مری گئی ہوئی تھی۔ واپسی پر یہ لوگ ایک روز کے لیے مری ٹھہر گئے۔ اگلے دن لاہور آتے ہوئے پروفیسر نے رضیہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب سے سعیدہ کی شادی ہوئی تھی۔ رضیہ اس کے گھر کبھی نہ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک لمبے عرصے کے بعد لاہور جا رہی تھی۔ جب ان کی کار رضیہ کے کالج اور ہوسٹل کے قریب سے گذری تو رضیہ کو کالج کے پرانے دن یاد آ گئے۔ سعیدہ کا گھر شہر سے باہر کینال بینک پر واقع تھا۔ یہ گھر بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ ہر کمرے میں روشنی، گرمی، زندگی اور سورج کی دھوپ تھی۔ رضیہ یہاں آ کر اپنے اندر ایک نئی زندگی محسوس کرنے لگی۔ سعیدہ کا خاوند اس کا بہت خیال رکھتا۔ اسے ہر روز صبح شام نہر کنارے سیر کرواتا۔ شہر سے واپس آتے ہوئے اس کے لیے نئے نئے رنگین انگریزی رسالے خرید کر لاتا۔ تقریباً ہر روز ہی ان کا سینما جانے کا پروگرام بن جاتا۔ سعیدہ کو کبھی کبھی اپنے خاوند کی طرف سے رضیہ کی یہ ناز برداریاں کچھ ناگوار سی گذرتیں۔ مگر وہ ان باتوں پر زیادہ سوچ بچار نہ کرتی۔

ایک روز یہ لوگ زبیدہ کے ہاں بھی گئے ——— زبیدہ کی صحت پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے سے نمودار ہو گئے تھے۔ زبیدہ کی ساس اور نندوں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ رضیہ کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس گھر میں زبیدہ سے اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ اور وہ وہاں خوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود زبیدہ نے رضیہ سے کچھ نہ کہا۔ رضیہ نے اکیلے میں جا کر اپنی بڑی بہن سے بہت کچھ پوچھنا چاہا مگر زبیدہ نے کوئی بات نہ کی۔

"تو پھر باجی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟"

زبیدہ نے رضیہ کو آہستہ سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"کوئی حالت خراب نہیں۔ وعدہ کرو کسی سے کوئی بات نہ کرو گی؟"

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زرد چہروں پر مسکراہٹ تھی اور دونوں نے ایک دوسری سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گی۔ سب کچھ سہیں گی اور خاموش رہیں گی۔

سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب بھی ہسپتال سے آ گئے۔ انھوں نے مہمانوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح بازو پھیلاتے ہوئے پروفیسر سے مصافحہ کیا اور سعیدہ اور رضیہ کو وہاں دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگے۔

"میں تو آج ناغہ ہی تھا۔ فون کر دیا ہوتا۔ چلو اچھا ہوا۔ زبیدہ! انھیں کچھ کھلایا پلایا بھی ہے یا نہیں؟ مگر تو ہاتھ پاؤں کہاں ہلائے گی۔ تو تو پوری بڈھ حرام ہے۔"

زبیدہ نظریں جھکائے مسکراتی رہی اور اس کی ساس بھی ہنستی رہی اور اس کی نندیں اپنے بھائی کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھانے لگیں اور رضیہ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ زبیدہ کی صحت کیوں خراب ہے۔ چاہ پر ڈاکٹر نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر رضیہ نے اُسے کوئی لفٹ نہ دی۔ اسے ڈاکٹر کی وہ نظریں سخت ناپسند تھیں جن سے وہ اسے گھورا کرتا تھا۔ یہ نظریں مکروہ

چھپکلیوں کی طرح اسے اپنے کپڑوں کے اندر رینگتی محسوس ہوتی تھیں۔ چائے کے بعد رضیہ، سعیدہ اور پروفیسر کنال بیگ اپنے گھر آ گئے۔ اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور برسات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ——— سعیدہ کے خاوند نے رضیہ کو ساتھ لیا اور سعیدہ سے یہ کہہ کر کہ وہ ذرا گھومنے جا رہے ہیں، شیزان میں آ گئے۔ بادل گہرے ہو گئے تھے اور ہال پر اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ شیزان میں بتیاں جلا دی گئی تھیں۔ وہ دونوں گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ رضیہ پروفیسر کے ساتھ، ایسے پُرسکون ماحول میں بیٹھی بے حد خوش تھی اور اس کے زردی مائل گندمی چہرے پر مسرت کا بھرپور احساس تھا۔ پروفیسر نے چائے کے ساتھ بہت کچھ منگوا لیا۔ رضیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مگر بھائی جان یہ اتنی ساری چیزیں کھائے گا کون؟"

"ہم کھائیں گے۔"

اور اتنا کہہ کر اس نے ایک کریم پف خود اٹھایا اور دوسرا رضیہ کے منہ میں ڈال دیا۔ دونوں ہنس پڑے اور باہر ایک دم مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ رضیہ کو اپنے گھر والے کمرے کا خیال آ گیا۔ کیا خبر وہاں بھی بارش ہو رہی ہو! رضیہ کو اپنے پرانے گھر اور اس کمرے سے کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ قریب رہ کر اسی سے بھاگتی تھی اور دور جا کر اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ اسے اپنی پرانی اور حالیہ زندگی کا خیال آ گیا۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کہاں جائے گی؟ وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے: اسے کیا ملے گا؟ خدا جانے وہ کیا کھوئے، کیا پائے۔ کیا چاہے اور اسے کیا ملے ——— !

پروفیسر نے سگریٹ سلگا کر رضیہ کو غور سے دیکھا۔

"چپ کیوں ہو گئیں؟"

"کچھ نہیں۔"

پروفیسر نے اسی طرح منہ بنا کر کہا "کچھ نہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ رضیہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھ کر باہر کھڑکی میں سے نظر آنے والی بارش کی جھالر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان ایک بات بتائیں گے؟"

"کیا؟"

"آپ شادی کر کے خوش ہیں؟"

پروفیسر خاموش ہو گیا۔ اس کے دُبلے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سلگتی ہوئی پژمردہ آنکھیں سکیڑ کر رضیہ کو دیکھا اور خشک سی آواز میں بولا:۔

"شادی کر کے ہم لوگ نہ سکھی ہوتے ہیں نہ دکھی، صرف شادی شدہ ہوتے ہیں۔"

"نہیں مجھے سچ سچ بتائیے۔"

رضیہ بچوں ایسی ضد کرنے لگی اور پروفیسر کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں ہاں بھئی، میں خوش ہوں، بہت خوش۔"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ پروفیسر بھی خاموش ہو گیا۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی۔

پروفیسر نے کہا۔

"تم بھی شادی کر لو رضیہ! تمہارا علم اور بھی بڑھ جائے گا؟"

رضیہ شرما گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری شادی خود کراؤں۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں کروں، تم، جو اتنی پیاری، اتنی ذہین، اتنی قیمتی لڑکی ہو۔ تمہیں بیاہنے تو کسی شہزادے کو آنا چاہئے۔ سوچتا ہوں کسی روز چپکے سے ہسپانیہ کے سبزہ زاروں میں نکل جاؤں اور سرو کے جھنڈوں تلے سوئے ہوئے کسی اندلسی شہزادے پر جھک کر کہوں، میرے ساتھ آؤ میں نے تمہارے لیے شہزادی ڈھونڈی ہے، اور پھر میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں اور بڑی دھوم دھام سے تم دونوں کا بیاہ رچاؤں اور....."

پروفیسر نے چونک کر رضیہ کو دیکھا۔ وہ ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔ اور سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ پروفیسر گھبرا گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے رضیہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

"آنسو روک لو اندلسی شہزادی! تیرا شہزادہ برق رفتار گھوڑے پر اڑا چلا آ رہا ہے۔ آنسو پونچھ لو.....؟"

اندلسی شہزادہ ابھی کافی دور تھا۔ لیکن سعیدہ شیزان کی گیلری میں ضرور پہنچ گئی تھی۔ پروفیسر نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا

"پاگل لڑکی! یونہی رونے لگ پڑی۔ کہنے لگی گھر یاد آ رہا ہے۔"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ کبھی زرد ہو رہا تھا اور کبھی سرخ۔ بدگمانیوں کی نیند بڑی کچی ہوتی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی ہیں۔ سعیدہ کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ رضیہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ دل اس کا بھی دھڑک رہا تھا۔ لیکن وہ طبعاً ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بلند لڑکی تھی۔ اس نے سعیدہ سے کوئی بات نہ کی۔ سعیدہ نے پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ کچھ سامان خریدنے آئی تھی اور یونہی شیزان میں آ گئی کہ شاید اس کا خاوند یہاں ہو۔ اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے اٹھے اور گھر آ گئے۔ سعیدہ نے راہ میں رضیہ سے کوئی بات نہ کی۔ گھر پہنچ کر بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ جیسے گم سم سی ہو گئی۔ بھڑکیلی طبیعت رکھنے کے باوجود اسے کچھ ایسا دھکا لگا کہ وہ ایکدم بجھ سی گئی۔ رضیہ کو ایسی حالت میں وہاں رہنا بڑا ناگوار لگا۔ اس نے سعیدہ کے خاوند سے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ سعیدہ کا خاوند رضیہ کو بالکل نہ روک سکا۔ اس نے رضیہ کو کار میں بٹھلایا۔ بوڑھا خادم ساتھ لیا اور سٹیشن پر آ گیا۔ ریل کی روانگی میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ وہ دونوں ریفرشمنٹ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ پروفیسر نے کولڈ ڈرنکس منگوائیں۔ اور وہ انہیں خاموشی سے پینے لگے۔ دونوں کے غمزدہ دل اداس تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہ سکتے تھے۔ آخر پروفیسر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کا بہت دکھ ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر ایک بات بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور شاید کبھی نہ کہہ سکوں۔

تم ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ میری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح پرکھ سکتی ہو۔ سوچتا ہوں اس گھڑی دو گھڑی کی دوستی میں ہم نے کیا پایا ہے۔ تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ میں پھر کالج کی پرانی لکیر پیٹوں گا۔ شاید اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہو۔ دونوں خاندانوں کی بھلائی ہو۔ تم اپنے خاندان کے لیے زندہ رہو اور میں اپنی بیوی کے لیے۔ ہم میں کوئی بھی اپنے لیے زندہ نہیں ہے۔ ہم یہاں اپنے لیے زندہ نہیں رہ سکتے ہاں اپنے لیے مر ضرور سکتے ہیں۔ اُداس نہ ہونا۔ آئندہ نہ ہونا، شاید ہم کسی دوسرے جنم میں، کسی نئے روپ میں ملیں۔"

رضیہ پر موت ایسی خاموشی طاری تھی۔ وہ صرف سُن رہی تھی۔ وہ ہمیشہ صرف سننا چاہتی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے زخموں پر ٹھنڈے مرہم کے پھاہے رکھ رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے انجن اور ڈبوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

"گاڑی آگئی ہے۔ چلو چلیں۔"

رضیہ آہستہ سے اٹھی اور پروفیسر کے ساتھ باہر پلیٹ فارم پر آگئی۔ پروفیسر نے اسے سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں سوار کروا کر ملازم کو ساتھ والے ڈبے میں بٹھلا دیا۔ ریل کے انجن نے آخری سیٹی دی۔ پروفیسر نے رضیہ کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ سر لگائے اداس نگاہوں سے پلیٹ فارم کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کھسکنے لگی تو رضیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ دھواں، شور، گرد و غبار، آوازیں ——— تیز، بلند چیخوں سے ملی جلی آوازیں، روک لو، روک لو، گاڑی روک لو، رضیہ کا سر کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گاڑی بڑی تیزی سے شور مچاتی ہری تاگ کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

.....

تیسرے ہی روز سعیدہ نے شیزان میں پیش آئے ہوئے حادثے اور اس سے پہلے کے کئی ایک واقعات کی پوری تفصیل بڑی آپو کو لکھ بھیجی۔ رضیہ کی والدہ سُن ہو کر رہ گئیں۔ ایک لمحہ کے لیے انھیں کچھ سجھائی نہ دیا۔ خط کے آخر میں سعیدہ نے لکھا تھا کہ اگر اب رضیہ کو اس کے گھر آنے کی اجازت دی گئی تو اس کے گھر کی چاروں دیواریں گر پڑیں گی۔ بڑی آپو نے خط بند کر کے بڑی الماری کے نچلے دراز میں مقفل کر دیا۔ انھوں نے رضیہ کے والد کو اس حادثہ سے آگاہ کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ دو تین دن گزر جانے پر انھوں نے رضیہ کو بلایا اور بڑی تدبیر اور دانشمندی کے ساتھ اُسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

"اگر سعیدہ کے سسرال والے تمہیں اچھا نہیں سمجھتے میری بیٹی، تو پھر اُن کے ہاں جانے کا فائدہ؟ ہمیں جب اپنے گھروں میں جا بسیں تو وہ دُور کی رشتہ دار بھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں، تم پہلی بار اُن کے ہاں گئی تھیں اور تمہارے ساتھ انھوں نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن خیر تمہارے ایسی پڑھی لکھی لڑکی کو ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ ادھر کا راستہ بھول جاؤ۔ اب جاؤ اور خادمہ سے کہو کہ میرے لیے دلیا اور سبز چائے تیار کر کے لے آئے۔"

رضیہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت نہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا علم بڑی آپو کو بھی ہو جائے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سعیدہ نے امی کو خط لکھا ہے۔ اُسے اپنی اس قدر بے عزتی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی اور تکیوں میں سر دے کر جی بھر کر روئی۔ ان دکھوں کو بھی روئی جو اس پر بیت چکے تھے۔ ان غموں پر بھی روئی جنھیں وہ اٹھا رہی تھی اور اُن پر بھی روئی جو اُسے اٹھانے تھے۔ تین دن تک کمرے میں بند رہنے اور کسی کے بلانے پر بھی باہر نہ نکلنے کے بعد اس نے چوتھے روز شام کو اُٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ سر پر اپنے مخصوص انداز میں دوپٹہ اوڑھا، لیمپ جلایا اور "دیان کرستوف" کھول کر بیٹھ گئی۔ جوں جوں وہ اسے پڑھ

رہی تھی۔ اس کے اندر طاقت، بہت اولیری اور توانائی کا شدید احساس بھر رہا تھا۔

کھلی کھڑکی میں سے باغ کی طرف سے پھولوں کی خوشبو اندر داخل ہو رہی تھی اور روتاں کہہ رہا تھا۔

"O, LIFE, I SOUGHT THEE IN MYSELF, IN MY OWN EMPTY SHUT-IN-SOUL. MY SOUL IS BROKEN. THE SWEET AIR POURS IN THROUGH THE WINDOWS OF MY WOUNDS. I BREATHE AGAIN. I HAVE FOUND THEE ONCE MORE. O, LIFE! HOLD THY PEACE, AND LISTEN....."

اگست کی آخری تاریخیں تھیں کہ زبیدہ اپنے خاوند کے ساتھ ہری ناگ آ گئی۔ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اور پرانی روایات کے مطابق اپنے پہلے بچے کو ماں باپ کے گھر جنم دینا چاہتی تھی۔ اس کا خاوند پورے ساز و سامان کے ساتھ لیس ہو کر آیا تھا۔ زبیدہ آتے ہی بستر پر پڑ گئی۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ پہلے سے بے حد دبلی اور نحیف دکھائی دے رہی تھی۔ پانچویں دن، رات کے کسی لمحے جبکہ رضیہ اپنے کمرے میں افسردہ گال تکیے پر رکھے سو رہی تھی، زبیدہ کے ہاں پھول سی لڑکی پیدا ہوئی۔ رضیہ کو صبح خبر ملی۔ اس نے بچی کو اٹھا کر بڑا پیار کیا۔ بچی کا باپ بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بھی بچی پر جھک کر اسے پیار کرنے لگا اور رضیہ کو اس قسم کی بو محسوس ہوئی جیسے وہ تانگوں کے اڈے پر بہت سے گھوڑوں کے درمیان کھڑی ہو۔ اور اس نے جلدی سے یونہی مسکراتے ہوئے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

ڈاکٹر ایک ماہ کی رخصت لے کر وہاں آیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے گھر پر ہی رہتا تھا۔ صرف صبح شام سیر کو جاتا اور کئی کئی میل کا چکر لگا کر پسینے میں تر بتر باپ کا چہیتا بڑے کمرے میں داخل ہوتا اور ٹوٹ کھول کر صوفے پر اوندھے منہ لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیتا۔ وہ سعیدہ کے کمرے میں سوتا تھا۔ اور سعیدہ کا کمرہ رضیہ کے کمرے سے ملحق تھا۔ رات بھر ڈاکٹر کے بے ہنگم خراٹے رضیہ کو بے آرام رکھتے۔ دن میں وہ کسی بھی وقت رضیہ کے کمرے میں آن دھمکتا اور کبھی میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگتا اور کبھی صوفے میں دھنس کر سگریٹ پر سگریٹ پیے جاتا۔ اور ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں شروع کر دیتا۔ رضیہ کو بے جا مداخلت بڑی ناگوار گزرتی لیکن اپنی بڑی بہن کے منہ کو چپ ہو کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ زبیدہ کی زندگی سسرال میں پہلے ہی کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ایک دو بار اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس طرح اور قیامت برپا ہو جاتی۔ دروازہ باہر سے زور زور سے بجایا جاتا۔ اور رضیہ کو مجبوراً چٹخنی کھول دینی پڑتی، اندر آتے ہی ڈاکٹر بڑے تعجب سے ادھر ادھر دیکھتا اور کہتا ——

"بھئی دروازہ تو کھول رکھا کرو۔ اور نہیں تو کم از کم تازہ ہوا تو اندر آتی رہے۔ تمہاری صحت پہلے ہی کمزور ہے؟"

رضیہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بات ٹال دیتی۔ پھر وہ رضیہ کے پاس آ کر میز پر جھک کر پوچھتا۔

"کہیں میں تمہارے مطالعے میں مخل تو نہیں ہوتا؟"

"جی نہیں بھائی جان! بالکل نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اور تمہیں اتنا پڑھنا بھی نہیں چاہیئے۔ تمہاری آئی سائیٹ بالکل خراب ہو کر رہ جائے گی۔"

رضیہ کتاب پر نظریں جمائے سوچتی رہی کہ وہ کیا کرے! کتاب بند کر دے یا پڑھتی رہے! اگر وہ پڑھتی رہے تو ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکے گی اور اگر کتاب بند کر دے تو اس بھدے ریچھ سے بات کیا کرے؟ وہ اسی گومگو کے عالم میں مبتلا رہتی اور ڈاکٹر باتیں کرتا، سگریٹ پر سگریٹ پیتا صوفے میں دھنسا قالین پر ٹانگیں پسارے اونگھنے لگتا۔ اُسے اونگھتا دیکھ کر رضیہ فوراً کتاب بند کرتی اور دبے پاؤں وہاں سے نکل زبیدہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور اس کی بچی سے کھیلنے لگتی۔ ابھی وہ آن کر بیٹھی ہی ہوتی کہ زور سے ہنہنانے کی آواز آتی اور ڈاکٹر اندر داخل ہوتے ہی ہوں، ہوں، ہوں، کرتا بچی کو بے تحاشہ چومنا شروع کر دیتا۔

رضیہ زندگی میں کبھی کسی شے سے اتنی عاجز نہ آئی تھی۔ وہ کبھی اس قسم کی گھٹیا ذہنی الجھن میں گرفتار نہ ہوئی تھی۔ جس قسم کی الجھن میں وہ ان دنوں گرفتار تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھ سکی تھی کہ ایسی باتوں سے ڈاکٹر کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ایک دن یہ مطلب اُس کی سمجھ میں آ گیا۔

ایک رات پڑھنے کے بعد اس نے کاپی نکال کر اپنی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ بڑی دیر سے اس نے ڈائری کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اور اس دوران میں حادثات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ لکھنے بیٹھی تو لکھتی ہی چلی گئی۔ دس، گیارہ، بارہ، رات کے ساڑھے بارہ بج گئے اور رضیہ کا تیز قلم اسی طرح چل رہا تھا۔ لیمپ میں تیل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ وہ پہلے ٹٹولنے اور پھر کانپنے لگا۔ رضیہ نے قلم رکھ کر دراز میں سے دو بڑی موم بتیاں نکالیں، انھیں جلا کر ٹکڑی کے بنے ہوئے چنار کے پتے میں جما دیا اور لیمپ بجھا دیا۔ لیمپ بجھا کر ابھی اس نے موم بتی کی نرم روشنی میں لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ اُسے اپنے عقب میں قالین پر کسی کے بوجھل قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کھڑا تھا۔ سگریٹ اس کے منہ میں سلگ رہا تھا اور اس کی نیم وا آنکھیں سرخ تھیں۔ رضیہ غیر شعوری طور پر چوکنی ہو گئی اور اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے اپنا اضطراب بڑی مشکل سے دباتے ہوئے نارمل انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"آپ اس وقت بھائی جان! نیند نہیں آئی ہو گی۔ سا ریڈیو دوں؟"

لیکن ڈاکٹر نے کوئی جواب دیا۔ بلکہ اِدھر اُدھر دیکھا اور رضیہ پر جھک کر آہستہ سے بولا۔

"کوئی نہیں ہے۔ سب سو گئے ہیں۔ سب سو رہے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی رضیہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رضیہ کے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ اب سب بہروپ بیکار تھے۔ وہ جلدی سے کرسی چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈاکٹر کا بھدا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے لپکتی ہوئی ہوسناک نگاہوں سے رضیہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا اور پاگلوں کی طرح جھپٹ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پہلے تو رضیہ ایک دم سُن ہو کر رہ گئی اور ڈاکٹر کی باہوں میں مُردہ لاش کی مانند لٹک گئی۔ مگر فوراً ہی جیسے اس کے اندر ایک شعلہ بھڑکا جس نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی۔ اس کے ہونٹوں، کانوں اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ کر ٹوٹنے لگیں۔ اُس نے ایک ہاتھ باہر نکال کر ڈاکٹر کے منہ پر اس قدر بھرپور طمانچہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا اور ششدر ہو کر رہ گیا۔

"نکل جاؤ۔ نکل جاؤ ——— ورنہ میں شور مچا دوں گی۔"

رضیہ کی آواز لرز رہی تھی اور اس کے خشک ہونٹوں پر جھاگ اُڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک گہری غضب آلود نگاہ سے دیکھا۔

اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ نے جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور اپنے آپ کو بمشکل سنبھالے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور ٹانگیں اب پہلے سے زیادہ کانپ رہی تھیں۔ اس نے پلنگ تک جانا چاہا۔ لیکن دو قدم اٹھانے پر ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ گر پڑی اور قالین پر اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے بچوں کی مانند پھوٹ پڑی۔ اس شرمناک گھناؤنے منظر کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے گندے بدرو کے دلدل میں گرا دیا ہو۔ جہاں سے نکلنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہو مگر باہر آنے کی بجائے اور نیچے چلی جا رہی ہو۔ ساری رات وہ قالین پر پڑی روتی رہی۔ پچھلے وقت کہیں روتے روتے اُسے نیند آ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ سنہری دھوپ کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ قالین پر اوندھے منہ پڑی ہے اور اُس کے گال کے نیچے قالین کا بُرا نمدار ہو رہا ہے۔ اُس کا سارا بدن دُکھ رہا تھا۔ کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر اُس نے باہر باغ میں پھیلی ہوئی روشن دھوپ میں چڑیوں کی چہکاریں سنیں اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے رات اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

دوپہر تک رضیہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بوڑھی خادمہ نے اُسے کھانا بھی وہیں لا کر دیا جو اس نے تھوڑا سا کھا کر ویسے ہی چھوڑ دیا۔ آخر اس کی پیاری امی اور زبیدہ خود اس کے کمرے میں آئیں۔

"کیا بات ہے میری بیٹی؟ آج ہمارے پاس نہ آؤ گی؟"

کہیں انھیں سب کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا؟ رضیہ کا دل شرم اور ندامت سے ڈوبنے لگا۔

زبیدہ نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"چلو رضیہ باہر بیٹھتے ہیں، آؤ نا؟"

رضیہ کو معاً یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں ڈاکٹر نے اپنی بھدی سی بانہیں ڈال رکھی ہوں۔ وہ سہم سی گئی۔

"آتی ہوں باجی! ابھی آتی ہوں آپو جی، یونہی ذرا پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔"

"اتنا مت پڑھا کرو میری بیٹی۔ پہلے ہی بڑی کمزور ہو۔"

رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

"اب نہیں پڑھوں گی آپو جی۔ اب نہیں پڑھوں گی۔"

زبیدہ نے پوچھا۔

"کیوں؟"

اور رضیہ نے چونک کر کہا۔

"اوہاں —— ساری کتابیں ختم ہو گئی ہیں۔"

زبیدہ اور امی باہر چلی گئیں۔ رضیہ تنہا رہ گئی۔ وہ باہر جاتے ہوئے گھبراتی تھی۔ وہ ضرور باہر کھڑا ہو گا۔ وہ اُس کا انتظار کر

رہا ہوگا۔ جانے باہر کیا ہو جائے! تیسرے پہر وہ زبیدہ کے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا تھا۔ دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ رقیہ بچی سے کھیلتی رہی اور ڈاکٹر زبیدہ سے باتیں کرتا رہا۔

.....

دوسری صبح رقیہ نے بستر پر سے اُٹھتے ہی سُنا کہ ڈاکٹر اپنی بچی اور زبیدہ کو لے کر واپس چلا گیا۔ اسے یوں لگا گویا کسی نے اس پر سے بہت بڑا بوجھ اٹھا لیا ہو۔ اُس نے امّی سے زبیدہ باجی کے اکدم چلے جانے کی وجہ پوچھی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایکا ایکی تیار ہو گئے تھے اور چلے گئے۔"

رقیہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور غسل خانے میں نہانے کے لیے چلدی۔

موسم سرما شروع ہوا تھا کہ ہری تال میں ہاتی کو ڑیوں کے پُرانے۔ بہت پرانے بوسیدہ حویلی نما مکان کی خستہ دیواروں کے نیچے کھلی کھلی زمین میں سوئے ہوئے سرد لاوے میں کہیں سے ایک چنگاری پھوٹی اور دیکھتے دیکھتے لاوہ پگھلتی، کھولتی، سسکارتی سیال آگ بن کر پتھر بنیادوں سے ٹکرانے لگی۔ اوپر ایک زلزلہ سا آگیا۔ اور بوڑھی، پتھریلی بھری دیواریں کانپنے لگیں۔ یہ وہ زلزلہ تھا جو ہر اس پُرانے گھرانے کی دیواروں کو ملبے کا ڈھیر بناتا ہوا گزر جاتا ہے۔ جو صدیوں سے ایک ہی جگہ آباد زمین سے زندگی کا عرق کھینچ رہا ہو۔ آخر زمین کا سینہ خشک ہو جاتا ہے۔ اور درختوں کی جڑیں سُوکھ جاتی ہیں۔ وہ بظاہر تن آور اور تنومند ہوتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا سارا گودا دیمک زدہ ہوتا ہے اور وہ طوفان کے پہلے ہی حملے میں لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ پھر اس حادثے کو آسمانی طاقتوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کے جسم کھوکھلے اور بنیادیں خستہ ہو چکی ہیں۔

میر غلام حسن شاہ بڑے وضعدار بزرگ تھے۔ انھیں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خاندان کے اِن افراد کی عزت کا خیال رہتا تھا جو مر کھپ گئے تھے۔ اور جنھوں نے اپنے وقتوں میں آئندہ نسل کا خیال کیے بغیر بے نیازی اور آسانی میں اچھی زندگی گزاری تھی۔ آپ اپنے خاندان کی تعریف سننے کے لیے دوسرے اعلیٰ خاندانوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اپنے رکھ رکھاؤ کے لیے دوسروں کے رکھ رکھاؤ کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ آپ قدرتاً ہاتھ کے کھلے تھے۔ جہاں ایک روپیہ سے کام نکل سکتا وہاں بلا دریغ پانچ روپے خرچ کر دیتے اور انھیں اس خیال سے بڑی تسکین ہوتی کہ لوگ اُن کی دریا دلی کو، اُن کی خاندان کا طرۂ امتیاز سمجھ کر تعریف کر رہے ہوں گے۔ جو کوئی اُن کے پاس سوال لے کر آتا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔ کئی بار جب میر غلام حسن شاہ سے کسی نے قرض کا سوال کیا تو آپ نے کسی دوسرے سے قرض لے کر اُس کا سوال وعدہ کے مطابق پورا کر دیا۔ انھیں دوسرے کی غرض سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ صرف اپنا وقار اور خاندان کی وضعداری نبھا رہے تھے۔ کمیٹی کے تمام ممبر آپ کے مقروض تھے اور آپ نے کبھی قرض کی واپسی کا تقاضہ نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بھی مقروض ہو گئے۔ بنک میں جو تھوڑا بہت روپیہ جمع تھا اس کی ساکھ پر دوگنا نکلوا لیا جا چکا تھا۔ کپڑے کے ایک کارخانے کا حصہ خریدا لیکن سوت نہ ملنے سے کارخانہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا۔ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ پرانا خاندانی مکان رہن رکھ کر حاصل کی گئی رقم کے ساتھ ہی دونوں بیٹیوں کی شادی پر خرچ ہو گیا تھا۔ اب خواب گاہ

کی تجوری میں رکھے ہوئے چند سو روپوں اور زیورات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ زیورات بھی ڈیڑھ ایک ہزار سے زیادہ کی مالیت کے نہ تھے۔ کچھ آپ کے والد گرامی رکھ کر چھوڑ گئے تھے۔ اور کچھ سعیدہ اور زبیدہ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی کوٹھی خاندان ——— پرانے اعلیٰ کشمیری خاندان پر پچیس ہزار کے قریب قرض چڑھا ہوا تھا اور محلاتی دیواروں، بھاری پردوں اور موٹے افغانی قالینوں والے تاریخی مکان میں سوائے چند سو روپوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میر صاحب نے یہ تاریک راز اپنی رفیقۂ حیات پر بھی منکشف نہ کیا تھا۔ اس خوفناک راز کو وہ اپنے ہی سینے میں چھپائے۔ قرض خواہوں کی نگاہوں سے بچتے پھرتے تھے۔ کسی قرض خواہ کا ان سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا میر صاحب کے نزدیک نہ صرف ان کی بلکہ سارے خاندان کی موت تھی۔ چنانچہ وہ زیادہ وقت گھر پر اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ مسلسل غم و فکر اور پریشانی کی وجہ سے انھیں بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی۔ جوں جوں بنک میں روپے کا حساب دینے اور رہن شدہ مکان کی آخری تاریخیں قریب آ رہی تھیں۔ آپ کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا اور بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز آنکھوں کے سامنے اس صدیوں پرانے مکان کو لڑکھڑا کر زمین پر گرتے اور خاندان کے اعلیٰ افراد کو گلیوں میں دربدر پھرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا باغیرت ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ ہاں خاندان کے باقی لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چپ چاپ مر سکتے تھے۔ یہ عظیم خود غرضی ایک عظیم خاندان کے شایانِ شان ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو عظیم ذلت اور عظیم بدنصیبی کے دن قریب آ رہے تھے اور میر صاحب ان کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ چھپ جانے کی فکر میں تھے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ایک صبح جب کافی دیر تک ان کی خوابگاہ کا دروازہ بند رہا تو خادمہ نے اندر جا کر دیکھا۔ میر صاحب اپنے بستر پر مردہ پڑے تھے۔ خادمہ بدحواس ہو کر بڑی آپو کی خوابگاہ کی طرف بھاگی اور ان کو خبر سنتے ہی غش آ گیا۔ بوڑھی خادمہ نے روتے ہوئے انھیں سنبھالا اور لاتی چیختی چلاتی چھوٹی آپی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ رضیہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ بغیر دوپٹہ کے کھلے بالوں سمیت اپنی امی کی طرف بھاگی۔ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ پنڈی، لاہور، کراچی، پشاور، ہر طرف تاریں دوڑ گئیں۔ دوسرے ہی روز قصبہ ہری ناگ کا پرانا حویلی نما مکان ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ رضیہ کو بار بار غش آ رہا تھا۔ بڑی آپو عورتوں کے درمیان بیٹھی رومال چہرے پر رکھے مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ سعیدہ اور زبیدہ کی آنکھیں رونے سے بری طرح سوج رہی تھیں۔ زبیدہ کا خاوند قبرستان میں گورکنوں کے سر پر کھڑا قبر کھدوا رہا تھا۔ اور سعیدہ کا خاوند باہر برآمدے میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھا کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ موت کیسے اور کیونکر واقع ہوئی۔ میر صاحب رات کو اچھے بھلے سوئے تھے۔ اور اس رات انھوں نے خلافِ معمول رضیہ کو اپنے کمرے میں بلا کر بڑا پیار کیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ موت ہارٹ فیل ہو جانے سے ہوئی ہے اور ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ لاش کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف اوپر کے دانتوں میں ایک جگہ ذرا سا خون نکل کر وہیں جم گیا تھا۔ شاید وہ مرنے سے پہلے کہیں گر پڑے ہوں اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئے ہوں اور موت نے ان کے ذہن سے تمام الجھنوں اور پریشانیوں کو سمیٹ کر واپس لے لیا ہو اور ان کی زندگی پر جمود کی سرد مہر لگا دی ہو۔

اور بدنصیب رضیہ اور اس کی سفید بالوں والی شفیق ماں!

تم لوگوں کو موت کب آئے گی؟

.....

سرو شاہ کے دھندلکے میں جبکہ قصبے کے کھلے کھیتوں پر دھند چھا رہی تھی۔ میر غلام حسن شاہ کو ان کے آبائی قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب رشتہ دار کھسکنے لگے۔ تیسرے ہی روز پرانے گھر میں سوائے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر کے اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر بھی لاہور جا چکا تھا۔ اس اعلیٰ خاندان کے باقیماندہ بدنصیب افراد پر اس بھید کا اب انکشاف ہوا تھا کہ ان پر پچیس ہزار روپے کا قرضہ ہے اور بڑا مکان بھی شہر کی ایک کمپنی کے پاس گروی پڑا ہے۔ اُن لوگوں کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے۔ اب کیا ہو گا! اب تو سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ رہے گی۔ بڑی آپا نے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر سے مشورہ کیا۔ پچیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ سعیدہ کے پاس بنک میں صرف اڑھائی ہزار روپیہ جمع تھا۔ اور ڈیڑھ ہزار قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ زبیدہ بیچاری کی تو خیر گھر میں اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی سے کچھ مانگ سکے۔ سعیدہ کا خاوند سب سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی شریف خاندان کو محض ایک فرد کی کھوکھلی وضعداریوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے دیکھ رہا تھا اور اُسے کسی طرح بھی نہ بچا سکتا تھا۔ آخر بڑی آپا نے تجویز پیش کی کہ رضیہ کے لیے قاضی اصغر علی ملٹری کنٹریکٹر کا رشتہ منظور کر لیا جائے۔ یہ رشتہ پہلے سعیدہ کے لیے آیا تھا۔ لیکن محض اس لیے نامنظور کر دیا گیا تھا کہ قاضی اصغر علی کی عمر زیادہ تھی اور اس کی دو بیویاں فوت ہو چکی تھیں۔ قاضی اصغر علی مالدار آدمی ہے۔ اگر وہ رضیہ کا رشتہ منظور کر لے تو یہ خاندان تباہی کے غار میں گرنے سے بچ سکتا ہے۔ اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت پروفیسر نے کی۔

"خدا کے لیے آپ بھی ایسا نہ کریں۔ اس سے تو بہتر ہو گا کہ آپ اپنے ہاتھوں رضیہ کو کنوئیں میں دھکا دے دیں۔"

سعیدہ فوراً بول اٹھی۔

"آپ تو اس کی طرفداری کریں گے ہی۔ ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے آپ کی بلا سے۔ آپ تو رضیہ کو بچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔"

دھیمی طبیعت کا سوگ پسند پروفیسر خاموش ہو گیا۔

زبیدہ نے بھی باولی نخواستہ اس تجویز کی حمایت کی۔ اسی وقت قاضی اصغر علی کے نام بڑی آپا کی طرف سے ایک خط لکھ کر آدمی شہر کی طرف دوڑایا گیا۔ دوسرے روز اس کا جواب آ گیا۔ قاضی اصغر علی کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہائی کورٹی خاندان بُری طرح قرضے میں پھنسا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض باتوں کا بہانہ بنا کر رشتہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سب پر اوس پڑ گئی۔ انھیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا سودا کر رہے ہیں تو دوسرا بھی مال دیکھ قیمت ڈالتا ہے۔ بھلا ایسی دلہن کو کون اپنے گھر بسانے کا جس کے پیچھے پچیس ہزار قرض خواہوں کی ایک طویل قطار کھڑی ہو۔ دوسرے دن سعیدہ اور زبیدہ بھی یہ کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیں کہ وہ فی الحال آرام سے رہیں اگر کوئی غیر خوشگوار بات ہوئی تو انھیں فوراً اطلاع کر دی جائے۔ گھر پہلے سے زیادہ خالی اور سنسان دکھائی دینے لگا۔ رضیہ اپنا کھیل لے کر اپنی امی کے پاس گئی اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو امی! ابا جی ہمیں اس طرح کیوں چھوڑ گئے ہیں؟"

اور بوڑھی مدبر ماں آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پی کر بیٹی کو حوصلہ دینے لگی۔

"ہماری یہی تقدیر تھی میری بیٹی! آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔"

خدا نے ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ بلکہ خدا کو تو ان کے گناہ یاد بھی نہیں تھے۔ ہاں دنیا میں رہنے والوں نے ان کی چھوٹی سے چھوٹی خطا بھی معاف نہ کی تھی۔ چنانچہ گھر کے مالک کو فوت ہوئے بمشکل تین ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ شہر کے بنک، جائیداد گروی رکھنے والی کمپنی اور کپڑے کے کارخانے کی جانب سے اپنی اپنی رقم کی واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ کپڑے کے کارخانے کا حصہ میر صاحب اپنی زندگی میں ہی فروخت کر چکے تھے۔ بلکہ اُلٹا کارخانے والوں سے چار ہزار قرض لے رکھا تھا۔ مکان ستر ہزار میں گروی پڑا تھا اور بنک کا مطالبہ کٹ کٹا کر چھ ہزار روپے کا تھا۔ آہستہ آہستہ تقاضے شدید ہوتے گئے۔ بنک کی طرف سے ہر تیسرے روز ایک آدھ یادداشتی خط آجاتا۔ رہن کمپنی نے جائیداد خالی کر دینے کا سرکاری نوٹس دلوا دیا۔ کارخانے والوں کا ایک آدمی ہر روز آ کر مکان کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

رضیہ کی والدہ نے صورتِ حال سے زبیدہ اور سعیدہ کو آگاہ کر دیا تھا۔ پہلا خط پروفیسر نے لکھا اور دوسرا زبیدہ کی طرف سے آیا۔ انھوں نے رضیہ اور بڑی آپو کو تھوڑا بہت ضروری اور قیمتی سامان ساتھ لے کر اپنے اپنے ہاں آجانے کی دعوت دی۔ بڑی آپو نے زبیدہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری سامان کی پیکنگ شروع ہو گئی۔ رضیہ کے لیے اپنا خدیمی گھر چھوڑنا اور پھر ایسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں چھوڑنا ایک عظیم صدمہ تھا جسے وہ دوسرے صدموں کے ساتھ اپنے سینے میں چھپائے تھی۔

بوڑھی خادمہ اور اس کی بیٹی لاڈلی کے ساتھ مل کر چمڑے کے بڑے صندوقوں میں ریشمی اور گرم کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ بوڑھی خادمہ سے بھی اس گھر کی تباہی نہ دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور آدھی رات کے وقت قالینوں، پردوں اور آبنوسی فرنیچر سے سجے ہوئے اس پرانے مکان صدیوں کے بوڑھے آسن کے سفید بال پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ رات کے تین بجے تمام قیمتی اور ساتھ لے جانے والا سامان صندوقوں میں بند ہو کر تیار ہو گیا۔ تین بڑے صندوق، دو سوٹ کیس اور دو بستر تیار کر کے رکھ گئے تھے۔ بڑی آپو آتشدان کے پاس سرمئی گرم شال اپنے جھکے ہوئے بوڑھے کندھوں پر پھیلائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ انھیں وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ پہلے روز اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے آئی تھیں۔ کتنے روشن، پُرامن اور ہمدرد دن تھے۔ وہ بنارسی کامدار عروسی جوڑے میں ملبوس بڑے کمرے کے وسط میں گہری سُرخ سوزنی پر شہزادیوں کی طرح بیٹھی تھیں اور انھیں خوبصورت آنکھوں اور سرخ چہرے والی لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ کس طرح ان پر دیوانہ وار فدا ہو رہی تھیں! آج ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب خوبصورت آنکھوں والی سہیلیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ دُکھ اور مصیبت کی اس بھیانک گھڑی میں انھیں اپنے خاوند کا خیال آگیا جو آج کے دن سے بچنے کے لیے ان لوگوں کو اس دن کے مقابلے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا۔ بڑی آپو نے سفید رومال والا کمزور بوڑھا ہاتھ شال سے نکالا اور اُسے آنکھوں پر رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگیں۔

رضیہ اپنے کمرے میں ایک طرف ہو کر کھڑی دیواروں، الماریوں، میزوں، صوفوں اور پلنگ اور سنگار دان اور قالینوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے اپنا کمرہ سانس لیتا محسوس ہو رہا تھا اور اس کے در و دیوار گویا اس کے دکھی دل کے ساتھ ساتھ دھڑک رہے تھے۔ کمرے کی الماریاں اور شیلف کتابوں سے خالی تھیں۔ میزوں کے درازوں میں کوئی ضروری کاغذ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف موٹا گدا پڑا تھا۔ کارنس پر چینی کی دو لمبی منقش صراحیاں پڑی تھیں اور ان کے اوپر بڑا سا کلاک لیمپ کی دھندلی روشنی میں

رات کے سوا تین بجا رہا تھا۔ کھڑکی بند تھی اور اس کے آگے قرمزی پردہ چھنا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر شے پریشان اور ویران دکھائی دے رہی تھی۔ رضیہ کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ محض میز پر سے کتابیں اٹھا دینے اور پلنگ پر سے بستر اٹھا دینے سے کمرہ اجڑ جائے گا۔ اس کمرے نے رضیہ کو ہر رنگ، ہر موڈ، ہر حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی دیواریں اور پردے اس کے ہمراز اور محرم تھے۔ انھوں نے رضیہ کو روتے، آپ ہی مسکراتے، باتیں کرتے، چپ ہوتے، اُلجھن اور اداس ہوتے دیکھا تھا۔ انھوں نے اُسے پُراسرار راتوں کی نیلی خاموشیوں میں اُٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جسم پر عطر چھڑکتے اور سنہری کاغذ پر ان دیکھے اجنبی محبوبوں کو محبت بھرے خطوط لکھ کر دراز میں سنبھالتے اور صبح ان خطوں کو ندامت سے پھاڑتے دیکھا تھا۔ رضیہ نے پردہ ایک طرف کر کے لیمپ دھیما کر دیا اور کھڑکی کھول دی۔

باہر سردیوں کے گہرے نیلے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی لویں جھڑک رہی تھیں۔ باغ میں سردی اور اندھیرا تھا۔ اور گہری خاموشی میں لیموں کے پیڑوں سے شبنم کے ٹپکنے کی پُراسرار آواز آ رہی تھی۔ باغ کے اوپر درختوں پر تاروں کی دھیمی دھیمی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تازہ اور سرد بہار رضیہ کی پیشانی کو چھو کر اندر داخل ہونے لگی۔ رضیہ کے کمزور جسم نے جھرجھری سی لی اور اس نے گرم شال درست کرتے ہوئے کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ الوداع! لیموں کے پرانے باغ اور اس کی شاخوں پر سے ٹپکتی ہوئی شبنم! شاید تمہیں دیکھنا پھر کبھی نصیب نہ ہو۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے رضیہ نے سوچا۔ جانے اس کھڑکی کو اب کون کھولے گا۔ رات کی خاموشی میں پرانی وقادار خادمہ کے بڑے بیٹے نے سارا سامان اپنے چھکڑے پر لادا۔ اور سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلی منزل کے تمام کمرے مقفل کر دیئے گئے۔ دوسری منزل کے کمرے پہلے ہی بند تھے اور اندر ٹوٹا پھوٹا بوسیدہ سامان گرد و غبار کی دبیز تہوں میں اٹا ہوا تھا۔ اور اب نچلی منزل کی باری تھی۔ اب اس منزل میں مکڑیاں جالے بنیں گی، مکڑیاں انڈے دیں گی۔ اور چوہے قالینوں پر دوڑیں گے اور بلی کھلے روشندان میں سے بڑی الماری اور بڑی الماری پر سے میز پر کود کر ان کے شکار کو آیا کرے گی۔ اب دیواروں کا چونا گرنا شروع ہو جائے گا۔ اور دیمکوں، چوکھٹوں، دروازوں اور کرسیوں کو دیمک لگے گی اور ریشمی گدیوں والے پلنگوں میں چھپکلیاں آباد ہوں گی۔ بندکمروں کی گھٹی ہوئی فضا میں ایک نئی فضا پیدا ہو گی اور اس نئی فضا کے کیڑے مکوڑے پیدا ہوں گے۔ اب یہ پرانا مکان کبھی آباد نہ ہو گا۔ اس میں جو بھی رہنے آئے گا۔ اسے ایک نہ ایک دن رات کے اندھیرے میں سامان باندھ کر چوروں کی طرح بھاگ جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس مکان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، بنیادوں کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ اور اس کے نیچے کھولتا ہوا آتشیں لاوا گردش کر رہا ہے۔ ایسا پرانا مکان جہاں کہیں ہو گا آخر ویران ہو گا اور اس پر آسیب اپنا قبضہ جما لیں گے۔ نکل جاؤ، نکل جاؤ، ایسے تمام بوسیدہ مکانوں کی چھتوں سے نکل جاؤ۔ یہ لڑکھڑا کر گرنے کو ہیں، ان کے نیچے زمین کے بھونچال سے بھرتا لاوا دہک رہا ہے۔ یہ بھڑکنے کو ہے اور پھر بھیانک آواز کے ساتھ زلزلہ آئیگا۔ اور ان حویلی نما کرم خوردہ مکانوں کے ستون تنکوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ اے پہلی منزل والو! اور دوسری منزل والو.....

اور اب میر گھرانے کے یہ آخری دو بدنصیب افراد اپنے آبائی مکان سے بے دخل ہو رہے ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں گرم کپڑوں، گرم چادروں اور اونی شالوں میں اپنا آپ چھپائے، سر جھکائے مکان کے پہلے دروازے میں سے نکل کر سرد ویران

برآمدے میں سے ہوتی ہوئی بڑے گیٹ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ان کے آگے بوڑھی خادمہ ٹوکری اور اچکن کیس اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ باہر درختوں کے نیچے ایک تانگہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔ جب وہ دونوں صدر دروازے میں سے باہر نکلنے لگیں تو دہلیز میں آگی ہوئی گھاس نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو بڑی آپو! چھوٹی آپی! آپ کب آؤ گی؟ ہم سردیوں کی ٹھٹرتی تنہائیوں میں یاد کیا کریں گے۔ شاید اگلی بہار تک ہم زندہ رہیں۔ ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ ہم آنے والوں کے قدم چوما کرتے تھے اور جانے والے کے پاؤں پکڑ لیتے تھے۔ اب ہم کس کی راہ دیکھیں گے؟ رضیہ کی امی نے ہاتھ سے صدر دروازے کے ٹھنڈے ستون کو چھوا اور جیسے کسی نے ان کے دل کو مٹھی میں لے لیا۔ رضیہ نے اپنی روتی ہوئی والدہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور قدم قدم چلتی تانگے کی طرف آ گئی۔ تانگے میں بیٹھ کر انھوں نے آخری بار مکان پر نگاہ ڈالی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ کسی کھڑکی میں کوئی لیمپ نہ جل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی افسردہ، پھیکی اور بیمار روشنی اور اندھیرے میں اونگھتے ہوئے مکان پر ایک ایسے مجرم کا گمان ہو رہا تھا، جسے پھانسی ملنے والی ہو، اور جو اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا سر جھکائے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا ہو۔

تانگہ آہستہ آہستہ کھیتوں میں سے گذرنے لگا۔ قصبے کے کھلے کھیتوں میں جوار اور کپاس کی فصل تیار کھڑی تھی اور سرد ہوا میں ان کی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ کھیتوں پر دور دور تک کہرا چھا رہا تھا اور اوپر وسیع آسمان پر رات کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اور صبح کے خوف سے ستارے کانپ رہے تھے۔ پرانا حویلی نما مکان رضیہ اور اس کی والدہ کی نگاہوں سے آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا اور اب کھلے پھیکے نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ درختوں کے اوپر ایک بڑا سا سیاہ دھبہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس تاریک دھبے میں ان کے پورے خاندان کی تاریخ دفن تھی۔

سٹیشن پر کہیں کہیں دو ایک لیمپ روشن تھے۔ اونچے نیچے فرش والا پلیٹ فارم دور تک سنسان تھا۔ پچھلے پہر کی یخ بستہ سردی میں لوہے کے بنچ اوس میں بھیگے ٹھٹر رہے تھے۔ رضیہ اپنی والدہ اور بوڑھی ملازمہ کے ساتھ برآمدے میں لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا شاید وہ سعیدہ کے ہاں جا رہے تھے لیکن سٹیشن پر آ کر پتہ چلا کہ وہ زبیدہ کے گھر جا رہے ہیں۔ رضیہ کا دل بجھ گیا تھا اور اوس میں بھیگے ہوئے آہنی بنچ کی طرح سردی میں پڑا ٹھٹر رہا تھا۔ تانگے میں، کھلے کھیتوں کی سڑی کھاتے سے اس کا بدن دکھ رہا تھا۔ اور اس کے پریشان خیالات خلا میں گمشدہ ستاروں کی طرح بے مقصد چکر لگا رہے تھے۔ ریل کے ڈبے میں سوار ہوتے ہوئے بڑی آپو نے مکان کی چابیاں بوڑھی خادمہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"اب سب کچھ تمہارے حوالے ہے۔"

خادمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی آپو نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ گاڑی چلی تو رضیہ نے آخری بار قصبے کی طرف دیکھا۔ مشرقی آسمان پر رات کے آخری بیمار اور زرد سائے مدھم ہو رہے تھے اور ستاروں کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سر والدہ کے سینے سے لگا دیا۔ اور دونوں ماں بیٹیاں دور تک روتی چلی گئیں۔

ڈیڑھ ماہ بعد ہری ناگ والے پرانے مکان کا سارا سامان نیلام کر دیا گیا۔ یہ بہار کے آغاز کا موسم تھا۔ نہر کنارے گیکر کے درختوں پر بسنتی پھول آ رہے تھے اور ہوا میں ان کا زرد بورا اڑ اڑ کر ندی کے پانی اور پگڈنڈی پر گر رہا تھا۔ پرانے مکان

کے عنب میں خستہ حال محراب پر چڑھی ہوئی خشتی بیلیاں اور گلاب کی بیلوں میں ننھی ننھی کلیاں آنکھیں کھولے پتوں کے جھروکوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لیموں کے پیڑ بھی سفید پھولوں سے لد گئے تھے اور ان پر شہد کی مکھیاں چکر لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف مکان کے صدر دروازے کے باہر پہلی اور دوسری منزل کا گرد آلود پرانا مگر قیمتی سامان نیلام ہو رہا تھا۔ مکان کی بوڑھی ملازمہ اپنی بیٹی اقبال کے ساتھ باورچی خانے کے باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کھڑی غمزدہ چہرے اٹھائے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دوسری جانب زبیدہ کا خاوند ڈاکٹر اور سعیدہ کا خاوند پروفیسر شہر کی ایک کمپنی اور بنک کے نمائندوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے ———

سیاہ لمبے کوٹ والا آدمی چبوترے پر کھڑا چھڑی اٹھائے نیلامی بول رہا تھا۔ سامنے قصبے کے زمینداروں جاگیرداروں اور امیر بیوپاریوں کے کارندے کھڑے مال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی وجہ سے وہ لوگ خود نہیں آئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے کارندے بھیجے تھے۔ اس مجمع میں قصبے کا ایک بھی دوکاندار، گاڑیبان، حجام، نعل ساز، کوچوان اور حلوائی موجود نہ تھا۔ وہ لوگ ایک بھرے گھر کا یوں راج اٹھتا دیکھ کر گھروں میں بیٹھے افسوسناک انداز میں اس پر تبصرہ کر رہے تھے اور خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ وہ ہر گھر کی لاج رکھے۔ دوسری پرانی ڈیوڑھیوں میں ملبوس سامان کی ڈھیریوں کے درمیان اجنبی مرغوں کی طرح گردن اکڑائے پھر رہے تھے اور یہاں وہاں کسی نہ کسی میز، صوفہ، الماری یا پلنگ کو ڈنڈے سے بجا کر دیکھ لیتے تھے۔

نیلام بڑی تیزی سے شروع تھا۔ سو کا مال دس روپوں میں اور دس روپے کی شے ایک روپے میں اٹھ رہی تھی۔ قرضخواہ فوراً رجسٹروں میں اندراج کرتے جاتے تھے اور دور بنک کے ادھیڑ عمر نمائندے کے پاس میز پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا اور نیلام کرنے والی کمپنی کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا۔

"لندن میں نیلام کروانے والوں کو کمیشن کے ساتھ آنے جانے کا الاؤنس اور وہ وقت کا کھانا بھی ملتا ہے اور یہاں.....؟"

کمپنی کا گنجا نمائندہ گولڈ فلیک کے سگریٹ کو بچے کے سگریٹ کی مانند پیتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا اور لمبے سیاہ کوٹ والا دبلا پتلا چاربی سا آدمی کانسی کا پھول کی پتی ایسا بڑا اور منقش نقال ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔

"بولئے حضرات اس کے لیے۔ اس ماسٹر پیس انجینئر کے لیے۔ ہاں ہاں.....!"

مجمع میں ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"اوئے غلام علی! اسے گھر لے جاؤ اوئے، اماں پان لگائے گی۔"

اور مجمع میں لوگ قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ ڈاکٹر بھی دیچھی کی طرح ہنسنے لگا۔ گنجے نمائندے نے ڈاکٹر کی طرف جھک کر کہا۔

"صاحب یہ نقال پان سگریٹ کی دکان ہی کا ہے۔"

جب سیاہ رنگ کے ایک خوبصورت آبنوسی رائٹنگ ٹیبل کی نیلامی ہونے لگی تو پروفیسر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے بڑے مجمع میں صرف وہی جانتا تھا کہ اس میز پر جھک کر رضیہ ——— وہ یونانی المیہ کی ہیروئن اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی ——— اور ترجمہ ٹالسٹائی، ژید، کیٹس، تھارو اور ہیگو کو پڑھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"آپ کہاں چلے؟"

"میں یہ میز خریدنا چاہتا ہوں۔"

نیلامی بولنے والے نے آبنوسی میز کو چھڑی سے بجاتے ہوئے کہا۔

"اور اب اس کالے میز کے لیے ——— سائیان اس کے سیاہ رنگ پر نہ جائیں۔ اس کے گن دیکھیں۔ دیکھئے اس کے چھ دراز ہیں اور اس کا ایک ڈھکنا بھی ہے۔ موٹر گاڑی کی طرح بارش ہو تو ڈھکنا چڑھایا جا سکتا ہے۔ اب بولیے اس کالے مگر دل کے گودے میز کے لیے.....

ایک طرف سے آواز آئی۔

"پانچ روپے۔"

پروفیسر نے فوراً بیس روپے کہہ دیئے۔ سب لوگ اُسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ نیلامی بولنے والا کتنی دیر "بیس روپے ایک، بیس روپے دو" چلاتا رہا لیکن مجمع میں کوئی نہ بولا۔ آخر اس نے "بیس روپے تین" کہہ کر چھڑی میز پر ماری اور میز پروفیسر کے حوالے کر دی گئی۔ پروفیسر نے روپے دیئے اور بوڑھی خادمہ کی مدد سے میز برآمدے میں ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ پروفیسر نے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی ہو بیٹی؟"

لالی نے سر جھکا لیا۔ اس کی ماں نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیسا ماج اکٹ گیا بڑے بابو؟"

پروفیسر نے ایک گہرا سانس بھرا اور خاموش رہا۔

.....

رضیہ کو اپنی امی کے ساتھ زبیدہ باجی کے ہاں رہتے ہوئے تیسرا مہینہ گزر رہا ہے۔ زبیدہ کے سسرال والوں کی یہ کوٹھی اولڈ کلب روڈ پر واقع ہے۔ یہ کوٹھی کافی لمبی چوڑی ہے۔ اس کے لان میں کیاریاں نصف دائرے کی صورت میں بوگینویلیا کے اونچے اونچے درخت ستونوں کی طرح کھڑے ہیں۔ برآمدے کی محرابوں میں کانٹے دار گھاس کے دو تختی گملے لٹک رہے ہیں۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ پورٹیکو سے ان دروازوں کی طرف جاتی ہوئی کمان نما کچی سڑک پر حنائی رنگ کی بجری بچھی ہوئی ہے۔ جب کوئی کار اندر داخل ہوتی ہے، تو اس کے نچلے پہیوں کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گرد اڑا کرتی ہے۔ سڑک کی جانب جھاڑیوں کی دس گیارہ فٹ اونچی دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ لان میں لالہ اور سورج مکھی کے سُرخ اور زرد پھول مارچ کی دھوپ میں مسکرایا کرتے ہیں۔ رضیہ اور اس کی امی کو اس کوٹھی کے دو مختصر سے کمرے دے دیئے گئے ہیں۔ ایک کمرے میں سامان اور دو پلنگ بچھے ہیں اور دوسرے کمرے میں دو تین کرسیاں، ایک میز اور کارنس پر چینی کا تھوڑا بہت سامان پڑا ہے۔ اس کمرے کی ایک چھوٹی سی کھڑکی لان کی طرف کھلتی ہے۔ اس وقت رضیہ اس کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ اس قدر ڈھل گیا ہے کہ وہ عمر رسیدہ عورت معلوم ہو رہی ہے۔ چہرے کا رنگ بھوسلا ہو رہا ہے اور ہاتھوں پر سبز رگیں اُبھر آئی ہیں۔ بھورے حلقوں میں آنکھیں جب کسی شے کو غور سے

دیکھتی ہیں تو پتھر کی معلوم ہوتی ہیں۔ گالوں پر ایک بے رنگ سی مُردنی چھا رہی ہے وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی باہر لان میں ایک طرف ڈھلتے سورج کی نارنجی دھوپ میں اپنی بوڑھی امی کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی امی جھاڑیوں کے پھولوں کے پاس سبز کرسی پر بیٹھی کانپتے ہاتھوں میں پلیٹ تھامے چمچ سے دلیہ کھا رہی ہے۔ اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں اور بھاری جسم ڈھلک کر زرد ہو گیا ہے۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئی ہیں اور چہرے پر گردن تک جھریوں اور لکیروں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ اس کے پاس ہی زبیدہ کی شوخ و شنگ نندیں ٹینس کھیل رہی ہیں۔ انھوں نے رنگین دوپٹے کمر کے ساتھ کس کر باندھ رکھے ہیں اور وہ اچھل اچھل کر کھیل رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں اور ان کے کٹے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ بڑی نند کا کمسن لڑکا نیلی نکر پہنے رضیہ کی والدہ کے پاس جا کر اُسے جھک کر غور سے دیکھتا ہے اور پھر ٹینس کھیلتی ہوئی امی سے پوچھتا ہے۔

"امی..... دادی..... تیا تھا رہی ہے؟"

رضیہ یہ سب کچھ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور جیسے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ساتھ والی کوٹھی میں کوئی ریڈیو پر شہنائی بجا رہا ہے۔ شہنائی کی پُر درد آواز میں ایک زخمی فریاد اور لچک ہے۔ جیسے کوئی کھویا ہوا بچہ خواب میں بلک کر اپنی ماں کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رضیہ کے لیے یہ سنگین افسردگی کوئی نئی نہیں تھی۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اسی طرح تھی۔ اس نے کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔ وہ سارا دن اپنے مختصر سے کمرے میں بیٹھی پڑھتی رہتی، لکھتی رہتی اور اپنی غم نصیب بوڑھی امی کے پاؤں دباتی رہتی۔ اس سے اپنی امی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کی نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی اور سورج کی روشنی میں بھی انھیں دو تین گز کے فاصلے پر سوائے دھند کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ نمکین چائے دن میں کئی بار پیا کرتی تھیں لیکن یہاں انھیں یہ کشمیری چائے صرف دن میں ایک بار صبح کو ملتی تھی۔ کبھی کبھی زبیدہ سب کی نظریں بچا کر ان کے لیے سبز چائے کا پیالہ بنا کر لے آتی تھی۔ وہ چوری چھپے انھیں اور بھی بہت کچھ لا دیا کرتی تھی۔ لیکن اپنے تخت سے گری ہوئی شکست خوردہ بوڑھی آپو نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ بلکہ وہ زبیدہ کو بھی وہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ سعیدہ شروع شروع میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے آیا کرتی مگر کچھ دن گزرنے پر اس نے بھی آنا کم کر دیا۔ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا کہ وہ اب ملنے کیوں نہیں آتی۔ پروفیسر نے اپنی بیوی سے چپکے بڑی آپو کو ہر ماہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ پیش کرنا چاہا جسے غیور عورت نے قبول نہ کیا۔ بلکہ پروفیسر کے ساتھ کچھ ایسی سرد مہری سے پیش آئی کہ وہ چپکے سے اٹھ کر چلا گیا اور پھر کبھی نہ آیا ———

پہری ناگ سے جو چند سو روپے بچا کر لائے گئے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ زیور ——— پرانے خاندانی زیورات فروخت کرنا بڑی آپو نے گوارا نہ کیا تھا، علاوہ ازیں ان کا خیال تھا کہ یہ زیور وہ رضیہ کو دیں گی۔ رضیہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا ——— ہاں! رضیہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تو خالی دامن ہی رہ گئی تھی ——— اس کی پھلواری میں تو بہار میں بھی درختوں کے زرد پتے ہی گرے تھے۔ آج اس کی محبت، اس کی جوانی، اس کی زندگی سلسلہ در سلسلہ تباہ حال کھنڈروں میں برہنہ سر کھڑی تھی اور اس کی ہر اُمنگ، ہر آرزو کا سر نیزے میں پرویا ہوا اس کی نعش پر نوحہ کناں تھا۔ وہ لاشعور کے تاریک جنگلوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اس کی سنگین یادوں کے تمام گیت وقت کی خاک اڑاتی، ویران محرابوں میں سجدہ ریز تھے۔ ہائے رضیہ! تیرے سارے سپنے گرم ریت میں بوئے گئے تھے۔ تو پھول کہاں سے چنتی! تیرے سارے جگنوؤں کو اندھیروں نے اپنی گدڑیوں میں قید کر رکھا ہے۔ تجھے روشنی کہاں سے

آئے گی! یونانی المیوں کی ہیروئن! اپنے کھوئے ہوئے ایتھنز، مائی سینی اور غرناطہ کی تلاش میں نکل جا! شاید تیرا محبوب تجھے شام اور فرات کے نخلستانوں میں کسی چشمے پر مل جائے اور تجھے شمالی افریقہ کے ساحل سے ہوتا ہوا ہسپانیہ کی اُن پتھریلی سڑکوں پر لے جائے جو زیتون اور انجیر کے باغوں کو جا رہی ہوں۔ اور جہاں انگور کی بیلوں تلے مراقشی قالینوں پر تیوعیسی کنیزیں رقص کر رہی ہوں اور اندلسی فکر یورپی تہذیب کا خاکہ مرتب کر رہے ہوں ———!

لیکن رضیہ جس طرف بھی جاتی زبیدہ کا خاوند اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور وہ بے بس ہو جاتی۔ اب تو بالکل ہی بے بس تھی۔ یہاں اس کی آہ و زاری سننے والا کون تھا۔ ایک امی تھیں۔ سو ان کی حالت رضیہ سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کے شیطانی حملوں سے بچائے رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر بالکل نہ نکلتی تھی۔ دن بھر کتابوں میں کھوئی رہتی اور رات کو دروازہ اندر سے بند کر کے امی کے پاس سوتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی طرح اپنی شادی کر لے اور آپو جی کو اپنے ساتھ ہی لے جائے۔ مگر وہ اکیلی کیسے اور کیونکر شادی کر لے؟ یونہی اسے کون گھر میں گھسنے دے گا اور اگر وہ کسی گھر میں آباد بھی ہو گئی تو وہاں اس کی کوئی بھی عزت نہ ہو گی۔ وہ بڑے باعزت طریق سے اپنے سسرال جانا چاہتی تھی۔ جہاں کا ہر فرد اس کا اور اس کی امی کا احترام کرے۔ لیکن وہ ہر بار ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی پھر اُسے یقین ہو جاتا کہ اُس کا بیاہ کبھی نہیں ہو گا اور کسی ہسپانوی پہاڑ سے نکل کر کوئی اندلسی شہزادہ اسے لینے نہیں آئے گا، کوئی سفو کلیس اُسے اپنے ڈراموں کی ہیروئن بنانا گوارا نہ کرے گا اور فرات کی وادی میں کوئی محبوب چشمے پر اس کا انتظار نہ کرے گا، اور وہ یونہی مر جائے گی، اس لئے اُسے موت بڑی خوفناک دکھائی دیتی۔ مگر جب وہ اپنے نیلے راستوں پر ڈاکٹر کے بالوں بھرے بھدے جسم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتی تو چیخ مار کر جاگ اٹھتی اور خدا سے موت کی دعا مانگتی۔ موت ——— تاریک اندھیروں کا اندھیرا، سناٹوں کا سناٹا، تنہائیوں کی تنہائی اور راتوں کی رات!

ایک بار اس نے اپنی امی کے پاؤں دباتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میرا یہاں دل گھبراتا ہے آپو جی! بہت گھبراتا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک آدھ ماہ باجی سعیدہ کے ہاں رہ آئیں۔"

رضیہ کا خیال تھا کہ باجی سعیدہ کے ہاں اس بہانے جا کر وہ کبھی زبیدہ کے گھر واپس نہ آئے گی۔ مگر اس کی امی نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا اور تنبیہہ کی کہ آئندہ اس گھر کا نام نہ لے۔

"اب ہمارا مرنا جینا اسی جگہ ہے۔"

اور رضیہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ پنجرے میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

باہر لان میں دھوپ یوکلپٹس کے درختوں کی آخری ٹہنیوں کو چوم کر رخصت ہو رہی تھی۔ زبیدہ کی نندیں بدستور ٹینس کھیل رہی تھیں۔ رضیہ کھڑکی کے ساتھ لگی اسی طرح کھڑی تھی اور بے خیالی میں کبھی انہیں کھیلتے دیکھنے لگتی اور کبھی اپنی کمزور و ناتواں ماں کو آہستہ آہستہ دلیہ کھاتے دیکھ رہی تھی۔ اچانک ایک طرف سے گیند اچھلتی ہوئی آئی اور دلیہ کھاتی بوڑھی عورت کے سر سے ٹکرا کر جھاڑیوں میں جا گری۔ رضیہ کا دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ زبیدہ کی پہلی نند نے بلند آواز میں رسمی طور پر معافی مانگی اور دوسری نند جھاڑیوں میں گیند تلاش کرنے لگی۔ کمزور بوڑھی عورت نے کچھ نہ کہا۔ صرف عاجزی سے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ دلیہ کھانے لگی۔ اور اب اس کے دلیے میں اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی شامل تھے۔ رضیہ کے دل پر برچھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے کھڑکی

بند کر دی اور اس کے بند پٹ کے ساتھ سر لگا کر سسکیاں بھرتے ہوئے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا اور باہر دھوپ نجھت ہو گئی۔

بہار گذر گئی تھی اور درختوں پر سے پتے گرنا شروع ہو گئے تھے کہ سعیدہ کے ہاں چاند ایسا لڑکا پیدا ہوا۔ سعیدہ کی ساس، بہو کے اصرار پر زبیدہ کے ہاں آئی تو ساتھ اُن کی بوڑھی آپو کو بھی کمال بیگ لیتی آئی۔ اس نے رضیہ کو بھی چلنے کے لیے کہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ سعیدہ نے رضیہ کی عدم موجودگی کو ایک لمحہ کے لیے محسوس کیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے بھول گئی۔ سعیدہ نے زبیدہ، اپنی بوڑھی ماں، زبیدہ کی دونوں نندوں اور اس کی ساس، سبھوں کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے پر سب نے بڑی خوش دلی اور سرگرمی کا اظہار کیا۔ زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند تو اس قدر کھا گیا کہ اس کا پیٹ ابھر گیا اور وہ کافی پر کافی چڑھانے لگا۔ پروفیسر نے بہت کم کھایا اور سب سے جدا ہو کر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ اس کے ارد گرد سائے میں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اچانک اُسے خیال آیا کہ رضیہ گھر میں تنہا ہو گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے چپکے سے گیرج میں جا کر موٹر نکالی۔ نوکر سے کہا کہ وہ ذرا اسٹیشن تک جا رہا ہے۔ اور سیدھا زبیدہ کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

رضیہ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں تنہا تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز اپنی ڈائری کے پرانے اوراق پڑھ رہی تھی کہ کوٹھی میں کسی کار کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ کار کے دھیمے دھیمے ہارن کی آواز بڑی مانوس تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ باہر پورٹیکو میں پروفیسر کار کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ رضیہ گم سُم سی ہو کر وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ یہ کیوں آئے ہیں؟ کیا اُسے لینے آئے ہیں؟ وہ کبھی نہیں جائے گی۔ کہیں نہیں جائے گی۔ اب یہاں اس کا کون ہے! کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ رضیہ جیسے کسی سحر کے زور سے دروازے کی طرف لپکی اور فوراً چٹخنی کھول دی۔ پروفیسر نے بھورے رنگ کے سمر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ افسردہ تھا۔

رضیہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹھیے۔"

پروفیسر کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے میں بڑی معنی خیز چپ چاپ طاری ہو گئی۔ رضیہ کو پہلی بار اس کمرے کی خاموشی بڑی مانوس محسوس ہو رہی تھی۔ اس خموشی میں آنے والے دنوں کی خفتگی اُمیدیں اور پرانے دنوں کے سوگوار نوحے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اُسے اُس خموشی کی پُر عجب سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ سعیدہ کے خاوند نے اپنے مخصوص انداز میں فکر آمیز آنکھوں کو ذرا سکیڑ کر کہا۔

"میں ——— میں تمہیں بہت کچھ کہنے آیا تھا رضیہ۔ مگر کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری باتوں سے بہت بلند ہو۔ میں نے تمہارے سامنے ہمیشہ لفظوں کے پاتشے پھینکے ہیں اور تم زندگی کے بھنور میں اتری ہوئی ہو۔ اب صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم شادی کر لو۔ سعیدہ نے آپو جی کے مشورے سے ایک رشتہ تلاش کر لیا ہے۔ لڑکا مجھے بھی پسند ہے۔ کوشش کرنا کہ اس کے ساتھ زندگی کے دو روز ہنس کھیل کر گزار سکو۔"

رضیہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں رضیہ۔ اس لیے کہ تمہارے دکھوں کا یہی ایک علاج ہے۔"

"اگر زندگی گذارنا ایک مرض ہے تو مجھے اس کا علاج نہیں چاہیئے۔"

پروفیسر کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر رضیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس بدنصیب مرغ کو برف کے گھرے شگاف میں گرتے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ رضیہ کو اس تباہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا ———

"میرا مطلب یہ نہیں رضیہ۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے گھر آباد رہو۔ تمہارا بھی ایک خوبصورت گھر ہو۔ تمہارے بھی خوبصورت بچے ہوں۔ تمہاری نگہداری کرنے والا کوئی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔ تم کیا تھیں۔ تم کیا بن گئی ہو؟"

رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اگر خوبصورتی کی تلاش میں نکلا ہوا انسان بدصورت ہو جاتا ہے تو میں دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہوں۔ اور اگر نیکی کرنے سے انسان برا ہو جاتا ہے تو مجھ سے زیادہ برا اور کون ہو گا؟"

پروفیسر نے سگریٹ سلگایا اور اٹھ کر پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رضیہ کھڑکی سے باہر درختوں پر دھوپ میں چمکتے زرد پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

"مجھے زندگی سے محبت ہے اور جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرنا بھی زندگی میں شامل ہے مجھے موت سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گی۔ ہو سکتا ہے میں کل سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کل طلوع ہونے والا سورج مجھے نہ دیکھے۔ جہاں میں دفن ہوں گی وہاں زرد گلاب کا پھول اگے گا۔ بھلا جس کی موت پر تر و تازہ پھول اگیں وہ کیسے مر سکتا ہے؟ ....."

"لیکن رضیہ ....."

"زندگی گذارنا ایک آرٹ ہے پروفیسر صاحب۔ شاعر اور نیچرل آرٹسٹ اور جو لوگ اس آرٹ سے واقف ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ زندگی کا تعلق انسٹنکٹ سے ہے لیکن زندگی گذارنے کا تعلق انٹلیکٹ سے ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے دلی ہمدردی ہے۔ اس کے لیے میرا دل خوشی سے لبریز ہے۔ لیکن میں اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ راستہ پُرسکون جھیلوں پر جا نکلا تو میں وہاں چاندنی راتوں میں نیلے کنول چن کر آپ کی ہمدردیوں کے تہوار منایا کروں گی۔ اور اگر تپتے صحراؤں میں جا کر ختم ہو گیا تو میں پناہ صحیح راستہ تلاش کرنے ایک بار پھر آؤں گی ——— ہاں ایک بات آپ سے ضرور کہوں گی۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے لیے غم نہ کریں۔ میری قبر پر کسی کو آنسو نہ بہانے دیں۔ بڑی دلیری سے زندہ رہیں۔ زندگی کے الاؤ کو روشن اور بھڑکتا رکھیں۔ اگر یہ الاؤ مدھم ہونے لگے اور لکڑیاں ختم ہو جائیں تو بے شک میری لاش کو بھی اس میں جھونک دیں۔ میں مرنے کے بعد بھی زندگی کی بھٹی میں جلنا پسند کروں گی۔"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے لگا تھا اور زرد چہرے پر ایک عجیب قسم کی گرم روشنی جھلک رہی تھی۔ پروفیسر میز کے ساتھ ٹیک لگائے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر وہ ایکا ایکی آگے بڑھا۔ اس نے جھک کر رضیہ کے نازک ہاتھ کو بڑے احترام سے چوما اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ ایک عالم خود فراموشی میں ڈوبی مجسمے کی طرح

پڑی رہی۔ باہر کار کے سٹارٹ ہونے اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دور جا کر یہ آواز خلا میں کھو گئی۔ رضیہ اپنے ہاتھ کو بڑی افسردہ مسرت کے ساتھ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس مقدس ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

.....

شام ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک سعیدہ کے ہاں سے کوئی واپس نہ آیا تھا۔ نوکر بھی کہیں سینما وغیرہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں رضیہ کو اکیلے میں کچھ مبہم سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ لان میں ٹہلتی رہی۔ پھر برآمدے میں بیٹھی پڑھتی رہی اور اس کے بعد اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر لیٹ کر سعیدہ کے خاوند سے اپنی آج کی ملاقات، اس کی خاموشی، اپنی باتوں اور پھر اس کے جھک کر ہاتھ چومنے کے متعلق سوچنے لگی۔ کمرے میں شام کے پہلے مرطوب سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں بتی جلانے کا خیال آیا۔ وہ ابھی بتی جلانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک بار پھر وہی بھاری نیم وا سرخ آنکھوں والا ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن آج اس کے پاؤں میں خوفزدہ لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ وہ یوں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا جیسے اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا قیدیوں کو چابکیں لگوانے کا حکم دینے والا ہو۔

رضیہ دھک سے رہ گئی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"آپ..... آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"تم جانتی ہو۔"

ڈاکٹر کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ اندھیرے میں اچانک ایک خیال چمکا۔ رضیہ جھک کر کھلی کھڑکی کی طرف لپکی اور ڈاکٹر نے فوراً اسے اپنی مضبوط گرفت میں لیا۔

"اگر تم نے شور مچایا تو یاد رکھو کل تم اور تمہاری سفید بالوں والی ماں سڑک کے کنارے پڑی ہو گی۔"

رضیہ کا مبہم برف کی سل بن چکا تھا۔ سرد اور بے جان۔ اس نے ڈاکٹر کے بازوؤں سے نکلنے کی آخری کوشش کی اور اس کے بعد اسے غش آ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور دروازے سے باہر نکل کر کوٹھی کے دوسرے خالی کمروں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

.....

رات کو جب سب لوگ کار میں بیٹھے واپس آئے تو رضیہ کی بوڑھی امی نے دیکھا کہ رضیہ پلنگ پر بیہوش پڑی ہے اور کمرے کی فضا میں خون کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بدحواس ہو کر رضیہ کو ہلایا جلایا اور پھر چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ امی کی چیخ کی آواز سن کر سبھی اس کمرے کی طرف دوڑے۔ زبیدہ نے فوراً رضیہ کے نصف حصے پر چادر پھیلا دی اور اپنے خاوند کو آواز دی۔ اس کا خاوند بھاگتا ہوا اندر آیا اور اپنی بہن کو دوائی کا بکس لانے کو کہہ کر مریضہ پر جھک گیا۔

"فکر نہ کریں نبض ٹھیک چل رہی ہے۔"

رضیہ کو فوراً دو ٹیکے لگا دیئے گئے۔ لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ رات بھر اُس کی بڑی بہن اور بوڑھی ماں اُس کے پاس بیٹھی رہیں۔ درمیان میں دو ایک بار رضیہ نے آہستہ سے کراہتے ہوئے کچھ کہا اور پھر بے ہوش رہی۔ صبح کینال بینک والی کوٹھی سے بھی سعیدہ کے سوا باقی سب لوگ اولڈ کلب روڈ کی جانب دوڑے۔ سعیدہ کے خاوند نے غور سے رضیہ کا مرجھایا ہوا نیلا چہرہ دیکھا اور باہر نکل گیا۔ رضیہ کا چہرہ نیلا پڑ کر سیاہی مائل ہو گیا تھا اور ناخنوں کا رنگ بھی نیلاہٹ مائل ہو رہا تھا۔

کلائیوں اور ہتھیلی کی پشت پر اُبھری ہوئی سبز رگیں کھنچ گئی تھیں۔ اور بند آنکھیں سیاہ حلقوں میں ڈوب چکی تھیں اور اگر اس کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو شاید وہ ڈاکٹر کو اپنے رُوبرو دیکھ کر پھر کبھی نہ کھلنے کے لیے بند ہو جاتیں۔ رضیہ کی بوڑھی امی ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے سہمی ہوئی تھی جیسے وہ اپنی بیٹی کے اُوپر موت کے بازوؤں کو جھکے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ تین روز تک رضیہ حیات و موت کی کشمکش میں لٹکی بے ہوش پڑی رہی۔ بلیڈنگ کسی طرح بند نہ ہو رہی تھی۔ تین روز سے اس کے معدے میں سوائے گلوکوز اور طاقت کی دوائیوں کے اور کچھ نہ گیا تھا۔

چوتھے روز رات کے کسی لمحے اُس نے موت کے تاریک غار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ایک بار ——— صرف ایک بار کسی کی تلاش میں، کسی کی جستجو میں وہ اردگرد دیکھا اور اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بوڑھی ناتواں ماں نے اپنی بیٹی کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھام کر محبت سے پکارا۔

"میری بیٹی، میری بیٹی! میری رضیہ....."

رضیہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور وہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سعیدہ اور بوڑھی ماں چیخ مار کر لاش سے لپٹ گئیں۔ جاگو! جاگو! میری بیٹی، میری بہن، تم نے تو کہا تھا تم کبھی نہیں مرو گی۔ دیکھو صندوق میں تیرے بیاہ کے زیور پڑے ہیں اور الماری میں تیری کتابیں تجھے بلا رہی ہیں۔ جاگو! جاگو! آدھی آدھی رات تک پڑھنے والی! تجھے بیاہنے والا اُندلسی شہزادہ آ گیا ہے وہ دیکھو اس کا سنہری گھوڑا انجیر کے درختوں میں کھڑا ہے۔ لیکن رضیہ جا چکی تھی۔ نیلی دھند میں ڈوبی ہوئی گمنام پہاڑیوں کی طرف۔ تاریک کہرے میں لپٹے ہوئے اجنبی جزیروں کی طرف ——— اور زندگی اور موت سے پیار کرنے والی! ذرا کھڑکی سے باہر دیکھ۔ رات نے تیرے سوگ میں اپنے تمام ستاروں پر سیاہ چادر چھپا دی ہے اور ہوا درختوں کی نکلتی ہوئی ٹہنیوں سے گلے مل کر سسکیاں بھر رہی ہے۔ ہمیں بھی اُس جنگل کا راستہ بتا دی جاؤ جہاں زعفران اگتی ہے اور جہاں پہنچ کر غمزدہ کنواریاں گھر واپس آنا بھول جاتی ہیں۔ اور پھر کھلی کھڑکی میں سے آدھی رات کو چلنے والی ہوا کا جھونکا اندر آیا اور جیسے کسی نے آہ بھر کر خشک آواز میں کہا۔

SO SIGH WE PASSING OVER THE SILVER STRINGS
WE ARE THE VOICES OF THE WANDERING WINDS
..... WANDER THOU TOO, O, PRINCE!

دوسرے دن رضیہ کو ہری ناگ کے آبائی قبرستان میں اپنے باپ کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔

دسمبر کی کہر آلود سرد رات ہے۔ بارش ابھی ابھی رکی ہے۔ کینال بینک کی تمام کوٹھیوں میں اندھیرا ہے۔ صرف ایک کوٹھی کے عقبی کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہے اور اندر ادھیڑ عمر کا ایک اداس چہرے والا آدمی سیاہ آبنوسی میز پر جھکا کسی عورت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرانی ڈائری پڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک انتہائی لاغر بوڑھی عورت لوان میں بیٹھی اپنی بیٹی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے۔

اور کینال بینک سے دور ——— باغوں، کھیتوں، میدانوں کے اس پار قصبہ ہری ناگ کے حویلی نما پرانے مکان کو تاریکی نے اپنی بھیگی ہوئی سرد چادر میں لپیٹ رکھا ہے کسی کھڑکی میں لیمپ نہیں جل رہا۔ اس کی دیواروں پر گھاس اگ آئی ہے اور گلاب کی بیل نیچے گر پڑی ہے۔ اور یہاں سے جنوب کی طرف نہر کے پار مغل دربار کی گمنام کنیز کی تربت پر آم کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں اور قریب ہی پرانے قبرستان میں ایک جگہ رضیہ دفن ہے۔ اس کی پختہ قبر پر کائی جمی ہے اور اوپر درختوں کی ٹہنیوں میں رکا ہوا بارش کا پانی ٹپک رہا ہے، رو رہا ہے۔

گڈریا

اشفاق احمد

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر تک لپٹے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ پیر دھکیلنا چاہا "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا ــــ اس کا فاری میں ترجمہ کرو۔"

"دادو جی کے بچے" میں نے روٹھے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہیں ــــ دفع ہو جاؤ ــــ میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا ــــ دادو جی کے بچے ــــ کہتے ہیں" اور میں رونے لگا۔

دادو جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا! پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا پھر لوگ تیرے دادو کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں ــــ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی ..... اور میں بھی ــــ میں بھی ..... میں بھی" اپنی جوانمرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

دادو جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر شاباش ــــ میرا اچھا بیٹا ــــ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے راتو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو ....."

"نہیں نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "میرے بیٹے وعدہ رہا۔ آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا ــــ شاباش اب بتا۔ "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے روٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے" انھوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو"

"نہیں کرتا" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنان گوشہ خانہ را توقیف کردند ——— کارکنان گوشہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں یہ الفاظ ہے نئی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلانے والی نہیں ناچار گوشہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو دادی جی نے بڑی لجاجت سے کہا "اب سارا فقرہ پانچ بار کہو جب یہ جانکاہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا "بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا"

پھر وہ بدھ ست آئے تھے ادھر ہو گئے۔

شام کو جب ملاجی سے سیپاہے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ صرف مرتے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف پکے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا، پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پھاٹک۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نال میں چلا جا رہا ہوں اور جو نہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی نمیدہ کمر پر خالی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا سا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب میں اور میرا بھائی مچھلیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر وہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چٹیا میلی مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا "دادی جی سلام"

اور دادی جی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بیحد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی بھنی آواز میں چلایا "دادی جی سلام"

"جیتے رہو! جیتے رہو!" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ اور میرے بھائی نے چارج سے مجھے زناٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کتے" "دو بیچا" جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی! ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمبخت۔ بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤجی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤجی" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں وہ داؤجی" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکو اس مت کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا۔ شیخی خورا!"

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤجی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا نا اس لیے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤجی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کرکے گلی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جاتے ہوں۔ انہیں سلام کرکے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اتنی تو معلوم ہو سکا کہ داؤجی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے "مجھے کیا" اور "بکو اس مت کر" مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔

اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کرکے میں ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤجی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہشیار تھا۔ اس کی گٹھی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤجی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہوگا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی آگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ عقیق کے چند پودے

اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ صحن میں کھلتی تھیں اور صحن کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو آتی چندنے چلا کر "بے بے لسنے" کہا اور لپکے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر صحن میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے"

مشین رک گئی۔

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جوتوں کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے میڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے پکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا!"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے دادی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "اتی چند کے ساتھ آیا ہے"

اندر سے دادی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک لپٹا پاجامہ چڑھا رکھا تھا اور کرتہ آدھا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آگئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں شکل بہت ملتی ہے مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گوتو مولو سا ہے" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی! آپ جی کو پتہ ہے"

"اچھا" انہوں نے سر ہلا کر کہا "تو آپ جی سے پوچھا کرو! ۔۔۔ جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارے سیپارے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"مرتلک المرتل" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے جیسے مشین چلاتی رہی۔ وہ لڑکی خدمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولنا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی جیسی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ معاً داؤجی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا "سورۂ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمد بھی نہیں جانتے؟"

"الحمد للہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!" پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔"

جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پاؤں مجمار گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ جوڑ کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے وَلَا الضَّالِّیْن کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤجی اسی طرح بیٹھے رہے بلکہ اور بھی بیٹھ گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤجی سلام" اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا۔ جیتے رہو۔ بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کر....."

"ہاں ہاں آجایا کر" داؤجی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انہوں نے باچھیں پھیلتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا" اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا۔ بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا وہ خفا ہوں گے۔" پھر اماں نے ذرا ہمدردی سے کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤجی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے مصری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گو لو آ گیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا" اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لیے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی

تھیں پھر وہ اپنے جھرمٹ سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے "ایک سوال نکالو" اس بات سے میری جان جاتی تھی کیونکہ ان کا وعدہ بزار سیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باقی اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھیلے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے "یہ کیا ہے؟" چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنک کر جواب دیتا "لوجی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ چمکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گو لو۔ میں جو سکھاتا ہوں ——— سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سنی ان سنی کر کے کہے جاتے فارسی بوریا عربی حصیر اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے ——— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے دماغ امی چند پر بھی برابر ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈٹو کا ناؤں کیا ہے؟"

اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اُسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر اٹک لگا کر کہتے "قرۃ بیٹا یہ تیری تجھے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے "بھائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں صحن کے چند ڈبوں۔ شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیضیاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں

میرے اس رویّے سے سخت خفا تھیں، ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات ظلم ہو شربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ مشنشاہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ٹامٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی جادو، فسانۂ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانۂ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر جغرافیہ کی کتاب تھے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا.....

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی۔ ای سکول پہنچی۔ اسی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانشگاہ نے میرا نام بھی ان چھٹوں بدکلوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے ریٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے اور کدھر جانا چاہئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عرد عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی والی بے کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے تو بس ایک بات اور ان کے بیان گذارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں خوشیا کوڈ اور ولیسو یب مسجد کے پچھواڑے نالے کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ولیسو یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھائی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چک کر بولا "یار ولیسو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا کہ تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر ولیسو سے پوچھا "انارکلی میں دفتر بنائیں گے نا؟"

ولیسو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں بادشاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں؟"

میں نے کہا "انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی ہی لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دوپہر کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ ڈکرنے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر ابا جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ دادا جی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے دادا جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" ابا جی نے سختی سے پوچھا۔

"بے شک!" میں نے ایک مہذب سیلز مین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے، حرامزادے، میں تیری یہ سب....."

"معذرت ڈاکٹر صاحب" دادا جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو....."

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی!"

"آپ فکر نہ کریں" دادا جی نے سر جھکائے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن....."

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کر لیگا، کر لیگا ——— ڈاکٹر صاحب" دادا جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ راستے میں باتیں کریں گے۔"

ابا جی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو دادا جی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے گا ابھی بھروا دیجیے گا۔"

ابا جی نے ویسے ہی چیزیں پھینکتے "اچھا" کہا اور دادا جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

دادا جی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے چل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انھوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی، سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر اراٹے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا.....

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گولو؟" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا.....؟"

اب کے دادا جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن یک اُن پڑھ کی کار میں نہ بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی میں اپنے یہاں خوش۔"

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پروا نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے میری

بھی پہچانتیں ؟ اوگو تو میری بھی پہچانتیں !"

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی توبہ ہے مگر ..... مگر انھوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا ..... تو ..... تو ..... ؟" انھوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا ہوں حضرت مولانا کی خاک پا سے بدتر بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا ؟" پھر انھوں نے دونوں ہاتھ پیچھے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے "میں ذات کا گڈریا ، تیرا باپ منڈاسی کا گوالا ، میں جہالت کا فرزند ، میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم ، حضرت کا ایک اشارہ ، حضور نے چنتو کو منشی چنتا رام بنا دیا ، لوگ کہتے ہیں منشی جی میں کہتا ہوں رحمۃ اللہ علیہ کا کشف بیدار ..... لوگ سمجھتے ہیں ....." داؤجی کبھی ہاتھ جوڑتے ، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھے جاتے ۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "داؤجی ! داؤجی !" اور داؤجی "میرے آقا ، حضرت مولانا ، میرے مرشد" کا وظیفہ کئے جاتے ۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے ۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ پل کی دیوار سے اٹھے اور بولے "چلو اب چلیں ازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا ۔ گھنٹہ گھنٹہ بھی دلیسو جب جب کے باپ کی دوکان سے انھوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے ۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر بہت شرمندگی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا ۔ وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انھی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہرکین لالٹین بھی رکھی تھی ۔

بزنس مین بنتا اور پان پان کرتی پیکا ڈاڑ آئے پھر تا میرے مقدر میں نہ تھا ۔ گو میرے ساتھیوں کی رو انگلی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انھیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کونسے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا !

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی ۔ مجھے تباہ کر دیا مجھ پر جینا حرام کر دیا ۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات ، گرمیوں کی مختصر سی رات ، ان کے سوالات کا جواب دینے میں ۔ کوئے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور وہ مونگ ، رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں ۔ میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی سروں کو آگے لا کر اٹکا دیا ہے ۔ میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے ۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی فکر بن کر تلیوں میں اتر جاتی ۔ میں آہستہ سے کہتا "داؤجی"

"ہوں !" ایک گمبھیر سی آواز آتی ۔

"داؤجی کچھ اور پوچھیے ؟"

داؤجی نے کہا "بہت سے آبرو کو تو سے ہے ہم نکلے ——— اس کی ترکیب نحوی کرو ؟"

میں نے معاوضندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا ذرا سے بھی لکھ کر بتا دو گا کوئی اور پوچھے"

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کے کہا "میرا گو بہت اچھا ہے"

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا "بہت اچھا صنعت، ہے حرف ربط کر بنا مسند.....

اور داؤ جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے، ہاتھ اٹھا کر بولے "جان پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کرو"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لیے پوچھا "آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں جان داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

مسکرا کر "وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ جا شاکا ان کے درمیان قارسی اضافت نہیں لگ سکتی، جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں، روز بروز کو یاد رکھو۔ اسی طرح سے.....

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی خطرناک معاملے میں آ پھنسا ہوں تو جان سے کر پیار سے کہتا "داؤ جی اب نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے۔ بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

ابھی چند کا ہی چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اس وقت بری لگتی تھیں وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤ جی پرانے طائی کتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے اور جب اس مدفوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دیدے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر! اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اٹھو گو موٹا ہو گیا بیٹا" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لیے یہ کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے تھے۔ سنتا تو چمکار کر کہتے "بھدا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر مثلع کا دورہ کیسے کیا کریگا!"

اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤ جی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو؟"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤ جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤ جی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤ جی کو کوسنے دیتے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤ جی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر انگلیاں رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں میں میری فرقہ الیہن ہو رہا تھوڑا تو بھی ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا محرابدار

اور آنکھیں چندھیا سی جاتی تو ایسی گھر پانی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کسی کنسوئیاں لیتی چلتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر ہلکان ہو اکرتی۔ ایک امی جیسے کے ساتھ اس کی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے دادا جی سے پیار نہ تھا۔ ہوں تو بی بی بچاری بہت اچھی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں دادا جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "دادا جی پڑھ نہیں رہا ہے تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے!"

میں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا، نہیں پڑھتا۔ تو کیوں چغلی کرتی ہے ——— آئی بڑی تھانیدارنی!"

اور دادا جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "ارے نہ گوروں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں بی جھوٹ بولتی ہے!"

دادا جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "مقرنہ بیٹا تو اس کو چھپا لے کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا!"

بی بی کہتی "کوئی انکار دیکھو دادا جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا!"

میں قہر آلودہ نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ کڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر دادا جی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لیے کہتی ہے ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو نیل ہو جا پاس اس کی بلا سے۔ مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور مجھے دادا جی کی یہ بات ہرگز سمجھ نہ آتی تھی میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے دادا جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آکے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور دادا جی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی دادا جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی دادا جی سکول کی گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ جامعہ قصبہ میں منصفی کا نام لینے میں اس دن ہوتا تھا اور جس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن دادا جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے ایک آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کثیر مدت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتے تھے چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا اس لیے وہ دادا جی پر اور بھی حاوی ہو گئی ——— ایک دن خلاف معمول دادا جی کو سے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور دادا جی نانبائی کے پھٹے پر ایک بنچ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے میں نے ہوئے سے جا کر ان کا بستر اٹھایا اور ان کے گلے میں بانہہ ڈال کر کہا "چلئے آیا ہوں آپ کو لینے آیا ہوں" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔ میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلئے بے بے کو بتائیں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں!"

دادا جی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور

ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آدمی کی بات ہے کہ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کرے گی۔ زیادتی پر اتر آئے گی۔" پھر انھوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے دادی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس وقت میں نے بے بے سے نہ کہنے کا وعدہ کر کے ہی ان کے لیے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت دادی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے دادی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا آلوٹھا ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا سادی کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی اور گھر میں صرف دادی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر دادی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں۔ میں دکان سے کوئلے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولہے پر رکھو۔" بی بی نے جلدی جلدی چولہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چولہے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ دادی کوئلے کر آئے تو انھوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں۔" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ ان ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ دادی چولہا پھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گلیلو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گلیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔ پانی ابل رہا تھا۔ دادی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا کبت گا رہے تھے۔ او گولو! او گولو! گلیلو کی بات مت بھولنا، گلیلو کی بات مت بھولنا۔ انھوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور دادی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گل گل بل کے ساتھ گولو گلیلو! گولو گلیلو کے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ دادی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے۔ دادی مدھیں چلانے والا ہاتھ جوں کا توں پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور دادی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں کہا "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دو جوتے دادی کی کمر میں مارے اور کہا "بڈھے پر دھاگے تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار پھر سے تجھے بم بیٹھے ہیں تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھائیوں میں گل کی مرتی آج سروں تیرا ہی راضی ہو، تیری آسیں بھری ہوں ——— کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکر کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا..... تجھے موت نہیں آتی..... اور اب تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چولہے کے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے دادی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور ہیٹک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ اندر فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسنے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے

پکڑ کر اور بیٹھ کر بولی "میری سوت! بتا پڑھے سے تیرا کیا ناتا ہے۔ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟" بی بی بچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی اُٹھ کر اندر ٹیک میں کھسک آیا۔ دادو جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہونے لگی۔ الماری کے اندر مڑ کر کے ہنسنے لگا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کرو ہار کم کہ گرفتارم بہ بیچارے نہ کہ بہ معشوقے!" تھوڑی دیر تک کو پھر کہا "میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے مرغ پر کی ایک کم نصیب بڑھیا غائت پھیلا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ سلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل تا جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرأت عطا کرے، مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "دادو جی آقائے نامدار کون؟"

تو دادو جی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جان پدریوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو تجھ سے بیزار نہ کرے۔ وہ میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی اور استاد بھی۔ وہ تیرے دادا استاد ہیں..... دادا استاد....." انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار دادو جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد تاری کے بے شمار تعقیبی اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "دادو جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں؟ آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

دادو جی نے مسکرا کر کہا "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا جاوے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام ہے یہ منشی جی ہیں وہ مجھ جیسا ہو وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ کھسک کر بستر میں پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر دادو جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ——— لکھنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ——— حضرت مولانا کی بیٹی آواز کیا آواز تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا، پیارے زادے ہمارے پاس آؤ، میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس پا کھڑا ہوا۔ چھتہ پٹھان اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی ——— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا "جنتی ہر تو کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو ——— پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا "چنتو" ——— حضرت مسکرائے ——— حضور کا سا ہنسنے بھی ——— فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا ——— میں نے سر ہلا دیا ——— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے لئے میں کھدر کا لمبا کرتا تھا پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے

اور سر پر سرخ رنگ کا جاکٹ لپٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری.....

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چراتے تھے دادو جی!"

"ہاں ہاں" وہ تھرے بولے "میں کڈ رہا تھا اور میرے باپ کی ڈھیر بکریاں تھیں"

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے سماعت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جلدی سے پوچھا "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے؟"

دادو جی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی اور اپنے پاؤں پلنگ پر رکھ کر بولے "جان پدر، اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوبیس برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی۔ ٹی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آتا کو پڑھانے کا شوق تھا، اردگرد کے لوگ اپنے لڑکے کو چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے ——— ان کا سارا خاندان زیور علم سے آراستہ اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ دارا ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدا جدا بارہ کشمیر کے میرنٹی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے۔ فارسی عربی، بحث و مناظرہ، اقلیدس، حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحر علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شفیقہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان بڑے مراسم تھے اور خود حضرت مولانا کی تعلیم دلی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی.....

مجھے دادو جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لیے میں نے جلدی سے پوچھا "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا؟"

"ہاں" دادو جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتیں بھی ایسی تھیں جس کی طرف توجہ فرماتے تھے بند سے مولا کر دیتے تھے مٹی کے ذرے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے ——— میں تو اسی وقت لاکھی زمین پر ڈال ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے بھائیوں کے پاس بورے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر پیچھے گزر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروف ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف، بے، پے، تے ——— سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف، بے، پے، تے" اور دادو جی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا اور حرکت ہٹ تھا اور اس کے ساتھ کھجلیوں کا حوض۔ پھر انھوں نے بایاں ہاتھ جوا میں لہرا کر کہا اور اس طرف مزار مبین کے کوٹھے۔ دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی قدیم عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔ درس کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ مسلک کی پابندی.....

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا "حضرت مولانا کا اجمل گرامی تعریف کیا تھا؟" تو پہلے انھوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انھیں جہاں جاناں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جہاں جاناں کی رعایت سے نظر جہاں جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ دادو جی اچانک رک گئے اور بولے "سب سڈی بری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا بڑا پیریا ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں سوائے

پہاڑے کی طرح میں نے سب سڑی ایری سسٹم کا سارا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گرا فر اٹھائی اور بولے "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا یا نہیں" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مٹھیں چلاتے اور بی بی کو چھاتی کرتے پایا۔

داؤ جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے "سب ایک ایک شعر سناؤ" پہلے بھی سے تھا سنا تو نا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ہے

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "داد میں شعر نہ سنوں گا، اردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا" میں کہتا "لے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سنائے"۔

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی ہے۔

شنیدم کہ خنا پور دم در کشید
چو خسرو براکش قلم در کشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آڈر آڈر پکارتے
بی بی قینچی رکھ کر کہتی "

شوئے شد و از خواب علم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم"

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے"۔

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک سنائے گی" مگر بے بے ایک ہی رٹا رٹایا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر کبت" اس پر داؤ جی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کہتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤ جی بھی عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چندا کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ بارات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامہ پر دستخط کروں گا" میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خط شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خط شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا ——— سن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہیں گا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر افرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا"

پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے جھکتے خوب خوب کہتے۔ جان پدر چلا ایں قدر: محنت می کشی ..... خوب ..... یا دوارم .....

اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ جی! چلتا پھرتا چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے ——— ایک دن جب

چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند برخوردار عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔ اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سیدھا سادھا یہ مسلم لیگ یہ ہیکھ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا ہاں خدا نے بزرگ دیر تراس کو ایک نیک موسمی بیوی دلا دے تو وہ اُسے راہِ راست پر لے آئے گی۔

اس موسمی کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے دادی کو بڑا دکھ ہوگا ——— میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات آ گئی۔ بیچارا رام پرتاب کے بارے میں دادی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انھوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترتا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی دادی کو اس بات کی تھی کہ اس کے سمدھی قاری کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی دداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ سب بے تحاشا رو رہے تھے۔ امی چند آنسو بہا رہا تھا اور گلے کی حد تک چیخیں کر رہی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور دادی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے اور بار بار کہہ رہے تھے "آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں تو اپنی قائم نہیں رکھ سکتا۔ بھیجا ہی کے باپ بولے "دلشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اُسے چارپائی پر ڈالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور دادی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹا۔ اُٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خوشگوار زندگی کی پہلی گھڑی ہے۔ اسے یوں منحوس نہ بناؤ۔" بی بی اسی طرح ڈھاڑیں مارتے ہوئے دادی سے لپٹ گئی۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاپ بھی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا قبل میرے سامنے ظلم ہے۔" یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور دادی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے آبلے ٹوٹ کر زمین پر گر گئے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "دلشی جی آپ فکر نہ کریں بیٹی کو میں کریما پڑھا دوں گا۔" دادی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو پڑھ چکی ہے، گلستاں بوستاں بھی ختم کر چکی ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔" اس پر وہ ہنس کر بولے "آپ بھی حد کرتے ہیں ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی جہاں عربی آتی تھی آگے گذر جاتا تھا۔" ——— دادی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گوٹا لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند کے اور پھر میرے سر پر پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چلی۔ دادی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "لو یہ بھی دور ہے دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ اور گولو..... اور مرحوم دیدہ..... تجھے کیا ہو گیا..... جان پدر تو کہیں....."

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور بھائی درمیان دادی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ و زاری زور سے نکل جاتی تو دادی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹا۔ لاحول پڑھو۔"

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

راتو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے اُسی کا تھا اس میں بیس تیس بکریاں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام راتو گلی کے نکڑ میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اُسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دیتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گذرتے ہوئے وہ بونی شوتیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤجی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اُسے کو مرتبہ بجایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں۔ کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا لیکن راتو نہیں مانتا تھا وہ اپنی مونچھ چبا کر کہتا "لے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو وہ پنڈت ہی ہوتا ہے"۔ ——— چھوٹی یادوں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جو آ بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا سلسلہ چلتا۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "مورنی تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا ہے گا" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبو بھرتے ہوئے کہا "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا تو خط لگایا کہ نہیں" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تالو ٹھونک کر اس کے سر میں دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور بابا جی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت راتو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے بھی کسی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے راتو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چھوٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چکناتی تھی۔ گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی بگڑی اُتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی!" تو میں نے نفی میں جواب دیا اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادتمند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت اُستاد بھی خال خال ہوگا۔ جب تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔ ہنس کر فرمانے لگے جنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کر دوں لیکن میرا بس نہیں چلتا ——— خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے "خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے"۔ ——— داؤجی گذرے ایام کی تہہ میں اُترتے ہوئے کہہ رہے تھے "میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا سعادم آ گیا۔ مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی جنت رام اب اس گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھا لو" میں سعید گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے جنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانتے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور

جب جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں انہیں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صحن کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا تو فرماتے ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لیے قصبہ کی سیر کرتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک خدا ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لیے وقف کر دیا ہے ——— جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے بجرا سودھان کر بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے یہ سعادت تجھے نصیب کی۔ چنت رام تیرا مستقبل کا پیشہ ہے تو شاہ بطلی کا پیرو ہے اس لیے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کشائش میسر آئے گی۔۔۔

داؤجی یہ باتیں کرتے کرتے سر گھٹنوں پر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ پیچھے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤجی کے بچے گویا میرا انگیر کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی تلخی بڑھ جاتی تو میں انہیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدریہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو مسز چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں کوتو انہیں بہت مرغوب تھا۔ طنبورا دوسرے درجہ پر مسٹر ہونق اور انفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آ چکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا

داؤجی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں دسنا تے دکھ تینوں

تیتوں دسنا ——— دسنا دسنا دسنا دسنا..... تیتوں تیتوں تیتوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا ڈکھ تیتوں تیتوں دسنا۔
وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے میرے پاس آکر کاپی اٹھاتے، صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے "ہنسی بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے! جونہی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا "دیکھو پھر میں تیرا داؤ نہیں ہوں!" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں!" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے!" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ بھی سرکار" میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ بھی سرکار وہ سب کا پالنے والا ——— بول بکرے سب کا داتا کون!"

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "داؤ جی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ——— مجھے پانی تو پی آنے دے!"

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا "تو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا!"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا ریٹ نظر آ رہا تھا تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو.....؟"

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کل باون پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر بہت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹھتا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹتا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا۔ اور میں باہر صحن میں آکر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لیے سر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا "ارے بھئی طنبورے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا" پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے بالقوہ یوں نالاں ہے میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں الجھن ہوتی میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "چھت رام اب ہم تم کو پڑھا نہیں سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی معلم کی طرف رجوع کرنا چاہئے" میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا لیکن آپ کا ہر جملہ اور ہر شوشہ میرے لیے حکم ربانی سے کم نہیں۔ اس لیے خاموش ہوں بھلا آقا نے غلاموں کے سامنے اجازت کی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دکھ ضرور ہوا ہے فرمانے لگے تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی۔ میں نے سر جھکا کر کہا "ارشاد فرمایا" بولی میں حکیم ناصر سینائی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی اپنی تنہائی کر رہا ہوں جب فارغ ہو لوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔ چند ایام بڑے اضطراب کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا۔ لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی سے دو روپے چرائے اور نصف اس کے بیچ کر گاؤں نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا، بدقسمت ہوں بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا۔ سن رہا ہے؟" داؤجی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی!"

داؤجی نے پھر کہنا شروع کیا "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جاکھل جنید سر سے حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو پا لی گئی تھی لیکن گوہر مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سینائی

کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی۔ لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے بیسے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں گھس پھیک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو نیند جا بندہ۔ آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہ پتھر چھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے۔" حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسم گرامی؟" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور ..... میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے "اوہو! چنت رام ہو! میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے میاں اندر آ جاؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟ میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عود میں نوکی طرح بیٹھے رہے۔ پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا "بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بتاؤ ہندسہ کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتے یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا "بتاؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک متساوی الساقین۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے "میاں جلدی کرو، نا بلینا ہوں کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتے ہوئی انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا۔ دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی انگلی سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے "ہے ہے کیا کرتے ہو یہ نقطہ س ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نقطہ س ہے وہاں سے خط کھینچو ——— اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔" پھر داڑھی دتی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا داؤجی؟" انھوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گزر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا۔" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انھوں نے کہا "پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا۔ اور ان چھوٹی چھوٹی پراپوزیشنوں کو بتائے۔ سمجھے گا" میں نے جواب دیا "بھلا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں" انھوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کوزہ آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں رو دیا تو دست محبت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔ یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے ہاتھ پکڑ کر کہتے ہاسپ تازی بن طویلہ خوردبن۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل موان برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں خوشامدوں گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ مرد بیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد۔ تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤجی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورہ بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سُر نکال طنبورے کسی آہنگ پر نغمہ کیا کر رہا ہے! جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی پَو پھوٹنے لگی تو میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گذر گیا مگر داؤجی تھے کہ کچھ آہستہ سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تھیہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور گنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اچھی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تھیہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گذر چکا ہوگا اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے میری پسلی میں ہلکا درد شروع ہو گیا تھا ابھی مناسب سمجھا کہ تھیہ پر جا کر داؤجی کو سوتے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں! خوف سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤجی تھیہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے ؎

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر

بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھو لوگو سوچ لو میں نہیں..... میں نہیں تمہارا ہوں..... سنا رہا ہوں..... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤجی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ کا تصویر والا جن تھا جب داؤجی کا علم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوٹتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا۔

——— تھوڑی دیر بعد داؤجی آئے انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ

میں انھوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی مکھل پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے ملے والی فریدا ڑیا ڑیا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ——— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اُڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو نہ گیا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے، وجیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے بجلی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کھیا کی طرح داؤ جی سے چمٹ گئی، بچے ان سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی "بڈھے ٹونگی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری تاسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو اُلٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اُجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں جل گئی، میں جل گئی لوگو اس بڈھے نے میرے ای چند کی جان لینے کا پربندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے، میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" ای چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن علاوہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے۔ اور تیری بے بے ام الجاہلین ——— میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ اے وائے کہ تو شعور کے بجائے توہم کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ——— صد افسوس" بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤ جی کو بوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ——— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستہ میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں" میں نے اس کیمیے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشنیں سنتے ہوئے پوچھنے لگے "بیٹا کیا تم نے کبھی جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے "واقعی تو بیحد بھولا ہے میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں جیسے جو دتی مستری اور پھٹے مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چنائی بھی جانتے ہیں؟" میں نے جل کر کہا "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ" داؤ جی نے کہا "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی"

پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی۔ ——— سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا!" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا

تھا چنانچہ وہ صبح آگئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع لاہور جا رہی تھی اور اسکول کے اردگرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور اس ہجوم سے داؤجی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور داؤجی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے ——— جھیل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پہنچتے تو اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر جاتی تھی پھر اتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ "اور وہ عورت؟" "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ——— "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟" میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے "مثالیں؟" میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک ان ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو کر چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طبلے ماریاں گھوڑی ماکیاں امی..... ماریاں گھوڑی..... ماکیاں..... مرگئی ——— ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح داؤجی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جو نہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤجی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر! اسی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کونسا سوال غلط ہو گیا؟" میں نے سہم کر کہا "چار دیواری والا" جھلا کر بولے "تو نے کھڑکیاں اور روشندان منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیٹر کی طرح جھلاتے ہوئے کہا "ہاں جی ہاں جی ——— گولی مارو کھڑکیوں کو" داؤجی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طلبہ رے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا مسلمات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی بیس نمبر ضائع کئے..... پورے بیس نمبر" اور داؤجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے "اگر محض اچھے دل کا پرچہ تو دو ایک نمبر ضرور دے گا۔ تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے" اس پرچے کے بعد داؤجی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرۂ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں

کے ساتھ گھر سنا اور شام کو نماز میں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو دادی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گذارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے چنگل میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سوبار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن دادی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے بات کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گالیاں اندر گھس آئیں۔ میں اسے کھڑکی سے باہر نکال رہا ہوں اور وہ بھی پوچھ رہے ہیں COW نادان ہے یا ادیب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جاتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر دادی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ COW 35 کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ بعد میں انہی دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ——— پھر ایک دن یہی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لیے نکلے۔ تو میں نے ان سے درخواست کی کہ مصنفی کے آنگن سے دھمائیں کیونکہ وہاں دادی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کارتوسوں کے بارے پوچھنے لگیں گے۔ یا تاریں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رہنا مجھے بہت زیادہ اور دادی سے کم باتیں کرنا۔ اکثر کیا کرتے۔ دادی آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر دیا ہے۔ میں شرارتاً مجھے خوب غصہ آ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا میں اور ابا جی لڈوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ دادی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ ابا جی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے۔ میرا خیال تھا اس کی فرسٹ ڈویژن آ جائے گی لیکن نہ آ سکی۔ بنیاد کمزور تھی....."

"ایک ہی تو نمبر کم ہے بچے نے ٹھیک کر بات کا ئی۔"

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ خیر میں اسے مبارک خیال کرتا ہوں۔"

پھر ابا جی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ کہیں دور نکل گیا۔

اول اول کالج سے بھی دادی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی دادی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کیا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے۔ اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انھیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آ کر کتابیں دیکھ جاتے۔ ابی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ دادی بھی مصنفی جاتے تھے لیکن کچھ لاتے نہ تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ——— کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے دادی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھیں بہت عمر بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آنکھ مچولی میں گذارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ دلکش وہ اور سہانا بن گیا۔ انہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر ابا جی کو خط لکھے جا سکتے تھے اور نہ ہی دادی کو۔ نہ دھر سے

کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی نہ کسی کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسے گذر گیا اور یوں ہی ایام گذرتے رہے۔

..... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بڑے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دو تاکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا، اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چلے گئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر جیسی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے ہی تھے! ——— کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گذرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ بھی دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا "ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رہتکی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلا کر کہا "اوئے راتو جلدی آ اوئے جلدی آ ——— تیری سامی ——— پنڈت ——— تیری سامی"

راتو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انھیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا "یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے ——— اسے کچھ مت کہو..... یہ تو..... یہ تو....." ہجوم میں تنہائی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تولی کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی ——— آگیا بڑا حمایتی بن کر ——— تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "اتھا ہوگا شاید۔"

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ راتو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور راتو داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "اب بول بیٹا اب بول" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اتار کر کہا۔

"پہلے بودی کاٹو بودی" اور راتو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داڑھی کی بودی کاٹ دی۔ "بودی لڑکا بھیر بولا" بلاؤ بیٹے ہے!" اور راتو نے کہا "جانے دو بڈھا ہے، میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا" پھر اس نے داڑھی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ پیڑ تا" اور داڑھی آہستہ سے بولے۔

"کون!"

راتو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پاکی سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو راتو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں"

اور ننگے سر داڑھی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے بالوں والا فرید اچل رہا ہو!

آیا

اوپندر ناتھ اشک

افراد :-
جناب رضا صاحب، آیا
نوکر
مقام : بمبئی
وقت : بارہ بجے دن

(پردہ جس کمرے میں اٹھتا ہے وہ ایک متوسط درجے کے مکان کا ڈرائنگ روم ہے۔ کسی ایسے کشادہ، کھلے، روشن اور ہوادار مکان کا، جو بمبئی کی نواحی بستیوں میں عام ہیں۔ ان پر ٹن کی چھتوں کی بجائے کھپریل کی چھتیں ہوتی ہیں۔ اور بمبئی کے چھ سات منزلہ مکانوں کے نقلی نمونوں جیسے اوپر ہی رہنے والے ان کشادہ کھلے مکانوں میں آ کر ایک عجیب آسودگی سی محسوس کرتے ہیں

یہ بیٹھنے کا کمرہ بھی مکان کی پہلی منزل پر ہے جس کا ثبوت اس کی چھت کے ڈھالوں گوشوں اور سائے کی بالکونی سے ملتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دائیں بائیں دروازے ہیں جو بالکونی کو جاتے ہیں۔ اس دیوار پر درمیان میں ایک کلاک لگا ہے جس میں اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔

کمرے کو اس کے فرنیچر کے لحاظ سے تین حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ دائیں دیوار کے ساتھ میز اور کرسی لگی ہوئی ہے اور کتابوں کے ریک پڑے ہیں۔ جس سے یہ حصہ چھوٹی موٹی لائبریری یا سٹڈی روم بن گیا ہے۔ سامنے کمرے کے وسط میں کوچ کا سیٹ پڑا ہے۔ اور ایک تپائی رکھی ہے۔ اسے بیٹھنے کی جگہ سمجھ لیجئے۔ تیسرے حصے میں، یعنی بائیں طرف چھت سے ایک جھولا لٹک رہا ہے۔

جھولا بمبئی کے متوسط درجے کے نواحی مکانوں کا ایک لازمی جزو ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مکان ہو گا جس کے برآمدے یا ڈرائنگ روم میں جھولا نہ ہو۔ اس کا خیال چاہے جہیز کا ہو

کھانے بعد خنودگی کے مارے کسی گجراتی سیٹھ کے دماغ کی اختراع ہو۔ خواہ کسی مارواڑی بنیے کے دماغ کی اپج، لیکن اب تو یہ شیواجی کے ساتھ، محض چنے کھا کر میلوں کی مسافت طے کرنے والے مرہٹے بہادروں کے قصوں کی زینت بھی بنا ہوا ہے۔

بائیں دیوار میں ادھر کو ایک دروازہ ہے جو باہر برآمدے میں کھلتا ہے۔

پردہ اٹھنے پر، میز پر صاحب بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ صاحب سے مراد کسی گورے انگریز سے نہیں، بلکہ کالا ہو وہ شخص جو ایک نوکر رکھنے کی توفیق رکھتا ہے، تو سے کی طرح کالا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو "صاحب" اور اپنی بیوی کو "میم" کہلوا سکتا ہے ——— "مجھے صاحب کہا کرو" یہ حکم صادر کرنے کی بھی ضرورت نہیں نوکر اسے اتنی بار صاحب کہہ کر پکارے گا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو صاحب پکارنے پر مجبور ہو جائے گا۔

یہ صاحب خیر تو سے کی طرح کالے تو نہیں، لیکن اتنے گورے بھی نہیں۔ ۳۵-۳۶ برس کے خوش شکل نوجوان ہیں۔ قلم کھٹی میں سنا رہے ہیں اور اس وقت معلوم ہوتا ہے کسی فلمی کہانی کا سناریو لکھنے میں مصروف ہیں۔

پردہ اٹھنے کے ایک لمحے بعد بائیں طرف بیک گراؤنڈ میں دستک کی آواز آتی ہے۔ ایک لمحے بعد بائیں دروازے میں سے نوکر جھانکتا ہے۔

نوکر۔ صاحب آپ کی پرانی آیا ہے۔

صاحب۔ (کام کرتے ہوئے بے خیالی سے) پرانی کون؟

نوکر۔ موٹی سی جوان چھوکری ہے۔

صاحب۔ (بدستور کام کرتے ہوئے) موٹی!

نوکر۔ صاحب کالی کالی ہے۔ اتنا بڑا بالوں کا جوڑا، بڑی بڑی آنکھیں اور صاحب بڑی جوان ہے۔

صاحب۔ (بدستور بے خیالی میں) نام نہیں پوچھا؟

(دروازے کے قریب بیک گراؤنڈ میں، آیا کی نہایت میٹھی آواز آتی ہے)

آیا۔ میں ہوں سیسیلیا فرنینڈس (C. FERNANDES) آجاؤں صاحب؟

صاحب۔ (مجبوری کے انداز میں کام چھوڑ کر ایک خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے) آجاؤ آیا۔

(آیا اندر آجاتی ہے۔ نوکر چلا جاتا ہے۔ اگرچہ ذکر تے آیا کو کالی کالی کہلوا کر محض کالے کے لفظ کا استعمال اس کے کالے پن کی جانب ہے، لیکن شاید نوکر کی نظر اس کے رنگ کی نسبت اس کے شباب پر زیادہ رہی۔ اور اس کے بیان میں اس نے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ آیا کی عمر بیس

ایک برس کی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھوں اور بھرپور جوانی نے اس کے رنگ کی سیاہی اور پیشانی کی کوتاہی کو یکسر چھپا دیا ہے۔ بے حد مہذب معذرت بھرے اور کنارے دار کھلی ہوئی تعلیم دھوتی میں ملبوس ہے۔ آواز میں مٹھاس اور لہجے میں نغمہ ہے۔ بولتے وقت 'ہ' حذف کر جاتی ہے۔ صاحب کو 'صاب' نہیں کہتی۔ 'رہنے' کو 'رینے' اور 'کر' کو 'کر'.... وغیرہ وغیرہ

آ کر صاحب کے سامنے کرسی کی پشت تھام کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ نیل کے مکالمے میں آیا اور صاحب کی حرکات کے محض چند اشارے دیئے گئے ہیں۔ باقی ایکشن ڈائرکٹر کی سمجھ داری (SOURCEFULNESS) پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

آیا۔ (مسکرا کر سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے) میم صاب چلا گیا صاحب؟

صاحب۔ ہاں آیا!

آیا۔ چھوکرا ہے؟

صاحب۔ (ہنس کر) تم نے دیکھا ہے!

آیا۔ وہ تو جانے والا تھا۔ میم صاب بولتا تھا۔ وہ چلا جائیگا تو تم آ کر کام دیکھنا۔

صاحب۔ (ہونٹوں پر طبیعت مسکراہٹ آ جاتی ہے) میم صاحب نے ہنسی کی ہوگی۔ میں تو خود جانے والا ہوں.....

آیا۔ کدھر؟

صاحب۔ پہاڑ پر! اسی لیے اس نوکر کو جواب نہیں دیا۔

آیا۔ کیوں صاحب، تم تو اور ہی رہنے والا تھا۔ میم صاب بولتا تھا صاب اور ہی رہے گا۔

(جیسے انجانے میں کرسی کی پشت چھوڑ میز کا کنارہ تھام لیتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے صاحب کی نگاہ آیا کے بھرپور بدن پر پھسلتی ہوئی سی پڑ جاتی ہے)

صاحب۔ (قلم چھوڑ کر ایک ہلکی سی انگڑائی لیتے ہیں) طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آیا۔ میں بھی مہینہ بھر کی چھٹی لے کر ادھر ہی جا رہا ہوں

آیا۔ (آنکھوں میں عجیب سی ہمدردی اور مستی بھر جاتی۔ سینے کا ابھار میز کے کونے پر زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بازو ذرا پھیل جاتے ہیں) ہاں صاب تم کتنا دُبلا ہو گیا ہے (لمحہ بھر کے لیے صاحب کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ لیکن صاحب کی آنکھیں بالکل کے خلاف لگی ہوئی ہیں) بات کو بڑھاتے ہوئے میز پر ہاتھ بچھا لیتی ہے) میم صاب بھی کیسا دُبلا ہو گیا تھا ایسا کیسا صاب؟

صاحب۔ (کرسی پر پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے) پچھلے دن کوئی نوکر نہیں تھا اور آیا بھی نہیں۔ میم صاحب کو عادت تو ہے نہیں

سب کام انہیں خود کرنا پڑتا۔ برتن مانجنا۔ پانی بھرنا۔ صفائی کرنا۔ مانت کو پھر اور کھٹمل کے بارے بابا سوتا نہ تھا۔ اور میم صاحب۔ دن رات جاگتا تھا۔

آیا۔ کھٹمل کیا صاحب؟

صاحب۔ ارے یہی جسے ماٹکوں کہتے ہیں، ارے وہ لال لال جو بستر میں ہوتے ہیں وہ جگ جگ۔

آیا۔ (ہنستی ہے۔ کالی شکل کے باوجود نقرئی ہنسی) ارے صاحب تم اس کو کھٹمل کہتا ہے۔

صاحب۔ کھٹمل نہیں، کھٹمل کھٹمل!

آیا۔ اں اں (ہنستی ہے) اسی سے تو بابا بھی کیسا ہو گیا تھا۔ کتنا چھریرا دُبلا تھا؟

صاحب۔ آیا کوئی نہیں تھی، میم صاحب بچے کو دیکھیں کہ گھر کو؟ آیا بھی جاتی تو ہم میم صاحب کو بھیجی دیتے۔

(کرسی پر بیٹھے کو جھکتے جھکتے دیوار کے ساتھ لگ جاتے ہیں)

(آیا پھر پہلے کی طرح میز کے کونے سے لگی کھڑی ہو جاتی ہے)

آیا۔ ہم تو سال بھر تمہارے پاس نوکری کیا۔ ہم چھوڑتا نہیں پن ہمارا برائے فرزند بولا تمہارے پاس آئے کو ہم کو بہت ترس پڑتا ہے۔ تین گھنٹہ ملاؤ آئے جانے میں لگتا ہے۔ تم کو لایا میں نوکری کرو۔

صاحب۔ کیا حال ہے تمہارے برائے فرزند کا؟

آیا۔ جلت تھا اور تو صاحب، ہم اور سے نوکری چھوڑ گیا تو اس کی بھی نوکری چھوٹ گئی۔ روز شراب پیتا تھا اور ہم کو ترس دیتا۔ ہم کو لایا نوکری چھوڑ دیا۔ ہم سے شادی بنانے کو مانگتا تھا۔ ہم بولا، ہم بھوکا مرتا، فٹ پاتھ پر سو جاتا پن تم سے شادی نہیں بنا سکتا۔

(صاحب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں اور پھر پہلی پوزیشن میں آ جاتے ہیں)

صاحب۔ تمہاری کہیں بنے گی بھی آیا؟

آیا۔ تم کو یہ آیا پسند ہے صاب!

(صاحب کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی پھر میز پر کہنیاں ٹکا کر جھک جاتی ہے۔ صاحب کی نگاہ اس کے بھرے سینے سے ٹکرا کر مڑ جاتی ہے)

صاحب۔ ہماری پسند کا کیا سوال ہے۔ میم صاحب کو پسند ہے۔

آیا۔ یہ ہماری جات کا ہے صاب۔ ہم اسے بہت دیر سے جانتا ہے۔ ہماری جات والوں کے نوکری کرتا تھا۔ سرٹیفکیٹ اس کے پاس نہیں۔ شکل بھی اچھا نہیں۔

صاحب۔ ذرا بہ ہمارے دفتر کا چپراسی۔ اسے شناختا کر دو۔ اسے لانے گیا تو اسے بے عزت واپس آ گیا۔ میں نے پوچھا تو بولا صاحب اس کی شکل اچھی نہیں۔ میں نے کہا لاؤ اسے۔ اگر وہ کام اچھا کرتی ہے تو چلے گا۔ مجھے کوئی اس سے عشق کرنا ہے۔

آیا۔ تم کیسا ہے صاب۔

(پھر نقرئی ہنسی فضا میں گونجتی ہے۔ اور ہنستے ہنستے وہ میز پر
جھک جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پھیل کر صاحب کے میز پر پڑے
پیڈ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

صاحب۔ اور کیا (کمرے میں گھومنے لگتے ہیں) آیا بہت اچھی ہے۔ شور نہیں مچاتی۔ تنگ نہیں کرتی۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہے ایک جگہ ٹک کے کام کرتی ہے۔ اور پھر اس کا بھیجا بھی بڑا ہے (ہنستا ہے) تمہاری طرح نہیں ہے۔ کہو اب کدھر کام کر رہی ہو؟

(جا کر صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور اسے ہلکے سے جھلا دیتے ہیں۔ آیا ان کے قریب جا کھڑی ہوتی ہے)

آیا۔ ہاؤس میں کرتا تھا صاب!

صاحب (اچانک ٹوک کر) ہاؤس؟

آیا۔ برسوں سے ہم ہاؤس میں تھا۔

صاحب۔ کس کے ہاں؟

آیا۔ اور صاب، ہم اس صاب کا نام نہیں جانتا۔ اس پر نے والی جاڑی میم صاب نے بھیجا تھا۔ ہن آج جھگڑا ہو گیا۔

صاحب۔ تمہارا جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔ کیا بات ہوئی؟

آیا۔ او میم صاب بہت کھٹ کھٹ کرتا ہے صاب۔ او بولا — تم ایسی ساڑی پہنتا ہے۔ ایسا بال بناتا ہے۔ تمہارا صاب تو ہم سے جاتی ہے۔

صاحب۔ ساڑی تو یہ تمہاری واقعی اچھی ہے۔

آیا۔ ہم بولا۔ ہم تو ایسا بال بنائیگا۔ ایسا ساڑی پہنیگا۔ چھوٹ میں کاہے کو بڑا بڑوم کرتا ہے۔ او بولا۔ ایسی ساڑی پہنتا ادھر نہیں مانگتا۔ تم کو کام کرنا ہو ٹھیک سے کرو۔ ایسا رعاب اور نہیں چلیگا۔ ہم بولا، ہم کو ہمارا پگار دو۔ ہم کو نہیں مانگتا نوکری۔ او بولا صاب سے پگار لو۔ صاب بولا۔ میم صاب سے لو۔ ہم تو کتاں گیا۔ بولا۔ جاؤ ہم کو نہیں مانگتا پگار۔ ہمارا پگار رکھ کے تم دھنی ہو جاؤ! ہم چلا آیا۔ لفظ رک کر صاب ایک روپیہ ہو تو دیجو۔ کولا جانے کا کرایہ مانگتا ہے دو چار آنے کا ناشتہ کریگا۔

(صاحب پھر میز پر جا کر بیٹھتے ہیں اور دراز سے ایک روپیہ نکال کر اسے دیتے ہیں)

صاحب۔ (روپیہ دیتے ہوئے) کیا تم ناشتہ کر کے بھی نہیں چلی؟

آیا۔ نہیں صاحب۔ صبح ناشتے کو او لوگ کچھ نہیں دیتا۔ خالی پیٹ لوم ماتا ہے۔

صاحب۔ تم کھانا کھاؤ گی؟

آیا۔ نہیں صاب۔

صاحب۔ ارے کھاؤ (نوکر کو آواز دیتے ہیں) جگدیش، جگدیش (لمحے بعد نوکر داخل ہوتا ہے۔ سوتی گھر سے آیا ہے۔ ہاتھ

میں چھری اور ادھ چھلا پیاز ہے)
یہ ہماری پرانی کیا ہے۔ کھانا یہیں کھائے گی۔

جگدیش۔ جی بہتر۔

(چلا جاتا ہے۔ صاحب کی نگاہیں آیا کے سینے سے ٹکراتی ہیں اور لمحہ بھر کے لیے وہیں بھی رہتی ہیں)

آیا۔ کیوں صاب کیا دیکھتا ہے؟

صاحب (اچانک نگاہیں ہٹا کر) بڑی اچھی ساڑی ہے۔ کتنے کی لی ہے؟

آیا۔ دالی کی ہے۔ یہ تو پرنٹ ہے۔

صاحب۔ اچھا پرنٹ ہے۔

آیا۔ اور دھوبی تالاب میں ایسا ساڑی بنتا ہے صاب۔ صاب کیسا لگتا ہے ہم کو؟

ساڑی کو اپنے جسم پر لپیٹ کر بتاتی ہے۔ صاحب اس
کے سڈول جسم کے خدوخال کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔ اور
اضطراری حرکت کے طور پر پھر آنکھ کھڑے ہوتے ہیں)

صاحب۔ اچھی لگتی ہے۔ لیکن تمہیں سفید ساڑی پہننی چاہیے۔ (کمرے میں ایک چکر لگاتے ہیں)

آیا۔ کیوں صاب۔

صاحب (کرسی کے بازو پر بیٹھتے ہوئے) کالے رنگ پر سفید ساڑی اچھی لگتی ہے۔

آیا۔ ہم سفید ساڑی بھی پہنتا تھا صاحب، پن کئی آدمی ہمارے پیچھے لگ جاتا تھا۔ ہم چھوڑ دیا سفید ساڑی پہننا۔

(صاحب صرف مسکرا دیتے ہیں)

اس میں اور کیا جانتی۔ صاب لگتا تھا صاب۔ ایک دن کی بات ہے ہم اور واکیشر میں کام کرتا تھا صاب۔ ہم ایسا ہی سفید ساڑی باندھ کر پہنا تھا۔ ایک پنجابی فوجی ٹیکسی میں بیٹھا تھا۔ اور افسر تھا صاب۔ جلا کھایا تھا۔ ہم کو دیکھ کر اترا۔ بہت دار پی اسے لا تھا صاب۔ ہمارے پاس آکر بولا "تم نیوی میں کام کرتا ہے؟" ہم بولا — "نہیں ہم کیا ہے۔" اور بولا "تم جھوٹ بولتا ہے۔ تم نیوی میں کام کرتا ہے۔ تم ہم کو بہت پسند ہے۔" ہم بولا — "ہم تم کو مانتا بھی نہیں۔" پن صاب اس نے ہم کو پکڑ کر ٹیکسی میں ڈال لیا۔

(صاحب ہنستے ہیں)

— صاب وہ بہت تگڑا تھا۔ بہت دار پی اسے لا تھا۔ ہم چلایا۔ ایک سپاہی بھی آیا۔ پن اوفیسر افسر بولا یہ نیوی میں کام کرتا ہے، ہمارا فرینڈ ہے تم جاؤ۔ اسے ڈرائیور سے بولو کہ گاڑی چلاؤ۔ ہم بہت گھبرایا صاب۔ ہم ڈرائیور سے بولا — "ڈرائیور گاڑی پن صاب اور ڈرائیور کو مارنے دوڑا۔ اس کے پاس دو بوتل دار دو تھا صاب۔ ہم سے بولا ہیرا ہم بولا۔ ہم مانتا بھی نہیں۔ اس نے بوتل ہمارے سر پر انڈیل دیا صاب۔ ڈرائیور ہماری جات کا تھا ہم اس کو گاڑی روکنے کو بولا۔

جرمانی پر اس نے گاڑی روک لیا صاب۔ تب او افسر ہمیں سے پستول نکال لیا۔ اور بولا ہم یہاں سے مار دیں گا ڈاکو ڈر گیا اسنے چل پڑا۔ ہم بھی بہت ڈر گیا صاب۔ او فوجی ہم کو تاج ہوٹل میں لے گیا۔ اسنے اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ کھڑکی بھی بند کر لیا۔ ہم صاب بہت گھبرا گیا۔ بس صاب ہم بھاگا۔ ہمارا پرس بھی وہیں رہ گیا۔ اس میں تین روپیہ اسکے ہمارا ایک رنگ تھا۔ پن صاب ہم نے اس کو بھی نہیں دیکھا۔ بھاگ کر ریل پہنچا۔ ٹرم لیا اور کولابا آ گیا۔

(صاحب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں)

ہا صاب، پھر ہم کو ایک دن او فوجی صاحب۔ کہنے لگا۔ تم اس دن بھاگ کیوں گیا۔ ہم تم کو بہت پسند کرتا ہے ہم تم سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔ ہم بولا ہم کو نہیں بنانا ہے شادی۔ اور ہمارا سب جات دار رہتا ہے۔ تم ہم کو اس میں دیں گا تو ہم تمہارا سر توڑ دیں گا۔

صاحب (پھر جا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر) تم سب کا سر پھوڑنے کی تو کیسے ہے گا۔ تم کیں شادی کیوں نہیں کرتی۔

آیا۔ ہم کو مانگتا ہی نہیں شادی۔ ہم بھوکا مر جائیگا۔ فٹ پاتھ پر سوئیں گا پن شادی نہیں بنائیگا۔

صاحب اب تم کدھر جاتی ہے؟

آیا۔ ہم تو اور ہی آیا تھا صاب۔ میم صاب بولا تھا ذرا جانے کو مانگتا ہے۔ ہم کو صاب کا بڑا فکر ہے تم اس کو دیکھنا۔ ہم آیا تو اب تم باہر گاؤں جانے کو مانگتا ہے۔ ہم تو اور نوکری بھی چھوڑ دیا۔

صاحب۔ تم مجھ سے پوچھ تو لیتی۔

آیا۔ ہم کو کیا مالم۔ میم صاب بولا تھا ہم جا رہا ہے کو جائیں گا۔ آپا پاگل ہے۔ ہم اور آیا ہے۔

صاحب تم کو پنٹو صاحب کے ہاں بھیجا تھا۔

آیا۔ اس میم صاب نے آیا رکھو۔

صاحب۔ وہ موٹا صاحب جو تمہیں لے گیا تھا۔ میں اس سے کہوں گا وہ تمہارے لیے نوکری ڈھونڈ دے گا۔

آیا۔ (پھر آ کر صاحب کی میز پر جھول جاتی ہے) وہ بڑا ایسا ہے صاب۔

صاحب۔ کیوں؟

آیا۔ جب ہم پنٹو صاب کے گھر سے چلا تو او موٹا صاب بولا۔ آپ سینما دیکھنے چلیں گا؟ ہم بولا ہم کو نہیں مانگتا ہے سینما۔ بولا چلو جائے پئیں۔ صاب او ہم کو جبرجستی ہوٹل میں لے گیا۔ ہم ایک کپ چائے پیا۔ او بولا۔ آپا ہمارے سنگ چلو ہم تم کو بہت پسند کرتا ہے۔

صاحب۔ وہ تم کو پسند کرتا ہے۔

آیا۔ اس کا اپنا شادی نہیں بنا صاب۔

صاحب۔ اس کی بیوی ہے! بہت خوبصورت لیکن ولیس میں ہے۔

آیا۔ اور بڑا ایسا ہے صاب۔

صاحب۔ اندھیری والے صاحب کو بھی اب آیا چاہیئے تم ادھر کیوں نہیں جاتی؟

آیا۔ ہم کو نہیں مانگتا اندھیری۔ وہاں ہم کو اور بہوت بہت تراش دیتا ہے۔ ہم بے بی کو لے کر بیٹھا ہوتا۔ اور بے بی کو لے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ ہم کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑتا۔ اور ہم کو بہت تراش دیتا تھا۔

صاحب۔ وہ لمبا صاحب اب ادھر نہیں ہے۔

آیا۔ اور میم صاب بھی بہت کھٹ کھٹ کرتا تھا۔

صاحب۔ (ہنس کر) تو پھر تم میں کوئی پسند بھی ہو؟

آیا۔ ہم کو تو تم جیسا کھتری صاحب پسند ہے۔ ہم تمہارے گھر اتنی دیر رہا تم ہم کو کبھی تراس نہیں دیا۔ ہم اچھا سا دی پہنتا تھا تم ہم کو کبھی نہیں بولا۔ کھانے کا ہم کو کوئی دانہ نہیں ہوتا۔ میم صاب کھٹ کھٹ بھی کرتا تو تم اس کو بول دیتا۔

صاحب۔ لیکن تم تو یہاں سے بھی ڈر کر بھاگ گئی۔

آیا۔ وہ ہمارا بھٹ بوا نے فریڈ ہم کو لے گیا صاب۔ یہاں کا بوا کے لوگ بھی تراس دیتا ہے۔ اور دھنی لوگ بھی۔ ہم تو کھتان گیا بمبئی سے۔

صاحب۔ تم تو دیس میں جانے والا تھا۔

آیا۔ دیس میں گیا تھا صاب پن ہمارا دل اُدھر نہیں لگا۔

صاحب۔ تم سے پنجاب جانے کو کہا تھا اس اُدھر والی میم صاحب کے ساتھ۔

آیا۔ نہیں صاب ہم اُدھر گاؤں جانے کو نہیں مانگتا۔ اُدھر ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا۔ ہم صاحب سے کہتا ہم ایک بار ایک صاب کے ساتھ دلی گیا۔ ایک ویک میں میم صاب سے ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا۔ وہ بولا دلی میں کدر جائیں گا۔ ہم بولا ہم بہوت کام کریں گا فٹ پاتھ پر سوئیں گا پن تمہارے گھر نوکری نہیں کریں گا۔ ہمارا جات والا کوئی اور تھائیں۔ ہمارے گھے کا ہنسلی ہمنے دیچا تو اور آیا۔

صاحب۔ کسی اور کے ہاں نوکری کر لیتی وہاں۔

آیا۔ ہم کو تو کئی لوگ بولتا تھا صاب، تم ہنسلی نہ دیچو ہمارے سنگ رہو۔ تم کو دیش کرائیں گا۔ کوئی دیکھیگا نہیں ہونے دیں گا پن ہم بولا۔ ہم بہوت کام کریں گا۔ فٹ پاتھ پر سوئیں گا پن دلی میں نہیں رہیں گا۔

(صاحب کچھ لمحے اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں جلدی کر تم اشارہ کرتے ہیں)

صاحب۔ (ہنس کر) تم شادی کر لو آیا۔ میں نے تم سے کئی بار پہلے بھی کہا ہے تمہارے پیچھے کی سب گرمی دور ہو جائے گی۔

آیا۔ ہم کو مانگتا بھی نہیں شادی۔ ہماری جات والے بڑے سندر لڑکوں نے ہم سے شادی بنانے کو کہا صاب۔ پن ہم کو نہیں مانگتا شادی۔ ہمارا دو دن میں کھٹ پٹ ہو جائیں گا۔ پھر سیز پر جھگڑا ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پھیل کر صاحب کے پیٹ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ آنکھوں میں نرمی اور آواز میں ملائمت آ جاتی ہے۔ ہم کو تمہارے ماتھ کھتری مانگتا ہے صاب۔ بھٹ نہیں مانگتا۔

ہم تو ملیں سے پاس آیا تھا۔ ہم صاب بور تھا۔ چھوڑ کر چلا جائیں گا۔ ہم یہاں رہتا ہوتا تو تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوتا۔

صاحب۔ (انگلیوں سے ہلکا پھلکا اس کے گوز سینے کو دیکھتے رہتے ہیں، جو میز کے کونے کو دبائے جا رہا ہے پھر ہنس پڑتے ہیں)
تم یہاں رہتا تو ہمارا بھی بوجھ نہ رہتا۔

آیا۔ تم کیا کہتا ہے صاب!

صاحب۔ (پیشتر سا جی اپنا کام شروع کرتے ہوئے) اب جاؤ۔ کھانا وانا کھاؤ پھر جانا۔

آیا۔ تم یہیں رہے گا صاب۔

صاحب۔ (لکھتے ہوئے) ہاں۔

آیا۔ صاب ہم نیچے باتھ روم میں باتھ لینے کو جاتا ہے۔ اتنا گرمی ہے، ہمارے پاس دوسرا ساڑی ہے۔

صاحب۔ (پیشتر کام کرتے ہوئے) تو کیا کر سر سے لے گی؟

آیا۔ تو کل ہے صاب۔

صاحب۔ جاؤ نہاؤ۔

(آیا مسکراتی ہوئی چلی جاتی ہے)

صاحب۔ (حول و فوقہ) یہ آیا بھی خوب ہے (نوکر کو آواز دیتا ہے) جگدیش جگدیش۔

(نوکر آتا ہے)

دیکھو وہ آیا نیچے نہانے گئی ہے۔ کھانا یہیں کھائے گی۔ دل پھینک قسم کی عورت ہے۔ باتوں میں نہ لگے رہنا۔ کھانا وانا کھلا کر سارا کام نمٹا دینا۔

(قلم چھوڑ کر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے انگڑائی لیتے ہیں)

(اپنے آپ سے) مرزا نیم اور ملا دیوان جوں ہی اس کے لیے نہیں مرتے۔

(آیا دروازے میں جھانکتی ہے)

آیا۔ صاب۔

صاحب۔ کہو۔

آیا۔ کوئی صابن کا ٹکڑا ہو تو دیو صاب۔

صاحب۔ صابن۔

آیا۔ پسینہ بہت رہے صاب۔ کپڑا دھونے کا ہو تو بھی چلیں گا۔

صاحب۔ (نوکر کو آواز دیتے ہیں) جگدیش!

جگدیش۔ (نیپک کر آواز میں) جی۔

صاحب۔ ادھر ہماری صابن دانی میں صابن کا چھوٹا ٹکڑا ہے لاؤ۔

جگدیش۔ (ایک گراؤنڈ میں) جی بابا۔

آیا۔ صاب اس شام تو اور دھوپ بڑا ہے۔ ہم کچھ دیر اور بالکونی میں آرام کروں۔ شام کو ہم چلا جائیں گا۔

صاحب۔ (بدستور کام کرتے ہوئے) اچھا۔

(جگدیش صاحب کا ٹکڑا لاتا ہے)

صاحب۔ آیا کو دور آیا سے پیسیں گا۔

آیا۔ پیسیں گا صاب۔ ہم ابھی ہاتھ لے کر آتا ہے

(چلی جاتی ہے۔ لمبی سانس بھر کر صاحب اٹھتے ہیں)

صاحب۔ دیکھو جگدیش ہم ابھی دفتر جاتے ہیں۔ کھانا ہم وہیں کھائیں گے۔ تم شام تک سب کام ختم کر لینا۔ کل دیوالی ہے کل تک کچھ باقی نہ رہے آیا کے ساتھ باتوں میں نہ لگے رہنا۔

(چلے جاتے ہیں۔ پردہ کچھ لمحوں کے لیے گرتا ہے پھر اٹھتا ہے۔ گھڑی میں ۱ بج رہے ہیں۔ صاحب جلدی جلدی داخل ہوتے ہیں اور آتے ہی نوکر کو آواز دیتے ہیں)

جگدیش!

جگدیش۔ (ایک گراؤنڈ میں) جی آیا۔

صاحب۔ ایک پانی کا گلاس لاؤ۔

(کھڑکیوں سے بالکونی کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی زندگی کا نشان ہے یا نہیں۔ پھر فائلوں میں ڈھونڈ کر ایک فائل نکالتے ہیں۔ نوکر پانی لاتا ہے۔)

صاحب۔ (پانی کا گلاس پیتے ہوئے) جلدی میں یہ فائل یہیں رہ گئی (پانی کا گھونٹ پیتے ہیں) کھانا کھلا دیا آیا کو؟

جگدیش۔ جی وہ تو چلی گئی۔

صاحب۔ چلی گئی؟

جگدیش۔ اسی وقت آپ کے جاتے ہی۔

صاحب۔ کیوں؟

جگدیش۔ ذرا سا تیل مانگنے اوپر آئی۔ آپ کو نہ دیکھ کر بولی۔ صاب کدھر گیا؟ میں بولا دفتر بولی۔ کب آئیں گا؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ بس اسی وقت چلی گئی۔ نہ اس نے ٹفن کیا نہ کھانا کھایا۔ یہ روپیہ دے گئی ہے۔ کہتی تھی۔ ہم سمجھتا تھا صاب گھر رہیگا میں نے کہا کھانا تو کھاتی جاؤ۔ بولی۔ ہم کو نہیں مانگتا ہے کھانا۔ جاتے جاتے بولتی تھی۔ یہ کیسا صاب ہے؟

(صاحب گلاس ہاتھ میں لیے بالکونی کے خلا میں تک رہے ہیں۔ جب پردہ پھر گر جاتا ہے)

اصفہان کے تکبند

(ایک ریڈیائی تمثیل)

سید امتیاز علی تاج

حلاج: معزز سامعین، السلام علیکم! مزاج شریف؟ خالق ارض و سما نے جب سے یہ کائنات پیدا کی ہے، ابن آدم کو وہ مسرتیں کبھی نصیب نہیں ہوئیں جو آج اصفہان میں میسر ہیں۔ اس دیارِ حسن و عشق میں کسی شخص کا آئینۂ خاطر زنگ آلود نہیں۔ یہیں اسقدر مسرتیں حاصل ہیں کہ اگر ہم قصداً غمگین ہونا چاہیں جب بھی نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے دیکھئے آج ایک ایسی پریشانی کا سامنا ہے کہ میرے حواس مجھ سے رخصت طلب کرنے پر مصر ہیں۔ پر کہتا ہوں، بسورنے اور ہائے وائے کرنے سے کیا حاصل؟ قصہ یہ ہے کہ میں ایک ایسی حسینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس کے دیدار سے میری آنکھیں بہرہ یاب نہیں ہوئیں۔ آپ کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ محبت کا مقدس جذبہ محض دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا یہ آگ کبھی کبھی گفتار سے بھی بھڑک اٹھا کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ایک شاعر اپنی محبوبہ کی صورت دیکھے بغیر محض اس کے نام پر فدا ہو جائے تو آپ اس بیچارے کو قصوروار کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں؟ رباعی تو خیر میں نے لکھ لی لیکن سوال اب صرف یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے باپ کی دوسری شرط کیونکر پوری کی جائے؟ آخر تاجر ہے۔ ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جو شخص اس مقابلہ میں شریک ہونا چاہے رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی پیش کرے۔ یہاں لے دے کے ساری پونجی صرف یہ ایک دینار ہے۔ افسوس کہ آپ اسے دیکھنے سے معذور ہیں بہرحال اب فکر ہے تو یہ کہ کیا افسوں پڑھ کر پھونکا جائے جو اسے ایک کے دس دینار نظر آنے لگیں؟ خیر ہمیشہ سے یہی ہوتی آئی ہے، کچھ مجھ ہی پر موقوف نہیں۔ بڑے بڑے اہلِ کمال آشفتہ حال پھرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ آج کل کاروبار مندا ہے۔ دکان پر اتنے گاہک نہیں آتے جن سے دو دینار کمانے کی امید ہو سکے لیکن قسمت کا شکن کرنا احمقوں کا شیوہ ہے۔ کاتبِ تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے ہو کر رہے گا۔

(موسیقی کے ساتھ شاہ کمال داخل ہوتا ہے)

حلاج: اخاہ آتائے شاہ کمال، خوش آمدید! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ غریب خانے پر آپ قدم رنجہ فرمانے والے ہیں تو میں سارے فرش پر گلاب و یاسمین بکھیر دیتا۔ لیکن آپ نے اپنی تشریف آوری کی اطلاع ہی نہ بخشی۔ کیوں خیر ہے آج؟

شہ کمال: حضور نے اپنا تنور اس قدر جلد کیوں بند کر ڈالا؟

حلاج: اے کوہ دانش! اے سلطان اقلیم! ابھی ابھی کچھ بیچتے ہوئے میں نے سنا کہ اصفہان کے متمول سوداگر ابن حیم نے اپنی پری جمال دختر کی شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

شہ کمال: ماشاء اللہ آپ کی سماعت میں اب تک کوئی عیب پیدا نہیں ہونے پایا۔

حلاج: یہ بھی سنا کہ جو شخص اس کے جمال جہاں آرا کی تعریف میں بہترین رباعی کہہ کر لائے گا وہی اس کا شوہر قرار پائے گا۔

شہ کمال: لیکن میرے محسن اس کے ساتھ بعض شرطیں بہت کڑی بھی ہیں۔

حلاج: میں بھی تو سنوں وہ کیا ہیں؟ اگر چند اشعار کے عوض جوہری کی کافر ماجرا دختر ہاتھ آئے تو اور چاہیے کیا؟

شہ کمال: رباعی غروب آفتاب سے پہلے تیار ہو جانی چاہیے۔

حلاج: معمولی بات ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کی فرصت ہے اتنی دیر میں چار مصرعے کہہ لینا کیا بڑی بات ہے۔ ارے برادر ایک مرتبہ شیخ کے ہاں ضیافت تھی۔ اس ناچیز نے ضیافت کا سارا کھانا گھنٹہ بھر میں تیار کر کے رکھ دیا تھا اور پھر لطف یہ کہ ہر کھانے کی قطع اور رنگت کسی نہ کسی پھول سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اس کارنامہ پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔ کیوں ہے نا؟ تو صرف رباعی ہی کہنی ہے؟

حلاج: ایک شرط یہ بھی ہے کہ قافیہ میں لڑکی کا نام آئے اور اس طرح لایا جائے جس طرح جوہری زر و موتی کے نگینے کے اردگرد سونے اور چاندی کے بیل بوٹے بنا دیتا ہے۔

شہ کمال: یعنی ویسے ہی ناجیسے سانچوں میں نان پاؤ تیار کئے جاتے ہیں۔ اے لو مجھے تو شعر سوجھنے بھی لگے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دماغ کے تنور سے اشعار کے خستہ شیرمال نکلے آ رہے ہیں۔

حلاج: یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی نہایت پاکیزہ خط نستعلیق میں لکھ کر پیش کی جائے۔

شہ کمال: یہ البتہ ٹیڑھی کھیر ہے تم جانتے ہو لکھنا مجھے آتا نہیں۔

حلاج: اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں۔

شہ کمال: دام کیا لو گے؟

حلاج: آقا اس خاکسار کو چاندی کا ایک دینار دے دیجئے۔ ایسے پاکیزہ خط میں نظم لکھ دوں کہ لوگوں میں ایک بار تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ہاں بھئی شہ کمال کی رباعی واقعی ماہ سیمیں کی نظروں سے گزرنے کے قابل ہے۔

شہ کمال: منظور۔ یہ لو دینار۔ جو کچھ کہا سچ ہے، تو یہ معاوضہ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ تو گویا اب رباعی کی طرف توجہ کی جائے اور نہایت لطیف اشعار کہے جائیں۔ ذرا مجھے فکر کرنے دو۔ ہاں تو یوں کہنا چاہیے۔ تو شمع ہے، میں پروانہ ہوں۔

حلاج: مگر ایک بات اور۔

شہ کمال: یار تم تو پریشان کئے دیتے ہو بڈھا اور کیا چاہتا ہے۔ کہہ بھی چکو۔

حلاج: رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی دیتے ہیں۔

شہ کمال: حریص پیر فرتوت۔ مگر پرواہ نہیں، دس دینار بھی ہیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ میں شیخ ہوں اور پھر وہ ہے تو ہوں! ہوں! ہوں! لاحول ولا قوت۔ غارت ہو گیا سارا خیال۔ کیسے تھا؟

(گھنٹی بجتی ہے)

حلاج: کون ہے؟

آواز (باہر سے): میں ہوں علاؤ الدین عطر فروش!

حلاج: اندر تشریف لے آئیے۔

(علاؤ الدین داخل ہوتا ہے)

حلاج: آج تو میری قسمت کا ستارہ زوروں پر ہے اگرچہ آپ کے عطر کے قرابوں سے گلاب کی بوئے دلآویز کے بھبکے اٹھتے ہیں لیکن مجھے اس وقت اس شخص کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل ہے جس کی باتیں عطر سے بھی زیادہ نکہت بیز ہیں۔

علاؤ الدین: اگر یہ صحیح ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ قدرت لطیف کاموں کے لیے ان ہی لوگوں کو منتخب کرتی ہے جنہیں لطافت ذوق کی نعمت عطا ہوئی ہے لیکن ذرا دیکھنا یہ ان حضرت کو کیا ہو گیا؟ میرے خیال میں تو ان کی حالت اندیشہ ناک سی ہے۔

حلاج: یہ شہ کمال نا تبائی ہیں۔ آپ نے یقیناً انہیں بارہا دیکھا ہو گا۔

علاؤ الدین: میں نے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میرا ان سے کیا واسطہ، لیکن یہ تو فرمائیے یہ ایسے وحشیانہ انداز میں کیوں گھوم رہے ہیں؟

حلاج: یہ اس وقت بحر نظم میں غرق، قافیہ کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔

علاؤ الدین: کیا کہا، بحر نظم میں غرق؟ نا تبائی میں شاعری کی روح کہاں سے آئی۔ کہیں انہیں بھی تو یہ خبط نہیں ہوا کہ رباعی کہہ کر ماہ سیمیں پری جمال دوشیزہ کو حاصل کیا جائے؟ کیا خوب بھچوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔

شہ کمال: ارے بھئی یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے۔ اخاہ تم ہو میرے دوست علاؤ الدین! وہ اس شیر مال کے دام آج تک ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ یاد ہے نا؟ لاحول ولا قوۃ! مصرعہ ہی دماغ سے نکل گیا تھا۔ کیا تھا۔ یہ گھمائے.....

علاؤ الدین: کتنا فرسودہ اور پامال خیال ہے۔ جیسے اس شخص کے شیر مال پھیکے اور بے مزا ہوتے ہیں ویسے ہی اشعار بھی بے کیف ہیں۔ لیکن حلاج پہلے میں اپنے یہاں آنے کی غرض و غایت بیان کر ڈالوں۔ معلوم ہوتا ہے بوڑھے جوہری کے خبط کا قصہ تم نے سن لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ابن جسیم خود تو بالکل کورا ہے۔ لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن بوڑھے کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ اس کی بیٹی ماہ سیمیں.....

حلاج: میں جانتا ہوں یہ اشعار ماہ سیمیں پڑھے گی۔

علاؤ الدین: بالکل ٹھیک۔ چنانچہ اگر اپنے اشعار میں تم سے لکھواؤں تو اس کا معاوضہ تم کیا لو گے؟

حلاج: دو دینار!

علاؤالدین: دونوں بھائی ایک۔ کامیاب ہو گیا تو سارا بیڑہ تمہارا۔

حلاج: منظور!

شہ کمال: (جھاتی کوٹتے ہوئے) میرا قافیہ تنگ ہو گیا ہے۔ شعر سوجھتا نہیں۔

علاؤالدین: تو اب سوال یہ ہے کہ اشعار لطیف ہوں یا جذبات سے لبریز ہوں یا مشکل ہوں۔

حلاج: تین دینار تو ہو گئے۔ شاید باقی سات بھی کہیں سے مل رہیں گے۔

شہ کمال: یہ گلہائے رنگا رنگیں۔ یہ گلہائے رنگا رنگیں۔

علاؤالدین: حلاج! یہاں میرے بے شعر کہنا ناممکن ہے جب ایک ایسا عجیب غریب انسان اس ہیئت کذائی کے ساتھ شاعری کا خون کر رہا ہو تو بھلا کوئی شریف آدمی شعر کیونکر کہہ سکتا ہے؟

حلاج: آپ کہاں لکھنا پسند کریں گے؟

علاؤالدین: کوئی نرم اور گدگدی سی جگہ ہوتی یہاں گدیلے بھی تو نہیں ہیں۔ ارے میاں تم کیا آدمی ہو۔ درویشوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہو۔

حلاج: آپ یہاں تشریف رکھئے نا۔

علاؤالدین: ہوں۔ خیر لیکن ایک بات سنلو۔ اگر کوئی اور آئے تو اسے میرے قریب نہ پھٹکنے دینا۔ میرا دماغ بے حد حساس ہے اور اثر بڑی جلدی قبول کرتا ہے۔ پھر میرا ذوق بھی بے حد لطیف واقع ہوا ہے۔ کوئی غیر فصیح لفظ سن پاؤں تو ذہنی کوفت ہوتی ہے اور اگر کسی احمق کا منحوس چہرہ نظر آجائے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر تک طبیعت مکدر رہتی ہے۔

حلاج: الٰہی تیری پناہ!

علاؤالدین: تو اب میں شعر کہتا ہوں۔

(گھنٹی کی آواز)

حلاج: کوئی اور صاحب تشریف لائے۔ ارے یہ تو جماعت مآب جناب سلیمان حجام ہیں۔

سلیمان: (بھاگتا ہوا آیا ہے اس لیے ہانپ رہا ہے) ہاں حلاج سنا تم نے بوڑھے جوہری کا قصہ جب ڈھنڈورچی یہ خبر لے کر میرے کوچے میں پہنچا تو میں خط بناتا بناتا اٹھ کر اس طرح بھاگا جیسے شیطان جہنم سے نکل کر بھاگے۔ سارے شہر میں اس قصے کا چرچا ہو رہا ہے اور یہ دوشیزہ ہے بھی تو عرم سرائے سلطانی کی زینت بننے کے قابل۔ ارے بھائی تمہارے وہم و گمان میں تو اس کی انگشتریوں کی صحیح قیمت بھی نہیں آسکتی۔ ان کے نگینے اتنے بڑے ہیں کہ.....

حلاج: خدا کے لیے بات کرتے وقت اپنی قینچی کو یوں نہ گھمائیے، آپ میری آنکھیں نکال ڈالیں گے۔

سلیمان: میں تو کہتا ہوں یار اب یہ بیداری کا عالم ہے یا خواب و خیال کی دنیا۔ میں اس قدر مسرور ہوں کہ بچپن کے زمانے کی طرح ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ سنو! میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔ معاوضہ نقدا نقد، جی چاہے چینگی لے لو اور اگر کہیں میں نے اس معرکہ میں فتح پالی اور ماہ سیمیں میرے ہاتھ آگئی تو قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے اس حجامی کے

پیشے سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ لو، اب میں شعر کہتا ہوں اور تم فوراً نہیں لکھ لینا۔

گلی میں سے آواز: ارے بدمعاش نکل باہر کہاں آکر چھپ بیٹھا ہے۔ حلاج، سلیمان اندر ہے؟

سلیمان: (گھبرا کر) ہی ہی یہ کم بخت یہاں آپہنچا جب ڈھنڈورچی آیا تو میں اس وقت کم بخت کی آدھی ڈاڑھی تراش چکا تھا۔

(گلیش داخل ہوتا ہے)

حلاج: خوش آمدید گلیش!

گلیش: لیکن تم مسکرا کیوں رہے ہو؟

حلاج: کیونکہ آج بڑی مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔

گلیش: وہ رہا کم بخت حجام۔ کیوں بے بدمعاش یہ کیا حرکت تھی۔ آدھی ڈاڑھی تراش کر اٹھ بھاگا۔ شہر کے ایک معزز آدمی کو اچھا خاصا مسخرا بنا ڈالا۔ میں اس بلا کی گرمی میں سوانگ بنا، گلی کوچوں میں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ادھر تو آ۔ تجھے بھاگنا سکھاؤں۔

حلاج: ابھی حضرت ایسا بھی کیا غصہ، ذرا بات تو سنئے۔ سلیمان برا آدمی نہیں، البتہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے اور پھر اس وقت ذرا فکر شعر میں بھی مصروف ہے۔

گلیش: کیا کہا شعر؟ ایک بار اس کی ناک میرے ہاتھ آجائے تو اسے سکھاؤں شعر کہنا۔

علاؤ الدین: ارے بھئی یہ کیا مصیبت ہے۔ دفان کرو اس بھکی کو یہاں سے۔

شہ کمال: اے لو۔ اتنی دیر کے بعد ایک ہی لفظ سوجھا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔

سلیمان: قبلہ آپ کی باقی ڈاڑھی میں پھر کسی دن تراش دوں گا۔ اس وقت آپ کو معلوم نہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ مجھے معاف فرمائیے۔

گلیش: ہیں؟ کیا کہا؟

حلاج: میں نے کہا حضرت ذرا بات تو سنئے۔ میں نے سنا ہے آپ بڑے کاروباری شخص واقع ہوئے ہیں۔

گلیش: تو پھر؟

حلاج: آپ بھی وہی کیجئے نا جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

گلیش: کیا میں بھی شعر کہوں؟ میں اور شعر؟

حلاج: چار مصرعے ہی تو کہنے ہیں۔ خیر آپ نے سن ہی لی ہوگی۔

گلیش: وہی اپنی جسیم کا قصہ۔ جی ہاں! یہی نا کہ وہ اپنی لڑکی چند شعروں کے عوض بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ نا بھائی ان دنوں جو روپیہ بہت روپیہ صرف ہوتا ہے۔ پھر میں اتنی استطاعت کہاں۔

حلاج: غالباً آپ نے یہ نہیں سنا کہ جہیز میں سنتا اونٹ بھی ہاتھ آئیں گے۔

گلیش: علاج! تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔ یہ بات ہے تو میں اس لڑکی کو جیت کر رہوں گا۔

حلاج : بالکل بجا۔ لیکن روانی کھٹکتی بھی تو پڑے گی۔
گلیش : کھٹکنے کی بات پڑھی ہے۔
حلاج : ایک دینار صرف کیجئے تو یہ مشکل بھی آسان ہوتی جاتی ہے۔
گلیش : اکٹھا ایک دینار۔ یہ تو بہت ہے۔ نصف دینار کہو۔ ہاں نصف دینار۔
حلاج : لیکن پاکیزہ اشعار اگر پاکیزہ خطوں میں نہ لکھے گئے تو حاصل کیا ہوگا۔
گلیش : اچھا تو پھر پورا ہی سہی یہ لو دینار۔
حلاج : یہ خیال بھی تو بیچارے کاغذ کی کے ساتھ دوات کتنی ہاتھ آئے گی۔
علاؤالدین : شکر ہے بھئی۔ کسی قدر سکون تو نصیب ہوا۔ تو اب سبھی کو کوئی نیا اور شگفتہ قافیہ تلاش کریں۔ ابھی سے قافیہ کی تلاش شروع کرنی چاہئے۔ سبھی، آئیں۔ قرسودہ، پامال قافیہ ہے۔ پائیں۔ رنگیں، سنگیں، شیریں، نگیں، رنگیں اور نگیں اچھے قافیے ہیں۔ پہلے قافیہ مقرر کر لینا چاہئے۔ خیال خواہ پست ہو اس کی پرواہ نہیں۔ شاعری کی جان الفاظ کا ترنم اور آہنگ ہے۔
گلیش : (دور سے) اماں علاؤالدین تم نے تو مغز چاٹ ڈالا۔ جہاں کوئی موزوں ترکیب سوجھتی ہے۔ تم اسے قتل کر دیتے ہو۔
سلیمان : کان نہ کھاؤ گلیش۔ میں اپنی رباعی دل میں دہرا رہا ہوں۔
شہ کمال : اگر یہ بات ہے تو آپ حضرات کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لیجئے۔
علاؤالدین : یہ مصرعہ کیسا رہے گا ع تمہارے بلبلیں گاتی ہیں تیرے روئے رنگیں کا۔
شہ کمال : سوجھ گیا۔ بالکل سوجھ گیا ع نہیں ہے علم بلبل کو ذرا الفت کے ہمیں کا
علاؤالدین : (اٹھ کر) کیا کہا تم نے؟ نہیں ہے علم بلبل کو؟ یہ ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ بلبل کا خیال میرا ہے۔
گلیش : اتنا بگڑا تو ہو گیا۔ کہاں بلبل کہاں نغمہ۔
علاؤالدین : تم سب کے سب چور ہو۔ یہ ساری بلبل چوروں کی ٹولی ہے۔
حلاج : ہائیں ہائیں کیا ہوا تمہیں۔ شاعر اور عاشق اور اس پر یہ کیفیت کہ مرغوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ اس خشک اور سوختہ دنیا میں شاعر تو ابر رحمت کی طرح ہیں۔ جو خدا کی دنیا کو سیراب و شاداب بناتے ہیں۔ پھر شاعروں کا لڑنا جھگڑنا کیا معنی؟
سلیمان : (اچانک) حلاج، گلیش، شہ کمال، علاؤالدین! میں نے رباعی کہہ لی۔
علاؤالدین : نہیں نہیں پہلے اس قضیہ کا فیصلہ ہونا چاہئے۔
سلیمان : اماں چھوڑو اس قصے کو۔ لو حلاج تم میرے شعر قلمبند کرو۔ دیر کی تو میں بھول جاؤں گا۔

کہیں خوشبو ہے ریحاں کی کہیں ہے رقص نسریں کا
کہیں بلبل کے . . . . . .

علاؤالدین : کیا کہا بلبل! یعنی تم نے بھی میرا ہی بلبل کا خیال چرا لیا۔ چچا جان کی ریش دراز کی قسم یہ دنیا لٹیروں سے بھری ہوئی ہے۔

سلیمان : کیوں بلبل کے ٹھیکیدار آپ کیسے بن بیٹھے ؟

علاؤالدین : یہ لفظ پہلے مجھے سوجھا تھا۔

شہ کمال : سنا آپ نے ! حالانکہ سوجھا مجھے پہلے تھا۔

گلیش : بکتے ہو جی۔ یہ لفظ میرا ہے۔

حلاج : یہ کس فوک جھونک میں پڑ گئے آپ لوگ۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہ نہ بھولئے کہ آسمان کی بلندیوں پر چاند آپ ہی نہیں نکلتا ہے لیکن اس کا پرستار ہر باغ میں موجود ہوتا ہے جو راتوں کے سائے میں اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔

سلیمان : واللہ کیا بات کہی ہے۔ آدمی فکر مند ہے۔ مجھ سے پوچھو تو سب سے بڑے شوق سے اس لفظ کا استعمال کریں۔ الفاظ پر کسی کے باپ کا اجارہ ہے !

علاؤالدین : لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا ہر ایک جانتا ہے کہ الفاظ کے دہرانے اور ان کی تکرار سے جسم کلام کا خون ہو جاتا ہے۔

سلیمان : حلاج ! اس معاملہ سے تمہارا کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لیے تم ثالث بن کر یہ جھگڑا چکا دو۔

شہ کمال : میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

گلیش : اور میں بھی۔

علاؤالدین : اور میں بھی۔

حلاج : یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے۔ آپ کے اشعار خواہ دوپہر کی طرح روشن ہوں خواہ شام کی تاریکی کی مانند سبک اور لطیف، یا تاروں بھری رات کی طرح پُر شکن آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن ان میں طلسم ایسے الفاظ کا باندھ دیجئے جن میں سنبل و ریحان اور مشک و عنبر کی خوشبو جاں نواز کا ذکر ہو اور کائنات گلہائے رنگا رنگ سے تحفہ گزار نظر آئے۔ نرگس کی نگاہ بلاری بھی اور سوسن کی زباں درازی بھی۔ اس میں طیور خوش الحان کا نام بھی لائیے قمری، فاختہ، طوطی اور طاؤس کا ذکر بھی کیجئے۔ لیکن بلبل ہزار داستان کا نام بھی نہ لیجئے۔

علاؤالدین : یعنی کوئی بھی بلبل کا ذکر نہ کرے ؟ اس طرح تو میں خسارہ ہی میں رہا لیکن اچھا تم کہتے ہو تو یوں ہی سہی۔

سلیمان : تو پھر فیصلہ ہو گیا کہ بلبل کا نام اشعار میں نہ آئے گا۔ یوں ہی سہی۔

(پھر سب مل کر شعر کہنا شروع کر دیتے ہیں)

حلاج : (دینار گنتے ہوئے) : ایک، دو، تین، چار، پانچ ! ——— دنیا میں مجھ سا بدقسمت بھی کوئی نہ ہوگا۔ تاجروں سے سنا ہے کہ پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔ باقی رہے پانچ دینار۔ اب وہ کیونکر حاصل کئے جائیں۔ (سامعین سے مخاطب ہو کر) اے سننے والو ! معلوم نہیں میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مجھ سے اچھا شعر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن افلاس بہت بڑی لعنت ہے۔ اب اتنا وقت بھی تو نہیں رہا کہ روپیہ کہیں سے چرا کر ہی لے آؤں۔ اچھا اگر میں اسے اپنا نہیں بنا سکتا تو اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی جب بھی یہ آفتاب

کی روشنی، بادل اور یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، پھول اور شعر تو کہیں نہیں گئے۔

سلیمان: (نہایت بلند آواز سے) ہو گئی رباعی۔ حلاج جلدی کرو۔ لکھو قلم اور کاغذ۔ اشعار سیلاب کی طرح بہے چلے آ رہے ہیں اور میری روح کے قفس کی تیلیاں توڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو اور ان کے پاؤں میں حروف کی زنجیریں ڈال دو۔

حلاج: تیار ہوں، بولو!

سلیمان: ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محل پردیس کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

شہ کمال: آہا ہا! کیا خوب رباعی ہے۔ حلاج لکھنا میرا شعر جلدی سے۔ کیا بھلا مصرع!

سلیمان: مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

حلاج: اے بھائی ٹھہرو میں دونوں ہاتھوں سے نہیں لکھ سکتا۔

گھنش: اے سبحان اللہ! "تراجم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا"

علاؤالدین: اماں ہٹاؤ ان چوروں کو ان کی نہ سنو۔ میرے شعر لکھو۔

سلیمان: میں نے کہا تھا "مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب"

علاؤالدین: ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ غمگیں کا
گھنش: تراجم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا
شہ کمال: جہانِ عشق و مستی میں گزر کیا علم و تحمیں کا
سلیمان: مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج: یار دوزمانہٹ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ اُفوہ کتنی گرمی ہے۔ سینوں میں شاعری کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک ایک کر کے کہو۔ سلیمان پہلے تم اپنی رباعی لکھواؤ۔

سلیمان: ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محل پردیس کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب
مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج: واہ واہ سبحان اللہ! کیا دلکش اشعار ہیں۔ اے کاش یہ اشعار میرے ہوتے۔

علاؤالدین: اماں رہنے دو تم انہیں دلکش کہتے ہو۔ خدا کی پناہ میں تو سمجھتا ہوں نہایت پھسپھسے شعر ہیں۔

سلیمان: کیوں بے پھسپھسے ہیں ہمارے اشعار؟

علاؤالدین: ارے چھوڑ میرا کان۔

حلاج : شاہ کمال اب تم اپنی شاعری کے تنور کا ڈھکنا اٹھاؤ۔ دیکھیں الفاظ کے کچے تیار کرنے میں تمہیں کتنی مہارت ہے۔

شہ کمال : عرض کرتا ہوں ؎

تخیل سے مرے کیا واسطہ شہباز و شاہیں کا
جہاں عشق و مستی میں گزر کیا ظن و تخمیں کا

اسی دن زندگی کو زندگی کہہ کر پکاروں گا
مرے ہاتھوں میں ہوگا ہاتھ جس دن ماہ سیمیں کا

حلاج : کیا کہنے ہیں۔ واہ، واہ، واہ!

علاؤالدین : شاہ کمال ایک بات میری سن لو۔ اگر ماہ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو چوتھا مصرعہ بدل ڈالو۔

حلاج : گلیش! آگے آؤ اب تمہاری باری ہے۔

گلیش : کہتا ہوں کہ ؎

ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا
بیاں میں کیا کروں تیرے جمال لذت آگیں کا

میں سچ کہتا ہوں پانی کی طرح سونا بہا دوں گا
جس اک پل کے لیے جلوہ دکھا دو ماہ سیمیں کا

علاؤالدین : ان اشعار میں دولت کا تذکرہ فروت سے زیادہ ہے۔

حلاج : ہاں تم تو کسی کو بھی داد نہ دو گے۔ اچھا اپنے اشعار سناؤ۔

علاؤالدین : تمہارا اصرار ہے تو انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ جو کچھ کہا ہے دواروی میں کہا ہے اور اس زمانہ کے تمام بلند پایہ شاعر ایک ایک مصرعہ پر پورا ہفتہ صرف کر دیتے ہیں۔ تو عرض کیا ہے کہ ؎

ترا پیکر سہارا ہے مرے احساس غمگیں کا
ترا ماتھا ستارہ ہے مری شبہائے مشکیں کا

جسے لوگوں نے کوثر کی پلک کہہ کر پکارا تھا
ہوا میں اثر اقبال میرے ماہ سیمیں کا

شہ کمال : چوتھے کا سا تخیل ہے۔

سلیمان : نئے استعارے جیسا باریک خیال۔

گلیش : ہاں تمہیں کیا پڑی ہے کہ نکتہ چینی کر کر کے دوسروں کے اشعار درست کرا رہے ہو۔ رہنے دو یوں ہی وقت تھوڑا ہے مجھے اب دس دینار لانے کے لیے جانا چاہیے۔

سلیمان : میں بھی جاتا ہوں۔ چلو سب اپنے اپنے گھر چلیں۔

شہ کمال : خدا حافظ حلاج۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

حلاج : اب شمعیں روشن کر دوں؟ نہیں جب دن بھر کی گرمی کے بعد رات اپنے نازک پر دنیا پر پھیلا دیتی ہے تو ارمان بھرے دل کی حرکت مدھم پڑ جاتی ہے اور غم بھی شیریں معلوم ہوتا ہے۔ شمعیں خاموش ہی رہنے دوں۔ لیکن حلاج اب ان خیالات کو چھوڑ۔ ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے حقیر جھونپڑے کو اپنی محبوب کی آمد کے لیے آراستہ کر۔ الٰہی فردوس اور جہنم میں کتنا کم فاصلہ ہے۔ مٹھی بھر سونا ہے جو جنت کی رنگینیوں اور دوزخ کی اذیتوں کو جدا کرتا ہے۔

شہ کمال: (دور سے آہستہ سے) حلاج!

حلاج: کون، آپ؟ دوسری بار کیسے تشریف لائے؟

شہ کمال: ذرا آہستہ بولو۔ میں نے کہا کمرے میں تمہارے سوا کوئی دوسرا تو نہیں؟

حلاج: نہیں۔ یقین نہ آئے تو شمع روشن کئے دیتا ہوں۔

شہ کمال: نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ماہ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اشعار علاؤ الدین کے اشعار کے سامنے تخیل کے اعتبار سے پست ہیں۔ وہ تو بڑا شاعر ٹھہرا، اور بھی شعر کہنا کون سا شیر مال تیار کرنا ہے لیکن اگر تم چاہو تو مجھے کچھ امید ہو سکتی ہے۔ تمہارے قلم کی جنبش اس کے اشعار کو کچھ کا کچھ بنا سکتی ہے۔

حلاج: ذرا دیکھوں تو اس کی رباعی، یہ رہی۔ ایک دینار دو تو ہو سکتا ہے۔

شہ کمال: بس تو میدان مار لیا میں نے، یہ لو ایک دینار علاوہ ازیں شادی کے بعد ضیافت بھی دی جائے گی۔

(جاتا ہے)

حلاج: صرف ایک دینار..... اس سے کیا بن جائے گا؟

سلیمان: (آہستہ سے) حلاج!

حلاج: کون ہے، سلیمان؟

سلیمان: ہاں میں ہوں۔ ارے بھیا! مجھے تو اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ لیکن اگر اس آڑے وقت میں تم کام آؤ تو.....

حلاج: کوئی فکر نہیں۔ میں سمجھ گیا تمہارا منشا۔

سلیمان: میں تمہیں بتا دوں کہ ابن جسیم کو فن شعر سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ تو صرف روپے کا بھوکا ہے، چنانچہ مجھے اندیشہ ہے کہ گلیش کے اشعار اسے بہت پسند آجائیں گے۔ اب تم مہربانی کر کے یہ ایک دینار لو اور مجھے اس پریشانی سے نجات دو۔ میں نے جو اشعار لکھے ہیں انہیں اسی طرح رہنے دو اور.....

حلاج: میں سمجھ گیا۔

سلیمان: گلیش کے اشعار کو مسخ کر دو۔

حلاج: ہو جائے گا بے فکر رہو۔

سلیمان: تو میں چل دیا۔ (جانے کے بعد)

حلاج: ایک دینار اور ہاتھ آیا۔ اگر اسی طرح آج.....

علاؤ الدین: حلاج!

گلیش: حلاج!

علاؤ الدین: کون ہے؟

گلیش : اے تم کہاں سے آ ٹپکے۔ میں تو ایک نہایت ضروری کام کے لیے آیا ہوں۔
علاؤالدین : خوب! لیکن جناب یہ کیوں سمجھ لیا کہ مجھے ضروری کام نہیں ہے۔ جناب ہی کیوں نہیں ذرا سی دیر کے لیے سرک جاتے؟
گلیش : مشکل ہے۔
علاؤالدین : تو جناب میرے لیے آسان نہیں۔
حلاج : ارے لڑتے کیوں مرتے ہو۔ ادھر آؤ اور میری ایک بات سنو مجھے ایک عجیب دل لگی سوجھی ہے۔ یقیناً تم دونوں اس معرکے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو لیکن ایک آدمی تین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر تم دونوں ایک ایک دینار صرف کر دو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اتنا معاوضہ لے کر میں تمہارے حریفوں کے اشعار توڑ موڑ کر بے حد مضحکہ خیز بنا دوں گا۔ میں بآسانی یہ کر سکتا ہوں۔ ایک خطا یا حرف یا لفظ سے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔ زیادہ معاوضہ تو نہیں ایک ایک دینار میں ایسی پری جمال دوشیزہ ہاتھ آتی ہے۔
علاؤالدین : مجھے اپنے ابن عم کی ڈاڑھی کی قسم، تم میرے اندازہ سے زیادہ عقلمند ہو۔ مجھے منظور ہے، یہ لو ایک دینار۔
گلیش : معلوم میرے سر پر کیا حماقت سوار ہے کہ اتنا کچھ خرچ کرنے پر تیار ہو رہا ہوں۔ بہرحال یہ رہا دینار۔
علاؤالدین : اب میں جب شہ کمال کی صورت دیکھوں گا تو مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ میں چل دیا۔

(جاتا ہے)

گلیش : (جاتے ہوئے) اب خواہ کامیاب ہوں یا ناکام، سلیمان کی دال تو گلنے نہیں پاتی۔
حلاج : (جلد جلد) ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ بس ایک دینار کی کسر ہے۔ میری سوئی ہوئی تقدیر اس وقت آنکھیں کھول دے۔

(جلدی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

اماں گلیش پلٹ آؤ۔ بات تو سنو۔ سچ کہتا ہوں کہ تم نے آج تک اس سے زیادہ مہنگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔
گلیش : خود ہی تو میرا روپیہ ہتھیا لیا اور بدمعاش خود ہی کہتا ہے کہ میں نے اتنا مہنگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔
حلاج : میں کہتا ہوں جس شخص کو عطر سازی آتی ہے۔ وہ بہ آسانی شعر بھی تصنیف کر سکتا ہے۔ یاد رکھو علاؤالدین شاعر ہے اور تمہارے اشعار کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا۔
گلیش : تو اگل دے میرا سارا روپیہ۔
حلاج : تم بھی کسی قدر احمق ہو۔ ارے سنا نہیں کہ دوڑ میں جو گھوڑا سب سے پیچھے ہو آخر میں وہی جیت جایا کرتا ہے چنانچہ اگر میدان مارنا چاہتے ہو تو ایک چہرہ شاہی اور دلواؤ۔
گلیش : قسم کھا کے کہتے ہو کہ جس طرح دوسروں کے اشعار مسخ کئے ہیں اسی طرح علاؤالدین کے اشعار بھی مسخ کر دو گے؟
حلاج : قسم ہے تمہاری ڈاڑھی کی۔ جگر یہ لو، میں نے اشعار میں رد و بدل کر بھی دیا۔
گلیش : بس صرف ایک لفظ کی تبدیلی!

حلاج : صبر کرو جب ماہ سیمیں تمہارے ہاتھ آگئی اس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت معلوم ہو سکے گی۔

گلیش : مگر ایک دینار کی رقم بڑی بھاری ہے۔

حلاج : تمہاری مرضی میں جانتا ہوں روپے کے معاملے میں تم بڑے سیانے ہو پر اتنا خیال نہیں کرتے کہ دین کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔ ارے تم تو تذبذب میں پڑ گئے۔ پھر انکار ہے کیا؟ یوں ہی سہی۔ ماہ سیمیں تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

گلیش : (آہ بھر کر) اچھا بھئی لے لو۔

حلاج : دس پورے ہو گئے۔ آخر دس پورے ہو گئے۔

گلیش : کیا مطلب؟

حلاج : آپ کے دست کرم پر دس برکتوں کا نزول ہو۔ غم کی تیرگی دور ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند نکل آیا اگر انسانوں کی دنیا حقیقت اس سے کہیں شیریں اور دلفریب بھی ہوتی جیسی آج نظر آ رہی ہے اور شباب اور محبت کا نور ہمارے سینوں کو یونہی جگمگاتا رہتا تو زندگی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ نظم ہوتی کہ شاعر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے۔

گلیش : تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو گویا ماہ سیمیں کو حاصل کرنے کا خواب تم بھی دیکھ رہے ہو۔

حلاج : اس لیے اعتراف ہے کہ میں تخیل پرست ہوں لیکن حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتے ہیں اور جب ہم شباب کو بھول جاتے ہیں تو زندگی ایک بیکار چیز رہ جاتی ہے لیکن سنو آہٹ سن رہے ہو۔ اس کی پائل کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے کوچے سے گزر کر ہماری جانب آ رہے ہیں۔

(ماہ سیمیں کے عاشق داخل ہوتے ہیں)

اس کے عاشق شاعر آ رہے ہیں۔ خوش آمدید۔

شہ کمال : حلاج ہم نے اسے مسجد کے قریب گزرتے دیکھا ہے۔

سلیمان : وہ حسین ہے، بادام کے پھولے ہوئے درخت سے زیادہ حسین۔

علاؤ الدین : حلاج تمہارے ہاں آئینہ بھی نہیں؟

حلاج : نہیں بندہ پرور۔ اب ذرا سرک جائیے۔ اس کے لیے جگہ چھوڑ دیجئے۔ (ماہ سیمیں کی سوتیلی آتی ہے۔ ساتھ اس کا باپ ابن جسیم ہے)

ابن جسیم : اے نیلے گنبدوں والے شہر اصفہان کے باشندو! میں تمہیں زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں تم سب نے سن لیا ہے میں اب ایک ضعیف العمر اور سفید ریش انسان ہوں مجھے لے دے کے اب یہی ایک خواہش ہے کہ میرے جیتے جی میری لڑکی کی شادی ہو جائے۔ تم پوچھو گے کہ میں اپنی لڑکی کو شرم کے عوض کیوں دے دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے امتحان کے لیے سپاہ گری کا کوئی کرتب کیوں تجویز نہیں کیا۔ میرا جواب مختصر ہے۔ جو شخص شاعری سے جو درحقیقت زندگی کی ساری لطافت کا مجموعہ ہے محبت نہیں کرتا میں اسے فطرت کا باغی اور وحشی سمجھتا ہوں۔ وہ درحقیقت صرف نام کا انسان ہے اسی طرح جس شخص کے دل نے حسن کے آگے سر جھکا دیا ہے اس نے خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ کی ہوں وہ عام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ شفیق ہوگا۔ اس لیے حضرات اب آپ میں سے ہر شخص باری باری آگے

بڑھکر شاعری کے جوہر دکھائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ میں سے کون شاعری کے میدان میں گوئے سبقت لے جاتا ہے اس معرکہ میں جو کامیاب ہوگا اسے حسن اور دولت کا انعام دیا جائے گا۔

حلاج : اے ماہ سیمیں! اے بہار کے چاند! اگرچہ ان اشعار کو ایک بے ہنر کے قلم نے لکھا ہے لیکن کیا آپ ان پر نظر ڈالنا گوارا فرمائیں گی؟

ماہ سیمیں : تم حلاج ہو۔ اہل قلم کے بادشاہ حلاج!

حلاج : بادشاہ جب، اگر میری خوشنویسی آپ کو پسند آجائے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ کے نیچے شہ کمال کا نام لکھا ہے۔

شہ کمال : میں ہوں شہ کمال۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اشعار تخیل کے اعتبار سے کسی قدر پست ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ تمام بلند پایہ شاعر...

ابن جسیم : خاموش۔ ہم اشعار سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں۔

ماہ سیمیں : ؎

نہ جانے ان دنوں کیوں ولولہ اٹھتا نہیں دل کا
نہیں دیکھا ہے میں نے پیٹ اس دنیا میں مسکیں کا
چٹانوں سے بھی موٹی روٹیاں ان کو کھلاؤں گا
اگر مجھ کو میسر ہو خزانہ ماہ سیمیں کا

اہل جان اظاہر ہے کہ شہ کمال خواہ کیسا ہی ہنرمند نابغہ مانا جائے پر شاعری سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شہ کمال : لیکن۔ لیکن۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ان اشعار کا ایک لفظ میرا نہیں ہے۔ حلاج تم بڑے بدمعاش ہو۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسے اشعار لکھوں۔

علاؤ الدین اور گلیش : مگر یہ شعر تمہی نے تو لکھے ہیں۔

شہ کمال : (آتا ہے) میں کہتا ہوں۔ بس دل لگی کی حد ہو چکی۔ یہ اشعار ہرگز میرے نہیں۔

علاؤ الدین : ہم کہتے ہیں یہ تمہارے ہیں تمہارے۔

شہ کمال : مجھ پر کسی نے جادو تو نہیں کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات! بخدا مجھے یقین ہے کہ یہ اشعار میں نے نہیں لکھے۔

ابن جسیم : اچھا اب دوسرے شاعر کی باری ہے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ پر سلیمان کا نام لکھا ہے۔ سلیمان کون ہیں۔

سلیمان : میں ہوں بندۂ ناچیز سلیمان۔

ماہ سیمیں : مری تخیل نے موہنڈا.....

سلیمان : نہیں۔ نہیں۔ قصور میں نے دیکھا.....

ابن جسیم : بکو مت۔ دل میں پڑھ کیا لکھا ہے۔

ماہ سیمیں: ؎ مری تخئیل نے موہنڈا ہے سر شہباز و شاہیں کا
فرشتے گیت گاتے ہیں مری مقراضی رنگیں کا
مرے دل میں ہزار دل استرے اب تک پر افشاں ہیں
کہ دیکھا ہے تصور میں ہیولیٰ ماہ سیمیں کا

سلیمان: جی ایسے اشعار لکھنے کی سزا میں ہم نے علاج کا گلا نہ کاٹ ڈالا تو دیکھنا، بیٹا کس بھول میں ہو جو صاحبن کے جھانسے میں غوطہ نہ دیا تو میرا نام سلیمان نہیں۔

ابن حسیم: ظاہر ہے کہ ایسے بیہودہ گو، شاعری کے اس معرکے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دوسرے شاعروں کا کلام پڑھو۔

ماہ سیمیں: علاؤ الدین۔

علاؤ الدین: میں اتنا عرض کر دوں کہ میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار کو پورے غور سے پڑھئے گا۔

ماہ سیمیں: بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا

علاؤ الدین: نہیں نہیں یہ نہیں نہیں یہ کہاں، تیرا پیکر سمایا ہے مرے.....

ابن حسیم: کوئی اسے چپ کرائے ہاں بیٹا پڑھو۔

ماہ سیمیں: ؎ بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا
نہ دھوکا کھائیے غیروں کے احساسات رنگیں کا
میں بدصورت سہی بھونڈا سہی بندر سہی لوگو
مگر خوشبو سے جی بہلا ہی لوں گا ماہ سیمیں کا

علاؤ الدین: ہائیں۔

ماہ سیمیں: ابا جان! کہیں اس خوشبو دار بندر سے میری شادی نہ کر دیجئے گا بس اب ایک کا غذ اور رہ گیا ہے گلیش۔

ابن حسیم: گلیش صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا انعام آپ کے حصے میں آئے گا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کے اشعار ان لوگوں سے بھی بڑے ہوں۔ اس لیے انہیں پڑھنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ میں لڑکی آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔

ماہ سیمیں: لیکن ابا جان! یہ بھی دیکھئے کہ یہ شخص بھینگا ہے۔

گلیش: میری التجا ہے کہ آپ میری گھنٹہ بھر کی محنت کو یوں ضائع نہ کر دیں۔

ماہ سیمیں: میں شعر پڑھتی ہوں ؎
زمانہ میں بس اک ریشم ہی ہے سامان تسکیں کا
نہ مجھ کو حرص خوشبو کی نہ لالچ جام شیریں کا
اگر ملتے ہیں میرے ہاتھ تو کیا آپ یوں کیجے
مری ڈاڑھی سے دامن باندھ دیجے ماہ سیمیں کا

گلیش : حلاج! رکھ دے میرے تین دینار یہاں اسی وقت۔
سلیمان : اماں تین دیناروں کے پیچھے مرے کیوں جاتے ہو۔ دیکھتے تو یہ شادی کا معاملہ آخر طے کیونکر ہوتا ہے۔
حلاج : آہ ماہ سیمیں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔
ماہ سیمیں : ان سب نے میری ہنسی اڑائی ہے۔
حلاج : نہیں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں یہ سب کیا دھرا میرا ہے۔
ابن جسیم : تمہارا؟ صاف صاف کہو کیا بات ہے ورنہ آج خیر نہیں تمہاری۔
حلاج : لیجئے ایک اور رباعی جو ابھی پڑھی نہیں گئی۔
ابن جسیم : یہ کس نے کہی ہے؟
حلاج : میں نے!
ابن جسیم : مجھے بتایا گیا ہے کہ تم بے حد مفلس ہو کیا دس دینار تمہارے پاس ہیں!
حلاج : یقیناً! یہ بھی لیجئے اور جو کچھ بھی میرے پاس ہے لے لیجئے میری طاقت میری جوانی، میرا تقدس، میری طبیعت کی جودت اور حسن کی پرستش کا شاعرانہ جذبہ غرض جو کچھ آپ چاہتے ہوں میں پیش کر سکتا ہوں مجھ سے لے لیجئے۔
ابن جسیم : پڑھو۔
ماہ سیمیں : میں اس وقت تک اس کی نظم سنوں گی بھی نہیں جب تک کہ.....
سلیمان : جب تک کہ حلاج خود اسے نہ پڑھے گا۔
ماہ سیمیں : ہاں!
حلاج : کیوں صاحب! شاعر اپنا کلام خود بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔
ابن جسیم : تمہیں اجازت ہے۔
حلاج : ؎

رخ پُر نور کعبہ ہے تری چشم جہاں بیں کا
فلک بس ایک سایہ ہے ترے گیسوئے مشکیں کا

اسے چھو لوں مگر ہاتھوں کو کوثر میں جگو لاؤں
کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامن ماہ سیمیں کا

ماہ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔
سلیمان : نہایت دلفریب، بے حد لطیف ہیں نا علاؤ الدین؟
علاؤ الدین : واقعی پاکیزہ اشعار ہیں۔
ابن جسیم : شکر ہے الٰہی کہ میری امیدیں بر آئیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا ویسا ہی ہوا۔ اب حلاج میرے بیٹے! یہ تحفہ مجھے تم نے اپنی دانائی اور شاعری سے حاصل کیا ہے تمہارے سوا لے ہے۔ خدا کرے کہ تم دونوں، حلاج اور ماہ سیمیں، شاعر اور اس کی بیوی ایسی

محبت میں منسلک رہو کہ جب ہماری حیاتِ مستعار ماضی کی بھولی بسری بات بن جائے تو لوگ یاد رکھیں کہ روپیہ پیسہ بے اصل چیز ہے۔ میں نے دس دینار اس لیے طلب نہ کئے تھے کہ روپیہ انسان کی ہنرمندی اور قابلیت کا معیار ہے ——— میں ان چاندی کے سکوں کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ یہ لو سونے کی تھیلی۔

حلاج : ایک بات مجھے بھی کہہ لینے دیجئے میرے دوستو مجھے معاف کر دو۔ میں نے آپ سب کو دھوکا دیا، میں ابھی اس کی تلافی کئے دیتا ہوں۔ گلیش! یہ سونے سے بھری ہوئی پوری تھیلی تم لے لو، تمہیں اپنی راعی کا معاوضہ مل گیا۔ علاؤالدین! تمہیں ساشی کا ایسا چغہ دیا جائے گا جو اصفہان بھر میں بے نظیر ہوگا۔ شہ کمال! تمہیں شادی کے روز ضیافت دی جائے گی۔ باقی رہا سلیمان، سلیمان کے لیے بھی کوئی اعلیٰ نفیس چیز ہونی چاہیئے۔

سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشئے۔

حلاج : بخشی۔

ماہ سیمیں : اور میں نے بھی۔

(ماخوذ)

ہیلو

جاوید اقبال

(بفرضِ محال اگر اس کھیل کے کردار فرضی نہ ہوں تو ــــ)

منظر

ایک کوٹھی کا ہال کمرہ جس کا سامنے کا دروازہ اور کھڑکیاں باہر ڈیوڑھی کی جانب کھلتی ہیں۔ بایاں دروازہ کھانے کے کمرے کی طرف کھلتا ہے اور اس میں پڑی ہوئی کھانے کی بڑی میز پر پلیٹوں کے چند جوڑے نظر آ رہے ہیں۔ بایاں دروازہ بند ہے جو اس کمرے کو کسی دوسرے کمرے سے ملاتا ہے۔

فرش پر گرد و غبار سے اٹا ہوا قالین بچھا ہے۔ قالین کے ارد گرد ٹوٹے پھوٹے صوفے رکھے ہیں۔ دیواروں پر چند بزرگوں کی ہیبت ناک قسم کی تصویریں ٹنگی ہیں۔ چھت کا پنکھا پوری تیزی سے چل رہا ہے۔ جواد قالین پر بکھرے ہوئے دو تین میلے سے تکیوں میں سے ایک پر سر رکھے، بنیان پہنے تہمد باندھے اونگھ رہا ہے۔ چند رسالے بھی فرش پر منتشر پڑے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو چند لمحوں کے لئے جواد کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باہر تپتی ہوئی دوپہر میں لُو کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ دھول اڑ اڑ کر کھڑکیوں کے رستے کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ معاً سامنے کا دروازہ کھلتا ہے۔ ذکی اور شمیم داخل ہوتے ہیں۔ دونوں بھائی ہیں۔ دونوں نے ایک جیسی سفید اچکنیں پہن رکھی ہیں۔ دونوں شریفوں کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ ذکی دبلا گورا دراز قد ہے۔ شمیم قدرے بھرے جسم کا مگر پست قد ہے۔ ذکی میں نسوانیت سی ہے مگر شمیم نے مونچھیں پال رکھی ہیں۔ ذکی کے جسم میں عورتوں جیسی لچک ہے لیکن شمیم چٹان کی طرح سخت ہے۔ ذکی شدید قسم کا جذباتی نوجوان ہے اس لئے اس کی کرخت جسمانی حرکات اس کے جذبات کے متوازی سرزد

ہوتی ہیں۔ شمیم نسبتاً کم گو اور دھیمی طبیعت کا ہے۔

ذکی :- (جواد کو جھنجھوڑتے ہوئے) ارے ——— ابھی تک یونہی پڑے ہو؟!

جواد :- (جماہی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے) ہیں! ——— ہاں یار، آؤ!! (پھر سو جاتا ہے)

شمیم :- (عجیب انداز میں) جناب کو علم بھی ہے اس وقت کیا بجا ہے؟!

ذکی :- (جواد کو پھر سے جھنجھوڑتے ہوئے) بندۂ خدا پانچ بج چکے ہیں ———

جواد :- (پھر آنکھیں کھولے) ذکی نے دوپہر ڈھل گئی ہے۔

ذکی :- (تنگ آکر) خیر سے آپ کے لئے ابھی دوپہر ہی نہیں ڈھلی؟!

شمیم :- (ذکی سے) قصور ان کا نہیں ہے بھائی۔ اس گھر کی فضا ہی کچھ ایسی ہے کمبخت۔

جواد :- (اسی انداز میں) میاں بیٹھ جاؤ، مجھے کھڑے لوگوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔

شمیم :- (اوپر دیکھ کر) ذرا پنکھے کی ہوا تو کھا لیں۔

ذکی :- (بے قابو ہو کر) توبہ، کس شدت کی گرمی ہے۔

جواد :- (بیزاری سے) یہ اچکن وچکن اتار دو، تم دونوں کی نیکریں ساتھ کے کمرے میں پڑی ہیں، پہن کر لیٹ رہو۔

شمیم :- (بے پروائی سے) پہلے بھائی سے ایک تازہ قصہ تو سن لو ———

جواد :- (گھبرا کر) کیوں ذکی، خیر تو ہے؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) ارے بھئی وہی کمبخت ———

جواد :- (یکدم اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کیا پھر کوئی ٹیلیفون آیا؟!

ذکی :- (تنگ آکر) کیا بتاؤں یار، عجب مصیبت میں جان ہے ——— (آہ بھر کر بیٹھتے ہوئے) ظالم نہ تو پتہ بتاتی ہیں نہ ٹیلیفون کا نمبر ——— بہتیرا سر پٹکا مگر سب بیکار۔ دن میں چار چار مرتبہ فون آتے ہیں۔ ابتدا میں تو کسی کو خبر تک نہ تھی لیکن اب تو اچھا خاصا افسانہ بن گیا ہے گھر بھر کا۔

جواد :- (تعجب سے) وہ کیسے؟!

ذکی :- (افسردگی سے) بس کچھ نہ پوچھو۔ کل میں اتفاق سے ابا کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ شامت اعمال سے چچو میاں قریب تھے۔ فون سنتے ہی دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بھائی" میں نے پوچھا "کہو کیا بات ہے؟!" بولے "بھائی ——— خی خی خی ———" میں نے کہا "میاں اگر کوئی بات بھی تو ہو؟" پھر وہی خی خی خی ——— خیر میں سمجھ گیا تھا۔ اٹھا اور ٹیلی فون کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے جو واپس آتا ہوں تو قبلہ ابرو سکیڑے بڑے غصے میں بیٹھے ہیں۔ پوچھنے لگے "کس کا ٹیلی فون تھا؟" میں نے تمہارا نام لیا تو بولے "کچھ بھی ہو، ہیں چھوٹے بچوں کے ساتھ آپ کی اس قسم کی بے تکلفی کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ حفظ مراتب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟!" اب میری مشکل دیکھو کہ وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔

جواد :- (پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ) بھئی ہاں واقعی !!

شمیم :- (اسی بے پروائی سے) اور وہ چوکیدار صاحب کی بھی تو سنا دو۔

ذکی :- (افسردگی و حقارت سے) ادھر وہ چوکیدار ہیں۔ ایک شام جناب کہیں ٹیلی فون سن بیٹھے۔ گھر کے سب افراد موجود تھے۔ یعنی بڑے ابا بھی۔ تم تو ان کی طبیعت سے واقف ہو ہی ——— ہم ان کے سامنے کبھی ننگے سر بھی نہیں بیٹھتے۔ سو میں اور شمیم دونوں ترکی ٹوپیاں پہنے دو زانو بیٹھے تھے۔ بڑے ابا حسب عادت آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہے تھے لہٰذا ہم سب خاموش تھے کہ میاں چوکیدار آ دھمکے اور لگے بکارنے "ذکی میاں کا ٹیلا پھون ——— " سکوت قائم رہا۔ بڑے ابا بدستور سوچتے رہے۔ میں نے چور نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر چوکیدار سے آہستہ سے پوچھا "بھئی کس کا ہے ؟" آپ اسی انداز میں فرمانے لگے "جی نام وام تو میں جانتا نہیں پر آواز جنانی ہے" یہ سننا تھا کہ میرا دل ٹھنوں میں دھڑکنے لگا۔ بدحواس ہو کے نظریں اٹھاتا ہوں تو بڑے ابا مجھے بری طرح گھور رہے ہیں۔ اللہ ——— تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ یار پہ کیا گزری ہوگی۔

شمیم :- (بیزار ہو کر) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کونسی لڑکیاں ہیں کمبخت ———

ذکی :- (ہنستے ہوئے) بھئی مجھے تو اکثر اس قسم کے فون آتے ہی رہتے ہیں۔

جواد :- (سر کھجاتے ہوئے) مگر یہ تو کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔

ذکی :- (اسی انداز میں) آخر شرارت کس کی ہو سکتی ہے، ہمارا تو کوئی بھی دوست۔

جواد :- (سنجیدگی سے) ممکن ہے عزیز موٹا ہو، مجھے تو بشیر چوہے پر بھی شک ہے ——— !!

شمیم :- (جھلا کر) ارے نہیں بھائی۔ میں نے خود کئی بار گفتگو کی ہے ——— بھلا ہم کسی مرد کی بدلی ہوئی آواز نہیں پہچان سکتے ——— ؟!

ذکی :- (سوچتے ہوئے) ہو تو سکتا ہے۔

شمیم :- (بے پروائی سے) واہ ! آپ نے بھی ایک ہی کہی !!

ذکی :- (حافظہ پر زور دے کر) ٹیلی فون پر بولنے والی تو ایک ہے ———

شمیم :- (کرختگی سے) مگر آپ نے محسوس نہیں کیا عقب میں ہر وقت زعفران زار کھلا رہتا ہے۔ مجھے تو کوئی غول معلوم ہوتا ہے لڑکیوں کا ——— کئی ہیں، شاید آٹھ دس ہوں۔

جواد :- (تعجب و سراسیمگی سے) ارے پر ہم تو تین ہی ہیں۔

ذکی :- (ہنستے ہوئے) تو کیا تم نے بٹوارے کی سوچ رکھی ہے !

جواد :- (بے پروائی سے) میری بلا سے، میں ان باتوں کا قائل ہی کب ہوں۔

شمیم :- (غصے سے) ستم تو یہ ہے کہ وہ ہماری شکلیں تک پہچانتی ہیں، خدا جانے ———

جواد :- (حیرانی سے) کیا انھوں نے تمہارے حلیے تک بتا دئے ؟!

ذکی :- (سنجیدگی سے) ایمان سے ——— ! چند روز ہوئے شمیم نے مونچھیں مونڈی تھیں نا ؟!

جواد :- (تعجب سے) ہاں تو ———

ذکی :- (اسی انداز میں) کہنے لگیں "آپ نے مونچھیں کیوں صاف کرادیں، اب آپ کے تھنے اور بھی کھلے معلوم ہونے لگے ہیں"

جواد :- (شمیم سے) اچھا تو، تو جبھی آپ نے مونچھیں بڑھا دی ہیں ؟!

شمیم :- (سنجیدگی سے) نہیں واللہ، یہ بات نہیں ہے۔ مجھ سے تو بھائی نے کہا تھا۔

ذکی :- (بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ) ایک دن تمھارے متعلق بھی پوچھ رہی تھیں۔

جواد :- (بے قابو ہو کر) کیا، کیا ——— ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) یہی کہ آپ کے دوست کوئی جواد صاحب بھی ہیں ؟!

جواد :- (اسی انداز میں) ہوں، ہوں ———

ذکی :- (بے پروائی سے) ان کے اگلے دونوں دانت باہر کیسے نکلے ہوئے ہیں ؟!

جواد :- (افسردگی سے) اس پر تم نے کیا جواب دیا ؟!

ذکی :- (ہنستے ہوئے) میں نے کہا "چھٹپن میں اماں کی گود سے گر پڑے تھے"

جواد :- (غصے سے) کیا بے ہودگی ہے ——— !

شمیم :- (بے پروائی سے) بھائی سے کہہ رہی تھیں "سنا ہے آپ کو اپنی آنکھوں پر بڑا ناز ہے، ہمیشہ نیم وا رکھتے ہیں"

جواد :- (ذکی سے) تو تم نے کیا کہا ؟!

شمیم :- (اسی انداز میں) بھلا یہ تیلی پر پھولے والا راز کیوں فاش کرتے۔ گول کر گئے ———

جواد :- (تنگ آکر) آخر یہ بدعت کیا ہے ؟!

ذکی :- (تنگ آکر) بھئی میں تو تنگ آگیا ہوں۔ جس میں نکلتا ہوں تو چنو منو سب مجھے دیکھتے ہی دانت نکوسنے لگتے ہیں۔ ادھر چوکیدار صاحب کی "زیر مونچھ مسکراہٹ" دیکھ کر خون علیحدہ کھول اٹھتا ہے۔ بھاڑوں تو بڑے ابا کی خفگی کا احتمال ——— غرض عجب نکو بنا ہوا ہوں۔

جواد :- (حافظہ پر زور دے کر) یہ تھنے، باہر نکلے ہوئے دانت اور . . . . اور شمیم وا ——— میرا تو خیال ہے ہمارا کوئی نہایت ہی قریبی دوست ان لڑکیوں کو جانتا ہے ———

شمیم :- (بے پروائی سے ہنستے ہوئے) ہمارا کوئی دوست، لڑکیوں کا شناسا اور ہمیں خبر تک نہیں۔ بھلا یہاں کسی کے پیٹ میں آج تک کوئی بات بھی پچی ہے ؟!

جواد :- (اسی انداز میں) ممکن ہے ریاض ہو سکتے ہیں اس کی بہت سی لڑکیوں سے شناسائی ہے۔

شمیم :- (حقارت سے) جھک مارتے ہیں جو یہ کہتے ہیں، اس بجو کو کون جانتا ہوگا۔

ذکی :- (جواد سے) اور ہاں، ایک دوپہر اسی قسم کا ٹیلیفون بھائی مختار کو بھی آیا۔ بیچارے اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے

تھے۔ ان کی جلد بازی سے کون واقف نہیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے "تو پھر ملاقات کا کوئی وقت ؟!"

جواد :- (تعجب سے) تو کیا ملاقات ہوئی ؟!

ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) بھائی مختار ابھی دفتر ہی میں تھے کہ ان کے گھر ٹیلیفون ہوا۔ ان کی بیگم بولیں "کون ہے ؟!" آواز آئی "پہلے آپ بتائیے آپ کون ہیں ؟!" انھوں نے کہا "میں بیگم مختار ہوں، فرمائیے ؟!" ادھر سے جواب آیا "اللہ ——— آپ سے تو ملنے کو دل بہت بے قرار تھا۔ بے نصیب نیاز حاصل ہوئے۔ ذری میرا ایک کام کر دیجئے، اپنے ان سے کہہ دیجئے کہ اب جو ہمارے یہاں آئیں تو میرا ریشمی رومال اور عطر کی شیشی نہ بھولیں۔"

جواد :- (خوفزدہ ہو کر) پھر کیا ہوا ؟!

ذکی :- (اسی انداز میں) مختار صاحب جو شام کو خوشی خوشی گھر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم سر پچھاڑ، منہ پھاڑ کے ٹوٹی کھٹولی پر پڑی ہیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی بھابھی صاحبہ نے بچوں کی دھما کٹی شروع کر دی۔ بھائی مختار جو پہنچے تو پنجے جھاڑ ان کے گرد ہو گئیں۔ اب تم ہی سوچو کہ کیا ادھم مچا ہوگا۔ رات ہوتے جب میں ان سے ملنے گیا تو خلافِ معمول بستر پر دراز تھے اور ان کی داہنی آنکھ کے گرد گہرے نیلے رنگ کا حلقہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو جناب نے بھرائی آواز میں ساری کیفیت کہہ سنائی ———

جواد :- (آہ بھر کر) الامان ——— بھئی مجھے تو یہ کوئی چنڈالیں معلوم ہوتی ہیں۔

شمیم :- (بے رخی سے) اجی نہیں، مغرب زدہ ہیں۔ اپنی طرف سے بڑی ظریف طبع بنتی ہیں۔

جواد :- (تعجب سے) مگر یہ کہاں کی ظریف طبعی ہے ؟! (وقفہ کے بعد ذکی سے) آخر تم سے کہتی کیا ہیں ؟!!

ذکی :- (اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے) بھئی قصہ اصل میں یوں ہے کہ پہلے شمیم کو فون آیا کرتے تھے ——— ایک دن میری طلبی ہو گئی اور لگیں انگریزی جھاڑنے۔ ادھر سے جو مسکت جواب ملا تو آگئیں اپنی اصلیت پر اور ایسی ہر بڑائیں کہ اردو بھی غلط سلط بولنی شروع کر دی ———

شمیم :- (جل کر) صاف کیوں نہیں کہتے کہ ایک دن جناب نے میری غیر موجودگی میں انھیں بتا دیا کہ آخر شمیم کا بڑا بھائی ذکی ہے اور وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔

ذکی :- چلو یوں ہی سہی، آخر بڑے بھائی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔

جواد :- (تنگ آکر) یار خدا کے لئے جھگڑا بعد میں پہلے واقعہ تو سن لینے دو۔

ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) تو جناب شمیم صاحب کو پہلے فون آیا کرتے تھے۔ مدت تک حضرت نے ذکر ہی نہ کیا۔ ایک روز جو اتفاق سے میری آنکھ دس بجے کھل گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ صبح صبح شمیم صاحب بیٹھے شیو بنا رہے ہیں۔ پوچھا "کہو بھئی کہاں کی تیاریاں ہیں ؟" بولے "یونہی طبیعت کچھ کرنے کو چاہ رہی ہے۔" میں خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے آپ کھونٹیاں اکھاڑتے رہے اور میں دیکھا کیا۔ ایک بار، دو بار، تین بار، اور خدا جانے کتنی بار صابن لگا۔ دوپہر ہوئی تو جناب غسل خانہ میں گھس گئے۔ چار بجے کے قریب وہاں سے نکلے تو اب کپڑے پہننے شروع کئے۔ چھ بجے

کے قریب آرائستہ پیراستہ ہو ٹانگ لے باہر کی ٹھانی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ پوچھ ہی بیٹھا "بھئی کدھر؟" بڑی بے اعتنائی سے بولے "یونہی ٹہلنے دہلنے"

شمیم :- (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) توبہ، مبالغے کی بھی حد ہوتی ہے!!

ذکی :- (جلتے ہوئے) اچھا تو کیا میں ———

جواد :- (غصہ میں) اماں ٹھہرو بھی ———

ذکی :- کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جناب منہ لٹکائے، اچکن کے سارے بٹن کھولے چلے آ رہے ہیں مجھ سے پھر نہ رہا گیا پوچھا "بھئی یہ پژمردگی کیسی؟" جواب آیا "آج شام سینما کی قرار داد تھی"

جواد :- (شمیم سے) کیوں شمیم؟!

شمیم :- (سنجیدگی سے) بھئی ———

جواد :- (حیرانی سے) پھر ملاقات ہوئی؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) توبہ کرو ———!!

شمیم :- (سنجیدگی سے) اصل میں ———

ذکی :- (حقارت سے) اصل میں کے کیا معنی۔ اچھے خاصے چنگے ہو۔ گھنٹہ بھر سینما کے برآمدے میں قواعد تم نے نہیں تو کیا میں نے کی ہے؟!

جواد :- (تعجب سے) کیا کوئی بھی نہ آیا؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) بھئی میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ انھیں کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔

ذکی :- (نفرت سے) جی ہاں ———

جواد :- (بچوں کی طرح) مگر ذکی سے بات چیت کیا رہی؟!

شمیم :- (سنجیدگی کے ساتھ) بات دراصل یہ ہے کہ میری غیر موجودگی میں بھائی کہیں آن سے گفتگو فرما چکے تھے۔ آج صبح جو میں نے ریسیور اٹھایا تو فرمانے لگیں "کیا ذکیہ آپا۔ یہاں موجود ہیں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "جی نہیں، ذکی بھائی موجود ہیں۔ بولیں" "اچھا تو انھیں ہی بلوا دیجئے، ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے" مجھے بڑا طیش آیا ———

جواد :- (سراہنے سے) یعنی ادھر تو مختار بیچارے کی گت بنوائی اور ادھر تم دونوں بھائیوں میں کشیدگی ———

ذکی :- (سنجیدگی سے) ہاں بالکل ———

شمیم :- میرا ارادہ تھا کہ بھائی کو اطلاع نہ دوں۔ میں نے ان سے تو اچھا کہہ دیا مگر ٹیلیفون بند نہ کیا۔ میرا خیال تھا خود ہی تنگ آ کر چھوڑ جائیں گی۔ اب جو میں باہر جانے کے لئے مڑتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھنٹے والی میز کے نیچے سے ایک ہاتھ آہستہ آہستہ ٹیلیفون کی طرف سرک رہا ہے۔ پل بھر کے لئے بھائی صاحب کا سر نمودار ہوا اور دوسرے

لے سر ٹیلیفون سمیت پھر میز کے نیچے ———

جواد :- (تعجب سے) ارے ذکی ——— ؟!

ذکی :- (کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ) یار یوں اکثر ہو ہی جاتا ہے ———

(باہر کی ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

شمیم :- (حیرانی سے) یہ گھنٹی کون بجا رہا ہے ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) منور ہوگا ———

ذکی :- (بآواز بلند) شاہ صاحب اندر تشریف لے آئیے ———

آواز :- (باہر ہی سے) نہیں بھئی، میں جا رہا ہوں۔

شمیم :- (بآواز بلند) میاں کیا صرف آواز سنانے ہی آئے تھے ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) کہاں جا رہے ہو ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) میں نانی اماں کے ہاں ریڈیو سننے جا رہا ہوں۔ علاوہ اس کے میرے عرب والے ماموں بھی آئے ہوئے ہیں۔

ذکی :- (التجا کرتے ہوئے، بآواز بلند) بھئی ذرا کی ذرا تو دم لے لیتے ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) کہہ جو دیا نہیں ——— میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے زندگی کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کر لیا ہے۔

شمیم :- (گھبرا کر) انا للہ ———

جواد :- (تعجب سے) مگر آج صبح تو تم اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ رجائیت ہی زندگی کا بہترین لائحہ عمل ہے ؟

آواز :- (اسی انداز میں) اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ آج صبح میں تمہارے ہاں آ رہا تھا تو تانگہ میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے مجھ پر غلط انداز ڈال دی تھی۔

ذکی :- (حیرانی سے) اور اب ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) وہ ساتھ والے مکان کی بھٹیارن ہے نا ؟!

شمیم :- (حیرانی سے) کونسی ——— ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) وہی جسے میں کوٹھے کے جھروکے میں سے دیکھا کرتا تھا۔

جواد :- (تنگ آ کر) ہاں ہاں ———

آواز :- (اسی انداز میں) آج دوپہر جب میں کوٹھے پر چڑھا تو جھروکہ بند پایا۔ میں نے منڈیر پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی تو نامراد سامنے بیٹھی تھی، مجھے دیکھتے ہی چیخ اٹھی ——— "آ لینے دے میرے خصم کو، تیرا سر منڈوا کر بھٹکری کی ایسی مالش کراؤں گی کہ ساری کو دن بازی بھول جاؤ گے۔" میں نے بہتیرا کہا "نیک بخت کیوں بدگمانی

ہو رہی ہو، میری نیت بری نہیں تھی، وہ تو اتفاق سے نگاہ پڑ گئی" مگر وہ بولی "چھوٹ کی منڈیر ہے اور آپ کا قد ماشاء اللہ ٹھہرا تین فٹ، بھلا اتفاق سے نگاہ کیونکر پڑ سکتی ہے۔ اب یہ فیصلہ تو میرا گھر والا ہی کرے گا ———

ذکی :- (خوفزدہ ہو کر) پھر ———

آواز :- (اسی انداز میں) میں قنوطی ہو چکا ہوں ———

شمیم :- (بناوٹی تعجب سے) اب قنوطی ہو چکے ہو؟!

آواز :- (اسی انداز میں) ہاں ———

شمیم :- (بے پروائی سے) کتنے گھنٹوں کے لئے؟!

آواز :- (اسی انداز میں) اب میں عمر بھر قنوطی ہی رہوں گا۔

ذکی :- (بے پروائی سے) یہ تو تم ہمیشہ ہی کہا کرتے ہو۔

آواز :- (اسی انداز میں) اب کی مرتبہ ———

جواد :- (اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ٹھہرو تو سہی ———!

آواز (دور سے) نہیں، نہیں ———

(چلا جاتا ہے)

ذکی :- (پژمردگی سے) چلا گیا ———!

شمیم :- (ہنستے ہوئے) خوب آدمی ہے ———

جواد :- (واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) شمیم، تم بتا رہے تھے کہ جس وقت بھائی نے ٹیلیفون پکڑ لیا تو تم ———

شمیم :- (جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجائے) ہاں، تو میں حیران پریشان دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر تک تو کھسر پھسر ہوتی رہی پھر جیسے سروں میں بھائی صاحب نے گانا شروع کر دیا۔

ذکی :- (شرما کر) ارے بھئی ادھر سے غزل کی فرمائش جو ہوئی تھی۔

جواد :- (ہنستے ہوئے) تو پھر تم نے کونسی غزل گائی؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) وہی ؎

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

جواد :- (جھوم کر) سبحان اللہ ——— خوب سماں بندھا ہوگا۔

ذکی :- (افسردگی کے ساتھ) یار، افسوس تو یہ ہے کہ جو بات میں سنجیدگی سے کہوں کمبخت اُسے بھی مذاق سمجھتی ہیں۔

شمیم :- (تنگ آکر) انھیں پوری بات کیوں نہیں سنا دیتے؟!

ذکی :- (جذبات سے بے قابو ہو کر) بس کہنے لگیں "ہائے، کبھی ملئے" میں نے جواب دیا "پہلے میرے برادرِ عزیز

کو تھوڑا سوار کیا ہے۔ جواب مجھ سے ملنے کو کہہ رہی ہیں؟!

جواد :- (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر انھوں نے کیا کہا؟!

ذکی :- (بے مروتی سے) کچھ نہیں، سوائے ہی ہی کے ———

جواد :- (اسی انداز میں) تم کیا بولے؟!

ذکی :- میں نے کہا "مجھے فرصت نہیں ہے" بولیں "آخر آپ سارا دن کیا کرتے رہتے ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "صبح کوئی گیارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کرتا ہوں طبیعت ذرا کسل مندسی ہوتی ہے تو عشقیہ کہانیوں کی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد جو عشقیہ کہانی ادھوری رہ جاتی ہے اسے پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس طرح شام ہو جاتی ہے" کہنے لگیں "پھر شام کو آپ کیا کرتے ہیں؟" میں نے کہا "شام کو بھنگڑ خانے چلا جاتا ہوں"

جواد :- (تعجب سے) بھئی یہ بھنگڑ خانے سے تمھاری کیا مراد تھی؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) یہی، تمھارا گھر ———

جواد :- (حیرانی سے) میرا گھر؟!!

ذکی :- (بے پروائی سے) انھوں نے خود ہی اس کا نام بھنگڑ خانہ رکھا ہوا ہے، انھیں معلوم ہے ہم تمام دوست تمھارے ہاں ہر شام اکٹھے ہوتے ہیں۔

جواد :- (نفرت سے) لاحول ولا قوۃ ——— بڑی بدتمیز لڑکیاں ہیں!!

ذکی :- خیر ——— میں نے پوچھا "آپ سارا دن کیا کرتی ہیں؟" کہنے لگیں "صبح اٹھتی ہوں، ابا جان اور ننھے بھائی صاحب دونوں رونا شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں چپ کراتی ہوں۔ ناشتہ وناشتہ کرا کے اسکول بھیج دیتی ہوں۔ اس کے بعد گھر کی جھاڑو بہارو ہے۔ برتن مانجھنے ہیں۔ روٹی پکانی ہے ——— کہیں دوپہر کو تھک ہار کر اپنے بستر پر سیدھی کرنے کے لیے لیٹتی ہوں تو آپ کو ٹیلیفون کر دیتی ہوں"

جواد :- (خوفزدہ ہو کر) اللہ کی پناہ ——— (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ———

ذکی :- (اسی انداز میں) میں نے جواب دیا "شریف لڑکیوں کو یوں ہی کرنا چاہیے"

جواد :- (دلچسپی لے کر) پھر ——— (پھر نوکر کو پکارتے ہوئے) ارے کوئی ہے؟!

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر وہی خی خی ——— کچھ ملے تو بولنی گذرے پھر بولیں "آپ نے شام و سحر پڑھی ہے؟" میں نے کہا "جی نہیں صبح و شام دیکھی ہے" اس پر ہنسنے لگیں۔ شاعری پر بحث شروع ہوئی۔ بولیں غالب اور اقبال بے حد فضول ہیں ———"

جواد :- (اسی انداز میں) تو تم نے کیا کہا؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) میں نے کہا "چوکیں پڑھیے"

جواد :- (پھر نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ——

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر اصرار کرنے لگیں کہ کہیں ملاقات کیجیے۔

جواد :- (جھلا کر چیختے ہوئے) ارے او دیوان علی ——

ذکی :- (تنگ آکر) بھئی یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ یا تو بات سنو یا اس کمبخت نوکر کو آوازیں دیتے رہو۔

جواد :- (سنبھل کر) اچھا چلو، پھر کیا ہوا ؟!

ذکی :- (مزے لیکر) کہنے لگیں: "آج شام ضرور ملیں گے۔" میں نے کہا "قسم کھائیے"

جواد :- (پھر بآواز بلند) دیوان علی ——

آواز :- (باہر سے) جی صاحب ——

جواد :- (مسکرا کر) بس اس نے سن لیا ہے، کہتے جاؤ!

ذکی :- (اسی انداز میں) میں نے کہا: "قسم کھائیے"

جواد :- (بے پروائی سے) پھر کیا انھوں نے قسم کھائی ؟

ذکی :- (مسکرا کر) سنو تو —— بولیں: "ناشتہ بہت بھاری تھا۔ اب کچھ حلق سے نیچے نہیں اترتا"

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (ہاتھ کے اشارے سے سلام کرکے) جی ——

جواد :- (بے پروائی سے) بھئی میری یہ ٹانگ ذرا قالین پر سے اٹھا کر صوفے پر رکھ دو۔ سو گئی ہے۔ (ذکی سے) ہاں تو پھر ——

ذکی :- (بے پروائی سے) پھر ہنسنے لگیں۔

(نوکر جواد کی ٹانگ قالین پر سے اٹھا کر صوفے پر رکھ دیتا ہے۔ لیکن جب واپس جانے کے لئے مڑتا ہے تو شمیم میاں ایک مگر کچھ ایسی وسیع اور فراخ جماہی لیتے ہیں ——)

جواد :- (نوکر سے مخاطب ہو کر) اور ..... اور یہ شمیم صاحب جماہی لے رہے ہیں، ذرا ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے جانا

—— (نوکر شمیم میاں کے منہ پر ہاتھ رکھتا چلا جاتا ہے) ہاں، تو بھئی ذکی پھر ؟!

ذکی :- (جماہی لے کر) پھر ——!

شمیم :- (انگڑائی لیکر) کچھ غنودگی سی طاری ہو رہی ہے ——

ذکی :- (بے پروائی سے) پھر طے ہو ہی گیا کہ آج شام ضرور ملاقات ہوگی۔

جواد :- (بے قابو ہو کر) نہیں ؟!

ذکی :- (سنجیدگی سے) ایمان سے !!
جواد :- (بے قابو ہو کر) مگر کہاں ؟!
ذکی :- (بے پروائی سے) اُس تو تو ———
جواد :- (اسی انداز میں) نہ نہ، پہلے بتاؤ کہاں۔ کیا میں بھی جا سکتا ہوں ؟!
نعیم :- (ہنستے ہوئے) کیوں نہیں ——— !!
ذکی :- (سرگوشی کے انداز میں) کہنے لگیں "ہم ہیں تو آٹھ دس، اور سب ہی آپ کے دیدار کو ترس رہی ہیں۔ مگر شروع شروع میں صرف دو ہی آئیں گی باقی نسبتاً شرمیلی ہیں" میں نے کہا "کیوں فون کرتے ہوئے انھیں شرم نہیں آتی ؟" بولیں "واہ آپ پھر مذاق کرنے لگے" میں مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ پوچھنے لگیں "ہم آئیں کہاں ؟" میں نے کہا "آپ خود ہی مقام تجویز کر دیجئے، غلام حاضر ہو جائیں گے" بولیں "نہیں جہاں آپ کہیں" میں سوچ میں پڑ گیا۔
جواد :- (جھلاتے ہوئے) ہاں، ہاں ——— تو تم سوچ میں پڑ گئے !!
ذکی :- (اسی انداز میں) پھر میں نے پوچھا "اپنی پہچان تو بتا دیجئے" بولیں "ہم دونوں نے ساڑھیاں باندھ رکھی ہوں گی اور لفٹی سینڈل ———" میں چلایا "خدارا کہیں لفٹی سینڈل پہن کر نہ آئیے گا۔ ہمارے سر پر بال پہلے ہی اکا دکا ہیں" اس پر مزید قہقہے پڑے ———
جواد :- (بے قابو ہو کر) جلد بتاؤ، آخر ٹھہری کیا ؟!
ذکی :- (بے پروائی سے) قصہ مختصر، طے یہ ہوا کہ وہ دونوں ٹھیک چھ بجے سائیکلوں پر سوار ہو کر ———
جواد :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) ہاں، ہاں ———
ذکی :- (اسی انداز میں) تمھارے یہاں پہنچ جائیں گی۔
جواد :- (یکدم افسردہ ہوتے ہوئے) ہائیں ؟!
ذکی :- (بے پروائی سے) تمھارے یہاں ——— کیا ہرج ہے ؟!!
جواد :- (غصے میں آتے ہوئے) عجب نامعقول ہو ———
ذکی :- (گھبرا کر) کیوں ؟!
جواد :- (اسی انداز میں) ان سے یہاں آنے کو کیوں کہا۔ کوئی اور جگہ تجویز کی ہوتی ؟!
نعیم :- (جھلا کر) اور کہاں بیٹھ سکتے تھے یار ؟!
جواد :- (سنجیدگی سے) انھیں میرے ساتھ کم از کم یوں نہ کرنا چاہیے تھا ذکی ——— تم جانتے ہو ہم بچپن سے ساتھ پڑھتے چلے آئے ہیں ———
ذکی :- (تسلی آمیز لہجے میں) بھائی خفا نہ ہو ———

جواد :- (غصے میں چیختے ہوئے) تو اور کیا کروں۔ بھلا یہاں بیٹھنے کی جگہ بھی ہے۔ ایک ہی تو صوفہ ہے۔ کمبخت اور وہ بھی بغیر اسپرنگوں کے ——

شمیم :- (پھیکی ہنسی کے ساتھ) ہوا جو واجان کے وقت کا!!

جواد :- (اسی انداز میں) ایش ٹرے میں سگرٹ بجھانے کی عادت سے سب ناواقف۔ دروازے کے سامنے مجھے ہرے سگرٹوں کے انبار لگے ہیں۔ مکڑیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جہاں چاہیں جالے لگائیں..... یہ..... یہ دھول —— آخر وہ تمہارے متعلق کیا نظریہ قائم کریں گی؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) ہمارے متعلق ان کو کیا نظریہ قائم کرنا ہے؟!

جواد :- (اسی انداز میں) مگر میرے متعلق تو کریں گی۔

ذکی :- (بے پروائی سے) ہوا کیا، انھیں معلوم ہے تمہارا گھر بھگڑ خانہ ہے۔

جواد :- (جل کر) واہ بھئی واہ —— میرا گھر ——

شمیم :- (تسلی دیتے ہوئے) تم بعض اوقات ذرا ذرا سی باتیں محسوس کر لیتے ہو۔

جواد :- (پھر غصے میں آتے ہوئے) ابھی تو میں کہہ رہا تھا کہ میں ان چھوکریوں و کریوں کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہے، ایمان سے مجھے ان سے گھن آتی ہے۔

ذکی :- (گھبرا کر) ابھی یہ وقت بحث کرنے کا نہیں۔ اب تو وہ آیا ہی چاہتی ہوں گی۔

جواد :- (غصے میں) تو میں کیا کروں۔ میں انھیں اسی تھعد اور بنیان میں ملوں گا۔

شمیم :- (گھبرا کر) اللہ یوں نہ ملنا سارا اثر زائل ہو جائے گا۔ بھائی نے ان پر بڑی ہوا باندھ رکھی ہے۔

جواد :- (تعجب سے) ایمان سے؟!

ذکی :- (سنجیدگی سے) بخدا میں نے ان سے کہہ رکھا ہے کہ تم ایف۔ اے میں پڑھتے ہو۔

جواد :- (قدرے دھیمے لہجے میں) مگر یار ذرا سوچو تو سہی، آخر وہ آئیں گی تو چائے کے لئے تو پوچھنا پڑیگا۔ اور میرے پاس تو کل تین ہی پیالیاں ہیں۔ وہ بھی بے جوڑ۔

ذکی :- (بے پروائی سے) تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔

جواد :- (پھر غصے میں آتے ہوئے) میں ان باتوں کی فکر نہ کروں تو اور کون کرے؟!

شمیم :- (سنجیدگی سے گھڑی دیکھ کر) بھائی چھ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

ذکی :- (گھبرا کر) جاؤ جواد، کپڑے بدل آؤ۔ وقت ایمان سے بہت کم ہے۔

جواد :- (اٹھ کر) کیا مصیبت ہے۔ تم نے مجھے آتے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ بھلا اب میں پندرہ منٹ میں کیوں کر تیار ہو سکتا ہوں؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) نہانے دھونے کی ضرورت نہیں، ابھی تم پچھلے مہینے ہی تو نہائے تھے۔ صرف یہ تھعد بدل کر

پتلون پہن آؤ۔

جواد :۔ (جل کر) میں صرف تہمد بدل کر پتلون پہن آؤں اور تم جو صبح ہی سے اچکنیں ڈانٹے، زلفیں سنوارے ——

شمیم :۔ (پھر گھبرا کر) یار وقت ضائع نہ کرو ایمان سے ——

جواد :۔ (بے پروائی سے) اچھا یہ سگرٹوں کے ٹکڑے تو چن لو ——

ذکی :۔ (گھبرا کر اٹھتے ہوئے) تم جاؤ میاں، میں چن دیتا ہوں۔

(ذکی دہلیز میں پڑے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے چننے لگتا ہے)

جواد :۔ (شمیم سے) شمیم، ذرا اس صوفہ کو پکڑو ——— (شمیم اٹھ کر صوفہ کو پکڑتا ہے) ادھر سے نہیں، وہاں سے ——

(جواد دوسری طرف سے خود پکڑ کر اٹھاتا ہے)

شمیم :۔ (زور لگا کر اٹھاتے ہوئے) ہاں ——

جواد :۔ (صوفہ کو ایک طرف لے جا کر) اور اٹھاؤ ——— لے ..... لے ..... ادھر رکھو، ہاں ——— (صوفہ رکھ دیتے ہیں۔ شمیم اسی صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے) ——— (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ——!!

شمیم :۔ (تنگ آ کر) اب اس سے کیا کہنا ہے؟!

جواد :۔ ابھی جالے اتار دے گا۔ (مسرت سے) قالین پر اگر ایک تانتہ برش کا پڑ جائے تو چمک اٹھے ———

ذکی :۔ (سگریٹ باہر پھینکتے ہوئے) اتنا وقت نہیں جواد خدارا ———

جواد :۔ (چیخ کر نوکر کو پکارتے ہوئے) ابے او دیوان علی ——!! (تہمد کے پلڑے سے سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے)

آواز :۔ (باہر ہی سے) جی صاحب؟!!

جواد :۔ (ذکی سے) لو میں جاتا ہوں۔

شمیم :۔ (جھلا کر) اب جا بھی چکو یار ———

جواد :۔ (اٹھا کرتے ہوئے) ذرا یہ سگریٹ ختم کر لوں ——— (زور زور سے کش لگاتا ہے)

ذکی :۔ (اسے کندھوں سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے) نہیں، نہیں ———

جواد :۔ (پھر رکتے ہوئے) کرو ایمان سے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی پہلوان کا اکھاڑہ ہو۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :۔ (بآواز بلند) جی کہیے ——؟!

شمیم :۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) ارے آہستہ بولا کرو، تم سے کئی بار کہا ہے ——

جواد :۔ (بے پروائی سے کش لگا کر) یہ تکیے اٹھا کر لے جاؤ۔

(نوکر تکیے اٹھا کر ملحقہ کمرے کی طرف مڑتا ہے)

شمیم :۔ (تنگ آ کر) بس اب تم جاؤ گے بھی یا نہیں ———

جواد :- (بغیر سنے) دیوان علی ——— یہ کھانے کے کمرے کا دروازہ بھیڑتے جانا۔

(ذکی بغیر جواب دیئے چلا جاتا ہے)

ذکی :- (آہ بھر کر بیٹھتے ہوئے) خدا کے لئے اب جاؤ بھی ———

جواد :- (تعجب و سراسیمگی سے) پر ..... پر ..... یا ——— ؟!

شمیم :- کیوں اب کیا ہے ؟!

جواد :- (اسی انداز میں) آتو وہ جائیں گی، مگر ان سے بات کیونکر شروع کی جائے گی ؟!

ذکی :- (کچھ سوچ کر) تم گفتگو کرنا ——— ہم دونوں خاموش رہیں گے۔

جواد :- (بچوں کی طرح) میں کیوں بولوں ؟!

شمیم :- گھر جو تمہارا ہے (نیچے بکھرے ہوئے رسالوں میں سے ایک اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے)

جواد :- (جل کر) یہ خوب رہی۔ معاشقے تم کرو اور ترجمانی کریں ہم۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں جوئی کی چت پٹ ہو جائے۔

ذکی :- (گھبرا کر) بھئی اس کا وقت نہیں ہے۔

جواد :- (سنجیدگی سے) پھر کوئی راہ تو نکالو۔

ذکی :- (بے پروائی سے) تم جاؤ، کپڑے بدلتے وقت سوچنا، اور ہم یہاں سوچتے ہیں۔

جواد :- (شمیم کو رسالہ پڑھتے دیکھ کر چڑتے ہوئے) شمیم بھئی، یہ کیا بات ہوئی یہ کوئی رسالے پڑھنے کا وقت ہے ؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) ایک مضمون اتفاق سے مطلب کا آ گیا ہے۔ شاید اسی سے مشکل حل ہو جائے۔

ذکی :- (تعجب سے) کیا عنوان ہے ؟!

شمیم :- (بغیر نظریں اٹھائے) "لڑکیوں کو مرعوب کرنے کا مجرب طریقہ"

جواد :- (خوش ہو کر) ضرور پڑھو، ممکن ہے کوئی کام کی بات نکل آئے۔

ذکی :- (تنگ آ کر) اب تک بھی چکو، یا چھ بجے بجاؤ گے۔ میں تو کہتا ہوں صرف نہ بدل آؤ۔

جواد :- (جاتے ہوئے) لو بھئی جاتا ہوں ———

(کچھ دیر سکوت رہتا ہے۔ پھر غسلخانے سے جواد کی آواز گونجتی ہے ——— "دیوان علی ——— ابے او دیوان علی صابن تو دے جاؤ ——— ")

ذکی :- (بے بسی سے) جناب ابھی صابن ہی منگوا رہے ہیں (پھر بآواز بلند) ارے میاں غسلخانے سے نکلو بھی ——— (وقفہ) کیوں شمیم، کچھ ملا ——— ؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) اوں ہوں! ابھی تو کمنٹ یہی لکھ دیا ہے کہ بڑے بڑے جری اور دلیر آدمی کیونکر لڑکیوں کے سامنے زبان بندی کے عارضے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ذکی :- (بے پروائی سے) خیر ———

(جواد داخل ہوتا ہے۔ اس نے اب تھدی کی جائے تولیہ باندھ رکھا ہے)

جواد :- (بال جھٹکتے ہوئے) کہو بھئی ——— ؟!

ذکی :- (تعجب سے) ابھی تک تولیہ باندھے پھر رہے ہو؟ (التجا کرتے ہوئے) للہ کپڑے بدل آؤ۔

جواد :- (جاتے ہوئے) اچھا ———

(چلا جاتا ہے)

ذکی :- (وقفہ کے بعد) شمیم میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔

شمیم :- (بے پروائی سے لگاتار پڑھتے ہوئے) ہوں ———

ذکی :- کہ شرم کو بالکل پاس نہ آنے دیا جائے۔ جو کہنا ہے آپ بیدھڑک کہہ ڈالو۔

شمیم :- (جھلا کر) پر کوئی ڈھنگ کی بات بھی تو ہو۔

ذکی :- (بے بسی سے) یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا تو اسی مضمون میں دیکھو ——— (پھر آواز بلند) کیوں جواد! فارغ ہو گئے؟

آواز :- (ساتھ کے کمرے سے) بس آیا کپڑے بدل رہا ہوں ———

ذکی :- (اسی انداز میں) خدا کے لئے مانگ پٹی زیادہ نہ کرنا۔

آواز :- (بے پروائی سے) نہیں یار، مجھے تو پتلون پہننا بھی عذاب معلوم ہو رہا ہے، تم کہتے ہو مانگ پٹی نہ کرنا۔ آخر کسی نووارد سے ملنا ہو تو کم از کم کپڑے تو قاعدے کے ہوں۔ اور ویسے تو تم جانتے ہو کہ مجھے ان چھوکریوں وکریوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایماں سے سب تمھارے لئے کر رہا ہوں۔

ذکی :- (ہنستے ہوئے) لے میاں، یہ ہم پر پارسائی کا رعب ——— (دور کہیں گھڑیال چھ بجاتا ہے) ہائے ——— (بے قابو ہو کر) جلدی کرو، یہاں تو رعشہ طاری ہو رہا ہے۔

(جواد کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس نے کپڑے بدل لئے ہیں)

جواد :- (بے پروائی سے) لو بھئی میں تو تیار ہو گیا ——— (وقفہ شمیم سے) کیوں شمیم؟!

شمیم :- (بغیر نظریں اٹھائے) ابھی تو دیکھ ہی رہا ہوں۔

جواد :- (سنجیدگی سے) جلد جلد پڑھو میاں ——— (وقفہ) بھئی مجھے اس کمرے کی ہیئت چھوٹی آنکھ نہیں بھاتی ——— ذرا روشندان کھول کر دیکھنا چاہیئے۔ شاید فرق پڑ جائے۔

ذکی :- (بے پروائی سے) نہیں یار یہ وقت ———

جواد :- (چھت کی طرف دیکھ کر) سفیدی ادھر سے ———

شمیم :- (یکدم) لو بھئی مل گیا ——— !!

جواد :- (تعجب سے) کیا ؟!
شمیم :- (مسرت سے) "طریقہ" کمبخت نے آخر بھی دیا ہے۔
ذکی :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) پڑھو، پڑھو ———
شمیم :- (گلدستہ صاف کر کے) لکھا ہے ———
جواد :- (بے قابو ہو کر) بولو بھی ؟!
شمیم :- (سنجیدگی سے) لکھا ہے "خواتین سے ملتے وقت اس امر کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جب ——— "
ذکی :- (بے قابو ہو کر) ہاں ہاں ———؟!
شمیم :- (اسی انداز میں) "کہ جب وہ کمرے میں داخل ہونے لگیں تو مرد تعظیماً اٹھ کھڑے ہوں اور اتنی دیر ——— "
جواد :- (بے صبر ہو کر) کیا کریں ؟!
شمیم :- (جاری رکھتے ہوئے) "کھڑے رہیں جب تک کہ خواتین بیٹھ نہ جائیں ——— "
جواد :- (مسرت سے) سبحان اللہ ——— بھئی کیا پتے کی بات کہی ہے ———
شمیم :- (پھر پڑھتے ہوئے) "گفتگو کی ابتدا"
ذکی :- (بے صبر ہو کر) ہوں، ہوں ؟!
شمیم :- (اسی انداز میں) "یوں ہونی چاہیئے ——— "
جواد :- (بے صبری سے) کیونکر ؟!

(شمیم خاموش رہتا ہے)

ذکی :- (بے صبری سے) ہاں بولو بھی ؟!
شمیم :- (پڑھ رہا ہے) آگے بریکٹوں میں لکھا ہے "باقی آئندہ ——— "
جواد :- (جھلا کر) لعنۃ اللہ ———

(باہر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے)

ذکی :- (گھبرا کر) ارے یہ آواز کیسی ہے ؟!
شمیم :- (کھڑکی کی طرف دیکھ کر) تانگہ معلوم ہوتا ہے۔
جواد :- (تعجب سے) تانگہ ! ——— (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) ٹھہرو میں کھڑکی میں سے دیکھتا ہوں۔
ذکی :- (گھبراہٹ سے) کون ہے ؟!
شمیم :- (سہم کر) کہیں ارزانی بنگلا نہ آ گیا ہو ———
جواد :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) دو لڑکیاں اتری ہیں ———
شمیم :- (بے قابو ہو کر) ہائیں لڑکیاں ؟! (ذکی سے) لو بھئی آ گئیں ———

ذکی :- (اٹھتے ہوئے) مگر انہوں نے تو کہا تھا کہ ہم سائیکلوں پر آئیں گی ؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) سائیکلیں پنکچر بھی تو ہو سکتی ہیں۔

جواد :- (لگاتار جھانکتے ہوئے) دیوان علی سے کچھ پوچھ رہی ہیں۔ اُن میں سے ایک نے دوسری کے کندھے کا سہارا لے رکھا ہے۔ بیمار معلوم ہوتی ہے ———

ذکی :- (کھڑکی کی طرف آتے ہوئے) تم نہیں سمجھتے جواد ——— بڑی چالاک ہیں، اب کوئی نیا ڈھونگ رچایا ہوگا۔

شمیم :- (وہیں بیٹھے ہوئے) شرارت تو ان کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

جواد :- (یکدم گھبرا کر) ارے، وہ تو ادھر ہی آ رہی ہیں۔

شمیم :- (گھبرا کر) نہیں ———؟!

جواد :- (بغیر اس کی طرف دیکھے) ایمان سے ———!!

ذکی :- (مسرت سے اچھلتے ہوئے) لے ہے ——— خاصی اچھی ہیں ہیں تو بھلا یوں ہی ہوں گی۔

جواد :- (سنجیدگی سے) کود کر پڑے رت لگاؤ یار، قالین سے گرد اڑنی شروع ہو گئی ہے۔

شمیم :- (کھڑکی کی طرف آ کر جھانکتے ہوئے) بخدا وہی ہیں ———

جواد :- (گھبرا کر) شمیم تم اپنے نتھنے چھپانے کے لئے ناک پہ رومال رکھ لو۔ ذکی اپنی آنکھیں نیم وا کر لو ———

ذکی :- (جواد سے) یار تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارا منہ بلا ضرورت نہ کھلے۔

شمیم :- پھر جھانک کر) دیکھو بھائی، ایک نے کس طرح سہارا لے رکھا ہے جیسے بیمار ہی تو ہے۔

ذکی :- (سنجیدگی سے) ابھی تم دیکھتا تو سہی، آتے ہی کوئی اور سوانگ بھریں گی۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (بآواز بلند) میاں صاحب !!

شمیم :- (کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر) ارے آہستہ بولا کرو۔ تم سے کئی بار کہا ہے۔

جواد :- (نوکر سے) کیوں کیا بات ہے ؟!

نوکر :- (دھیمے لہجے میں) عورتیں ہیں ———

جواد :- (غصے سے) تو کیا ہوا ؟!

نوکر :- (اسی انداز میں) کسی ڈاکٹر ڈاکٹر کا پوچھ رہی ہیں۔

شمیم :- (ذکی سے) لو صاحب دیکھ لیا ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) میاں انہیں اندر بھیجدو۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔

نوکر :- (اسی انداز میں) بہتر ———

(چلا جاتا ہے)

ذکی :- (تعجب و سراسیمگی سے) خدا کی قسم یہ لڑکیاں تو بلا کی شریر ہیں۔
جواد :- (بے بسی سے) بھئی میں تو انھیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔
شمیم :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) لو آ رہی ہیں ———
جواد :- (یکدم بھاگ کر صوفہ پر بیٹھتے ہوئے) بس اب خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔
شمیم :- (کھڑکی سے ہٹ کر فرش پر بیٹھتے ہوئے) فکر نہ کرو ———
ذکی :- (وقفے کے بعد) تمھارے کان ہل رہے ہیں جواد ———
جواد :- (بے بسی سے) بھئی میں کیا کروں، میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ گھبراہٹ میں کمبخت خود بخود ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔
شمیم :- (جذبات سے بے قابو ہو کر) توبہ ———
ذکی :- (صوفے پر گرتے ہوئے) میرا تو دل دھڑک رہا ہے۔

(دو لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ دونوں قبول صورت ہیں)

پہلی :- (جھجک کر دروازہ کھولتے ہوئے) ہم اندر آ سکتی ہیں؟!
جواد :- (صوفے سے فرش پر بیٹھتے ہوئے) بڑے شوق سے!!
پہلی :- (دوسری کو صوفے پر بٹھا کر خود بھی بیٹھتے ہوئے) کیا ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں؟!
جواد :- (مسرت سے) آپ ذرا بیٹھ تو جیئے ———
ذکی :- (شمیم کے کان میں) جواد اچھا چل رہا ہے ———
شمیم :- (بے پروائی سے) ہاں ———
دوسری :- (بیمار لہجے میں) آپا ——— آہ ——— میرا بدن تو بخار سے پھنکا جا رہا ہے۔
پہلی :- (تسلی آمیز لہجے میں) ہمت کرو ——— (پھر جواد سے) کیا ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود نہیں؟!
جواد :- (ہنستے ہوئے) جی، ہم انہی کا انتظار کر رہے ہیں۔
پہلی :- (آہ بھر کر) آپ سب گویا کہ مریض ———
جواد :- (گھبرا کر) جی ... جی ہاں ———!!

(کچھ دیر کے لئے سکوت رہتا ہے)

ذکی :- (گاتے ہوئے) ؎ آج کی رات ساز دل پر درد نہ چھیڑ
پہلی :- (جھلا کر) خدا را گانا بند کیجئے ——— میری بہن کو بھونڈی آوازوں سے خفقان شروع ہو جاتا ہے۔
دوسری :- (پہلی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے مرتعش لہجے میں) آپا ———
ذکی :- (تعجب سے) مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سائیکلوں پر آئیں گی؟!
پہلی :- (نفرت و حقارت سے) کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، ہم سائیکلوں پر کس طرح آ سکتی تھیں؟!

ذکی :- (مسرت کا اظہار کرتے ہوئے) ساڑھیاں تو آپ پہن آئیں - یہ پھٹی سینڈل کیوں ——— ؟ (افسردگی سے) میں نے عرض کیا تھا کہ ———

پہلی :- (حقارت سے) بکئے مت ——— !!

دوسری :- (بیمار لہجے میں) آپا، ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے ؟ مجھ سے تو اب بیٹھا ———

شمیم :- (جواد کے کان میں) بھئی بڑی شیطان ہے واللہ - ذرا قریب تو دیکھو ———

ذکی :- (صوفے کے قریب ہو کر) اچھا اب مذاق چھوڑیئے - سچ بتائیے آپ ہمیں ٹیلیفون کیوں کرتی ہیں ؟ !

پہلی :- (نفرت سے) آپ نے بھنگ تو نہیں پی ہے ؟ !

ذکی :- (تنگ آکر) تو کیا بھنگڑ خانے میں شربت بزوری پیتے ہیں ؟

دوسری :- (تنگ آکر) یہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں آپا ——— !!

پہلی :- (بے پروائی سے) میں سب سمجھتی ہوں، بکنے دو ———

جواد :- (آگے بڑھ کر) دیکھئے نا ——— مجھے کم بولنے کی عادت ہے، مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے بہت سی لڑکیاں دلچسپی لیتی ہیں -

ذکی :- (بے قابو ہو کر) یعنی سمجھ لیجئے، کئی گوری لڑکیاں ہمارے صدر دروازے کے سامنے چارپائیاں بچھائے حقہ پیتی رہتی ہیں ——— (ہچکچا کر) لے ..... سے ..... کیا آپ حقہ پئیں گی ؟ !

پہلی :- (جھلا کر) آپ کو شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے ؟ !

ذکی :- (اسی انداز میں) اجی بات یہ ہے کہ مجھے خود اسی کا انتظار ہے - آتی ہی ہوگی -

پہلی :- (غرور سے) آپ دیکھ نہیں رہے ہیں نے عینک لگا رکھی ہے ؟ !

شمیم :- (بے پروائی سے) تو کیا ہوا ؟ !

پہلی :- (سنجیدگی سے) یعنی یہ کہ میں پڑھی لکھی ہوں، کوئی ———

جواد :- (ہنستے ہوئے) چہ خوب !!

پہلی :- (جواد کی طرف مڑ کر) کیا فرمایا آپ نے ؟ !

دوسری :- (بیمار لہجے میں) آپا، تینوں دیوانے ہیں - ان کے منہ نہ لگو ———

ذکی :- (عالمانہ انداز میں) خاکسار کو علم ہے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں - آپ نے "شام و سحر" اور "آہ و واہ" دونوں پڑھی ہیں - غالب کی شرح پڑھی ہے اور اقبال کی شاعری آپ کو پسند نہیں ———

جواد :- (ہنستے ہوئے) مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی شاعری آپ کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ہے - اس کے اشعار عورتوں کے لئے نہیں ہیں -

پہلی :- (جل کر) اور کن کے لئے ہیں ؟ !

جواد :- (عجیب طالمانہ شان سے) ہم جیسے عالموں کے لئے ———

پہلی :- (حقارت سے) اللہ کی شان ———

جواد :- (پھر ہنستے ہوئے) میں درست کہہ رہا ہوں۔ ایک عورت بھلا صوفیوں کی منازل کے متعلق کیا واقفیت رکھ سکتی ہے آپ جانتی ہیں فنا فی الشیخ کی منزل کیا ہوتی ہے ؟!

پہلی :- (حقارت سے) جی نہیں ——— آپ ہی وضاحت کر دیجئے۔

جواد :- (گھبرا کر) یعنی دیکھئے نا ——— آہ ——— فنا فی الشیخ کی منزل گویا کہ بڑی ہی دلچسپ منزل ہے اور اس کی پیچیدگیاں یعنی میں کیا عرض کروں، بہت ہی پیچیدہ ہیں ——— غالباً آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ویسے میں آپ کی معلومات کے لئے کہہ دوں کہ زندگی فانی ہے، اسی لئے میں گرمیوں میں دوپہر کے وقت لحاف اوڑھ کر سوتا ہوں۔ آپ نے کبھی عمرو بن کلثوم کے اشعار پڑھے ہیں ——— آہا ——— کیا پُر مغز باتیں کہتا ہے۔

ذکی :- (شمیم کے کان میں) کیوں نہ ہو، آخر ایف اے میں پڑھتا ہے۔

جواد :- (جاری رکھتے ہوئے) اب آپ پوچھیں گی کہ شمیم صاحب نے ناک پر رومال کیوں رکھا ہوا ہے، میں کہوں گا انہیں دائمی نزلہ ہے۔ آپ پوچھیں گی ذکی صاحب کی آنکھیں نیم وا کیوں ہیں۔ میں کہوں گا یہ رات کو خواب میں اکثر ڈر جاتے ہیں۔ آپ پوچھیں گی میں کم کیوں بولتا ہوں۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ میرے دادا مجذوب تھے کیا کبھی آپ نے آسمان پر کوؤں کو اڑتے دیکھا ہے ؟!

پہلی :- (بے پروائی سے) جی نہیں ———

جواد :- (بے بسی سے) پھر آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ چاکلیٹ کا مزا کیسا ہوتا ہے !!

پہلی :- (دوسری سے) تم سچ کہہ رہی تھیں ساجدہ !!

ذکی :- (تعجب سے) ارے آپ کا نام ساجدہ ہے ؟!

دوسری :- (گھبرا کر) جی ہاں ———

ذکی :- (پہلی سے) پھر آپ پروین ہوں گی ؟!

پہلی :- (تعجب سے) جی ؟!

شمیم :- (مزے لے کر) نسیم ہوں گی ——— !!

پہلی :- (تنگ آ کر) براہ مہربانی ———

جواد :- (مزے لیکر) نہیں بھئی عارفہ ہوں گی ——— !!

پہلی :- (حقارت سے) میں کہتی ہوں کان مت کھائیے ———

(باہر کی ڈیوڑھی سے سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

دوسری :- (قدرے لہجے میں) ک..... کیا ڈاکٹر صاحب آگئے ؟!

شمیم :- (گھبرا کر) توبہ ہے، منوّر ———

ذکی :- (حقارت سے) پھر آگیا کمبخت ؟!

جواد :- (گھبرا کر) کہیں اس نے اپنا نظریہ نہ بدل لیا ہو۔

آواز :- (باہر ہی سے) بھئی ———

ذکی :- (بآواز بلند) کہو ؟!

آواز :- (باہر ہی سے) میں نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔

شمیم :- (بے پروائی سے) بڑی دیر لگائی یار !!

ذکی :- (پیچھا چھڑاتے ہوئے) اچھا تم جاؤ، ہم کل سن لیں گے ———

آواز :- (باہر ہی سے) میں ابھی سنائے دیتا ہوں، مجھے جلدی نہیں ہے۔

جواد :- (بے بسی سے) توبہ ہے بھئی ———

آواز :- (باہر ہی سے) میں نانی اماں کے ہاں جا رہا تھا۔ دریا کے قریب پہنچا تو مجھے ایک دوست مل گیا (فاتحانہ انداز میں) وہ قد میں مجھ سے بھی ایک فٹ چھوٹا ہے ———

شمیم :- (بے پروائی سے) ہوگا ———

آواز :- (باہر ہی سے) اس کے ساتھ ایک سات فٹ کی لڑکی تھی۔ اس کے گھٹنے سے سر لگائے وہ کہہ رہا تھا۔ جانم میں زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ اگر تم نے مجھ پر ترس نہ کھایا تو میں دریا میں کود پڑوں گا ———"

ذکی :- (تعجب سے) کہو بھئی کہیں یہ تمھارا تیرا دوست افتخار تو نہیں ؟!

آواز :- (باہر ہی سے) ہاں وہی ——— تو وہ بیچاری جذبۂ کرم سے متاثر ہو کے آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور اسے گود میں اٹھا کر ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

شمیم :- (تعجب سے) اماں نہیں ——— ؟!

آواز :- (باہر ہی سے) قسم ہے اللہ پاک کی ——— سو اب میں باغی ہو گیا ہوں ——— میں نے قنوطیت کے خلاف بغاوت کر دی ہے ——— ایمان سے کہتا ہوں میں باغی ہوں ———

جواد :- (ڈرتے ڈرتے) آہستہ بولو یار کوئی پکڑ لے گا !!

آواز :- (باہر ہی سے) میں باغی ہوں ——— میں باغی ہوں ——— میں باغی ہوں ———

(چلا جاتا ہے)

پہلی :- (نفرت سے پوچھتے ہوئے) یہ ٹھگنے صاحب کی تعریف ؟!

جواد :- (مسرت سے) ہمارے ایک دوست ہیں۔

شمیم :- (بے پروائی سے) فلسفہ کے طالب علم ہیں ———

ذکی :- (سنجیدگی سے) پرنٹ بال بہت اچھا کھیلتے ہیں۔

دوسری :- (تنگ آکر) آپا میری تو طبیعت گھبرا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کس وقت آئیں گے ؟!

پہلی :- (جواد سے ترشی سے) بتائیے ڈاکٹر صاحب کہاں گئے ہیں ؟!

ذکی :- (التجا کرتے ہوئے) ایمان سے مذاق چھوڑیئے، کسی وقت سنجیدہ بھی ہو جایا کیجئے ———

پہلی :- (غصہ سے) میں کہتی ہوں آپ ———

ذکی :- (بغیر دھیان دیئے) اللہ قسم آپکے ٹیلیفونوں نے میری بڑی گت بنائی ہے۔ آپ محلے کی نزاکت کو ابھی تک سمجھی نہیں سب چھوٹے بڑے مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

پہلی :- (غصہ سے) آپ مجھے بتائیں گے یا نہیں !!

شمیم :- (جواد کے کان میں) بتا دی ہیں !!

جواد :- (شمیم کے کان میں) بھئی کمبخت بڑی ———

ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) ابھی تو چچا میاں موجود نہیں تھے۔ وہ پچھلے مہینے سے شکار پر گئے ہوئے ہیں ورنہ ———

جواد :- (یک دم بے قابو ہو کر) اخاہ ——— شکار ؟! کیا بات ہے شکار کی ——— (آہستہ سے شمیم کے کان میں) مجھے کسی نے بتایا ہے کہ لڑکیوں سے اگر شکار کی باتیں کی جائیں تو ہنس جاتی ہیں ———

پہلی :- (جھلا کر) میں کہتی ہوں ———

جواد :- (بغیر رکے) شکار ——— کبھی آپنے شیر کا شکار کیا ہے ؟!

پہلی :- (منت کرتے ہوئے) خدا کے لئے آپ خاموش رہیئے ———

جواد :- (اسی انداز میں) شیر کا شکار ——— یعنی ایک مرتبہ میں تنہا سی، پی کے جنگلوں میں شیر کے شکار کو نکل گیا۔

شمیم :- (جواد کے کان میں) ارے ریاض کے سنائے ہوئے قصے اپنے ساتھ ٹانک رہے ہو ؟!

جواد :- (شمیم کے کان میں) چلنے دو، ہاں تو ———

ذکی :- (سنجیدگی سے) ایمان سے آپ ہیں بھی نہیں ——— ہم میں سے کوئی بھی پاگل نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلا ———

پہلی :- (تنگ آکر) وہ تو ظاہر ہی ہے۔

جواد :- تو جناب ایک دفعہ میں اتفاق سے اکیلا جنگل میں نکل گیا۔ جنگل میں بڑی چہل پہل تھی۔ گیدڑ مختلف جگہوں پر خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ بندر، بھینے، ہاتھی، بھینسے سبھی جھولا جھول رہے تھے۔ ایک طرف دو مڑیاں شلواریں پہنے پھر رہی تھیں۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لگڑ بگڑ سے پوچھا: کہو بھئی، بات کیا ہے ؟ بڑی رونقیں ہیں ؟ بڑے تعجب سے بولا۔ کیا آپ کو خبر نہیں، ہمارے حضرت بادشاہ سلامت شہنشاہ شیر بیر کے ہاں اس ضعیفی کی عمر میں بڑی منتوں اور آرزوؤں

کے بعد ولی عہد پیدا ہوا ہے"۔ میں آگے نکل گیا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے مسند پر سفید براق چاندنی کا فرش بچھا ہے اور شیر صاحب گاؤ تکیہ کا سہارا لئے، عینک لگائے، رباعیات عمر خیام پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے بڑے تپاک سے ملے۔ اور اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا۔ ہاتھ دانتہ دھلوانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں پوچھنے لگے "آپ کی بندوق کس بور کی ہے؟" میں نے عرض کیا کہ بیس بارہ بور کی ہے کہنے لگے "اس سے تو صرف بٹیروں کا شکار ہو سکتا ہے آپ یہاں کس ارادے سے آئے ہیں؟" میں نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ بولے "کہو" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ آپ کے شکار کی خاطر وہ نہایت سنجیدگی سے اٹھے۔ میرا ہاتھ پکڑا اور قریب کے تیے میں لے گئے۔ پھر اپنی چھاتی پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہنے لگے "جان حاضر ہے، شست باندھیے" میں بہت نادم ہوا۔ ان کے قدموں پر گر پڑا اور رونے چیخنے لگا۔ واللہ اس عالم خلائی کی قسم کا شیر ہرآج تک نہ دیکھا نہ سنا! پھر ———

دوسری :- (بے قابو ہو کر) آپا، انھیں چپ کراؤ۔ ان کی بکواس اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔

پہلی :- (بے بسی سے) خدارا ڈاکٹر صاحب ———

ذکی :- (آگے بڑھ کر) پہلے آپ بتائیے، آپ نے ٹیلیفون پر ملنے کو کہا تھا یا نہیں؟!

پہلی :- (ہار کر) چلو کہا تھا مگر ———

ذکی :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) اخاہ، مان گئیں۔

شمیم :- (مزے لے کر) سبحان اللہ ———

ذکی :- (ہاتھ جوڑ کر) ایمان سے میں زندگی سے بالکل بیزار ہوں۔

پہلی :- (بھرائی ہوئی آواز میں) تو پھر ہم کیا کریں؟!

جواد :- (فتنی آمیز لہجے میں) تجاہل، تغافل تو ہو چکا ——— اب بھی تم حکم اور کیا ———

دوسری :- (پہلی کے کان میں) آپا میرا تو خیال ہے یہیں غلطی ہوئی ہے۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں) غلطی؟! وہ کیونکر ———؟!

دوسری :- (کھانے کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھ کر) یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر معلوم نہیں ہوتا۔

شمیم :- (جواد کے کان میں) ارے جواد ——— خدا کی قسم وہ کھانے والے کمرے کی جانب دیکھ رہی ہیں۔

جواد :- (دانت پیستے ہوئے) میں نے اس بدبخت دلوان علی سے کہا بھی تھا کہ دروازہ بھیڑتے جانا۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں) ڈاکٹر صاحب کا گھر نہیں؟! وہ کیسے؟!

دوسری :- (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو نا، سامنے کھانے کی میز پر بوٹ رکھے ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی بورڈنگ ہاؤس معلوم ہوتا ہے۔

پہلی :- (جواد سے غصے میں) کیوں صاحب، کیا یہ بورڈنگ ہاؤس ہے؟!

جواد :- (پتھر کی طرح) جی نہیں ——— یہاں تو لڑکے رہتے ہیں۔

دوسری :- (چیخ کر) اوئی میرے اللہ ——— کہاں آ پھنسی ———

پہلی :- (جرأت سے) میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا یہ ڈاکٹر ظہیر الدین کا گھر نہیں ہے ؟!

ذکی :- (لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے) کون سے ظہیر الدین ؟!

شمیم :- (سر کھجاتے ہوئے) اپنے وہی بابر تو نہیں ؟!

ذکی :- (تعجب سے) کون سے بابر، بائیں ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) اماں وہی ہمایوں کے ابا ———!

پہلی :- (اسی انداز میں) اس گھر کا نمبر کیا ہے ؟!

جواد :- (ملازموں کی طرح) جی، پرنے آٹھ ———

پہلی :- (جھلا کر) آہ مگر آپ کے دروازے پر تو آٹھ لکھا ہوا ہے ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) ممکن ہے کسی نے شرارت سے لکھ دیا ہو۔

شمیم :- (عیاشوں کی طرح) تو کیا ہوا۔ نمبروں سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

پہلی :- (غصے میں) آپ کو ہم سے دل لگی کرتے شرم آنی چاہیے۔ بڑے بدمعاش ہیں آپ۔

شمیم :- (تعجب سے) بدمعاش اور ہم ؟ کیوں بھئی، یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں ؟!!

پہلی :- (بے پروائی سے) ہمیں ڈاکٹر ظہیر الدین کے ہاں جانا ہے۔

جواد :- (گھبرا کر) لاحول ولا قوۃ۔ آپ کے پیچھے کیوں نہ کہا۔ وہ تو ساتھ کے مکان میں رہتے ہیں۔

دوسری :- (اٹھتے ہوئے) اٹھو آپا، میں کہہ رہی تھی یہ کوئی ———

جواد :- (لجاجت سے) میں معافی چاہتا ہوں، ہمیں ———

پہلی :- (بے قابو ہو کر) بکیے مت ———!

جواد :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔

پہلی :- (شمیم کی طرف دیکھ کر) میں آپ لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔

شمیم :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔

پہلی :- (جل بھن کر) دیکھو نہیں ہے میرے ساتھ بیمار ہے۔ ورنہ ابھی پولیس میں رپٹ لکھوا دیتی۔ آپ کو ہمیں اندر بلانے کی جرأت کیسے ہوئی۔

جواد :- (بھرائی ہوئی آواز میں) بولو ذکی تمہی پیش پیش تھے۔

ذکی :- (ہچکچاتے ہوئے) واہ، انھوں نے خود ہی تو ٹیلیفون پر کہا تھا۔

پہلی :- (حقارت سے) ٹیلیفون پر کہا تھا ؟ کس نامعقول نے آپ سے ٹیلیفون پر کہا تھا ؟!!

ذکی :- (اسی انداز میں) آپ ہی تو تھیں۔

دوسری :- (بیمار لہجے میں) چلو آپا میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔

جواد :- (سنجیدگی سے) جائیے جائیے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔

پہلی :- (غصے میں) بکئے مت۔ میں ابھی ——

شمیم :- (گھبرا کر) ذکی بھائی، بات کرو نا اب ؟!

ذکی :- (بھرائی ہوئی آواز میں) یار، میں کیا بات کروں ؟!

پہلی :- (غصے سے بے قابو ہو کر) کہئے کہیں کے، نابکار ——— غضب خدا کا کمبختوں کو اتنا خیال نہیں کہ بیمار ساتھ ہے اور انھیں عشق و شق کی سوجھ رہی ہے۔ کلموہے کہیں کے، نامراد ———

دوسری :- (دروازے کی طرف دھکیل کر) چلو آپا، باہر تو نکلو ———

(دونوں لڑکیاں چلی جاتی ہیں)

ذکی :- (اطمینان کی سانس لیکر) ایک دن کے لئے کافی خطاب ہیں۔

شمیم :- (بے پروائی سے) میں تو کہتا ہوں شکر کرو بچ گئے۔

جواد :- ذکی یار، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم ابھی تک بالکل ناسمجھ ہو۔

(ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

شمیم :- (بے پروائی سے) غالباً منور پھر آیا ہے ———

(دروازے کے قریب سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ذکی :- (چونک کر) ارے، یہ رو کون رہا ہے ؟!

شمیم :- (آگے بڑھ کر جھانکتے ہوئے) منور ———

جواد :- (نہ مانتے ہوئے) نہیں ؟!

(دروازہ کھلتا ہے اور منور روتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔
منور ایک پست قد گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان ہے جس کے
ابرو ہمیشہ حقارت سے تنے رہتے ہیں اور جس کی ناک
ہمیشہ نفرت سے چڑھی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی
نگاہوں میں گویوں جیسی چمک نظر آتی ہے)

ذکی :- (پیار سے پوچھتے ہوئے) کیوں بھئی، خیریت تو ہے ؟!

شمیم :- (مخاطب ہوتے ہوئے) منور ——— ؟!

جواد :- (تعجب و سراسیمگی سے) آخر بات کیا ہے ؟!

منوّر :- (روتے ہوئے) کچھ نہیں کچھ ———
ذکی :- (اصرار کرتے ہوئے) نہیں، کچھ تو ضرور ہے۔
جواد :- (التجا کرتے ہوئے) بتاؤ تو سہی ہم کوئی غیر تو ہیں!!
شمیم :- (تسلی دیتے ہوئے) کہو، گھبراؤ نہیں ———
منوّر :- (روتے ہوئے) میں بحیثیت ایک باغی کے سائیکل پر اڈا جا رہا تھا کہ رستہ میں مجھے ایک عورت نظر آئی پیچھے سے جوان معلوم ہوتی تھی۔ بیچاری پسینہ میں بُری طرح شرابور تھی۔ نہ جانے کہاں سے پیدل چلی آ رہی تھی۔ مجھے بڑا ترس آیا۔ پوچھ بیٹھا۔ آپ اتنی دھوپ میں پیدل چل رہی ہیں تانگہ میں کیوں نہیں بیٹھ جاتیں؟ بولی۔ "بیٹا اگر تمہیں کوئی تانگہ مل جائے تو مجھے بٹھا دو ———" (جذبات سے بے قابو ہو کر زور زور سے روتے ہوئے) جب میں نے یہ سُنا تو وہیں سے واپس آ گیا ———
جواد :- (تعجب سے) کیوں؟!
منوّر :- (اسی انداز میں روتے ہوئے) اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔
شمیم :- (تعجب سے) مگر تم تو اپنی نانی اماں کے ہاں ریڈیو سُننے جا رہے تھے؟!
منوّر :- (حقارت سے چیخ کر) نہیں، میں اب نانی اماں کے ہاں ریڈیو سُننے کبھی نہیں جاؤں گا ——— ہاں ———
ذکی :- (حیرانی سے) اور تمہارے ماموں؟!
منوّر :- (ہچکیاں بھرتے ہوئے) میں اپنے عرب والے ماموں سے بھی نہیں ملوں گا ——— ہاں ———
جواد :- (بے پروائی سے) چلو نہ سہی ——— مگر مونچھوں سے یہ آنسو تو پونچھ ڈالو ———
منوّر :- (رومال سے ناک صاف کر کے) جواد؟!
جواد :- (پیار سے) کہو کہو؟!
منوّر :- (روتے ہوئے) مجھے ایک دھوتی اور بنیان مل جائے گی؟!
جواد :- (تسلی آمیز لہجے میں) ضرور۔
منوّر :- (قدرے سنبھل کر) اور تنہا کمرہ بھی؟!
جواد :- (اسی انداز میں) کیوں نہیں ———
ذکی :- (پیار بھرے لہجے میں) مگر منوّر میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس وقت تنہائی کے خواہشمند کیوں ہو؟!
منوّر :- (پھر روتے ہوئے) میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔
شمیم :- (تعجب اور پیار سے) کیا؟! ایمان سے، ہمیں بھی بتاؤ؟!
منوّر :- (وقفہ بعد) میں سوچنا چاہتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا سوچنا چاہیئے ———
ذکی :- (بے قابو ہو کر) بھئی اللہ قسم ہم بھی اس وقت یہی سوچنا چاہتے ہیں۔

جواد :- (تسلی آمیز لہجے میں) اگر ہم چاروں اسی کمرے کے کونوں میں پڑ کر سو جائیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا منور؟!

منور :- (بھرائی آواز میں) نہیں ———

جواد :- (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ——— !!

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (بآواز بلند) جی صاحب !!

شمیم :- (تنگ آکر) اسے آہستہ بولا کرو، تم سے کئی بار کہا ہے۔

جواد :- (بے پروائی سے) ذکی اور شمیم صاحب کی نیکریں، میرے اور بخاری صاحب کے تھرمے لے آؤ ———

نوکر :- (جاتے ہوئے) بہتر ———

(چلا جاتا ہے)

شمیم :- (جماہی لیکر) اس صوفے کو پرے سرکا دو، لیٹنے کے لئے تھوڑی جگہ تو ہو جائے۔

ذکی :- (لیٹتے ہوئے) دو چار تکیے بھی منگوا لینا یار ———

——— پردہ ———

تعبیر طلب

شوکت تھانوی

مجھے اس وقت جو غصہ آ رہا تھا یہ غصہ کی وہ قسم ہے جس کا تجزیہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی اور کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ غصہ اتفاقات کی غلطی پر آتا ہے یا اپنی بیچارگی پر۔ اور ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ میں ان لوگوں کو نہایت احمق سمجھتا ہوں جو اس قسم کے موقعوں پر بھی مشتعل ہوتے ہیں، جھنجھلاتے ہیں جب صورت میں میٹھی میٹھی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ٹینس کھیلنے کے لیے جب سفید جوتے پہن چکے، سفید جوتے کے تسمے کس چکے اور ریکٹ ہاتھ میں لے کر باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ تمام پروگرام پر پانی پھر گیا۔ کپڑے بدلے، ریکٹ کو پریس میں کس دیا اور طے کیا کہ چلو آج اپنی لائبریری میں بیٹھ کر موسم بسر کریں گے۔ سگریٹ کا ڈبہ لیا، پڑھنے کی عینک اٹھائی اور لائبریری میں پہنچ گئے۔ جہاں چاروں طرف الماریوں میں ان مصنفین کی کتابیں چنی ہوئی تھیں جن سے کچھ نہ کچھ عقیدت ہو چکی ہے۔ ابھی بیٹھے نہ تھے کہ اس وقت کسی مصنف سے شرف نیاز حاصل کیا جائے کہ ایک دم بجلی غائب۔ میرے نزدیک اس قسم کے موقعوں پر غصہ نہ آنا اگر حکم ہے تو یہ علم یقیناً کوئی بیماری ہے۔ جس کا علاج کرانا چاہیے۔ کتنا اچھا موسم تھا۔ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں۔ کیسا لطف آتا ہے اس وقت مطالعے میں۔ مگر ابر آلود فلک کی رفتار سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ اب اندھیرے میں گم بے وقوف بنے بیٹھے ہیں اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں۔ کچھ دیر روشنی آنے کا انتظار کیا۔ پھر مایوس ہو کر آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ مگر ہائے اس اندھیرے میں بھی اسی طرف تھیں جہاں وہ بیٹھی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جگمگا رہا تھا۔ گویا اگر اس طرف سے نگاہ ہٹ گئی تو روشنی کا کر واپس چلی جائے گی۔ کہ میں کیوں آؤں جب کہ تم میرے منتظر ہی نہیں ہو۔ معلوم نہیں کتنی دیر اسی طرح گم رہے کہ یکایک نیم کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی ہوئی ایک باوقار آواز آئی۔

"آداب!"

سامنے ایک خاتون محترم لباس کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج میں پورا سلیقہ لیے کھڑی تھیں۔ میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور تواضع کو تعظیم دیتے ہوئے پوچھا "کس کی کوشش ہے آپ کو؟"

خاتون محترم نے اپنی سنجیدگی میں ایک چھوٹا سا تبسم ملا کر کہتے ہوئے فرمایا "عجیب!"

میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عرض کرنے ہی والا تھا کہ محترمہ نے خود بول دیا۔ "عجیب بات ہے آپ کی لائبریری میں میری کتابیں موجود ہیں اور آپ مجھ کو جانتے نہیں۔ کاش تالیف گاہ میرے ساتھ ہوتے یا کم از کم دوستاش ہی ساتھ ہوتی کہ تعارف کی رسم ادا ہو جاتی۔"

میں ایک دم چونک پڑا: "آپ ..... آپ ——— جناب ..... جناب امتیاز تو نہیں؟"

محترم جناب نے میری بوکھلاہٹ سے لطف لیتے ہوئے کہا: "کمال کیا کہ اب بھی پہچان لیا۔ آپ مجھے مصنوعی حرارت سے پکے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نارنگی کا سینڈوچ کھاتے ہیں؟"

عرض کیا: "نارنگی اور ڈبل روٹی الگ الگ کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔"

محترم جناب نے فرمایا: "اناس کا سینڈوچ تو کھایا ہی ہوگا؟"

عرض کیا: "جی نہیں اناس کا زردہ البتہ کھا چکا ہوں اور اناس کے پکاؤ بھی چکھے ہیں۔"

وہ اداس ہو گئیں اور مجھے دکھ ہونے لگا کہ کاش میں نے نارنگی اور اناس کے سینڈوچ کھائے ہوتے۔ میں اس سلسلے میں معذرت پیش کرنے ہی کو تھا کہ وہ مجھ سے بیزار ہو کر موسم کی طرف متوجہ ہو گئیں: "اس ابر کے ٹکڑے کو دیکھیں کہ آسمان پر سبز رنگ کا چاند دم بخود ہے۔ کائنات ایک عظیم سکوت اور خوفناک انتظار میں ڈوب کر رہ گئی ہے۔"

اور میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ اس لیے کہ ظاہر ہے یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ میں نے نارنگی اور اناس کے سینڈوچ نہیں کھائے۔ میں اپنی آنکھوں سے ایک اشک ندامت نچوڑنے ہی والا تھا کہ محترم جناب نے فرمایا: "ابھی یہ بادل چھٹ جائیں گے اور ایشیائی جوانی کے دیکھتے ہوئے آسمان پر نارنجی رنگ کا گلشن آفتاب آگ برسائے گا۔"

میں نے احمقوں کی طرح کہا: "جو خدا کو منظور ہو!"

محترم جناب نے فرمایا: "اور پھر وہی لہرے کا سی، نمک کی دوپہر ہوگی۔ آپ کے مکان میں کوئی فرانسیسی دریچہ ہے جس سے چھلکتے ایشیا کی بہار آفریں نرم صبح کا نظارہ دیکھا جا سکے؟"

میں نے عاجزی سے سر ہلا کر کہا: "شاید ایک آدھ پاکستانی دریچہ ہو جس سے ایشیا تو ایشیا، لاہور بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔"

محترم نے فرمایا: "یہاں بلبلوں چہچہ بلبلوں کے نالہائے جگر خراش سے دل دہلتے ہیں۔ نہ یہ وہ ساحل ہے کہ حواسوں کی چیخ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے، نہ آسمان کا رنگ ایسا ہے جیسے ہنستے کا کھیت لہلہا رہا ہو، نہ سمندر ہے جس پر گہری نیلی چادر بچھی ہو، نہ یہاں پکے ہوئے سیبوں کی نکہت ہے، نہ پکے لیموں میں بسی ہوئی ہوائیں، جھینگروں کے نغمے بھی شاید ہی سننے میں آتے ہوں۔"

میں نے بڑی مستعدی سے کہا: "جی نہیں جھینگر تو ایک سے ایک کا سیکل اس غریب خانے میں پل جاتے ہیں۔ نہایت خوش آواز جھینگر ہیں۔ کبھی تنہا گاتے ہیں، کبھی کورس میں اور رات کو جھنڈ کے جھنڈ اپنے راگ چھیڑ دیتے ہیں۔ ان کے دوگانے سنتے سنتے میں اور کسی کام کا نہیں رہتا۔"

محترم جناب نے تجسس سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا: "ورنہ آپ بھی آدمی تھے کام کے۔ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں وثوق کے ساتھ صحیح الدماغ کہا جا سکتا ہے۔"

میں نے بغیر سمجھے نہایت بے وقوفی سے کہا: "درست فرمایا آپ نے!"

غالباً محترم جناب میری بے وقوفی کو تاڑ گئیں اور براہ راست مجھ سے سوال کیا: "آپ اپنے کتب خانے میں میری کتابیں کیوں رکھتے ہیں؟"

عرض کیا: "پڑھنے کے لیے!"

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ عل الحساب عرض کر دیا: "دلچسپی جو ہوتی ہے پڑھ کر!"

وہ سوال کرنے پر تلی ہوئی تھیں: "کیا دل چسپی ہوتی ہے؟"

عرض کیا: "یہی کہ ——— گویا ——— میرا مطلب یہ ہے کہ خوب ہوتی ہیں آپ کی تصانیف!"

گو وہ تھیں والی نہ تھیں: "کس اعتبار سے؟"

عرض کیا: "ہر اعتبار سے!"

کہنے لگیں: "مثلاً جسمانی اعتبار سے ——"

گھبرا کر کہہ دیا: "ہی اور کیا ——"

وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں: "میں اپنی سب کتابیں واپس لے جانا چاہتی ہوں۔ آپ فی الحال ڈومی نرس کھلا لیجیے اور دانستہ چور بن جایا کیجیے۔ اس سے آپ کے احساس میں پابندی پیدا ہوگی۔ کتاب بینی کا شوق ابھی قبل از وقت ہے۔ ابھی بچے تو پڑھنے کو عمر پڑی ہے۔ غذا کا خاص خیال رکھیے۔ صبح ناشتے میں ڈھائی چھٹانک کچی کھیر، تین اونس کھوں کا رس، تین ٹماٹو اور سات مونگ پھلیاں ——— کھانے میں سیب کا بھرتہ ——"

میں سیب کے بھرتے کی ترکیب پوچھنے والا ہی تھا کہ وہ غائب اور الدی سے ان کی تصانیف بھی غائب۔

میں بے تحاشہ اس دریچے کی طرف دوڑا جو روسی یا فرانسیسی تو درکنار خالص پاکستانی بھی نہ تھا۔ گو ابھی جھانک ہی رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔

"السلام وعلیکم!"

دوسرے جسم کے ایک صاحب عینک لگائے، پان کھائے، ہاتھ میں ڈوبیہ جوڑ دبائے موجود تھے۔ میں نے دبی زبان سے "وعلیکم السلام" کہا۔

وہ صاحب بغیر کسی رسمی تعارف کے بولے: "صحیفۂ اوستا اور شریعت زردشت میں عورت کے حقوق و ناموس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ قدیم ایرانیوں میں عورت کے حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں کے لیے کچھ اصول علم زیست اور تیاری کے لحاظ سے مقرر تھے ——"

مرعوب ہو کر عرض کیا: "درست فرماتے ہیں حضور ——— گو جناب کی تعریف؟"

وہ بے شعور جاکانہ انداز سے بولے: "آپ کے دعائے کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے اہل نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیریں (فرہاد کی محبوبہ) چالیس صفات جمال میں سے انتالیس پر حاوی تھی۔ دعائے کی ساخت کی وجہ سے رازداری کی اہل نہ تھی۔ گو حسن و اخلاق اور وفاداری کے اعتبار سے وہ بھی اس قدر بلند مرتبہ تھی کہ جب اس کا شوہر خسرو پرویز قتل کیا گیا اور شیرویہ فرماں روا ہوا تو اس کے خود کشی سے پہلے اپنے بال کھول دیے۔ نازک نازک ہاتھوں سے نازک سینہ پر خانہ برانداز قسم کی مرثیں لگاتے لگاتے تھک کر ختم ہو گئی۔ گو شیرویہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج منظور نہ کیا ——"

عرض کیا: "اور فرہاد اس زمانے میں کہاں تھا؟"

بے پروائی سے بولے: "وہ ——— سر گشتہ تھا بہ رسوم و قیود تھا۔"

حاضری سے عرض کیا: "میں اپنے دعائے کی ساخت کے باوجود آپ کے نام کو راز میں رکھنے کی کوشش کروں گا۔"
ایک تر کیا ہوا پان کھا کر چھالیہ پھانکتے ہوئے بولے "ایک جھوٹے وعدے سے زیر بار کرنے کے لیے اپنا نام بتائے دیتا ہوں۔ نیاز ——"

میں نے چونک کر کہا: "نیاز —— مولانا نیاز —— نیاز فتحپوری —— شہاب کی سرگزشت —— کیرپڑ اور سائیکل ——"
نیاز صاحب نے میرا سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا: "آپ نگار کے خریدار ہیں؟"
عرض کیا: "تھا تو مگر اب نہیں ہوں۔"
وہ مجرمانہ لہجے میں بولے: "ذرا ست الیہ ہے آپ کے پاس؟"
عرض کیا: "تھی مگر میرے ناتجربہ ہاتھ کی لکیریں اس میں نہ نکلیں، لہٰذا بیکار ڈالی۔"
پوچھنے لگے: "شہرانیات؟"
عرض کیا: "بچے پڑھا کرتے تھے اسے، کہیں گم کر دی۔"
مولانا نے فرمایا: "نگار سان اور نامہ نیاز بھی آپ کے کتب خانہ میں رہنا چاہیے۔ میں اپنا شمار آئینہ فروشان شہر کراں میں کرانا نہیں چاہتا۔"

اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑے، چھڑی کے دستے سے اپنی کتابیں الماری سے نکالیں اور قبل اس کے کہ میں معذرت کروں وہ تیزی سے نکل گئے۔ میں دروازے تک ان کے پیچھے پیچھے گیا تاکہ نگار کا چندہ دے کر ماضی کروں۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان کو آواز دیتا، کسی نے مجھ کو آواز دی:

"مشہ —— اے جناب ——"

گھوم کر دیکھا۔ ایک سرو قد، گھنے بالوں والی ایسی خاتون کھڑی تھیں جو اپنے چہرے کی ساخت میں مسکراہٹ لیے تھیں۔ میں نے گردن کے خم سے ان کو تعظیم دی۔ وہ اپنے گھنے ہوئے بالوں کے گرداب حرکت میں لا کر بولیں: "میں نے آپ کو ردفیلر ادھا کل کرسی کے پاس کے اس خشک قطعے میں غائب دیکھا ہے جہاں مقبل بائیاں کھائی جاتی تھیں اور اوما پنچال تکلم کے بھی گاتی تھی۔"
میں نے چونک کر عرض کیا: "آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہو رہی ہے؟"
خاتون محترم بولیں: "آپ کو بران کانٹیس کی شکایت تو نہیں ہے؟"
عرض کیا: "جی بالکل نہیں۔"
خاتون محترم نے وثوق سے حکم دے دیا: "پھر تو اپنی سائیکس کا ہونا ضروری ہے۔ یہی شکایت آدمی کو ہو گئی تھی۔ وہ ایک مذہبی خدا ترس بلی ہے جو برابر اداس رہتی ہے۔"
میں گھبرا کر پوچھا: "خدا کے لیے بتا چلیے آپ قرۃ العین حیدر تو نہیں؟"
وہ بولیں: "ہوں تو سہی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ترانی کا وہ اسٹیشن میرے ذہن سے نکل گیا جہاں مرزا عبدالرحمٰن بیگ ایک ڈاک گاڑی میں سے سر داخل کر کے کہتا ہے "چھلندے بچے کو سس ہا!" اور نانا ماں جی کے گھر کے آنگن میں ہم بیٹھ کر امرود کھاتے تھے۔ میرا خدا ہو جھے خدا ہے

خاموش پانیوں کے کنارے کنارے جاتا ہے۔ سینٹ کو بتایا کہ مجھے میرا دماغ واپس مل گیا تو میں تمہارے سامنے چار شمعیں جلاؤں گی۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "اللہ نے چاہا تو ضرور واپس مل جائے گا۔ جو زہر اس سے باہر اس امید وار ——"

وہ اچانک بولیں "آپ کے پاس میرے لیے کوئی حکم نامہ ہے؟"

میں نے کہا: "جی ہاں!"

وہ خوش ہو کر بولیں: "اسی میں ہے ——— میرا دماغ اسی میں ہے۔ گاؤ میرے دوست اس خوشی میں اور ذرا کک زاتی گاؤ۔ بلکہ شہر جاؤ میں لکھتی کو جاؤں۔ گڈ اولڈ بکسی ——— خدا کرے اس نے شادی نہ کر لی ہو۔ اب اس کے سارے پرابلمز حل ہو جائیں گے اور دنیا مجھے اب یقیناً ACCEPT کرے گی۔

میں بے وقوفوں کی طرح ان محترمہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف گئیں اور میرے بھی حکم نامے کی جلد نکال کر خوشی سے اچھل کر بولیں "تھینکس ملے لوٹ ——— گڈ نائٹ ——— اب میں اپنے سنٹر کو لوٹ جاؤں گی اور سیدھی کا تاشر کے سو جاؤں گی ——— گڈ ——— نائٹ ———"

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ "وعلیکم السلام" کی طرح "گڈ نائٹ" کا جواب کیا ہے اور وہ ایک طرف کو مڑ کر غائب ہو گئیں۔ شکر ہے کہ اسی وقت ایک مانوس آواز کان میں آئی: "کرو مجھے سلام تاکہ میں کہوں وعلیکم السلام!"

میں نے گھبرا کر کہہ دیا: "السلام علیکم!"

اور اب غور سے دیکھا تو چوکھٹے پر سبز مخمل کی ٹوپی، لمبا سا کرتہ، کرتے پر صدری اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنے ایک کامل وجاہت بزرگ نہایت ذہانت سے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھ کو حیران دیکھ کر نہایت مٹھاس سے بولے "وعلیکم السلام۔ اور اب سنو میری بات کو دوسروں کے عیب دیکھو تو پہلے اپنے عیبوں کا تصور بھی کر لیا کرو۔ اللہ کے نیک بندے تمہارے گناہوں سے بچائے گا اور تم پر رحم کرے گا۔ اور جب خدا کسی بندے پر رحمت کی نظر ڈالتا ہے تو وہ آدمی دل کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پس میں دل کا بادشاہ بن گیا ہوں اور تم سب کو بھی دل کی بادشاہی تقسیم کرتا ہوں کہ تم بھی میری طرح اپنے گناہوں کو یاد کرو اور خدا سے توبہ کرو اور خدا سے کہو کہ "اے خدا تو بھی مسلمان ہو جا!"

میں نے ان بزرگ محترم کے تقدس سے دل ہی دل میں لرز کر کہا: "حضور تشریف تو رکھیں! کیا شربت یا آئس کریم، کوئی چیز پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں؟"

بزرگ محترم نے خندہ پیشانی سے فرمایا: "آج میری چھوٹی لڑکی کو ڈاکٹر نے آئس کریم کھانی تھی میں خواجہ محل کے پاکستان نے ہی پیا کام کر رہا تھا کہ زید پاشا آئس کریم لے کر آئے۔ میں نے کہا پاشا اس سے مجھے خون آ جاتا ہے میں نہیں کھاتا۔ وہ چلے گئے۔ محسن ابو حاب سے کر آئے اور کہا کہ لڑکی دل شکنی ہو گی۔ چلو پیجئے۔ میں نے گرمی شربت صاف کر دی اور کہا، ہر چہ بادا باد من در شکم روح اندازم ——"

میں نے خوش ہو کر کہا: "میں آپ کو پہچان گیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی؟"

خواجہ صاحب نے فرمایا: "آپ تو مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے عید کا چاند ہوں اور جیسے آپ کہنے ہی والے ہیں "مبارک ہو عید کرسمس!"

میں نے حیرت سے کہا "آپ کی تصانیف نے آپ سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر اتنی ہی خوشی ہو رہی ہے جتنی"

خواجہ صاحب نے فرمایا: "اگر میں آپ کی خوشی کا بہانہ بن گیا ہوں تو اپنے کو مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں ورنہ خوش اعمال لوگ تو خوش رہتے ہی ہیں ——"

میں نے عرض کیا: "نہیں خواجہ صاحب میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ بلا کے سخت کوش ہیں"

خواجہ صاحب بولے: "ذاکر کہتے ہیں، حلیم کہتے ہیں، تجربہ کار دوست کہتے ہیں، خواجہ بانو کہتی ہیں، کشتی شاہ کہتے ہیں اور خود میرا دل بھی کہتا ہے کہ واقعی محنت کی کثرت ان بیماریوں کی بنیاد ہے۔ لیکن اگر میں کام ترک کر دوں تو کام بھی مجھے ترک کر دے گا"

میں نے کہا: "خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی خواجہ صاحب۔ مگر مجھے ایک بات پوچھ لینے دیجئے کہ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے جارج برنارڈ شا کا فاتحہ کرایا تھا؟"

خواجہ صاحب نے ہنس کر کہا: "اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میجر جنرل ڈکسن نظامی کی وفات کے بعد میں نے مسٹر جارج برنارڈ شا کا ایک اعلان اخباروں میں پڑھا کہ آئندہ ساری دنیا میں مذہب اسلام ہوگا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جارج برنارڈ شا چشتی نظامی تھے"

میں نے حیرت سے کہا: "جی کیا فرمایا — جارج برنارڈ شا اور چشتی نظامی؟"

خواجہ صاحب نے فرمایا: "جی ہاں — میں نے اپنے خلفاء کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی ہے کہ وہ اپنی مجلسوں اور نیازوں میں میجر جنرل ڈکسن نظامی اور جارج برنارڈ شا چشتی نظامی کے نام سے کرنا دیا کریں"

میں سوچ رہا تھا کہ جارج برنارڈ شا چشتی نظامی کا فاتحہ برک فاسٹ پر جائے گا یا لنچ یا ڈنر پر کہ خواجہ صاحب نے یکایک سوال کیا۔

"آپ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم سے کبھی ملے ہیں؟"

میں نے کہا: "جی نہیں اس سعادت سے ناشاد رہا ہوں"

کہنے لگے: "مثنوی غمار شاد ضرور پڑھیے۔ یہ مثنوی مسجد دل میں سنایئے۔ یہ مثنوی کم سے کم سترہ مرتبہ یعنی سترہ آدمیوں کو ضرور دکھایئے اور سنایئے"

میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر اٹھارویں مرتبہ میں نے کسی کو سنا دی تو کفارہ کیا دینا ہوگا۔ مگر خواجہ صاحب نے کتابوں کی الماری سے بڑی ایک کتاب نکال لی جو میں نے سرتیج بہادر سپرو کے نام معنون کی تھی۔ خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ نے یہ بہت اچھا کیا — سرتیج اصل میں اردو کے سرتاج تھے۔ وہ سپرو نہیں بلکہ اردو کے سپر تھے"

اور یکایک سرتیج بہادر سپرو خیال بنے ہوئے میرے تصور میں آ گئے۔ خواجہ صاحب بدستور گل فشانی فرما رہے تھے: "اردو ہی زبان ہے۔ ہم سے مراد ہے ہندو اور مسلمان" "ہ" سے ہندو اور "م" سے مسلمان۔ دونوں مل کر بنے "ہم"۔"

میں عقیدت کی شدت سے بوکھلا کر رہ گیا اور خواجہ صاحب نے اس بوکھلاہٹ کو وجد سمجھ کر ارشاد فرمایا: "آپ پریم راگی سے بھی ضرور سنا کیجئے۔ اس سے آپ کے قلب کی وقت میں انجذابی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور موسیقی سے طبیعت میں ایک تنفر منجانب اللہ ہو جائے گا"

میں پریم راگی کا پتہ نوٹ کرنے کے لیے پنسل نکالنے کو جھکا ہی تھا کہ خواجہ صاحب ٹمانچہ بردار یزید کی جلد الماری سے لے کر ت ہو گئے اور ان کی جگہ ایک ڈھلتا ہوا ڈھانچہ جھک کر نظر آیا۔ مگر یہ ڈھانچہ بولتا بھی تھا۔

"پہچانا مجھے؟" اور یہ کہہ کر میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول بنا دیا اور پھر اس پھول کی پتیاں بناتے ہوئے کہا "مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ بہت شوق تھا۔ اور ہر روز ملنے کا ارادہ کرتا تھا۔ میں آپ کو اپنی تصویر دکھاتا ہوں۔ میری تصویر دیکھ کر آپ مجھے آسانی سے دیکھ سکیں گے۔ بات یہ ہے کہ یہ اصلی تصویر ہے اور میں خود کچھ نقلی سا ہوں۔ اس تصویر میں جو میری آنکھیں ہیں وہ آپ کے دل و دماغ پر چھا جائیں گی۔ بات یہ ہے کہ یہ تصویر ساکت ہے اور میں ذرا جاگتا ہوں۔ اس تصویر کو دیکھئے یہ تصویر بھی خاموش ہے اور عینک کے پیچھے بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش ہیں۔ بہت سی عورتیں یہ تصویر دیکھ کر منہ بنا لیتی ہیں۔ مگر تنہائی میں چپکے سے ان آنکھوں کو چومتی ہیں۔ اسی چوما چاٹی کی کثرت نے میری نظر کمزور کر دی ہے اور میں عینک لگانے لگا ہوں۔"

میں حیرت سے ان حضرت کی باتیں سن رہا تھا مگر وہ نام پوچھنے کی مہلت ہی نہ دیتے تھے۔ کہتے ہی چلے گئے: "آپ یقین کیجئے کہ اگر میں عورت ہوتا تو میرے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے نیچے میرے سینے کا ابھار یقیناً چغلیاں کھاتا اور جو کوئی مجھ کو دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں پھٹ جاتیں۔ مگر میں یقیناً ایسی چال نہ چلتا کہ لوگ اونچی ایڑی کے جوتے کو میرا نیا نیا شوق سمجھتے زمین لیتا غرارہ پہنتا جس کی سلوٹوں کا گھیراؤ سمٹا ہوتا۔ میں اس طرح کبھی نہ سوتا کہ بڑی بڑی اداس آنکھیں بند ہوتے ہی دایاں بازو ایک طرف ڈھلک جاتا۔"

میں نے تنگ آ کر پوچھا "حضرت، پہلے یہ تو بتائیے کہ میں کس صاحب سے ہمکلام ہوں۔ جناب کا اسم مبارک؟"

وہ صاحب عجیب مرشدانہ انداز سے بولے۔ بہت سے نام ہیں میرے۔ ٹھنڈا گوشت ——— کھول دو ———

میں ایک دم چیخا "ارے ارے۔ منٹو صاحب ——— سعادت حسن منٹو ——— اور وہ ٹائپ رائٹر والے انشا پرداز ——— خود زیب داستان اور افسانہ نگار؟"

منٹو صاحب نے میری بدمذاقی سے بے مزہ ہوتے ہوئے کہا۔ اب ایسی باتیں نہ کیجئے کہ میرا نشہ اتر جائے۔ میں اس وقت مغربی اور پاکستانی ہوئی لڑکیوں کے متعلق غور کر رہا ہوں اور میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ ابھر رہے ہیں۔"

میں سوچنے لگا۔ یا اللہ اس کا ذہن کس وادی کو دکھایا جائے۔ مگر وہ بولتے ہی رہے: "اور کیوں جناب ان کو مغربی کیوں کہا جاتا ہے انہیں اغوا کب کیا گیا۔ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے۔ جس میں مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں ——— یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں رو دھوں کے تاروں سے الجھنا سمجھتے ہیں۔"

میں نے صفائی پیش کی: "منٹو صاحب، خدا گواہ ہے میں نے اس کا نام اغوا یا ان عورتوں اور لڑکیوں کا نام مغربی نہیں رکھا ہے"

وہ تلخی سے بولے: "تم ——— تم تو شکاری ہو۔ صحافی، افسانہ نگار اور شاعر قلم اٹھائے شکار میں مصروف ہیں۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ تم انسان کو ہندو اور مسلمان سمجھتے ہو۔ تم کہتے ہو ایک لاکھ ہندو مرا یا ایک لاکھ مسلمان مرا۔ تم یہ نہیں کہتے کہ دو لاکھ انسان مرے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہندوؤں سے مذہب شکار کئے جاتے ہیں ——— بے وقوف ——— چرک فرید دیکھا نہیں اور بن جیسے انشا پرداز ———"

میں نے منانے کی بہت کوشش کی بلکہ وعدہ کیا کہ پرسوں سے کہ امرتسر جاؤں گا اور چرک فرید دیکھ آؤں گا۔ مگر منٹو صاحب تو اس بیگانگی سے چلے جیسے منٹو پارک کا سبزہ بیگانہ۔ میں دل ہی دل میں کوستا دروازے تک جا کر واپس لوٹ آیا اور لوٹ کر ایک دم چونک پڑا۔ بڑی بڑی آنکھوں کی ایک سادہ اور معصوم مگر سادہ اور معصوم سے زیادہ کثیف روح اور خاتون جس کو کمزوری نے لڑکی بنا رکھا تھا۔ کھڑی ہوئی نظر آئیں اور سلام کے بجائے صرف مسکرا دیں۔ میں بھی مسکرانے کی کوشش میں دانت نکال کر رہ گیا۔ وہ شرما کر بولیں: "آپ بڑے علمی آدمی معلوم ہوتے ہیں کہ ان

آف ہو جانے سے گھبرا جاتے ہیں۔ آخر چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کر لیتے، آسمان پر چلتے ہوئے یہ دو پہلے دیئے آخر کس کام کے ہوتے ہیں؟"

میں نے نہ جانے کیوں یہ بے ہودہ بات کہہ دی: "میں سمجھا نہیں آپ کیا فرما رہی ہیں"

وہ جل کر بولیں: "بھئی سب سمجھو۔ ایک ذرا سمجھ لیتے تو جانے کیا ہو جاتا۔ یہاں تکیہ بھی تو نہیں ہے کہ میں اپنا سر اس پر دے مارون"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ہی صبح اس کمرے سے گاؤ تکیہ اٹھوایا ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ میرے جواب کی منتظر تھیں۔

آخر خفا ہو کر بولیں: "اب کچھ بولو بھی۔ میرا انتظار دم توڑ کر نہ رہ جائے۔ جی چاہتا ہے کہ سسک سسک کر رو دوں"

میں نے جھک جھک کر ہنستے ہوئے کہا: "میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کون ہو سکتی ہیں"

وہ بولیں: "میں گئی بھولے میں، پہلے اپنے متعلق غور کرو کہ تم کون ہو سکتے ہو۔ میں نے تو غلطی کی جو تمہارے پاس آ گئی۔ وقت اباجوں کی طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ میں نے کہا چلو ان حضرت سے مل آؤ۔ یہاں آ کر میرا دھڑکتا ہوا دل عذاب سے ڈوب گیا۔ اب یہاں سے جاؤں گی اور سنی اور پرانی باتوں کے بلبلے تلے پڑی کراہتی رہوں گی۔ میں کرسی پر پھونٹ کھول کر بے جان سی لیٹ جاؤں گی اور میرا چہرہ جذبات سے بالکل خالی ہوگا"

میں نے پہچان لیا اور گویا نعرہ بلند کیا: "آپ ——— ماجرہ مسرور ———"

وہ میری حماقت پر مسکرا دیں: "جی نہیں ——— خدیجہ مستور ہوں"

میں نے کہا: "وہ ایک ہی بات ہے۔ عطر ایک ہی ہے خواہ کارخانہ اصغر علی کا ہو یا محمد علی کا"

یکایک سر پر لٹکا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشنی آ چکی تھی۔ کتابوں سے الماریاں بھرپور تھیں اور تمام مصنف غائب تھے۔ کاش کتابیں غائب ہوتیں اور مصنف موجود ہوتے ———

دوست کے نام

پطرس

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے۔ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی۔ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہلِ جنوں ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو۔ اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے۔ لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا۔ کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہو گی۔ ورنہ حق تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے۔ انسان دیوانہ نہیں تو بعض دماغ ضرور ہو جاتا ہے۔ اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں۔

لیکن اے دوست کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روتا اور نیرو کی سازندگی کا فقرہ نہیں کہا؟ کسی متوسطِ چشم پر دور میں آپ دین کے نئے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے بھولے پن اور تفریحِ کوشی پر تعریض نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتویٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گلگس مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

بیا بجنگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است!

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا صباحت کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمعصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعویدار ہے، آپ کی آزاد منشی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ چڑے ہوئے نقرا کے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی۔ یا پھر بیزاری اور بددلی پک رہی ہو گی۔ اور

آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہو گی۔ ورنہ جس حسنِ مذاق پر آپ کو فخر ہے۔ وہ تو آج کل ایک جاہلِ یتیم کی طرح بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر جھکائے دبکا بیٹھا ہے اور باہر پڑا پڑا مینہ برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائدِ اعظم یہاں تشریف لائے اور وہ باغ جس کو قدیمی گارڈن کہا کرتے تھے۔ اس میں جو قلعۂ روز گارڈن کہلاتا تھا۔ وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا۔ "روز گارڈن" کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت عمارت استادہ ہے۔ اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا۔ لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اور مضحکہ خیز تھی کہ مدرسے کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لٹکاتے ہوئے شرم آتی۔ "گلستانِ فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے۔ جس کی بدولت نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے۔ جو دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ وہ چیتھڑے پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن جب ان جلسے کی پیاسی نگاہوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا۔ تو فخر اور دل دونوں مجروح ہوئے۔ کیونکہ ایسے شاندار موقعے کے لیے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے خوش نویسی کی علمبردار ہے۔ جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صنائی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتبِ قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہو گا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور بیش بہا طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوش نویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے۔ جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم نامور کاتب تو کچھ نہ تھے۔ اور اس پر ہماری اس شہر میں مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے خطا ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں مذاق کا عروج نظر آتا اور آپ پڑھ کر دو ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی طنز و تیزی پر آپ کو بدتمیز کہتے۔ یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام فوراً اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آجاتا۔

اب آپ اس انجمن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم بھی ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں۔ تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہ کہنے سے کیونکر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤ اجداد خط اور دوات سے اور قلم اور نادیے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ اس دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغرے۔ نستعلیق اور نسخ۔ کس کس طرح سے انہوں نے ابد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وسیعوں کو دیکھو۔ ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو۔ ان کے روضوں اور محلوں۔ ان کی مسجدوں اور خانقاہوں۔ ان کے قرآنوں اور سکوں اور مہروں۔ ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا صحبت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے وہ ثانی نقوش جو سب و فراس و رنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنی کچھ کے احیاء اور تحفظ کے لیے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ قسمیں کھا کر اس ورثے کو ہاتھ سے نہ جانے دو گے۔ اور عہد کرو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور

رسالوں تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں۔ تمہارے مرثیوں اور تمہارے نوحوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابھر کے خط کھینچیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نوادکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں۔ انہیں مٹنے نہ ہونے دیں گے۔ تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے۔ اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا۔ اور جو اب بھی اپنی شستہ آفرینی پر ناز کرتی ہے۔

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ایسے لوگ؟ خون طلحہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی۔ لیکن کیا آگے بھی بڑھیے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی لکھیے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست دعا دیتا ہے تجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونی ورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دست کاری سب چلتی پھرتی دی گئی تھیں اور اس مجموعہ کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک بورڈ میں خاتون ممبر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی صورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا۔ کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام فی الحال کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آجائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو نہ کر کے رکھ دی گئی ہے۔ کیونکہ ہو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا لیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے نے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے لکھوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جانداروں کی شکلیں نہ بنائیں گی چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب۔ ناشپاتی۔ مرتبان یا پہاڑ۔ دریا۔ جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی تصویر کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویر تو ہرگز جائز نہیں۔ فوٹو البتہ جائز ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ فوٹو بھی تو کئی طرحوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹو تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو اب ملا کر چالبازی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ مولانا کے نزدیک اسی ایک فوٹو کا کام حق اور راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے۔ یہ حال تو جاخار اشیار کا ہے۔ باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک دن کوئی کوتاہ حق میں مصوروں کے جھوٹ کو گردن سے جا دبوچے گا۔ اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیے گا کہ یہ تو وہی لوگ ہیں جو بہت بڑا ——— ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر کشی کا بھاڑ ٹل جائے گی۔

ان حالات میں چنانچہ کے جیتے کا امکان ——— کم ہے۔ کوئی بات سچی بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں اور تک

تو مجنوں کی انگلیاں معدوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا۔ اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات عریاں کے بدن تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں قصے، گودیاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تکمہ یا ڈوری پلٹے کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا معتقد ہے۔ اسے دفن کر دیا جائے تو یہ دبا دبا ختم جائے گی۔ اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہیں مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوری کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس اور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی اشیاء آتش کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے۔ تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کیے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کونسا ایسا جزیرہ ہے اور کون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ اردو کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے۔ لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے سنگ چھین کر اس کی جگہ تم اور مرتم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ایمان پیدا کیجئے آپ کے دیکھتے کے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہیے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجیے تو قاش شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے مونڈے لگائیں؟ آپ حیا کی تلقین کیجیے تو لوگ سر بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں۔ اور بچیوں پر اپنا بہیمانہ زور آزماتے ہیں۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلماں؟

ایسے فیض و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لیے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور فراغ لازم ہیں۔ یا پھر کوئی دلدار کوئی اُمنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شور و سنی نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے بھی پنپا ہے کہ ہر چیز کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرا کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر بڑے سے اور ماہ گیر سے لینے پر تلا ہوا ہو۔ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی بڑی قیمت اور ہر قیمت کی بڑی چیز نصیب ہو۔ اور لوگ فاقے کے ڈر سے جنات یا کرامت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں۔ نہ کوئی اخلاقی نظام کیا ہو کہ اس کی اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو۔ نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا جہاں آپ کا من کا معکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لیے تصویریں بناتا رہے۔ نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ سمجھ کر اسے پکڑ لیں۔ شان عظیمہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان کے اوپر ایسے لوگ مسلط کر دیے جائیں جو ان کے ہنر کو کمزوری سے کمزوری کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوے تھا۔ اس کا دور اب گذر گیا۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں　　پابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے اور اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے۔ آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جانداروں کی تصویر پر اصرار ہو۔ یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو انتخاب ہے۔ جہاں رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب۔ چھوٹے بڑے۔ اونٹ اہل سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا ہمیں میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہد زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسان کے ہل میں، سپاہی کے ہاتھ کی چھڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں۔ غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو۔ لیکن جو شمعیں وہاں روشن تھیں یہاں وہاں بجھا دی ہیں۔ انہیں ہی بجھا دیا گیا۔ تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں۔ وہ کیسے جگمگائیں گی؟ ایک کراچی میں جو آپ کے ہم عصر ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لیے انہیں اس بیگانہ تجسم ماحول میں کتنی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرشتے نیست کہ در سعی آں عدم نیست　　روز مولود جہاں کم ز شب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی تو پھر اے دوست ہم سب کو وہاں جا بسیے۔ کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ وسیع پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ بڑے بڑے ارباب حل و عقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہیے کہ ؎

منزل ما ہمہ دوراں و دگر بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

برج بانو

کنہیا لال کپور

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ اس کے عجیب و غریب نام کی کیا وجہ ہے؟ یہ تمام سوالات جس آسانی سے کیے جا سکتے ہیں، شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جا سکیں۔ تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرا سکوں۔ برج بانو ایک خوب صورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ کیا میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوب صورت عورت تو کجا کسی بدصورت چنڈال کو بھی اغوا کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے برج بانو کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے۔ آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ بہرکیف، وجہ بیان کیے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سند پیش کرنی پڑے گی جو ایک بارسیش بزرگ ہے۔ مجھے اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں۔ اور مجھے میری طرح اس عورت سے عشق ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عورت لوگوں سے عشق کرتی ہے؟ آپ نے غلط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی موہنی کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے۔ میری عمر تیس برس کی تھی جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف چھبیس سال ہے عشق کرنے کے لیے نہایت غیر موزوں ہے۔ لیکن میں مجبور تھا اور صرف مجبور ہی کیا عاجز ہے۔ لکھنؤ میں ایک شخص رتن ناتھ سرشار ہوا کرتا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان کے چٹخارے پر کچھ ایسا مرمٹا۔ کہ ساری عمر اس کا لطف اس کی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی۔ جس کا ہر مصرع باکی سو صفات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔ لیکن چند دنوں سے اداس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پچھلے چند دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے۔ ایک لمبی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسائے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے: "لالہ جی یہ کیا جھک ہے۔ آپ کے گھر ایک ایسی عورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا؟ اور میرے کئی لمبے بالوں والے دوست مجھ سے بار بار

کہہ چکے ہیں: "آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرحد پار کرنے سے پہلے آپ اسے ستلج کی لہروں کی نذر کر دیتے!"

میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں۔ تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دل پر جو گزرتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بیچاری ہر روز ملی کئی سُن سُن کر تنگ آ گئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت جب وہ ٹیرس میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا: "برج بانو، میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے!"

"لیکن کیوں" برج بانو نے چونک کر کہا "میرا قصور؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا!"

"لیکن میری ماں تو ہندو تھی"

"ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا"

"یہ عجیب منطق ہے"

"جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی دال نہیں گلتی"

وہ اور بھی اُداس ہو گئی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "برج بانو تمہیں اب یہاں سے "اوشیہ" چلے جانا ہوگا"

ایک لمحہ کے لیے وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اور پھر کہنے لگی۔

"اوشیہ" کسی شہر کا نام ہے کیا؟"

"شہر کا نام نہیں "اوشیہ" ہندی زبان میں "ضرور" کو کہتے ہیں"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی "میری پڑنانی بھی "ضرور" کو "اوشیہ" کہا کرتی تھی"

میں نے پوچھا: "تم ضرور کو "اوشیہ" کیوں نہیں کہتیں؟"

برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا: "کہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے"

"بس اسی لیے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا"

یک لخت برج بانو کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا: "ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟"

"تمہارا گھر پاکستان ہے"

یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دہلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھونپڑی اور شباب لال قلعہ دہلی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ لگایا۔ دیوان عام میں مجھے رہنے اور اونچی مسند پر بیٹھا یا گیا۔ اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی حسینہ میرے حسن، میری جھڑک اور جھٹکے کی تاب نہ لا سکی۔ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہوں گی!"

"یہ درست ہے پر تو.....!"

"یہ پرنتو" کیا بلا ہوتی ہے جی؟" بری باؤ نے شرارت سے کہا۔

"پرنتو" ہندی میں "لیکن" کو کہتے ہیں۔"

"ہاں یاد آیا۔ میری نانی بھی "لیکن" کو "پرنتو" کہا کرتی تھی۔

"تمہیں اب "لیکن" کو "پرنتو" کہنا ہوگا۔"

"معاف کیجئے۔ میں تو "لیکن" کو "لیکن" ہی کہوں گی۔"

"یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ اگر "لیکن" کو "پرنتو" نہیں کہو گی۔ تو تمہیں یہاں کھے گا کون؟"

"ہر وہ شخص۔۔۔۔۔"

مگر ایک قلفی بیچنے والا میری ڈیوڑھی کے آگے ٹھہر گیا۔ بری باؤ اپنا آخری فقرہ مکمل کیے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے قلفی والے کو جاتی ہے۔

"قلفی کھائیں گے آپ؟" وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

"کیا یہ قلفی کھانے کا وقت ہے۔ میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں"

"پہلے قلفی کھا لیجئے۔ اس کے بعد ٹھنڈے دل سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔" اور وہ قلفی والے کو مخاطب کر کے پوچھتی ہے۔

"کیسی ہے یہ قلفی تمہاری۔ میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یونہی سی"

قلفی والا کن انکھیوں سے بری باؤ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے "ابھی کیا پوچھتی ہیں آپ۔ میری قلفی ہے تعبیر، لاجواب، شاندار۔"

بری باؤ کے مغموم لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور قلفی کھائے بغیر قلفی والے کی ہتھیلی پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتی ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔

قلفی والا چلا جاتا ہے۔ میں اسے بیٹھنے کے لیے کہتا ہوں۔ لیکن وہ بدستور کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ پاکستان جا رہی ہو نا؟"

وہ میری بات ان سنی کر کے ایک سکوڑ دار چور کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے "وہ دیکھئے"

میں لاری کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لاری کے فریم پر چند اشعار اردو میں لکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

دو دو بار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لاری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ "چنا زور گرم" بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے املی اس میں ڈالا ہے مرچ مصالحہ چنا لایا ہوں بازار سے چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں۔ برج بالا ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے۔ لیکن جونہی اس کی پہلی نظر سرخی پر پڑتی ہے اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ جلی حروف میں لکھا ہے "برج بالا اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی"۔

ایک لحظہ کے لیے اس پر گویا بجلی سی گرتی ہے۔ وہ دھم سے زمین پر گرا چاہتی ہے۔ لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔

دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں: "خدا نہ کرے تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا!"

وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے: "میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی"۔

"لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ....؟"

"حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں گلفی والے، سکھ گوریلے اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی"۔

"خدا کی قسم — بڑی ضدی ہو تم!"

برج بالا مسکرا رہی ہے اور میں گلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں: "لاجواب! شاندار! بے نظیر!!"

سفرنامہ جہاز باد سندھی کا

شفیق الرحمٰن

بسم اللہ، دیباچہ فسانہ نغمہ زنی عندلیب خانہ، نغمیں تراز راست براست، بلکہ کراست، اپنی تذکرہ جہاز باد سندھی کی عنہ۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے، مدت مدید و عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک نوجوان تخت و نزار کہ جسے نوجوان کہنا بڑی خوش فہمی تھی، اپنی آفس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دراز قد کا جہاز باد تخلص سندھی اور لقب خود، علیہ اس کا فاقہ زدہ تھا اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن توڑ رہی تھی۔ شیو اس نے ہفتے بھر سے نہیں کرایا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو بھی رکھا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انگلو انڈین طبقے سے متعلق تھا ——!

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی، ملازم کو اگلے روز بخشش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑتا کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ ایک عالیشان محل کے سامنے اسے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی جیسے خیالات کی روانی میں دفعتاً الجھن پیدا ہو گئی ہو۔ چونک کر دیکھا تو پچھلے پہیے میں پنکچر ہو چکا تھا۔ اتفاق کا دن تھا اور دکانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات جو ایک پمپ اور پنکچر لگانے کا ذرا سا سامان لے کر سائیکل ورکس کھول لیتے ہیں، اور پر دو پر انسٹرکٹ کہلاتے ہیں، غائب نکلتے ہو چکے تھے۔

اتنے میں محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی عینک مسرت سے چمک اٹھی، اس نے بڑھ کر پمپ مانگا۔ اس شخص نے دیدیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ تب وہ مرد خانہ زیر ہونٹ مسکرایا۔ اس کا چہرہ ایک چوڑی سیاہ گھنی اور عمدہ مونچھوں سے مزین تھا۔ اور بولا —— اے مرد ناداں! مزید کوشش عبث ہے۔ کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہوا۔ دروازے پر پہونچا تو عینک کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لکھا تھا —— "جہاز باد سندھی تشریف لائیں"

ذرا قریب گیا تو مرغان نوا سنج کی زمزمہ پردازی دل کو لبھانے لگی، ہزار و طوطی کی صدا آنے لگی، انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے دماغ جلد معطر ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ عالم بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمہ دلربا اور رباب کی آواز خوش کانوں میں آئی۔ طعام لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ ماہ

خوشگوار کی صراحی غلغل کی صدا سنائی تھی۔ دیکھا کہ احباب بذلہ سنج اور خاتونیں ذی مرتبہ رنگ رلیاں منا رہی ہیں۔ بیجھولیاں قہقہے لگا رہی ہیں۔

جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے۔ مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بدطالع، بدبخت ہے، کوئی صاحب تاج و تخت ہے۔ اس مکان کے مکین پر بڑی متانت ہے اور مجھ گناہگار پر یہ عتاب۔ یہ کسی شاہ فلک بارگاہ کا ایوان سپہر توامان ہے، یا دوزخ عصیان ہے۔ کہیں جو ہے تو کہیں نہیں ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس مرد قوی مونچھ نے آکر پیغام دیا کہ صاحب مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا ——— وعلیکم السلام اور روانگی کا قصد کیا۔ مگر وہ مرد قوی ہیکل کہنے لگا کہ صاحب خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز باد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو صاحب خانہ کوئی ماہر نفسیات ہے۔ جس نے اتنی دور سے میرا تجزیہ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مونچھ چھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ جہاں شاندار دعوت منعقد تھی۔ حیرت ہوئی کہ یا الٰہی اتنی خوبرو اور گلبدن حسینان پری شوخ و شنگ رشک گل رخان فرنگ کیونکر ایک جگہ پر جمع ہیں۔

جہاز باد سندھی کلاں بڑے تپاک سے ملا اور گویا ہوا ——— "اے محرز اجنبی حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹلیکچوئل معلوم ہوتے ہیں۔"

جہاز باد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز باد کلاں کی باچھیں کھل گئیں ——— "الحمد للہ۔ یہ خاکسار بھی کبھی انٹلیکچوئل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے ہیں جو انٹلیکچوئل ہیں۔ ہونے والے ہیں یا کبھی تھے ——— آپ ان سے ملئے۔"

سب خوب بغل گیر ہو ہو کر ملے۔ اگرچہ جہاز باد خورد گدگدی سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ عید کے روز چھپتا پھرتا۔ تاہم ایک موہوم سی امید پر اس نے بغل گیر ہونا شروع کر دیا۔ لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سرخ لباس والی حسین شہزادی سے بغل گیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی ——— "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ———"

جب دونوں جہاز بادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محفوظ بھی۔

جہاز باد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا ——— "پیر و مرشد ابھی سورج نظر آتا ہے۔ غروب آفتاب سے پہلے وہسکی سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ بیئر وقت کی چیز ہے ———"

جہاز باد کلاں یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گیا۔ عش عش کرنا چاہتا تھا لیکن شہزادیوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا اور یوں بولا "اے بامذاق انسان بیئر کا گلاس نوش جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ تیری سائیکل ہم نے مرمت کے لئے بھیج دی ہے"

ہوا شافی کہہ کر وہ جام جہاز باد خورد نے پیا اور دوسرا اٹھانے لگا۔ جہاز باد کلاں نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ——— "اے نوجوان سلیقہ شعار ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولو کہ خدائے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے نوا کو چشم زدن میں صاحب دولت و جاہ کرے۔ اور قارون سے مالدار کو ذرا سے اشارے سے تہ خاک و تباہ کر دے تو ضرور حیران ہو گا کہ یہ تمہیں ہم کو مکرر مبتلائے ہیں یہ فرمانبردار بیئر سے جنہیں سنائی بھی دیتا ہے۔ یہ افرنگی بیئر جو غلط شدہ غم صبح کرتی ہے یہ پڑ روشنی محفلیں، یہ سب کچھ ہمیں یونہی نہیں ملا ——— ہم ———"

"واحد متکلم صیغہ استعمال کیجئے ———" ایک طرف سے آواز آئی۔

تحائف کیجئے، تو اس کے لئے مجھے کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اس کا ذکر میں ابھی سناؤں گا۔"

محفل میں یکلخت کھلبلی سی مچ گئی۔ کوئی گھڑی دیکھنے لگا۔ کسی کو ضروری کام یاد آگیا۔ کسی نے کہا ابا جان انتظار کر رہے ہوں گے، کوئی بولا یہ کہانی کئی مرتبہ سنی ہے کہ زبانی یاد ہو چکی ہے۔ جب سب جا چکے تو جہاز باد بادلاں نے خورد کے لئے چھتا گلاس انڈیلا، کباب سامنے رکھے اور کلام کیا۔

جہاز باد سندھی کا پہلا سفر

نخست اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

"اے میرے عزیز ہم نام تو نے ان شہزادیوں کی مینا چنی دیکھی، حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہ آیا۔ یہ میرے چشمے سے معلوم ہوتی ہے۔ نئی بوتل کھول اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھ۔"

"اے میرے محترم ہم نام ادھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر۔"

"یہ ان دنوں کا ذکر ہے ـــــ کلاں گویا ہوا ـــــ" کہ جب یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ ان دنوں جسے بادِ سندھی کہتا تھا، بعد میں سے۔ بی سندھی ہو گیا۔ اس علاقے میں کئی اور سے۔ بی سندھی بھی تھے۔ چنانچہ کلاں کا اضافہ کیا۔ تاجیر کو فنون لطیفہ شناسی، فنون حرب و ضرب، فنون جمع تفریق میں خاصی شد بد تھی۔ موسیقی میں وہ مہارت تھی کہ شدھ سارنگ، اشدھ کلیان، اشدھ کمود وغیرہ سب بجا لیتا تھا۔ لیکن طبیعت میں اس قدر سادگی تھی کہ ایک بھیڑیے کو لیسیٹن کتا سمجھ کر پکڑ لایا۔ اور کئی دنوں تک ساتھ ساتھ لئے پھرا۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو ایک بھیڑ کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔ سیب کے درخت کو بھی پہچان سکتا اگر اس میں سیب لگے ہوں۔ ورنہ پھلوں یا پھولوں کے بغیر بوٹے اور درخت میرے لئے یکساں تھے۔ نصیب دوستاں طبیل ہوا تو طبیب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ حقیر نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تعویذ نہ تھا، نسخہ تھا۔ ایک مرتبہ سر سر ملنے پر حکیم جی سے دریافت کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لغت میں قیولے کے معنے دیکھے تو بتا تا رہ گیا۔ برسوں دو پہر کے کھانے کے بعد سویا کیا۔ لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ ایسی معمولی سی حرکت کے نتائج قیولے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ کہ قاف جس کا حلق میں فلک شگاف گونج پیدا کرتا ہے۔ جب فارغ التعلیم ہوا یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جانثاروں نے سیاست کی طرف رغبت دلائی۔ فدوی نے رجوع کیا۔ اور مات دو دن پر گئی ترقی نصیب ہوئی۔ میری آنکھیں تحریروں نے کئی جگہ لاٹھی چارج کرایا۔ متعدد مقامات پر جوتا چلا۔ کئی اخبارات ضبط ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے جگری دوست تھے۔ جو بے حد معمولی صلے کے عوض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ فلک کج رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریریں تمام ہوئیں۔ چند ہی مہینوں میں خود عرش دنیا مجھے بھول گئی۔ محض میرے دوستوں کی وجہ سے۔"

"تو کیا آپ کے یہ دوست واقعی اہل کو لبیک کہہ گئے ـــــ؟"

نہیں! ان میں سے ایک تو ضلعدار بن گیا اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سوم۔ کچھ دنوں کے لئے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی پھر

شاعری کا شوق چرایا۔ مرحوم تخلص کیا۔ غزل میں رقم کا یہ عالم تھا کہ شعر کی درست سے پر بھی نہیں تار سکتا تھا اور دلیت سے پر بھی غزل کے بنے اگر طبیعت غیر حاضر ہوئی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ محلسرا کے باہر جو پھیلان کا بورڈ لگا ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چرا لیا۔ دروازہ نئے بورڈ سے مرصع کیا گیا۔ مجھے فوراً تبدیلی آب و ہوا خیال جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا۔ سب تعزیت نامے تھے حیران تھا کہ کس نے کس کی جان آفریں کس کے سپرد کی جو بورڈ دیکھتا ہوں تو کاتب نے غلطی سے خرم کی بجائے مرحوم لکھ دیا تھا اسی روز بورڈ بدلا۔ لیکن شہر بھر میں رسوا ہو چکا تھا۔ سند تخلص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ شاعری ترک کرنا پڑی۔ پھر سوچا کہ اسے مرزا باہمت شاعری کی تو کیا ہوا اور بہت سے جنبد شعلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اوسط عمر بیس بائیس سال ہے۔ تو یہ عمر بھی کی گذار چکا۔ اب اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ اور پیری مریدی کی طرف رجوع کر۔ ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس تاجر نے اس سلسلے میں بڑا مطالعہ کیا۔ بہاولپور اور سندھ کے ٹیلوں میں بیشتر وقت گذارا۔ قابل فقیروں سے ٹریننگ حاصل کی۔ جنگ سے بصیرت افروز ہوا۔ لیکن قسمت میں چکر لکھا تھا۔ کہ کسی ایک لائن کو سٹک نہ کر سکا۔ ایک دن اتفاق سے آڈس، ایکسلے، وربھیا ولف، برٹرنڈ رسل کی کتابیں ایک کباڑیے کے ہاں اتنی سستی مل گئیں کہ خریدنا پڑیں۔ چونکہ خرید چکا تھا اس لئے ورق گردانی ضروری ہو گیا۔ اچھا بھلا بیٹھا تھا اچانک بشارت ہوئی کہ تو اسٹیکچوئل ہے۔ اگرچہ یہ دیو بے سہارا کسی کے ورثے میں پایا تھا۔ تاہم خاندانی اسٹیکچوئل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ہاؤس جانا شروع کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور حلیے سے لاپرواہ ہوتا چلا گیا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف اس کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا۔ تو ایک پرندہ بالکل میرے سر کے اوپر سے گذر گیا۔ یہ واہمہ نہ تھا تشویش ہوئی۔ کیونکہ مقامی پرندے بڑے سست اور ڈرپوک تھے۔ اندھیرا ہو چکنے کے بعد بھی نظر نہ آتے۔ دل میں یہ شبہ یقین پایا کہ ہو نہ ہو یہ پرندہ ہما تھا۔ اس مژدہ جانفزا سے روح کو سرور حاصل ہوا اور طبیعت کو کمال درجہ سکون۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ پا سکا ہے۔ زندگی میں کسی قسم کی راحت ہے۔ دنیا میں امن ہے اور میں اسٹیکچوئل ہوں!

اچانک ایک سائنس دان دوست نے بڑی بڑی خبر سنائی کہ میں سالمہ ہر گز نہیں ہوں۔ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا جا رہا ہوں۔ سورج کے گرد ہر سال بیس کروڑ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کہکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جھکا جا رہا ہوں ـــــ ادھر کی گردش ادھر کی گردش اس طرف کی طرف، ہر طرف رواں دواں۔ میرے کانوں میں تیز ہوا سے شوں شوں ہونے لگی۔ چکر پر چکر آنے لگا۔ فوراً اسٹیکچوئل شراب دیسی پر پہنچا۔ اجیاں ہندوستانی شراب پیتے کر پی سکتے ہیں۔ اجب باہر نکلا تو دنیا تاریک تھی۔ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں شاہراہ پر ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دونوں کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری طور پر پیچھے ہو لیا جب چونکا تو اپنے آپ کو اکھاڑے میں پایا۔ غیر اسٹیکچوئل ہجوم کو دیکھ کر ریت بھر لیا۔ پہلوانوں نے طرح طرح کے پٹھے ساتھ بنائے ہوئے تھے۔ وہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا۔ ذکر خطاب جس نے پہلوان السندھ کا پایا تھا وہ ایک ہاتھ ہوا میں اٹھائے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا اکھاڑے کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا پٹھا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے محترم محترم کا ذکر نہیں کیا۔ کہ گھر میں کا ایک بیس صدی کی ایک طرز کی محلسرائے تھی جس کا نقشہ ملک فرنگ کے ایک ذی فہم بزرگ کاریگر نے تیار کیا تھا۔ اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں ذکر اہل فرنگ کی صناعی و جادوگری کا حیرت انگیز نمونہ ہیں اکھڑی جھرتی تھیں۔ وہ احتشام وہ دبدبہ وہ طمطراق تھا کہ اسٹیکچوئل جب سامنے

سے گذرتے تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ ویسے یہ مرد طرار تاب نول کا پورا تھا۔ فن تراش و طرازی میں اس کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس کے دروازے پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ اژدہام رہتا۔ کیونکہ آٹے اور چینی کا راشن اس کے اختیار میں تھا۔

کشتیاں ختم ہوئیں تو ماموں جان کی نظر اس طرف پڑ گئی۔ اس نے گردن سے آدھا چار۔ زور سے دھپ لگا کر بولا ـــ سنا بے گیدی یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ تمام تیرا کافی بادس اور مرلی نوجوانوں کی محفل ہے۔ ایسی جگہ آتے ہوئے اپنے تئیں شرم محسوس نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر وہ پہلوانوں کے غول کے ساتھ سوئے ڈیوڑھی روانہ ہوا اور اس فقیر کو کمال شفقت اٹھانی پڑی۔ سوچنے لگا۔ یہی مردک کبھی تانگے کے گھوڑے کی طرح لاغر تھا۔ خدا کی شان کہ پلٹتے ہی اس قدر توانا ہو گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی انگے شرم سے ڈوب مرے۔ اور اس پر ایسی گفتگو ـــ واللہ یہی جی چاہتا تھا کہ سڑک پر دراز ہو جاؤں۔ اور اپنے آپ کو جاں بحق تسلیم کر دالوں یکایک ایک صدائے روح پرور سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان اجو فقط ایک لنگوٹے سے مرصع تھا۔ ڈھول پر رقصاں ہے۔ نفس پر اس خاکسار کے پاؤں کو حرکت ہوئی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ تمام جسم میں حلول کر گئی یہاں تک کہ ضبط نہ رہا۔ اور بیخود اس قلندر خوش لباس کے پیچھے ہو لیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ ڈھول والے کی کمر پر ایک بورڈ ہے۔ چشم زدن میں چشمہ اجو ماموں جان کے دھپ سے اتر گیا تھا۔ جیب سے نکالا۔ آہ سرد بھری جس سے شیشوں پر چند قطرے نمودار ہوئے۔ قمیض سے عینک صاف کر کے ناک پر رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت پہنچی کہ بیان جس کا احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ بعد از مطالعہ انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیم ٹانک کا اشتہار تھا۔

غم محترم کا وہ ملعون جو اس ناچیز کی صحت پر مکمل کھلا حملہ تھا تیر کی طرح پیوست ہو چکا تھا۔ قصد انتقام کا یہ نیا زمند کر چکا تھا۔

ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کسی کو چینی دینے سے معذرت چاہی۔ کیونکہ حقیقتاً آٹے چینی کی کمی تھی جو اس کے احباب کے لئے درکار تھی۔ اس نے گاہک کو اپنی شیریں بیانی سے خوش کرنا چاہا۔ لیکن وہ شخص کہ شرارت کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ کاغذ کا ایک پرزہ دکھا کر تلاشی لینے کا متوقع ہوا۔ عین اس وقت جب وہ منشی دکان کے اندر گیا غم محترم اپنی ہوک میں بیٹھ کر مطمئن پہنچے اور خواہ مخواہ اسے تحت مفرنہ ہو کر سرحد کا قصد کیا۔ لیکن سب انتظامات پہلے مکمل ہو چکے تھے۔ ماموں جان کو روک لیا گیا۔ اور سرکاری مہمان خانے میں اس ملک میں جیل کہلاتا ہے۔ قیام و طعام کا بندوبست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں بلند مرتبہ اور عالی مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکی تھیں چنانچہ جب اسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے فقط پہلوان السندھ کا خطاب واپس لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمے نے نڈھال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور سیاست سے حد درجہ شغف تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلوان السندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لئے جان ہلکان کر لی جائے آپ پہلوان الہند بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ فاضل اجل علامہ اقبال فرما گئے ہیں ـــ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

میرا ماموں اس پر بھڑک اٹھا اور کہنے لگا ـــ "واہ واہ۔ مگر برخوردار اس کا اگلا مصرعہ کیا ہے؟ وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہوگا"

"دوسرا مصرعہ اے محترم عشق کے امتحانوں کے متعلق ہے"

"واہ، تو عشق کے امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کون سی یونیورسٹی لیتی ہے؟"

میں نے اس مرد جاہل سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ گو یہ شخص غم اس ناشدنی کا تھا۔ بزرگوں کا ادب

پاس حکم خداوندی ہے۔ مگر جہالت اس کے چہرے پر بچپن کی طرح یوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔

"عشق کے امتحانوں کے متعلق کیا فرماتے ہیں علامہ؟" اس نے اصرار کیا۔

"یہ دوسرا مصرعہ اے عم محترم آپ جیسے پیر فرتوتوں کے لئے نہیں، مجھ جیسے نوجوانوں کے لئے ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ پہلے مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں۔" میں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ستاروں سے فقط دلچسپی نہیں" ذرا وہ آہ سرد کھینچ کر بولا "مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لائن میں ہے۔ اور برخوردار تو گستاخ ہوتا جا رہا ہے۔"

اس نے اپنی انگلی کا ٹھیکا بنا کر میرے سر کے مختصر سے گنج پر مارا، نہایت مترنم آواز نکلی جو کانوں کو بھی مطلوب ہوتی۔ میں نے خودداری نے نعمت و ملامت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر اسٹیشن پہنچا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اے مرد جہول! کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا پھرتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا۔ اور ساری کتابیں ایک بھٹیارن کے حوالے کیں کہ وہ بقدر ضرورت استعمال میں لاوے۔ اور ریڈیم تانک پز کھانے اور مگر گھانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ڈنٹر پیلنے کے بعد تین گولیاں کھانا، الچ کی مشکیں نکالنا۔ لنج پر چار گولیاں، پھر ڈنٹر اور مگر، رات کو پانچ گولیاں ہفتہ گذرا ہوگا یقین جانیے۔ بدن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ اندھیری رات میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اٹھویں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شہر پر سواری کی جائے۔ تانگوں کس کر چڑیا گھر پہنچا۔ مگر شیروں کو پنجروں میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کر لی گئی۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کیوں نہ عم محترم کی خبر لی جائے۔ چنانچہ اسی نکوٹ میں ماموں کی محلسرا پر پہنچا۔ نوکر جا کر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں بستر استراحت پر بحالت صفوع و خشوع دھاڑیں مار رہا ہے۔ کہ اے باری تعالیٰ میرے اس نابکار بھانجے کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے۔ اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس کی ڈیوڑھی پر سکارڈ اور کیڈی لک جھومتی تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی انٹلکچوئل کی بددعا تو نہیں لگی۔"

"بس بس اے مرد بدبخت اٹھ! میں نے تیرے فیل نہ ہونے کا راز پا لیا ہے۔ اور خبردار جو کسی انٹلکچوئل کو برا بھلا کہا ہے تو۔ خبردار جو کسی کو بھی برا بھلا کہا ہے تو۔ کیا ہم سب ایک جیسے نہیں، سب برابر نہیں۔ میں برابر ہوں برنارڈ شا کے۔ برنارڈ شا برابر ہے کنفیوشس کے کنفیوشس مساوی ہے ابن بطوطہ کے ——"

اے عزیز از جان بھانجے، آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ۔ تیرے تن میں جو روح کی تھی وہ میں واپس لیتا ہوں۔" اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

دفعتہً مجھے محسوس ہوا کہ صحت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل چکے ہیں۔ مجھے انٹلکچوئل بنا دو بھوکھا دینے لگا۔ کہ اس طبقے میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انہیں لوگ سمجھتے نہیں ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا جیب خرچ طبیبوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ صحت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لئے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سن کر ممبروں کو احساس کمتری ہو جاتا ہے۔ اور وہ خواہ مخواہ فیل کر دیتے ہیں۔ ویسے ہلکا ہلکا دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے کے

اور کچھ تیر نہیں آتا۔ اور ہوا میں قرائت نہیں۔ سچ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بلا جب عیدگاہ میں دو بزرگوں کو بغل گیر ہوتے دیکھا۔ دونوں بھلے تھے مگر بلا کے انٹلکچوئل تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلائے، مسکرائے، از لب کلمات خوشگوار لوٹے۔ ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلطی کا احساس ہوا۔ تو نعرے بلند ہوئے ـــ "کہاں چلے گئے؟" "میں تو یہاں ہوں اور تم؟" ـــ "یہ رہا"ـــ

مڑے اور بغل گیر ہونے کے قصد سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ پھر نشانہ خطا گیا۔ تیسری مرتبہ بغلگیری پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک انٹلکچوئل استاد سے بغل گیر ہوتے وقت جو کمر پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ ان کی دم غائب تھی۔ جاگا تو بہت شرمندہ ہوا۔ اسی دن سے میں نے اس انٹلکچوئل پنے بلکہ PSEUDO INTELLECTUAL پنے سے کنارہ کشی کر لی ـــ "بھئی تو سن رہا ہے اونگھ رہا ہے؟"

"نہیں تو ـــ" جہاز باد خورد دفعۃً جاگا۔

"اچھا بتا میں کیا کہہ رہا تھا ـــ؟"

"جہاز باد جندی در باز جہاز زندی، نہاز باد نندی ـــ"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا کا اثر ہے ـــ"

"ہرگز نہیں! یہ سفر بہت لمبا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ پیدل طے کیا گیا تھا۔ اور باہمدم وہ پرندہ کون سا تھا جو آپ کے سر مبارک کے اوپر سے گزرا؟"

"اے ہمدم نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرندہ وہ بوم تھا کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گزرا۔"

کہا تمام پہلا سفر جہاز باد سندھی کلاں کا، رخصت ہوا جہاز باد سندھی خورد کا ساتھ وعدہ آنے کے اگلے روز بغرض ساعت سفر دوم۔

اگلے روز جب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات شامل تھے۔ خورد و اور کلاں۔ ہر چند کہ کلاں نے شہزادیوں کا بے صبری سے انتظار کیا۔ بارہا ٹیلیفون کیا۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ ناچار چائے منگوائی۔ خورد چار دیکھ کر نہایت غمگین ہوا اور یہ مصرعہ زبان پر لایا چار را کی چاہ درپیش ـــ لیکن کلاں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بولے ـــ

جہاز باد سندھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی

اے عزیز از جان ہم نام ایک دن جوک میں میں نے ایک شخص کو ہجوم کے سامنے تقریر کرتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ سب لوگ برابر ہیں سب خود میں برابر ہیں۔ سب بچے ایک سے ہیں۔ لہٰذا سب کو برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی ہے اس میں سفر کیجئے۔ ساڑھے چار آنے میں سیکنڈ شو دیکھئے۔ اندھیرا ہو جانے پر اندر آ جائیے ـــ اور روشنی ہونے سے پہلے باہر نکل آئیے میونسپلٹی

نے کہیں کہیں ریڈیو نصب کئے ہیں۔ اور ان پر موسیقی (جو اسی فیصدی فلمی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سنی جا سکتی ہیں۔ ایک مثال پر کھڑے ہو کر فضا کی دوری میں تازہ رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک بٹن سے اور کوٹ سے سروبال نکل سکتی ہیں اور دور نشین بعض شرفوں سے گرہیاں نغمہ سی خوشامد سے بآسانی محبت کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ مت بھولئے کہ سب لڑکے ایک جیسے ہیں۔ اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس ہیں ـــــ"

"وہ روس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شبہ سا ہوا۔ اگرچہ معلومات اس احقر کی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں۔ تاہم بحث کرنی ہو تو گھنٹوں بول سکتا ہے۔ اسے ہم نام خورد و تیرا روس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"اسے ہم نام کان معلومات تو میری بھی ایسی ویسی ہیں۔ اگرچہ میں نے گراؤچو مارکس کی لکھی ہوئی مشہور و معروف کتاب 'سرمایہ داری' پڑھی ہے ـــــ"

"نہیں یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے۔"

"تو وہ بھی تو مارکس برادرز میں سے ہوگا ـــــ مارکس برادرز کو ماشاء اللہ کون نہیں جانتا۔"

"خیر تو میں تقریر سنتا رہا۔ اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی۔ خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی۔ معلوم ہوا کہ اس پارٹی میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو تین شہزادیاں تو واقعی خوب تھیں۔ ناچیز نے چشم و دل کو ان کی دید سے تر و تازہ پایا۔ اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔

لیکن یہ چلا کر شامل ہونا آسان نہیں۔ کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سرپرست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی یا نے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیبوں کا اصرار ہے کہ سبزیاں بچوں کی بہبودی کے لئے از حد اشد ہیں۔ ادھر بچے ہیں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کو چھوتے تک نہیں۔ میں نے ان حضرت سے مل کر اس مہم کا بیڑا اٹھایا۔ چند کاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں۔ کچھ ٹاٹر بالائے طاق رکھے۔ شلجم کتابوں کے نیچے چھپا دیئے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فراوانی ملیں تو سمجھے کہ انہوں نے چرائی ہیں۔ خوب سیر ہو کر کھائیں۔ ان کے ابا نہایت خوش ہوئے اور اپنے پیارے کتے کا کرنے لگے۔ جو عیل عقد کر دوائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دوائی اس سگ بالکار کے دہن میں ٹھونسنا چاہی جب اس نے متواتر نارضامندی کا اظہار کیا تو شیشی فرش پر پٹخ دی۔ تس پر اس سگ ناعاقبت اندیش نے زبان سے ساری دوائی چاٹ لی اور کیفر کردار کو پہنچا۔ وہ حضرت کمال درجہ مہربان ہوئے اور بولے ـــــ "اے مرد عاقل تو دولت لغبات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا مانگتا ہے؟"

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہوتا۔ الحمد للہ کہ اس مرد گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گذرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگرٹ کا ٹین کھولتا سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے، چیزیں، روپیہ استعمال کرتے۔ ویسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے۔ لیکن جب کام پر جاتا ہوتا تو نہایت سادہ اور کھردا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا۔ سر پر ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی۔

واسکٹ اور جیبوں کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا کہ کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا، پوسٹر لگانا، خاص خاص جلسوں میں تقریر کرنا جہاں کوئی کھیل تماشہ ہو، بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور و غل مچا کر رنگ میں بھنگ ڈال دینا۔ اس کے لئے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹولی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے نفرت تھی۔ مگر یہ خاکسار محض شہزادیوں کے لئے شریک ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ نہ سیکھ سکا اور ویسے کا ویسا رہا۔ آگ شلک و تر کو کہاں جلاتی ہے۔ شہزادیوں کے قرب نے خرمن صبر و شکیب پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ تقریریں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سوالوں میں تو خوب تبلیغ کی گرمیاں آئیں تو تیز دھوپ سے ان کی رنگت سنولانے لگی۔ ہر جگہ پگھلوں اور برف کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹر بھی کتنی بار بگڑ جاتی اور پیدل چلنا پڑتا۔ شہزادیوں کو شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ ادھر ہم کتنے تھوڑے ہیں لوگ ان پر شبہ ہی سمجھتے نہیں بلکہ اب تو لوگ ہم سے چڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کرنے کیوں نہیں نکلتیں۔ اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ایک شہزادی نے خان بہادر قلندر بیگ سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ خان بہادر موصوف کی گزشتہ سے پیوستہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک راستے بہادر کو چنا جو سب کی رائے میں کافی بزرگ تھے۔ جن کی بیوی کے متعلق افواہیں اڑی تھیں کہ سرگرمیاں ہو چکی ہیں۔ یا ہونے والی ہیں۔ یہ تازہ شگوفہ جو پھوٹا تو یہ تاجیر ساری چوکڑی یک دم بھولا۔ لیکن پھر سوچا کہ شہزادیوں پر بھروسہ کرنا دلیل حماقت ہے۔ ان کی استقامت کا دم بھرنا بھی جہالت ہے۔ یکایک تیسری شہزادی نے ایک دولتمند زمیندار سے عقد کیا جس نے فوراً دو مرتبے تج کر ایک پیکارڈ خریدی، الغرض خواں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک بے وفا کو میں نے لکھ کر بھیجا۔

ع جو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

جواب آیا۔

بہت دنوں کے تقابل نے تیرے پیدا کیا
وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے، سوچنے کی آزادی، جو جی میں آئے کر گزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذلیل و خوار کیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر بازار اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب جا کر نصیحت شروع کی ہی تھی کہ نوجوان نے ترچھا وار کر کے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑ دی۔ دو ماہ ہسپتال میں پڑا رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا ——— میں نے آزادی گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادی کردار۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشدنی کو نظر آیا۔ ایک رات سوتا کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گذر رہا ہے۔ یکایک آسمانی دی۔ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آواز دوسری بار حیران ہوا۔

"میں نے جھری سے ——— گھوڑے نے بڑی سلیس اردو میں کہا۔" اور میں کیوں نہ بھروں۔ میں بھی تو جاندار ہوں۔ منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ قادرون کی تھیوری کے مطابق ہم سب ارتقا کی مختلف منزلوں پر ہیں۔ ہمارا ماخذ ایک ہے۔ لہٰذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اسے میرے کزن! میں تھک گیا ہوں، اب

تم گھوڑے جو اور میں سواری کروں گا ـــــ"

چار و ناچار اس خیر کو گھوڑا بنایا، باری باری ہم نے سواری کی جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلتے تو بہتر تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اپنے کرن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہر نفسیات سے ملکر آپریشن کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بولا۔ ان دنوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدرجہا بہتر ہے

صبح جاگا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا۔ اور کوئی سواری میسر نہ تھی۔ نقل و حرکت محال ہو گئی۔ سائیکل چلا چلا کر برا حال ہوا تو عقیدے بدلنے پڑے۔ ادھر شہزادے بھی منتشر ہو گئے۔ کچھ رجواڑوں میں جا بسے ایک دو ایکٹرس گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے ایک رہ گیا تھا۔ اسے ہر وقت یہ وہم رہنے لگا کہ ؎

شاید کہ پولیس خفیہ باشد

وہ بھی سنا کہ نائب تحصیلدار بن گیا ـــــ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا۔ عزیز الفقر ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم ہی پتھر بن جائے۔ مجھے احساس ہے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ آج ویسی شراب مانگتی ہے کہ چھلکے اور کرنے

اگلے روز جب ماہتاب شب نے چادر سیاہ میں رخ انور چھپایا اور شاہ قادر نے اورنگ سپہر پر جلوہ فرمایا۔ (یعنی جب صبح ہوئی) ـــــ تو دونوں جہاز بادوں کو آرام کرسیوں پر سوتا پایا۔ کہ ساتھ ان کے جنس خرگوش بھی خوابیدہ تھے۔ آنکھ کھلنے پر غنچۂ صبح کھلکھلایا۔ مرغان خوش الحان کی ترانہ سنجی سے کانوں نے لطف مزید پایا۔ جہاز بادوں نے شرمایا اور زبان پر یہ کلمے لایا۔

"اے مرد نیک طینت! بادۂ ویسی نہایت تیز نکلا، اب تک حالت خمار ہے۔ آج اچھی طرح اس شعر کے معنی سمجھ میں آئے ہیں ؎

جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

نہ بتا کہ تیرے عزیز و اقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہوں گے۔ شاید تھانے میں پوچھنے گئے ہوں ـــــ"

"میں خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعا سے تائب ہوں، تو پھر سناؤں میرا سفر ـــــ؟"

"ذرا صبر فرمائیے، مسند کلام کو زیر نظام لائیے۔"

اتنے میں ملازم نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ چھوٹا حاضری تیار ہے۔ چار پلیٹ کر کلاں ضبط نہ کر سکا اور یوں گویا ہوا۔

جہاز بادِ سندھی کا تیسرا سفر

دل سے شوق رہ نکل نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اے مرد مخلص! میں موسم گرما گذارنے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لئے عشرت افزا گلشن اور درویشوں کے لئے دشت خلوت کدہ ہے۔ جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان

قلمی طور پر ناآشنا تھے ـــــ یہ نام تھا ترقی پسندی۔

معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں ایسی خوشگوار ہوا چلی کہ بچہ بچہ ترقی پسند بن گیا۔ شاعری ترقی پسند ہوئی۔ ادب ترقی پسند بنا سارا ملک ترقی پسندی کے گن گانے لگا۔ ابا خانہ یہ غلام بہت خوش ہوا۔ ترقی کون نہیں چاہتا بہت سے احباب جو ملازم تھے۔ ترقی کے لئے مدتوں سے کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیش قیمت تحائف بھی دے چکے تھے

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر کیا جاتا کہ فلاں ترقی پسند ہے یا نہیں۔

ادھر ترقی پسند ادب کا ریکٹ بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک پبلشرز اور ایڈیٹروں نے حد بندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس فدوی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اسے بیحد عام فہم پایا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے ملتی تھی۔ تمام افسانے ایک جیسے تھے۔ ساری نظمیں ایک سی تھیں۔ تھوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بتا سکتا تھا۔ غزل کا مطلع سن کر پیشین گوئی کر سکتا کہ بقیہ اشعار میں کیا ہوگا۔ لوگ بڑی سرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے۔ جن حضرات کو میں سڑکوں پر سارا دن گھومتے یا کافی ہاؤس میں گپیں ہانکتے دیکھا کرتا اب اس نئی دنیائے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ حقیر شاعری تو کر چکا تھا۔ لہٰذا ادیب بننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اسی دھن سے ساز ملا کر اسی لئے میں الاپنا شروع کر دیا۔ میری چیزوں پر ترقی پسند حلقوں میں تو واہ واہ ہوئی لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ اٹھ کر پیچھے پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں دو مختلف کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منتظر رہتے ہیں۔ میں کچھ حیران ہوا۔ اور ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لئے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے۔

اس نے بتایا کہ یہ بیحد ضروری ہے۔

میں نے کہا ـــــ لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت توتو میں میں ہوتی رہتی ہے یہ مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانبدار رہ کر نہیں لکھ سکتا؟

وہ بولا ـــــ "اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجئے۔"

چنانچہ یہ حقیر نقاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مضمر تھا جو ابھی بتاؤں گا ـــــ ترقی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا ـــــ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا۔ جو لوگ لکھنے لکھانے کے علاوہ روزی کمانے کے لئے محنت کرتے ہیں انہیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل ـــــ سب کے لئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کا لیبل لگانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف ان مسائل پر قلم اٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت نہ میں پلاٹ کو جانچتا، نہ مصنف کے پیغام کو۔ نہ پیغام کی افادیت کو۔ ہر چیز میں وہی جانے پہچانے موضوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا۔ اگر مل جاتے تو ترقی پسندی کا ٹھپہ لگا دیتا ورنہ مصنف کو گمراہ کرنے والا سرمایہ دار، تنزل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔

"آپ نے فرمایا تھا کہ نقاد بننے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے ـــــ" خورد نے بات کاٹی۔

اس تو بات دراصل یہ تھی کہ اس وقت عنہ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں، ان میں سے دو ایک کو تو میں بھی جانتا تھا۔ اور کئی سال سے لگاتار ان پر فریفتہ تھا۔ لیکن انہوں نے میرا اتنا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ لکھتی دکھتی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ان کی تعریف کرنے لگوں تو شاید ملتفت ہو جائیں۔ موقعہ بھی تھا چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سراہنا شروع کر دیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا۔ لیکن تعجب ہوا کہ یہ مدح سرائی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہزادیوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے صدمہ ہوا۔ ادھر ادھر پوچھنے پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا۔ کیونکہ انہیں خشک اور ثقیل سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نقادوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

"ان کمیٹیوں کا کیا بنا؟"

"بتاتا ہوں، ٹھہرو ـــــ یوں تو ہر تحریک کچھ عرصے کیلئے مقبول ہو جاتی ہے لیکن اس نام سے خواہ مخواہ خوش فہمی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقی ہو گی۔ حالات سدھر جائیں گے۔ انسان ترقی کرے گا۔ دنیا بہتر ہو جائے گی ـــــ لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جرائم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی، اسی ہفتے اس پر نظم لکھ دی گئی یا افسانہ، اگلے مہینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کو ہر چیز زنا کا غذی تھا۔ اس تحریک کا مقصد تخریب تھا۔ تعمیر مقصود نہیں تھی۔ یہ میرو نہیں تھے۔ بلکہ اب تک غلط لکھنے والوں پر BETTINA کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریہ حیات مریضانہ اور قنوطی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مایوس کر جائے ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے نہ ہو گا۔ چنانچہ لوگ اس فنی ہتھکنڈے سے تنگ آ گئے۔ اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ انہوں نے فلمی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے۔ فلمی رسالے تو فراری ادب میں بھی شامل نہیں ہیں۔ سافٹ ایک عجیب و غریب ادب نے جنم لیا ـــــ موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے۔ جو انہوں نے ہاتھ کے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں ـــــ"

"جی نہیں، بور تو نہیں ہو رہا ـــــ" خورد بھائی نے کہ بولا "فراری ادب پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آیا۔ ملے ہوا کہ ہمارے محلے کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں۔ داروغہ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں فراری ادب پر سے آیا۔ تجویز نکالا کہ وہ جیلوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے"

"خیر تو یہ تحریک بدستور ترقی پسند رہا محض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس شب فتاز کو میں نے جنا بازار میں دیکھ۔ میں اپنے دوست کے ہاں جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا بازار کا نظارہ کر لوں۔ ایک سٹال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک حسینہ پر تمکیں کو قریب پا کر کتوں کی زنجیریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینہ مذکور سے کتے طلب کئے۔ اس نے کمال بھولپن سے کہا۔ "ایک کتا تو ابھی کے پیچھے بھاگ گیا ـــــ"

انگشت بدنداں سخت پریشان ہوا اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا۔

"ہوں بھاگ گیا ـــــ" اس نے دوسرا کتا جگاتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے لیکن ادا یہ اس کی اس درجہ بھائی کہ پھر عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اختر شاہدی شروع کر دی۔ اس علاقے میں جتنے اختر حسین، اختر حسین، حسن اختر، محمد اختر وغیرہ تھے سب کی قوالے مگر ناکام رہا۔

آخر ابھی کزن کی مدد چاہی۔ وہ خالہ جانی بلائیں سے کہ بولی ـــ "میں آج ہی اسے کلب میں بلاؤں گی۔" چنانچہ شام کو وہ ماہ جبین کلب میں آئی، اس ٹھسّے سے کہ بھاری فرشی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور پہنے، بہار عجب بہار دکھا رہا تھا۔ گلے میں جگنی، چمپا کلی، موتیوں کی مالا دھگدھگی، کانوں میں پنے بالیاں، ہاتھوں میں جسمین بند، الماس کے کڑے، بازو میں سونے کے چوڑے، ناک میں ہیرے کی نتھ، انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں۔ سر پر چمپا، اس تقریر نے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے
کہیں اڑ جائے نہ جگنی تری خوشبو ہو کر

لیکن میری کزن نے ہنسنے سے ہشت کر کے چپ کرا دیا۔ اور اس سے گویا ہوئی ـــ کہ کلب میں بلانے کا تو فقط بہانہ تھا۔ اصل میں تمہیں ایک پیغام سنانا تھا۔ میرا کزن، جوان رعنا خوبرو گلگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفتہ و والہ ہوا عشق کا بول بالا ہوا وہ ہزار جان سے تمہارے گل رخسار کا عندلیب شیدا ہے۔ آہ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہے۔ ماشاء اللہ عجیب غریب نوجوان ہے۔ عجیب آن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے۔ حسن و خوبی میں اپنا آپ جواب ہے۔ تم دونوں کی خوب نبھے گی جچے گی۔ وہ بھی کم سن، تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن، تم بھی دھان پان۔ وہ مجسمہ جادو آفرینی، تم سرو چمن زار نازنینی ـــ"

"اوہ! اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی ـــ" حسینہ نے بات کاٹی ـــ "والدین میری شادی کا تہیہ کر چکے ہیں تبھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دیئے گئے ہیں۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئمبر رچایا جائے گا۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سوئمبر میں شرکت کرے۔"

حسینہ کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رہنا ناچنا چاہا۔ زیوروں سے ایسی عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں کہ ارادہ ترک کر دیا۔ پھر سامنا ناچنے کی کوشش کی۔ مگر ایک دوسرے کے ملبوسات آپس میں الجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ رقص کی حسرت، حسرت ہی رہی۔

سوئمبر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہوا اشتہار دکھایا۔ جو ضرورت رشتہ کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا مگر ترقی پسندی کی جھلک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا۔

اشتہار برائے پبلک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے شہزادی دلیر جہاں کے سوئمبر کا ٹورنامنٹ شروع ہوگا اور مناسب اور معقول امیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اترتے ہوں:۔

۱۔ کنوارپنے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کے دستخط ہوں۔ اور امیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائیداد کی تفصیل درج ہو۔

۲۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

۳۔ دو معزز آدمیوں کے نام اور پتے جو امیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں۔ اور اس کے رشتہ داروں میں سے نہ ہوں۔

۴۔ سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

۵۔ طلسماتی چیزیں اتلاف زمینداروں اور خان بہادروں کی سفارشیں ممنوع ہیں۔

۶۔ امیدوار ایک ہفتے کا راشن، بستر اور وفادار ملازم ہمراہ لائیں۔

۷۔ مہاجر کو ترجیح دی جائے گی۔

۸۔ کامیاب امیدوار کو شہزادی ولیمہ کے علاوہ جائیداد کا تہائی حصہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ:۔ سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا امیدوار ایسی سزا کا مستحق ہوگا جو پچاس روپیہ جرمانہ اور تین ماہ کی قید تک ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سپورٹ پر انجام مسرت کیا۔ اور دعا مانگی کہ دنیا کی ہر شہزادی کی شادی اسی طرح ہو کہ ہے۔ فوراً کاغذات مکمل کر کے گھوڑا منگایا۔ سر پر ہی ٹکا کر سوار ہوا۔ اور سوئے ڈونامنٹ روانہ ہوا۔ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان لئے گئے۔ آئی کیو (I.Q.) بھی ٹسٹ کیا گیا۔ جو زیادہ ذہین تھے انہیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن ٹپکا۔ اسے سزا دی گئی اور فہرست سے خارج کرتے وقت اس کے منہ پر سفیدی مل کر شہر میں پھرایا گیا۔ تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسند امیدواروں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائیداد کا کون سا حصہ ملے گا۔ شمالی یا جنوبی۔ جواب ملنے پر وہ راتوں رات فرار ہو گئے۔ کیونکہ وہ علاقہ بنجر تھا۔ وہاں ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت تھی۔

خاکسار بھی فائنل جیت کر فائنل تک جا پہنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آ مرا۔ یہ مردک کہ بیحد نحیف و نزار تھا ایک بہت بڑی جائیداد کا اکلوتا وارث تھا۔ (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جا رہی تھی) اس مردود کے مقابلے میں یہ ناچیز قدرے مفلس تھا۔ مفلس عاشق کہلاتے ویسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
آدمی کا وقار کھوتی ہے

اس کمبخت کے آ جانے سے ڈونامنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سرمایہ دارانہ سوالات پوچھے جاتے۔ ادھر شہزادی کی اماں نے برادر زادے کے لئے رو رو کر برا حال کر لیا۔ آخر وہ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے اور فیصلہ اس ملعون کے حق میں کیا گیا۔

ڈونامنٹ کے نتیجے کی خبر وحشتناک سنتے ہی موم جامہ صبر چاک ہوا۔ ماتمی لباس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پر جوتا تھا۔ نہ پاؤں میں گوشی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلاف توقع مبارک باد دی۔ اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بیحد بگاڑ رکھا ہے شاید تو نے بیگم کو نہیں دیکھا جو دراصل ـــــ بے غم ـــــ ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی لحیم شحیم بن جائے گی۔ اگر یہ مجھے شاہا مرغوب نہیں لیکن واسطے نادانی کیا بتاؤں کہ ـــــ میں امیر دام فریبی رہا ہوں ـــــ سے نوجوان تو کھانے میں نہیں رہا ـــــ اس کے بعد

ترنم سے بولے) ؎

تم بھی بیاہ کر دو تو جانو
ہم دکھیوں کی فریادوں کو

اس بیان سے اس نیاز مند کی تسلی تو نہ ہوئی لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادیاں اس ملک کی ہر گز ترقی پسند نہیں ہیں ـــ

"یا پیر و مرشد ایک بات پوچھوں؟" فورد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"دو پوچھ ـــ"

"اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتائیے کہ کبھی آپ کو کسی سے سچ مچ محبت ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ التحصیل بلکہ فارغ التحصیل ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم کی کلاس میں ملتے، انسٹیٹیوٹ کے پاس جو باغیچہ ہے وہاں اکثر جایا کرتے۔ وہاں میں نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے رخِ روشن پر ایک خال ہوتا۔ یہ خال کبھی تو پیشانی پر ہوتا کبھی رخسار پر، تو کبھی ٹھوڑی پر اور کسی روز سرے سے غائب ہوتا۔ میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا ؎

صحنِ باغ پر ترے خسالِ گلفشاں ہوا
یہ غلام حبشی حسانِ فرسا آں ہوا

بس یہ اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا۔ اور سرے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا تھا۔ میں نے بھی سرخ ہونٹوں کی تعریف کی ؎

لال ہیں آپ ہی لب سُرخیِ بیاں دور رہے
ناز کی کہتی ہے یہ بارِ گراں دور رہے

اس پر شہزادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ بیان دان کی سرخی نہیں میکس فیکٹر کی بڑھیا لپ سٹک ہے۔ اگرچہ اس فقیر کو علم تھا کہ لپ سٹک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مٹک نہیں کرتی۔ تاہم موضوع بدلنا پڑا۔ اور پاسٹری کا ذکر چھڑا۔ وہ بولی۔ میں جانتی ہوں آپ اس بہانے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا میں انہیں چھو سکتا ہوں؟"

وہ بولی۔ "آپ اسی بہانے سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں۔"

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ کیا ترقی پسند محبوبہ تھی۔ بے حد مسرت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام مقررہ ہے تو فرار بزدلی میں شامل ہے ؎

بیاہ کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اسے شادی کے لئے کہہ دیا۔

بولی۔ "آپ خراٹے تو نہیں لیتے؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس پر وہ بولی ـــ "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جائیے اور میرے والدین کو منا لیجیے۔"

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس کمتر بن کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ پھر جدِ متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا گویا تہمت لگا رہے ہیں۔ پھر بولے۔ "اگر تم دونوں میں سے خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو لڑکی کے لئے کیا انتظام ہوگا۔ کوئی ذاتی جائیداد یا پیسے کی پالیسی ہے؟" پھر مجھ کو قصہ شروع ہوا۔ جیسے تیلی ہوتی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ نیک ہے اور میری آمدنی اتنی نوبت رہنے گی۔ آخر آپ اتنے لمبے چوڑے جہیز کے لئے کیوں مُصر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ "اگر میں تھوڑا لکھا گیا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ جائے گی۔ خیر یہ تحقیقات گئی۔

وہ چاہتے تھے کہ پرانی رسومات ساری ادا کی جائیں۔ میں مجبور ہوں کہ بجوم اکٹھا کر کے غل مچانا ایام جہالت کی رسم ہے۔ جب پبلسٹی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً انجمن تصویر چھپ جاتی ہے۔ اور پھر شور و غل سے یہ اثر بہت گہرا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آ جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ کچھ کر بیٹھا ہوں۔ لیکن وہ بدستور مُصر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک روشنیاں جلا کر خوب ڈھول بجائیں اور دعوت پر سارے ایشیا کو (سوا ایشیائے کوچک کے) مدعو کر لیں۔

وہ کمال درجہ رجعت پسند نکلے کہ زمانے۔

اسی طرح وقت گذر گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو خود تو دیکھو۔ دیکھا تو حلیہ بدل چکا تھا۔ جھنوں اکھڑنا، بال ترشوانا، ناخن بڑھانا ان خوبیوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جوتوں اور بیک اپ سے کسی روز بھید بھی معلوم ہوتی۔ گھر میں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تو چھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصل شکل دیکھنا محال تھا۔ چنانچہ عشق و عاشقی کو بادیدۂ اشکبار رکھا اور ان رجعت پسندوں کو ان کے حال پر چھوڑا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ تنزل پسند ایک ترقی پسند کو سر بازار پھول مار رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور بولا ـــ "اسے مرو سخن فہم یہ سب تو ہے کچھ بھی نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تو تو ترقی پسند ہے تجھ سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔"

اس واقعے کے بعد الجھن سی پیدا ہو گئی۔ کیسے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رخ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ ویسے میرے اور ترقی پسندی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید مجھے شہزادیوں کی وجہ سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ ہوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے گوئیں اچھلنے میں خاصی مہارت ہو گئی۔ ادھر علمی پرچوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں فقیر علمی نقاد بن گیا۔ اور علمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں ہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے والے میری رنگین تحریروں کو بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ ظرافت اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی سہیلیوں سے اسی بہانے دوستی ہو گئی۔ ترقی پسند اور رجعت پسند مجھ پر رشک کرنے لگے۔

"پھر کیا ہوا ـــ؟"

"پھر خاک ہوا دھول ہوا ـــ" کلاں نے جھلا کر کہا۔

"ابھی کتنا سفر باقی ہے؟"

"تو بڑا بے صبر ہے، اچھا لے سفر ہیں ختم ہوا۔ یونہی طبیعت ہلکا کر دی۔ اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تب آئیو ـــ"

سر شام جہاز باد خورد آن دھمکا اور بولا۔

"صبح جو کچھ ہوا۔ اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیسرا سفر دوبارہ سننے کے لئے تیار ہوں۔"

جہاز باد کلاں مسکرا کر بولا۔ "ہم معاف کرتے ہیں۔ اور چوتھا سفر پہلی مرتبہ سناتے ہیں۔"

جہاز باد سندھی کا چوتھا سفر

ـــ فضل بہار آئی پیر صوفیوں شراب
بس ہو گئی نماز شعلا اٹھائیے

اسے رفیق دوبرہ ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کتے کو مارنے کے لئے ایک وزنی سی کتاب اٹھائی۔ کتا تو دور جا چکا تھا۔ لہذا وزن گرانی کرنے لگا۔ اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جو اٹھا تو اپنے آپ کو پرولتاری پایا۔ سوچا کہ شاید مشیت ایزدی اسی میں ہے کہ پرولتاری بنوں ـــ"

اسے ہمدم طوطی گفتار، لفظ پرولتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہ ایک انگریزی لفظ کا نعم البدل ہے نہ دو میں۔ ڈکشنری دیکھ بہت کچھ معلوم ہوگا۔ پرولتاری بننا آسان کام نہیں۔ بڑی ہمت چاہئے دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکچروں میں جانا پڑتا ہے۔ پریکٹیکل الگ ہوتے ہیں۔ بہت جلد فدوی نے یہ کورس مکمل کر لیا۔ زندگی میں کئی تبدیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پرولتاریوں میں ہوتا۔ بڑی خوبی یہ تھی کہ پرولتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہمیں مذہب، سیاست اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی۔ ہماری افسری اور بصیرت ضرور ہل سن کر عوام چونک پڑتے۔ ہر مذہب کو ہم تضحیک وقات سمجھتے۔ انسانی رویے کے عالمگیر قوانین ہمارے لئے مہمل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول، ہر بیان کو ہم صرف شک کی نظر سے دیکھتے۔ بلکہ شکوں میں دھجیاں اڑا دیتے۔ عجب دن تھے وہ بھی ـــ! کیا رعب تھا کیا دبدبہ تھا ـــ سڑک پر پرولتاری چلتا تو لوگ ادھر ادھر ہٹ کر راستہ دیتے۔ جھک جھک کر سلام کرتے۔ کیا مجال جو کوئی ہم سے بحث کر سکے۔ ہندی نظریوں کے بعد دو بول خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بڑے سے بڑے ہجوم میں محض چند پرولتاریوں کی آمد قیامت برپا کر دیتی تھی۔

"بھاگ چلو بھاگو، پرولتاری آگئے" کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ ٹوپیاں اور جوتے چھوڑ جاتے۔

جہاں ہم نے مقامی پبلک کو آگے لگا رکھا تھا وہاں مقامی لوگ بیان تھیں کہ سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں۔ ہم مذہب دوستی، ایمان، اخلاق، عشق ـــ کے بر نیچے ضرور اٹھاتے تھے لیکن یہ سب دکھاوے کے لئے تھا۔ کبھی کسی ہمارے دل میں محبت کی آگ سے سلگنے لگتے ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے۔ مصیبت پڑتی تو دعائیں مانگتے۔ رہا نفسی جنس سو اس کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا غیر پرولتاریوں کا لیکن

ہماری معلومات کا ماخذ فرائڈ، اڈلر، یونگ اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا۔ اور ہاں میں بتانا بھول گیا کہ پرولتاری ایک انقلاب بھی چاہتے تھے۔"

"کیسا انقلاب؟"

"کبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب ——— بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے۔ بس انقلاب ہو کہیں، کسی قسم کا کسی سانحہ سے۔ چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لئے اکساتے۔ ہم جانتے تھے کہ ہنگامے، بلوے اور افراتفری ہے، دنگے فساد ہوں تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جائے۔ لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ یہی لڑکیاں جو ہم سے ملنا اپنی ہتک سمجھتیں، کلب میں وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چہلیں کرتیں ——— یہ حضرات بھی عجیب تھے، ویسے اچھے بھلے تھے لیکن اپنے آپ کو بیحد غمزدہ اور بدنصیب سمجھتے اس کی وجہ اپنی بے جوڑ شادی بتاتے۔ حالانکہ ہر ایک ماشاء اللہ بچوں کا باپ تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے۔ اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ سرٹرک سے غرض کرتے جو کہ ان کے پاس کاریں تھیں اس لئے یہ بورژوا تھے۔"

"اس ناچیز کے چچا جان جو خانساماں کار رکھتے ہیں۔ کیا وہ بھی بورژوا ہیں؟" خورد نے پوچھا۔

"ضرور ہونگے ——— تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لئے پھرتے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چالیس برس سے کم نہ تھا۔ پتہ نہیں انہیں اس میں کیا ملتا تھا؟"

غالباً انہیں سنہ تیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے، اور نئے سٹریم لائینڈ ماڈل درحقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں ——— خورد نے موقعہ عرض کیا۔

"مگر یہ نئے ماڈل ان کا خوب مذاق اڑاتے۔ ملتے ہی سوال ہوتا کہ آپ کی نئی بچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اترا یا بیوی کا کوئی نخرہ آیا؟ بڑی لڑکی کی کب شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے ہمیں ضرور بلائیے۔ مگر یہ بورژوا تھے کہ ——— "

"ویسے یہ بورژوا ہوتا کیا ہے؟"

"بورژوا وہ ہے ——— (کاں نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بتانے کی کوشش کی) جو ——— جو ——— بالکل بورژوا ہو۔ سنا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا اسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔"

"یا پیر و مرشد، ایونگ آن پیرس کی نئی نشستی پر ایک لفظ بورژوا لکھا ہوتا ہے ——— "

"اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے کتنے میں دخل دینا سخت ناواقفی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب برائیاں کیں اور انہیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس چھوٹی موٹی بھی نہیں ہے۔ بیک بس ان کا حساب صفر ہے بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ دار ہونے کیلئے سرمائے کی ضرورت نہیں، سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جس پر منحصر آتا ہے۔ وہ بولیں جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پرولتاریت سے اکتا چکا تھا لیکن یہ لگے کا ڈھول تھا۔ کچھ عرصہ بجانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں سے خریدی اور بورژوا بن گیا ——— دہنے بائیں سرٹرک سے فلرٹ کرنا شروع کیا۔ اور سرجاتی کے نام سے شہرت پائی۔"

"آ تو آپ ہر جائی بھی رہ چکے ہیں۔ ملاحظہ ہاتھ یہ تاشدنی بھی ہر جائی رہ چکا ہے۔ آ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ زندگی بہت مختصر ہے اور حسین چہرے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں ——"

"لیکن وہ بھی لڑکیاں تو سچ مچ پسند آگئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا ——"

"ہن سب سے ؟" خورد چونک پڑا۔

"نہیں، ایک سے۔ لیکن معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ میں وہ صرف لڑکے کے نقائص معلوم کرنا چاہتی ہیں انہیں فوراً پسند آجاتا ہے کہ ہونے والی ساس کس مزاج کی ہے۔ کہنے میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ لڑکے کی تنخواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ مرد بننے کے کیا امکانات ہیں۔ ننگی مزاج تو نہیں کہ ذرا دوسرے مرد سے بات کی اور خفا ہو گیا۔"

"پتہ نہیں —— البتہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے۔ خاوندوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرت سے انسان تب تک آشنا نہیں ہوتا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی —— لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

"یار تو بات مت کاٹ چپ چاپ سنتا رہ۔ یہ لڑکیاں بھی (MATERIALISTIC) تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میں ہر چیز سے بیزار ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف کھاتا جو خسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر بات ہونے سے پہلے اس قسم کی دعا مانگتا کہ —— اے پروردگار میرے حال پر رحم فرما رشیدہ کی کہیں شادی کر دے۔ نرگس بی غفور کی کہیں منگنی ہو جائے۔ میں دیتا معراجدین اور ڈوڈھی فضل کا بھی کہیں انتظام کرا دے۔"

"لیکن اس کا بوڑھا ہونے سے کیا تعلق ہے ؟ کاش کہ موضوع بدل جاتے۔" خورد جوانی دیر میں ڈکشنری دیکھ چکا تھا بولا۔

"بہت اچھا۔ اب اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے تجھے یاد ہوگا کہ الف لیلہ کے سندباد کی ملاقات سمندر پر سے ہوئی تھی جس کے چنگل سے بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی سفر سے واسطہ پڑا۔ سفر سے لوٹتے وقت میں ایک بندرگاہ پر اترا جہاں بندر ہی بندر تھے وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہوگا۔ جو میں گھنٹوں میں وہ فقط تین چار گھنٹے مجھے چھوڑتا ورنہ ساتھ رہتا۔ اس سے دور رہنے کے لئے کیا کیا جتن میں نے نہ کئے۔ منت سماجت کی، ڈرایا دھمکایا، آخر تنگ آکر خودکشی کی دھمکی دی تب وہ بولا کہ میں بھی ساتھ خودکشی کروں گا اور پالیسی دینے کے لئے اگلے جہان تک پیچھا نہ چھوڑوں گا جب میں نے سچ مچ پستول دکھایا تو بولا اسے مرد بنک خصلت! اگر تو واقعی خودکشی کر رہا ہے تو پالیسی مفت لے لے لیکن وارث مجھے بنا جا۔ جب اتنا عرصہ آیا کہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور سیدھا لاہور بازار میں الف لیلہ کا قدیم نسخہ طلب کرنے گیا۔ تاکہ کوئی ترکیب نکالوں۔ سندباد نے اس مردِ ناہنجار کو انگوروں کی شراب پلا کر مدہوش کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے بادۂ انگور پلا دیا لیکن الٹا شامت آئی کہ وہ اپنے تئیں ہوش میں رہا۔ کچھ دیر وہ بھی تباہی مچاتا رہا پھر اس خطرے کو زدوکوب کیا۔ مجھے حیران ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں اسیر دام بدہوا۔ خود گرفتار بجرم ہوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے بعد جب کہیں ملا تو خجل ہو کر رہ جاتا۔ خیر اس طرح میری نجات ہوئی الف لیلہ سے عقیدہ اٹھ گیا۔"

گستاخی معاف: خورد بولا۔ "شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے سنائے ہیں بالکل اٹل ٹپ ہیں۔ غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ سفر بھی نہایت بے تکا رہا۔"

مگر تو نے مجھے بار بار ٹوکا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دو مرتبہ کر تو لیا گیا ہے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سناؤں گا جب تک تو ہونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کرے ——"

"کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟"

"نہیں اپنے ——"

اور وہ دونوں خنداں ہوئے رقصاں ہو کر شک و شبہات دور ہوئے دل صاف ہوئے اور جہاز بادکلاں کا چوتھا سفر تمام ہوا۔

اگلے روز جب شہباز نجوم نے آفتاب پر جال پھینک کر شکار کیا سیاہ افواج کو شکست ہوئی ظلمت کی عمرانی ہوئی تب جہاز باد خود حاضر ہو کر بولا ——"یا استاد کلاں اپنا پانچواں سفر بیان کر میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کروں گا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں۔ اور دو بوتلیں بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لئے تیار سمجھ ——"

جہاز باد کلاں نے یوں کلام کیا ——

جہاز باد سندھی کا پانچواں سفر

"دل دکھا یا کسی گھپس نے کوئی گل توڑا
باغ سے نالۂ بلبل کی صدا آتی ہے"

اس پر خود پھر بول اٹھا ——"بھائی ایک صلاح ہم دیں گے، وہ یہ کہ آئندہ آپ ایسے اوٹ پٹانگ اور بے محل شعر کم از کم اپنے محل میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے۔ ان کا قصے سے کوئی سروکار نہ تھا ——"

اسے نوجوان جنت بخت! اعتراض کرنا تیری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایات قدیم کو مدنظر رکھتے ہوئے پڑھے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان گوئی اشعار کے بغیر نامکمل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ —— رواداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔"

"رواداری نہیں —— وفاداری بشرط استواری ——" خود رو نے ٹوکا۔

"اچھا یا وفاداری سہی۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا —— اگر تیرا پیر ہے تو —— تو خاموش رہ —— آج کا سفر بالکل مختصر ہے۔ اور غالباً آخری سفر ہوگا۔ لہٰذا آج کی رات ساز و رود نہ چھیڑ۔"

سن میں زیادہ دیر بور تو ہو نہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ سمجھ کر سکتے نہ صحیح لفظ کسی کو آتا تھا۔ بار بار معنی پوچھتے۔ ادھر میری کار بھی بک گئی تھی۔ سوچا کہ ذہنی ارتقا کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کئے تھے ورنہ کوئی بادِ بُرا نہ تھا۔ چنانچہ باہر نکلنے کی ٹھانی۔ موسم گرما گذارنے کے لئے سانگھڑ کا رخ کیا۔ کراچی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائیگی۔ وہاں نہ جانے کیا ہوا کہ خیالات اس تاثیر کے دفعتاً بدل گئے۔ غالباً یہ اوچھے طبقے کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ آخر اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں تو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل بے نیاز ہوں۔ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ طلب ہو تو خیر ورنہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام ہو۔ بلا غرض کسی کو ملتا نہیں کرتا۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں —— بھلا دنیا کے جھمیلے آج تک کسی سے ختم ہوئے ہیں۔ جو میں اور تو انہیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ پڑھنا لکھنا، ملنا جلنا یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ شہزادوں کی منوّر بے وفائی سے شادی

ہمیں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بچوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے۔ دو تین سال کھیلتے پھرتے بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی حفاظت میں بڑی مدد دی ہے۔ آپ کو بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں ——"

یہ کہہ کر وہ خود کو دریچے تک لے گیا۔ کواڑ کھولنے کی دیر تھی کہ دوسرے گھر سے چیخم دھاڑ سنائی دی۔ کئی بچے بڑی بھیانک آواز میں چلا چلا کر رو رہے تھے۔ خود نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں تو کانوں نے دریچہ بند کیا۔

"اے میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر بسانے یا آئندہ نسل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دریچہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں۔ اور پھر آئندہ نسل کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ جس روز میں اس جہان سے رخصت ہوا وہ دعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو تاندان کا نام روشن کرتے دیکھنے دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"اُف! ۔۔۔ ہیچ ۔۔۔ ہیچ ۔۔۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ۔۔۔" خود نے اظہار افسوس کیا۔

"اب میں NIHILIST ہوں، نی ہلسٹ!" کانوں نے اپنے سینے پر مکوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔ "خود! جو میں اخلاق کے معنے پوچھتے ہیں تو ۔۔۔ اور اسے مرد جلد باز میرے پانچوں سفر تمام ہوئے۔ آخر تک مجھے سات سفر کرنے چاہئیں تھے۔ ایسی دنیا کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ زندگی تک دو دن اپنی منزل میں نے پالی ہے۔ میرا مقام مجھے ہاتھ آ گیا ہے اور تو جو یوں بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو اپنے دو سفر تو کر آ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"جی نہیں ۔۔۔ ایسے اصول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے!"

"یہ محل میرا کہاں ہے الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں فلاسفر نے اخباروں رسالوں میں بڑے دلنشین بیانات چھپوائے کہ ہم پبلک اپنی اکادمی کھولنا چاہتا ہوں۔ پبلک نے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ دیا۔ دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے۔ خود سمجھ جاتی ہے ۔۔۔ دوسرے لفظوں میں! اسے دقیق نہ جانتی! یہ اکادمی کا ریکٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا۔ اور برخوردار تیری پوسٹ دار بھی کیا ہے؟ نوکری کے لئے اپنا نام رجسٹر کروایا؟"

"نام رجسٹر تو نہیں کرایا لیکن جس محلے میں رہتا ہوں وہاں چوبے بیاں اور کتنے بہت زیادہ ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں ۔۔۔"

"اس سے تو بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تو کافی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام مجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا موڈ یکلخت اوپر ہو گیا ہے ۔۔۔"

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے!"

"یہ گنجے پن کو تو شکر بنا!"

"ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی!"

"اخاہ! پھر تو بوڑھے نیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی بہشت کمائی ٹھیک کر۔ حجامت کرا، پبلک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دھلوا کر استری کرا ۔۔۔"

"کہیں مجھے ٹیلیکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں ۔۔۔"

ہمیں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بچوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے۔ دو تین سال کھیلتے پھرتے بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی حفاظت میں بڑی مدد دی ہے۔ آپ کو بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں ——"

یہ کہہ کر وہ خود کو دریچے تک لے گیا۔ کواڑ کھولنے کی دیر تھی کہ دوسرے گھر سے چیخم دھاڑ سنائی دی۔ کئی بچے بڑی بھیانک آواز میں چلا چلا کر رو رہے تھے۔ خود نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں تو کانوں نے دریچہ بند کیا۔

"اے میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر بسانے یا آئندہ نسل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دریچہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں۔ اور پھر آئندہ نسل کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ جس روز میں اس جہان سے رخصت ہوا وہ دعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو تاندان کا نام روشن کرتے دیکھنے دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"اُف! ۔۔۔ ہیچ ۔۔۔ ہیچ ۔۔۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ۔۔۔" خود نے اظہار افسوس کیا۔

"اب میں NIHILIST ہوں، نی ہلسٹ!" کانوں نے اپنے سینے پر مکوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔ "خود! جو میں اخلاق کے معنے پوچھتے ہیں تو ۔۔۔ اور اسے مرد جلد باز میرے پانچوں سفر تمام ہوئے۔ آخر تک مجھے سات سفر کرنے چاہئیں تھے۔ ایسی دنیا کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ زندگی تک دو دن اپنی منزل میں نے پالی ہے۔ میرا مقام مجھے ہاتھ آ گیا ہے اور تو جو یوں بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو اپنے دو سفر تو کر آ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"جی نہیں ۔۔۔ ایسے اصول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے!"

"یہ محل میرا کہاں ہے الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں فلاسفر نے اخباروں رسالوں میں بڑے دلنشین بیانات چھپوائے کہ ہم پبلک اپنی اکادمی کھولنا چاہتا ہوں۔ پبلک نے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ دیا۔ دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے۔ خود سمجھ جاتی ہے ۔۔۔ دوسرے لفظوں میں! اسے دقیق نہ جانتی! یہ اکادمی کا ریکٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا۔ اور برخوردار تیری پوسٹ دار بھی کیا ہے؟ نوکری کے لئے اپنا نام رجسٹر کروایا؟"

"نام رجسٹر تو نہیں کرایا لیکن جس محلے میں رہتا ہوں وہاں چوبے بیاں اور کتنے بہت زیادہ ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں ۔۔۔"

"اس سے تو بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تو کافی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام مجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا موڈ یکلخت اوپر ہو گیا ہے ۔۔۔"

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے!"

"یہ گنجے پن کو تو شکر بنا!"

"ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی!"

"اخاہ! پھر تو بوڑھے نیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی بہشت کمائی ٹھیک کر۔ حجامت کرا، پبلک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دھلوا کر استری کرا ۔۔۔"

"کہیں مجھے ٹیلیکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں ۔۔۔"

"تو کیا ہوا؟ خیال ہے کہ چند شرفاء ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لئے ایک بلند پائے کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ ویسے کام دوسرے لوگ کریں گے۔ لیکن نام ہمارا ہوگا۔ کیا ارادہ ہے ——؟"

"خاکسار آمادہ ہے۔"

"اب جبکہ تو نے سب کچھ سن لیا ہے بتا کہ کبھی تو بھی ایسی کٹھن منزلوں سے گذرا؟ کبھی ایسی مصیبتیں تجھ پر بھی پڑیں ——؟"

خورد نے کلاں کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا —— "آپ واقعی بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہوئے۔ سید افتخار ہوئے۔ اب آپ حظ اٹھائیں، دل کھول کر کھائیں اور کھلائیں۔ خدا کرے تمام عمر شاد رہو، فائز المرام و بامراد رہو۔"

اس پر جہاز باد سند عجی کلاں نے خورد کے سر پر دست شفقت پھیرا۔ اس کا رتبہ اور بھی بڑھایا جب تک زندہ رہے۔ وہ جان اور وہ قالب ہو کر رہے۔

خالق زمین و زماں، آفرینندۂ ہر دو جہاں، کارساز مطلق، آقا و رحمن کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے کہ بندوں کو کبھی کبھی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ گاڑھے وقت میں اسی کا فضل آڑے آتا ہے۔

نتیجہ —— پس اے پیارے بچو! نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

شہر اور گاؤں

فلک پیما

شہر کا رہنے والا ہوں۔ اکثر شہری انٹوں پتھروں کی خوش نما ترکیب دیکھ کر
خوش بھی ہوتے ہیں، فخر بھی کرتے ہیں۔ مگر بعض چیزیں نہ دیکھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔
چونے گارے سے دماغ محفوظ نہیں۔

شہر وہ ہوتا ہے، جہاں دیوان خانے، زنان خانے، کارخانے، جیل خانے، قہوہ خانے، قحبہ خانے ہوں۔ نیز ہیچوں قسم
دیگر ضروریات مثلاً دکانیں اور ان میں روپیہ کمانے والے سیٹھ، عدالتیں اور عدالتوں میں جھوٹ بول کر سفید کو سیاہ دکھا کر مال دار بن جانے
والے معززین اور ان کے ایجنٹ۔ بنک اور بنکوں سے روپیہ کی ہجرت کرانے والے دلال۔

گاؤں وہ ہوتا ہے جہاں کسان مٹی کرید کر پیدا گری کرتا ہے کہیں بیج اور پانی مل کر چاول کا زمرد کھیت تو کہیں شرف
کا سونا۔

شہروں میں دولت کی آب یاری سے گھاسے بدنامی کھلتے ہیں۔ گاؤں میں محنت کے کندھے پر اناج کی بوری۔ کہا یہ جاتا ہے
کہ کھیت انسان نے بنائے اور بنک شیطان نے اور آخر کار انسان کے کھیت شیطان کے بنکوں کے ہاتھ گروی ہو گئے۔ یہ مبالغہ ہو یا غلط ہو
مگر گاؤں میں عام طور پر محنت کا اجر عزت ہے اور عزت کا نتیجہ یہ کہ گاؤں والے کھائیں بھیجڑا اور شہر والے بگھیں پراٹھے۔

جسے کسان سے محبت ہو، مگر جو بدقسمتی سے مٹی نہ کرید سکتا ہو وہ یہی کر سکتا ہے کہ لفظوں کی مٹی میں سونا تلاش کرے۔ خیالے لفظوں
کے جہاں سے نیلا آسمان ہے۔ اس آسمان کے اوپر نیچے، اندر باہر اور چاروں طرف جو آسمان والا ہے ریاکار نہیں ہے تو جسے ہماری آرزوں کو پورا
کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اسے قدیمی گیتوں سے ایک شہری یوں یاد کر رہا تھا۔

"اے ہفت افلاک والے پیا و بلندی پر تنہا ہیں دھواں ہوں، لوگوں
کی آنکھوں کو مجھ سے تکلیف ہے۔ مجھے آگ کر دے۔"

کیا شہروں کے رہنے والوں نے اپنے شہر کو بلندی سے دیکھا ہے؟ صبح و شام بڑے شہروں پر دھوئیں کا گھٹا ٹوپ ہوتا ہے۔
صنائی شعاعیں اس کو تھوڑا سے اکثر قاصر رہتی ہیں اور یہ زیب سرتاپا کی عجیب رنگ لاتی ہے یعنی دماغوں میں گاہا۔ دلوں میں کدورت اخلاق
کوئی شہری نہیں ہوتا ہے جو محض کوئی دھواں یا ٹیلیفون کھڑا نہ ہو۔

گاؤں والے فرشتے نہیں: وہ کفر و ایمان سے بے خبر ہیں اور اس بے خبری کی بدولت بہت سے صحت خوانوں سے بچ رہے ہیں۔ کوئی بڑا شہر نہیں جہاں شاندار کھنڈر نہ ہوں۔ کیا دہلی، کیا آگرہ، وہ شہر کیا جس میں کھنڈر نہ ہوں؟ کھنڈروں کو دیکھ کر شہروں کے رہنے والے یا دوزخیوں کے کھنڈروں میں قائم کرتے ہیں: یہ بدنام سلطان لوٹ کے لائے ہیں یہ ہیں آہوں کے جھنگے، وہاں ہیں جہاں لوگوں کو خیالی خلد گزشتہ میں سلا دیتی ہیں۔ گاؤں اس نعمت سے محروم ہیں۔ سینکڑوں گاؤں کا کوڑا جہاں ٹھاٹھ آتے ہیں ان کی بے رونق سی دکانیں تو دکھائی دیں گی۔

استخوانِ ماضی

کے ناہموار دکان آنکھ سے اوجھل رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں والے کا حافظہ کمزور ہے۔ شہر کی ایک بارونق زبردست بازار دشتوں والی تنگ دکان میں یہ سودا بکتے دیکھا۔ گاہک نے داخل ہوتے ہی آہ بھری اور چلا کر کہا۔

"حضور آپ کا نہیں صدی کا پیاسا ہوں" جواب ملا "یہاں روحانی سیل جاری ہے۔ صدی کی کمی کی تلافی زلفوں کی پیاس سے تمہارا دم نکل جائے گا۔ اپنا تمام سرمایہ پیش کر کے رخصت ہوا۔

گاہک گاؤں تھا۔ فروشندہ شہر تھا۔

ایک انسان کی موت

فکر تونسوی

شہر کے سب سے بڑے اور بارونق پُل پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی ابھی دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اس نے ٹانگا یہ بھی کر پُل کے نشیب تک پر مرا۔ اگر وہ پل کے بیچ درمیان مرتا تو ٹریفک رک جاتا اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی۔ مرنے والے زندہ رہنے والوں سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتے ہیں۔

"ارے! یہ تو شمبھو فقیر ہے!" شمبھو فقیر کے ایک کامریڈ نندو فقیر نے آکر اعلان کیا۔ نندو فقیر شمبھو فقیر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کر بھیک مانگتا ہے۔ اس لیے پڑوسی ہونے کے ناطے سے اُس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اٹھ کر آئے اور لوگوں کو بتائے کہ میرے مرحوم پڑوسی کا نام کیا ہے۔ چنانچہ وہ لنگڑاتا ہوا آیا، لاش پر جھکا اور چہرے کی ناخنائی نگاہ شمبھو پر ڈالی جیسے وہ کہہ رہی ہو: "میں دیکھتا تھا تمھیں آخر تم مر جاؤ گے اور تمہاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر بھیک مانگنی پڑے گی؟"

شمبھو — قسمت کا دھنی تھا۔ کیونکہ وہ جس اس نادر موقع پر بیٹھا کرتا تھا جہاں سے پُل کے بہتے سے آنے پڑھنے والی بڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کے کامریڈ نندو فقیر نے اس نادر جگہ کو حاصل کرنے کے لیے نہ جانے لاکھوں بار کوشش کی تھی۔ جب جا کر شمبھو مرا ہے —

نندو نے اپنے کان پر سے وہ جلی بیڑی اتاری ہے اور شمبھو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی ہے اور بیڑی سلگا کر ماچس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے — "میرا اور شمبھو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم بالکل جگری دوستوں کی طرح بھیک مانگا کرتے تھے۔ آہ! بھگوان نے اُسے مجھ سے چھین لیا —"

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بڑی سفاک وہ رونے لگا ہے۔ اور روتے روتے قریب سے گزرتی ہوئی ایک آپ ٹوڈیٹ اور خوشحال حسینہ کے راستے ہاتھ پھیلا کر بکنے لگا ہے — "لے لو بھگوان کے نام پر ایک پیسہ۔ بھگوان تمھیں ہمیشہ سُکھی رکھے۔"

شمبھو کا منہ کھلا پڑا ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں بھیک مانگنے کا انداز نہیں ہے۔ کیونکہ موت بھی اس کے لیے بھیک مانگنا ضروری ہے۔ اس کے دانت حقے سے بھنچے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیکا پھیکا سا ہو گیا ہے۔ لاش کی ہڈیاں اور نیلی نیلی رگیں پوری آب و تاب سے اُبھر آئی ہیں — غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر لاش کو خوبصورت کہا جا سکے۔ لباس بوسیدہ اور میلا پرانا ہے اور جگہ جگہ پر جوڑ لگے ہوئے ہیں۔ وہ اصلی لباس سے زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر یہ مسرت ہوتی ہے کہ شمبھو کا پیوند لگانے کا ٹیسٹ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شمبھو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر پرانے بوٹوں کا سوداگر بوٹا رام بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے پرانے بوٹوں کو فٹ پاتھ پر نہایت نفاست اور تنظیم کے ساتھ سجائے بیٹھا ہے اور اپنے ایک گاہک کے ساتھ سودا پٹانے میں مصروف ہے۔ وہ شمبھو غیر کی گمراہی سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ شمبھو نے کبھی اس سے پرانا بوٹ نہیں خریدا تھا۔ اسی لیے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شمبھو غیر مر گیا ہے۔ وہ اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے ——— "جناب! میں نے یہ بوٹ امریکہ کے ایک خاص فوجی آفیسر سے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے پہن کر فوجی آفیسر معلوم ہوں گے۔"

شمبھو مرا پڑا ہے۔ اور ڈیڑھ گز کے فاصلے پر جو شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بننے میں مصروف ہے ——— اس سے پرے ایک جوتشی پانسے پھینک رہا ہے۔ اور نصیب کے مزانے ڈھونڈنے میں جٹا ہوا ہے۔ ایک بھدی سی بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کی عورت اپنے میلے دانت کھول کر ہنس رہی ہے اور مردوں کے ہاتھ سانڈے کا تیل بیچ رہی ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شوخ و شنگ کنواری لڑکی اپنے ایک کنوارے عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے اور کنوارا عاشق کہہ رہا ہے کہ آئس کریم تمہارے ہونٹوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے۔ ایک ریلوے کی چھوکرا اپنے کیلوں کی گلی سڑی ٹوکری اٹھائے اس حسین کنواری کی سنت خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آئس کریم سے زیادہ میٹھے اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ساری لڑکی صرف دو آنے میں دینے کو تیار ہے ——— سات ہاتھ دور بیٹھے ہوئے شمبھو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ یہی اصلاح کافی ہے۔ اس سے زیادہ اصلاح کے لیے اس کے ذہن میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ذہن کی بیشتر جگہ پرانے بوٹوں، آئس کریموں، نصیب کے خزانوں، سانڈے کے تیل اور گلے سڑے کیلوں سے گھری ہوئی ہے۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟" لاش کے قریب گزرتے ہوئے ایک معزز سے آدمی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے، مر گیا ہے۔" دوسرے معزز آدمی نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا ہے۔

"مر کیوں گیا ہے؟"

"سالا گھٹیا اور زیادہ بیڑیاں پیتا ہوگا۔ اس لیے اسے دمہ ہو گیا ہوگا۔"

"آپ بکواس فرماتے ہیں، مجھے بھی دمہ کا ہی کیس دکھائی دیتا ہے۔" پہلے معزز آدمی نے نہایت جذباتی لہجہ میں تائید کی ہے۔ اور پھر یہ بلا چھلکا ہو کر چلا گیا ہے۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ شمبھو دمے سے مرا ہے تو اسے سخت جسمانی کرب ہوتا۔ چنانچہ اپنے جسمانی کرب کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کر چلا گیا ہے۔

"میرے خیال میں کسی سپاہی کو بلانا چاہیے۔" ایک اور آدمی نے رائے دی ہے ——— ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے

"میرا خیال ہے، سپاہی کو نہیں جانا چاہیے۔" دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔

پہلا آدمی ناراض ہو گیا ہے اور غصہ میں آ کر جیب سے چلغوزے نکال کر چبانے لگا ہے۔ اس کی رائے کی رتی بھر قدر نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ شمبھو کی لاش سے سخت ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بلا کر لاش اس کے حوالے کر دی جاتی تو آمر کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ لوگ بھلا پولیس سے اتنا کیوں بدکتے ہیں کہ اپنے مردے بھی اس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

سڑک کا ٹریفک نہایت زور شور سے جاری ہے۔ بسیں، لاریاں، کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک، سائیکلیں ——— سبھی مشینیں نہایت تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہر مشین کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے اور اپنے مقررہ نشان پر ٹکی ہوئی ہے۔ کسی کا پہیہ ٹوٹ نہیں ہوتا

کسی کے تاثر میں نقص پیدا نہیں ہو رہا۔ جس کی وجہ سے کچھ بھر کو رک جائیں اور شمبھو کی لاش پر ایک نظر ڈال لیں۔ شاید شمبھو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ شمبھو انسان تھا اور انسان اور مشین میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ایک کتا سرگشت کرتا ہوا شمبھو کی لاش کے قریب سے گزرا ہے ایک دو سیکنڈ کے لیے شمبھو کی لاش کے پاس ٹھٹکا ہے۔ وہ لاش کو پہچاننے لگا ہے۔ وہ لاش کو پہچان گیا ہے۔ کیونکہ شمبھو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ کتے نے لاش کو پہچان کر پہلے سے دم ہلائی ہے۔ مگر شمبھو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے مزید ثبوت دلانے کے لیے اور شمبھو کو چھیڑنے کے لیے اس کے ساتھ رکھی ہوئی گٹھڑی کو سونگھا ہے۔ مگر شمبھو کی لاش بدستور بے حس پڑی ہوئی ہے۔ کتا مایوس ہو گیا ہے۔ اس نے ایک آخری کوشش کی ہے اور ساتھ کھڑے ہوئے آدمیوں پر بھونکا ہے۔ شاید اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ شمبھو کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ شمبھو کے دشمن ہیں۔ ٹانگ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ شمبھو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شمبھو کی موجودہ پوزیشن کیا ہے۔

لاش کے قریب آدمی آتے ہیں۔ ایک دو منٹ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہر آدمی یہ تصدیق کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان مرا ہے۔ یہ لاش ایک ایسے چوراہے کی طرح دکھائی دے رہی ہے جہاں سے لوگ ایک دو منٹ میں اس کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شمبھو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے اسے اس کیا ہے ورنہ زندگی بھر وہ بھیک کے لیے لوگوں کو جگاتا رہتا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر پکارتا رہتا۔ مگر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا ——— موت نے اسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔

"اس کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا چاہیئے۔ لاش کو کھلا رہنا دھرم نہیں ہے" ——— ایک کھدر پوش نے انسانیت کی بلندیوں سے پکارا ہے۔

"ہاں، ضرور ڈال دینا چاہیئے۔ آخر انسان کی لاش ہے۔ لوگ تو جانوروں کی لاش پر بھی بوری ڈال دیتے ہیں" ——— دوسرے نے انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔

معاملہ دھرم کا ہے۔ اس لیے کوئی آدمی بھی کچھ بات مزید کہنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میلا کچیلا کھیس شمبھو پر بھی ڈال دیا ہے ——— یہ کھیس خود شمبھو کا ہے اور اس کی گٹھڑی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھیس نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا ہے اور اب موت کے وقت بھی دے رہا ہے ——— میلے کچیلے کھیس سے میلی کچیلی لاش ڈھانپ دی گئی ہے۔ ٹانگ سے ٹانگ میچ کر گیا ہے۔

"اس کے منہ پر کھیس مت ڈالو!" کسی نے سختی سے پروٹسٹ کیا ہے۔

"نہیں نہیں، ڈال دو!" کسی نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا ہے۔

"نہیں نہیں، مت ڈالو! پتہ کیسے چلے گا کہ کھیس کے نیچے مردہ پڑا ہے؟" اس آدمی کے خطرہ کی گھنٹی بجائی ہے۔

"یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے!"

"ضرورت ہے"

"نہیں ہے"

"ہے"

"نہیں ہے۔

اس آدمی نے بیلچہ مٹی میں گاڑ کر لاش کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے مٹھی میں آ کر دوبارہ کھیس منہ پر ڈال دیا ہے پہلے نے پھر ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے۔ اور پھر دونوں نے کھیس کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے منہ پر گھونسہ مارا ہے اور حق و صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو دو چار آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا ہے۔ اور دونوں صداقت کی تلاش میں دو مختلف سمتوں کو چلے گئے ہیں ——— ایک گھٹیا موضوع پر لڑ رہے تھے۔ جب زندہ شمبھو پر کوئی اپیل میں نہیں آتا تھا۔ تو اب مردہ شمبھو پر لڑنے کا کیا فائدہ ہے ——— اور پھر دھرم اور دیا کا ناز تو ویسے بھی ختم ہو گیا ہے۔

اب لاش اپنا منہ چھپائے ہوئے پڑی ہے۔ اس کے قریب کوئی آدمی نہیں ہے۔ جتنے آدمی تھے وہ اپنا اپنا فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو پتہ نہیں چل رہا کہ کھیس کے نیچے شمبھو سو رہا ہے یا مر گیا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے چند منٹ پہلے شمبھو کو موت آئی تھی وہ کھیس ڈالتے ہی بھاگ گئی ہے۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان کھیس آ گیا ہے۔ جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

تین چار منٹ سے وہی کھیس کی اوٹ میں ہے۔ اور پھر بارہ تیرہ سال کا ایک نحیف سا بھک منگا لونڈا، گھٹنا ہوا آیا ہے اس نے پہلے شمبھو کا کندھا جھنجھوڑا ہے اور پھر منہ سے کپڑا ہٹا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سورج کی روشنی میں چمک اٹھی ہے۔ روشنی کی اس مرگ سے لونڈا ڈر گیا ہے۔ اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ میں کہا ہے۔

"بابا ——— بابا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"ابے سالے! مر گیا ہے تیرا بابا!" قریب کھڑے ہوئے ایک گنڈیری فروش نے جیسے اسے رحم دلاتے ہوئے کہا ہے۔

"کیسے مرا؟"

"موت سے!"

"ابھی تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا!"

"ابے اتنا ہی ذکر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کر مرتا۔ اس کا جی چاہا اور مر گیا۔ بابا بابا ——— یہ گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ۔ ایک آنے کی پاؤ!"

لونڈے کی خوف زدہ آنکھیں یک دم سنجیدہ ہو گئی ہیں۔ اس نے کھیس کے اندر اپنا ہاتھ لے جا کر شمبھو کی ڈبیا کھولی ہے۔ اس میں سے کچھ ریزگاری نکلی ہے۔ جسے اس نے احتیاط سے جیب میں ڈال لیا ہے۔ اسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پھٹے پرانے کرتے کی جیب میں سے دو روٹیاں نکالی ہیں۔ گٹھڑی کھول کر اس میں سے بیڑی کا سامان نکالا ہے اور روش کے قریب بیٹھ کر کھانے لگا ہے..... روٹی کے دو چار لقموں نے ہی اس کے رخساروں پر لہو دوڑا دیا ہے۔ اس لہو میں ایک حمایت ہے۔ جو بھیک میں مانگی ہوئی روٹیوں میں سے کھائی گئی ہے اور شمبھو کا لونڈا شمبھو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے۔ اس لیے وہ حمایت چھوڑ سکتا ہے۔

لونڈے نے کھانا ختم کیا ہے۔ بیڑی سلگائی ہے۔ شمبھو کی گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں۔ ایک کرتا، ایک قمیص اور ایک پرانی چپل نکالی ہے۔ اور باقی گٹھڑی وہیں باندھ کر رکھ دی ہے۔ اور اپنی شلوار کی ایک نئی گٹھڑی بنا کر گھٹنا ہوا چلا گیا ہے ۔

جیون کے دن چار ——— اے گوری

جیون کے دن چار
لوٹ لے موج بہار ——— اے گوری
جیون کے دن چار

اب وش ایک بار پھر ننگے سر پڑی ہے۔ نئے نئے راہ گیر آ جا رہے ہیں۔ گروہ در گروہ ہر ائی ہوئی باتیں دہرا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے شمبھو کی لاش پر کوئی اچھوتی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور اب وش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے۔ جہاں سال میں ایک انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

"یہ وش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی؟" قریب کھڑے ہوئے گنڈیری فروش نے ایک جمائی لے کر کہا۔

"میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میرے خیال میں وش کو یہاں سے اٹھوا دینا چاہیے بُری لگ رہی ہے" گنڈیری والے نے ایک تجویز اٹھائی۔

"ہاں بُری تو لگ رہی ہے۔ زندہ انسانوں کے درمیان ایک مُردے کا پڑا رہنا!!؟ ..... بھئی بھئی بھئی! بوٹا رام کے ایک میلے سے اُٹھ کر میلے سے کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"مگر اٹھوایا کیسے جائے۔ اس سارے کا کوئی سالا سمبندھی تھوڑا ہو گا؟"

"تو پھر! ..... میرا خیال ہے، پٹری والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سب مل کر اس کے کفن دفن کے لیے چندہ اکٹھا کریں۔"

"تجویز بُری نہیں۔ مگر پٹری والے مانیں گے نہیں۔ سب مرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کرنا کیا جانیں ـــــ اچھا ذرا خیال رکھنا میرے بوڑھے کا۔ میں ذرا سامنے دکان سے چائے پی آؤں۔"

بوٹا رام چائے پینے چلا گیا ہے ـــ سارے پٹری والے مرامی ہیں۔ چائے کے بہت پیاسے ہیں۔ گنڈیری فروش شاید سوچ رہا ہے کہ بوٹا رام سچ کہتا ہے۔ پٹری والے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی تو آدھی گنڈیریاں بیچنا باقی ہیں۔ وش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں بیچنا بہت بُرا لگتا ہے۔ کچھ لوگ وش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں خریدنے سے ہچکچاتے ہیں۔ گزشتہ آدھے گھنٹے سے ایک بھی گاہک قریب نہیں پھٹکا ہے۔

وہ اپنا خوانچہ اٹھا کر چل دیا ہے۔ اور سامنے والے نشیا تھ کی طرف بڑھ رہا ہے ـــ پٹری والے سب مرامی ہیں۔ انسان کی قدر نہیں کرتے گنڈیریوں کی زیادہ کرتے ہیں۔

وش پر جو مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ وہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ مکھیاں بھی شمبھو کو چھوڑ کر گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دور سے نشیا تھ پر جا رہی ہیں ـــ ہر چیز شمبھو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

باقی چھ منٹ اور گزر گئے ہیں۔

نند کشور پھر ٹہلتا ہوا آیا ہے۔ وہ وش کے گرد گھر کی طرح ٹہلنے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے جس کا چہرہ ایک بہت قیمتی کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کے بازو پر ایک بلا لگا رکھا ہے جس پر جراحت خادمان قوم کے لفظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس نے جیسے وش کو سونگھ کر پہچانا ہے۔

اچھا تو یہ لاش ہے؟

"جی ہاں" نند وفقیر نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا ہے "بھیک مانگا کرتا تھا، کئی دنوں سے بیمار تھا، آج مر گیا ہے بیچارا"

"کوئی ہرج نہیں، ہماری جماعت اس کے کریا کرم کا بندوبست کرے گی۔ آہ! ملک میں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے؟"

نند وفقیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے اس لیے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے "اسے آپ کیسے اٹھا کر لے جائیں گے؟"

مزدوروں کے ذریعے رسے سے باندھ کر!

وہ شخص مزدوروں کے اٹھانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اس نے وہ مزدوروں کو اشارہ سے بلایا ہے، اور انہیں حکم دیا ہے کہ لاش کو رسے سے باندھ کر کندھے پر اٹھا کر ہمارے دفتر تک لے چلو!

نند وفقیر نے رسہ بندھوانے میں نہایت پھرتی سے امداد دینا شروع کر دی ہے۔ راہ گیر ایک لاش کو رسہ بندھتے دیکھ کر پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ رسہ اندھا ایک تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر تماشہ ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کشش عقل کا اصول ہے۔

"یہ بہت بے رحمی ہے۔ انسانی لاش کو رسہ نہیں باندھنا چاہیے" ایک راہ گیر نے حقارت سے کہا ہے۔

"تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا کر دے دیجئے!"

میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی چارپائی کوئی نہیں ہے!

ہوٹل والا عقیدہ خوبصورت ہے۔ سب کو مزا دے گیا ہے اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے۔

مجمع دیکھ کر ایک کانسٹیبل فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ڈنڈا لہرا کر دور سے ہی للکارا ہے "ایک طرف ہٹ جاؤ، کیوں اکٹھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"یہ بھیکو فقیر ہے جو مر گیا ہے" خادم قوم نے جیسے کہ تیار ہو اب دیا ہے۔

"کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے؟ کس نے مارا ہے؟" کانسٹیبل نے آئینی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ہے اور لاش کے ارد گرد اس شش و پنج کو کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے رسہ باندھنا بند کر دیا ہے۔ انہیں قانونی گرفت کا احساس ہے۔

"یہ لاوارث لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے شمشان لے جا رہی ہے" خادم قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

"کون ہے ہماری جماعت؟ ہوں! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی دھاندلیاں۔ تم اسے مار کر اب لاش چھپانا چاہتے ہو؟"

ڈنڈے کی آواز پھر ابھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں۔ کئی کئی کترا کر نکل گئے ہیں۔ خادم قوم جوش و خروش سے ابل رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے ہماری سرکار ہے۔ انسان سڑکوں پر یوں بھوکے پیاسے مر رہے ہیں اور تم تھانے کی ناقہ میں بیٹھے مردوں کو گرفتار کرنے کے لیے پھر رہے ہو۔ شیم، شیم!"

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں، شیم، شیم!

"اپنا بکچہ جیب میں رکھ کانسٹیبل اپنے وقار کو مٹی میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا" میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں کیونکہ تم قانونی کارروائی

میں ملاوٹ ڈال رہے ہو؟

سبھی لوگ کانسٹیبل کی مدمل بات سے متاثر ہوئے ہیں ——— شیم! شیم!

نندو فقیر کی حالت دگرگوں ہے ——— اسے قانون کے باریک نکتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اس لیے وہ گرفتاری کے ڈر سے کسک کر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔

تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں خادم قوم ہوں۔ خادم قوم کا چہرہ طنز سے سرخ ہے

"چلو چلو، بکواس بند کرو اور تھانے چلو۔"

"یہ لاوارث لاش ہے۔ اس لیے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا۔"

"تم اس لاش کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔"

"میں اسے لے جائے بغیر ٹلوں گا نہیں۔"

کانسٹیبل نے اس کی کلائی میں ہتھکڑی ڈال دی ہے۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ پولیس کے یا خادم قوم کے۔

"مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔" کانسٹیبل نے خادم قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ اس لیے اب نندو کے خلاف مقدمہ چلے گا۔"

شمبھو کو کس نے مارا ہے؟ اس سلسلہ میں شمبھو خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اپنے دفن کے بارے میں اس کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ شمبھو اپنی لاش کے مستقبل سے بے نیاز ہو کر مرا تھا۔ خادم قوم ہتھکڑی بھی کر سپاہی کے ساتھ تھانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے ——— "میں عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار کون ہے..... میں حق اور صداقت.....؟"

وہ چلے گئے ہیں۔ لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ شمبھو کی لاش پر سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شمبھو کی لاش پھر لوگوں سے کٹ گئی ہے

"تین چار منٹ اور گزر گئے ہیں۔

تین چار منٹ اور

——— دس پندرہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے ایک خفیف سی کراہ نکلی ہے۔ جیسے کوئی دوزخ کی سانس لے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیت کے ساتھ ہولے ہولے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اور پھر بند کر لی ہیں۔ اور پھر جیسے بڑی کوشش کی ہے۔ مگر نقاہت کے باعث اس سے اٹھا نہیں جا سکا۔ اس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اس نے جلتی ہوئی سڑک کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

نندو فقیر بھاگ کر لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس آ گیا ہے۔

"شمبھو! ——— تم ..... تمہیں ..... ، چھ! تم تو اٹھ بیٹھے ہو۔" شمبھو نے اٹھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کا سر اٹھ نہیں رہا ہے۔ نندو چونکہ اس کا کامریڈ ہے اس لیے وہ شمبھو کے سر کو سہارا دے کر اسے اٹھا رہا ہے۔ "تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لاؤ۔"

نندو فقیر پانی لینے چلا گیا ہے۔ اس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے ہیں۔

"گٹھریاں ایک آنے کی پاؤ۔" سامنے کے نٹ پاتھ سے آواز ابھری ہے۔

"سانڈے کا تیل، اسانڈے کا تیل!" ایک اور آواز جاگی ہے۔

"صاحب! بالکل امریکن بوٹ ہیں، خالص نرجی .....!" ایک اور مانوس آواز شمبھو کے کان میں پڑی ہے۔

شمبھو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے اور دوسرا ہاتھ ایک حسین دامن گیر جوڑے کی طرف پھیلا دیا ہے۔

"جوڑی بنی رہے بابو جی! بھگوان کے نام پر ایک پیسہ!"

چند یادیں

عبدالرحمٰن چغتائی

آج سے تقریباً بیس سال پہلے ارادہ کیا تھا کہ میں بعض واقعات کو قلمبند کرتا چلا جاؤں، چاہے وہ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار مگر ان میں زندگی کی رمق ضرور موجود ہو۔ آہستہ آہستہ یہ کوشش کتاب کی سی شکل اختیار کر گئی۔ اور میں اپنی اس کوشش کو فرسودہ باتیں کہہ کر یاد کرنے لگا۔ اس میں شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں سے ملاقاتوں کے علاوہ بعض ایسے حقائق کا بھی ذکر آ گیا ہے جن میں سامانِ زندگی کے علاوہ رموزِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایک موقع پر ایک مغربی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ "تمہارا ماڈل ہے۔" میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا "تم ہی تو ہو۔" وہ مسکرائی جیسے آئینہ میں اپنا جائزہ لے رہی ہو۔ وہ کیپ لیکس کے زیرِ اثر اپنے آپ کو ناپنے لگی۔ اور دوبارہ مغربی انداز میں جیسے غلام کی بصیرت سے منکر ہونے کی کوشش کر رہی ہے، کہنے لگی "اس ملک میں آرٹسٹوں کو اپنے لیے ماڈل تلاش کرنے میں کافی مشکلیں پیش آتی ہوں گی۔" ادھر غلام ابنِ غلام والا معاملہ تو تھا نہیں۔ میرے پروا نے تو یقیناً آزادی دیکھی ہو گی اور پھر مجھے اپنی بصیرت اور فہم پر بھروسہ بھی تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے اور اسی انداز سے کہا "فنکار کو ماڈل تلاش کرنے میں نہ یہاں مشکلیں پیش آتی ہیں اور نہ مغرب میں۔ صرف طرزِ زندگی کا سوال ہے اور وہی فرق ہے۔ میں یورپ دیکھ آیا ہوں۔ کس قدر جذبات سے خالی شیشوں کے گل پرزوں کی طرح خالی و عریاں عورتیں ماڈل بن کر آرٹسٹوں کے سامنے بیٹھ کر اپنی برہنگی کی نمائش کیا کرتی ہیں۔ خصوصیت سے اس وقت جب وہ اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے سگریٹ کے بے سود کش لگاتی ہیں تو کتنی بھونڈی اور جذبات سے عاری نظر آتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا، میں نے محسوس کیا تھا وہ ہر سہارے کے باوجود جسمانی شدتوں کا توازن قائم نہیں رکھ سکتیں اور نہ اپنی کمزوری کو چھپا سکتی ہیں ——— تمہارا مطلب غالباً ماڈل سے وہ عورتیں ہیں جو برقع پہنتی ہیں اور مردوں سے حجاب کرتی ہیں ———" اس موقع پر وہ ذرا ضبط سے مسکرائی جیسے میرے قومی کردار پر طنز کر رہی ہو۔ ساتھ ساتھ وہ آئینہ شخصیت نکال کر اپنا غازہ اور سرخی دیکھ رہی تھی اور اس میں اضافہ بھی کرتی چلی جا رہی تھی ——— میں نے کہا "انفرادی خصوصیت چاہے وہ مرد کی اپنی ہو یا عورت کی، زیادہ قریب ہونے سے ضعیف اور مضمحل ہو جاتی ہے۔ خصوصیت سے عورت مرد کے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ ایشیا کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ عورت کو تاج کے ہیروں اور جواہرات کی طرح اپنے سر کے لیے محفوظ

رکھے۔ ایشیا کی عورت بے تکلفی کا موجب اس لیے نہیں بنتی کہ مرد اس کے اوصاف کی پرکھ سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں مغرب میں آج عورت کے متعلق یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اسے ہم مشرقیوں سے کوئی شکایت ہے یا کوئی امید ہے۔ یا وہ رہین منت ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مغرب میں عورت کو اپنے ستر کا احساس کسی وقت بھی نہیں ہوتا" ——— یہاں پہنچ کر اس کا قہقہہ دیواروں سے چھو کر دب گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔ یا اسے اپنے سوال کی قیمت بہت زیادہ وصول نہ ہوئی۔

مشرقی زندگی کا سوز و ساز ابھی تک اپنے تسلسل کو توڑ نہیں سکا۔ اس کی زندگی میں آج بھی وہ کسک اور روحانی جذبات کی ہم آہنگی موجود ہے جس سے وہ اپنی سلامتی کا ضامن ہے۔ مغرب پرستی کے طلسم نے اسے گمراہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اسے اپنی کمتری کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کیونکہ وہ مشرقی زندگی کے اقدار اور اقتدار دونوں کا دشمن ہے۔ اور جب تک اسے اپنی خود پسندی کا جنون حاصل رہے گا اس وقت تک اپنے دامن کو بچانا اور بے عیب رکھنا محال ہے۔

مغربی خاتون کا یہ سوال اگرچہ اس کے فطری تقاضوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ مگر اس میں تلاش اور سوچنے کے امکانات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مشرقی فن کار کے سامنے اس کے سوال کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں! یہ ایک الگ سوال ہے۔ تخلیق کار کو چاہیے کہ وہ تخلیق کا سہارا تلاش کرتا رہے۔ اور اپنی روحانی قوتوں سے حاصل رہے اور انھیں قابل تسخیر سمجھے۔ جنھیں وہ روایات کی بنا پر کسی فرد گذاشت سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

مغرب میں جدید مصوری کا وجود اس اکتا کا لازمی نتیجہ تھا جو قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں نے سحر کی طرح پیدا کر رکھی تھی اور یہ طلسم ایسے جمود کا باعث بھی تھا کہ آج کا انسان اس کو بہت دیر تک برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ نگاہیں جو قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں سے اٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں، جدید تحریک سے آہستہ آہستہ بے رونق ہوتی گئیں۔ کیونکہ انھوں نے نئے نئے تجربات کے ذریعے تخلیق کا مقصد بدل کر رکھ دیا تھا۔ ادھر میکانی اور کیمیائی جوہروں نے صرف نظام زندگی پر ہی اثر نہ ڈالا تھا بلکہ انسان کے سکون کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اور آرٹسٹ کو اپنے لیے راہ منتخب کرنا ایک الجھن نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی نے ان کی طبیعتوں اور ذہانت پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا کہ وہ بغاوت کرتے اور اپنی فنی صلاحیتوں کا محور بدل ڈالتے اور ایک ایسا نعرہ بلند کرتے جو ان کے تمدن اور تہذیب کا علمبردار ہوتا۔ آہستہ آہستہ ان کا ردِ عمل بغاوت اور ایسے تجربات اتنے کامیاب ہوئے کہ انھوں نے قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا۔ اور دنیا ان کی طرف جھک گئی۔ مغرب میں اپنی طرز کا ایک واحد اسکول ہے جس نے اپنے شاہکاروں کے لیے ماڈل کا استعمال کیا بھی تو اس طرح جیسے وہ ان کا اپنا کردار ہے۔ قدیم استادوں میں ان کی مثال ایلیران کے سوا مشکل سے نظر آتی ہے۔ فان گوگ جو خود بھی پاگلپن کا ایک باشندہ تھا۔ پوسٹمین اس کا شاہکار زندگی کی تھکن کا منظر ایک ایسا کردار ہے جو دنیا کے ہر حصے میں ملتا ہے۔ جس کی اصولی اور فطری بنا یہ ہے کہ اس پوسٹمین کو اپنے خالق گوگ سے ایک گہری دلچسپی تھی۔ اور زندگی کے ہزار جھمیلوں کے باوجود وہ اپنے خالق آرٹسٹ کے قریب تر تھا۔ بطور فن کار نئی مصوری میں ماڈل کے مقلدوں کے لیے مغرب میں بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ یہاں اٹلے کردار، اٹلے ماڈل، زندگی کے ہر موڑ پر ملتے ہیں۔ جن کا انتخاب انفرادیت کا حصہ ہے۔ جو ماڈل کی پابندیوں اور عقل کی موشگافیوں سے آزاد ہے۔ کیونکہ زندگی کی حدت متحرک جذبوں میں مضمر ہے اور یہ حدت ہی اخلاق، کردار اور روحانی محرکات کی متلاشی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جدید استادوں کی معراج مشرقیت، مشرقی طرز معاشرت، مشرقی طرز نگارش میں ہے۔ اور یہاں کے اپنے الفاظ ہیں، کہ وہ مشرقیت کے حسن اور طرز نگارش سے مستفید ہوئے اور اس

طرح اپنی ذہانت اور تکنیک کو فنی صلاحیتوں میں بروئے کار لا سکے۔

آرٹسٹ کی صلاحیتوں کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ الجھنیں پیدا کرے، رمز شناسی کو ایک معمہ بنا دے، اور ایک برہنہ ماڈل کے انتشار کو جزو کل سمجھے۔ جمالیات کی ہر جھلک دنیا کے خوبصورت سے خوبصورت بدن کی عریانی سے بالا ہے اور جدید تخلیق کار تخلیق کی تکمیل کے لیے ہمیشہ کردار کی اہلیت کو ترجیح دیتا ہے اور فوری طرح فن کے لیے جہاں وہ چاہے اپنے ماڈل کو دیکھ لیتا ہے۔ مشرقی آرٹسٹ کی طرح نہ وہ ماڈل کا مقلد ہے اور نہ ماڈل کی لعنت کو فطری تقاضا سمجھتا ہے اور اسی اصول پر تمام ازم جمع ہیں۔ اور یہی اصول اس کو اپنے خطرناک تنزل سے بچا سکتا ہے۔

مغرب میں آج قوت ڈیزائن نے جس بلند آہنگی سے نعرہ بلند کیا ہے اس سے پہلی صدیوں کے فن میں یہ قوت ان کے ہاں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہے۔ مشرقی مصوری میں مغل آرٹ نے شبیہ نگاری میں ایک وصف پیدا کیا تھا جس سے ان کے فن کی انفرادیت، اس وقت کی معاشرت دربار کی شان و شوکت بادشاہ اور مصاحب کی پہچان کی عکاسی ہوتی ہے، مگر یہ کہیں نہیں ملتا کہ چیتن، گووردھن، فرخ بیگ اور نادر العصر استاد عبد الصمد نے جہانگیر، شاہجہاں، ممتاز محل یا نور جہاں کو اپنے سامنے ایلورا ماڈل کے بٹھایا ہو جس طرح لیونارڈو نے مونالزا کو ایک ماڈل کی حیثیت سے بٹھایا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے مطالعہ کا تقاضا تھا۔ ان کے وسائل بھی ایسے تھے اور یہی ایک وجہ تھی کہ انھوں نے جمالیات پر جسمانی اجزا کو قربان کر رکھا تھا۔ چاہے اس کے اسباب کچھ ہی تھے۔

پیرس سے برلن جانے کے لیے جب میں اپنی سیٹ والے ڈبے میں پہنچا تو اتفاق سے میرا ہمسفر ایک ایسا آرٹسٹ تھا جو ان دو ملکوں میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی اہمیت رکھتا تھا۔ میری ملاقات فرخ آرٹسٹ اینڈ ڈیزائن سے ہوئی اور جب ہم ادھر ادھر کی باتوں سے گھوم کر امپریشن ازم اور سوائیلے ازم کو برا بھلا کہہ چکے اور بعض انفرادی آرٹسٹوں کے متعلق گفتگو کرنے لگے تو ڈیزائن نے کہا ٹولس لوٹرس کا نظریہ اپنی تخلیق کے متعلق یقیناً بہت عجیب و غریب تھا۔ اس کا قول ہے کہ وہ ہر رات ایک نئی عورت سے ہم بستر اس لیے ہوتا تھا کہ اس کی ہر صبح ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ ہو۔ مرکزی خیال صرف اس قدر تھا۔ اس پر بحث ہوتی رہی۔ مگر تخلیق کے بارے میں کوئی قطعی اصول وضع نہ ہو سکا۔ کیونکہ میں اپنے مرکزی خیال پر قائم رہا کہ تخلیق زندگی کے رجحانات کا کتنا ہی اہم مسئلہ کیوں نہ ہو مگر اس کا تجربہ ماحول کی نشو و نما سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ پیرس کا رہنے والا تھا، اسے حرام و حلال، ستر اور ننگ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس نے یہاں تک بھی اپنے عقیدے کا اظہار کر دیا تھا کہ جب حیوان اور پرند ہمارے روبرو بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کیوں ہم یہ جرأت نہ کریں کہ ننگے پھرا کریں اور سب کے سامنے عورتیں بچے جنا کریں۔ میں نے اسے بار بار احساس دلایا کہ پیرس میں یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ میں نے راتوں کو سڑکوں اور فٹ پاتھ اور گلی کوچوں کے موڑوں پر عورتوں اور مردوں کو بدحواس دیکھا ہے اور یہ شرف پیرس ہی کو حاصل ہے جس نے آزادی کے لیے جنگ کی دنیا کو علم دان دیا۔ وکٹر ہیگو، موپاساں، فلابیر، بال زاک، برگساں، روان، کورے، ہینے، دریائے، تینے، گوگیس اور لوئی اراگاں جیسے پُرخلوص فنکاروں نے جنہوں نے ہمیشہ دنیا کے جمود کو توڑا، انکار کو ختم کیا۔ ارتقا کے مسئلے کو سلجھایا۔ عوام کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ وہ ملک اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے آج مسافروں کے رحم پر ہے جو براعظم ہاؤس میں فرانس کی کتابوں کی قیمتیں چکاتے ہیں۔ جن اداروں کو کبھی منہ مانگی قیمت نہیں دیتے۔

وہ پریشان تھا اس نے اپنے فطری تقاضے سے پھر ٹولس لوٹرس کا ذکر اس ضمن میں چھیڑ دیا کہ وہ پیرس کی پراگندہ زندگی کا

ترجمان تھا۔ وہ گھناؤنے اور دُکھ بھرے واقعات کو رنگ دینے والا تھا۔ میں اِدھر اُدھر کی باتوں سے ہٹ کر چپ ہو رہا۔ کیونکہ اس قسم کی کیفیت کا کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس پر بھی میں نے یہ ضرور کہا تھا۔ ٹولس لوٹرس میں بربریت کی سی بُو آتی ہے مگر عوام کی نمائندگی کا نشان بھی نہیں ملتا۔ اس کی مصوری سے اس کے اپنے قول کی کتنی بھی تصدیق ہوتی ہو مگر اس کی ہر تصویر اس کے ذہنی آثار چڑھاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے فن کے نقطۂ نظر سے اس کے آرٹ کا درجہ بہت بلند ہو۔ اس میں اس کے ماحول کی عکاسی اور ترجمانی ہو۔ لیکن جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے اس کا نظریہ فرانس تک محدود ہے۔ جہاں دن رات سوائے نفسانی خواہشات اور برہنگی کے مظاہروں کے دوسری کوئی قوت دماغوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب ہم ریبران اور روبنز کی بنائی ہوئی ننگی تصویروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو لوٹرس ان کے سامنے خود ننگا، بے ستر، جنسی ننگن کا ملا ہوا نظر آتا ہے۔ اس وحشت اور برہنگی میں ان عورتوں کی تصویروں کے سوا دوسری کوئی عورت نظر نہیں آتی جنھیں نہ ماں نے جنا اور نہ باپ نے ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ہے۔ پیرس کنتار یچڈ اور گدہ شہر ہے۔ ٹولس لوٹرس کے قول اور نقطۂ نظر سے یہ واضح بھی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں اس کے آرٹ کے صحیح مقاصد کو سمجھنے کے لیے اس زندگی کا مطالعہ بھی ضروری ہے کہ اس دنیا کے لوگ کس قدر گھناؤنے، کس قدر بدذوق، جنس کے خریدار ذلیل زندگی کی ہر ذلالت سے دوچار ہیں۔ حالانکہ وہ خود ایک امیرزادہ تھا۔ کلچر اس کے گھر کی مہمان تھی۔

ملاؤل کی روایات کے سلسلہ میں مجھے ریبران کا نظریہ بہت پسند ہے۔ اس نے خود کو ماڈل سمجھا اور اس کی اپنی بنائی ہوئی اپنی شبیہیں سو کے قریب ملتی ہیں جو ایک کم فہم کے نزدیک ایک سے ایک نہیں ملتی لیکن ہر شبیہہ میں ریبران کا اپنا کردار، اپنے اوصاف اپنا فن اوجھل نہیں ہوتا۔ اس نے جب بادشاہ سے اپنے سامنے ایک ماڈل کی حیثیت سے بیٹھنے کی درخواست کی اور بادشاہ بھی ایک بلند معیار حسن کار کی خوشی کو پورا کرنے کی غرض سے اس کے ہاں آیا تو اس نے اسے وہ لباس پیش کیا جس میں وہ اس کی تصویر بنانے کا خواہاں تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ وہ ایک فقیر کا بوسیدہ لباس تھا۔ بادشاہ باوجود ہر جاہ و جلال کے اسے گداگر نظر آ رہا تھا جو مقدس انجیل کا ایک کردار تھا۔ اور میرے نزدیک یہی ایک امتیاز ہے جو ٹولس لوٹرس اور ریبران کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ ریبران کی ہر عورت اپنی مریم، ماں، بہن اور محبوبہ ہے جس کو ماں نے جنا اور باپ نے شفقت کی گود میں اسے پالا پوسا ہے ——— ٹولس لوٹرس ریبران سے تقریباً تین سو سال بعد فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں مر گیا۔ اس کا فن اس کی اپنی انفرادیت کا سہارا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ کیونکہ اس نے انسانی تنزل اخلاقی بندھنوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کرتا ہے۔ اس کی ہر عورت گھناؤنی زندگی کی حامل ہے۔ نہ اسے ماں نے جنا ہے اور نہ باپ کی شفقت اسے نصیب ہوئی۔

جدید آرٹ کی تحریک کے اسباب کچھ بھی ہوں وہ ایک ردِ عمل ہے۔ وہ ایک انتشار ہے جس کے پشت پناہ میکانی اور کیمیائی جوہر ہیں۔ جب سے دنیا نے فن کے ساتھ انسانیت کو وابستہ پایا ہے۔ یہ موجودہ تحریک اپنی اہمیت کی ذمہ دار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے وہ آزادی اور سچائی کی علمبردار ہے۔ اس سے آرٹ کا وہ ابتدائی دور پھر سے جنم لیتا ہے جسے وحشت اور بربریت نے اظہار خیال کے لیے نہیں بلکہ اظہار خیال کی پرستش کے لیے تخلیق کیا تھا۔ جس میں دیوتا، خدا اور محبوب بھی شامل تھے ——— موجودہ تحریکوں کے رجحانات ذہنی جمود، فنی نشوونما کی تھکن کے تقاضے ہیں۔ اس وقت فنکاروں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اس فن کے قدر شناسوں میں بھی بے اطمینانی اور تنوعیت پائی جاتی تھی ——— مشین اور کیمیائی ترقی نے آرٹسٹ کو زندگی کے اور قریب کر دیا ہے تاکہ وہ فطری خدوخال کو

زیادہ سے زیادہ ترقی پسندانہ انداز میں دیکھنے کا خوگر بن جائے۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں بے پناہ گیاں آرٹسٹوں کو اور بھی زیادہ نظر آئی خصوصیت سے رینائے اور ہینے نے ان انقلابیوں کی جس خلوص سے رہبری کی ہے، ایسا کوئی اور آرٹسٹ نظر نہیں آتا مگر گوگیں، گوگ، میزاں، پیشے اور پیکاسو موجودہ تمدن کو مرقص خیال کرتے رہے اور کہتے رہے آرٹ کو پھر سے جنم دینے میں اس کی جیت ہے۔

انیسویں صدی کا اختتام نہ ہوا تھا کہ PRIMITIVE ART نے مختلف شکلوں میں مختلف ملکوں میں امتیاز حاصل کیا اور دیکھتے دیکھتے کئی صورتوں میں سامنے آیا اور دنیا نے اسے قبول کر لیا۔ وحشی قوموں نے اپنی بربریت کو اپنے دیوتا کے تناسب اور خدوخال کو، اور مذہبی توہمات کو جہاں چھوڑا تھا، وہاں سے اس کی ابتدائی صدیوں کے بعد ترقی پسندانہ رجحانات کے زیر اثر اس سے تعاون کیا گیا اور اپنے سامنے فرعون کے مجسموں کو، جینیٹس کی برتری کو رکھا گیا۔ اور ہر بربریت اور اختصار کو حل قرار دیا گیا۔ اس اسکول کے تمام فائدے سائنٹفک توجیہ کے لیے کیمیائی اور میکانی تھیوری سے استفادہ کرتے رہے اور فن اپنی فطرت کے مطابق مہذب دنیا سے وابستہ ہو گیا۔

جاپان کے لافانی آرٹسٹ ہکوسائی نے عرب کی ہندسی شکلوں نے، ایران کی نسخ اور نستعلیق خطاطی نے جدید آرٹ کو متاثر کیا جس میں فرانس، انگلستان، امریکہ، ہندوستان اور جاپان نے حصہ لیا۔ اور جو بھی جدید تحریک میں شامل ہوا اس نے سوئی ہوئی قوتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔

مشرق کی وہ سرزمین جس پر آرٹ کے پہلے شاہکار نے جنم لیا وہ زمین مصر ہے۔ اس کے بعد فلسطین، ایران اور ہندوستان نے اپنے ماحول، اپنی معاشرت کی بنا پر بڑے بڑے شاہکار تخلیق کئے۔ یہ سب آرٹسٹ اور صناع نہ ماڈل کے مقلد تھے، نہ ماڈل ان کی پرکھ تھی۔ ان کے ماڈل وہ کردار تھے جن میں زندگی تھی۔ ناقابل تسخیر عمل تھا۔ جن میں انسان اور انسانیت کے پھلنے پھولنے کے امکان تھے۔ ان کی ذہانت اور ان کا شعور انھیں سمجھ سکا تھا۔ فراعنۂ مصر کے مجسمے ان کے ابتدا اور ان کے وقت اور عظمت پر ہی روشنی نہیں ڈالتے بلکہ ان میں فن کی وہ تمام قوتیں، صلاحیتیں اور حقائق پائے جاتے ہیں جن کی طرف دیکھ کر آج کا انسان متحیر ہی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سوچتا چلا جاتا ہے کہ صناع نے انہیں کن لافانی قوتوں سے سرفراز کیا تھا۔ پتھروں کا سادل اور فولاد کا جسم دے کر کیوں انہیں کچل کر رکھ دیا تھا۔ ان مجسموں کا ابدی سرور اقتدار اور مملکت ہی نہیں وہ اعلیٰ ترین اوصاف ہیں جن سے فنکار کی نیت، پاکیزگی اور اس کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کیفیت جو ان کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے انفرادی نوعیت کی ہے۔ ان کے مطالعہ سے کبھی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک نہایت لطیف میلان ان کے ہمارے درمیان حائل ہوتا ہے کہ ہم رموز زندگی اور انسانی عظمت سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ اثر آفرینی ماڈل کی بدولت نہیں کردار کی تشکیل سے ہے جو ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ فنکار اپنے شاہکاروں کو سادہ اور نہایت کم درجہ تمثیلوں سے، اختصار سے تکمیل دیتے تھے۔ ظاہری طور پر ان کا مقصد ہر شاہکار کو آسان، عام فہم، قابل تحسین بنانا ہوتا تھا۔ مگر جب ان پر مصوروں نے نگاہیں گاڑ دیں تو انھیں ان کے معنی فرعون کے دعووں سے بھی زیادہ بلند اور عمیق نظر آنے لگے اور فن کی پرکھ رکھنے والوں نے بادشاہ اور رعیت کے تعلق کو چھوڑ کر ان کو ان کی ذاتی خصوصیات سے الگ کر کے صرف کردار اور شاہکاروں کو تخلیق کی رو سے دیکھنے پر قناعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب جو مادہ پرستی میں پیش پیش تھا

ماڈل کی پرستش سے منکر ہو کر فوٹو گرافی کے مسئلے سے بھی گزر کر ایشیا کی اس غیر فانی عظمت کا احترام کرنے لگا۔

روداں کے بعد اپسٹائین کا دور آیا۔ ڈوبسن اور مور نے دنیا کی توجہ کو کھینچا۔ پیکاسو نے اپنے آرٹ کے تجربات میں نیا اضافہ کیا تو دنیا بھر میں اس تحریک نے انتشار پیدا کر دیا۔ اور فن کے پرکھنے والوں نے بھی مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع پایا اور ابتدائی آرٹ کی جگہ کھجیت نے لے لی۔ پیچیدگیاں در پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں اور جدید آرٹسٹوں کی ساتھ کوئی تحریک نہ دے سکی اور وہ اپنی لوکھلاہٹ میں شعبدہ بازی پر اتر آئے اور اپنی پیچیدگیوں کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔ اس فن کے بانیوں کو جب ذرا روشنی ملتی ہے تو وہ منہ کھول کر اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی غلط طریق پر غلط راہ پر کھڑے ہیں۔ پیکاسو اپنے گنجے سر پر کبوتر بٹھا کر گھر سے باہر نکل آتا ہے اور کبھی نیم برہنہ بلی سے لپٹا ہوا اپنی بے نیازیوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کبھی ستر سال کی عمر میں اٹھارہ سالہ لڑکی سے شادی رچا کر چھوٹے پیکاسو کا اعلان کرتا ہے۔ شہرت اس کے دروازے پر کھڑی ہے، وہ اسے اور ہوا دیتا ہے اور کہتا ہے سیدھے سادے خط، سادگی اور اختصار فن کی روح ہے۔

نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست

زیرِ ادارت : احمد ندیم قاسمی ، ہاجرہ مسرور

۱

	طلوع	ہاجرہ مسرور
مقالے	بیانات	خالد حسن قادری
	مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک اسلوب	عزیز احمد
	کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی	غلام رسول مہر
	اردو زبان	فلک پیما
نظمیں	خطبۂ صدارت	حفیظ جالندھری
	رباعیات	سیماب اکبر آبادی
	رباعیات	احمد ندیم قاسمی
	ابرِ رواں	یوسف ظفر
	مناجات	قیوم نظر
	مشورہ	تفضیل شفائی
افسانے	بھیروں کا مندر بلیڈ	کرشن چندر
	میں انسان ہوں	احمد ندیم قاسمی
	بڑے انسان بنئے بیٹے ہو	ہاجرہ مسرور
	میرا دشمن میرا بھائی	عزیز احمد
	فاختائیں	ولیم سینسم
غزلیں	غزل مسلسل	اثر لکھنوی
	دو غزلیں	اختر شیرانی
	برگِ سبز	فراق گورکھپوری
	نغمائے چیدہ	حفیظ ہوشیارپوری
	غزل	علی سردار جعفری
	غزل	احمد ندیم قاسمی
	غزل	سیف الدین سیف
	دو غزلیں	مختار صدیقی ۔ عبدالمجید مدہم
ہماری زبان		ڈاکٹر عبدالحق
		سیماب اکبر آبادی
		خواجہ احمد فاروقی
		احتشام حسین
		ذوالفقار ہاشمی
		خدیجہ مستور
ہماری دنیا		سندھ فلسطین — عبدالمجید سالک
ہمارا اسٹاج		کچھ تو کہئے — ہاجرہ مسرور
فلم		ڈوکو منٹری — اے نقوش
نئی کتابیں		ہم وحشی ہیں (کرشن چندر) "ہم"
		نئی دنیا کو سلام (سردار جعفری) "قنات"

۲

	طلوع	ہاجرہ مسرور
مقالے	جہاں تو ہو رہا ہے پیدا	فیض احمد فیض
	تقسیم دولت	علامہ غلام مرشد
	سیاسی بحران اور ہمارا ادب	انتظار حسین
	اوپلے اردو کی خدمت میں	غلام جیلانی برق
	جدتی قدریں	شبیر محمد اختر
نظمیں	فریبِ بہار	جاں نثار اختر
	غریب	علی سردار جعفری
	لمحۂ دلبری	فکر تونسوی
	یہ بہار	ضیا جالندھری
	خیر مقدم	جعفر طاہر
	یہ گیت	مقبول حسین احمد پوری
	عنفوانِ شباب	احمد ندیم قاسمی
افسانے	جلک ٹوٹیے	خدیجہ مستور
	رات بھر	اختر اورینوی
	لمحات اندر لمحات	شوکت تھانوی
	زرد پتے	میکسم گورکی
غزلیں	غزل	انجم رومانی
	غزل	طاہر فاروقی

غزل — عبدالعزیز فطرت
غزل — مجید امجد
غزل — قیوم نظر
غزل — احمد ندیم قاسمی

ہماری زبان
نیاز فتحپوری
آل احمد سرور
اختر اورینوی
عزیز احمد
معین احسن جذبی
خواجہ احمد عباس

ہماری دنیا مغربی سیاست کے نئے تیور — مرزا محمد حسین
ہمارا سماج کچھ تو کہئے — "مجیب"
فلم فلم کے اثرات — اے۔ قدوس
نئی کتابیں محاکمتیں — "ہم"
آخر شب — "قاف"

۳

مقالے
طلوع — احمد ندیم قاسمی
جمالیاتی قدریں — ڈاکٹر تاثیر
شکایت روزگار — غلام رسول مہر
ترقی پسند ادب اور حب الوطنی — ساحر لدھیانوی
پاکستان کی قومی زبان — ڈاکٹر محمد عبداللہ باری علیگ
تقسیم دولت — علامہ خادم مرشد
زبان کا مسئلہ — محمد تونسوی

نظمیں
دروازہ — جگر مرادآبادی
رباعیات — جوش ملیح آبادی
صدا بصحرا — اختر الایمان
سمندر — محمود جمال الدین حریری
ایک شام — تصدق حسین خالد
یہ پھول — قیوم نظر
رواں ہے سفینہ — سیف الدین سیف
پڑوسی — قتیل شفائی
خواب — فارغ بخاری
خواب گناہ ملک — احمد ندیم قاسمی

افسانے کھول دو — سعادت حسن منٹو
سپاہی — کرشن چندر
چڑھے چڑھیا کی کہانی — احمد عباس
نفرت کیوں تھی؟ — عزیز احمد
آندھی میں چراغ — ممتاز شیریں

ڈرامہ ہیلو — جاوید اقبال

غزلیں
غزل — حفیظ ہوشیارپوری
غزل — عبدالمجید سالک
غزل — اثر لکھنوی
غزل — عبدالحمید عدم
غزل — اختر شیرانی
غزل — اختر ہوشیارپوری
غزل — احمد ندیم قاسمی

ہماری زبان ڈاکٹر باقر
عبادت بریلوی
آغا امشوت

ہماری دنیا آج کی دنیا — ابوسعید بزمی
ہمارا سماج مسئلہ نسواں اور ادب — زبیدہ نزہت
نظم تعلیمی مسئلہیں — اے۔ قدوس
نئی کتابیں صحیفہ — محمود سلطان (محمود بنگلوری) "ہم"
دوراہے پر (ڈاکٹر محمد اختر) "ہم"
نئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) "قاف"
اقبال کے خط عطیہ بیگم کے نام "قاف"
ملاپ (ماہنامہ) "قاف"
گونج (طفیل ملک) طیر بابر

۴ (آزادی نمبر)

طلوع — ہاجرہ مسرور

طنز و مزاح دوست کے نام — "پطرس"
برج بانو — کنہیا لال کپور
شہر اور گاؤں — "نک چڑھا"
کون (نظم) — شفیق الرحمٰن

مقالے
مثنوی بہار عشق — خواجہ احمد فاروقی
ادب، حب الوطنی اور وفاداری — احتشام حسین
اختر شیرانی — آل احمد سرور
ارسطو کا تصور المیہ — جاوید اقبال

	تمدن اور ترکۂ اسلام	عبدالرحمٰن چغتائی
	ادیب اور عوامی ادب	فکر تونسوی
نظمیں	ہندوستان پاکستان کا نعرہ	جوش ملیح آبادی
	پندرہ اگست	اختر الایمان
	ایک سے حسن آزادی	عبدالمجید بھٹی
	دھوئیں کے بادل	محمود جلند ھری
	روحیں	منیب الرحمٰن
	چراغ روشن ہیں	عبدالحمید عدم
	ردوا و فکر و عمل	اختر انصاری
	نغمات	جاں نثار اختر
	اجنبی دیس میں	ادا جعفری بدایونی
	اے ساقی	مقبول حسین احمد پوری
	اظہار	ضیا جالندھری
	میراث آدم	تابش دہلوی
	جدید تر	احمد ندیم قاسمی
افسانے	ایک اڑان میں	ابوالفضل صدیقی
	(؟)	سعادت حسن منٹو
	پچھلے چوری	ہاجرہ مسرور
	ماتی ڈارلنگ ہوٹل	مہندر ناتھ
	آخری سہارا	شکیلہ اختر
	کھیل	ڈاکٹر تاثیر
	جب بادل اڑے	احمد ندیم قاسمی
ڈرامہ	آیا	دیندر ناتھ اشک
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	انتخاب مسلسل	حفیظ ہوشیارپوری
	غزل	اثر لکھنوی
	تازہ اشعار	عابد علی عابد
	غزل	انجم رومانی
	غزل	شاد عارفی
	بوئے رفتہ	مختار صدیقی
	غزل	تیرم نظر
	غزل	سیف الدین سیف
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	عبدالعزیز خطرت
	غزل	احمد ریاض
	غزل	صفدر طاہر
ہماری زبان	اردو کا مستقبل	آل احمد سرور
		خواجہ احمد فاروقی
		ڈاکٹر سید عبداللہ
		اثر لکھنوی
		میاں بشیر احمد
		اپندر ناتھ اشک
		اختر الایمان
		جاں نثار اختر
		انجم رومانی
فلم	فلموں کا معیار	اے۔ قدوس
جائزے	اردو نظم کا ایک سال	عبادت بریلوی
	اردو نثر کا ایک سال	عائشہ درانی
	اردو کا ایک سال	عابد علی عابد
	سیاست کا ایک سال	ابوسعید بزمی
	سماج کا ایک سال	خدیجہ مستور

۵

	طلوع	احمد ندیم قاسمی
	قائد اعظم	ادارہ
	اداریہ شمارہ ۵	مقبول حسین احمد پوری
	اختر شیرانی	ندیم
	جو پروش لوح و قلم کرتے رہیں گے	فیض احمد فیض
	خاموش خاموش	انجم رومانی
	دنیا کے پانچ سو دانشوروں کا خطاب	
مقالے	قدیم انسان، احساس حسن اور اظہار	اختر انصاری
	زبان کا مسئلہ	خلیل احمد خاں
	نسائی عجائب اور بدعادت	عزیز احمد
	اقبال اور رومی	نذیر مومن
	روایت کی اہمیت	عبادت بریلوی
	دلی کا آخری ادیب	آغا محمد اشرف
	مثنوی خواب و خیال	مظفر علی سید
	ہمیں کیا کرنا چاہیے	ابوالخیر صدیقی
مطالعے	افسانہ نگار عسکری	ریاض جاوید

نظمیں

"یا خدا" اور اس کا دیباچہ	ظہیر بابر
ایک کوہستانی سفر کے دوران میں	مجید امجد
پس منظر	اختر الایمان
شرور	فکر تونسوی
خیال آرا ہے	مخمور جالندھری
یہ رات رات نہیں	خیب الرحمٰن
یا مرد	ظہیر کاشمیری
قطعات	جاں نثار اختر
سعیٔ رائگاں	ابن انشاء
معذرت	تفتیل شفائی
گیت	تیموم نظر
علم کے خلاف لڑنے والے فنکاروں کے نام	احمد ندیم قاسمی

افسانے

شاہراہ	انور
نیا سفر	خدیجہ مستور
تیسری ملاقات	اختر انصاری
پریٹ	ابراہیم جلیس
لمحے	بلونت سنگھ
یہ بیمار	شوکت صدیقی
پرانا سیحا	ہاجرہ مسرور
نیا فرہاد	احمد ندیم قاسمی

ڈراما

انسانیت کی موت	احسان الحق

غزلیں

غزل	فراق گورکھپوری
غزل	عدم
غزل	اثر لکھنوی
غزل	عارف عبدالمتین
غزل	میراجی
غزل	احمد راہی
غزل	جمیل ملک
غزل	احمد ریاض
غزل	ضمیر اظہر

ہماری دنیا ملک معظم زندہ باد	ایوب احمد کرمانی
ہمارا سماج ہماری شادیاں	طفیل احمد خاں
ہماری تحریک روداد انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور	مرتب

ہمارے نام یہ امریکہ ہے — مسعود جمال

نئی کتابیں

جمال و جلال (مجموعہ کلام)	احمد ندیم قاسمی
نقوش لطیف — خواتین کے افسانے	عبدالمجید سالک
قلی — ناول ملک راج آنند (ترجمہ)	احتشام حسین
نظام نو — عبدالوحید	حمید اختر قریشی
	ظہیر

۶

مقالے

طلوع	ہاجرہ مسرور
عوام کو امن نصیب ہو	اشیا اہری برگ (ترجمہ ایوب احمد کرمانی)
موجودہ تحریکوں کے آئینے میں	عطا محمد
اے عندلیب فتنۂ ناآفریدہ	محمد صفدر

نظمیں

نیا ادب کا خاص نمبر	احمد ندیم قاسمی
ہند کی یہ شب مہتاب	مسعود حسین
یوم مئی ۱۹۴۹ء	محمد صفدر
اور زوال پسندوں نے کہا	باقی صدیقی
پنچوں ہاتھوں پٹا دوالا	سوامی ماہر دی
رباعیات	جاں نثار اختر
کلفتِ احساس	عبدالمجید عدمؔ
وہ مرا آبوئے ختن	حامد عزیز مدنی
تم اپنی نگاہوں سے —	اعجاز بٹالوی
ایک سال پہلے	منظر سلیم
گیت	میراجی
پیاگ	خیب الرحمٰن
گیت	مقبول حسین احمد پوری

افسانے

حسن اور روٹی	اے، حمید
فکر	ابوالفضل صدیقی
آزادی	مہندر ناتھ
تلاش	اشفاق احمد
بڑی سرکار کے نام	احمد ندیم قاسمی

غزلیں

غزل	چراغ حسن حسرت
غزل	تفتیل شفائی
غزل	اختر ہوشیارپوری
غزل	تابش دہلوی
غزل	عبدالعزیز فطرت

غزل — مجید شاہد
غزل — قمر ہاشمی
غزل — فرید جاوید

ہماری دنیا — معاہدہ شمالی اٹلانٹک — ایوب احمد کرمانی
ہمارے نام — ارسطو اور اتلاطون کی سرزمین سے — مسعود جمال
ہماری تحریک
انجمن ترقی پسند مصنفین
نئی کتابیں — جاوید کا خاص نمبر — عبداللہ ملک
ودھا بھی شاہزادہ — ظہیر بابر
جب خون بہہ رہا تھا — "قاف"
اشتہارات

۷ (امن نمبر)

طلوع — ہاجرہ مسرور
احترام آدمی — علامہ اقبال
روکلا کے کھنڈروں میں منظر — احمد ندیم قاسمی
(روداد روکلا امن کانگرس)
اے ماؤ، ہنو، ہیٹیو! — ظہیر بابر
(روداد اوپن ڈائیلیسٹ امن کانگرس)
یہاں ڈالر اگتے ہیں — صابرہ زیدی (نیویارک)
(روداد نیویارک امن کانگرس)
روس اور والٹیر کی سرزمین میں (افسانہ)
تہذیب ناقابل تقسیم ہے — بیلا ہیرن برگ — ترجمہ کرمانی
کیا بارہ عورتیں ہاتھ جانیا کا سودا بنا سکتا ہے — ترجمہ احمد راہی
عالمگیر امن کانگرس پیرس کا منشور
پاکستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ
ہندوستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ

نظمیں — چنگ کنگ سے چلی تک! — احمد ندیم قاسمی
..... — محمد جلال ہری
دیئے جلاؤ ساتھیو — مسعود حسین
شانت سندیس — سامی مارہروی
قصاص — حسن طاہر
سیل انگار — ظہور نظر
اندھیرا — مخدوم محی الدین
جنگ — بلراج کومل
میرا قلم — قتیل شفائی
رات ساکت ہے — نجیب الرحمٰن
میں اکیلا رہ جاؤں — سلام مچھلی شہری
اک دنیا اپنالی — ریاض قادر
تحفے — تاجور سامری
حقیقت پسند — احمد ظفر

افسانے — موتی — کرشن چندر
ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد — احمد ندیم قاسمی
محاذ سے دور — خدیجہ مستور
منزل ہے کہاں تیری! — ابراہیم جلیس
جھنڈا اونچا رہے ہمارا — شکیلہ اختر
نقوش — سلطان الحسن
جدوجہد — کوہیاشی (مترجمہ حمیدہ اختر)

غزلیں — غزل — شاد عارفی
غزل — عدم
غزل — ظہور نظر
غزل — باقی صدیقی
غزل — صبا لکھنوی
غزل — حسن طاہر
غزل — اشعر ملیح آبادی
غزل — شہاب انصاری
غزل — عالم مخدومی

ہمارے نام — یہاں فنکاروں کا خون بہا تھا — مسعود جمال
ہماری تحریک — :- انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور اور راولپنڈی کے ہفتہ وار اجلاسوں کی کارروائیاں
نئی کتابیں — نیا دور (فسادات نمبر) — محمد صفدر

۸ (آزادی نمبر)

طلوع — ہاجرہ مسرور
ایٹم کے بارے میں — عبدالرحمٰن چغتائی

مقالے — ادب اور فرد ایت — ڈاکٹر اعجاز حسین
آتش کی صوفیانہ شاعری — احتشام حسین
ماضی کے ادبی تصور کے متعلق — ممتاز حسین
میرزا فرحت اللہ بیگ — اختر انصاری
ترقی پسند تحریک — عبادت بریلوی

نظمیں

"ضمن" کا نفسیاتی ارتقا	صفیہ اختر
ساقی نامہ	جہاں نشاد اختر
آئینے کے تکلیفوں	سلام مچھلی شہری
سہاگے کا گیت	حسن اعزازی
چراغاں	احمد ندیم قاسمی
قطعات	نشاد عارفی
قدمبوسی	مخمور جالندھری
یوم آزادی	مسعود حسین
جھلکیاں	غلام ربانی تاباں
دھارے کا موڑ	صہبا لکھنوی
آمریت کی قربان گاہ پر	شریف کنجاہی
کرشنا بینتی	سوامی مارہروی
ہیگ	مغیث الرحمن
تلاش	اختر اورینوی
رقص	کرشن موہن
آرٹ	احمد ظفر
یقین و عمل آگ	تاریخ بخاری، احمد فراز
دو گیت	مقبول حسین احمد پوری
	مسعود حسین

افسانے

پوم پوم ڈار رنگ	عصمت شاہد لطیف
چل پی کو ملن —	خدیجہ مستور
جہاں پھول کھلتے ہیں	قرۃ العین حیدر
چوپٹ راجا	کنہیا لال کپور
لغزش	"اعزاز"
جہاز باد سندھی	شفیق الرحمن
راجے مہاراجے	احمد ندیم قاسمی
ایک تقریر	فکر تونسوی
سندباد کا نیا سفر	باجرہ مسرور
میرے ساتھی	احمد ندیم قاسمی

غزلیں

غزل	فراق گورکھپوری
غزل	معین احسن جذبی
غزل	عبدالمجید سالک
غزل	احسان دانش
غزل	احمد ندیم قاسمی
غزل	اثر لکھنوی
غزل	ظہیر کاشمیری
غزل	جعفر طاہر
غزل	انجم رومانی
غزل	احمد راہی
غزل	قتیل شفائی
غزل	عبدالمتین عارف
غزل	عدم
غزل	حسن طاہر
غزل	عبدالعزیز فطرت
غزل	مجید شاہد
غزل	ماجور سامری
غزل	ظہور نظر
غزل	باقر مہدی
غزل	شہاب انصاری

جائزے

افسانوی ادب کا ایک سال	حمید اختر
معاشرت کا ایک سال	زہیر صدیقی
ہماری تحریک (۱۴ اگست ۴۷ء کے بعد)	عبداللہ ملک

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

میں تے توں	(پنجابی)	"نقو"
مزدور کا ترانہ	(پشتو)	فضل حق شیدا (ترجمہ خاطر غزنوی)
زیوں حال مزدور	(پشتو)	سید رسول رسا
کال گیت	(بنگالی)	جسیم الدین

۹

کچھ تو کہئے

طلوع	باجرہ مسرور
ترقی پسند مصنفین اور معترضین	احمد ندیم قاسمی

مقالے

ادب سے متعلق چند سوالات	مادونے تنگ (ترجمہ طفیل احمد ملک)
"نیا دور" کا فسادات نمبر	مجتبیٰ حسین

نظمیں

شناخت	
کھیلنے کے لوگ	عدم
گیا پنجاب	حامد عزیز مدنی
میں ترا کون ہوں!	مخمور جالندھری
طلوع	ظہور نظر
رہنماؤں کے نام	نزہت کمار شاد
	عارف عبدالمتین

غزلیں

بھول	احمد فراز
غزل	شاد عارفی
غزل	عالم خجندی
غزل	باقی صدیقی
غزل	احمد ریاض
غزل	ادا بدایونی
غزل	نور بجنوری
غزل	احمد ندیم قاسمی

افسانے

صکتی وادیوں میں	شوکت صدیقی
سیکنڈ زوجہ	ابراہیم جلیس
ایک رات	اے حمید
کرسی کے جالے	نثار عزیز
میرے ساتھی	احمد ندیم قاسمی

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

الاصلاح (پنجابی اور ترجمہ) — افضل پرویز

۱۰

کچھ تو کہیئے

طلوع	احمد ندیم قاسمی
کدھر جائیں	عصمت چغتائی

مقالے

فلسفۂ اقبال پر چند تنقیدی اشارے	مسعود حسین
میر کا تصورِ عشق	عطا محمد
ایران کا جدید ادب	صابرہ زیدی

نظمیں

موت سے پہلے	سلام مچھلی شہری
چل سو چل	ابن انشاء
آرٹ اور عوام	فکر تونسوی
سیاسی مخبر	تیغ الہ آبادی
جیل میں کسی کا خط پا کر	غلام ربانی تاباں
نیا دور	جگن ناتھ آزاد
سچائی	ناصر ساہری
آنکھوں سے دل تک	احمد راہی
وقت	احمد ندیم قاسمی

غزلیں

غزل	مسعود حسین
غزل	عدم
غزل	تفضیل شفائی
غزل	باقی صدیقی
غزل	مجید شاطر
غزل	احمد ظفر

افسانے

ہیرو لعزیز	کرشن چندر
جدوجہد (جاپانی کہانی)	حمیدا مختر
بجلی کا خون	عبدالحلیم چغتائی
ڈاکو	سلونت سنگھ وہیر

میرے خیال میں

"نقوش" آزادی نمبر کے متعلق رائیں

اختر شیرانی
مجتبیٰ حسین
سلام مچھلی شہری
بلراج کومل
مسعود حسین
تشنہ بریلوی
گمنام ترقی پسند
سوامی مارہروی
باقر مہدی
صبا لکھنوی
غلام ربانی تاباں
ظہور نظر
نثار عزیز

نئی کتابیں — "ثاقب"

- سامراج اور عوام
- مشرقی یورپ کا زرعی انقلاب
- ریاست کیا ہے
- ریت اور جھاگ
- بادبان
- پیام تو
- دولت نامہ

نئے رسالے — "ثاقب"

- محاذ (بمبئی)
- شبنم (لاہور)
- طلوعِ اسلام (کراچی)
- علم و دانش (بمبئی)
- نفسیاتی جائزے (لاہور)

زیرِ ادارت

وقار عظیم

۱۱-۱۲ (خاص نمبر)

غزلیں	طرح	وقار عظیم
	غزل	جگر مراد آبادی
	غزل	آرزو لکھنوی
	غزل	ڈاکٹر تاثیر
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	ن۔م۔ راشد
	غزل	عرش ملسیانی
	غزل	عدم
	غزل	راز مراد آبادی
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	فضلی
	غزل	اختر شیرانی
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	مجید شاہد
	غزل	رضی ترمذی
	غزل	ضمیر اظہر
	غزل	ارمان نامانی
مقالے	خطوط سے دل	میر ناصر علی مرحوم
	پاکستان میں مصوری کا مستقبل	عبدالرحمن چغتائی
	دگرد نائے راز.....	مولانا صلاح الدین
	عورت اہل فارس کے نزدیک	نیاز فتحپوری
	مصحفی کی غزل	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
	اردو شاعری میں تصوف	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
	کشکول	عزیز احمد
	اردو کا بہترین رپورتاژ	ممتاز شیریں
	للسفۂ عیش غم.....	عطا محمد
	اندر سبھا	نجوم نظر
نظمیں	سرور لکھنوی کے آئینے میں	مشرف انصاری
	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	نظم	جگر مراد آبادی
	نظم	تلیل شفائی
	مرسید کی روح سے	احسان دانش
	ویٹ نام	جگن ناتھ آزاد
	فنائے نوع بشر کے بعد	ہادی حسین
	اندیشہ	سلام مچھلی شہری
	تعارف	خاطر غزنوی
	پس پردہ	نقی الحکم
	خراج	شفیق الرحمن
افسانے	سہاگ	سعادت حسن منٹو
	پہاڑ	ممتاز مفتی
	بخیال خویش عیشے	عشرت رحمانی
	چند تصویر بتاں	یزدانی ملک
	چوہا	ابن سعید
	صحرا صحرا	اے۔ حمید
	گھر یا دیہانہ	مشکیہ اختر
	بندرابن کی کنج گلی میں	اشفاق احمد
	مائی پھاتاں	میرزا ادیب
	بھینٹ	حبیب اشعر
	خود کا نام جنوں	انصار حسین (زیتونی)
	کرم فرما و فرود آکہ خانہ خانہ تست	ابو سعید قریشی
	نئی کتابیں	وقار عظیم
	نقوش ثانی	مینجر

۱۳

مقالے	طرح	وقار عظیم
	تین افکار	عبادت بریلوی
	ادب اور مفید ادب	انتظار حسین
	کیا مذہب کا امکان ہے	ڈاکٹر اقبال
	مظلوم روحیں	وقار عظیم
نظمیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی

نظم		جگر مراد آبادی
	نخوت پری	مخمور اکبر آبادی
	پنجرے کے وہ دو دار کھلے	سوامی مانہروی
	تراوش	جمیل نقوی
غزلیں	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	عدم
	غزل	اثر صہبائی
	غزل	یوسف ظفر
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	شان الحق حقی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	حبیب الشعر
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	اقبال صفی پوری
	غزل	شہرت بخاری
	غزل	ادیب سہارنپوری
	غزل	مضطر اکبر آبادی
	غزل	عابد حضری
افسانے	جل منڈل	عزیز احمد
	ٹوٹو	سعادت حسن منٹو
	لیاقت نمبر و معاہدہ	شوکت تھانوی
	گرتے گھر	سلیم باندے
نئی کتابیں	چھان بین	اثر لکھنوی
	بیکراں	جگن ناتھ آزاد

۱۴

	طلوع	وقار عظیم
مقالے	پاکیزہ خیالیاں	میر ناصر علی (مرحوم)
	اندلس کے آثار علمیہ	نیاز فتحپوری
	تین ناول	جلال الدین اکبر
	اقبال کی ایک نظم پر علمی تنقید	مظفر علی سید
	یہ میرا جی ہیں	مظفر ممتاز
	غالب کی تصویریں	خیر بھوروی
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	رضا علی وحشت
	غزل	مرزا احسان احمد
	غزل	عدم
	غزل	ضیا جالندھری
	غزل	راز مراد آبادی
	غزل	عبدالعزیز فطرت
	غزل	اثر صہبائی
	غزل	فضل احمد کریم فضلی
	غزل	خاطر غزنوی
	غزل	نصیر صدیقی
	غزل	محمد صدیق کلیم
نظمیں	پیشانی گرنی	الطاف مشہدی
	گردش وہم و گماں سے نکلا	رخصت سروش
	جشن عید یا جشن ماتم	شاعر لکھنوی
	ہم سفر سے	نصیر احمد زار
افسانے	رام کھلاون	سعادت حسن منٹو
	مشاعرہ	شوکت تھانوی
	بہار کا گیت	یزدانی ملک
	کوئلیں کا بیوپاری	شیام سندر
	پہاڑی بینا	انتظار حسین
نئی کتابیں	ہمارے نبی	سید نواب علی
	پاکستان، پس منظر و پیش منظر	حمید انور
	ضلعوں کا ہنگامہ	افضل مرزا جالندھری

۱۶-۱۵ (سالنامہ)

ذکر تاثیر	ہائے وہ میرا کا رول ہو رہا	ڈاکٹر تاثیر
	لندن کی ایک شام	ڈاکٹر تاثیر
	مرثیاس کا لکھنے والے احباب (ذکر تاثیر)	عبدالمجید سالک، عابد علی عابد، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، خلیفہ عبدالحکیم، امتیاز علی تاج، ایس اے رحمن، فیض احمد فیض، عبدالرحمن چغتائی، حفیظ ہوشیارپوری
مقالے	ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	پطرس
	واجد علی شاہ	شرر مرحوم
	لقا خانا اور تعلقے	عبدالرحمن چغتائی
	مجھ سے کے فعل مذکر کا استعمال	عندلیب شادانی

مجھے کس ادب پارے نے سب سے زیادہ متاثر کیا — سید عابد علی عابد

اردو ادب کے بعض موجودہ میلانات — ابو اللیث صدیقی

جدید اردو ادب کے بعض مسائل — ڈاکٹر عبادت بریلوی

غالب کا نظریۂ شعر — مہدی حسین

میرے بھی صنم خانے — جلال الدین احمد

قدیم اردو کی مذہبی مثنویاں — نصیر الدین ہاشمی

مرے بو — ریاض الاسلام

نقوش بجا — مشرف انصاری

اقبال کی شاعری میں حشر کا عنصر — شمس الدین صدیقی

میراجی

میں میراجی کو نہیں جانتا — شوکت تھانوی

روسی کے بھاؤ — اسحاق احمد

غزلیں

غزل — رضا علی وحشت لکھنوی

غزل — جگر مرادآبادی

غزل — عندلیب شادانی

غزل — عابد علی عابد

غزل — عبدالحمید عدم

غزل — قتیل شفائی

غزل — عبداللطیف تپش (مرحوم)

غزل — قیوم نظر

غزل — انجم رومانی

غزل — امین حزیں سیالکوٹی

غزل — مختار صدیقی

غزل — سلام مچھلی شہری

غزل — نہال سیوہاری

غزل — حیرت شملوی

غزل — اقبال صفی پوری

غزل — شاعر لکھنوی

غزل — ضیا جالندھری

غزل — ناصر کاظمی

غزل — اختر ہوشیارپوری

غزل — تابش دہلوی

غزل — ادیب سہارنپوری

غزل — باقی صدیقی

غزل — عبدالعزیز فطرت

غزل — صفیہ شمیم ملیح آبادی

غزل — نظر حیدرآبادی

غزل — مضطر اکبرآبادی

غزل — باقر مہدی

غزل — قمر ہاشمی

غزل — فرید بخش قادری

غزل — باقر رضوی

غزل — آغا صادق

غزل — نفیس چغتائی

غزل — افضل حسین اظہر

غزل — مظفر اقبال حشر

نظمیں

رباعیات — جوش ملیح آبادی

قطعات — جگر مرادآبادی

چھل بیچ شیطان کی — میراجی

رباعیات — جلی ناظم آبادی

گیتوں کی کوئلیا بولے — سلام مچھلی شہری

ایک دن — قیوم نظر

منزل — عبدالحمید بھٹی

بس بھول بھی جاؤ — عشرت رحمانی

زندگی کی پکار

وہ دیکھو

برنارڈ شا افسانے

برنارڈ شا — ام امام

رئیس خانہ — قرۃ العین حیدر

اڈی چک بھوتنا — احمد ندیم قاسمی

بسم اللہ — اوپندر ناتھ اشک

دودھ بھری گلیاں — سعادت حسن منٹو

بارہ بانی — بلونت سنگھ

سابھ کو آج — عزیز احمد

اور زندگی چلتی رہی — شوکت تھانوی

بجو دھری — فیاض محمود

امی — صوفی تبسم

وہ ڈالیاں جن کی — اشفاق احمد

رخشندہ — اے حمید

موار — انتظار حسین

آغا بابر

۱۷—۱۸ (ناولٹ نمبر)

ناولٹ	کٹاری	سعادت حسن منٹو
	سسرال	شوکت تھانوی
	اللہ کے نام پر	انتصار حسین
	برف کی وادیوں میں	اے حمید
	مہمانِ بہار	اشفاق احمد

منظوم کہانیاں	ہمراہی	عبدالحمید عدم
	واپسی	سلام مچھلی شہری
مقالے	فورٹ ولیم کالج کے چند ناول نگار	سید عابد علی عابد
	اردو ناول	صلاح الدین احمد
	ناول یا افسانہ	نقاد
	طلوع	وقار عظیم

زیرِ ادارت

محمد طفیل

۱۹—۲۰

افسانے	سو روپے	کرشن چندر
	آتشِ گل	احمد ندیم قاسمی
	اولی اللہ	ممتاز مفتی
	سہارے کی تلاش	حیات اللہ انصاری
	سنسان موڑ	خدیجہ مستور
	حقیقت نیوش	اشفاق احمد
	سنہرے دن	یزدانی ملک
مکاتیب	اُس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	ڈاکٹر تاثیر
	بارِ خاطر	شوکت تھانوی
نظمیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	نغمۂ انساں	احمد ندیم قاسمی
	سلسلے	اختر الایمان
	رودادِ زمانہ	مجید امجد
	آرٹ	عبدالحمید عدم
	خوابِ حسن	شور علیگ
	کراچی سے ایک تار	انجن ناتھ آزاد
	رخصت	قیوم نظر
	نئے زاویے	انجم رومانی
	کیا خوب یہ انجام ہے	سوامی مارہروی
	تغیر	اختر ہوشیارپوری
	عذرا	منظور عارف
	سراب	فارغ بخاری
	یاد	منیر نیازی

طویل مختصر افسانے	چارہ گر	تسنیم سلیم چھتاری
	پھول کرتے ہیں	اے حمید
ڈرامہ	تعلیمی نظم	سعادت حسن منٹو
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	رضا علی وحشت
	غزل	آل احمد سرور
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	مجید امجد
	غزل	سیف الدین سیف
	غزل	عبدالحمید عدم
	غزل	شاد عارفی
	غزل	یوسف ظفر
	غزل	ناصر کاظمی
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	عبدالمتین عارف
	غزل	احمد راہی
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	فطرت
	غزل	منظور عارف
	غزل	عالم اکبرآبادی
	غزل	رضا ہمدانی

نوادر

غزل — شہرت بخاری
ہوا کے دوش پر (افسانہ) — انور سجاد
قم سے بڑھنے کی لگن ؟ (نظم) — فرہاد زیدی
کہو حریف خود یا مجھ کو فرزانے (غزل) — انوار حسین ہاشمی

مقالے

طبقۂ معتزلہ — نیاز فتحپوری
برنارڈ شا — آل احمد سرور
ناہید کی داستان — عابد علی عابد
قطب مشتری کی لسانی خصوصیات — احتشام حسین
ہادی صاحب — سعادت حسن منٹو
غدر کی اپنی تاریخ کا ایک ورق — خواجہ احمد فاروقی
ناولٹ کی تکنیک — عبادت بریلوی
بلتستان کے لوک گیت — محمود ہاشمی
ہندوستان میں مغلیہ فن مصوری — ربیعہ سلطانہ
ماہ لقا بائی چندا — نصیر الدین ہاشمی
فتح خاں، رابعہ — خاطر غزنوی

۲۱—۲۲

افسانے

سایہ — غلام عباس
موذیل — سعادت حسن منٹو
الحمد للہ — احمد ندیم قاسمی
ریت کا تودا — ممتاز مفتی
شاید کہ بہار آئی — علی عباس حسینی
وہی زمانہ، وہی فسانہ — قرۃ العین حیدر
تیسری کروٹ — مہندر ناتھ
ذلیل پیشہ — ابراہیم جلیس
چاند — شاہد احمد دہلوی
سیل کے نام — اے۔ حمید
مجیب — انتظار حسین
سڑک کے کنارے — سعادت حسن منٹو

مکاتیب

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو — جوش ملیح آبادی
اکبر نامہ — اکبر الہ آبادی
یار خاطر — شوکت تھانوی

نظمیں

رباعیات — جوش ملیح آبادی
سراپا — جگر مراد آبادی
انتقامی — ن۔م۔ راشد
حسن تخلیق — احمد ندیم قاسمی
تبدیلی — اختر الایمان
ساز — عبد الحمید عدم
منزل — مجید امجد
ٹھاکر صاحب — محمود جلالپوری
سپاہیوں کی آواز — شور عظیم
مشرقی بنگال — جگن ناتھ آزاد
بنائے نگار چمن زار گیتی — سلام مچھلی شہری
بھگوان توان میں کوئی نہیں — سوامی مارہروی
بہن — خاطر غزنوی
انتظار — عبد العزیز فطرت
نقد و نظر — فارغ بخاری
یہ سہانے یہ سوت کے دھاگے — جمیل ملک

مقالے (۱) شعر و شاعر

خاں اور اس کی شاعری — عندلیب شادانی
نظیر اکبر آبادی کا عہد — ابو اللیث صدیقی
شاد عظیم آبادی — عزیز احمد
خسرو — غلام جیلانی برق
آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے — انتظار حسین
سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا — اخلاق احمد دہلوی

غزلیں

غزل — جگر مراد آبادی
غزل — فراق گورکھپوری
غزل — آنند نرائن ملا
غزل — اثر لکھنوی
غزل — عابد علی عابد
غزل — رضا علی وحشت
غزل — غلام مصطفےٰ تبسم
غزل — اسرار الحق مجاز
غزل — عبد الحمید عدم
غزل — قتیل شفائی
غزل — خیال سیوہاروی
غزل — شعری بھوپالی
غزل — شاد عارفی
غزل — ناصر کاظمی
غزل — ناصر کاظمی

غزل	مختار صدیقی
غزل	باقی صدیقی
غزل	ملک رامپوری
غزل	سلیم احمد
غزل	نور بجنوری
غزل	شاہی الحق حقی
غزل	شاہد لکھنوی
غزل	تابش دہلوی
غزل	فارغ بخاری
غزل	قیوم نظر
غزل	شہرت بخاری
غزل	ناصر رسامی
غزل	رضا ہمدانی
غزل	نابش صدیقی
غزل	اختر انصاری اکبرآبادی
غزل	انجم اعظمی
غزل	نظر حیدرآبادی
غزل	منیر نیازی
غزل	پروفیسر آغا صادق
غزل	عبداللہ خاور
غزل	شہزاد احمد
غزل	احمد ظفر
غزل	جمیل ملک

مقالے (۲): ادب و تنقید

ہماری داستانیں	وقار عظیم
جمالیاتی خطا اور افادیت	ممتاز حسین
غزل کا مستقبل	عبادت بریلوی
امریکی مہارہ نامہ	اثر لکھنوی
ایسی بلندی ایسی پستی	جلال الدین احمد
تہذیب کی بنیادیں	سید علی عباس جلال پوری

اور

ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر یوسف حسین، محی الدین زور، خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، احتشام حسین، ممتاز شیریں، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، احمد علی خاں، اثر لکھنوی، رضا علی وحشت، اشوک رینگ، شاد عارفی، محمود جامی، عصمت چغتائی، نامور سیاری، جگن ناتھ آزاد، شاعر لکھنوی، کرشن چندر، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، قدرت اللہ شہاب، تسلیم، سلیم چھتاری، بلونت سنگھ، مہندر ناتھ، انور، شوکت صدیقی، عشرت رحمانی، محمود ہاشمی، زاہدہ قیصر، رقیہ سلطانہ، تبصرے — وقار عظیم

۲۴-۲۳

	طلوع	محمد طفیل
ناولٹ	ایک معمولی لڑکی	بلونت سنگھ
افسانے	خدا کی قسم	سعادت حسن منٹو
	ماتا	احمد ندیم قاسمی
	زندگی کا رس	ممتاز مفتی
	خانہ خراب	اشفاق احمد
	دیولا	انتظار حسین
	ڈاچی والیا	اے حمید
	پنجاب کو سلام	فکر تونسوی
	انسان اور سکے	صبیح صادق حمید
	اندھیری راتیں	حجاب امتیاز علی
نظمیں	کارواں میرا	جوش ملیح آبادی
	جاگتے رہو	فراق گورکھپوری
	پرچھائیاں	اثر لکھنوی
	قطعات	احمد ندیم قاسمی
	وہ مکان	اختر الایمان
	ایک شام	مجید امجد
	اسی کا آخری دن	ابن انشاء
	دولت کی خدائی	پروفیسر شور
	میراث	یوسف ظفر
	کون کہتا ہے	سلام مچھلی شہری
	سرسا ہے	حمایت علی شاعر
	جاگیر کے خدا	قمر اجنالوی
مکاتیب	بادِ خاطر	شوکت تھانوی
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	حفیظ ہوشیارپوری
	غزل	مجنوں گورکھپوری
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	آل احمد سرور

غزل — آنند نرائن ملا
غزل — اثر لکھنوی
غزل — احسان دانش
غزل — جگن ناتھ آزاد
غزل — عدم
غزل — ظہیر کاشمیری
غزل — حفیظ شفائی
غزل — شاد عارفی
غزل — ناصر کاظمی
غزل — ناصر کاظمی
غزل — انجم رومانی
غزل — شہرت بخاری
غزل — راز مراد آبادی
غزل — اقبال صفی پوری
غزل — باقی صدیقی
غزل — قرا جالوی
غزل — شاعر لکھنوی
غزل — عمود نظر
غزل — نور بجنوری
غزل — عابد حشری
غزل — نجم نقوی

مقالے — حافظ شیرازی — عابد علی عابد
اردو اور پنجابی — محی الدین زور
فانی کی شاعری — خواجہ احمد فاروقی
ادب اور نظریے — نصیر حیدر
مولوی عنایت اللہ دہلوی — شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
خطبۂ صدارت — حفیظ ہوشیارپوری
محبت پہ کیا گذری — ظہیر بانو
نقش فریادی پر ایک نظر — جلال الدین احمد

۲۵-۲۶ (افسانہ نمبر)

طویل مختصر افسانے
ستاٹا — احمد ندیم قاسمی
جیل پری — علی عباس حسینی
حیات نو — تسلیم سلیم چھتاری

مختصر افسانے مع بھائی
بارہ برس کے بعد — سعادت حسن منٹو
قاتل کیر — حیات اللہ انصاری
مٹی کا پل — عزیز احمد
دور کا نشانہ — ممتاز مفتی
اندھیرے اجالے — محمد علی ردولوی
تعبیر طلب — ہاجرہ مسرور
دوسری مونالزا — شوکت تھانوی
یہ صدی — خدیجہ مستور
نیلا نشان — حجاب امتیاز علی
اجلے پھول — مہندر ناتھ
پسماندگان — اشفاق احمد
بلیک اینڈ وائٹ — انتظار حسین
(۲) کوئی مسافر کوئی منظر — عادل رشید
ڈیڈ لیٹر — کرشن چندر
شاہد لطیف کی شادی — خواجہ احمد عباس
(عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کے خطوط سے ایک سچی کہانی کی ترتیب) — عصمت چغتائی
شاہد لطیف اور اخلاق احمد
مرزا جسونت سنگھ — قدرت اللہ شہاب
یہ ریڈیو روم تھا — شفیق الرحمن
نئے افسانہ نگار — چاندنی اور اندھیرا — ظہیر الدین احمد
بڑھیا — خلیل احمد
جب وحشت کا جگر چیرا — ابو الخطیب
بڑی بہو بیگم — ابن الحسن
رپورتاژ — لندن لیٹر — قرۃ العین حیدر

تراجم۔ مختصر افسانے
پنچ پرمیسر (ہندی) — رنجیا راگھوا
خون کا رشتہ (گجراتی) — ڈاکٹر جینت کھتری
مقتول (عربی) — محمود تیمور
خواب (چینی) — چن چین یو
کچھ تتلیوں کے بارے میں (فرانسیسی) — پال فی زاں
پیغمبر خلاق (روسی) — میکسم گورکی
تنہا گریستی (انگریزی) — کیتھرائن مینسفیلڈ
ایک ریل کا حادثہ (جرمنی) — ہانس مان
سعید جاہ اور عداد (ڈچ) — ایڈورڈ ڈیوز ڈکر

طویل مختصر افسانے

ہیرے کی انگوٹھی (بنگالی) نریندر مترا
ایک پرانی کہانی (کنڑی) باستی وکٹیش آئنگار
کھمبیں جادو کی برف (امریکی) ارنسٹ ہیمنگوے

مقالے

ہمارے مختصر افسانے — وقار عظیم
نئے افسانے اور ہمارا مستقبل — محمد حسن عسکری

۲۷-۲۸

مقالے

طلوع — محمد طفیل
شعر اور زندگی — ڈاکٹر یوسف حسین
نادر ادب کے چند گمشدہ اوراق — ڈاکٹر تاثیر
غزل اور تغزل — ڈاکٹر عبادت بریلوی
نیا منصور — ممتاز حسین
بھلا مانس غزل گو — محمد حسن عسکری
خالص شاعری — اثر لکھنوی
راشد الخیری کا اسلوب — عشرت رحمانی
پشتو شاعری کی ایک جھلک — عبدالغفور خاں

نظمیں

آغازِ انجام — جوش ملیح آبادی
بات سمجھنے والا — حفیظ جالندھری
تقابل — معین احسن جذبی
رباعیات — فراق گورکھپوری
آگ میں پھول — فیض احمد فیض
مری شکست — احمد ندیم قاسمی
سیر دا ہے — ابن انشاء
گرد منزل — پروفیسر شور
تبدیلی — قیوم نظر
خمارے — تیغ الہ آبادی
رقابت — عبدالمجید بھٹی
میرا شہر — ظہور نظر
ادھوری کہانی — عنایت علی شاعر
ایک ہی شہر میں — نور بجنوری
کھنڈر — احمد فراز
آیات — قمر اجنالوی
دو گیت — منیر نیازی

میراجی

میراجی — قدرت اللہ شہاب
گیت — میراجی
میراجی کے آخری لمحے — اختر الایمان

غزلیں

غزل — فراق گورکھپوری
غزل — فیض احمد فیض
غزل — اثر لکھنوی
غزل — عابد علی عابد
غزل — آنند نرائن ملا
غزل — سیف الدین سیف
غزل — قتیل شفائی
غزل — اختر انصاری
غزل — ناصر کاظمی
غزل — جگن ناتھ آزاد
غزل — شان الحق حقی
غزل — سلام مچھلی شہری
غزل — باقی صدیقی
غزل — زہرہ نگاہ
غزل — عبدالعزیز فطرت
غزل — شہرت بخاری
غزل — احمد ظفر
غزل — قمر اجنالوی
غزل — فارغ بخاری
غزل — ناجور سامری

منظوم ڈرامہ، منظوم افسانہ

تاناں دانا — اثر لکھنوی
شیلا ایک کنواری — محمود جالندھری

افسانے

تنہائی — مجنوں گورکھپوری
حماقت — سعادت حسن منٹو
زنداں و سلاسل — احمد ندیم قاسمی
زیرِ دامِ کون؟ — ابوالفضل صدیقی
زندگی کا رس (تارہ کیجیں) — ممتاز شیریں
تاش کے پتے — دیوندر ستیارتھی
جیب کترے — دیوندر اسر
ماما (گجراتی) — غلام حسین مصطفیٰ
ایک عظیم انسان ظلم (فرانسیسی) — نسیم ہمدانی

نئی کتابیں چاند گھن

۲۹ — ۳۰ (تیج سالہ نمبر)

طلوع — محمد طفیل

مقالے

حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون (تذکرۂ رجائیہ) — مولانا حالی

آسان اردو — ڈاکٹر عبدالحق

قتیل دہلوی تھا یا یزید گیلوی — ڈاکٹر مختار الدین احمد

اسلامی ادب — فراق گورکھپوری

واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف — ڈاکٹر ابو لیث صدیقی

باغ و بہار کے نسوانی کردار — سید وقار عظیم

صدر الدین آزردہ کے غیر مطبوعہ خطوط — خواجہ احمد فاروقی

غزل کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر عبادت بریلوی

تاریخ کی جذبات نگاری — ڈاکٹر عندلیب شادانی

مرزے دار شاعر — محمد حسن عسکری

چند یادیں — عبدالرحمٰن چغتائی

انگریزی ناول کا اردو ناول پر اثر — ڈاکٹر احسن فاروقی

غالب اور حیدرآباد — ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی

نظمیں، غزلیں

اختلال دماغ — جوش ملیح آبادی

غزل — فراق گورکھپوری

غزل — فیض احمد فیض

شباب کے پھول — احمد ندیم قاسمی

غزل — عابد علی عابد

غزل — آل احمد سرور

غزل — اثر لکھنوی

دعوت نامہ — احسان دانش

غزل — صوفی تبسم

آخری ملاقات — اختر الایمان

غزل — اختر انصاری

نوروز — عبدالمجید عدم

غزل — عبدالمجید عدم

دلہن — قتیل شفائی

غزل — قتیل شفائی

شاعر — مجید امجد

غزل — رضا علی وحشت

افسانہ آں شبے — جگن ناتھ آزاد

غزل — شاد عارفی

خاج — پروفیسر شعور

غزل — اعجم رومانی

نئے راستے — محمد رجا نہ حسری

غزل — ناصر کاظمی

نیند کی ندی — عزیز حامد مدنی

غزل — عبدالمجید بھٹی

سحر سے پہلے — ظہور نظر

غزل — باقی صدیقی

انقلابی — فارغ بخاری

غزل — سلام مچھلی شہری

خمار گندم — خاطر غزنوی

غزل — احمد فراز

سرحد — نور بجنوری

غزل — شاعر لکھنوی

دیپ سے دیپ جلے — احمد ریاض

غزل — زہرہ نگاہ

ایک عورت کے نام — احمد ظفر

غزل — عبدالعزیز فطرت

دن ڈھلے — منیر نیازی

غزل — جمیل ملک

وقت اور زندگی — عزیز جاوید وقاری

غزل — اختر شیرانی

غزل — مجید شاہد

افسانے — ڈرامے، طنز، ڈرامے

عزیز جگر — احمد ندیم قاسمی

تنہائی (مسلسل) — مجنوں گورکھپوری

پانی کا درخت — کرشن چندر

پانچواں مقدمہ — سعادت حسن منٹو

رحیم بابا — علی عباس حسینی

بندہ پرور کب تک؟ — کنہیا لال کپور

میرا گھر — ممتاز مفتی

دارا	خدیجہ منظور
حسن انتخاب	تسنیم سلیم مختاری
سجاد روحۃ الکبریٰ	اشفاق احمد
خمیر	دیوندر ستیارتھی
صدرنگ	ڈاکٹر محمد باقر
پتر اناماں دے	اے حمید
پربت لاج	شوکت صدیقی
مایا	انتظار حسین
دفتر کی مہریں	فکر تونسوی
بہتا خون، آبیتا خون	ضمیر الدین احمد
مہر بہ لب	احمد ندیم قاسمی
چترا	حبیب اشعر

نئی کتابیں رم جھم رسالے اور جائزے — عبادت بریلوی

۳۲-۳۱

طلوع	ڈاکٹر عبدالحق، نیاز فتحپوری
خاکے بے تاکہ	شوکت تھانوی
مقالے اسلامی ادب کیوں نہیں؟	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
داغ کا تغزل اور اس کے سماجی محرکات	ڈاکٹر عبادت بریلوی
مکاتیب سرسید	ڈاکٹر مختار الدین احمد
میر کا اسلوب قصیدہ گوئی	عشرت رحمانی
تحلیل نفسی پر ایک نظر	سید علی عباس جلالپوری
اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی
نظمیں، غزلیں ازالہ	جوش ملیح آبادی
غزل	عابد علی عابد
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	معین احسن جذبی
اضداد	احمد ندیم قاسمی
غزل	اثر لکھنوی
ہری بھری فصل	مجید امجد
غزل	ناصر کاظمی
نسر کی فرمائش پر	پروفیسر رشید
غزل	شاد عارفی
اے متوالو! ناقوں والو	ابن انشاء
غزل	قتیل شفائی
غزل	راز مراد آبادی
غزل	شاعر لکھنوی
غزل	اقبال صفی پوری
جانثین	احمد فراز
غزل	باقی صدیقی
غزل	عبدالحمید حیرت
غزل	شہرت بخاری
غزل	اختر ہوشیارپوری
غزل	فریاد زیدی
غزل	فارغ بخاری
غزل	احمد ریاض
غزل	احمد ظفر
غزل	مسعود انور عشقی
ڈرامہ درخت	شاہد احمد دہلوی
افسانے پی گئے	ابوالفضل صدیقی
آخری دودھ	ہاجرہ مسرور
گڑیا اور لوری	دیوندر ستیارتھی
کوڑے کے ڈھیر پر	آغا بابر
گلاب کا پھول	سید فیاض محمود
ٹوٹی پارک	ابن الحسن
گرم سیخ	غلام علی چودھری
تراجم ایک نیگرو جشن (امریکی)	ل۔ احمد اکبرآبادی
چاچا (بنگالی)	شردوں کمار ورما
شخصیات منٹو	عزیز احمد
وہ لڑکی	سعادت حسن منٹو
منٹو صاحب	محمد طفیل

۳۴-۳۳

طلوع	محمد طفیل
مقالے ایک خط	فراق گورکھپوری
بیادِ ہر شہ نازک خیالاں	آفتاب احمد
کچھ میر کے بارے میں	قاضی عبدالودود
باغ و بہار و فسانۂ عجائب کا تجزیہ	سید وقار عظیم

ارسطو کی اخلاقیات — غلام جیلانی برق
عندلیب شادانی کا تغزل — نظیر صدیقی

نظمیں، غزلیں غزل — فراق گورکھپوری
غزل — عابد علی عابد
تکمیل — عندلیب شادانی
غنچہ پھر لگا کھلنے ! — احمد ندیم قاسمی
غزل — رضا علی وحشت
غزل — کیفی چریاکوٹی
غزل — اختر انصاری
پورب ویس کی ناری — محمد وجاہت دھری
غزل — مجید امجد
غزل — شاد عارفی
ذرہ — جگن ناتھ آزاد
غزل — ناصر کاظمی
غزل — سلام مچھلی شہری
غزل — فضلی
غزل — راز مراد آبادی
غزل — باقی صدیقی
غزل — جمیل ملک
غزل — احمد ریاض

طنز و مزاح چچا سام کے نام دوسرا خط — سعادت حسن منٹو
خاموش نغمے — کنہیا لال کپور
سگریٹ پینے کی آزادی — فکر تونسوی

افسانے، ڈرامے
بنیا — اوپندر ناتھ اشک
محمودہ — سعادت حسن منٹو
فینسی ہیئر کٹنگ سیلون — غلام عباس
مہر لب — احمد ندیم قاسمی
ڈھلان — انور عظیم
ایک خاشعہ، ایک ہڈی — پرکاش پنڈت
ایک سفر اور — غلام علی چودھری
ایک تمنا ایک شکست — انجا احمد

شخصیات
جگر مراد آبادی — آل احمد سرور
جگر صاحب — محمد طفیل

۳۶-۳۵

مقالے اصول فارسی (غیر مطبوعہ) — مولانا حالی (مرحوم)
رنگ اکبر — حامد حسن قادری
کچھ میر کے بارے میں — قاضی عبدالودود
ڈاکٹر زاد حاکر شعر اور مذہب — ڈاکٹر غلام جیلانی برق
اردو غزل — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
فیضی کا نظریۂ شعر — ڈاکٹر وحید قریشی
ادب میں روایت اور بغاوت — نسرین شہناز ہاشمی
کارشتہ

نظمیں، غزلیں شکست زندگی — جوش ملیح آبادی
غزل — جگر مراد آبادی
غزل — فراق گورکھپوری
غزل — عابد علی عابد
غزل — اثر لکھنوی
غزل — آل احمد سرور
غزل — شاد عارفی
شہر خوباں — عدم
غزل — عدم
غزل — ظہیر کاشمیری
جیون ویس — مجید امجد
ایمان — جگن ناتھ آزاد
عرض نیاز — پروفیسر شور
غزل — حیرت شملوی
فراق تمنا — عبدالمجید بھٹی
غزل — شاد لکھنوی
برگ و برق — ظہور نظر
غزل — اقبال صفی پوری
اک آدم خوردہ دریا — حامد عزیز ندنی
غزل — سلیم احمد
ابن آدم — نور بجنوری
غزل — احمد فراز
کراہتے ہوئے دل — تیغ الہ آبادی
غزل — سلیم واحد سلیم
ایک کہانی، ایک انسان — عارف عبدالمتین

	غزل	شہرت بخاری
افسانے	ثبتِ منفی	ابوالفضل صدیقی
	بلونت سنگھ جھینڈ	سعادت حسن منٹو
	بیٹا	احمد ندیم قاسمی
	صرف آپ کے لئے	ممتاز مفتی
	اجنتا	دیوندر ستیارتھی
	بدچلن عورت	ابراہیم جلیس
	خواجہ کی چڑیا	سید فیاض محمود
	لی زا	منظور الٰہی
	حکم کی بیگم	ڈاکٹر محمد حسن
تراجم	خلش (سرجی)	انور احمد
	ترکِ محبت کے بعد (آئرش)	محمود حسن احسنی
	کچھ فسانۂ مجاذب کے بارے میں	رشید احمد صدیقی
	بے قاعدہ	شوکت تھانوی
شخصیات	فراق گورکھپوری	سید محمود احمد
	فراق کی شخصیت	نمکین احسن کلیم
	فراق صاحب	محمد طفیل
اسلامی ادب	میری گزارش	فراق گورکھپوری
	انجمن ادبی رسائل پاکستان	(ساقی سے)

۳۷-۳۸ (افسانہ نمبر)

(۱)	ننھی کی نانی	عصمت چغتائی
	بردہ فروش	غلام عباس
	شادی	سعادت حسن منٹو
	کالی تتری	بلونت سنگھ
	مکڑی کا جال	علی عباس حسینی
	مسوری سنہ ۱۸۵۷ء	خواجہ احمد عباس
	چچا جان	حیات اللہ انصاری
	گنہگاری کے انڈے	دیوندر ستیارتھی
	گنو ہتیا	کنہیا لال کپور
	اب یہاں کوئی نہیں آئیگا	تسنیم سلیم چھتاری
	بھابی جان	سہیل عظیم آبادی
	زرد گلاب	اے حمید
	گوری عورت، کالا مرد	ابراہیم جلیس
	اندر سبھا	ڈاکٹر احسن فاروقی
	اجنبی لڑکی	مہندر ناتھ
	انناس کا درخت	دیوندر اسر
	بھنور اور چراغ	جیلانی بانو
	گریز	آغا بابر
	آپا	غلام علی چودھری
	مالک	سید خلیل احمد
	رگِ سنگ	ضمیر الدین احمد
	فٹ پاتھ کی	ابن الحسن
(۲)	ست بھرائی	احمد ندیم قاسمی
	ممتا	اختر اورینوی
	کنیز	ہاجرہ مسرور
	ریلوے جنکشن	قدرت اللہ شہاب
	شکارگاہ سے	ابوالفضل صدیقی
	لالہ صحرائی	خدیجہ مستور
	گڈریا	اشفاق احمد
	مُردہ گھر	شوکت صدیقی
	بکی نبولی	انتظار حسین
	نئے سال کا آخری دن	کشمیری لال ذاکر
	یاقوت اور لیمپ	انور عظیم
	دوسری شادی	شوکت تھانوی
خاکے	عصمت چغتائی	اخلاق احمد دہلوی
	بلونت سنگھ	ڈاکٹر عبادت بریلوی
	حیات اللہ انصاری	نمکین احسن کلیم
	شوکت تھانوی	محمد طفیل
نووارد	بونے	صادق حسین
	تقدیر زندہ	چاندنی بی
سمپوزیم	اردو افسانے میں روایت اور تجربے	

حصہ لینے والے:- سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، حمید اختر، شوکت تھانوی۔

۳۹-۴۰

	طلوع	محمد طفیل
بحث (اسلامی ادب)	تخلیق کی جمہوریت	قرۃ العین حیدر

اشتیاق، ولی اللہ سرہندی
الم، صاحب میر
امین، خواجہ امین الدین
امانت لکھنوی
اختر، نواب واجد علی شاہ
احسان، شاہجہانپوری
اثر، امداد امام
بقا، شیخ بقاء اللہ
بیباک شاہجہانپوری
بہار، گلشن الدولہ
تجلی، میاں جاجی
تسلی، لالہ بنکا رام
تشنہ، محمد علی
ثاقب، نواب شہاب الدین احمد خاں
جوشش، شیخ محمد روشن
حزیں، میر محمد باقر
حسامی، حسام الدین حیدر
حسین، سید صادق علی
دلجو، آنند رائے مرتب سکھ
رانک، علی اوسط
رشک، نواب محمد علی خاں
رشان، نواب شہاب الدین احمد خاں
راقم، قمر الدین
زکی، نواب محمد زکریا خاں
سلیمان، نواب مرزا محمد سلیمان شکوہ
شوق قدوائی، احمد علی خاں
شمر، مولانا عبد الحکیم
شیدا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں
صبا، نادر کاکوری
صنعت مراد آبادی، شیخ کریم الدین
طاہر، عارف الدین خاں
عارف، حکیم نواب جان خاں
فراق، ثناء اللہ
قدوسی لاہوری
قلق، آفتاب الدولہ لکھنوی

احقر، میرزا احسن
امانی، میر امانی
افسوس، میر شبیر علی
آزردہ، مفتی صدر الدین
ارشد، میرزا عبد الغنی گورگانی
اسمٰعیل میرٹھی
بحر، شیخ امداد علی
برق لکھنوی، مرزا محمد رضا
بسمل مولانی
بیتاب، عظیم آبادی
تمنا، محمد عیسیٰ
تسکین، میر حسن
ثاقب لکھنوی، ذاکر حسین
جوان، مرزا نعیم بیگ
حیران، میر حیدر علی
حیا، مرزا رحیم الدین
خاکسار، محمد یار
خلیق، میر مستحسن
دلگیر، ماہرہ دی
رشکی، نواب محمد علی خاں
راسخ، مولوی عبد الرحمٰن
رسا، راجہ رسی (تلمیذ راسخ)
سجاد، میر سجاد اکبر آبادی
سحر بھوپالی
شاد غازی پوری، حکیم سید محمد
شاد، مہاراج کشن پرشاد
شفق، عماد پوری
صغیر بلگرامی، سید فرزند احمد
ضیا، میر ضیاء الدین
طاہر فرخ آبادی
عشق عظیم آبادی
عظیم، مرزا عظیم بیگ
فقیر، میر شمس الدین
قدرت، شاہ قدرت اللہ
قدر بلگرامی، سید غلام حسین

کمال، شاہ کمال الدین
گستاخ راجپوری، کرامت اللہ
مائل، مرزا احمد یار بیگ
منت، میر قمر الدین
منظور، میاں نور الاسلام
مہر، حاتم علی
مہر، شکوہ آبادی
محوی لکھنوی، مولوی محمد حسین
نیاز، شاہ نیاز بریلوی
ناظم، نواب یوسف علی خاں
ندرت، میر علی شعیب احمد
ولا، مظفر علی خاں
وفا، راجپوری حکیم عبد الہادی خاں
ہدایت، شیخ ہدایت اللہ
بحر شاہجہانپوری، نواب ہشتم سلطان

(۶) ہری چند اختر
اسد ملتانی
عشرت رحمانی
وحید قریشی
شاد، زرین کمار
مخضب جارچوی
حمید نسیم
اختر ہوشیارپوری
خاطر غزنوی
فارغ بخاری
سلیم واحد سلیم
مہر لقا چندا بائی
زہرہ نگاہ
نواب شاہجہان بیگم شیریں
نزاکت
امراؤ جان زہرہ لکھنوی
موتی جان موتی
لطیف محمدی جان صاحبہ لکھنوی
دلبر، امراؤ جان

گویا، نواب فقیر محمد خاں
محنت، مرزا حسین علی
مقتول، مرزا ابراہیم بیگ
محب، شیخ ذکی اللہ
مروت، صغیر علی
معروف، مرزا الٰہی بخش
مقتدر دہلوی، حکیم اسد علی خاں
نثار، محمد امان
نور، ظہور اللہ خاں
نظر لکھنوی، نوبت رائے
واقف، شاہ واقف
وحید الہ آبادی
ہادی، میر محمد جواد
ہاشمی، میر ہاشم
ہوس، نواب مرزا محمد تقی
شعری بھوپالی
کشفی ملتانی
شوکت تھانوی
خلیل الرحمٰن اعظمی
حزیں، شعیب احمد
کیف، حکیم ہاشم جان
تابش دہلوی
اقبال صفی پوری
احمد فراز
رضا ہمدانی
احمد ظفر
ادا جعفری بدایونی
نواب اختر محل اختر
نواب بادشاہ محل عالم
قمر جان مشتری لکھنوی
زینت بیگم نازک
بیگا جان شیریں
شباب، حسینی باندی بنارسی
نور جہاں ناز
شہزادی جان شوخ

۴۳ - ۴۴ (غیر غزل نمبر)

طلوع — محمد طفیل

ڈرامے
- یوسف زلیخا — (ترجمہ) حامد حسن قادری
- کتے کی موت — کرشن چندر

افسانے
- بھگن — سعادت حسن منٹو
- گڑیا گھر — ممتاز مفتی
- پابریدہ — خدیجہ مستور
- پھول سوگئے — اے حمید
- ونڈر لینڈ میں — ابن سعید
- شاہراہ عبدالحق — عبدالرحمٰن صدیقی
- لیلیٰ حسینہ — محمد یوسف خان

مکاتیب
- بادِ خاطر — شوکت خانزادی

شخصیات
- فراقؔ اپنے خطوط کی روشنی میں — فراقؔ گورکھپوری

غزل اور متغزلین

(۱) مولانا حالی، آل احمد سرور، نیاز فتحپوری، سید احتشام حسین، عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، حاذق قادری، عبدالستار دلوی، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی، سید وقار عظیم، نجم الدین احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین، سید باقر حسین، سید اعجاز حسین، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری۔

(۲) ولی دکنی، سراج دکنی، آبرو، حاتم، فغاں، میر تقی میر، سودا، میر درد، مظہر جانِ جاناں، سوز، شیخ قائم الدین، میر محمدی بیدار، عبدالحی تاباں، میر اثر، رنگین، مصحفی، غلام حسن حسن، انشاء، اخلاق، نظیر اکبرآبادی، ضمیر، ممنون، غالب، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر، نسیم، ناسخ، آتش، شہیدی، سالک، مجروح، واجد، ایرج، حالی، اجلال، تسلیم، اکبر، ریاض، آرزو لکھنوی، اقبال، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، جوش، سندھی، میرزا یگانہ، حفیظ جالندھری، سیماب۔

سمپوزیم (اردو غزل کا مستقبل)

حصہ لینے والے:- عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سبط حسن، سید وقار عظیم، ضمیر کاشمیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، احسان دانش، حامد علی خاں، چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری، حبیب اشعر

مقالہ
- غزل — فراقؔ گورکھپوری

۴۵ - ۴۶

طلوع — محمد طفیل

ڈرامے
- تلون — اوپندر ناتھ اشک
- تنکے کا سہارا — امجد حسین
- کلاڈ ناش عوت ستیاناس — کنہیا لال کپور
- مشکلتا — سلام مچھلی شہری

افسانے
- بابا لوز — احمد ندیم قاسمی
- نمرود — سعادت حسن (منٹو)
- چار گوٹ — ممتاز مفتی
- ناخنہ کی چونچ میں دانہ — دیوندر ستیارتھی
- صنم تراش کا خواب — ل۔ احمد
- بھیاد بیوج — ابوالفضل صدیقی
- کتا ہوا ڈبہ — انتظار حسین
- چھٹکارا — جیلانی بانو

نظمیں، غزلیں
- محبت برسات — جوش ملیح آبادی
- جگنو — فراقؔ گورکھپوری
- غزل — جگر مرادآبادی
- غزل — فیض احمد فیض
- غزل — فراقؔ گورکھپوری
- غزل — اثر لکھنوی
- غزل — عابد علی عابد
- منکر — احمد ندیم قاسمی
- غزل — اختر انصاری
- غزل — احسان دانش
- اداس رات کے آنگن میں — ابن انشاء
- غزل — شاد عارفی
- غزل — نہال سیوہاروی
- غزل — عبدالمجید حیرت
- غزل — جگنو ناتھ آزاد
- مدیر نقوش کے نام — پروفیسر شور
- غزل — جلیل قدوائی
- غزل — ناصر کاظمی
- ایک نظم — تیغ الہ آبادی
- سیلے — منیر نیازی

غزل — نور بجنوری
یہ زنجیر گراں — احمد ریاض
غزل — فارغ بخاری
غزل — جمیل ملک

مقالے

باغ و بہار اور قبولِ عام — سید وقار عظیم
جہانِ غالب — قاضی عبدالودود
میر کا فنی شعور — ڈاکٹر عبادت بریلوی
اقبال اور کاؤنٹ ٹیلسٹوئے — خلیق انجم
کچھ اپنے گرامیہ — اسلوب احمد انصاری
شب بیداری — محمد طفیل

مکاتیب

اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو — حافظ محمود شیرانی
ڈاکٹر تاثیر، حامد حسن قادری

۴۷-۴۸ (شخصیات نمبر)

شخصیت	شخصیت نگار
محمد حسین آزاد	آغا محمد باقر
مولانا شبلی نعمانی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
حالی	خواجہ غلام الثقلین
مہدی افادی	عبدالماجد دریابادی
مولانا عبدالحلیم شرر	خاکی قزلباش
گرامی	عزیز ملک
مولانا وحید الدین سلیم	روشن پانی پتی
مرزا رسوا	علی عباس حسینی
آغا حشر	عشرت رحمانی
میر ناصر علی	انصار ناصری
مولانا راشد الخیری	فضل احمد خاں دہلوی
اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
فانی	جوش ملیح آبادی
مرزا عظیم بیگ چغتائی	شاہد احمد دہلوی
سید سجاد حیدر یلدرم	قرۃ العین حیدر
مولوی عنایت اللہ دہلوی	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
پروفیسر شیرانی	ڈاکٹر سید عبداللہ
مرزا فرحت اللہ بیگ	مرزا عصمت اللہ بیگ
حسرت موہانی	جمیل قدوائی
مولانا سید سلیمان ندوی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن	نواب خواجہ عبدالمجید دہلوی
آرزو لکھنوی	چودھری جمیل احمد
ڈاکٹر مولوی عبدالحق	عبادت بریلوی
ابوالکلام آزاد	غلام رسول مہر
علامہ تاثیر کیفی	رحمت قطبی
خواجہ حسن نظامی	ملا واحدی
مولانا عبدالماجد دریابادی	حکیم عبدالقوی دریابادی
ڈاکٹر ذاکر حسین	ڈاکٹر سید عابد حسین
مرزا محمد سعید	اشرف صبوحی
مولانا حامد حسن قادری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
رشید احمد صدیقی	آل احمد سرور
مجنوں گورکھپوری	فراق گورکھپوری
ڈاکٹر زور	رشید سلطانہ
اثر لکھنوی	شیخ ممتاز حسین جونپوری
جگر صاحب	رشید احمد صدیقی
حفیظ جالندھری	عزیز ملک
امجد حیدرآبادی	نصیر الدین ہاشمی
عابد صاحب	محمد طفیل
مخفی کہستانی	میرزا ادیب
مولانا صلاح الدین احمد	وزیر آغا
چودھری محمد علی ردولوی	بیگم اختر حسین
عندلیب شادانی	ڈاکٹر شوکت سبزواری
ڈاکٹر شوکت سبزواری	سید مسعود حسن رضوی

(۳)

منٹو ماموں	حامد جلال
کرشن چندر	مہندر ناتھ
عصمت چغتائی	خالد لطیف
راجندر سنگھ بیدی	کنہیا لال کپور
احمد ندیم قاسمی	خدیجہ مستور
خواجہ احمد عباس	صالحہ عابد حسین
ممتاز مفتی	مسعود قریشی
قرۃ العین حیدر	ابن سعید
دیوندر ستیارتھی	پرکاش پنڈت
خدیجہ مستور	ہاجرہ مسرور
شفیق الرحمٰن	محمد خالد اختر
تسنیم سلیم چھتاری	سلمیٰ خورشید منیر

	پروفیسر فراق	مجتبیٰ حسین
	فیض احمد فیض	ایلس فیض
	کنہیا لال کپور	فکر تونسوی
	شاہد احمد دہلوی	جمیل جالبی
	کلیم الدین احمد	قاضی عبدالودود
	سرور صاحب	وقار عظیم
(۴)	لاہور کی چند ادبی شخصیتیں	عابد علی عابد
	دلی کی چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی
	لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں	شوکت تھانوی
	حیدرآباد دکن کی چند ادبی شخصیتیں	قطب الدین ہاشمی
انتظاریہ	سر سید احمد خان	مولوی عنایت اللہ
	ڈپٹی نذیر احمد	قاری عباس حسینی
	ریاض خیرآبادی	رئیس احمد جعفری
	پریم چند	جنندر کمار
	سر عبدالقادر	ڈاکٹر محمد باقر
	ڈاکٹر تاثیر	بیگم تاثیر
	میراجی	محمود نظامی
	ظفر علیخاں	شورش کاشمیری
	نیاز فتحپوری	ابوالخیر مودودی
	پطرس	صوفی جستم
	جوش ملیح آبادی	احتشام حسین
	عبدالمجید سالک	احمد ندیم قاسمی
	چراغ حسن حسرت	ظہیر بابر
	غلام رسول مہر	خلیل الرحمٰن داؤدی
	وقار عظیم	اقبال عظیم
	ابوالفیض صدیقی	صابر علی خاں
	عبادت بریلوی	مکین احسن کلیم
	غلام عباس	پریم ناتھ در
	حجاب امتیاز علی	شوکت تھانوی
	راجہ مہدی	احمد ندیم قاسمی
	شوکت تھانوی	عشرت رحمانی

۴۹ - ۵۰ (منٹو نمبر)

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

بابو بابو	مائی جنتے	جان محمد
بارش	افشائے راز	آمنہ
تصویر	ملاوٹ	بس اسٹینڈ
نصیبہ	جرنیلی	قادر اقصائی
خودکشی	پشاور سے لاہور تک	بجلی پہلوان
ایک زاہدہ ایک فاحشہ	شیدا	بڈھا کھوسٹ
اندر گلی	کمیشن	

منٹو کی منتخب تخلیقات :- ہتک ، موذیل ، ممی ، بابو گوپی ناتھ ، کالی شلوار ، ٹوبہ ٹیک سنگھ ، اس منجدھار میں ، نیا قانون ، شہید ساز ، سیاہ حاشیے

منٹو کا فن

منٹو کی فنی تکمیل	ممتاز شیریں
منٹو کا فن	وقار عظیم
منٹو کا مقام	محمد حسن عسکری
گنجا فرشتہ	عابد علی عابد
منٹو	ابواللیث صدیقی
منٹو کی حقیقت نگاری	عبادت بریلوی
سعادت حسن منٹو کی یاد میں	ممتاز حسین

منٹو کی شخصیت

میرا دوست میرا دشمن	عصمت چغتائی
منٹو میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک
منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط	احمد ندیم قاسمی
جو بچ نہ سکا	ہاجرہ مسرور
رحمدل دہشت پسند	ابوسعید قریشی
منٹو ماموں کی موت	حامد جلال
منٹو کی موت	غلام عباس
منٹو کا ایک خط	محمد طفیل

شخصیات نمبر کے بارے میں

مولوی عبدالحق ، نیاز فتحپوری ، عبدالمجید سالک ، عرشی رامپوری ، رشید احمد صدیقی ، مالک رام ، احتشام حسین ، مسعود حسن رضوی ، کرشن چندر ، ڈاکٹر عبدالجبار ، ایس اے رحمٰن ، خواجہ احمد فاروقی ، غلام عباس ، آغا اشرف ، شاد عارفی ، حجاب امتیاز علی ، فکر تونسوی ، ابن انشاء ، فارغ بخاری ، جیلانی بانو

ممتاز صدیقی

۵۱ - ۵۲

	واسوخت	فیض احمد فیض
	کم بیک الیزا	فیض احمد فیض
	فیصل کہسروں کی بہار	فیض احمد فیض
	دریچہ	فیض احمد فیض
ناولٹ	جگنو اور ستارے	جیلانی بانو
افسانے	گیہوں اور گلاب	خواجہ احمد عباس
	ٹھریا	حمت زمطلق
	بھاگ بھری	ہاجرہ مسرور
	تیسرا سگریٹ	بلونت سنگھ
	منشو، میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک
	ہرے رنگ کی گڑیا	دیوندر ستیارتھی
	سراب	خدیجہ مستور
	مرغلاؤ	شوکت تھانوی
	کومل رانی	صدیقہ بیگم سیوہاروی
	بیاہ بدھ	غلام علی چودھری
ڈراما	فردوسی	سید عابد علی عابد
نظمیں، غزلیں	غزل	جوش ملیح آبادی
	غزل	فراق گورکھپوری
	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	غزل	اثر لکھنوی
	صبح شکستہ	احمد ندیم قاسمی
	اکتشاف	عندلیب شادانی
	ہمسفر، جام سفلی	روش صدیقی
	غزل	اختر انصاری
	غزل	عدم
	غزل	شاد عارفی
	اتحاد ہند و پاک	پروفیسر شور
	غزل	غلام ربانی تاباں
	غزل	واحق جوہری
	غزل	ابن انشا
	منشو زندہ ہے	مصطفیٰ زیدی
	غزل	ناصر کاظمی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	زہرہ نگاہ
	غزل	احمد ریاض
	غزل	نور بجنوری
	منشو کا پیغام	عظیم قریشی
	غزل	باقر مہدی
	غزل	جمیل ملک
	غزل	بشیر منذر
	کرن	ضمیر اظہر
مقالے	داغ	فراق گورکھپوری
	برج بھاشا کی پہلی گرامر	سید مسعود حسن رضوی
	آزادی کی مساحت	آغا محمد اشرف
	تنقید میں نقطۂ نگاہ کی اہمیت	ڈاکٹر شوکت سبزواری
	رومن حروف کی آوازیں	شفیع منصور

۵۳ - ۵۴ (افسانہ نمبر)

اردو کی پہلی کہانی	رانی کیتکی	انشاء اللہ خاں انشاء
طویل مختصر داستانوں کا دور	طوطا کہانی	حیدر بخش حیدری
	آرائش محفل	حیدر بخش حیدری
	باغ و بہار	میر امن دہلوی
	بیتال پچیسی	مظہر علی ولا و لطف لال
	سنگھاسن بتیسی	کاظم علی ولا و لطف لال
	افسانۂ نورتن	محمد بخش مہجور
	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور
	الف لیلہ	حسن علی خاں، کشمیری، اصغر علی خاں، شہید الدین خاں
ناولوں کا دور	بیوہ	ڈپٹی نذیر احمد
	جام سرشار	رتن ناتھ سرشار
	دل دنیا	شرر لکھنوی
	شریف زادہ	مرزا محمد ہادی رسوا
	بھنور کی دلہن	راشد الخیری
ترجموں کا دور	تولہ بھر ریڈیم	ظفر علی خاں
	نجم السحر	عنایت اللہ دہلوی
	شاعر کی دھیت	عبد الرزاق ملیح آبادی
	بیتا	خواجہ منظور حسین

کیڑوں کا مصور	منصور احمد
بلی کے بچے	جلیل قدوائی
مصور کا راز	حامد علی خاں
دلہن کی پوشاک	فضل حق قریشی
ہڈیوں کا پنجر	نیر حزام فیروز پوری

افسانوی مضامین کا دور

شہزادے کا بازار میں گھومنا	خواجہ حسن نظامی
دو کھلے کی سیر	آغا حیدر حسن
جہان آباد	ناصر نذیر فراق
دہلی کی کلکھ بازی	عشرت لکھنوی
زود پشیمان	چودھری فضل حق
ریاکار	خلک پیما
پریت کی بیٹی	چراغ حسن حسرت
حاجی ابلول کا جوڑ بیں	اشرف صبوحی

اردو افسانہ

(پہلا دور)	خارستان و گلستان	سجاد حیدر یلدرم
	طوفان آدم	سلطان حیدر جوش
	کیوپڈ و سائیکی	نیاز فتحپوری
	کمی پوش	مجنوں گورکھپوری
	بھینٹ	ل۔ احمد
	تیسری جنس	محمد علی ردولوی
(دوسرا دور)	کفن	پریم چند
	جان نثار	سدرشن
	چین کی انگوٹھی	عظیم بیگ چغتائی
	پریم کی چنگاریاں	اعظم کریوی
	اندھا دیوتا	حکیم احمد شجاع
	نئی پیشے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار
	میدہ گھوڑی	علی عباس حسینی
	ڈالی کا جوگ	حامد اللہ افسر
	زندگی	عاشق بٹالوی
	لاری میں	فیاض محمود
	سکھ عالم دوبارہ نیست	امتیاز علی تاج
	لیلے	عابد علی عابد
	کیمیاگر	پریم چند
	دوشت خانہ	شوکت تھانوی
	صفدر کے سامنے	حجاب امتیاز علی
	بیمار مریض	ایم اسلم
	ناز و	اختر انصاری
	دردِ بیگانگی	میرزا ادیب
	جنتِ قمر	صادق الخیری
	لکھ دتا	شیر محمد اختر
	رسیلا	مسز عبدالقادر
	سلجھا کا	صالحہ عابد حسین
(تیسرا دور)	نیند نہیں آتی	سجاد ظہیر
	مہاوٹوں کی ایک رات	احمد علی
	دلی کی سیر	رشید جہاں
	جوان مردی	محمود الظفر
(چوتھا دور)	زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر
	نیا قانون	سعادت حسن منٹو
	گرہن	راجندر سنگھ بیدی
	چوتھی کا جوڑا	عصمت چغتائی
	ہماری گلی	احمد علی
	آندھی	غلام عباس
	پرمیشر سنگھ	احمد ندیم قاسمی
	آپا	ممتاز مفتی
	زعفران کے پھول	خواجہ احمد عباس
	مجھے جانے دو	اختر حسین رائے پوری
	جھاموں کی لو میں	ملک راج آنند
	نئی مصیبتیں	رشید جہاں
	حرام جادی	حسن عسکری
	زرین تاج	عزیز احمد
	آخری کوشش	حیات اللہ انصاری
	بینگن کا پودا	اوپندر ناتھ اشک
	لال دھرتی	دیوندر ستیارتھی
	گلاب اور کانٹے	اختر اورینوی
	جگا	بلونت سنگھ
	جالو	ہاجرہ مسرور
	خون	اختر
	جلاوطن	قرۃ العین حیدر
	میں نے چلے ہوئے چلے	خدیجہ مستور

جیتی	شفیق الرحمٰن
الاؤ	سہیل عظیم آبادی
آئینہ	ممتاز شیریں
ندو چھے	ابراہیم جلیس
سردار ہیبت سنگھ	قدرت اللہ شہاب
ٹوٹ گیا اک تارا	نسیم سیم چھتاری
سمندر اور تین کوے	مدھو سودن
کلوا	سید رفیق حسین
سرگوشت	ابوالفضل صدیقی
جہاں میں رہتا ہوں	مہندر ناتھ
آب حیات	رامانند ساگر
پاگل ولایت	آغا بابر
آنکھ مچولی	شکیلہ اختر
اب اور تب	جنس راج رہبر
روپ چند	صدیقہ بیگم سیوہاروی
تجاوز	عبدالرحمٰن چغتائی
(پانچواں دور) گڈریا	اشفاق احمد
راوں کے دیس میں	اے حمید
تیسرا آدمی	شوکت صدیقی
اجودھیا	انتظار حسین
کھیتر	پرکاش پنڈت
چاند بجھ گیا	سردار دیوی
موم کی مریم	جیلانی بانو
لڑکھڑاتی چٹان	انور عظیم
مقالات داستان سے افسانے تک	سید وقار عظیم
مختصر افسانے کا فن	عبادت بریلوی
مغربی افسانہ کا اثر اردو افسانہ پر	ممتاز شیریں
اردو افسانے کا مستقبل	محمد حسن عسکری
اردو افسانے میں روایت اور تجربے (مذاکرہ)	

۵۵-۵۶

مقالے ڈپٹی نذیر احمد کا ذہنی تجربہ	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
نذیر احمد کی انفرادیت	ڈاکٹر سید عبداللہ
نذیر احمد کے مذہبی افکار	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
نذیر احمد کی مذہبی تصانیف	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
یادِ مجاز یادِ مجاز	محمد رضا انصاری
گی نغمہ	ڈاکٹر محمد حسن
مجاز کا غیر مطبوعہ کلام	
جذبۂ شوق نہیں شہپر پرواز نہیں	
یہ تیرگیٔ شب ہی کچھ صبح طراز آئی	
نذر عاشقانہ کسی رہگذر کو دیکھتے ہیں	
زلف سرکش ہے نیاز پیچ و خم	
رعشہ ساحیراں دست و گریباں میں دیکھا	
دھواں سا اک سمت اٹھ رہا ہے شرارے اڑ اڑ کے آ رہے ہیں	
نظم: آہنگ جنوں	
مکاتیب فراق کے خطوط	فراق گورکھپوری
مطالعہ صاحب	کنہیا لال کپور
نظمیں غزلیں رباعیات	جوش ملیح آبادی
دکان سخن	فراق گورکھپوری
حبیب عنبر دست	فیض احمد فیض
غزل	عابد علی عابد
غزل	صوفی تبسم
غزل	عدم
قطعات	اختر انصاری
غزل	غلام ربانی تاباں
گلشن بہار	امتیاز علی عرشی
غزل	میکش اکبرآبادی
غزل	شاد عارفی
غزل	فضل احمد کریم فضلی
غزل	عبدالمجید حیرت
تبسم کی چھری	محمود جالندھری
غزل	ناصر کاظمی
غزل	شاعر لکھنوی
غزل	اقبال صفی پوری
ہر طرف اندھیرا ہے	نور بجنوری
غزل	حمایت علی شاعر
خلاؤں سے اترو	احمد ریاض
واپسی	خلیل الرحمٰن اعظمی

	دوڑی	منیر نیازی
	سحر بعید	عبدالعزیز فطرت
	غزل	تاریخ بخاری
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	بشیر منذر
	غزل	جمیل ملک
	سدراں دی موت (پنجابی)	احمد ظفر
افسانے	رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
	پانچواں مقدمہ (غیر مطبوعہ)	سعادت حسن منٹو
	خداداد کالونی	شوکت صدیقی
	سمی	آغا بابر
	رات بھر کا مہمان	کشمیری لال ذاکر
	ننگی آنکھیں	شکیلہ اختر
	پہچانیاں	صادق حسین
	حاجی پور گوجراں	منظور الٰہی
	نئی کتابیں	

۵۸-۵۷

افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح	کہانی ہوئی صورت بھی....	کنہیا لال کپور
	یاد خاطر	شوکت تھانوی
	گرم کوٹ اور بیوی	امجد حسین
	چنگیز خاں	سید عابد علی عابد
	انشا	صالحہ عابد حسین
	رات چور اور چاند (مسلسل)	بلونت سنگھ
	الف لیلہ سنہ ۱۹۵۷ء	خواجہ احمد عباس
	مولوی گزٹ	ابوسعید قریشی
	پڑی کا داغ	صدیقہ بیگم سیوہاروی
	ابدی مسرت	نور بجنوری
	نیلام گھر	مسیح الحسن رضوی
	جلاوطن	احمد سعید
نظمیں، غزلیں	حدیث حسن	فراق گورکھپوری
	حقیقت و مجاز	جگر مرادآبادی
	غزل	فیض احمد فیض
	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	احمد ندیم قاسمی
	قطعات	اختر انصاری
	یادوں کے	ادا جعفری
	غزل	شاد عارفی
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	اشک رامپوری
	غزل	انجم رومانی
	فرار	ظہور نظر
	غزل	ادا جعفری
	غزل	زہرہ نگاہ
	آل پر لٹکال	قیوم نظر
	غزل	ظہور نظر
	شہر آذر	مصطفیٰ زیدی
	غزل	عظیم قریشی
	غزل	نور بجنوری
	غزل	احمد ریاض
	غزل	حمایت علی شاعر
	مری کا سفر	افضل پرویز
	غزل	اکرم قسمر
	غزل	باقر مہدی
	سگریٹ	پریم وار برٹنی
	غزل	مضطر اکبرآبادی
	غزل	بشیر منذر
	یہ سب گم گشتہ	جلیل حشمی
	دیکھئے ان کی یہ سیمائی	مظہر امام
	غزل	موج علیگ
	غزل	قربان حسین شہیدی
	غزل	راحل گورکھپوری
	قلم خیال	منیر نیازی
مقالے	آوارہ گرد اشعار	قاضی عبدالودود
	حقیقت اور فنی حقیقت	احمد ندیم قاسمی
	اردو کے جدید ترین ترجمانات	احمد محی الدین جدی
	کہانی کا فن	دیوندر اسر
	اردو ادب کے معمار	مولوی نذیر احمد — شاہد احمد دہلوی

ڈاکٹر نذیر احمد — شکیب کاظمی
مولوی نذیر احمد کی مذہبی خدمات — شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

۵۹-۶۰ (شخصیت نمبر ۲)

شخصیت	شخصیت نگار
داغ دہلوی	جوش ملسیانی
اکبر الہ آبادی	عبدالماجد دریابادی
وقار الملک	مولانا غلام رسول مہر
نواب عماد الملک	ڈاکٹر عبدالحق
ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	محمد حسین خاں زبیری
مولوی چراغ علی	غلام ربانی
نظام رامپوری	شاد عارفی
شاد عظیم آبادی	سید حسن امام
نصیر حسین خیال	شاہ ولی الرحمٰن دلی کاکوی
امداد امام اثر	سید حسن امام
حبیب الرحمٰن شروانی	مالک رام
علامہ عبداللہ العمادی	ابوالخیر مودودی
پنڈت برج نرائن چکبست	نجم الدین شکیب
مولانا احسن مارہروی	جمیل زبیری
دیانرائن نگم	ثاقب کانپوری
سائل دہلوی	مالک رام
چودھری افضل حق	شورش کاشمیری
سیماب اکبرآبادی	نشار اٹاوی
میرزا ایبک جنگیزی	سید اعظم حسین اعظم
رضا علی وحشت	اختر قادری
سلطان حمید رجوش	وحید احمد
اختر شیرانی	نیر واسطی
ابوسعید بزمی	ادیب بزمی
رشید جہاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی
مجاز	ابواللیث صدیقی
مولوی محمد داؤد عباسی	محمود احمد عباسی
مجذوب	رضا انصاری
(۲) ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	اثر لکھنوی
جوش ملسیانی	پنڈت ہری چند اختر
تلوک چند محروم	عکس ناتھ آزاد
عبدالرزاق ملیح آبادی	شاہد خان
ڈاکٹر عابد حسین	ضیاء الحسن فاروقی
عرشی رامپوری	عشرت رحمانی
سید امتیاز علی تاج	شوکت تھانوی
صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	محمود نظامی
مسعود حسن رضوی	علی عباس حسینی
علی عباس حسینی	کشور نیلوفر زیدی
حامد علی خاں	محمد عبداللہ قریشی
رئیس احمد جعفری	ارشد تھانوی
شبلی بی کام	قمر نسکین
شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	بدرالاسلام فضل
ڈاکٹر غلام جیلانی برق	محمد عثمان
اے آر خاتون	زبیدہ خاتون
(۳) ڈاکٹر سید اعجاز حسین	سید احتشام حسین
سید احتشام حسین	ڈاکٹر محمد حسن
اختر حسین رائے پوری	دیوندر ستیارتھی
اختر اورینوی	شکیل اختر
حیات اللہ انصاری	مسیح الحسن رضوی
اوپندر ناتھ اشک	کوشلیا اشک
حفیظ ہوشیارپوری	نامر کاظمی
ن۔م۔ راشد	عطاء اللہ سجاد
احمد علی	سید علی اکبر قاصد
اختر انصاری	عزیز موسیٰ
شاد عارفی	طاہرہ اختر
سید عبدالحمید عدم	شاد امرتسری
جذبی	انور عظیم
شکیل اختر	صوفیہ فضل
(۴) مولانا محمد علی جوہر	ضیاء الدین احمد برنی
مولانا حسین احمد مدنی	رشید الوحیدی
سید ابوالاعلیٰ مودودی	نعیم صدیقی
علامہ مشرقی	غلام جیلانی برق
عطاء اللہ شاہ بخاری	شورش کاشمیری
انیس لئے رحمٰن	اثر صہبائی
حمید نظامی	شورش کاشمیری
شورش کاشمیری	محمد وارث کامل

(۵) حیدرآباد کی چند شخصیتیں — تمکین کاظمی
علی گڑھ کی چند شخصیتیں — خلیل الرحمٰن اعظمی
بہار کی چند شخصیتیں — شاہ ولی الرحمٰن کاکوی
سرحد کی چند شخصیتیں — سید فارغ بخاری

انتظاریہ

سر سید احمد خاں — محمد اسماعیل پانی پتی
خان بہادر مولوی بشیر الدین — محمد الدین مارہروی
نواب محسن الملک — ڈاکٹر سید محمود
امیر مینائی — اسمٰعیل احمد مینائی
سر تیج بہادر سپرو — ڈاکٹر سید اعجاز حسین
عبد الرزاق کانپوری — ابوالخیر مودودی
لالہ سری رام — ڈاکٹر عبدالسلام بابو سکسینہ
سید علی بلگرامی — غلام یزدانی
منشی سجاد حسین — ممتاز حسین جونپوری
مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی — مانی جائسی
محمد دین فوق — محمد عبداللہ قریشی
عشرت لکھنوی — خواجہ شمس الدین
اصغر گونڈوی — صغیر احمد صدیقی
ناجور نجیب آبادی — محمد وارث کامل
صفی لکھنوی — ممتاز حسین جونپوری
دل شاہجہانپوری — شبنم رومانی
فلک پیما — میاں بشیر احمد
مالک رام — مختار الدین احمد آرزو
احسان دانش — محمد وارث کامل

۶۱—۶۲ (سالنامہ)

افسانے

چور (غیر مطبوعہ) — سعادت حسن منٹو
اصطبل کے نگہبان — امتیاز علی تاج
جانا حاتم طائی کا — کنہیا لال کپور
رات چور اور چاند — بلونت سنگھ
بادل شرے کا جشن — حجاب امتیاز علی
ایک پھول، ایک کار — مہندر ناتھ
سات دن کی بادشاہت — کشمیری لال ذاکر
زرنو — ابوسعید قریشی
ایک، ننان کی موت — فکر تونسوی
بکی اینٹ — غلام علی چودھری
بہنا — جمیل الزمان
مومن کی واپسی — احمد سعید
یورپ میں اجنبی — منظور الٰہی
قدرت اعیں سوستادن — احمد جمال پاشا
زندہ لاش — سیدہ ثریا سلطانہ
چھبیس اور ایک — انوار حسن ہاشمی

نظمیں، غزلیں

خط — جوش ملیح آبادی
غزل — جگر مراد آبادی
غزل — سیماب اکبر آبادی
غزل — عابد علی عابد
تین نامکمل غزلیں — احمد ندیم قاسمی
غزل — سراج لکھنوی
غزل — آنند نرائن ملا
غزل — معین احسن جذبی
سہاروں کی تلاش — اختر انصاری
غزل — عدم
بڑی صدا — عدم
غزل — فضل احمد کریم فضلی
غزل — عرشی رامپوری
غزل — شاد عارفی
غزل — اشک رامپوری
غزل — شور علیگ
ابر و باد — شور علیگ
رباعیات — جلیل مشکوٰۃ
یاد — غلام ربانی تاباں
غزل — حیرت شملوی
غزل — اکرم رومانی
غزل — جگن ناتھ آزاد
غزل — راز مراد آبادی
غزل — ناصر کاظمی
گھونگھٹ اوٹ — سوامی مارہروی
غزل — ظہور نظر
غزل — ظہور نظر
غزل — شاعر لکھنوی
غزل — نور بجنوری

پرانی تیس	مصطفیٰ زیدی
اشارے	منیر نیازی
غزل	وحید قریشی
تعبیر	حمایت علی شاعر
یہ اونچے درختے	احمد ریاض
تعبیر	آغا صادق
غزل	پریم وار برٹنی
نگارِ شہر	منظر امام
غزل	جمیل ملک
غزل	اختر ہوشیارپوری
غزل	شکیب جلالی
غزل	منظر امام
غزل	جلیل عشمی
غزل	باقر مہدی

مقالے

تقریظ (غیر مطبوعہ)	مولانا محمد علی جوہر
نذیر احمد کا ایک ناول	مولانا عبدالماجد دریابادی
غالب کی مقبولیت کے اسباب	شیخ محمد اکرام
احتشام حسین کی تنقید	کلیم الدین احمد
متفرقات	قاضی عبدالودود
فقہ ہندی	اختر اورینوی
نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ	راجندر ناتھ شیدا
آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری	ڈاکٹر محمد حسن
تذکرہ شعرائے اردو	ڈاکٹر وحید قریشی
قدیم شاعری کی ادبی اہمیت	آفتاب احمد
حیات ڈپٹی نذیر احمد	یٰسین علی خاں

غیر شخصیات

علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی	سید ابوالخیر مودودی
قاضی عبدالودود	ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو
شفق عماد پوری	حسن وارثی
مانی جائسی	سید کعب مصطفیٰ
میرزا ادیب	جمیل ملک
صالحہ عابد حسین	بیگم انیس قدوائی
قتیل شفائی	ابراہیم جلیس
لاہور کی چند شخصیتیں	محمد طفیل

کھلے خط

پہلا خط	اثر لکھنوی
دوسرا خط	عبدالمجید عدم

۶۴ — ۶۳

افسانے

کچی مہر	کرشن چندر
آمرے	خدیجہ مستور
رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ
ادارہ تجہیز و تکفین	شوکت تھانوی
یہ دوشنم، یہ دوشنم	اے حمید
پرواز کے زخم	کشمیری لال ذاکر
مٹی	ابوسعید قریشی
سفید چادر	احمد سعید
پاگل کون	منظور الٰہی
مریم	رتن سنگھ
گورنگا ہیڑ	عبدالرحمٰن صدیقی

ڈرامے

نیا گھر	کرشن چندر
دو پیر چلتا ہے	آغا بابر

نظمیں، غزلیں

قند پارسی	فراق گورکھپوری
قند ہندی	فراق گورکھپوری
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	مجید امجد
کہانی ایک ملک کی	مجید امجد
بھکارن	مجید امجد
غزل	مجید امجد
موجودگی	مجید امجد
نرگس	مجید امجد
عمر یا آدم	جگن ناتھ آزاد
رباعیات	جوش ملیح آبادی
غزل	اثر لکھنوی
غزل	احمد ندیم قاسمی
قطعات	اختر انصاری
غزل	قتیل شفائی
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں	ابن انشا
غزل	شاد عارفی

غزل	شاد عارفی	
غزل	امتیاز علی عرشی	
غزل	عبدالمجید حیرت	
غزل	عبدالمجید حیرت	
پیامِ فطرت	پروفیسر شور	
غزل	پروفیسر شور	
غزل	انجم رومانی	
غزل	سلام مچھلی شہری	
غزل	نور بجنوری	
غزل	اقبال صفی پوری	
غزل	نواب شمس الحسن	
غزل	مصطفےٰ زیدی	
غزل	حمایت علی شاعر	
میراث	فارغ بخاری	
یہ لوگ	احمد ریاض	
میں اور ہم	پرویز مشاہدی	
رباعیات	شکیب جلالی	
بھٹکا ہوا مسافر	بلراج کومل	
اک نجلی سی لہرائی	عظیم قریشی	
غزل	پریم وار برٹنی	
غزل	افضل پرویز	
غزل	مظہر امام	
غزل	رضا ہمدانی	
غزل	جمیل ملک	
غزل	احمد ظفر	
غزل	ظفر اقبال	
غزل	رفعت سلطان	
غزل	صابر کنجاہی	
مقالے: نثر نگاروں کی شاعری	مولانا عبدالماجد دریابادی	
اردو شاعری پر مغربی اثرات	ڈاکٹر محی الدین زور	
مرزا رسوا کی تنقید نگاری	ڈاکٹر محمد حسن	
اودھ پنچ کا ایک فن	محمد طاہر فاروقی	
اشارہ یا استعارہ	ڈاکٹر شوکت سبزواری	
مرقع اکبر تجدیدی	سید علی عباس جلالپوری	
ملک حبیب احمد خاں	غلام رسول مہر	
۱۹۵۷ء کے بعد بنیادی رجحان	مولانا غلام رسول مہر	
۱۹۵۷ء میں اہل علم پر کیا گزری	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	

۶۵-۶۶ (مکاتیب نمبر)

علم و ادب میں خطوط کا درجہ	غلام رسول مہر	
اردو خط نگاری	ڈاکٹر سید عبداللہ	
اردو کے منفرد مکتوب نگار	مالک رام	
مشاہیر ادب (سوانح)	محمد عبداللہ قریشی	
غالب دہلوی		۸ خطوط
سرسید احمد خاں		۶ خطوط
محمد حسین آزاد		۵ خطوط
امیر مینائی		۴ خطوط
داغ		۴ خطوط
منشی ذکاء اللہ		۳ خطوط
ڈپٹی نذیر احمد		۷ خطوط
مولانا حالی		۲۶ خطوط
نواب محسن الملک		۳۳ خطوط
نواب وقار الملک		۹ خطوط
جلال لکھنوی		۳ خطوط
شبلی نعمانی		۴۴ خطوط
اکبر الہ آبادی		۱۶ خطوط
شاد عظیم آبادی		۱۰ خطوط
مولانا عبدالحلیم شرر		۱۰ خطوط
ڈاکٹر سید محمود		۳ خطوط
رسا رامپوری		۷ خطوط
سید احمد دہلوی		۷ خطوط
ریاض خیرآبادی		۹ خطوط
غلام قادر گرامی		۶ خطوط
سید امداد امام اثر		۳ خطوط
نظم طباطبائی		۶ خطوط
حبیب الرحمٰن		۸۷ خطوط
علامہ اقبال		۴۹ خطوط
سر عبدالقادر		۳۳ خطوط
مولانا محمد علی جوہر		۱۰ خطوط
مولانا شوکت علی		۴ خطوط

سرکشن پرشاد	۱۳ خطوط
بیخود بدایونی	۳ خطوط
خواجہ عشرت لکھنوی	۲ خطوط
راشد الخیری	۴ خطوط
حکیم اجمل خاں	۶ خطوط
سائل دہلوی	۴ خطوط
محمد دین فوق	۹ خطوط
ڈاکٹر انصاری	۳ خطوط
غلام صدیق نیرنگ	۸ خطوط
سر تیج بہادر سپرو	۳ خطوط
آغا شاعر قزلباش	۱۰ خطوط
ظفر الملک	۱۲ خطوط
احسن مارہروی	۲۷ خطوط
صفی لکھنوی	۱۱ خطوط
دیا نرائن بیگم	۶ خطوط
وحید الدین سلیم	۲ خطوط
نصیر حسین خیال	۱۰ خطوط
جالب دہلوی	۴ خطوط
سید سلیمان ندوی	۶۱ خطوط
خواجہ حسن نظامی	۲۹ خطوط
دتاتریہ کیفی	۲۱ خطوط
مناظر احسن گیلانی	۱۲ خطوط
سجاد حیدر یلدرم	۸ خطوط
عظمت اللہ خاں	۵ خطوط
سر راس مسعود	۹ خطوط
مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی	۵ خطوط
خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی	ایک خط
مفتی کفایت اللہ	۳ خطوط
عبدالرحمٰن بجنوری	۳ خطوط
منشی پریم چند	۲۸ خطوط
اصغر گونڈوی	۹ خطوط
حسرت موہانی	۱۱ خطوط
وحشت کلکتوی	۱۲ خطوط
پروفیسر محفوظ الحق	۱۹ خطوط
منشی حبیش پرشاد	۲۸ خطوط

شاداں بلگرامی	۷ خطوط
سیماب اکبر آبادی	۱۴ خطوط
فرحت اللہ بیگ	۷ خطوط
فانی بدایونی	۷ خطوط
آرزو لکھنوی	۵ خطوط
محمود شیرانی	۷ خطوط
تاجور نجیب آبادی	۱۳ خطوط
یگانہ چنگیزی	۱۵ خطوط
قاضی عبدالغفار	۲۸ خطوط
سلطان حیدر جوش	۳ خطوط
اختر شیرانی	۱۹ خطوط
ڈاکٹر تاثیر	۴ خطوط
عبدالسلام ندوی	۹ خطوط
چراغ حسن حسرت	۴ خطوط
اختر جوناگڑھی	۸ خطوط
(۲) سید نذیر حسین محدث دہلوی	ایک خط
نواب سر عزیز اللہ خاں	۳ خطوط
محمد سمیع اللہ	۳ خطوط
ابو محمد عبدالحق	ایک خط
سر آسمان جاہ	۲ خطوط
سید شوکت حسین شوکت فہمی	ایک خط
مولانا الحمد علی آزاد	ایک خط
رضا بلگرامی آرزو	ایک خط
نواب صدر الدین حسین	ایک خط
منیر شکوہ آبادی	ایک خط
مولوی خدا بخش	ایک خط
سید عبدالحی	ایک خط
سید عباس حسن فصاحت	۲ خطوط
امیر علی رضوی	ایک خط
جسٹس امیر علی	ایک خط
سید علی بلگرامی	۲ خطوط
سید میر حسن	ایک خط
مولانا میر حسن	ایک خط
عبدالرزاق کانپوری	۲ خطوط
شاہ سلیمان پھلواری	ایک خط

محمد علی ردولوی	ایک خط
مولانا عبدالباری	۲ خطوط
جلیل مانک پوری	ایک خط
مہدی حسن	۲ خطوط
بیخود بلگرامی	ایک خط
کشن پرشاد کول	۲ خطوط
شمیم بھرت پوری	ایک خط
میر نثار علی شہرت	ایک خط
خوشی محمد ناظر	ایک خط
غلام احمد مہجور	۲ خطوط
مولانا رشید احمد گنگوہی	ایک خط
مولوی بشیر الدین	ایک خط
مولانا عبدالباری آسی	۲ خطوط
مولانا آزاد سبحانی	ایک خط
پنڈت شیو نرائن شمیم	۲ خطوط
میرزا ثاقب لکھنوی	۲ خطوط
بیخود موہانی	ایک خط
آزاد انصاری	۲ خطوط
مولوی عنایت اللہ	ایک خط
مولوی نور الحسن نیر	۲ خطوط
مولانا حمید الدین فراہی	ایک خط
میر ناصر علی	ایک خط
مرزا ہادی رسوا	۲ خطوط
بے نظیر شاہ	۲ خطوط
شفق عماد پوری	ایک خط
ڈاکٹر ضیاء الدین	۲ خطوط
مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	۳ خطوط
سید طفیل احمد منگلوری	ایک خط
مولانا ظہور احمد وحشی	ایک خط
مولانا عبدالماجد بدایونی	ایک خط
مولوی سید ممتاز علی	ایک خط
سر سید رضا علی	۲ خطوط
منشی نوبت رائے نظر	ایک خط
عبداللہ یوسف علی	ایک خط
بہادر یار جنگ	۳ خطوط

سید ضمیر الدین احمد عرشی	ایک خط
مرزا محمد عسکری	ایک خط
مولوی محمد اکرام خاں ندوی	ایک خط
سعید انصاری	ایک خط
مولانا مسعود عاطم ندوی	ایک خط
مولانا مسعود علی ندوی	۲ خطوط
مولوی عزیز مرزا	۲ خطوط
سید فرزند علی صفیر بلگرامی	۵ خطوط
مولوی غلام حسین کنتوری	۵ خطوط
مولوی عبدالغفور شہباز	۸ خطوط
سید علی حسن خاں	ایک خط
سید حسین بلگرامی	۹ خطوط
سر آفتاب احمد	۳ خطوط
حکیم حبیب الرحمٰن شروانی	۲ خطوط
وجاہت جہنجھانوی	۹ خطوط
حکیم ناطق گلاوٹھی	۳ خطوط
مولوی سید محمد حسین محوی	۹ خطوط
جسٹس شاہ دین ہمایوں	۶ خطوط
حکیم فقیر محمد چشتی	۳ خطوط
بیخود دہلوی	۲ خطوط
مولانا محمد عرفان	۳ خطوط
مولانا اسلم جیراجپوری	۲ خطوط
مہدی بیگم	۲ خطوط
(۳) ابوالکلام	ایک خط
مولانا عبدالحق	ایک خط
مولانا عبدالماجد دریابادی	ایک خط
پطرس	ایک خط
نیاز فتحپوری	ایک خط
ڈاکٹر ذاکر حسین	ایک خط
غلام رسول مہر	ایک خط
عبدالمجید سالک	ایک خط
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	ایک خط
ڈاکٹر عابد حسین	ایک خط
رشید احمد صدیقی	ایک خط
خواجہ غلام السیدین	ایک خط

ڈاکٹر تارا چند	ایک خط
فراق گورکھپوری	ایک خط
مالک رام	ایک خط
ڈاکٹر محی الدین زور	ایک خط
امتیاز علی عرشی	ایک خط
سید مسعود حسن رضوی	ایک خط
شیخ محمد اکرام	ایک خط
پروفیسر چاند حسن قادری	ایک خط
پروفیسر محمد شفیع	ایک خط
مولانا حسین احمد مدنی	ایک خط
شیخ محمد عبداللہ	ایک خط
جوش ملیح آبادی	ایک خط
حفیظ جالندھری	ایک خط
جگر مرادآبادی	ایک خط
نوح ناروی	ایک خط
اثر لکھنوی	ایک خط
آل احمد سرور	ایک خط
مختار الدین آرزو	ایک خط
سید احتشام حسین	ایک خط
اختر حسین رائے پوری	ایک خط
محمد حسن عسکری	ایک خط
عندلیب شادانی	ایک خط
جوش ملسیانی	ایک خط
سید امتیاز علی تاج	ایک خط
فیض احمد فیض	ایک خط
ن۔م راشد	ایک خط
کرشن چندر	ایک خط
عصمت	ایک خط
احمد علی	ایک خط
راجندر سنگھ بیدی	ایک خط
غلام عباس	ایک خط
حیات اللہ انصاری	ایک خط
علی عباس حسینی	ایک خط
خواجہ احمد عباس	ایک خط
احمد ندیم قاسمی	ایک خط
اوپندر ناتھ اشک	ایک خط

ممتاز مفتی	ایک خط
بلونت سنگھ	ایک خط
عزیز احمد	ایک خط
قرۃ العین	ایک خط
حجاب امتیاز علی	ایک خط
ہاجرہ مسرور	ایک خط
خدیجہ مستور	ایک خط
تسنیم سلیم چھتاری	ایک خط
کنہیا لال کپور	ایک خط
شوکت تھانوی	ایک خط
معین احسن جذبی	ایک خط
میراجی	۲ خطوط
منٹو	۳ خطوط
مجاز	۴ خطوط

۶۷-۶۸ (دس سالہ نمبر)

طلوع	محمد طفیل
رپورتاژ ستمبر کا چاند	قرۃ العین حیدر
افسانے کلو کی ماں	عصمت چغتائی
پرتیج	کرشن چندر
ماتم	احمد ندیم قاسمی
ٹوٹے پل	علی عباس حسینی
دھند	ممتاز مفتی
رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ
دل کی پیاس	خدیجہ مستور
تاریک صلیب اور زرد چاند	اے حمید
جوکیں	مہندر ناتھ
رات کی آنکھیں	کشمیری لال ذاکر
ایمان کی سلامتی	جیلانی بانو
انسان اور صلیب	صادق حسین
دو ہزار روپے کا چیک	دیوندر اسر
انسان، اس کا گھوڑا اور خدا	احمد سعید
بجھتے چراغ	رام لعل
ایک رات	ڈاکٹر شفیق
ڈرامے کھلی کھڑکیاں	ہاجرہ مسرور

تو شب آفریدی چراغ آفریدم	سلام مچھلی شہری	
طنز و مزاح	سامع	کنہیا لال کپور
برائے وزنِ بیت	احمد حسین	
نظمیں غزلیں	خاکِ صلح	جوش ملیح آبادی
غزل	جگر مراد آبادی	
مشرق و مغرب	احمد ندیم قاسمی	
غزل	اثر لکھنوی	
ایک مفلوج دوست سے	تلوک چند محروم	
غزل	افقر موہانی	
غزل	جذبی	
قطعات	اختر انصاری	
غزل	عدم	
بے دور	اختر الایمان	
رہم شبستانِ طرب	قتیل شفائی	
غزل	قتیل شفائی	
غزل	شاد عارفی	
جادو کشش	مجید امجد	
ساقی کے حضور	پروفیسر شور	
غزل	پروفیسر شور	
غزل	غلام ربانی تاباں	
غزل	عبدالمجید حیرت	
شراب	منیر نیازی	
ایک ملاقات	ظہور نظر	
غزل	اقبال صفی پوری	
غزل	آغا صادق	
ماضی و حال و مستقبل	تاریخ بخاری	
آنچل کی چھاؤں میں	خلیل الرحمٰن اعظمی	
غزل	فضا ابن فیضی	
مریم نغمہ	شاذ تمکنت	
غزل	ظاہر غزنوی	
غزل		احمد ریاض
غزل		منظور عارف
غزل		کوثر نیازی
غزل		کوثر نیازی
غزل		جلیل حشمی
غزل		جمیل ملک
غزل		احمد ظفر
غزل		ظفر اقبال
غزل		آتش لدھیانوی
پانچ چینی نظمیں		ابن انشا
کیسے کیسے لوگ		
جگنو سے!		
کوچ		
سرخ رنگ دھوئیں		
بھوت کا گالا		
مقالے	تنقید شعر اور حالی	عبدالقادر سروری
	دارا شکوہ کا دیوان	پروفیسر علم الدین سالک
	گل بگاؤلی	محمد عبداللہ قریشی
	حضرت سید احمد بریلوی کی داستانِ جہاد	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
	آگرہ کی ادبی شخصیتیں	میکش اکبر آبادی
	غالب کی شاعری	عطا محمد شعلہ
	واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط	تکمین کاظمی
	قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار	نصیر الدین ہاشمی
	شیوۂ جوہر نزدی کا آغاز	سید علی عباس جلالپوری
	قرۃ العین طاہرہ	منظور الٰہی
تبصرے	خونِ جگر ہونے تک	م۔ ط
	داغ داغ اجالا	ع۔ ستی

نقوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ

(۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک)

زمانہ ادارت: احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظمیں	غزلیں	کل تعداد نظم و نثر	تعداد صفحات طبع شدہ
۱	۱	۷	۵			۶	۹	۲۷	۸۴
۲	۲	۸	۴			۷	۶	۲۵	۸۰
۳	۳	۱۰	۵	۱		۹	۷	۳۲	۱۰۴
۴	۴ (آزادی نمبر)	۱۱	۷	۱		۱۳	۱۳	۴۵	۲۶۴
۵	۵	۱۷	۸	۱		۱۴	۹	۴۹	۱۹۸
۶	۶	۷	۵			۱۲	۸	۳۲	۱۲۰
۷	۷ (امن نمبر)	۱۲	۷			۱۴	۹	۴۲	۱۵۲
۸	۸ (آزادی نمبر)	۱۰	۱۰			۲۲	۲۰	۶۲	۲۴۰
۹	۹	۴	۵			۸	۷	۲۴	۸۰
۱۰	۱۰	۴	۴			۹	۶	۲۳	۷۲
	میزان	۹۰	۶۰	۳		۱۱۴	۹۴	۳۶۱	۱۳۹۴
	زمانہ ادارت: سید وقار عظیم								
۱۱	۱۱، ۱۲ (خاص نمبر)	۱۱	۱۲			۱۰	۱۷	۵۰	۲۰۰
۱۲	۱۳	۴	۴			۵	۱۴	۲۷	۷۲
۱۳	۱۴	۶	۵			۴	۱۲	۲۷	۷۲
۱۴	۱۵، ۱۶ (سالنامہ)	۱۸	۱۲			۱۰	۳۴	۷۴	۲۴۴
۱۵	۱۷، ۱۸ (ناولٹ نمبر)	۳	۲ منظوم	۱	۴			۱۰	۲۸۸
	میزان	۴۲	۳۵	۱	۴	۲۹	۷۷	۱۸۸	۸۷۶
	زمانہ ادارت: محمد طفیل								
۱۶	۱۹، ۲۰	۱۳	۱۰	۱		۱۵	۲۲	۶۱	۲۳۲
۱۷	۲۱، ۲۲	۱۵	۱۲			۱۶	۳۸	۸۱	۲۶۴

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظمیں	غزلیں	کل تعداد نظم و نثر	تعداد صفحات طبع شدہ
۱۸	۲۳، ۲۴	۹	۹		۱	۱۲	۲۲	۵۷	۲۴۰
۱۹	۲۵، ۲۶ (افسانہ نمبر)	۲	۳۸					۴۰	۴۰۰
۲۰	۲۷، ۲۸	۱۱	۹			۱۹	۲۰	۵۹	۲۴۰
۲۱	۲۹، ۳۰ (پنج سالہ)	۱۶	۱۵		۱	۲۰	۲۵	۷۷	۴۰۸
۲۲	۳۱، ۳۲	۱۰	۱۰		۱	۶	۲۰	۴۷	۲۰۸
۲۳	۳۳، ۳۴	۱۱	۷		۱	۵	۱۴	۳۸	۲۰۸
۲۴	۳۵، ۳۶	۱۳	۱۱			۱۱	۱۷	۵۲	۲۴۸
۲۵	۳۷، ۳۸ (افسانہ نمبر)	۱	۴۰					۴۱	۵۰۶
۲۶	۳۹، ۴۰	۸	۱۰			۱۲	۱۶	۴۶	۲۱۶
۲۷	۴۱، ۴۲ (غزل نمبر)						۸۱۵	۸۱۵	۴۸۰۰
۲۸	۴۳، ۴۴ (غزل نمبر)	۵	۷	۲				۱۴	۲۵۶
۲۹	۴۵، ۴۶	۷	۸	۴		۸	۱۶	۴۳	۲۶۴
۳۰	۴۷، ۴۸ (شخصیات نمبر)	۸۶							۷۰۰
۳۱	۴۹، ۵۰ (طنز نمبر)	۱۵	۳۰					۳۵	۳۸۴
۳۲	۵۱، ۵۲	۵	۱۰	۱	۱	۹	۱۶	۴۲	۲۴۸
۳۳	۵۳، ۵۴ (افسانہ نمبر)	۵	۱۱۰					۱۱۵	۱۰۹۰
۳۴	۵۵، ۵۶	۹	۸			۱۱	۱۷	۴۵	۲۰۸
۳۵	۵۷، ۵۸	۱۰	۷	۲		۱۲	۲۱	۵۲	۲۴۴
۳۶	۵۹، ۶۰ (شخصیات نمبر)	۸۸						۸۸	۸۱۴
۳۷	۶۱، ۶۲ (سالنامہ)	۲۱	۱۶			۱۴	۲۹	۸۰	۳۸۴
۳۸	۶۳، ۶۴	۹	۱۱	۲		۱۴	۳۲	۶۸	۳۱۲
۳۹	۶۵، ۶۶ (مکاتیب نمبر)	۴	(۲۱۳ خطوط)					۱۲۱۷	۱۰۴۸
۴۰	۶۷، ۶۸ (دو سالہ نمبر)	۱۲	۱۷ (افسانے)	۲		۱۹	۲۲	۷۲	۴۵۶
	میزان	۳۸۵	۲۹۵ (۲۱۳ خطوط)	۱۷	۲	۲۰۳	۱۱۶۶	۲۱۶۸	۱۰۰۰۶
	کل میزان	۵۱۷	۳۹۰ (۲۱۳ خطوط)	۲۱	۶	۳۴۶	۱۳۳۷	۲۷۱۷	۱۲۲۷۶

ہماری کتابیں

نیلوفر	شوکت تھانوی	۶/-
مولانا	"	۳/۸
غزالہ	"	۶/-
خدانخواستہ	"	۳/-
سودیشی ریل	"	۳/-
کتیا	"	۳/۸
سانچ کو آنچ	"	۳/۸
سسرال	"	۲/۴
کارٹون	"	۳/۸
بابو دولت	"	۳/۸
بقراط	"	۲/۸
جوڑ توڑ	"	۴/-
مضامین شوکت	"	۲/۸
قاضی جی (تین حصے)	"	۱۰/۸
غالب کے ڈرامے	"	۲/۸
وغیرہ وغیرہ	"	۳/-
بھابی	"	۴/۸
روزن	قتیل شفائی	۳/-
بی اماں	عزیز احمد	۵/-
خلفائے محمد	"	۱۰/-
شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	۷/۸
امراؤ جان ادا	رسوا	۴/-
منٹو	ابوسعید قریشی	۴/۴
قول و قرار	عدم	۲/۸
پیچ و خم	"	۳/-
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
بازارِ حیات	"	۳/-
نقوشِ لطیف	"	۶/-
عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸
ید بیضا	عابد علی عابد	۵/-
سیاست الٰہیہ	امام ابن تیمیہ	۲/۸
مضامین جمال الدین افغانی		۴/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/۸
صاحب	محمد طفیل	۳/-
انتقاد	عابد علی عابد	۳/-

ادارہ فروغ اردو، لاہور

مُدیرِ نقوش

محمد طفیل

میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح دو رائیں بنتی چلی گئیں۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں اور یہ ان کے دل کی فیاضی ہے۔ بعض لوگ مجھے دشنام سے یاد کرتے ہیں اور یہ ان کے دل کی ناراضی ہے۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ اس کا فیصلہ آج نہیں، کل ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے ـــــ یہ اوراق انھیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ میں کتنا بُرا اور کتنا اچھا ہوں۔

ایوا لکلام

• آج میں آپ کی اُن حضرت سے ملاقات کراتا ہوں جو اس سے پہلے اپنے کئی دوستوں کی پگڑیاں اچھال چکے ہیں اور دعوے یہ کرتے رہے ہیں کہ میں تو صاف گو قسم کا انسان ہوں۔ ارادہ ہے آج انھیں بھی صاف گوئی کی کسوٹی پر رگڑ دیا جائے۔

صورت دیکھئے تو مسکین، بھولے بھالے، تجربتہً اس کے برعکس، میں انھیں ۱۵ اگست ۱۹۲۲ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ حضرت مجھے اب تک چکمے پر چکمہ دیئے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا؟

مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں ان کا بچپن کا دوست ہوں۔ اُس وقت کا دوست جب یہ بجائے چلنے کے رینگا کرتے تھے اور اماں اوچی کہہ کر روٹی مانگا کرتے تھے۔

بعض ناسمجھوں کا خیال ہے کہ طفیل صاحب ایسے شریف آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کمیاب ضرور ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برانڈ آتا ہی نہیں۔ یہ بھی اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو نقصان کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انھیں بے ضرر اور غیر مفید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ جوں جوں بڑھتے گئے۔ والد کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی جوان ہوتی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بے چارے کی تعلیم ادھوری رہی۔ انھیں ہائی اسکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے مگر ان کے پاس کوئی قابلِ ذکر تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سننے میں آتا ہے ـــــ ابھی سرٹیفکیٹ کو چھوڑیئے۔ آج کل تو سکولوں اور کالجوں میں جہالت کے سرٹیفکیٹ بٹتے ہیں۔

ان کی تیسری جماعت کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ جب یہ حضرت اوّل درجہ کے لڑکے ہوا کرتے تھے اور خوب پٹا کرتے تھے۔ اگر استاد نے گھر پر کرنے کے لیے کام دیا تو یہ پٹائی سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہم سبقوں کے گھروں پر جاکر، انھیں باتوں میں لگا کر، انکھ بچا کر یا اُن کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر، اُس دن کا کام کے بڑے صفحات ہی پھاڑ لایا کرتے تھے۔ اس طرح خود سرخرو ہو کر دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیا کرتے تھے اور استاد اُن بیچاروں کو یہ کہہ کہہ کر خوب پیٹا کرتے تھے ——— "ہوں، کسی نے کاپی میں سے صفحے پھاڑ لیے ہیں۔ نالائق ——— ہوں کاپی میں سے صفحے ——— اُو ایک تو کام نہیں کرتے۔ دوسرے جھوٹ بولتے ہیں۔"

ایک دن، ان کا ایک ہم سبق، ان کے ہاتھ کی صفائی سے پٹ رہا تھا تو یہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اٹھے اور اقرار کر لیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ سچ ہے اور قصوروار میں ہوں۔ استاد نے ان کی صاف گوئی کی کوئی قدر نہ کی۔ اُلٹے اتنی ٹھکائی کی کہ اسکول کی دیوار تک سہم گئیں۔ اب سے نہ جانے کیا ہوا کہ یہ پڑھائی میں تیز ہو گئے۔ اتنے تیز کہ استاد ان پر فخر کرنے لگے۔

ان کی اس سے بھی پہلے کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو ممکن ہے اب ان کے لیے وجہ فضیلت نہ ہوں۔ مگر وہ باتیں ان کے مستقبل کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے ہی سکتی ہیں۔ یہ اپنے ماضی کی یادوں کو یکسر بھلا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ انھیں یاد آ ہی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی جھنجلا کر یہ شعر بھی دہراتے ہوئے پائے گئے ہیں ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خوب گت بنوائی۔ رُوئے، چیخے اور کپا، گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھڑوں کے چھتے کو جلا ڈالا۔ کوئی دو مہینے بعد بھڑوں نے پھر وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ انھوں نے دوبارہ چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنا حلیہ حسب سابق بنا لیا۔ آج جبکہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔

انہی دنوں کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب یہ حضرت ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی ممانی کے ہاں ڈاکہ ڈالا۔ وہ بیچاری سب سے چھپ کر، چارپائی کے نیچے، زمین میں سوراخ کر کے اور اُس میں مٹی کا ایک چھوٹا سا آبخورا لگا کر پیسے جوڑا کرتی تھیں۔ یہ حضرت رینگتے، چلتے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ ڈھکنا اٹھایا، پیسے نکالے، مٹھی میں دبائے۔ برآمدے میں پہنچے تو بڑے بچوں نے چھین چھپٹ کر خوب مزے کیے۔

چند دنوں کے بعد یہ حضرت پھر اُسی ڈھنگ پر، جتنے بھی پیسے ہاتھ آئے نکال لائے۔ ممانی نے موقعہ پر ہی چور کو پکڑ لیا۔ خوب پیٹا۔ پیٹتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔ ہائے ہائے طفیل تیرا بیڑا غرق، تو نے مجھ "نتری" کی ساری پونجی لٹا دی۔

کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے بھی تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ طفیل صاحب ہیرا پھیری کے ساتھ چوری سے بھی باز نہ آئے۔ جب یہ چھوٹے سے تھے تو چھوٹے چور تھے۔ بڑے ہوئے تو بڑے چور ثابت ہوئے۔ پہلے ممانی کی اکنیاں، دونیاں

اور پیسے چرایا کرتے تھے۔ سیانے ہوئے تو والدہ کی بڑی احتیاط سے چھپائی ہوئی گوہے کی صندوقچی میں سے روپے تک چرانے لگے۔ یہ شغل کوئی مہینہ دو مہینے چلا ہوگا کہ والد کو ان کی شرافت کا علم ہوگیا۔ اس سے پہلے اس لیے پتہ نہ چلا کہ یہ چوری میں بھی عقل سے کام لیا کرتے تھے اور ایک دن میں، ایک یا دو روپوں سے زیادہ نہیں چرایا کرتے تھے۔

چوری میں لاکھ خوبیاں ہوں گی۔ مگر ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن آدمی پکڑا جاتا ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب بھی پکڑے گئے۔ ایک طوفان برپا ہوگیا۔ محلے والوں کو بھی معلوم ہوگیا کہ صاحبزادے چور ہیں۔ ان کی والدہ نے چور کو والد صاحب کے حوالے کردیا اور والد صاحب اسے تھانے کی طرف، اب طفیل صاحب رو رو کر منت سماجت کر رہے ہیں۔ ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ ناک رگڑ رہے ہیں۔ مگر والد صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جب تھانہ قریب آگیا تو جناب طفیل کے ہاتھ پاؤں اور پھولے۔ جھٹکا دے کر والد صاحب کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑائی اور بگٹٹ بھاگے۔ ان کے والد صاحب زور زور سے پکارتے ہی رہ گئے۔ پکڑو پکڑو چور ہے۔ اب لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ جو چھوٹا سا لڑکا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہا ہے چور بھی ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد انھیں چوری سے ایسی نفرت ہوئی کہ باقی زندگی میں، اس آرٹ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ورنہ طفیل صاحب تو اب بھی کہتے ہیں کہ میری ابتدا بڑی شاندار تھی۔

جب یہ سترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ دولت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا۔ اب انھیں نہ صرف خود کما کر اپنا پیٹ بھرنا تھا بلکہ ایک چھوٹے سے گھرانے کی دال روٹی کی بھی فکر دامنگیر تھی۔ اتنی سی جان اور زندگی کی یہ سب سے کٹھن راہ۔

کچھ سات برس انھوں نے خوشنویسی کے کام پر ضائع کر دیے۔ مگر اس میں سے کچھ میں اندازہ بھی کیا۔ اس رقم سے، ایک دوست کے اشتراک سے پبلشنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ اول تو آج کل کی دوستیاں ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتیں۔ اس پر اشتراک! اس لیے ان کے بھی حسین خوابوں کی تعبیر وہی ہوئی۔ جو عموماً متوقع ہوتی ہے۔

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بے زاری اور بے کاری میں جب کئی مہینے گذر گئے تو ۱۹۴۳ء میں انھوں نے ادارہ فروغ اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ابتدا جو کچھ گزری، اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں۔ بس یوں جانیے پریشانیوں اور دشواریوں کا یہ اکیلی جان برسوں ہی مقابلہ کرتی رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ تھکے ہارے گھر لوٹے، ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ والدہ نے انھیں یوں پریشان دیکھا تو پوچھا "بیٹا کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں"

"کوئی بات تو ضرور ہے"

"بات یہ ہے کہ میں ساری دنیا سے اکیلے ہی لڑ رہا ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے جو میرا ساتھ دے۔ نہ رشتہ دار، نہ دوست!"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر تو اکیلا نہیں ہے۔"

"جی ہاں! میرے ساتھ ساری خدائی ہے۔"

"تیرے ساتھ تیرے ولولے ہیں۔ تیری اُمنگیں ہیں۔ تیرے ارادے ہیں ——— اور پھر خدا ———"

"سب کچھ میرے ساتھ ہے۔ مگر خدا میرے ساتھ نہیں؟"

"ایسی بکواس نہیں کیا کرتے۔"

"میں بھی انسان ہوں۔ بچپن سے اب تک ہزار دُکھ جھیلے ہیں۔ مگر اب تک خدا کو ترس نہیں آیا!"

"دیکھو میں تجھے دو باتوں کی نصیحت کرتی ہوں۔ ایک یہ کہ صبر و ضبط کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دوسرے کسی بھی کام کو ناممکن نہ جاننا۔"

طفیل صاحب نے ہمیشہ اپنے دوستوں کے رومانس کو سرِ صفحات بدنام کیا ہے۔ دل چاہتا ہے آج ان حضرت کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا جائے۔ کچی عمر میں ایک صاحب نے غالباً انھیں بیوقوف سمجھ کر ان سے ذرا وضعی قسم کی خط و کتابت شروع کر دی۔ جب انھیں اُن صاحبہ کی طرف سے پہلا خط ملا تو یہ پاگل خانے کی سیڑھیوں پر ہی سنبھل گئے۔ وہ خط و کتابت نہایت دلچسپ تھی۔ سینکڑوں خطوں کا آنا جانا رہا۔

اگر محترمہ نے اظہارِ بے تکلفی فرمایا تو انھوں نے مفتی وقت بن کر فوراً ڈانٹ پلائی کہ یہ بات غلط، اگر محترمہ نے کوئی شرارت کی تو انھوں نے چھوٹی عمر میں بڑے میاں بن کر بڑی ہی معنی خیز "ہوں" کر کے اس شرارت کا مزا ہی کرکرا کر دیا۔ اگر انھوں نے کوئی لگاوٹ کی بات کی تو انھوں نے اپنا رشتہ ہی اس سے مختلف بتا دیا۔ غرض جتنی بھی نالائقیاں ان سے سرزد ہو سکتی تھیں، وہ ہوئیں۔ آخری نالائقی یہ کی کہ اس دو طرفہ خط و کتابت ہی کو ایک دن جلا ڈالا۔ جبکہ ان میں سے ایک ایک خط کو خود اُن جناب نے ایک ایک دو دو دن کی ریاضت سے لکھا ہوا تھا۔ آج یہ خود کوشش کر کے بھی لکھنا چاہیں تو اُس جیسا ایک خط نہیں لکھ سکیں گے۔

ان سارے واقعات پر، یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے (بشرطیکہ انھیں کسی طرح ایک دو برس کی قید ہو جائے۔ ورنہ فرصت کہاں) جس کی ضخامت کوئی چھ سو صفحات تو ہو گی۔ اُس میں ہیرو کی بزدلی، نالائقی اور بیوقوفیوں کے ساتھ، دوسرے کی بہن سے اپنے بھائی کا پیار لے گا۔

زندگی کے اس ابتدائی غلط تجربے ہی کی بنا پر، ان کا خیال یہ ہے کہ عورت ہی کو مرد پر عاشق ہونا چاہیے۔ مرد کو عورت پر ہرگز ہرگز عاشق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

یہ خواہ مخواہ کے ناصح مشفق بھی، ایک دن ایک صاحبہ انھیں اوارہ فروغ اُردو پر اکیلا پا کر ایک نہایت بازاری قسم کا عریاں ناول خریدنے آئیں تو انھوں نے جُوں ہاں ہی نہ کی۔

وہ صاحبہ قدرے تڑخ کر بولیں "میں پوچھتی ہوں۔ خلاں ناول ہے!"

"ہے تو مگر آپ کو نہ دوں گا۔"

"کیوں؟"

"وہ ناول بڑا عریاں ہے۔"

وہ جھنجھلا کر بولیں "یہ تو مجھے بتائیے۔ آپ میرے سرپرست کب سے بنے ہیں؟"

اس طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے مگر سوال یہ ہے کہ طفیل صاحب کو دوسروں کی بہنوں کے بارے میں، اپنی بہن کی طرح سوچنے کا کیا حق ہے؟ اگر حق ہے تو جب جواب ملتا ہے تو پسینے کیوں چھوٹتے ہیں۔

ابھی کوئی ایک برس کی بات ہوگی کہ شامتِ اعمال اُس دن بھی یہ اکیلے ہی بیٹھے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھے کہ ایک صاحبہ دندناتی ہوئی آئیں اور ان سے پوچھا "کنواری ہے؟"

یہ بڑے پریشان ہوئے۔ مگر اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ صرف اتنا ہی کہہ سکے "جی!"

"میں پوچھتی ہوں" دختر باکرہ کا اُردو ترجمہ ہے؟"

"میں فارسی نہیں سمجھتا۔"

"تو کیا اُردو بھی نہیں جانتے؟"

"جی نہیں"

طفیل صاحب کے اس جواب پر، پہلے تو مسماۃ نے انھیں سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پاؤں سے سر تک اور انھی کے جواب "جی نہیں" کو اس انداز سے لوٹایا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ چند کہیں کا۔

طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے ہر بات میں نفاست کو بڑا خیال رکھتے ہیں اور خوب صورت چیزوں پر تو جان بھی دیتے ہیں۔ یقین کیجئے انھیں اس حد تک خوبصورتی خوبیا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ ہر چیز میں حُسن ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ اپنے نہایت ہی بے تکلف دوست سے کہہ رہے تھے "دیکھو نیاز، وہ سامنے جو کوا بیٹھا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے؟"

خود ان کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اگر نیا کوٹ پھٹ گیا ہے تو پھٹ جائے، پتلون پر چائے گر گئی ہے تو گر جائے۔ یہ پھٹے ہوئے کوٹ اور چائے گری پتلون کے ساتھ بھی یہ خوشی خوشی نباہ کرتے چلے جائیں گے۔ پالش کے معاملے میں ان کے بوٹ عموماً نیم ہی ملے۔ ٹائی کے بغیر کوٹ اوڑھتے ہیں اور بازار میں اکیلے جاتے ہوئے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی پاگل!

ان میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر ایک انتظامی خوبی ایسی ہے کہ باقی تمام خوبیاں ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ ان کے خاص خاص دوست جانتے ہیں کہ دعوت کے دن طفیل صاحب کو کھانا نہیں چھوڑنا چاہئے۔ چنانچہ انھیں حکم مل جاتا ہے کہ اب ہم کھانے پینے کا سامان مہمانوں کے سامنے رکھنے والے ہیں لہٰذا یا تو آپ یہاں سے چلے جائیں یا ادھر کا رُخ اس وقت کریں۔ جب ہم فارغ ہو جائیں۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ طفیل صاحب کے دوستوں کی کتنی زیادتی ہے۔ ویسے آپ اس کا فیصلہ ان کے انتظام کے ماتحت جو ایک شادی ہوئی تھی۔ اُس کا ذکر سُن لینے کے بعد کریں۔

ان کے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے انھیں بلایا کہ میری بہن کی شادی ہے اس میں شرکت کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ یہ پہنچے ——— پکوانے وغیرہ کا کام کسی اور کے سپرد تھا۔ ان کے ذمہ صرف یہ کام تھا کہ برات کو اپنی نگرانی میں کھانا کھلا دینا اور جب دولہا گھر میں داخل ہو تو یہ ہار پہنا دینا۔

باجوں کی آواز قریب آنے لگی تو ان کے ہوش اڑنے لگے۔ جوں جوں برات قریب آتی گئی، ان کے کان بجنے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ برات صحن میں داخل ہو گئی۔ اب انھیں دولہا نظر نہیں آتا۔ پہلے کا دیکھا ہوا نہ تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ اس لیے دولہا بن کر بھی آدمی ہی تھا۔ انھوں نے گھبراہٹ میں کسی اور کو دولہا بھائی کا خطاب دے ڈالا۔

اب کھانا نکل رہا ہے اور یہ شور مچا رہے ہیں۔ پلاؤ کی کتنی دیگیں ہیں ——— آٹھ ——— آٹھ سے کیا بنے گا ——— یہ حضرت تو پورے شہر کو لے کر آ نکلے ہیں ——— شوربا ——— دو ——— ڈال دو پانی ——— ورنہ مارے جاؤ گے ——— اسی اثنا میں دو ایک بچے پلاؤ کی پلیٹ لے کر ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ یہ بوکھلائے ہوئے تو تھے ہی، انھوں نے دکھ کے جو زناٹے دار تھپڑ ایک بچے کو رسید کیا تو وہ کم بخت پلاؤ پھینک زور زور سے رونے لگا ——— اب یہ اُسے منا رہے ہیں۔ بھئی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ اور پلاؤ کی ایک چھوڑ دو پلیٹیں لے جاؤ۔ مگر وہ ایسا ضدی بچہ نہ پلاؤ لیتا تھا نہ چپ ہوتا تھا۔ آناً فاناً انھیں ایک ترکیب سوجھی جھٹ ایک روپیہ جیب سے نکالا۔ بچے کی ہتھیلی پر رکھا۔ ساتھ ہی ہاتھ جوڑے، تب کہیں بچہ راضی ہوا۔ اس پر بھی اُس بچے نے جا کر اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں بھی بچے کی طرح بڑی بھلی مانس تھیں۔ ایکدم گالیوں پر اُتر آئیں۔ زنانے میں گالیاں مل رہی تھیں۔ مردانے میں پلاؤ مل رہا تھا۔

جب برات چلی گئی اور گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھے تو سب کے سب ان کی باتیں یاد کر کے ہنس رہے تھے اور یہ پریشان ہو رہے تھے کہ جتنی بھی باتیں ان سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کی یوں بے قدری دیکھ کر آئندہ کے لیے توبہ ہی کر چکے ہیں کہ اب کسی کی برات آئے یا جنازہ اٹھے۔ پروا ہی نہیں کرنی چاہیے۔

ان کے سر سے والد کا سایہ اُس وقت اٹھا جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (یکم فروری ۱۹۴۳ء) اور والدہ کا سایہ اُس وقت اٹھا (۵ جون ۱۹۵۵ء) جب یہ اس دنیا میں آبرومندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ سب کچھ والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ طفیل صاحب کا اپنی والدہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں، کسی شمار قطار میں نہ تھیں۔

بیماری سے دو دن پہلے کی باتیں آپ بھی سن لیں :۔

"بیٹا یہ میری آخری بیماری ہے۔"

"یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ بخار ہی تو ہے۔"

"ہے تو بخار، مگر چھوڑو ان باتوں کو، شام کو کتنے بجے لوٹو گے؟"

"کیوں؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ تم جلدی سے آجاؤ۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں جاتا ہی نہیں۔"

"نہیں نہیں، بات کوئی نہیں، مگر آنا جلدی سے، ایک کام ہے۔"

یہ چلے تو گئے۔ مگر ان کے دل میں کھٹکا بڑی لگی رہی کہ والدہ نے جلدی واپس آنے کو کہا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ یہ اس دن تیسرے پہر ہی لوٹ آئے۔ دیکھا تو والدہ کی سانس اکھڑی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے۔ دوائی دی گئی۔ سانس بحال ہو گئی۔ بخار بھی ہلکا ہو گیا۔

دوسرے دن پھر سانس اکھڑ گئی۔ تو یہ پھر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے۔ مگر ان کی والدہ نے واپس بلا لیا اور بڑے حوصلے سے کہا: "بیٹا تو جو کچھ چاہتا ہے۔ وہ اب پورا نہ ہوگا۔"

ان کی والدہ ایسی باتیں کرتی ہی رہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ سانس ضرور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ مگر ظاہری حالت بڑی اچھی تھی۔ تین چار دن میں بخار سے مریض کی حالت بھلا خراب ہی کتنی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ سانس پھر بحال ہو گئی۔ بخار بالکل اتر گیا۔ بظاہر سب کی عید ہو گئی۔

طفیل صاحب نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور والدہ سے کہا: "بخار بھی اتر گیا۔ سانس بھی ٹھیک سے آنے لگی ہے۔"

اس پر جواب تو کچھ نہ ملا۔ البتہ مسکرائیں ضرور، جیسے کہہ رہی ہوں۔ پگلا کہیں کا۔

یہ اس دن کہیں بھی نہ گئے۔ سارا دن ہنسی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں۔ گھر میں رشتہ داروں کا آنا جانا رہا۔ دن گذر گیا۔ رات ہوئی تو کوئی گیارہ بجے والدہ نے ان سے سو جانے کے لیے اصرار کیا۔

رات کے ایک بجے کے قریب والدہ نے انھیں بلایا۔ یہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ قریب آئے تو والدہ نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: "بیٹا میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کا خیال رکھنا۔ دیکھنا وہ دنیا میں کسی طرح بھی آزردہ نہ ہوں۔" یہ کہہ کر چھاتی سے لگا لیا اور یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ——— اس پر ان کی والدہ کہنے لگیں "ارے دیکھو میں ابھی مجھے بڑی باتیں کرنی ہیں۔ حوصلے سے کام لو۔"

"حوصلے سے کام کس طرح لوں! کیا کروں!"

یہ تو پھر ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ والدہ نے ایک ایک کو پاس بلا کر پیار کیا۔ دعائیں دیں۔ چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی، جب یہ (بغیر ڈاکٹر کے) واپس لوٹے تو سب کے سب رو رہے تھے اور والدہ سب کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں:

"دیکھو، ٹرنک کھول کر، جو سب سے اچھا جوڑا ہو۔ وہ میرے یتیم بھتیجے کی شادی پر دے دینا ——— میں نے نہ تو کسی کا کچھ دینا ہے اور نہ ہی کچھ لینا ہے ——— میرے کانوں میں جو سونے کے بٹنے ہیں وہ نہلانے والی کو دے دینا ——— چاروں جمعراتوں پر بیٹیوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا ———"

اب صبح ہونے ہی والی تھی۔ یہ پھر ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے۔ والدہ کو پتہ چلا تو انھوں نے انھیں واپس بلوایا۔ ڈاکٹر کو لانے سے منع کیا۔ یہ بھی کہا: "اب کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس بیٹھو۔ مگر یہ نہ مانے۔ ڈاکٹر کو لانے کے لیے چل ہی دیے۔"

ڈاکٹر کو لے کر جب یہ واپس آئے تو ان کی والدہ ان کی ممانی اور بیگم سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے نہلا دو۔ وہ چپ تھیں۔ کیا کرتیں۔ بات نہیں ہے۔ آپ لوگ بلاوجہ گھبرا رہے ہیں۔

جب بیگم اور ممانی نہلانے پر راضی نہ ہوئیں تو والدہ نے پھر ان کی طرف دیکھا اور اصرار کیا "ان سے کہو۔ مجھے نہلا دیں۔ پڑ نہیں یہ کیا سوچ رہی ہیں مگر مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔"

میں بھی چپ رہ گیا۔ ماموں صاحب بھی چپ ہو گئے۔ ممانی بھی چپ ہو گئیں۔ میرے اشارے پر بیگم نے اٹھ کر پانی گرم کیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو والدہ خود چارپائی سے اٹھیں۔ بیگم اور ممانی نے سہارا ضرور دیا۔ مگر وہ غسلخانے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے صابن مل کر نہائیں۔ نہانے کے بعد پیدل چل کر واپس آئیں اور بیگم سے کہا "میرے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر دو۔"

جب یہ سارے کام ہو گئے تو ہلکی سی آواز میں ہوں ہوں کرنے لگیں۔

طفیل صاحب نے پوچھا "اماں کیا بات ہے؟"

"بیٹا تیرا میرا یہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میں پرایا مال ہوں۔"

اس کے بعد ایک منٹ خاموش رہیں۔ پھر اونچی آواز سے پڑھا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اس کے بعد وہ پھر کچھ نہ بولیں۔ حالانکہ سب بلاتے ہی رہے۔

موت اور اس کا اتنا خندہ پیشانی سے استقبال، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ——— والدہ کے انتقال سے طفیل صاحب بجھ کے رہ گئے ہیں۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچتے ہوں کہ دنیا کے یہ سارے بکھیڑے کتنے عارضی اور کتنے بے حقیقت ہیں۔

اگر آپ کی ان سے بے تکلفی ہے تو یہ کافی حد تک شگفتہ ثابت ہوں گے۔ تکلف کے تعلقات ہیں تو یہ آپ کی ننا بور کریں گے ہی دونوں چیزیں۔ اگر مخاطب بھی کم گو اور بے تکلف نہ ہو تو پھر لطف ہی آ جائے گا۔ مجاز لکھنوی اور طفیل لاہوری کے مابین ایک بار بڑے مزے کی باتیں ہوئی تھیں اور یہ گفتگو کوئی پون گھنٹہ کے عرصہ میں ہوئی ہو گی۔ آپ پہلے بھی شاید ایک بار پڑھ چکے ہوں۔ ایک بار اور سہی! ابتدا طفیل صاحب کرتے ہیں:

"خیریت؟"

"جی ہاں!"

"چپ چپ کیوں ہیں؟"

"یونہی"

(کافی دیر سکوت کے بعد) "ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟"

"جی ہاں!"

"آپ بولتے کیوں نہیں۔ کیا بات ہے؟"

"یونہی"

"اچھا"

"جی ہاں"

(پھر کافی دیر سکوت کے بعد) "لکھنؤ دیکھا؟"

"کچھ کچھ"

"کافی کیسی ہے؟"

"کڑوی"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتائیے۔ اس رفتار سے آپ والناس تک کب پہنچیں گے؟"

انھیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں، جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انھیں مدیر نقوش بنا دیا تھا۔ ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت! ہمفہ!!

یہ غلط فہمی انھیں یوں بھی ہوئی کہ تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے، ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے۔ ان میں سے کوئی دوست تھا تو کوئی بھائی، ان کے مدیر ہونے کے فوراً بعد بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن، الحمد للہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں۔ سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔

اس میں ان کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔ اوّل تو انھیں مدیر ہی نہیں بننا چاہئے تھا۔ اگر بن بیٹھے تھے تو انھیں دوستانہ حقوق کا احترام کرنا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر، ان کا کوئی دوست اسمبلی دو میل سے چل کر آتا ہے اور یہ بھی خبر کی دھن میں غرق، دوست پوچھتا ہے "طفیل صاحب خیریت ہے؟"

"یار کرشن چندر نے افسانہ نہیں بھیجا"

"اوہو!"

"جی ہاں!"

"بھابی اور بچے تو اچھے ہیں؟"

"امید ہے کل تک ضرور آجائے گا۔ مجھے کرشن نے خط لکھا تھا۔ افسانہ لکھ لیا ہے۔ صاف کر کے دو روز تک بھیجوں گا"

"بھائی! میں پوچھ رہا ہوں۔ بھابی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟"

"معاف کرنا بھائی! مجھے ان کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک ہفتہ سے گھر بارہ بجے سے پہلے نہیں جا سکا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کے چلا آتا ہوں تاکہ پرچہ جلد آجائے۔ ہاں بھئی کچھ ضرور ہے کہ جاوید کو بخار آرہا ہے۔"

"اور ہوا کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"پرچہ چھپ جائے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔" پھر ایکدم کاتب صاحب سے مخاطب ہو کر "بھئی کتابت کتنی ختم ہوئی؟"

وہ دوست، جو بیچارا مارے خلوص کے چل کے آیا تھا۔ وہ ان کے پاس آکر ان کے نقوش خوبیاں سے پریشان ہو جاتا ہے۔ بیچارہ بیس منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتا ہے شاید یہ اب بھی آدمی کے جائے میں آجائیں اور کوئی ڈھنگ سے بات کریں۔ یہ اپنی دھن میں مست، نمبر ہی کی "تجہیز و تکفین" کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ بالآخر خلوص کی زد میں آیا ہوا دوست، ان کی یہ حالت دیکھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تب یہ چونکتے ہیں اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ، اُس کا بازو پکڑ کر کہتے ہیں "یار چائے تو پی لو۔"

"میں اتنی دُور سے آپ کے پاس صرف چائے پینے آیا تھا؟"

تب انھیں اپنی نالائقی، مردم بیزاری اور دوست کشی کا احساس ہوتا ہے۔ دوست سے معافی مانگتے ہیں۔ اسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ مگر وہ جو دوست کے خلوص کو ٹھیس لگتی ہے۔ اُس کا ان کے پاس کوئی مداوا نہیں ہوتا۔ دوستوں کو ناراض کیا۔ بھائی مروتاً دوستی تک بھی آئے۔ خوش اتنے انہماک کے بعد انھوں نے جو نمبر مرتب کئے۔ ان کے بارے میں لکھنؤ سے ایک خط آتا ہے:۔

"آپ نے شخصیات نمبر میں ہر ایرے غیرے کو شامل کیا ہے۔ مگر مجھ پر مضمون نہ چھاپا۔ اب آپ سے کون دوستی رکھے؟"

ایک اور خط بمبئی سے آتا ہے:

"آپ بھی عجیب چیز ثابت ہوئے۔ افسانہ نمبر میں جو آپ نے میرا افسانہ لیا ہے۔ وہ میرا سب سے گھٹیا افسانہ تھا۔ آخر آپ نے یہ مجھ سے کس وقت کا انتقام لیا ہے؟"

کراچی سے ایک شاعر نے زبانی پیغام بھیجا:۔

"آپ نے غزل نمبر میں فیض کی تو چھ غزلیں چھاپی ہیں اور میری صرف ایک۔ کیا میں فیض سے گھٹیا شاعر ہوں۔ اگر آپ کو شاعری کی الف بے کا پتہ نہیں تو کسی سے پوچھ لیا ہوتا۔"

لاہور والے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ وہ شخصیات نمبر میں بھی نہیں آئے تھے۔ افسانہ بھی اُن کا گھٹیا شامل ہو گیا تھا۔ غزل نمبر میں بھی کسی کی ایک غزل آئی تھی اور کسی کی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ منچلوں نے چائے کی میز پر بیٹھ کر یہ پروگرام بنایا کہ ہم سب نقوش کے دفتر چلتے ہیں۔ ایک نے کہا۔ میں طفیل کا گریبان پکڑوں گا۔ دوسرے نے کہا۔ میں گھونسہ ماروں گا۔ تیسرے نے کہا۔ میں مصلحتاً بیچ بچاؤ کراؤں گا۔ مگر تم اپنا کام کرتے جانا۔

خیر یہاں تک تو غنیمت تھا۔ کوئی انھیں گالی دے لے تو دے لے۔ کوئی تھپڑ مار کر خوش ہوئے تو ہوئے۔ مگر ایک دن ایسا ہوا کہ لاہور سے کراچی جاتے ہوئے اخبار نویسوں نے یہ پروگرام بنایا کہ واپسی پر مدیر نقوش کی خبر لی جائے۔ بلیاد سجاد ظہیر کے

افسانے کو بنایا۔ جسے طفیل صاحب نے پہلے ہی کانٹ چھانٹ کے عمل سے کافی بے ضرر بنا دیا تھا۔ (مگر یہ اس کا اقرار پھر بھی کرتے ہیں کہ اُس صورت میں بھی اُس میں قابلِ اعتراض باتیں تھیں) میرا عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اس سے مدیر نقوش کی نیت کا تو اندازہ ہو ہی سکتا تھا۔ جبکہ اسی قسم کا ایک نوٹ افسانے کی ابتدا میں بھی موجود تھا۔

قباحت یہ تھی کہ طفیل صاحب کے نزدیک اُس افسانے کی شمولیت یوں ضروری تھی کہ وہ افسانہ قہر کی صورت میں، ایک طرح کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ اُس دور کے اس انداز کے افسانے بھی آئیں۔ جب مذہب سے بیزاری، خدا اور رسولؐ کا تمسخر (نعوذ باللہ) اور انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا ——— اور اسی غلط روش کو دکھانے کے لیے طفیل صاحب نے اس افسانے کی شمولیت ضروری سمجھی تھی۔

چنانچہ ایک دم طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مخالفت میں بھی، موافقت میں بھی، مخالفت زیادہ تھی، موافقت کم، حالانکہ بعض لوگ کہتے ہی رہے کہ طفیل کی نیت کی طرف بھی دیکھو۔ اُس کا ہرگز یہ مقصد نہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ مگر صاحب کون سنتا تھا۔ بڑا ہمہ ہلاں جنجال بن گیا تھا۔ مسجدوں میں مدیر نقوش کو ملعون کیا گیا۔ مرچی دروازے کے باہر جلسہ ہوا۔ پکٹنگ کے پروگرام بنے۔ کسی نے سوچا دفتر کو آگ لگا دی جائے۔ کسی نے سوچا جان سے مار دیا جائے ——— اور یہ سارا ہنگامہ اُس جانِ ناتواں کے بارے میں تھا۔ جس نے کبھی سراٹھا کے نہیں دیکھا کہ یہ لکڑی کس طرف سے آئی ہے۔

مدیر نقوش کو جب اپنی موت سامنے نظر آئی تو انھوں نے خدا سے التجا کی ——— تُو تو علیمٌ بذات الصدور ہے۔ میرے بھی سینے کے بھیدوں کو جانتا ہے اور میرے مخالفوں کے بھی ——— ہر دوستوں نے سمجھایا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ تو اخباروں میں لوگوں سے معافی مانگ لے اور اس افسانے ہی کو حذف کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس دنیا میں ان کی گستاخی کا یوں فیصلہ ہوا۔ اب انھیں آخرت کے فیصلے کا انتظار ہے۔ ممکن ہے وہ اس سے مختلف ہو۔

انھوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو ——— ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے۔ جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا ہے۔ جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل ہیچ جانا ہے۔

دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے۔ جب یہ کرسیٔ ادارت پر ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے۔ اُس وقت انھیں بڑے سے بڑے علامہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اسی خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں۔ جس کی افسانہ نگاری میں دھوم ہو۔ نقاد اُسے صفِ اول کا افسانہ نگار مانیں۔ اس کے افسانے کو اگر مدیر نقوش ناقابلِ اشاعت قرار دے دے تو کیا وہ ان سے خوش ہوگا۔ وہ تو یہی کہے گا نا کہ جاہل ہے یہ۔

جس شاعر کی نظم یا غزل دس ہزار کے مجمع میں پڑھی گئی ہو اور اسے سامعین نے دل کھول کر داد بھی دی ہو۔ وہ بھی اگر مدیر نقوش کی نظر میں نہ جچے تو پھر شاعر بے چارا ان کی شاعرانہ سوجھ بوجھ پہ ناحق پڑھے یا نہ پڑھے۔

جس نقاد نے تمام مغربی نقادوں کو پڑھا ہو (اور اتفاق سے اپنے ان کے تنقیدی سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو) اور ان کے حوالے پر حوالے دے کر مضمون کو بھاری بھرکم بنا دیا ہو۔ وہ مضمون بھی اگر نقوش میں نہ چھپے تو پھر آپ ہی بتائیں مدیر نقوش کی عقل کا ماتم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے!۔

ایک نقاد نے (اب ان کا نام کیا لوں) انہیں ایک مضمون بھیجا۔ اچھے خاصے بڑے نام والے نقاد تھے۔ جب وہ مضمون پڑھا تو انہیں نہ جچا۔ جناب نقاد کو بڑے احترام کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ مضمون نقوش میں نہ چھپ سکے گا اور اس میں فلاں فلاں نقص ہیں۔

وہ صاحب بڑے برہم ہوئے۔ پہلے تو وہ نقوش اور مدیر نقوش کی تعریفیں کرتے تھکا کرتے تھے۔ پھر یکدم معصوم قسم کی گالیوں پر اتر آئے۔ مثلاً نالائق اور بدتمیز قسم کے الفاظ بے دریغ استعمال کر ڈالے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو۔ بعد میں وہ مضمون "نگار" جیسے بڑے پرچے میں چھپ گیا۔ تب تو وہ صاحب اور چڑھے۔ ایک اور خط لکھا جس میں شروع سنایا گیا تھا کہ وہ مضمون نیاز فتحپوری جیسے علامہ نے تو پسند فرمایا ہے۔ مگر جناب جیسے "پڑھے لکھے" نے واپس کر دیا تھا —— یہ واقعہ اپنی جگہ ضرور صحیح ہے۔ مگر طفیل صاحب کا آج بھی دیانتداری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ نیاز صاحب لاکھ علامہ سہی میرے ذہنی گرو سہی، نگار اردو کا عظیم الشان پرچہ سہی۔ مگر وہ مضمون نقوش میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔

انھیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا۔ بلا مبالغہ انھوں نے اپنے ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں۔ جن دنوں کوئی خاص نمبر زیر ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پر کھانا کھانا۔ نہ سونا، دن رات کام۔ صبح کے جتنے جتنے اگر رات کے بارہ ایک یا دو تین بج گئے ہیں تو بھی انھیں کچھ پروا نہیں۔ جلد لگن ہیں۔ مست ہیں۔

ایک بار یہ ہوا کہ یہ اپنے دفتر سے رات کے بارہ بجے لوٹے۔ بیگم سے کہا۔ کھانا لاؤ۔ وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ کھانا گرم کر کے لائی۔ دیکھا تو یہ پھر نقوش کے عشق میں غرق اکا پیاں پڑھ رہے ہیں۔

بیگم نے شوہر کو اپنے سہاگ کا واسطہ دے کر کہا "خدا کے لیے کام کو بند کر دیجئے۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھا لیجئے۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟"

یہ اُسے منت سماجت سے کہتے ہیں "خدا کے لیے چپ رہو۔ لوگوں کو نہ جگاؤ۔ میرے منہ میں نوالے ڈالتی جاؤ تاکہ کھانا بھی ہو جائے اور کام بھی، یوں کھانا کھایا۔ رات کے تین بجے سوئے۔ مگر بیگم کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی صبح سات بجے جگا دینا۔

بیگم کے لیے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اُس نے سات بجے جگا دیا۔ اب ان سے اٹھا نہیں جاتا۔ آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ایک دن کی جگائی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ یہاں تو روز کا قصہ تھا۔ بیگم برہمی اور طنز سے کہتی ہیں "اب اٹھئے کیوں نہیں۔ رسالہ لیٹ ہوا جا رہا ہے۔" یہ کہتے ہیں "اٹھنا تو چاہتا ہوں مگر آنکھیں نہیں کھلتیں۔"

پھر طفیل صاحب پکار کے بیگم سے کہتے ہیں "میرے قریب آؤ۔ میرے پپوٹوں کو زور سے اوپر کو اٹھاؤ تاکہ میری آنکھیں

کھلیں اور جن اُٹھ سکوں۔

ممکن ہے کوئی صاحب اسے زیبِ داستان ہی کہیں۔ مگر ہے یہ واقعہ۔ اب یوں کبھی کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اب تو ان کی زندگی یونہی گزر رہی ہے۔ یونہی گزر جائے گی۔ زندگی کی لطافتیں اور مسرتیں انھیں بہ آوازِ بلند پکارتی رہتی ہیں۔ مگر یہ ان سب سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جیسے بالکل مُردہ ہوں۔

قیافہ شناسی میں بھی یہ بڑے ماہر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں صورت دیکھ کر ہر کسی کے کیریکٹر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ ایک بار یہ اور ان کے ایک اخبار نویس دوست، تانگے پر سوار، نظم دیکھنے جا رہے تھے۔ معاً ایک تانگہ پاس سے گزرا۔ اُس میں نقاب لگائے، ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ چاندسی صورت۔ اُس پر بھی میک اپ۔ ان کے اخبار نویس دوست نے، اُسے دیکھتے ہی انھیں ٹھوکا دیا۔

یہ بھی متوجہ ہوئے اور فتویٰ دے دیا "یہ لڑکی آوارہ ہے"

"ارے نہیں"

"شرط لگا لو"

"جو کہو"

اب ان کے لیے یہ ثابت کرنا کہ یہ لڑکی آوارہ ہے بڑا دشوار تھا۔ آج کل آوارہ لڑکیاں کہاں آوارہ دکھتی ہیں۔ اِدھر ان کے دوست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ لڑکی قطعاً آوارہ نہیں ہے۔ اب یہ کرتے تو کیا کرتے۔

انھوں نے تانگے والے سے کہا "میاں کوچوان! ذرا اپنے گھوڑے کو دوڑاؤ اور اُس تانگے کے برابر برابر چلو"

کوچوان نے ان کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مگر زبان سے یہ کہا "بہت اچھا سرکار"

اب ان کا تانگہ، اس تانگے کے برابر برابر چل رہا ہے۔ لڑکی نے بھی اس بات کو تاڑ لیا۔ انھوں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو آوارہ ثابت نہیں کیا تھا۔ اس لیے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے انھوں نے لڑکی کی طرف، تین چار منٹ ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔

لڑکی نے بھی پہلو بدلا اور اپنی ران سے ہاتھ اٹھا کر بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔

اب تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دوست کے چٹکی لی اور اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھایا۔ دیکھا بچو ہم نہ کہتے تھے۔

تانگہ میکلوڈ روڈ پر پہنچ گیا۔ جہاں کا تانگے والے سے طے کر کے آئے تھے۔ تانگے والے نے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اسے کہا۔ فکر نہ کرو تانگہ اُدھر لے چلو۔ جدھر وہ تانگہ جا رہا ہے۔ منہ مانگے دام ملیں گے۔

"بہت اچھا سرکار، پر یہ کام بڑا ٹیڑھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی تھانے کی ہوا کھاؤں"

"بھئی جو خدا کو منظور!"

"خدا کو کیا منظور ہوگا۔ اس تفتے کو چھوڑیئے۔ وہ تو ہے ہی بدمعاش، دیکھا ابھی سلام کر رہی تھی"

کوچوان کے ان ریمارکس پر انھوں نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے انھوں نے مونٹ ایورسٹ فتح کر لی ہو۔

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ان کا تانگہ اس تانگے کے ساتھ چلتا رہا۔ یہ دل میں سوچتے بھی تھے کہ ہٹاؤ اس قصے کو، آخر کیا فائدہ، مگر زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ تانگے برابر چلتے رہے۔ وہ لڑکی بھی ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی اور یہ بھی، کبھی وہ اپنے پریشان بالوں کو سنبھالتی، کبھی یہ مسکراتے، کبھی وہ ذرا سی تن کے بیٹھ جاتی، کبھی یہ ہاتھ سے بالوں کو سنوارتے، کبھی وہ مسکراتی، کبھی یہ سہم جاتے۔ غرض انہی بوالعجبیوں میں، اُس کا تانگہ ایک جگہ رک گیا اور ان کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔

کوچوان نے پوچھا۔ "روکوں بابو جی تانگے کو؟"

"نہیں"

"پھر"

"سرپٹ دوڑاؤ"

گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہا۔ مگر یہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا یا یہ۔

کھیلوں میں بھی یہ کئی بازیوں سے حد درجہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اتنی دلچسپی کہ اللہ دے اور بندہ لے ——— کیرم بورڈ اور تاش میں اتنے گم نہیں ہیں۔ جتنے پتنگ بازی اور کرکٹ میں۔

کوئی پندرہ سال بعد پچھلے برس انھیں پتنگ بازی کا پھر سے ابال آیا۔ گھر میں اعلان کر دیا۔ اب کے بسنت پر پتنگیں بڑھیں گی ——— بچے، بڑے سب حیران، یونہی ہانک دی ہے۔ اب اس عمر میں بچوں والا مشغلہ کیا اختیار کریں گے۔ مگر بسنت سے ایک دن پہلے چھ چھ "گوٹوں کے دو پتے" منگوائے گئے۔ درجنوں چھوٹی بڑی پتنگیں ساتھ آئیں۔ رات بھر کنے باندھتے رہے۔ جس وقت مؤذن نے اذان دی۔ انھوں نے منڈیر پر چڑھ کے دیکھا، تو اس وقت کوئی بھی جیالا پتنگ بڑھاتے ہوئے نہ تھا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ پتنگ بڑھے تو کیسے بڑھے۔ البتہ کہیں کہیں چھتوں پر، ایک ایک دو دو من چلے، کھڑے محسوس تو ہوئے۔ مگر نظر نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے "وہ کاٹا" کا زوردار نعرہ لگایا اور اپنی پتنگ بڑھا دی۔ اوروں کے بھی حوصلے بڑھے۔ انھوں نے بھی جواباً وہ کاٹا کا نعرہ لگایا۔ پھر کیا تھا آناً فاناً حریف پیدا کر لیے۔

قسمت کے دھنی یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ہوا بھی خوب تیز تھی۔ انھوں نے جس سے پیچ لڑایا۔ کاٹا، جب حریفوں نے دیکھا کہ یہ تو صفایا کر رہے ہیں تو تین تین چار چار اکٹھے حملہ آور ہوئے۔ اس میں بھی زیادہ تر میدان انہی کے ہاتھ رہا۔ آس پاس کے محلوں میں دھاک بیٹھ گئی۔ بفضل خدا یہ اب اپنے علاقہ میں، دوسرے سال سے، پتنگ بازی میں چیمپئن چلے آ رہے ہیں۔

انھیں لمبے پیچ لڑانے میں مزا آتا ہے۔ "کچم کچی" کو یہ قطعاً پسند نہیں کرتے کہتے ہیں دشمن کو اپنے جوہر دکھانے کے پورے موقعے دینا چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے اتنے لمبے پیچ جاتے تھے کہ پتنگ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ لڈو کے برابر نظر بھی آئی تو کیا۔

ایک لمبے پیچ میں، ان کے ہاتھ ڈور کی مسلسل رگڑ سے لہولہان ہو گئے۔ سبھی کہتے رہے کہ پتنگ ہمیں دے دیجئے۔ ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ برابر اُف اُف سی سی کرتے ڈور دیتے رہے۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کی جد و جہد کے بعد

جب انھوں نے بیچ کا تا تب انھوں نے پلنگ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کی۔ بڑھی ہوئی پلنگ کو جب اتارا جا رہا تھا تو وہ ان کے خون سے نہائی ہوئی تھی۔

کرکٹ کا بھی شوق انھیں پرانا ہے۔ لاہور سے باہر میچ ہو رہے ہوں تو یہ اپنے دفتر کی میں ریڈیو لے جائیں گے۔ جب تک میچ ہوتا رہے گا۔ برابر کمنٹری سنتے رہیں گے۔ ہزاروں کام ہوں، کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی ملنے والا بھی آئے تو بات ہی نہیں کریں گے۔ باتیں ہوں گی بھی تو کرکٹ ہی کے بارے میں۔

سبھی قابل ذکر میچ انھوں نے یا تو دیکھے ہوں گے یا سنے ہوں گے۔ ابھی پاکستان میں آسٹریلیا کے میچ ہوئے ہیں۔ یہ ریڈیو سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ ہٹے۔ کوئی اچھی ہٹ لگائے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ کوئی اچھا گیند پھینکے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سیٹیاں بھی بجاتے تھے۔ ناچنے سے انھیں ان کی پوزیشن روکتی تھی۔ ورنہ یہ بیقرار اس کے لیے تھے۔

یوں بھی ہوا ہے کہ کمنٹری سنتے سنتے ایکدم بے حد خوش ہو گئے۔ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگ گئے۔ پوری قوت سے تالیاں پیٹنے لگے۔ پھر نوکر کو آواز دی۔ جلدی سے پانچ روپے کے لڈو لا ——— وجہ پوچھی گئی تو بتایا پاکستان آؤٹ ہو گیا ہے۔

ان کی صحت یوں تو کبھی زیادہ اچھی نہیں رہی۔ چھوٹے موٹے بیسیوں عارضے لاحق رہے۔ مگر یہ بھلا بھلا قسم کے بیمار بہت ہی کم ہوئے۔ مگر صاحب ایک بار ہوئے، خوب ہوئے۔ مزا آگیا۔ یہ قصہ ۱۹۴۳ء کا ہے کہ بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئے۔ سو کے اٹھے طبیعت مضمحل پائی۔ چہل قدمی کو نکلے۔ گھر تک واپس پہنچنا مشکل ہو گیا۔ لیٹے تو پھر لیٹے ہی رہ گئے۔

بہتیرے دوا دارو اور ٹونے ٹوٹکے ہوئے۔ مگر صحت نہ سنبھلی۔ بگڑتی ہی گئی۔ معالج دواؤں سے دعاؤں تک پہنچا۔ مگر دونوں ہی علاج بیکار ثابت ہوئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دے دیا۔ جب یہ خوشخبری عام ہوئی کہ جناب طفیل اب ایک دو دن کے مہمان ہیں تو ان کے قریبی دوست آخری دیدار کو آن پہنچے۔

"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، اب آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔"

"بخار ہلکا ہو گیا ہے۔"

"انشاء اللہ کل تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

طفیل صاحب یہ ساری باتیں سنتے رہے۔ بولنے تک کی ہمت نہ تھی۔ نقاہت اتنی تھی کہ اگر منہ پر مکھی بیٹھ جاتی تھی تو ہاتھ اٹھا کر اسے ہٹانے تک کی ہمت نہ تھی۔ بس ہڈیوں کا ایک پنجر تھا۔ جو چارپائی پر پڑا تھا۔ یہ اپنے دوستوں کو ان کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے۔ مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ اپنی اس حد تک معذوری پر ان کے آنسو نکل آئے۔ دوستوں نے آنسو پونچھے تو انھوں نے سنائی نہ دینے والی آواز میں دوستوں کی باتوں کا جو جواب دیا یہ تھا:۔

"ڈاکٹروں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ جو آپ حضرات کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر میں ضرور صحت یاب ہوں گا۔ آج نہیں تو کل، میرا بھی فیصلہ ڈاکٹروں کو سنا دینا۔

غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، یہ موت کے منہ سے بھی نکل آئے۔ قوتِ ارادی کے استحکام ہی نے انھیں زندگی میں آبرومند بنایا ہے۔ ان کے پاس اگر کوئی دولت ہے تو یہی۔ اگر انھیں اپنی کسی حرکت پر ناز ہے تو اسی پر۔

جب موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ تو یہ خدا سے من ہی من میں جو باتیں کرتے تھے۔ وہ کچھ اس قسم کی تھیں:۔

"اے اللہ میں تجھ سے درگذر کی التجا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے زندگی عزیز ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میری امنگوں اور آرزوؤں کا خون ہوا جا رہا ہے۔ میں اس دنیا میں آکر کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی گذارنا نہیں چاہتا تھا۔ تو مجھے اتنی مہلت دے کہ میں اپنے ارمانوں کو پورا کر سکوں۔ میں اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے لیے زندگی چاہتا ہوں ——— میری موت آج نہیں تو کل واقع ہو جائے گی۔ مگر تو مجھے ان ولولوں اور ارادوں کی تکمیل کے لیے زندہ رکھ۔ جنھوں نے میرے ذہن سے نکل کر ابھی تک زندگی کی ایک ساعت بھی نہیں گذاری۔"

کئی دنوں کی بات ہے کہ یو۔ پی کے ایک صاحب ان کے پاس آئے۔ انھوں نے انھیں بھی یو۔ پی کا سمجھ لیا اور لگے پنجابیوں کی برائیاں کرنے۔ "پنجابی یہ ہوتے ہیں۔ پنجابی وہ ہوتے ہیں۔ میری ترقیوں میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ مجھے ستاتے ہیں۔ یہ چپکے سنتے ہیں۔ جب انھوں نے کہا۔ پنجابی بڑے حرامزادے ہوتے ہیں تو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا: "صاحب کے لیے چائے لاؤ۔"

چائے کا سن کر یو۔ پی والے صاحب سمجھے ہوں گے۔ یہ بھی پنجابیوں کے ہاتھوں ستا ہوا ہے۔ وہ اور چڑھے۔ پھر تو وہ ماں بہن کی گالیوں تک آگئے۔ طفیل صاحب نے دوسرے نوکر سے کہا: "صاحب کے لیے مٹھائی کا بھی انتظام کرو۔"

چائے آئی۔ مٹھائی آئی۔ دونوں نے خوب کھائی اور پی۔ ہنستے بھی رہے۔ پیار سے باتیں بھی کرتے رہے۔ جب وہ صاحب جانے لگے تو انھوں نے ان سے پوچھا: "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"یہ پوچھ کر کیا کیجیے گا؟"

"نہیں بتائیے!"

"جانے دیجیے۔"

"آپ کو میری قسم!"

"میں پنجابی ہوں۔"

یہ شکل و صورت کے اعتبار سے بس لونڈے سے ہیں۔ مدیر نقوش ہونے کا مطلب تو یہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد جیسا جبہ پہنا کرتے۔ سر پر ایسی داڑھی ہوتی۔ ابوالکلام جیسا رعب و دبدبہ ہوتا۔ برعکس اس کے یہ سیدھے سادے آدمی کا بچہ ہیں۔ نہ رعب نہ کچھ۔ ان کی شکل و صورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے۔ ایک لطیفہ آپ بھی سن لیں:۔

ان کے چھوٹے موٹے کام تعارفی رقعوں سے ہو جایا کرتے ہیں۔ جو کام ہوا۔ جس سے ہوا۔ تعارف ہو یا نہ ہو۔ لکھ کر کہہ دیا۔ ہو گیا۔ لوگ عزت کرتے ہیں۔ لحاظ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ اپنے ایک کام کے لیے، خود ایک دفتر میں جا نکلے۔ چق اٹھا کر صاحب سے ملے اور بغیر تعارف کے ملے۔ وہ نہایت

ڈکھائی سے پیش آئے۔ یہ اپنا تعارف ہی نہیں کرا پائے تھے کہ وہ صاحب برسے "کیا بات ہے؟"

"جی! مجھے آپ سے ایک کام ہے؟"

"کیا کام ہے؟"

"جی وہ ذرا ——"

"آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے، میرے ہیڈ کلرک سے ملئے۔ پرنٹنڈنٹ سے ملئے۔ میرے اسسٹنٹ سے ملئے۔ سیدھا منہ اٹھاتے ہیں اور میرے پاس چلے آتے ہیں۔ چپڑاسی! ان صاحب کو کس نے اندر آنے دیا؟"

"جی غلطی ہو گئی۔"

"خبردار جو آئندہ کوئی یوں اندر آیا۔"

"بہتر جناب!"

ڈرائے کا یہ سین ان کے سامنے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ سٹ پٹا گئے۔ گردن اٹھائے اپنے دفتر پہنچے۔ ٹیلیفون اٹھا کر انہی صاحب سے بات کی۔

"میں نقوش کے دفتر سے عقیل بول رہا ہوں۔"

"کیجئے حضور مزاج تو اچھے ہیں؟"

"جی ہاں اللہ کا شکر ہے۔"

"فرمائیے آج کیسے بھول گئے۔ مدت کے بعد یاد فرمایا۔ کوئی میرے لائق خدمت؟"

"یہ ایک ذرا سا کام ہے؟"

"آپ اپنے چپڑاسی کو چٹ دے کر بھیج دیں۔ ابھی ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا چپڑاسی کو بھیج رہا ہوں۔"

"دیکھئے کبھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نکلنی چاہئے۔"

"جی!"

"میں کہتا ہوں کبھی دفتر آئیے نا!"

"آ آ —— اچھا —— اچھا ——!!"

ان کی زندگی کے ایک دو خوش کن واقعات یہ ہیں جن پر انہیں آج بھی خوشی ہوتی ہے۔

ابھی یہ اپنے کاروبار کی ابتدائی اسٹیج پر تھے۔ چند ٹکے بھی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھے۔ ان دنوں انھوں نے ایک دکان سے آرٹ پیپر کا ایک ریم خریدا۔ ایک مزدور کے سر پہ اٹھوایا۔ دو آنے کی اجرت مقرر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بازار کیچڑ سے لت پت تھا۔ آرٹ پیپر بڑا پھسلواں ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مزدور سے بار بار کہتے تھے۔ دیکھو بھئی احتیاط سے چلو۔ کاغذ کو مضبوطی

سے پکڑو۔ گر گیا تو پچاس روپے کا ریم تباہ ہو جائے گا۔ یہ فقرہ انھوں نے ایک بار نہیں۔ تین چار بار دہرایا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ ریم سر سے پھسل کر زمین پر گر ہی گیا اور کیچڑ میں نہا گیا۔ مزدور کانپنے لگا۔ یہ چپ رہے۔ مزدور نے کاغذ سمیٹا۔ ساتھ چل دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے کاغذ ایک کونے میں رکھ دیا اور خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے جیب سے چار اکنیاں نکالیں اور مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

مزدور شرمندہ ہو کر بولا۔ "آپ سے دو آنے طے ہوئے تھے۔"

دو آنے اُس صورت میں تھے۔ جب تم کاغذ کو صحیح سالم لے آتے۔

"جی!"

"اب تم چونی کے حقدار ہو۔"

ابھی پانچ چھ ماہ کی بات ہے کہ یہ سائیکل پر سوار صبح سویرے ہی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے کہ ہمیل ہال کے پاس انھیں ایک اپاہج لڑکا ملا۔ جو چلنے سے بالکل ہی معذور تھا۔ اُس نے التجا کے انداز میں، ان سے کہا "مجھے سائیکل پر بٹھا کر گنگا رام اسپتال تک لے جائیں۔ انھیں جلدی تھی۔ گذر گئے۔ مگر لڑکے کی خواہش ان کا برابر تعاقب کرتی رہی۔ یہ قبرستان کے قریب پہنچ گئے ہوں گے۔ مگر لڑکے کی بات ذہن سے نہیں اُتری تھی۔ ذہن سے اُترنی تو کجا، پریشانی بڑھنے لگی۔ چنانچہ یہ اُلٹے پاؤں پلٹے۔ لڑکے کو سائیکل پر بٹھایا۔ خود پیدل چل کر اسے اسپتال تک پہنچایا۔ لڑکا کہتا رہا۔ سائیکل پر سوار ہو جائیں، آپ کو جلدی ہو گی۔ یہ جواب دیتے۔ نہیں پیدل چلنے میں لطف آ رہا ہے۔

جب لڑکا منزل مقصود پر پہنچ گیا تو انھوں نے اس سے معافی مانگی۔ میں جلدی میں تھا۔ اس لیے اپنے فرض سے غافل ہو گیا تھا۔

ایسی ہی "بیوقوفی" کی ایک بات اور بھی سن لیں۔ ایک دن یہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر اس لیے آ کر بیٹھے کہ ایک ضروری کام کو نپٹا لیا جائے۔ خوب گرمیوں کے دن تھے۔ پنکھا کھولا۔ کاغذ، قلم، دوات لے کر بیٹھے۔ خوب موڈ میں تھے۔ اتنے میں ٹھک سے پنکھے کے ساتھ کوئی چیز لگی۔ یہ اٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ایک چڑیا پنکھے سے ٹکر کھا کر گری پڑی ہے۔ فوراً لپکے۔ چڑیا کو اٹھایا۔ جو اوندھی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں کی گرم آغوش میں لیا اور پانی پانی کا وہ شور مچایا، جیسے پانی کے بغیر یہ خود ہی مرے جا رہے ہوں۔ چڑیا نے پانی پیا تو وہ "سُرکنے" لگی۔ مگر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ جان سے تو نہ گئی۔ مگر دائمی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اسے ایک اونچی جگہ پر بٹھا دیا۔ مگر خود سارا دن کوئی کام نہ کر سکے۔ وہ ضروری کام بھی ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔

یہ گویا بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں۔ بعض اوقات یونہی اکڑ بھی جاتے ہیں۔ یہ سچ یا اس وقت ہوتے ہیں۔ جب ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ ورنہ بڑی سے بڑی بات ہوئی اور گئی۔

پطرس بخاری کے سلسلے میں، انھوں نے کئی ایک لکھنے والوں کو خط لکھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ ٹیلیفون کے انجکشن لگانے والے ڈاکٹر نہیں۔ اور ایسے ڈاکٹر، بڑا رعب اور طنطنہ ہے ان کا۔ سبھی ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو بھی آئے۔ کہتے رہتے ہیں۔ کوئی بولتا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے طفیل صاحب کے خط کے جواب میں لکھا:۔

جمیل صاحب قبلہ!

"یہ آپ نے مرے ہوئے آدمیوں کو بیچنے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ نہ بھائی یہ بات ابھی نہیں سمجھ میں آتی ہے۔ جیسے آپ لوگ (یعنی اردو کے ساتویں والے) اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور اس کا نمبر نکالیں۔ خواہ جیتے جی اس کی طرف مڑ کے بھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بخاری میرا دوست تھا اور میں اس کے لیے بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی اس موڈ میں نہیں ہوں اور کم از کم مُردہ نمبر کے لیے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ مردہ نمبروں نے مجھے اس قدر حراساں کیا ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہوا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو میرا مردہ نمبر شائع نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ مجھے اب یہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ کوئی منافع خور ضرور میرے "نام زندہ" کو "مردہ فروشی" کے بہانے بیچ کر پیسے بنائے گا اور مجھے یہ ضد ہے کہ "اردو کی خدمت کرنے والے" یہ کام نہ کریں۔"

جس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ملا تو انھوں نے اپنے اوپر بتراشیں بھیجیں کہ اور نکال شخصی نوعیت کے نمبر یہ اپنی قلم سے اپنی عقیدت کے اظہار میں نمبر نکالتے ہیں۔ لوگ اسے منافع خوری کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی چیتے کی طرح ان پر جوابی حملہ کیا:-

برادرم، اسلام مسنون!

"آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا تو شاید میں چپ ہو جاتا۔ مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ نمبر نہیں نکالے گا بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہوا کہ مرا۔ البتہ ہمارے گھر والے ہمیں روئیں گے اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا مفاد وابستہ ہوگا ——— میری یہ بات شاید اب دل لگی کا درجہ رکھے مگر مجھے اس کے سچ ہونے پر سو فیصد یقین ہے۔ کسی کے لیے آپ رو رہے ہیں، کسی کے لیے میں۔ امید ہے البتہ الگ الگ ہیں۔

"مردہ نمبر" کی ترکیب مجھے پسند آئی۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ حفیظ جالندھری کی طرح زندگی ہی میں ہر اہم شخصیت کا جلوس نکال دیا جائے۔ اگر کسی کا جلوس اس کی زندگی میں نہ نکلے تو پھر بعد میں بھی نہ نکلے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اگر کوئی ادیب اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اسے خراج عقیدت

پیش کریں۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں رسائل نمبر نکالیں۔

دیکھئے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آڑ لے کر ابھرے۔ بلکہ اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ وہ اگر پطرس نمبر نہیں نکالے گا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے منٹو نمبر نکالا تھا اور یہ سمجھ کے نکالا تھا کہ منٹو ایک بڑا تیکھا آرٹسٹ تھا۔ اسے خراج عقیدت پیش کرنا چاہئے۔ مگر اس پر بعض مستعلی قسم کے لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا۔ پھر اس کا دوسرا پہلو بھی لیجئے۔ منٹو نمبر کا پہلا ایڈیشن آج بھی بازار میں ملتا ہے مگر میرے دوسرے نمبروں کے تین تین چار چار ایڈیشن چھپے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث نہیں ہیں بلکہ ایک ادیب سے عقیدت کا اظہار ہیں۔

معاف کیجئے گا۔ میں نے اکثر یہ اندازہ لگایا کہ آپ اچھی باتوں کے بُرے پہلوؤں پر ہی سوچتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور بُرائی بھی ——— بڑا کونسا بھاری ہے؟ اس کا اب فیصلہ کون کرے؟

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ آپ نے "پیاری باتیں" لکھیں۔ میں نے پیاری باتیں سنائیں ——— والسلام"

اب چونکہ یہ مسئلہ نقوش منافع خوری کی بات چل نکلی ہے۔ تو طفیل صاحب کا ایک خط اور بھی پڑھ لیں۔ جو انھوں نے اپنے ایک دوسرے دوست اختر انصاری کو لکھا تھا:—

برادرم، اسلام مسنون!

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تر تخلیقات کا انتخاب اب تک چھپ جانا چاہئے تھا۔ یہ شکایت نہ صرف سو فیصد حق بجانب ہے۔ بلکہ حساب کی رُو سے اگر دو سو فیصد بھی درست ہو سکتی تو بھی ٹھیک تھا۔ تو بھی غلط نہ ہوتا۔

مگر یار کیا بتاؤں۔ یہ جو نقوش کی بیماری میری جان کو لگی ہے۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا میرا لاکھوں کا ادارہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ نہ کوئی نئی کتاب چھپتی ہے نہ کسی پرانی کتاب کا نیا ایڈیشن آتا ہے۔ پریس بھی میری بے توجہی کا بُری طرح شکار ہے۔ خود بڑا پریشان ہوں۔ کئی بار اپنے اوپر غصہ آتا ہے (ادارہ اور پریس کی حالت دیکھ کر) جی چاہتا ہے یا تو خودکشی کر لوں۔ یا نقوش کو بند کر دوں۔ تاکہ میں قطعہ قسم کا آدمی بن جاؤں اور وہ سب کچھ کروں۔ جو میرے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ سود مند ہو۔ یہ خیال کرتا ہوں تو نقوش محبوبیت کی تمام تر تڑپا دینے والی اداؤں کے ساتھ

میرے عزائم پر برف بن کر گر جاتا ہے اور میں پھر ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح، اس پر وارفتہ نثار ہو جاتا ہوں۔ بہک جاتا ہوں۔ ہار جاتا ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے نقوش کے حسن و جمال میں مزید تابانی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سارے کام ٹھپ ہو گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو بہ حیثیت مجموعی یہ سودا مہنگا پڑ رہا ہے۔

میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے وہ سب کچھ آپ سے کہہ دی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کی کتابچہ جلد ترسانی سے مجبور رہا۔ والسلام!

ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ طفیل صاحب بڑے نفاست پسند ہیں۔ اس کا اقرار اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ مگر میں بھی آپ کو انکی نفاست پسندی اور کاہلی کا حال ایک ساتھ ہی سنا دوں۔

جس دن ان کے قلم کی نب خراب ہو۔ سیاہی اچھی نہ ہو۔ کاغذ اچھا نہ ہو۔ یہ کسی کو خط ہی نہیں لکھیں گے۔ خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ پھر جس دن یہ سب چیزیں اچھی ہوں گی۔ یہ خط پر خط لکھتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ بلا وجہ بھی خط لکھتے رہیں گے۔ جس دن انھیں خط لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو یہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ خط لکھ ڈالیں گے۔

ان کی میز مسودات، ضروری اور غیر ضروری کاغذات سے پٹی رہتی ہے۔ ان کے ارد گرد بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اگر ایک ٹکڑے سے لفافے میں ضروری خط اور مسودے پڑے ہیں تو دوسرے لفافے میں بھی دفعتاً بیسیوں لفافوں میں، اگر کسی چیز کی انھیں ضرورت پڑ جائے تو ضروری نہیں وہ اسی دن مل جائے۔

کبھی کبھی ان کا چپڑاسی میز کی یہ حالت دیکھ کر، سارے لفافوں کو ایک جگہ باندھ کر، کسی دوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ میز کو مال گودام بنتا دیکھے۔ مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ہر کاغذ کو قیمتی سمجھ کر اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر کاغذ کو غیر ضروری سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی قیمتی مسودے بھی وقتی طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ انھیں ہفتوں اور مہینوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ پسند نہیں کہ کوئی کام آسانی سے ہو جائے۔ یہ ہر آسان کام میں خود دشواریاں پیدا کر کے پھر اسے آسان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک صاحب انھیں اپنی ایک غزل دے گئے۔ انھوں نے رکھ لی۔ دوسرے تیسرے دن وہ صاحب تشریف لائے اور پوچھا "میری غزل چھپے گی؟"

"نہیں"

"اچھا پھر مجھے واپس کر دیجئے۔"

"پتہ نہیں اب کہاں ہے؟"

"یہیں میز پر ہو گی۔ ڈھونڈ دیجئے۔"

"بھی نہیں ملے گی"
"مل جائے گی"
"جناب میری میز پر اگر ماچس بھی گم ہو جائے تو وہ بھی ایک دن میں تو مل نہیں سکتا"

طفیل صاحب تصور کے بے حد قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ان فقرے کی نشست کرتے ہیں۔ کام ہو جاتا ہے تو شکر گذار ہو جاتے ہیں۔ نہ ہو جب بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہو گیا۔

کسی دوست نے انھیں ورغلایا کہ حکومت وقت کو اپنے کارناموں سے مطلع کرو۔ وہ تمہارے کام کے بدلے اور کچھ نہیں تو ایک آدھ توصیفی جملہ تو بھیج ہی دے گی۔ یہ بڑے خوش، اسائے بنڑوں کا ایک بڑا سا پلندا بنا کر بھیج دیا اور اب اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جس دن حکومت اعلان کرتی ہے کہ فلاں کو یہ تمغہ دیا، فلاں کو یہ خطاب ـــ چنانچہ صاحب وہ تاریخ بھی آئی جس دن یہ کام ہوتا ہے۔ اب یہ بار بار ناموں کو پڑھتے ہیں۔ مگر ان میں ان کا نام نظر نہ آیا۔ بڑے آزردہ ہوئے۔ مگر مایوس نہیں۔ فوراً تصور کی دنیا میں چلے آئے اور یہ سمجھ لیا کہ مجھے حکومت نے، جسے بڑا ادبی اعزاز دے دیا ہے۔ اب کوئی انہیں لاکھ کہے کہ میاں، تمہیں تو کسی نے منہ لگایا ہی نہیں۔ مگر یہ کسی کی کب سنتے ہیں۔ اپنی موج میں رہتے ہیں۔ اپنے تصورات کی دنیا میں بستے ہیں، جو ان کی کلفتوں اور آزردگیوں کا واحد سہارا ہے۔

یہ کبھی کبھی یوں بھی سوچتے ہیں :-

"بدفرض محال میں آج مر جاؤں تو کیا ہو۔ بہت سے لوگ تو خوش ہوں گے۔ کچھ خدا ترس قسم کے لوگ، (میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود) شاید یہ کہیں کہ اچھا ہی آدمی تھا۔ جس کو ادب سے شغف ہوگا۔ وہ ممکن ہے یہ کہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اچھے اچھے نثر نکالے ـــ اور بس ـــ غور کیجیے میرے بعد میری زندگی کا حاصل ہی ایک فقرہ ہوگا ـــ صرف اسی ایک فقرے کے لیے میں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے؟ دنیا تیاگ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دل کشیوں اور مسرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہوں۔ دن رات مرتا ہوں ـــ دن رات مرتا ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں۔

یار دوستوں سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بیوی سے ہنسنا بولنا میرے مقدر میں نہیں۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر ـــ کس لیے؟ ـــ صرف ایک فقرے کے لیے۔

اگر میں عین جوانی میں مر گیا۔ جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا اور میرے بچے اس فقرے کو چاٹا کریں گے۔ "ہمارے ابا نے بڑے بڑے اچھے نثر نکالے تھے"۔

بہر حال ان کے بعد جو کچھ بھی ہو۔ انھوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے۔

(باقی)